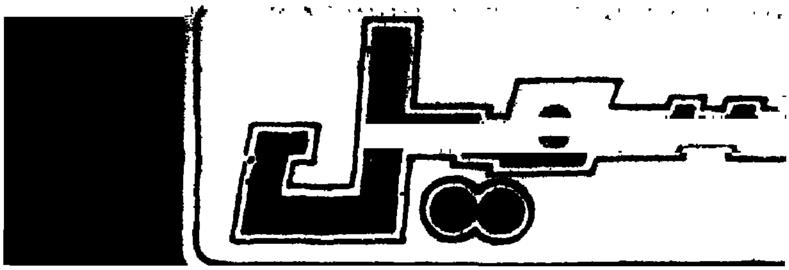


بانی :- حافظ محمد عبدالرحمٰن بسمل شنہاروی ـــــ بیادگار :- زین العابدین احمد و ادریسی شنہاروی

ماہنامہ سہیل گیا

فہرست

نمود ـــــ ۵

اردو ہندی کا تعلق ـــــ گیان چند ۸

نئی غزل نئی آوازیں ـــــ قیصر زماں ۱۹

نظمیں ـــــ رؤف خیر ۲۳

غزلیں ـــــ رؤف خیر، رؤف رحیم ۲۵

غزلیں ـــــ شرون کمار ورما، حسن نجمی سکندرپوری ۲۷

آئینے ـــــ ریحانہ زیدی ۲۹

پرانے البم کی نئی تصویر ـــــ الیاس قریشی ۳۷

نئی کتابوں کا تعارف ـــــ ڈاکٹر علیم اللہ حالی ۳۹

شہر خیال ـــــ ڈی این آریہ، مشتاق احمد نوری

مصور اعجاز، رؤف خیر ۴۱

چیف ایڈیٹر :- مسعود منظر

ایڈیٹر :- جمیل منظر

معاونین :- شکیل احمد جمالی، عبدالقیوم ابدالی

• کتابت :- سید عبدالاحد گیاوی

شمارہ ــــ جلد 50

بدل اشتراک ....

فی شمارہ .... ۲/۵۰ روپے

زر سالانہ .... ۳۰/- روپے

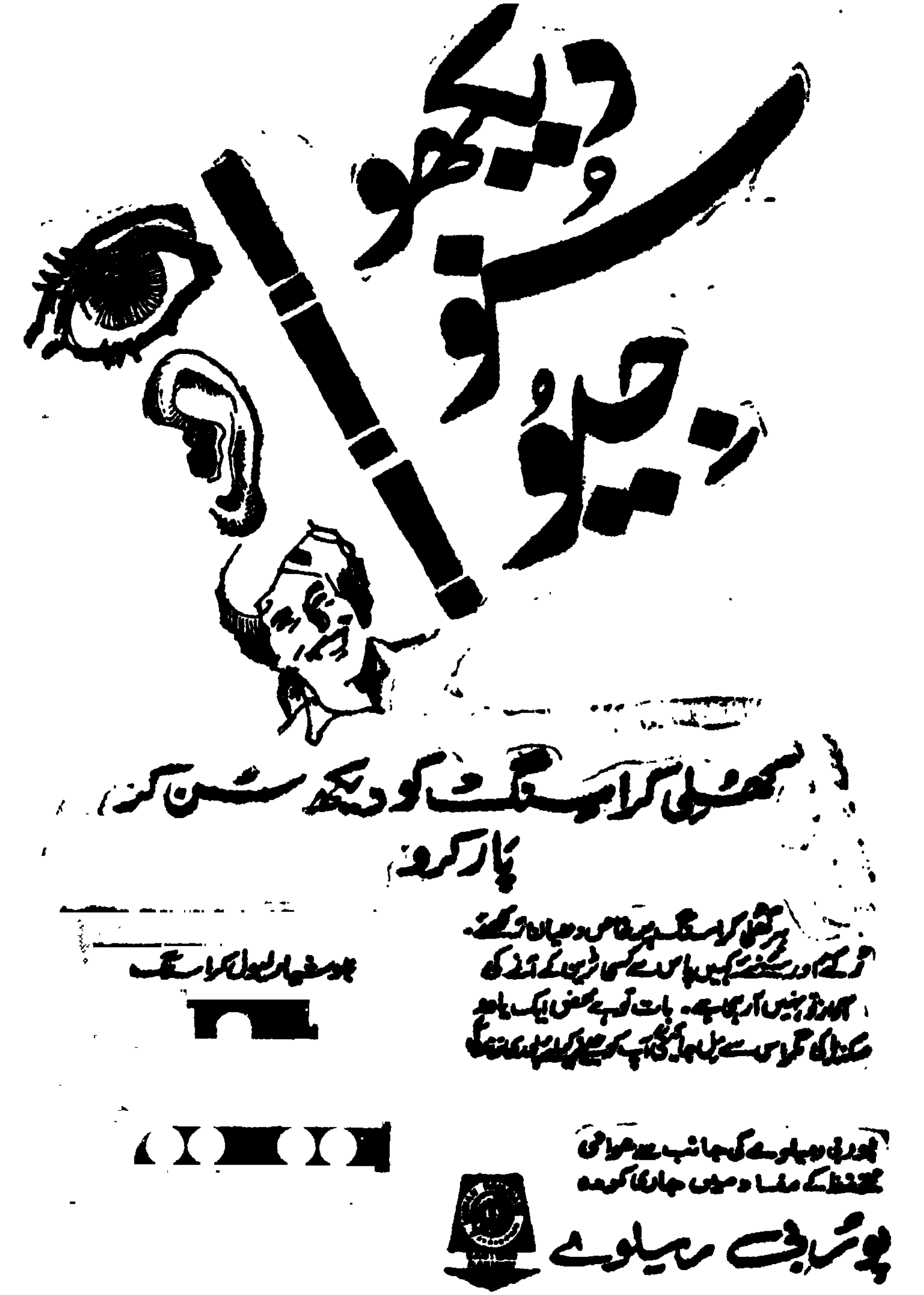
لائف ممبری .... ۵۰۱/- روپے

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ سہیل گیا

ریورسائیڈ روڈ، گیا (بہار)

• فون نمبر :- ۳۱۵۷۳


دیکھو
پار کرو
پوربی ریلوے

بے

ملک کا سیاسی اور سماجی منظر نامہ
تہذیب و ثقافت سے محبت کرنے والے عوام کے لئے
ایک بڑا سوال بن کر ابھر چکا ہے
تہذیب و ثقافت اور جمالیاتی قدروں کا رشتہ
عوام سے منقطع کرنے والی قوتیں ایک طرف کمزور ہوتی ہوئی نظر آرہی ہیں تو دوسری
طرف ہندوستانی سیاست اور معاشرے میں انتشار اور نراجیت کی فضا قائم کرنے والی
قوتوں میں اضافہ بھی ہوا ہے
نتیجہ سامنے ہے
فسادات ـــــ فرقہ وارانہ فسادات ـــــ عدم اعتماد
اور ربط و رشتہ کو جوڑنے والی قوتوں کا زوال
مگر
سب سے زیادہ افسوسناک امر یہ ہے کہ اس صورت حال کے ادراک و احساس کے باوجود
قلمکاروں اور فنکاروں نے مکمل طور پر اپنی ذمہ داریوں کو
اب بھی محسوس نہیں کیا ہے
نظریاتی ناوابستگی کا نعرہ بلند کرنے والا "تخــریبی گروہ"
"انحراف" کی باتیں کرنے والے نام نہاد "دانشور"
اب بھی سات سمندر پار سے ملنے والے
اشاروں کے منتظر ہیں
ایک بڑے حملے کی تیاری ہے
اگر تہذیب، ثقافت، ادب اور فن کی دنیا میں
منفی
سماج دشمن

مثبت جمالیاتی قدروں کے مخالفین ــــ اور
معاشرے میں نراجیت پھیلانے والی
تباہ کن ذہنیت کو
منطقی طور پر نشو ونما پانے دیا جائے
تو
ادب، کلچر، اخلاقیات، سیاسیات، معاشیات
اور پھر
تمام مروجہ علوم صحیحہ
پتہ نہیں کون سا رُخ اختیار کریں

ان تمام حالات کو سنجیدگی سے دیکھنا ــ اور اپنے لئے
اپنی تہذیب و تمدن ـــــ ادبی اور فنی قدروں کی بقا کے لئے
کوئی ضروری نہیں کہ
سیاسی اداروں کی جانب دیکھا جائے
کیوں کہ سیاسی اداروں ـــــ اور
مثبت نظریاتی استحکام کا فاصلہ کچھ بڑھتا ہی جا رہا ہے
"عوامی فلاح" کے نام پر
"بے سمت" پلاننگ کا سلسلہ رکتا نہیں ہے
کوئی سمت نظر بھی آتا ہے
تو وہ مٹھی بھر حکمراں طبقہ کے فلاح کی طرف جاتا ہے
جس کے اختیار میں ملک کی معاشیات ہے
"سیاسی قوت" کے ساتھ ساتھ ـــــ کلچرل قوت کی بھی بڑی اہمیت ہے
اسلئے سیاسی اداروں پر ہی سب کچھ چھوڑ دینے سے ملک اور عوام کے تہذیبی اور تمدنی ورثے کی حفاظت ممکن نہیں
ہمیں
اس "کلچرل قوت" کی معنویت اور ضرورت کو سمجھنا ہوگا ـــــ اور
ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کو اپنی ذمہ داریاں محسوس کرنی ہوگی
کیوں کہ ہماری آواز

سیاسی اداروں کی آواز سے کچھ زیادہ ہی بلند ہوگی
کچھ زیادہ ہی متحرک ہوگی
کچھ زیادہ ہی فعال ہوگی
کہ

ہماری آواز میں
عوام کے دل کی دھڑکنوں کی آواز شامل ہے
ہماری آواز میں
ہماری تہذیب اور ثقافت کا جمال زندہ ہے
اور

ہماری آواز
ملک کے مستقبل کی آواز ہے ۔



گیان چند

اردو ہندی کا تعلق، ایک ذاتی وضاحت

[میں نے ذیل کا مضمون کوئی ڈیڑھ سال پہلے عصری ادب میں اشاعت کے لئے بھیجا تھا۔ ڈاکٹر محمد حسن نے مجھے صلاح دی ہے کہ مضمون کا آخری حصہ، جس کا تعلق براہ راست مجھ سے نہ تھا، حذف کر دیا جائے۔ میں نے ان کا نیک مشورہ قبول کر لیا۔ یہ مضمون میرے ایک زیر طبع مجموعے میں بھی شامل ہے۔ اور میں نے وہاں بھی آخری حصے کو محذوف رکھا ہے۔ یہ مضمون رسالہ عصری ادب بابت جنوری تا اپریل ۹۰ء میں جو اکتوبر ۱۹۹۰ء میں چھپا کتاب کے طور پر شامل ہے۔ مضمون بھیجے ہوئے عرصہ ہو چکا تھا۔ مدیر کو خیال نہیں رہا اور بے خیالی میں وہ حصہ چھپ گیا جسے میں حذف رکھنا چاہتا تھا، لیکن صفحات کی تنگی کی وجہ سے مضمون کا مرکزی حصہ جس میں لسانیاتی بحث تھی بہت زیادہ مختصر ہو گیا ہے۔ ذیل میں اس حصے کا مکمل متن دیا جا رہا ہے۔]

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے شعبۂ لسانیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پروفیسر ایمریٹس مقرر ہونے پر ۱۲ جنوری ۱۹۸۸ء کو ایک خطبہ دیا جسے شعبے نے "اردو زبان: تاریخ، تشکیل، تقدیر" کے نام سے شائع کیا۔ مسعود صاحب، نیز شعبۂ لسانیات نے مجھے اس کی ایک کاپی عنایت کی۔ فاضل خطیب اس میں لکھتے ہیں:

"پروفیسر گیان چند جین نے ۱۹۶۲ء میں سب سے پہلے یہ شوشہ چھوڑا تھا کہ دستور ہند بنانے والوں کی سب سے بڑی بھول یہ ہوئی کہ انھوں نے آٹھویں شیڈول میں ہندی کے دوش بدوش اردو کو بھی ہندوستان کی ۱۴ مقتدر زبانوں کی فہرست بناتے وقت پنڈت جواہر لال نہرو کے اصرار پر جگہ دے دی...... امرت رائے نے ڈاکٹر گیان چند کے اس خیال پر یہ عمارت کھڑی کی کہ بغیر اردو کے علاحدہ وجود کا اب آئینی جواز ختم ہو گیا ہے لیکن اس ملک کی سالمیت کے لئے وہ دن روز سیاہ ہوگا جب ریشہ دوانیوں سے اسے چند صوبوں میں دوسری زبان منوا لیا جائے گا جس کا سلسلہ بہار سے شروع ہو گیا ہے۔ اردو کو [کیے؟]

ان نئے بے ننگ و نام کہنے والوں کے بارے میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے۔

؎ یہ جس تھالی میں کھاتے ہیں اسی میں چھید کرتے ہیں ؎

چونکہ امرت رائے اردو کی تھالی میں نہیں کھاتے اس لئے میں ہی وہ ننگ و نام ہوں جس پر مصرع کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں اردو کے بڑے محققوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان سے توقع کی جاتی ہے کہ کسی پر اعتراض کرتے وقت اپنے الفاظ اس کے منہ میں نہ رکھ دیں گے۔ بلکہ اس نے واقعی جو کہا ہے اسے حزم و احتیاط کے ساتھ نقل کریں گے۔ اس بیان کے پہلے مرکب جملے کو یہ اعزاز دیا جا سکتا ہے کہ تین سطروں کے اس جملے میں جتنی غلط بیانیاں ٹھونس کر بھر دی گئی ہیں اس کی نظیر اردو میں شاید ہی ملے۔ ملاحظہ ہو۔

(۱) میں نے ۱۹۶۲ء میں اس موضوع پر لکھا ہی نہیں موصوف کے ذہن میں جو مضمون ہے وہ ۱۹۷۳ء کا ہے

(۲) میں نے کبھی وہ بات نہیں کہی جو وہ مجھ سے منسوب کر رہے ہیں۔ اگر میں ان سے کہوں کہ میرے الفاظ نقل کر دیجئے تو وہ لاجواب ہو جائیں گے۔ میں اس نکتے کو آگے چل کر تفصیل سے لوں گا

۳ جواہر لال نہرو کے اصرار پر اردو کو آٹھویں شیڈول میں شامل کئے جانے کی بات میں نے مارچ ۱۹۸۰ء میں حیدرآباد کے ایک سمینار میں کہی تھی جس کی صدارت مسعود صاحب کر رہے تھے۔ میری تقریر سب رس حیدرآباد۔ کہ ایک سمینار میں کہی گئی جو بابت جون ۸۰ء میں ایک مضمون کی شکل میں شائع ہوئی تھی۔

(۴) امرت رائے نے اپنی انگریزی کتاب کے خاتمے میں صفحہ ۲۸۹ پر جو نتیجہ نکالا ہے اس میں کہیں ہندی ریاستوں، دوسری سرکاری زبان یا بہار کا کوئی ذکر نہیں۔ اس پورے باب میں نہیں۔

معلوم ہوتا ہے مسعود صاحب نے میری تحریر کو خود نہیں پڑھا، اپنے شاگرد رشید ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ سے سن سنا کر لکھ دیا ہے۔ بیگ صاحب نے ہماری زبان بابت یکم مئی ۱۹۸۰ء میں ایک مضمون لکھا" امرت رائے کا لسانی شاعرانہ مضمون کے آخر میں امرت رائے کا نتیجہ نقل کرتے ہیں کہ اردو کو ہندی کے علاوہ ایک قومی زبان کی حیثیت دینے میں عجلت سے کام لیا گیا بیگ صاحب آگے لکھتے ہیں۔

" اپنے اس خیال کی تائید میں امرت رائے نے پروفیسر گیان چند جین کا یہ قول نقل کیا ہے۔ " ہندوستان کے آئین میں اردو ہندی کو دو زبانوں کی حیثیت سے درج کرنا سیاسی مصلحت ہے۔ لسانی حقیقت نہیں۔

(مضمون " اردو ہندی یا ہندوستانی " شمولہ ہندوستانی زبان، سال ۵ نمبر ۱، اکتوبر ۱۹۷۳ء صفحہ ۱۵)

" پروفیسر گیان چند نے یہ بات کھل کر نہیں کہی کہ اردو کو ہندوستان کے آئین میں جگہ نہیں ملنی چاہئے لیکن اس اقتباس کے بین السطور سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ جب ہندی کو آئین میں جگہ دی گئی تو اردو کو، جو اس زبان کا دوسرا نام ہے، آئین میں جگہ دینے کا کیا جواز؟ ان کے خیال میں ایسا کرنا محض سیاسی مصلحت ہی ہو سکتا ہے، لسانی حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

(ہماری زبان، یکم مئی ۸۰ء صفحہ ۷)

میرا مضمون میرے مجموعے "حقائق" میں بھی شامل ہے۔ میں نے امرت رائے کے متعلقہ باب کو، جو اختتامی ہے۔ توجہ سے پڑھا۔ اس میں کہیں نہ میرا ذکر ہے نہ میرے کسی بیان کا۔ پھر یہ دعویٰ کیوں کیا جا رہا ہے کہ امرت رائے نے اپنے خیال کی تائید میں میرا قول نقل کیا ہے۔ امرت رائے کا فیصلہ صفحہ ۲۸۷ پر ہے اور میرا قول کتاب کے صفحہ ۲۳ پر ہے۔ دونوں میں ایک بات کہی گئی ہے۔؟

ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر خلیل بیگ اور ڈاکٹر ابو محمد سحر (ہماری زبان، ۲۲ مئی، ۱۹۸۰ صفحہ ۷) تینوں حضرات نے مجھ پر اعتراض کیا ہے کہ امرت رائے نے میرے قول کی بنا پر اپنی کتاب کی عمارت کھڑی کی۔ کاش میرے کسی جملے پر اس کی کاٹ ہی میں سہی، کوئی اردو والا بھی کوئی عالمانہ کتاب لکھ دے۔

امرت رائے میرے تحت کام کرنے والے ریسرچ اسکالر نہ تھے جو میرے فرمودات پر چلتے۔ وہ عمر میں مجھ سے بڑے ہیں۔ اردو ہندی کے ایک بڑے ادیب کے بیٹے ہیں۔ مجھ سے ایک زمانہ پہلے ہندی میں ساہتیہ اکادمی کا انعام حاصل کر چکے ہیں۔ میری تدریسی زندگی کے ۲۶ سال بھوپال اور جموں میں گزرے جو اردو ہندی کے مرکز سے دور ہیں۔ امرت رائے نے الہ آباد جیسے ہندی کے گڑھ میں ہندی کے عمائد کے بیچ زندگی گزاری ہے۔ یہ کہنا ان کی توہین ہے کہ ہندی اردو کے مسئلے پر ان کی رائے تو کم سواد کے ایک جملے پر مبنی ہے، نہیں ان کا فیصلہ ان کی عمر بھر کی سوچ کا نتیجہ ہونا چاہئے۔

انہیں نہرو فیلوشپ ملی جس کے لئے انہوں نے اردو ہندی کے موضوع پر کام کیا۔ اردو میں اس موضوع پر جو مواد مل سکتا تھا وہ مجھ سے لیتے تھے۔ میں نے ایک معلم اور محقق کے طور پر انہیں سب کچھ دیا، موافق بھی اور مخالف بھی۔ میں یہ بد دیانتی نہیں کر سکتا تھا کہ انہیں ایک رنگ کا مسودہ دیتا اور دوسرا چھپا لیتا۔ انہوں نے اردو کا مواد تنہا مجھ سے نہیں لیا۔ بلکہ پانچ دوسرے حضرات سے بھی لیا جن کے نام تمہیدی اعتراف میں دیئے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں بھی شامل ہیں۔ امرت رائے نے اردو فارسی کے جن ماخذ سے استفادہ کیا ہے ان میں سے کئی میرے لئے نئے ہیں اور ان سے میری معلومات میں اضافہ ہوا۔ امرت رائے مجھ سے محض مواد حاصل کرتے تھے۔ کتاب کی تسوید کے بارے میں کوئی رہبری نہیں لیتے تھے۔ جب تک میں الہ آباد میں تھا، انہوں نے شاید کتاب کی تسوید شروع ہی نہ کی تھی۔ میں نے کتاب کا خاکہ نہیں دیکھا۔ مجھے کچھ علم نہ تھا کہ وہ کن خطوط پر کتاب لکھنا چاہتے تھے، آیا ان کی کتاب لسانیاتی ہوگی، تاریخی ہوگی یا مناظرانہ۔ کبھی ان سے ذکر ہی نہیں آیا کہ وہ کس زاویۂ نظر سے کیا لکھیں گے۔ اردو ہندی کے تعلق سے ان کے میرے بیچ کبھی اتفاق ہوتا تھا اور کبھی اختلاف۔ اپنے تمہیدی اعتراف میں وہ میرے سلسلے میں لکھتے ہیں۔ "ہم ہمیشہ متفق نہیں ہوتے تھے۔"

۱۹۷۹ء میں میرے حیدر آباد آنے کے بعد ان کا ایک یا زیادہ سے زیادہ دو خط آئے جن میں انہوں نے میرے پہلے سے فراہم کئے ہوئے کسی مواد کا ماخذ پوچھا تھا۔ کتاب شائع ہونے پر انہوں نے اس کی ایک کاپی بھیجی تب مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے کیا کیا لکھا ہے۔ اس طرح مجھے ان کے کسی نتیجے کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ میں نے اپنے مضامین میں جو کچھ لکھا ہے، مجھے صرف انہیں کی حد تک کٹہرے میں کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ "ہماری زبان" میں جب ان کی کتاب پر مضامین شائع ہوئے، اس وقت ان کی کتاب میرے پاس نہیں تھی۔ کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ میں نے یہ کہاں لکھا ہے کہ آئین کے آٹھویں جدول میں اردو کو شامل کرنا جلد بازی تھی۔ اس پر انہوں نے اپنے ۲ر اکتوبر ۸۰ء کے خط میں لکھا۔

"وہ میری بات ہے اس کی جواب دہی میرے اوپر ہے۔
آپ کے ساتھ تو میں نے کوئی زیادتی نہیں کی۔"

ڈاکٹر خلیل بیگ نے میرے اقتباس کے بین السطور

وہ کچھ پڑھا ہے جو میں نے لکھا ہی نہیں۔

وہ بات، سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

میری نثر غالب کا منسوخ شعر یا سرسید میرکا شی اور مین راکا افسانہ نہیں کہ اسے حسب دلخواہ کوئی بھی معنی پہنا دیئے جائیں۔ کیا میں نے متعلقہ جملے میں آٹھویں شیڈول کا نام لیا ہے؟ کیا کہیں یہ لکھا ہے کہ دستور میں ہندی کا اندراج بجا اور اردو کا بے جا تھا؟ کیا کہیں اردو کے مقابلے میں ہندی کو فضیلت دی ہے؟ انگریزی کی کہاوت ہے کہ "کتے کو برا نام دیجئے اور پھانسی پر لٹکا دیجئے۔" میں نے یہ مضمون مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر بمبئی کے رسالے "ہندوستانی زبان" میں ہندوستانی کی حمایت میں لکھا ہے۔ معترض میری اسپرٹ کو نہ سمجھ سکے۔ میرے گردن زدنی جملے کے پہلے اور بعد کے کچھ جملے پڑھنے ضروری ہیں۔ سیاق و سباق کو تفصیل سے درج کرنے کی معذرت چاہتا ہوں۔

"میں مردم شماری میں اپنی مادری زبان اردو لکھواتا ہوں حالانکہ میرے ماں باپ، دادا دادی اردو سے نابلد تھے....

میں قصبہ سیوہارہ، ضلع بجنور، یو پی کا رہنے والا ہوں۔ یہ قصبہ آزادی سے پہلے بھی مسلم اکثریت کا تھا اور آج بھی مسلم اکثریت کا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہاں کی تمام قدیمی آبادی ایک زبان بولتی ہے۔ اور سب ایک دوسرے کی زبان کو سو فیصد سمجھتے ہیں۔ میرا قیاس ہے کہ مردم شماری میں تمام مسلمانوں کی زبان اردو اور ہندوؤں کی زبان ہندی لکھی جاتی ہوگی۔ کم و بیش یہی کیفیت تمام ہندی (یا ہندوستانی) ریاستوں کی ہونی چاہئے۔

مذہب کی بنا پر زبان کی یہ مصنوعی تقسیم کیا بددیانتی نہیں؟ پنجاب اور چنڈی گڑھ کے ہندو پنجابی بولتے ہیں۔ لیکن سیاسی وجوہ سے اپنی زبان کو ہندی کہتے ہیں۔ اسے سراہا نہیں جا سکتا اسی طرح مذہب کی بنا پر ایک زبان بولنے والوں کی زبان کو دو میں بانٹ دینا سیاست اور فرقہ واریت کا کرشمہ ہوتا ہے۔ قرار واقعی صورتحال نہیں۔ ہندوستان کے آئین میں اردو ہندی کو دو زبانوں کی حیثیت سے درج کرنا سیاسی مصلحت ہے، لسانی حقیقت نہیں۔ مردم شماری میں اردو اور ہندی بولنے والوں کی تعداد کی تقسیم محض فرضی اور خیالی ہے۔ یہ سب اردو بولنے والے بھی کہلا سکتے ہیں، ہندی بولنے والے بھی۔"

(۱۹۷۳ء کا مضمون۔ باطباعت، حقائق، ص ۳۰۳۔ ۲۱۱)

کیا میں نے ان جملوں میں آئین میں ہندی کے اندراج پر طمانیت اور اردو کے شمول پر تاسف کا اظہار کیا ہے؟ صرف ایک جملے کی وجہ سے جو اجارہ داران اردو مجھ پہ اردو دشمنی کا فتویٰ دے رہے ہیں، اگر میں کہہ دوں کہ ان کے من میں ہندی بیزاری چھپی ہوئی ہے جس کے سبب وہ اردو کے ساتھ "ہندی" کا نام بھی سننا گوارا نہیں کرتے تو انہیں کیسا لگے گا۔ کہا جائے گا کہ اوپر کے پیراگراف کے آخری جملے میں میں نے تین کروڑ اردو بولنے کا (۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق) وجود ہی ختم کرکے انہیں ہندی والوں میں ضم کر دیا ہے۔ لیکن میں نے چندرہ کروڑ ہندی بولنے والوں کو بھی اردو میں ضم کیا ہے۔ میں نے اردو ہندی کا پلڑا برابر رکھا ہے۔ آگے چل کر میں نے لکھا ہے۔

مہاتما گاندھی نے ملک کی زبان ہندوستانی تجویز کی تھی جو اردو اور دیوناگری دونوں خطوں میں لکھی جانی چاہئے مجھے ڈاکٹر محمد حسن کی اس رائے سے مکمل اتفاق ہے کہ "دارِ ملک کی عام زبان نہ ہندی ہے نہ اردو، بلکہ ہندوستانی ہے ..... اردو ہندی کی تفریق جرمنی، کوریا اور ویتنام کی تقسیم کی طرح ہے۔ کیا ان دونوں زبانوں اور دلوں کو ملایا نہیں جا سکتا۔ شروعات کے طور پر انھیں قریب لایا جائے۔ پھر مشترک الفاظ اور ادبی روایات نیا زیادہ زبان

؛ مبادہ سہل گیا

ہوگی، وہ غالب ہو جائیں گی۔ جو تعصب آمیز ہیں وہ دب کر ختم ہو جائیں گی۔ اس سے اردو اور ہندی کی علیحدہ حیثیتوں کو ضرور ضرر پہنچے گا لیکن دونوں کا جو مجموعہ ہوگا وہ ملک کے لئے زیادہ مفید ہوگا۔"

• اسکول کی تعلیم کی کسی منزل میں اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط سکھائے جائیں اور بی۔اے اور ایم اے میں علیحدہ اردو اور علیحدہ ہندی کے علاوہ ایک ایسا مضمون یا نصاب تیار کیا جائے جسے ہندوستانی ادب کہا جائے۔ اس کے طلبہ دونوں رسوم الخط سے کما حقہ، واقف ہوں اور انہیں نصاب میں دونوں رسوم الخط کے ادبوں (یعنی اردو ادب اور ہندی ادب) کے شاہکاروں سے واقف کرایا جائے۔"

" اس مسئلے پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اردو اور ہندی زبان و ادب کو اگر ایک بھی نہ کر دیا جائے تو بھی انہیں ایک دوسرے کے قریب، قریب تر لایا جائے کہ نہیں؟ میں فصل کو وصل پر ترجیح دیتا ہوں۔"

(حقائق۔ صفحہ ۳۴۴)

میں اردو اور ہندی کی دوئی ختم کر کے۔" صرف ہندی" کی وکالت نہیں کرتا تھا۔ جس نے یہ کہا تھا کہ آئین کے آٹھویں شیڈول میں اردو شامل نہ کی جائے۔ میں تو پورے آئین کو لے کر ملک کی قومی زبان کی بات کرتا تھا کہ وہ ہندوستانی ہونی چاہئے جو ملک کی واقعی مشترک زبان ہے۔

میری تقصیر صرف یہ ہے کہ میں ہندی اردو کو ایک مانتا ہوں جو ہندوستانی یا کھڑی بولی کی دو شکلیں ہیں۔ واضح ہو کہ تقسیم ملک سے پہلے کی کسی مردم شماری میں اردو اور ہندی کو الگ زبانوں کے طور پر درج نہیں کیا گیا۔ ان کے بجائے 'ہندوستانی' کا اندراج ہوا تھا۔[۱]

۱۔ گجرال کمیٹی رپورٹ دفعہ ۱۰۶ / ۷ ۔ صفحہ ۵۲

تقسیم ملک سے پہلے کی نسل کو یاد ہوگا کہ ۱۹۴۷ء تک آل انڈیا ریڈیو سے صرف 'ہندوستانی' میں خبریں نشر ہوتی تھیں اردو یا ہندی میں نہیں۔ قانونی طور پر آزاد ہند کے آئین نے ہندوستانی کو ختم کر کے اردو اور ہندی کو الگ حیثیت دی۔ ہندوستانی کے حامی نہ صرف مہاتما گاندھی، ڈاکٹر تارا چند اور سجاد ظہیر تھے بلکہ جی جی کی صدارت میں بنی پہلی سرکاری زبان کمیشن کی رپورٹ میں دونوں زبانوں کی قدر مشترک کی وکالت کی گئی ہے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے گجرال کمیٹی رپورٹ تک نے دونوں زبانوں کے مشترک ورثے اور دونوں زبانوں کو ہندوستانی کے رنگ میں ترقی دینے پر زور دیا ہے (گجرال کمیٹی رپورٹ دفعہ ۲۱۔۲۰ / ۳ صفحہ ۶۹۔۶۸)

شاید اب ہندوستانی کا نام لینے کو دیوانہ پن قرار دیا جائے لیکن آج ۲۴ ستمبر ۱۹۸۸ء کے انڈین ایکسپریس حیدرآباد ایڈیشن میں پہلے صفحے پر خبر ہے کہ مدراس میں نیشنل فرنٹ کے جلسے میں چودھری دیوی لال وزیر اعلیٰ ہریانہ نے کہا کہ ہندوستان کی سرکاری زبان ہندوستانی ہونی چاہئے۔[۲] ڈاکٹر محمد حسن نے مجھ سے ماضی میں بھی کہا تھا اور ۱۰ ستمبر ۱۹۸۸ء میں بھی اردو ہندی کے سنگم اور ہندوستانی پر زور دیا۔ دیکھیں اور کون کون اردو ہندی کو ایک سکے کے دو رخ مانتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ لسانیات کے نقطۂ نظر سے اردو اور ہندی کو دو زبانیں قرار دینا صحیح نہیں۔") (صفحہ ۱۴)

۲۔ اس مضمون کی تحریر کے بعد ہندوستانی کا ایک اور وکیل نظر آیا۔ ڈاکٹر عبد المغنی لکھتے ہیں۔

" (آزادی) کے چالیس سالہ تجربے نے واضح کر دیا ہے کہ پورے ملک کے لئے واحد قابل قبول زبان اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہی ہندوستانی ہے۔ جسے اس وقت کی مخصوص فرقہ وارانہ فضا میں جمہوریہ ہند نے آج سے ۴۰ سال قبل ۱۹۵۰ء میں رد کر دیا تھا۔

(مریخ پٹنہ، جنوری، جون ۱۹۸۹ء، صفحہ ۲۴)

ڈاکٹر ابو محمد سحر نے اپنے ایک مضمون میں احتشام صاحب کے اس بیان کی طرف بھی توجہ دلائی۔

"اگرچہ اردو اور ہندی لسانیاتی مفہوم میں دو زبانیں نہیں ہیں لیکن عملی حیثیت سے اس وقت تک انہیں دو الگ الگ زبانوں کا مرتبہ حاصل ہے۔" (ہندوستانی لسانیات کا خاکہ صفحہ ۵۰)

میں اس بیان سے بھی واقف ہوں۔ میں نے اپنے مضمون "اردو اور ہندی کا لسانیاتی رشتہ" مشمولہ "لسانی   " میں احتشام صاحب کے مندرجہ بالا بیان کو نقل کرکے خود بھی یہ کہا ہے کہ

"صحیح صورت حال یہ ہے کہ اردو اور ہندی کھڑی بولی کے دو روپ ہیں۔۔۔۔ کھڑی بولی کے ان دو روپوں کا ادب اور لسانی سرمایہ اتنا مختلف ہو گیا ہے کہ انہیں دو زبانیں نہ ماننا حقیقت کی جانب سے آنکھیں موند لینا ہے۔" (لسانی مطالعے صفحہ ۲۰۴)

میرا یہ بیان اس وقت کا ہے جب میں نے باقاعدہ لسانیات نہیں پڑھی تھی۔ ساگر اور دھارواڑ کے لسانیاتی اسکولوں میں درس نہیں لیا تھا۔ اپنی کتاب "عام لسانیات" کی تیاری کے لئے میں نے زبان اور بولی کے فرق کا مطالعہ کیا تو یہ ماننے پر مجبور ہوا کہ اردو اور ہندی لسانیات کی رو سے ایک ہیں۔ احتشام صاحب لسانیات کے اعتبار سے دونوں زبانوں کو ایک اور عملی حیثیت سے دو مانتے ہیں۔

(۲) پروفیسر آل احمد سرور اپنے مضمون "نئے ہندوستان کی تعمیر میں اردو کا حصہ" میں لکھتے ہیں۔

"اردو زبان ایک آریائی اور ہندوستانی زبان ہے اس کی بنیاد کھڑی بولی پر رکھی گئی ہے۔ اس اعتبار سے اس میں اور ہندی میں کوئی فرق نہیں۔ ہندی اور اردو دو مستقل، جداگانہ زبانیں نہیں ہیں۔" (ادب اور نظریہ صفحہ ۲۶۳)

(۳) "من تُرا حاجی بگویم تو مرا ملا بگو" [illegible] تحسین خاں فرماتے ہیں۔

چونکہ ہندی اور اردو ایک ہی زبان کے دو روپ ہیں اس لئے اس میں ترجمے کا پردہ کم سے کم مائل رہتا ہے۔"

گنجوڈان (۲)، ہماری زبان ۱۰ جون ۱۹۸۱ء باز طباعت اردو کا المیہ صفحہ ۲

مسعود صاحب کے اس قول کو عاقل انصاری نے اپنے مضمون (ہماری زبان ۸ اکتوبر ۱۹۸۱ء صفحہ ۲)

نیز مانک ٹالا نے اپنی کتاب "پریم چند اور افسانۂ پریم چند" (صفحہ ۱۲۶) میں نقل کیا ہے۔

(۴) ڈاکٹر سہیل بخاری

دراصل اردو اور ہندی ایک زبان کے دو روپ ہیں جسے ماہرین علم زبان نے کھڑی بولی کا نام دیا ہے۔

(اردو کا قدیم ترین ادب، نقوش مئی ۶۵ء صفحہ ۱۸۳)

(۵) کمال احمد صدیقی صاحب نے ہماری زبان میں تین قسطوں میں ایک مضمون لکھا "تازہ بجات نزہات اور باسی بجات خیرات" (۱۹۸۰ء) کیتکی کی کہانی کے سلسلے میں ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کا یہ قول درج کیا ہے۔

"اردو مخلوط زبان نہیں ہے۔ فارسی، ترکی اور عربی الفاظ کے بغیر بھی یہ اردو ہے اور ہندی بھی اردو اور ہندی دونوں ایک ہیں۔"

(ہماری زبان ۲۲ جون ۸۰ء صفحہ ۸، کالم ایک)

(۶) کمال احمد صدیقی صاحب نے مندرجہ بالا مضمون میں مجھ سے کہیں زیادہ واشگاف طریقے پر لکھا ہے اور بار بار لکھا ہے۔

(الف) اردو ہندی میں بول چال کی سطح پر کوئی فرق نہیں ہے۔ ٹکسالی ہندی اور ٹکسالی اردو، ادب میں بھی ایک ہیں۔ (ہماری زبان ۲۲ جون ۸۰ء صفحہ ۲ کالم ۳)

(ب) "ہندی اور اردو" دونوں ایک سکّے کے دو رُخ ہیں بلکہ ایک ہی رُخ ہیں۔ (ایضاً کالم ۵)

اور اب مسعود صاحب، ابو محمد سحر صاحب اور مرزا خلیل بیگ صاحب جگر تھام کر سنیں کہ جو بات میں نے نہیں کہی تھی وہ کمال صاحب نے کہہ دی ہے۔

(ج) "دستور کے آٹھویں شیڈول میں ہندی اور اردو کو الگ زبانیں تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ ایک سیاسی فیصلہ تھا۔ لسانی نہیں اور اس سیاسی فیصلے کی بنا پر لسانی نتائج اخذ کرنا کم از کم زبان اور ادب کے عالموں کے لئے مناسب نہیں۔ (ایضاً ص ۷ کالم ایک)

(ب) "میں ان لوگوں میں سے ہوں جو بول چال کی ہندی ہی کو بول چال کی اردو کہتے ہیں۔ فارسی رسم الخط میں ہندی ہی اردو ہے اور دیوناگری میں اردو ہی ہندی ہے (ایضاً ص ۷ کالم ۲)

(ج) اور زبانوں میں میری مادری زبان بھی شامل ہے جو فارسی رسم الخط میں لکھیں تو اردو ہے اور دیوناگری میں لکھیں تو ہندی (ایضاً، صفحہ ۷، کالم ۳)

(د) "اردو اور ہندی دو نام ہیں ایک ہی زبان کے" (ہماری زبان ۸ جولائی ۸۰ء صفحہ ۸ کالم ۲)

(س) "بول چال کی سطح پر لسانی اعتبار سے ہندی اور اردو ایک ہی ہیں۔ اس لئے بول چال کی ٹکسالی ہندی، دونوں لپیوں میں اور کہیں ہو نہ ہو، اترپردیش اور دلی کی سرکاری زبان ہے۔ [ہو؟]" (ایضاً ص ۷، کالم ۵)

کمال احمد صدیقی صاحب نے یہ مضمون اردو کی حمایت میں لکھا ہے۔ اس حد تک کہ وہ بار بار مہاتما گاندھی تک پر تنقید کرتے ہیں۔ کمال صاحب کو کسی طرح اردو کا دشمن قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اردو اور ہندی کو ایک زبان ماننے والا لازماً اردو دشمن نہیں ہوتا۔ مسعود صاحب نے اپنے خطبے میں مدیر کے منہ میں وہ الفاظ رکھ دیئے جو انہوں نے نہیں کہے تھے۔ کمال احمد صدیقی صاحب نے آٹھویں شیڈول کا نام لے کر وہ بات کہی، مسعود صاحب نے ان پر گرفت نہیں کی۔

۷ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر سید ہاشم علی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں لکھا۔

"قومی زبان" کل ہند بول چال کے لئے ہندوستانی زبانوں میں سے ایک زبان کی ضرورت ہے جس کو ہندوستان کے زیادہ سے زیادہ لوگ جانتے اور بولتے ہوں اور دوسرے آسانی سے سیکھ سکتے ہوں۔ یہ زبان بلاشبہ ہندی ہے۔ یہ شمالی ہندوؤں اور مسلمانوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور جب اردو رسم الخط میں لکھی جاتی ہے تو اردو کہلاتی ہے۔ (اردو کی بقا، ترویج و ترقی کے مسائل" تہذیب الاخلاق علی گڑھ اگست ۸۹ء ص ۱۰)

لسانیات اردو اور ہندی کو ایک زبان کہتی ہے۔ اردو کے طرف دار ان کی ثنویت کے قائل ہیں۔ واضح ہو کہ زبانوں کی تعیین میں ان کے محض تکلمی روپ کو دیکھا ہے۔ مردم شماری میں کسی کی زبان وہ قرار پاتی ہے جو وہ بولتا ہے۔ نہ کہ وہ جس میں وہ لکھتا پڑھتا ہے۔ اردو اور ہندی کو دو زبانیں کہنے والوں سے میں پوچھ سکتا ہوں کہ کیا یوپی میں اردو اور ہندی بولنے والے ایک دوسرے سے کسی ترجمان کے واسطے سے بات کرتے ہیں۔ یہ کیسی دو زبانیں ہیں جو کئی صدیوں پر پھیلے ہوئے دکنی ادب کو اپنا اپنا مال بتاتی ہیں۔ جن میں پوری پوری کتابیں مشترک ہیں۔ سنگھاسن بتیسی، بیتال پچیسی، مادھونل و کام کندلا اور رانی کیتکی کی کہانی۔" مسعود صاحب نے قصۂ مہر افروز و دلبر کو بغیر کسی ترجمے کے ہندی میں بھی چھاپا۔ کیونکہ وہ اسے اردو کے ساتھ ساتھ ہندی کی کتاب بھی مانتے ہیں۔ اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں۔

"شمالی ہند کی قدیم زبان میں لکھی ہوئی ایک قدیم داستان ہے۔ اس داستان کو یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ ہندی والوں کے لئے بھی قدیم ہندی نثر کے اولیں نمونے کے طور پر اہمیت رکھے گی۔ بڑی محنت سے ہندی رسم الخط میں مع حواشی کے شائع کیا گیا۔"

" وردِ مسعود، پٹنہ، سنہ طبع ندارد، ص ۳۰۰)

اس کے بعد تو کوئی شک نہیں رہتا کہ مسعود صاحب اردو اور ہندی کو ایک زبان مانتے ہیں۔ پاکستانی شاعر ناصر شہزاد کا شعری مجموعہ "چاندنی کی پتیاں" اگر دیوناگری خط میں چھاپ دیا جائے تو کیا۔ باعتبارِ زبان اور کیا باعتبار افکار۔ وہ خالص ہندی کی کتاب معلوم ہوگا۔

لیکن مسعود صاحب مجھ سے محض اس وجہ سے شاکی نہیں کہ میں نے ۱۹۷۳ء کے مضمون میں اردو اور ہندی کو ایک زبان کہا۔ مجھ سے ان کی بدگمانی زیادہ قدیم ہے۔ مثال میں انھوں نے مجھے اپنی مرتبہ کتاب "رفعاتِ رشید صدیقی" تفویض کی اس میں جملہ مکاتیب مسعود صاحب ہی کے نام ہے۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۷۱ء کے ایک خط میں رشید صاحب انھیں لکھتے ہیں۔

" حال ہی میں دورانِ گفتگو میں آپ نے اردو پروفیسر کے تقرر سے متعلق ایک نہایت سچی اور اونچی بات کہی تھی یعنی کسی مسلم ادارے میں (مثلاً جامعہ ملیہ دہلی) اردو کا پروفیسر مقرر کئے جانے کے لئے پیشہ ورانہ استعداد اور زبان و ادب سے متعلق اس کے اسناد اتنے ضروری نہیں ہیں جتنا اردو سے اس کی وابستگی "

طبع اول علی گڑھ ۱۹۸۱ء ص ۱۹۸

جاننے والے یہ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ اشارہ کس بے ننگ کی طرف ہے۔ ع ہم کہ ٹھہرے دشمنِ اردو کتب لکھنے کے بعد۔ ہندوستانی پر میرا مضمون ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔ یہ خط ۱۹۷۱ء کا ہے۔ اس سے مجھے کرید ہوئی کہ اپنی ۱۹۷۱ء سے قبل کی زیرو بمِ اردو سے اپنی غیر وابستگی کا سراغ لگاؤں۔ اپنے عہد کے مضامین کو کھنگال ڈالا، کچھ ہاتھ نہ آیا۔ مسعود صاحب نے اپنے خطبے میں میرے ۱۹۶۲ء کے مبینہ مضمون کا ذکر کیا ہے۔ میں نے اس اُتے پتے کے سہارے مزید تلاش کی۔ ہماری زبان مورخہ

۸ ستمبر ۱۹۶۴ء میں میرا ایک مضمون " اردو تحریک " شائع ہوا تھا جس سے بعض اہلِ اردو کافی ناراض ہوئے تھے میں نے اس میں مولوی عبدالحق اور ہاشمی فرید آبادی کے پاکستان میں دیئے ہوئے بعض بیانات نقل کئے تھے کہ " اردو کی وجہ سے پاکستان بنا، اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے "۔ یقین ہو گیا کہ مسعود صاحب کے ذہن میں اس مضمون کا تاثر رہا ہوگا۔ ویسے میں اب بھی یہ کہتا ہوں کہ کوئی اس مضمون کو کھلے دل سے پڑھے۔ اس کا لکھنے والا اردو دشمن معلوم نہ ہوگا۔

تو اپنے خطبے میں مسعود صاحب نے میرے ۱۹۷۳ء اور ۱۹۸۷ء کے دو مضامین کے مطالب لائے اور ان کے زمانے کو ۱۹۶۴ء کے ایک مضمون سے گڈمڈ کر کے[1] حاصل جمع کو ۱۹۶۲ء سے منسوب کر دیا۔

اپنے مضمون " اردو ہندی یا ہندوستانی " کے آخری صفحے پر میں نے نہ صرف اردو ہندی زبانوں کے اتحاد کی خواہش کی تھی بلکہ اردو اور ہندی کے ادبوں کے سنگم کی بھی۔ یک نہ شد دو شد۔ لیکن ان ادبوں کی مغائرت اتنی نہیں جتنی معلوم ہوتی ہے دونوں زبانیں دکنی ادب کو اپناتی ہیں۔ شمالی ہند میں اردو ادب کا قدیم دور دوہوں اور گیتوں پر مشتمل ہے جو رسم الخط کے علاوہ ہر اعتبار سے ہندی ہیں۔ یہی کیفیت جدید دور کے گیتوں کی ہے۔ ڈاکٹر انصار اللہ نظر اور جناب علی جواد زیدی نہ صرف کبیر کے کلام کو بلکہ تلسی داس کی رامائن تک کو اردو ادب میں شامل کرنے کے حق میں ہیں۔

مشہور ہے کہ ۱۹۴۸ء میں سردار جعفری اور کرشن

سلہ یہ قول عصری ادب میں بھیجے جانے والے مضمون کے لہجہ کا اعادہ ہے۔

سلہ لیکن ڈاکٹر محمد حسن کے بقول مسعود صاحب نے مجیب صاحب اور محمد حسن سے کوئی اور ہی بات کہی تھی۔ ملاحظہ ہو عصری ادب جنوری تا اپریل ۸۹ء ص ۲۰۲

چند روغیرہ نے اہل ہندی کو نہ صرف اردو ہندی زبان کو ملانے کی کوشش کی تھی بلکہ دونوں کے ادیبوں کو بھی، یعنی اگر ہندی والے درس گاہوں میں ہندی نصاب میں میر و غالب وغیرہ کو بھی پڑھائیں تو اہل اردو دونوں زبانوں کے انضمام کو تیار ہو جائیں گے۔ مراد یہی ہوئی کہ ہندی ادب کی تاریخ میں اردو ادب کو شامل کر لیا جائے ہندی کا فریق اس کے لئے تیار نہ ہوا۔

مرکزی ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر آر۔ایس۔کیلکر نے ۱۰ر جولائی ۱۹۸۱ء کو مختلف زبانوں کے ادیبوں کو (مجھ کم سواد سمیت) ایک چٹھی بھیجی جو "پریم چند اور ہندوستانی ناول" یا ہندوستانی پن" کے موضوع پر ایک بین الاقوامی سمینار کے دعوت نامے کے طور پر تھی۔ اس میں انھوں نے سوال اٹھایا تھا کہ ہندوستانی فکشن میں کیا کچھ ہندوستانی ہے۔ انہوں نے دعویٰ کیا تھا کہ ہم بالیقین ہندوستانی فکشن کو ایک ممیز وجود (DISTINCT ENTITY) مان کر بات کر سکتے ہیں۔

میں ہندوستانی فکشن سے آگے بڑھ کر ہندوستانی ادب کی تشکیل کرنے کے حق میں ہوں۔ جہاں تک اردو ہندی کا سوال ہے ہندی کی کھڑی بولی ادب اور اردو ادب کو یک جا کیا جا سکتا ہے۔ یعنی ۱۸۵۷ء کے بعد کے ادب کو ایک دفعہ کو ماضی کو بھول جائیں تو آزادی کے بعد کے اردو ہندی ادیبوں میں تو وصل کیا ہی جا سکتا ہے۔ ہم اردو ہندی کے ادیبوں اور ادیبوں کو اتنے قریب لائیں کہ بالآخر "من تو شدم، تو من شدی" کی خوشگوار مثال بن جائیں۔ جیسا کہ میں نے ہندوستانی سے متعلق اپنے مضمون میں کہا تھا جن لفظیات اور ادبی روایات میں زیادہ جان ہوگی وہ غالب ہو جائیں گی، جو تصنع آمیز ہیں وہ دب کر ختم ہو جائیں گی۔ اردو اور ہندی ادب بالکل ایک ہو سکتے ہیں۔ دوسری زبانوں کے ادب، ادبی روایات اور موضوعات کے معاملے میں نزدیک آکر "ہندوستانی ادب" میں اپنا حصہ ادا کریں۔

جو حضرات اردو ہندی زبان و ادب کے اتصال کے بارے میں میرے اس نقطہ سے اتفاق نہ کریں انھیں دیانت داری سے اس کا حق ہے۔ میں انھیں افتراقی یا علیحدگی پسند نہ کہوں گا۔ لیکن میں ان سے یہ ضرور چاہوں گا کہ مجھے بھی اپنے عقیدے پر قائم رہنے کا حق دیں۔

اب میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے خطبے کے دوسرے حصے کو لیتا ہوں کہ یہ بے ننگ و نام جس تھالی میں کھاتے ہیں اسی میں چھید کرتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ ایک پر تکلف خطبے میں ایک زندہ معاصر کا نام لے کر اس لہجے میں ذاتیات پر اتر آئے۔ کسی رسالے کا مناظرانہ مضمون ہوتا تو دوسری بات تھی۔ اپنی صفائی میں مجھے بھی ذاتی معاملات افشا کرنے کی اجازت دیجئے۔

میرا جو ملازمتی منصب ہے وہ مجھے نہ کسی نے طشت میں رکھ کر پیش کیا، نہ غیر مستحق طور پر کسی کی کوشش سفارش کے طفیل ملا ہے۔ میں نے جون ۱۹۴۷ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں ڈی فل کا مقالہ داخل کیا جس پر کچھ مہینوں کے بعد ڈگری مل گئی۔ اس وقت تک ہندوستانی یونیورسٹیوں میں اردو کے آٹھ نو ڈاکٹریٹ ہوئے تھے۔ اپنا مقالہ داخل کرنے کے بعد میں نے الہ آباد یونیورسٹی میں لیکچرر کی جگہ کے لئے درخواست دی۔ اس زمانے میں الہ آباد میں لیکچرر کے انتخاب کے لئے انٹرویو نہیں ہوتا تھا۔ محض درخواست دیکھ کر فیصلہ کیا جاتا تھا میں منتخب نہ ہوا۔ مسیح الزماں لئے گئے۔ دو ایک سال بعد الہ آباد سے ایک عارضی لیکچررشپ مشتہر ہوئی۔ میں اپنی ڈاکٹری کے باوجود منتخب نہ ہوا۔ نجم الدین نقوی لئے گئے۔ بعد میں انھوں نے اس جگہ کو عارضی دیکھ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر بھی مجھے منتخب نہ کر کے ثامن عباسی کو لیا گیا۔ یہ عارضی جگہ کسی کی چھٹی کے عوض میں تھی، بعد میں سوخت کر دی گئی۔

دربدرے ناکامی اور تین سال کی بے روزگاری کے بعد

میں سرکاری حمیدیہ کالج بھوپال میں ۱۵۰ تا ۲۵۰ کے گریڈ میں دوسو روپئے مشاہرے پر ڈگری کالج لیکچرر ہوگیا۔ بعد میں مدت سبق سے اس گریڈ کو ۲۰۰ تا ۵۰۰ کردیاگیا۔ بھوپال اور مدھیہ پردلیش کے سرکاری کالجوں میں قاعدہ ہے کہ ڈگری کالج لیکچرر سے اوپر کے عہدوں یعنی پوسٹ گریجویٹ کالج پرنسپل تک محض سینیرٹی کے بل پر خود بخود ترقی دی جاتی ہے۔ ۱۹۵۶ء میں ایم اے کی جماعتیں کھلنے پر میں کالج پروفیسر ہوگیا جو یونیورسٹی ریڈر کے برابر کا عہدہ ہے۔ دو تین سال بعد مجھے ڈگری کالج پرنسپل مقرر کیاگیا لیکن میں نے معذرت کرلی۔

میں کالج سے یونیورسٹی میں داخل ہونے کی کوشش کرتا رہا۔ کئی ناکامیوں کے بعد ۱۹۶۵ء میں جموں یونیورسٹی میں پروفیسر منتخب ہوگیا۔ میں انٹرویو دینے نہیں گیا تھا لیکن لے لیاگیا۔ یہ ایک نئی یونیورسٹی تھی اس لئے منتخب ہوگیا۔ کوئی پرانی یونیورسٹی اور پرانا شعبہ ہوتا تو مجھے کون گھسنے دیتا۔ چونکہ جموں وکشمیر میں ریاست سے باہر والوں کو شہریت کے حقوق نہیں ملتے اس لئے میں نے وہاں سے نکلنے کے لئے کوشش کی۔ دو چھ ناکامی کے بعد الہ آباد یونیورسٹی میں لے لیاگیا۔ وجہ یہ تھی کہ شعبے میں کوئی ریڈر نہ تھا۔ دو لیکچرر امیدوار تھے انھوں نے ریڈری اور پروفیسری دونوں کے لئے درخواست دی تھی۔ لیکچرر سے براہ راست پروفیسر بنانا غیر معمولی بات ہوتی۔ اس لئے مجھے آنے دیاگیا۔ اگر شعبے میں پہلے سے کوئی ریڈر موجود ہوتا تو مجھے داخلہ نہ ملتا۔ حیدرآباد میں اس وقت اپنی مرضی کے خلاف منتقل ہوا۔

اردو کی کھالی سے تنخواہ کے علاوہ کچھ انعاموں کی مالی غذا بھی ملتی ہے۔ اس میں میری کوشش کو دخل نہیں۔ میں نے کبھی انعام کے لئے کتاب داخل نہیں کی۔ اپنے کسی چھوٹے بڑے انعام کے لئے کوئی [illegible] کوشش نہیں کی کسی سے کہا ہو تو وہ [illegible] مجھے [illegible] سے زیادہ پانچ ہزار روپئے کا انعام ملا ہے جو میرے استحقاق سے زیادہ ہے۔ یہ انعام کسی کتاب پر ملے ہیں، مجموعی خدمات پر نہیں۔ ملک میں آج تک بمشکل سو پچاس آدمی تو ہوں گے جنہیں اردو کا دس ہزار یا اس سے زیادہ کا انعام ملا ہے۔ میں نے دو سال پہلے ایک شعر کہا تھا۔

خود سے مل جائے گا جو کچھ وہ دل وجاں سے قبول
کسی خلعت کے لئے ہاتھ نہ پھیلاؤں گا

اگر میں نے اردو کی کھالی میں کھایا ہے تو اسی قدر واپس بھی کیا ہے۔ میں نے ۳۹ نسلوں کو اردو پڑھائی ہے اور اگر یہ دیکھا جائے کہ بہ یک وقت دو ڈگری کلاسوں کو پڑھایا ہے تو ان نسلوں کی تعداد دوگنی ہوجاتی ہے۔ بھوپال جموں اور حیدرآباد میں اردو کے تین پوسٹ گریجویٹ شعبے قائم کئے ہیں۔ ایم اے اور پی ایچ ڈی کے کئی مقالے لکھائے ہیں۔ خود بھی، بری بھلی بہت سی کتابیں اور مضامین لکھے ہیں

اپنے خطبے میں مسعود صاحب کہتے ہیں۔

" اردو کے ایک غیر مسلم [illegible]
ایک بار صفائی سے [illegible]
کی زبان ہے۔ تہذیبی زبان نہیں ہے۔"

ڈاکٹر محمد حسن نے مجھ سے کہا کہ یہ اشارہ بھی میری طرف ہے۔ مجھے یقین نہ آیا۔ اردو میں چار اور غیر مسلم پروفیسر ہیں۔ اگر مسعود صاحب میرا قول نقل کرتے تو میرا نام درج کرنے میں کیوں تامل کرتے۔ جبکہ اس سے پہلے وہ اور زیادہ درشت الفاظ میں لکھ چکے ہیں۔ اگر میں نے کبھی ان سے ایسی بات کہی بھی ہوگی تو ان الفاظ میں نہیں۔ میں پیشے کی زبان، تہذیبی زبان، غیر تہذیبی زبان جیسی باریکیوں کا ماہر نہیں۔ صرف مادری زبان یا بول چال کی زبان کو جانتا ہوں۔ پیشے کی زبان کی اصطلاح میرے لئے نئی ہے۔ اردو میری محض پیشے (روزگار) کی زبان

نہیں۔ پیشے میں آنے سے بہت پہلے میری اردو سے یاد اللہ ہو چکی تھی۔ چار پانچ برس کی عمر میں تعلیم کا آغاز اردو سے کیا۔ ۴۷ء سے ۵۰ء تک بے روزگاری کے زور میں کثرت سے ہندو پاک کے معیاری رسالوں میں مضامین لکھے۔ چند ماہ بعد ملازمت چھوڑنے کے بعد بھی اردو میں لکھتا رہوں گا۔ پھر اردو میری محض پیشے کی زبان کیونکر ہوئی۔ ہاں یہ ڈاکٹر مسعود خاں کے پیشے کی زبان ہو سکتی ہے۔ اپنی خود نوشت میں لکھتے ہیں۔

"اردو کو میں نے پیشے کے طور پر اختیار کیا تھا، اب وہ میرا مقدر بن گئی"

(ورود مسعود، ص ۲۱۷)

ممکن ہے کبھی میں نے یہ کہا ہو کہ اردو ہندوؤں کی مذہبی زبان نہیں اور یہ اس لئے کہ سنسکرت کے بعد ہندوؤں کے بھجن، مذہبی دعائیں، اوراد عبادات ہندی میں ہوتے ہیں اردو میں نہیں۔ تہذیبی زبان کی بات میں نہیں کہہ سکتا۔ میں اردو تہذیب، ہندی تہذیب، عربی تہذیب وغیرہ کا قائل نہیں۔ اردو تہذیب کی اصطلاح کا استعمال اردو والوں کے آداب و خوش وضعی کے معنی میں کیا جائے تو کوئی اعتراض نہیں۔ کسی کی کلچر کا تعلق خاص طور سے تین عوامل سے ہوتا ہے۔ علاقہ، مذہب اور زبان، محض زبان سے نہیں ہوتا۔ بعض اوقات نسل بھی اثر انداز ہوتی ہے مثلاً امریکہ کے سیاہ فاموں کی کلچر اپنے گورے ہم وطنوں سے علاقے، مذہب اور زبان کے اشتراک کے باوجود، مختلف ہے، میری ذہنی افتاد میں دو زبانوں نے حصہ لیا ہے۔ اردو اور انگریزی نے۔ محض اردو نے نہیں۔ بہر حال میں کبھی تہذیبی زبان کی اصطلاح استعمال نہیں کر سکتا۔

اپنی ذات کم صفات کے بارے میں اس شرح و بسط سے لکھنے پر مجبور ہوں اور قارئین سے معذرت کا خواستگار ہوں۔ ▭▭

قیصر زماں

نئی غزل، نئی آوازیں

"غزل اردو شاعری کی آبرو ہے" اور "غزل نیم وحشی صنفِ سخن ہے"۔ اردو غزل سے متعلق یہ متضاد آرار بہت معروف و مقبول ہیں۔ لیکن اردو غزل کو پورے سیاق و سباق تہذیب و کلچر کے تناظر میں دیکھنے کی مخلصانہ کوشش ہمارے نقادوں نے کم ہی کیا ہے۔ جدید شاعری کا ایک اہم نام اسعد بدایونی کا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب "نئی غزل، نئی آوازیں" میں نئی غزل کو جدید شاعری کے پس منظر میں دیکھنے کی مخلصانہ کوشش کی ہے۔

نئی غزل یا جدید غزل سے متعلق جو سوالات ایک فن کار کے ذہن میں ابھرے ہیں۔ نئی غزل، نئی آوازیں انہیں سوالات کے اشاریہ ہیں۔

اس مجموعے میں غزل سے متعلق پانچ مضامین —— جدید اردو غزل اور اس کی روایت ' نئی غزل کا مزاج، نئی غزل میں اسالیب کا تنوع، آٹھویں دہائی کی غزل اور نئی غزل، نئی آوازیں، شامل ہیں۔ بقیہ دو مضمون - وزیر آغا کی غزلیں اور عرفان صدیقی کی غزلیں کے مطالعے کے طور پر لکھے گئے ہیں۔ کتاب کے شروع میں اسعد بدایونی نے لکھا ہے کہ۔

"اردو میں جدیدیت کے رجحان یا تحریک کی ابتدا کے ساتھ جدید غزل کے حوالے سے بھی بہت سی تحریریں سامنے آئی ہیں۔ جن کے ذریعہ اس رجحان یا تحریک کے زیر اثر لکھے جانے والے غزل کی تحسین اور اس کی تعیین قدر کا مقام خاصا آسان ہوگیا ہے، ترقی پسند تحریک کے دورِ عروج میں غزل جس اعزاز اور وقار سے محروم ہوگئیں تھی، جدیدیت کے زیرِ اثر اسے وہ منصب و مرتبہ اور مقبولیت دوبارہ حاصل ہوگئی ..... اس تحریک یا رجحان کے طفیل اردو غزل کو جو بیش بہا فائدہ پہنچا ہے۔ وہ باعثِ اطمینان ہے۔"

جدید اردو غزل کی روایت، نئی غزل کا مزاج اور نئی غزل میں اسالیب کا تنوع، تینوں مضامین میں ربط و تسلسل کو برقرار رکھا گیا ہے یا اس کی شعوری کوشش ہے، جس سے جدید غزل کے خدوخال کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اردو میں جدیدیت کے رجحان کے ساتھ ساتھ اسلوبیات - لسانی تبدیلی، شعری زبان، استعارہ اور شعری تجرید جیسے مسائل پر نئے انداز سے غور کیا

کیا گیا۔ اسعد کا خیال ہے کہ " جدید غزل کی دو روایتیں ابھر کر سامنے آئی ہیں۔ ایک میر اور دوسری غالب کی روایت۔ چھٹی دہائی کی شاعری فرد کے معاشرتی رشتوں کے بازیافت کے بعد میر سے لاتعلق ہوگئیں۔ ساتویں دہائی نے ایک بار پھر پیش رو نسل سے رخصت لی اور نئے ذہن کے ساتھ نئی غزل کی طرف پیش رفت کی۔ نئی نسل روایت سے وابستہ بھی ہے اور پیوستہ بھی۔" جدید اردو غزل کے سلسلے میں یہ خیالات تو درست ہیں لیکن جدید غزل پہ جدید شاعری کی روایت ہی دوسرے عوامل بھی کارفرما رہے ہیں۔ مثلاً انکشاف ذات، جنسی حقیقت نگاری، ان عوامل پر بھی روشنی ڈالی جاتی تو جدید شاعری کا بھر پور اور اچھا مطالعہ ہوتا۔ نئی غزل کے مزاج کے متعلق کہتے ہیں "جب [illegible] گیا جو ۴۷ء کے آس پاس شہر غزل میں پھیلا تھا۔ ۴۷ء کے بعد جو نسل سامنے آئی اس نے غزل کے جسم میں نیا خون اور نئی توانائی داخل کی (اس نسل سے اسعد بدایونی کا بھی تعلق ہے) میراجی کی شاعری کے متعلق ان کا خیال ہے کہ۔

" کچھ معتبر ناقدین کا خیال ہے کہ نئی شاعری کی اساس میراجی کی شاعری ہے۔ میراجی حالاں کہ بیشتر شاعری نظم میں کی ہے ...... اس سلسلے میں میری ناقص رائے یہ ہے کہ میراجی کی جنسی نظمیں ناآسودگی اور نفسیاتی الجھنوں کے سبب ظہور میں آئی ہیں ان کے یہاں جنس کا اظہار بھی انہیں محرومی اور ناآسودگی کے روپ میں ہوا ہے۔ انہوں نے "استلذاذ بالنفس" تک کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ مگر کیا یہ شاعری ایک مثبت ذہن کی شاعری ہو سکتی ہے۔ نئی غزل کا مزاج جنس کے سلسلے میں میراجی سے مختلف ہے۔ یہاں بھر پور آسودگی کی خواہش اور اس سے حاصل ہونے والی طمانیت بھی نظر آتی ہے۔ جب کہ میراجی کے یہاں اس کا فقدان ہے۔" (نئی غزل کا مزاج صفحہ ۳۵)

میراجی کی شاعری کے سلسلے میں جنسی ذہنی ناآسودگی نفسیاتی الجھن استلذاذ بالنفس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ میراجی کی شاعری کے سلسلے میں متنازعہ خیال ہے۔ اسعد بدایونی کو اندازہ نہیں کہ جدیدیت میں جنسی حقیقت نگاری کی کئی سطحیں ہیں۔ میراجی کی شاعری کے سلسلے میں ترقی پسندوں کا جو رویہ رہا ہے۔ نئی غزل کا مصنف بھی اس سے الگ نہیں۔ دراصل میں میراجی کی شاعری کا ناقص مطالعہ کرنے والوں نے ان کی شاعری کو "کوک شاستر" تک کہہ ڈالا ہے۔ لیکن یہ کہنے والے زرا ٹھہر کر دیکھ لیتے کہ میراجی کیا کہتے نظر آتے ہیں۔

" مشاہدہ کے لحاظ سے گرچہ بہ حیثیت مجموعی زندگی کی ہر پہلو کی طرف میری تجسس نے مجھے راغب کیا۔ لیکن موجودہ صدی کی بین الاقوامی کشمکش (سیاسی، سماجی اور اقتصادی) نے جو انتشار نوجوانوں میں پیدا کر دیا وہ بالخصوص میرا مرکز نظر رہا ہے۔ اور آگے چل کر جدید نفسیات نے اس تمام پریشان حالی کو جنسی رنگ دے دیا۔"

(میراجی شخصیت اور فن)

اس کے علاوہ ـــــ " اکثریت کے لئے میری باتیں اگر اجنبیت لئے ہوئے ہوں تو اس میں تعجب ہی کیا ہے۔ میں اگر چاہوں کہ نظمیں لکھنے کے بجائے آسانی اور آسائش کی زندگی بسر کروں، گھر بار بسا لوں، بیوی مہیا کر لوں، بچے پیدا کر لوں تو مجھے وقت کے دو گھیروں سے نکلنا پڑے گا۔ مگر اکثریت چاہے کہ اپنے بیوی بچوں اور گھر بار کی دلکشی سے ہٹ کر میری نظموں کو آسانی اور آسائش سے سمجھ سکے تو اسے تین گھیروں کی حد بندی دور کرنی ہوگی۔ اکثریت کی نظمیں الگ ہیں۔ میری نظمیں الگ ہیں۔ اور چونکہ زندگی کا اصول ہے کہ دنیا کی ہر بات ہر شخص کے لئے نہیں ہوتی۔ اس لئے یوں سمجھئے کہ میری نظمیں بھی صرف انہیں لوگوں کے لئے ہیں جو انہیں سمجھنے کے اہل ہوں۔ یا سمجھنا چاہتے ہوں اور اس کے لئے کوشش کرتے ہوں۔"

(ادب، کلچر اور مسائل صفحہ ۲۴۶)

اب اگر ان دونوں اقتباسات کو پڑھئے تو میرا جی کی شاعری کو پڑھنے میں آسانی ہوگی، اور اگر کوئی اپنے نظریات کے مطابق میرا جی کی شاعری پر رائے قائم کرتا ہے تو انہیں الجھنوں سامان کرنا پڑتا ہے۔ میرا جی کی شاعری کو پڑھتے وقت ان کی شاعری اور شخصیت کے پورے سیاق و سباق کو دیکھنا بھی لازمی ہے۔ اس کے علاوہ اپنی شاعری کے متعلق میرا جی نے جو باتیں بیان ہیں انہیں بھی سامنے رکھنا ہوگی، ورنہ دعویٰ بغیر دلیل خیال کا فساد ہوتا ہے۔

نئی غزل میں اسالیب کا تنوع ـــــ "میر، سودا اور غالب کے اثرات نئی غزل پر پڑے اس کے علاوہ موضوعات کے اعتبار سے جدید شاعروں نے نئی شعری زبان اور اصطلاحات وضع کئے جن کے سبب اس اسالیب کا تنوع پیدا ہوا۔"

آٹھویں دہائی کی غزل سے متعلق لکھتے ہیں کہ اس نسل کا بڑا حصہ تقلیدی طرز فکر کی نذر ہو جائے گی۔ اور بہت کم آوازیں آئندہ نسل پر اثر انداز ہوں گی۔ نئی غزل نئی آوازیں اس مضمون میں ۱۹۶۰ء کے بعد ابھرنے والے غزل گو شعراء کی ایک نامکمل فہرست سازی ہے۔ اور ان کی غزلوں پر مصنف کے اپنے تاثرات ہیں۔

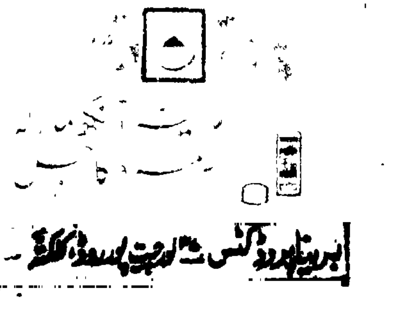
وزیر آغا کی غزلیں ـــــ ایک خوبصورت مضمون ہے۔ وزیر آغا کو بحیثیت غزل گو پیش کیا گیا ہے۔ اور یہ خیال بھی کہ ـــــ وزیر آغا کو اردو شاعری میں نظم نگار کی حیثیت سے ایک اہم مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ ان کی غزل کے مطالعے سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ وزیر آغا کی غزلوں میں تسلسل و تکمیل کی جو فضا ملتی ہے یہ اس بات کا اشاریہ ہیں کہ غزلوں کی فضا نظم سے غزل کی طرف مراجعت کی مثال ہے۔

'آخری مضمون ـــــ عرفان صدیقی کی غزلیں ہیں' عرفان صدیقی کی غزلوں کے سلسلے میں چند قابل ذکر باتیں یہ ہیں۔

عرفان صدیقی ایسے ہی فنکاروں میں ایک ہیں جنہوں نے فطرت کی جملہ نیرنگیوں کو کیا ہے اور حیرتوں کے بے شمار چراغ جلائے ہیں۔ عرفان صدیقی کی غزل اپنے زمانے کا سچا اور کھرا اعلامیہ بن کر ابھرتی ہے، عرفان صدیقی کی شعری کائنات کا احاطہ اگر چند لفظوں میں کرنے کی کوشش کی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ گمشدہ تہذیب و ثقافت کی بازآفرینی اور حال سے بھی رابطے کی کوشش کے شاعر ہیں۔

نئی غزل، نئی آوازیں میں تمام مضامین تشنگی کے شکار نظر آتے ہیں۔ اختلافات کی بھی بڑی گنجائش ہے۔ لیکن پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ یہ ایک فنکار کی مخلصانہ کوشش ہے۔ اگر نئی غزل، نئی آوازیں کا مصنف تھوڑے نظم و ضبط اور جدید شاعری کے بھرپور مطالعے کے بعد قلم اٹھاتے تو نئی غزل کے سلسلے میں اچھے اور بھرپور مضامین سامنے آتے۔ نئی شاعری کے مصنف سے توقعات بہرحال کر سکتے ہیں کہ آئندہ ان کے مضامین اس کمی کو پورا کرے گا۔

▭▭



آپ کے کنبے میں جب بھی کوئی

پیدائش

یا

موت

ہو تو اسے مقامی اندراج دفتر میں

درج ضرور کرائیں

یہ معاون ہوتا ہے

پیدائش کا سرٹیفکیٹ عمر کا سرٹیفکیٹ ہوتا ہے:

- اسکول میں داخلے
- نوکری حاصل کرنے
- ووٹ کے حق
- ڈرائیونگ لائسنس
- پاسپورٹ لینے کے لئے
- بیمہ پالیسی کے لئے

موت کے سرٹیفکیٹ کی ضرورت ہوتی ہے

- موروثی جائیداد
- بیمے کی رقم
- جائیداد میں حصے کا تصفیہ کرانے کے لئے

اندراج بروقت کرانے

اور سرٹیفکیٹ بلا معاوضہ حاصل کیجئے

پیدائش اور موت کا اندراج کرانا قانوناً لازمی ہے

تاخیر سے کئے گئے رجسٹریشن بھی قابل قبول ہوں گے۔

رجسٹرار جنرل، انڈیا

رؤف خیر

فالو آن

وہ بہو تھی روایتی
اکثر ساس جوتیاں بھی کھاتی تھی
جھڑکیاں بھی خسر کی سہتی تھی
اور شوہر سے کچھ نہ کہتی تھی

جبکہ اب ساس بن چکی ہے وہ
صبح اٹھ کر نماز پڑھتی ہے
گھر کے سب کام کاج کرتی ہے
چابیاں اپنی بہو کے ہاتھ میں ہیں
اور بیٹا ہے تاش کے گھر میں

٭

والدہ مرحومہ کے نام

کسی نے شاخ لگا لی ہے اپنے آنگن میں
کسی نے پھول چنے ہیں کسی نے پھل چکھے
کسی نے چھال سے تیری بنا لیا صندل
کسی کسی نے تو پتوں سے گھر سجا ڈالا

تجھے خبر تھی کہ میں ایسا اک مسافر تھا
گھنی گھنی تیری چھاؤں میں بیٹھ جاتا تھا
کہ تیری چھاؤں ہی زادِ سفر تھی میرے لئے

کڑی ہے دھوپ کٹا بھی ابھی سفر ہی نہیں
کہاں رکوں؟ مرے رستے میں اب شجر ہی نہیں

٭

شاپنگ

بے شک تھی شاہکار، گلہری میں کیا سو
گڑیا نہ لی کہ وہ تو فقط خوش لباس
تصویر بولتی سہی تصویر ہی تو تھی

چینی کا تاج خوب تھا، نایاب پائیدار تھا
تھا بادشاہِ وقت مگر ہاتھی دانت کا
کیا کھنکھناتا جسم تھا جو ٹوٹتا رہا

بازار کا جو مال تھا جی کو نہیں لگا
کچھ دیر اور جیب میں سکہ پڑا رہا

پھر یوں ہوا کہ خیر سے گھر لوٹتے ہوئے
آنکھیں خرید لیں کسی اندھے فقیر سے

رؤف خیر

ہمارے نام کا پردہ کہاں اٹھاتی ہے
اسی جگہ تو کہانی بدن چراتی ہے

ادھر ادھر کو بھٹکنے کبھی نہیں دیتی
وہ لو کہ خوش بدنی راستہ دکھاتی ہے

کوئی کتاب ہو بین السطور ہی پڑھیے
یہ راکھ وہ ہے جہاں آگ منہ چھپاتی ہے

یہ لوٹنا ہے کہ لٹنا ہے کہہ نہیں سکتے
خدا گواہ ترا حسن سومناتی ہے

خطاؤں سے تو اندھے کے تیر ہوتے ہیں
جہاں سے نیک گمانی فریب کھاتی ہے

کسی طرح سے سہی دن گزر ہی جاتا ہے
مگر وہ رات کہ جب امید ٹوٹ جاتی ہے

غلط سلط ہی کبھی فیصلے ہوئے ہم سے
مزاج اپنا ذرا غیر تجزیاتی ہے

انا کے ہاتھ میں تلوار ہے جو دو دھاری
کبھی کبھی تو خود اپنا لہو بہاتی ہے

کسی طرح تو کرائے کی علتوں سے بچے
نواحِ شہر میں اک گھر تو خیر ذاتی ہے

رؤف رحیم

ہم دیدہ و دل ہی سے پریشان رہے ہیں
اب تک بھی مگر ان کا کہا مان رہے ہیں

سولی پہ چڑھایا تو کبھی زہر پلایا
یہ جرم کے ہم حق کے نگہبان رہے ہیں

یادیں کبھی، آہیں کبھی آنسو کبھی نالے
جینے کے ہمارے یہی سامان رہے ہیں

سوکھے ہوئے ہونٹوں کی کوئی پیاس بجھا دے
جلتے ہوئے شعلوں کے یہ ارمان رہے ہیں

اس حسن جہاں سوز کو دیکھا نہیں شاید
قائم جو ابھی غیر کے اوسان رہے ہیں

صد حیف وہی آج بھی محروم ضیا ہیں
ظلمات سے جو دست و گریبان رہے ہیں

شاید ہمیں اس بھولنے والے نے کیا یاد
ہم خود سے پریشاں پریشان رہے ہیں

ہم دیکھیں گے کس طرح بھلا دے گا زمانہ
ہر دور میں جو وقت کی پہچان رہے ہیں

جو تم پہ گزرتی ہے رحیمؔ اس پہ نہ جاؤ
عشاق کم و بیش پریشان رہے ہیں

اویس احمد دوراںؔ

صبحِ نمود پر تری جلوہ گری رہے
اے زندگی یونہی تری محفل جمی رہے

روئے زمیں پہ کوئی دھماکہ نہ ہو کبھی
کوئل بہ طرزِ نغمہ یونہی کوکتی رہے

بلبل بھرے چمن میں بصد لطف انبساط
آئیں وہ دن کہ عارضِ گل چومتی رہے

وہ فتنہ گر ہے اسکی فسوں کاریاں نہ پوچھ
وہ چاہتا ہے روزِ قیامت مچی رہے

آرام جسم و جاں کیلئے سب ہیں بے قرار
اک تو کہ چاہتا ہے یونہی بے کلی رہے

جب تک جہاں میں صبحِ مسرت نہ ہو طلوع
دوراںؔ مرے قلم سے کرن پھوٹتی رہے

□□

پلکوں کی نوک تک مرے دل کا لہو نہ آئے
پھر آئی پچھلی رات کہیں یاد تو نہ آئے
ہرگز لبوں پہ نام کسی کا کبھو نہ آئے
اک تیری گفتگو کے سوا گفتگو نہ آئے
تنہا اداس، ہجر کی راتوں میں بار بار
تیرا خیال آئے مگر ہائے تو نہ آئے
ہاں میں تمام عمر یونہی تشنہ لب رہوں
تیرے بغیر میرے لبوں تک سبو نہ آئے
گو لاکھ اپنی غزلوں میں نرمی کو راہ دیں
دوراںؔ میاں کو میرؔ کا لہجہ کبھو نہ آئے

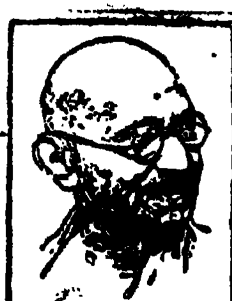
□□

شروَن کمار ورما

جاگ رہا ہوں خواب میں ہوں
میں بھی عجب عذاب میں ہوں
جیسے تو رکھ کر بھول گیا
میں بھی اُس گلاب میں ہوں
پتھر آئے تو یاد آیا
میں بھی کِس حساب میں ہوں
اکھڑ چکے ہیں پاؤں مرے
لگتا ہے سیلاب میں ہوں
بھولی ہوئی کہانی میں
بسرے ہوئے نصاب میں ہوں
پڑھتا کوئی نہیں مجھ کو
شاید غم کے باب میں ہوں

حسن نجمی سکندرپوری

خیال آوارہ و پریشاں، سکون دل کا لُٹا لُٹا سا
بھرے بھرے شہر آرزو میں، بس ایک میں ہوں بجھا بجھا سا
اداس گلیاں، خموش رستے، قدم قدم ایک ہُو کا عالم
جو راہ پیما ہے سہما سہما، تو راہزن بھی ڈرا ڈرا سا
یہی تو ہے کرب کا وہ عالم، جو انقلاب آفریں بنے گا
لبوں پہ نالے رکے رکے سے، پلک پہ آنسو تھما تھما سا
خرد کا آہستہ رو سفینہ لگے گا کس گھاٹ کون جانے
جو آگیا جوش میں کسی دن، جنوں کا دریا رُکا رُکا سا
دیئے جلائے ہیں کس نے الفت کے آج دیر و حرم میں نجمی
لرز اٹھا سارا شہر میرا، یہ حادثہ ہے نیا نیا سا



"سچی جمہوریت مرکز میں بیٹھے ہوئے بیس افراد کے ذریعہ نہیں چلائی جا سکتی۔ اسے نچلی سطح سے ہر گاؤں کے لوگوں کو چلانا ہوگا"

—— گاندھی جی

عوام کے لئے اختیارات

اہم خصوصیات





پنچایتی راج بل

- گاؤں، بلاک اور ضلعی سطحوں پر پنچایتیں قائم کرنا۔
- الیکشن کمیشن کی زیر نگرانی تینوں سطحوں پر تمام نشستوں کو براہ راست انتخاب کے ذریعے بھرنا۔
- پنچایت کے کام کرنے کی میعاد - 5 سال
  اگر کسی پنچایت کو اس میعاد سے پہلے منسوخ کیا جاتا ہے تو چھ ماہ کے اندر اس کی تشکیل نو کے لئے انتخاب کرانا۔
- درج فہرست [illegible] کے لئے ان کی آبادی کے تناسب سے نشستیں محفوظ کرنا۔
- خواتین کے لئے 30 فیصد نشستیں محفوظ کرنا۔
- پنچایتوں کا سماجی انصاف کے ساتھ ساتھ معاشی ترقی کے منصوبے تیار کرنا اور انہیں لاگو کرنا۔
- پنچایتوں کو اپنا کام چلانے کے لئے کافی فنڈس مہیا کرنا۔

نگرپالیکا بل

- تین قسم کی نگرپالیکائیں قائم کرنا: نگر پنچایتیں، میونسپل کونسلیں اور میونسپل کارپوریشنیں۔
- الیکشن کمیشن کے زیر نگرانی براہ راست انتخاب کرانا۔
- کام کرنے کی میعاد 5 سال۔
- اگر کسی بھی میونسپل تنظیم کو اس کے کام کرنے کی میعاد سے پہلے منسوخ کر دیا جاتا ہے تو انتخاب چھ ماہ کے اندر کرانا چاہئے۔
- وارڈ کمیٹیاں قائم کرنا تاکہ ان لوگوں کو جو عوامی خدمات کا جذبہ رکھتے ہیں اپنے علاقے کی خدمت کرنے کا موقع مل سکے۔
- مقامی تنظیموں کو موثر طریقے سے اختیارات کی منتقلی۔
- منصوبہ بندی کے عمل میں انہیں اہم رول ادا کرنے کا اختیار
- میونسپل تنظیموں کے لئے [illegible] مہیا کرنا۔

ترقی اور جمہوریت کو گھر گھر پہنچانے کے لئے ایک انقلابی قدم

آئینے

ریحانہ زیدی

اور جب کچا راستہ شروع ہوا تو اس نے اٹھ کر باہر دیکھنے کی بھی زحمت نہ کی اسے خود بخود احساس ہو گیا تھا کہ اب تاج کے گاؤں کا راستہ شروع ہو چکا ہے۔ کیونکہ ریتیلی مٹی کے ذرات اس کے پیور شیفون کے دوپٹہ میں سے چھن چھن کر اس کے چہرے پر جم رہے تھے۔

دوسرے جیپ کے ہچکولوں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اگر اس نے کونے میں رکھے جری کین میں پیر نہ اڑائے ہوتے تو جیپ کی اس اچک پھاند میں ضرور گر پڑتی یا پھر جری کین خود ہی اچھل کر اس پر آن پڑتا۔

سو گئیں کیا، تاج نے گردن موڑ کر پوچھا۔

توبہ کرو جیپ نے جسم کی ساری چولیں ڈھیلی کر دی ہیں۔ اور تم سونے کی بات کرتے ہو۔ وہ منہ پھاڑ کر جماہی لیتے ہوئے بولی۔

"اب سمجھو۔ تم ہی کو بڑا شوق تھا گاؤں کی رومانی سحر آلود فضا دیکھنے کا۔ رومان تو راستے میں نکل گیا ہوگا بقیہ سحر آلودگی کا پتہ گاؤں پہنچ کر چل جائے گا۔ تاج اسے چڑانے کے انداز میں بولا۔

"نہیں بھئی میں تو ذرا بھی بور نہیں ہوئی۔ بس ذرا جیپ نے گڑبڑ کر دی۔ اگر کار ہوتی تو شاید اتنی تکلیف نہ ہوتی۔" وہ دھم سے دوبارہ پچھلی سیٹ پر بنائے ہوئے بستر پر لیٹ کر بولی۔

ہاں ہاں۔ ابھی بس ذرا کار کی ضرورت محسوس ہوئی ہے گاؤں چل کر بس ذرا لائٹ، بس ذرا پائپ۔ بس ذرا گوبر کی جگہ پرفیومز۔

"اونہہ تنگ کر دیا تم نے تو۔ بینا نے شور مچا کر اس کی بات کاٹ دی تو تاج قہقہہ لگانے لگا۔

"اب اور کتنا راستہ ہے؟"

تھوڑی دیر بعد بینا واقعی بیزار ہو گئی

"تقریباً تین گھنٹے لگ جائیں گے۔" تاج نے شرارت سے کہا جیسے بینا واقعی سچ سمجھی اور لمبا سانس لے کر رہ گئی۔ عین اسی وقت جیپ ایک دھچکے سے رک گئی۔

"اب کیا ہوا۔" بینا نے گردن اٹھا کر دیکھا۔

یہ سرخ اینٹوں سے بنی قدیم طرز کی حویلی تھی جس کے آگے گاڑی کھڑی کر کے تاج ہونٹ دبائے مسکرا رہا تھا۔

"بڑے بے ایمان ہو تم۔" بینا نے پیچھے سے اس کی گردن دبائی

ارے.... ارے کیا کرتی ہو۔ اگر ہمارے گھر کی کسی خاتون نے دیکھ لیا تو کفر کا فتویٰ دائر کر دیں گی۔ اس حویلی میں شوہر کو خدا کے بعد ساری عظمت دی جاتی ہے۔" تاج نے دونوں ہاتھ پیچھے کر کے

بینا کے بال پکڑ لئے۔

"پھر کیوں ہوتی کسی حویلی والی لڑکی سے شادی۔" بینا نے بال چھڑاتے ہوئے اس کے ایک دھپ لگائی۔

"کیا کریں تم ہو ہی دسترس کر دینے والی شخصیت۔ تمہارے بنا تو ہم جنت بھی قبول نہ کریں۔" تاج ہارن بجاتے ہوئے بولا۔

اس کے ہارن کی آواز سے چوکیدار نے باہر نکل کر پہلے غور سے تاج کو دیکھا پھر بڑا پھاٹک کھول دیا۔

تاج تیزی سے جیپ برآمدے کے نزدیک لے گیا۔

"احتیاط اوڑھ کر اترنا۔" اس نے دروازہ کھول کر آہستہ سے بینا سے کہا۔ بینا نے جسم کے ساتھ ساتھ آدھے سے زیادہ چہرہ کو بھی چادر میں چھپا لیا۔ اور اس کے پیچھے چل دی۔

راہداری پار کر کے یہ لوگ بڑے سے کمرے میں پہنچے۔

"جیجی.... ادتی.... ماسی.... ارے کوئی ہے۔"

دیکھو تو سہی کون آیا ہے؟

تاج نے زوردار نعرہ لگایا

کمرے میں کھلنے والے مختلف دروازوں سے کئی خواتین اندر آگئیں۔

"بھابی!"

ایک پیارے نقوش والی لڑکی بینا سے لپٹ گئی۔

"یہ میری چھوٹی بہن سوہنی ہے۔"

تاج نے تعارف کرایا۔

یہ چاچی ہیں

وہ ماسی ہیں

ان کے برابر جیجی ہیں۔ چاچی کی بیٹی۔

جیجی کے پیچھے ادتی ہیں۔ ماسی کی اکلوتی بیٹی اور میری بڑی بھابی۔

بینا سب کو آداب کرتے ہوئے گلے ملتی رہی۔

"تھوڑا سا آرام کر لو پھر سارے گھر کی سیر کراؤں گا۔"

"سوہنو۔ ہمارا کمرہ صاف ہے؟" تاج نے چھوٹی بہن سے پوچھا۔

"فون آنے پر رات ہی کو صاف کروا دیا تھا۔"

بینا تاج کی راہنمائی میں کمرے میں آگئی۔

چائے پی کر اٹھے تو شام ہو گئی

"آؤ پہلے گھر دکھا دوں ورنہ اندھیرا بڑھ جائے" ... نے بینا سے کہا۔

بینا ایک چھلانگ مار کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ تاج سے ... ہاتھ میں لے لیا۔ نچلی منزل کے تقریباً سب ہی کمرے مردوں ... مخصوص تھے، کچھ مہمان خانے تھے۔ دوسری منزل میں خوا... چند مخصوص کمرے تھے۔ بقیہ بیاہتا جوڑوں کو ملے ہوئے ... منزل کھلی ہوئی تھی ایک کونے میں چار کمروں اور برآمدے ... کچھ نہ تھا۔

"بینا ابھی تم بہت لوگوں سے ملی ہو۔ گھر کے مرد ... پر گئے ہوئے ہیں۔ خواتین نیچے ہیں اور یہاں تیسری منزل ... ایسی ہستی رہتی ہے جس نے سدا میرا انتظار کیا ہے چلو اس ...

تاج نے سوالیہ نظروں سے بینا کو دیکھا۔

"ہاں چلو، مگر ہے کون وہ؟" بینا نے حیران ہو ...

"میری بیوی تمہاری سوکن۔" تاج نے اطمینان سے ...

"کیا!!" بینا حلق پھاڑ کر چیخ پڑی۔

"ہاں۔ جب میں تین سال کا تھا تو میری شادی وا... نے ایک بیس سال کی لڑکی سے کر دی۔ وجہ یہ تھی کہ ہمارے ... میں لڑکیاں باہر نہیں دیتے۔ چاہے ساری عمر کنواری رہیں ... ساتھ بھی یہی ہوا۔ مگر یہ ایک جذباتی لڑکی تھی۔ میرے ... کا انتظار نہ کر سکی۔ ماسی کے ایک سسرالی رشتہ دار سے ... ہو گئی ان دونوں نے گھر سے بھاگ جانے کا منصوبہ بنایا"

وقت پر بھانڈا پھوٹ گیا۔ اس کے محبوب کو کھڑا کر کے گولی مار دی گئی۔ اور اس بے چاری کو اتنا پیٹا گیا کہ یہ ذہنی توازن کھو بیٹھی۔ اور جب سے یہ تیسری منزل پر قید ہے۔ اسے دوسری منزل پر بھی رکھا جا سکتا تھا مگر یہ رات کو اتنا شور مچاتی ہے کہ مردے بھی جاگ پڑیں۔"

تاج بینا کو آخری کمرے کے پاس لے آیا۔

"زینو۔" اس نے شمعدان آگے کر کے پکارا۔ ملگجے اندھیرے میں زینو بڑی خوفناک لگ رہی تھی۔

"عاقل کہاں ہے؟" زینو نے آہستہ سے پوچھا۔

"مجھے پہچانو زینو، میں تاج ہوں۔ یہ میری بیوی ہے بینا۔" تاج نے شمعدان بینا کے قریب کر کے کہا۔ زینو بہت غور سے بینا کو دیکھتی رہی۔

"عاقل کہاں ہے؟" اس نے دوبارہ پوچھا۔ "وہ مجھے لینے کیوں نہیں آیا۔ دیکھو میں نے تو ساری تیاریاں کر لی ہیں۔ زینو آہستہ آہستہ بڑبڑا رہی تھی۔

پھر زینو اچانک رو پڑی۔

"عاقل مر گیا۔ اسے گولی مار دی۔ مجھے بھی گولی مار دو۔ مار دونا۔

اس نے بڑی التجا سے تاج سے فریاد کی۔

"نہیں زینو مجھ میں اتنی طاقت کہاں ہے کہ تمہیں گولی مار دوں۔ اب تو تمہیں زندگی کے ہر لمحے سے موت تک گولیاں کھانی پڑیں گی۔" تاج نے گہری سانس لے کر کہا اور بینا کو لے کر واپس پلٹ آیا۔

"بینا جب میں چھوٹا سا تھا تو اپنے حصے کی روٹی زینو کو دے آتا تھا۔ اس زمانے میں دادا جان زندہ تھے ایک دن خبر لگنے پر انھوں نے میری خوب پٹائی کی اور اوپری منزل پر تالا ڈال کر اس دن سے چابیاں اپنے پاس رکھنے لگے۔ وہ تو شکر ہوا کہ اللہ میاں نے مجھ پر رحم کھا کر دادا جان کو اپنے پاس بلا لیا ورنہ دادا جان نے زینو کے بعد تجھی کی شادی مجھ سے کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔"

"کیا!؟" بینا پھر چیخ پڑی تھی۔

"ہاں۔ دادا جان کے مرنے کے بعد تجھی نے خود ہی شادی سے انکار کر دیا۔ یہ زینو سے تین سال بڑی ہیں۔"

"تو۔ تو ابھی تک ان کی بھی شادی نہیں ہوئی ہے۔" بینا نے تھوک نگل کر پوچھا۔

"نہیں۔ ہمارے گھر میں خوش نصیب صرف سوہنی ہے جسے ہم عمر شوہر ملا ہے۔ ورنہ میری بھابی بھی بھیا سے دس سال بڑی ہیں۔" تاج کے جواب پر بینا سر پکڑ کے بستر پر گر پڑی۔ اسے کیا خبر تھی کہ وہ ماحول جسے وہ شہر میں رہ کر بڑا سحر آلود اور رومانٹک تصور کیا کرتی تھی۔ اندر سے اتنا کھوکھلا اور زہر آلود نکلے گا۔

صبح تاج تو زمینوں پر چلا گیا۔ بینا سارے گھر میں چکر پھیریاں کاٹتی رہی اور جب دوپہر کو وہ اپنے کمرے میں آئی تو اس کی ٹھنڈک محسوس کر کے ایکا ایکی زینو کا خیال آ گیا۔ آس پاس کوئی نہ تھا۔ بینا دبے پاؤں اوپر چلی آئی۔ اوپر بڑی تپش تھی۔ کونے میں پڑے شیڈ دار کمرے میں زینو اکڑوں پاؤں بیٹھی نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔

"زینو؟" بینا نے آہستہ سے پکارا۔

زینو ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

تم یہاں کیوں آئیں؟ اس نے بوکھلا کر پوچھا۔

"اپنی بہن سے ملنے؟" بینا نے بہت پیار سے کہا۔

"ہاں کیوں نہیں۔ تم میری بہن ہو۔ ہم دونوں مسلمان ہیں۔ پھر ایک ہی شوہر کی بیویاں ہیں۔ میرا شوہر تمہاری بہت عزت کرتا ہے پھر میں تم سے نفرت کیوں کروں۔ بینا نے پیار سے کہا۔

تم کیسی باتیں کرتی ہو، میری سمجھ میں نہیں آتا؟ زینو سر پہ آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

اس وقت سیڑھیوں پر آہٹ ہوئی بینا نے پلٹ کر دیکھا۔ یہ تاج تھا۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ میں سارے گھر میں ڈھونڈ آیا"
سو نے بے ساختہ بینا کی کمر میں باہیں ڈال دیں۔

"میں زینو آپا سے باتیں کر رہی تھی" بینا نے اطمینان سے کہا۔ اور زینو سے بولی۔ "اچھا زینو آپا پھر آؤں گی۔" بینا زینو کو خدا حافظ کہتی ہوئی تاج کے ساتھ نیچے آگئی۔

نہ جانے کیوں تاج نے اس سلسلے پر بینا سے بالکل بات نہ کی۔ دوسرے دن بینا گھر کی دیگر خواتین کے ساتھ کھیتوں کی سیر کو گئی باوجود بے تحاشہ غلاظت کے اسے کھیتوں کا پرسکون ماحول بے حد پسند آیا۔ رات گئے جب یہ لوگ واپس ہوئے تو پتہ چلا تاج بیج لینے منڈی گیا ہوا ہے اور صبح تک آسکے گا اسے تاج بنا گھر کا ماحول بہت اداس لگا چنانچہ پر دیر تک اداس نغمے سننے کے بعد وہ شمع دان کی شمعیں بجھا کر سو گئی۔

ابھی سوئے ہوئے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ اسے احساس ہوا تاج اس پر جھکا ہوا ہے۔

"تم آگئے تاج میں تمہارے بنا اداس ہو گئی تھی" اس نے نیم وا آنکھوں کے ساتھ ہاتھ آگے بڑھائے۔

مگر ایک انجانے خوف سے وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کی انگلیاں کسی کی مونچھوں سے ٹکرائی تھیں۔ اور تاج مونچھیں نہیں رکھتا تھا۔ یہی احساس لمحہ بھر میں اس کے شعور کو جگا گیا۔ وہ اپنے اوپر جھکے ہوئے انسان کو پرے دھکیل کر مسہری کے دوسری طرف کود گئی۔ اس کی گھٹی گھٹی چیخ نے برابر کے کمرے میں سوئی ہوئی سوہنی کو جگا دیا۔ اس سے پہلے کہ قیامت کا کوئی اور لمحہ گزرتا۔ برآمدے میں کھلنے والے دروازے سے سوہنی شمعدان اٹھائے اندر چلی آئی۔

بینا نے دیکھا کہ تاج سے ملتا جلتا کوئی انسان تھا۔ ایک نظر سوہنی اور دوسری نظر بینا پر ڈال کر وہ پچھلے دروازے سے چپ چاپ چلا گیا۔ بینا دوڑتی ہوئی دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی ہو گئی

"یہ کون تھا سوہنی؟" بینا نے خوفزدہ آواز میں پوچھا

"تمہارے جیٹھ میرے بڑے بھائی" سوہنی نے گہرے سانسوں کے درمیان جواب دیا۔

"کیا!" بینا آنکھیں پھاڑ کر رہ گئی

"ہاں بھابی۔ یہ میرے بھائی شادی کے پہلے سال تو بہت شریف رہے مگر اس کے بعد اپنے سے دس سال بڑی بیوی سے سمجھوتہ نہ کر سکے۔ ان کی اس کشمکش کو گھر والوں نے سمجھنے کی بجائے الٹا انہیں مطعون کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ واقعی بہکتے چلے گئے۔ ایک رات زینو کی چیخوں سے پریشان ہو کر دادا جان اوپر گئے تو پتہ چلا کہ زینو کا کمرہ کھلا ہوا تھا اور وہاں بھائی کی ایک سلیپر پڑی رہ گئی تھی یہ خود بھاگ اٹھے لگے درختوں کے ذریعہ بھینسوں کے باڑے میں کود گئے تھے پھر اس دن سے دادا جان نے اوپر جانے والے زینے میں تالا لگا کر چابی اپنے پاس رکھنی شروع کر دی تھی۔ دادا جان کے انتقال کے بعد جب ایک روز گرمی کی وجہ سے ماسی باہر برآمدے میں تہجد کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ تبھی اپنے کمرے میں سوتے سوتے ڈر کے بے تحاشہ چیخنے لگیں۔ سب ہی ان کے کمرے کی طرف دوڑ گئے۔ تبھی خوف کے مارے بے ہوش ہو چکی تھیں۔ ان کے پلنگ پر بھائی کی گھڑی پڑی ہوئی تھی۔ اسی لئے میں نے آپ سے کہا تھا کہ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کے پاس سو جاؤں۔ مگر آپ نے شاید پسند نہیں کیا۔ تاہم میں اب تک جاگ کر اسی حادثے کا انتظار کر رہی تھی۔ اب کوئی خطرہ نہیں ہے آپ آرام سے سو جائیں۔ میں آپ کے پاس بیٹھی رہوں گی۔" سوہنی نے لٹاتے ہوئے پیار سے کہا۔

"نہیں سوہنی۔ اب نیند نہیں آئے گی تم یہیں بیٹھی رہو" بینا نے سوہنی کو اپنے پاس لٹا لیا۔

صبح ناشتے پر تاج آچکا تھا۔ سوہنی کا منگیتر واپس آگیا تھا تاج نے اپنے بڑے بھائی اور سوہنی کے منگیتر کا

کا تعارف مینا سے کروایا۔ احمد مینا سے بڑے خلوص سے ملا۔ مگر بڑے بھائی گہری سانسوں کے درمیان زرد چہرہ لئے مینا کے سر پر ہاتھ ہی پھیر سکے۔ گو کہ رات کا واقعہ بڑا زہر آلود تھا مگر مینا کو بڑے بھائی کے حالات جاننے کے بعد ان سے ہمدردی ہوگئی تھی۔ اس نے چہرہ پر شکن لائے بغیر بہت احترام سے ان کو سلام کیا تو سوہنی منہ بگاڑ کر رہ گئی۔

ناشتہ کے بعد جب تاج اپنے بھائی کے ساتھ گاؤں چلا گیا تو مینا پھر چپکے سے اوپر آگئی۔ آج اس نے اپنے ہاتھ میں چھوٹا سا انیچی کیس اٹھایا ہوا تھا۔ زینو کے کمرے کی چابی اس نے صبح ہی تاج سے لے لی تھی۔

وہ بلا خوف و خطر تالا کھول کر اندر آگئی۔ زینو ایک کونے میں پڑی سو رہی تھی جھلنگا سی چارپائی پر میلا بستر جوں کا توں پڑا تھا۔

"زینو آپا" اس نے نزدیک آکر پیار سے پکارا۔

زینو لوکھلا کر اٹھ بیٹھی۔

"تم چلی جاؤ۔ یہاں کیوں آگئیں؟" زینو خوفزدہ لہجہ میں بولی۔

"کیوں آپ کے پاس آنا منع ہے کیا؟" مینا کے لہجے میں دنیا جہان کی مٹھاس تھی۔

"نیچے والے برا مانیں گے" زینو نے اداس ہو کر کہا۔

مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔ اچھا آپ یہ بتائے کہ آپ پلنگ پر کیوں نہیں سوتیں؟"

یہ بہت گندہ ہے۔ زینو نے برا سا منہ بنایا

مینا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ یہ دنیا کتنی مطلب پرست ہے۔ زینو کے اپنے ابھی زندہ تھے مگر چونکہ یہ کسی کام کی نہ تھی اس لئے اس کی کسی کو پرواہ نہ رہی تھی۔ ایک ماں تھی جو نمازیں پڑھنے کے بعد زینو کو کھانا بھجوانا اپنا فرض سمجھتی ہیں۔ اس کی بقیہ ضروریات

کی کسی کو کوئی پرواہ نہیں تھی۔ ایسے ماحول میں تو اچھا بھلا انسان پاگل ہو جائے۔

یہ دیکھئے زینو آپا، میں آپکے لئے کپڑے لائی ہوں۔ اب جلدی سے اٹھئے آپ کو نہلا دوں پھر کپڑے بدل لیجئے گا" مینا نے زینو کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا

"تم کس دنیا کی لڑکی ہو" زینو خلاف توقع بہت اچھی باتیں کر رہی تھی۔

"اس دنیا میں سب ایک جیسے نہیں ہوتے۔" وہ زینو کا ہاتھ پکڑ کر باتھ روم میں لے آئی۔

اور جب زینو نہا دھو کر تیار ہوگئی تو خود مینا اسے دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ وہ اپنی عمر سے کہیں چھوٹی اور معصوم لگ رہی تھی۔

"آئیے زینو آپا اب نیچے چلتے ہیں" وہ اسے اٹھاتے ہوئے بولی

"نہیں میں نیچے نہیں جاؤں گی۔" زینو خوفزدہ ہوگئی۔

"کیوں" مینا نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہاں مجھے سب مارتے ہیں" زینو اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

آپ میرے ساتھ چلئے، میری موجودگی میں آپ کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا" مینا نے اس سے اتنی اپنائیت سے کہا کہ وہ چپ چاپ اٹھ کر اس کے ساتھ چل دی۔

ابھی مینا برآمدے تک ہی پہنچی تھی کہ دوسری سمت سے بڑے بھائی اور تاج آتے نظر آئے۔ تاج مینا کے ساتھ زینو کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا، اور زینو تاج کے ساتھ بڑے بھائی کو دیکھتے ہی چیخ مار کر مینا سے لپٹ گئی۔

"یہ ڈاکو ہے بہن مجھے بچالو" زینو نے کپکپاتی آواز میں مینا سے کہا۔ مینا بمشکل تمام اسے اپنے کمرے تک لا سکی۔

تاج مجسم سوال بنا پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔
سنو تاج جب تک میں یہاں ہوں زینو آیا میرے ساتھ اسی کمرے میں رہا کریں گی۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔" مینا نے اچانک پلٹ کر تاج سے کہا تو تاج لمحہ بھر کے لئے گڑبڑا کر رہ گیا۔
"اگر تمہیں اعتراض نہیں تو مجھے کہاں ہو سکتا ہے۔" تاج نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔
زینو کو مینا نے اپنے بیڈ پر لٹا دیا اور خود نہانے چلی گئی۔
جب نہا کر نکلی تو دیکھا زینو بے خبر سو رہی تھی اور تاج دور ایزی چیئر پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔
بہت بھوک لگی ہے چلو کھانا کھا لیں۔ تاج نے مینا کو دیکھتے ہی اخبار ایک طرف رکھ کر کہا۔
بس ایک منٹ۔ ہیئر بینڈ لگا لوں ذرا۔ مینا نے چٹکی بجائی۔
اور رات کو جب مینا زینو کے ساتھ ایک ہی بیڈ پر اس کے گلے میں باہیں ڈالے سو رہی تھی تو عین اسی لمحہ تاج کے ذہن میں ایک سوال کلبلایا۔
یہ کون سے دیس سے تعلق رکھتی ہے جو اتنی پر خلوص اور بے لوث سی ہے۔
تاج کو یاد آیا جب اس کے گاؤں سے ملحقہ شہر میں انٹر تک کالج ہونے کے سبب اسے آنرز کے لئے یونیورسٹی میں داخلہ لینا پڑا تو ایکا ایکی اسے اپنی کلاس فیلو مینا سے سخت چڑ ہو گئی۔ یہ لڑکی جو ہر کس و ناکس سے مسکرا کر بات کرتی تھی تاج کی نظر میں ہرجائی اور مکار تھی۔ وہ ایک چھوٹے سے شہر کے کالج سے آیا تھا خیالات بھی زیادہ وسیع نہ تھے۔ یونیورسٹی کے ماحول سے ناآشنا تھا مرد اور عورت کو یکجا دیکھ کر اس کے ذہن میں صرف کرپشن کا تصور ابھرتا تھا۔ اسی لئے وہ بلا وجہ ہی مینا سے نفرت کرنے لگا۔ پہلا سال تو جیسے تیسے گزر گیا۔ مگر دوسرے سال وہ دل کی بات زبان پر لے آیا۔ اب وہ ہر جگہ کھلم کھلا مینا کی مخالفت کرتا۔ اتفاق سے اس کا پورا گینگ اسی جیسے نظریات رکھتا تھا۔ نتیجتاً کہ وہ سب کے سب مینا کو صرف عیاشی کا ذریعہ سمجھنے لگے۔ بظاہر اس سے بے حد خلوص سے ملتے مگر اندر ہی اندر بڑے غلیظ خیالات کی پرورش کرتے۔ سب ہی اس فکر میں تھے کہ مینا پہلے اس کے ہتھے چڑھے۔
ادھر مینا خلوص اور بے لوث پیار کا سمبل بنی اپنے دل کی سچائی کے آئینے میں دوسروں کو دیکھتی رہی۔ اسے کیا خبر تھی کہ اس کے پیچھے تاج کا گروپ اس کے متعلق کیا کچھ پروگرام بناتا ہے۔
اس دن تاج اپنے دوستوں کو ان کے گھر ڈراپ کر کے واپس ہوسٹل آ رہا تھا تو دیکھا لائبریری کے ریڈنگ روم سے مینا کتابیں سنبھالتی باہر آ رہی تھی۔
تاج نے گاڑی اس کے نزدیک لے جا کر روک لی۔
"تم ابھی تک یہیں ہو؟" تاج نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں میں تو روز اس وقت تک نوٹس بناتی ہوں۔" مینا نے سادگی سے جواب دیا۔
"کچھ پتہ ہے آج بسوں کی ہڑتال ہو گئی ہے۔" تاج نے خبر سنائی۔
"ہاں پتہ تھا۔" مینا نے اطمینان سے کہا۔
"پھر گھر کیسے جاؤ گی؟" تاج واقعی حیران ہو گیا۔
"سپر ہائی وے تک پیدل جاؤں گی وہاں سے کراچی آنے والی کسی بس میں بیٹھ کر گاڑی کھاتے اتر جاؤں گی وہاں سے تھوڑی ہی دور تو ہے میرا گھر۔" مینا نے سارا پروگرام بتا دیا۔
"کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟" تاج کو یقین نہ آیا
"ہاں اس میں جھوٹ کی کیا بات ہے۔ یونیورسٹی کی بسیں اکثر ہڑتال پر رہتی ہیں ان کی خاطر میں اپنی پڑھائی تو نہیں چھوڑ سکتی نا؟" اس نے کوریڈور کی دیوار پر اپنی کتابیں ٹھیک کرتے ہوئے

اور خدا حافظ کہتی ہوئی نیچے اتر آئی۔

تاج لمحہ بھر کو کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔

بینا سپر ہائی وے کی طرف جانے والی سنسان سڑک پر بڑے اعتماد سے فوجیوں والے انداز میں جا رہی تھی۔

تاج کچھ سوچ کر گاڑی اس کے پیچھے لے گیا۔

"سنو بینا اگر مجھ پر اعتماد کرو تو میں تم کو ڈراپ کر دوں گا۔"

"حیدر آباد تک جانے میں خاصا پٹرول خرچ ہو جائے گا۔ تمہارے لئے تو کوئی بات نہیں ہوگی مگر میں اتنے بڑے احسان کا بوجھ نہیں اٹھانا چاہتی۔" بینا بڑی صاف گو تھی۔

احسان کی کیا بات ہے۔ مجھے اسٹیشن جانا ہے۔ تمہیں بھی ڈراپ کر دوں گا۔" تاج نے سوچ سمجھ کر کہا۔

"کیا سچ کہہ رہے ہو۔" بینا نے بے یقینی سے پوچھا۔

"اب تم اتنی بھی اہم نہیں ہو کہ صرف تمہاری خاطر دو گیلن پٹرول برباد کر دوں۔" تاج نے جل کر کہا تو بینا ہنستی ہوئی دروازہ کھول کر اس کے برابر بیٹھ گئی۔

اگر میں تم کو تمہارے گھر چھوڑنے کے بجائے کراچی کڈنیپ کر کے لے جاؤں تب؟" تاج نے یونیورسٹی روڈ ختم ہونے پر حیدر آباد کی طرف مڑنے سے پہلے بینا سے پوچھا۔

مجھے یقین نہیں کہ تم ایسا کرو گے کیونکہ جو سچائی کی راہ پر گامزن ہو خدا اس کی ضرور مدد کرتا ہے۔" بینا کا لہجہ پر اعتماد تھا۔

"اگر فرض کرو ایسا ہو جائے تب؟" تاج نے گاڑی کھڑی کر کے پوچھا۔

"کیوں کروں؟ جو خدا پر اعتماد کرتا ہے خدا اسے کبھی تنہا نہیں چھوڑتا۔ اگر یقین نہیں ہے تو آزما کے دیکھ لو۔"

بینا کے لہجے کی کھنک سے وہ لرز گیا۔ بینا کی آنکھوں میں جو جذبے روشن تھے ان کی روشنی سے تاج کی آنکھیں چندھیا گئیں اور وہ باوجود عزم مصمم کے اپنے ارادوں کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔

"میں تو تم کو آزما رہا تھا۔" تاج نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"کیوں بھئی آزمائش کی ایسی کون سی ضرورت پیش آگئی۔" بینا نے حیرت سے پوچھا۔

اگر بتا دوں تو شاید تم مجھ سے نفرت کرنے لگو۔" تاج نے راہ فرار اختیار کرنا چاہی۔ مگر بینا کے اصرار پر اپنی اور اپنے گروپ کی ساری باتیں بتانا ہی پڑیں۔ تاج سمجھتا تھا کہ بینا پوری بات سن کر شاید مارے طمانچوں کے اس کا منہ لال کر دے گی۔ مگر وہ بڑے اطمینان سے بیٹھی مسکراتی رہی۔

"تم کو حیرت نہیں ہوئی؟" تاج اس کے یوں مسکرانے سے خود ہی حیران ہو رہا تھا۔

"نہیں۔ مجھے تو سب خبر تھی۔" بینا نے پرسکون لہجے میں کہا۔

"کیا، مگر مخبری کس نے کی تھی؟" تاج بوکھلا گیا۔

تمہارے چہروں نے۔ تم لوگ سمجھتے ہو کہ دلوں میں غلاظت کے ڈھیر چھپا کر چہرہ پر معصومیت کا رنگ چڑھ سکتا ہے لیکن یہ تم سب کی خام خیالی تھی۔ چہرہ دلوں کا آئینہ ہوتا ہے اور میں جیسے اس آئینہ میں سب کچھ پڑھتی رہی۔" بینا اب بھی پرسکون تھی۔ گاڑی کھاتہ آگیا تھا۔ تاج نے چپ چاپ بینا کو وہاں ڈراپ کر دینے میں عافیت سمجھی۔

اس کے بعد سے سب نے دیکھا تاج کا رویہ اچانک تبدیل ہو گیا۔ وہ بینا کے ہر موڑ پر حمایت کرنے لگا۔ اس کے دوستوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ اور جب اس راز کو فاش کرنے کے سلسلے میں دوستوں کا اصرار زیادہ بڑھا تو تاج نے ان کا ساتھ بھی چھوڑ دیا۔ مگر بینا اس کے کارزار حیات کا وہ شگفتہ پھول بن چکی تھی جو کو چھوڑنا ممکن نہ تھا۔

مینا تو کورا کاغذ تھی جب صاف ستھری پیار بھری تحریر اس پر نقش ہونے لگی تو اس کا حسن اور نکھر آیا۔ قریبی رشتہ داروں میں اس کا بوڑھی ماں کے سوا کوئی نہ تھا۔ تاج نے اس کی ماں پر اپنا رنگ کچھ ایسا جمایا کہ وہ انکار نہ کر سکیں۔ تاج کے چچا نے مینا کی ماں سے صاف گوئی سے کام لیا تھا۔ انہیں یہ بھی بتا دیا تھا کہ تاج کی ایک اور بیوی بھی موجود ہے جو اس سے تقریباً سترہ سال بڑی ہے۔ اور ذہنی معذور ہے۔ مینا جب امتحانات کے سلسلے میں ہاسٹل چلی گئی تھی تب وہ خاموشی سے جا کر تاج کا آبائی گھر بھی دیکھ آئی تھیں مگر مینا کو ان تمام باتوں سے بے خبر رکھا۔ پھر شادی کے بعد تاج مینا کو گاؤں لے کر ہی نہ گیا جو اسے کچھ حالات پتہ چلتے۔ اُدھر ماں کو موت نے مہلت ہی نہ دی ورنہ شاید وہی اس راز پر سے پردہ اٹھا دیتیں۔

جی بھر کے زندگی بھر کا لطف اٹھانے کے بعد جب یہ لوگ لطیف آباد میں بنے ایک چھوٹے سے بنگلے میں منتقل ہو گئے تو مینا کو ایکا ایکی گاؤں جانے کا بھوت سوار ہوا جو تاج کی آنا کانی کے باوجود نہ اترا اور تاج کو مجبوراً گھر فون کر کے یہ اطلاع دینا ہی پڑی کہ وہ مینا کو لے کر گاؤں آ رہا ہے۔

تاج نیا سگار سلگانے ہی جا رہا تھا کہ اچانک جیجی کی چیخوں سے سارا گھر تھل پھل ہو گیا۔ بے خبر سوئی ہوئی مینا بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ گہری نیند سے اٹھنے کے سبب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا وہ سہم کر تاج سے لپٹ گئی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

"جیجی اکثر سوتے میں ڈر جاتی ہیں۔" تاج نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے نرم لہجہ میں کہا

مینا کو سوہنی کی بتائی ہوئی باتیں یاد آ گئیں

"تاج واپس چلو۔" مینا نے اچانک مطالبہ کیا۔

"کیوں بھئی اتنی جلد اکتا گئیں۔" تاج نے اسے چھیڑا۔

"تمہیں کیا خبر یہاں بڑی گھٹن ہے تاج:" اس نے اٹک اٹک کر کہا۔

صبح جب تاج نے شہر واپس جانے کی تیاری شروع کی تو مینا نے زینو آپا کا سامان بھی لا کر رکھ دیا۔

"یہ کیا؟" تاج بوکھلا گیا۔

"زینو آپا بھی ہمارے ساتھ چلیں گی۔ وہ اتنی پاگل نہیں ہیں جتنا تم لوگ سمجھتے ہو۔ تم جب گاؤں آ جاتے ہو تو میں بہت تنہائی محسوس کرتی ہوں۔ میں ان کو اپنے ساتھ رکھوں گی۔ ان کا علاج کراؤں گی۔" مینا کے لہجے میں عزم تھا۔

"کیسی بچوں جیسی باتیں کر رہی ہو مینا۔" تاج الجھ گیا۔

"اس میں بچوں والی کیا بات ہے۔ تم مرد لوگ عورتوں سے ان کے حقوق باآسانی غصب کر سکتے ہو۔ مگر میں عورتوں کے اس گروپ سے تعلق نہیں رکھتی جو دوسروں کے حصہ میں اپنا تاج محل بناتی ہیں، یقین کرو تاج ایسے تاج محلوں کی بنیاد بڑی کھوکھلی اور ناپائیدار ہوتی ہے۔

تاج بیچارہ لمبی سانس لے کر رہ گیا اسے مینا کے دل کے آئینے پر عزم اور خلوص کی ڈھیر ساری پرچھائیاں ایکدم ہی نظر آ گئی تھیں۔

◻◻

بقیہ پرانے البم

سامنے دیکھا ایک دبیز سیاہ چادر آسمان تک تنی ہوئی تھی اور دودھیا روشنی اس چادر پر بری طرح تڑپ رہی تھی۔ اور کچھ فاصلے کی چکنی چٹانوں پر لوگوں کا جم غفیر اچھل کود رہا تھا

اب سمجھ میں آیا کہ یہ لوگ اتنے دن سے متحرک کیوں تھے۔ کمپنی کے گھاؤ والے نے کہا اور ہم لوگ ایک اکائی ہوتے ہوئے بھی غیر متحرک رہے قائد تھیلی رگڑتے ہوئے بولا

ہم لوگ اپنی مہم میں کامیاب رہے اس لئے اب ہمیں لوٹ کر جلد از جلد سبھوں کو اپنی کارگزاری سنانی ہے ہمیں آواز والے نے اعلان کیا

اور وہ چاروں تیزی کے ساتھ پہاڑ پر سے اترنے لگے ◻◻

الیاس قریشی

پرانے البم کی نئی تصویر

اچانک چاندنی رات اماوس کی رات میں تبدیل ہوگئی تو بستر پر سوئے ہوئے لوگ ہڑبڑا کر اٹھ گئے اور کروٹیں بدلتے ہوئے لوگ بری طرح چونک پڑے ہر شخص حیرت و خوف کے عالم میں سوچ رہا تھا کہ یہ اچانک کیسے ہوگیا؟

کچھ دیر کے بعد لوگ اپنی بیویوں اور بچوں کو محتاط رہنے کی تلقین کرکے چھتوں پر تحقیق کرنے کے لئے نکل آئے۔ ہر کوئی سمجھ رہا تھا کہ وہ واحد شخص ہے جو تحقیق کے لئے چھت پر آیا ہے جونہی انہیں دوسرے مکان کی چھت پر کوئی سایہ نظر آیا وہ چونک پوزیشن لیتے ہوئے خطرناک انداز میں بولتے۔ کون ہے؟ دوسری طرف سے جواب ملنے پر وہ مطمئن ہوکر لرزتی ہوئی آواز میں مکھیوں کی طرح بھنبھنانے لگتے یہ حال سبھی چھتوں پر تھا۔

کافی دیر کے بعد ان کی تلقین کو بالائے طاق رکھ کر ان کی بیویاں اور بچے کانپتے ہوئے اوپر آگئے تو لوگوں کو احساس ہوا کہ ساری آبادی چھتوں پر منتقل ہوگئی ہے۔

اچانک دوڑتی ہوئی جیپ پر نصب لاؤڈ اسپیکر سے آواز نکلنے لگی۔ فوراً چھتوں کو خالی کردو نہیں تو زمین اور چھت کا شخص مٹ جائے گا۔ لوگ سراسیمہ ہوکر چھتوں کو خالی کرنے لگے۔

کسی نے سوچا چاند سیاہ بادلوں کے نرغے میں پھنس گیا ہو۔

آخرکار سوچتے سوچتے لوگ ایک بڑے ہال میں جمع ہو لوگوں کی بھنبھناہٹ سے ہال گونج رہا تھا۔ اور جب بھنبھناہٹ شور میں تبدیل ہوکر صرف شور بن کر رہ گئی تو کسی نے چیخ کر کہا۔ جو ہوگیا، اتنی بڑی واردات ہوگئی اور ہم لوگ صرف اظہار خیال ہی کر رہے ہیں۔ کیا صرف اسی سے مسئلہ حل ہو جائے گا؟

تم ہی بتاؤ کہ آخر ہم لوگ یہاں اپنے تشخص کو کیسے برقرا رکھ سکتے ہیں۔ اپنی کنپٹی کے گھاؤ کو سہلاتے ہوئے قدرے فاصے پر کھڑے نوجوان نے پوچھا۔

اسی لئے کچھ کہہ دینے اور سُن لینے سے مسئلہ حل ہونے وا نہیں بلکہ ہمیں خود معلوم کرنا ہوگا کہ یہ یکبارگی کیسے ہوا۔

ہاں تم ٹھیک کہتے ہو پھر ہم کیا کریں کئی لوگ آگے پیچھے پڑے مجھے چند ایسے نوجوان چاہئیں جو میرے ساتھ بلا خوف و خ اس بھیانک اندھیرے کو ختم کرنے کی مہم میں میرا ساتھ دے تاکہ پھر وہ نہ ہوسکے جو آج ہوا ہے۔

ایک ایک کرکے چار نوجوان اس کے قریب پہنچ گئے ان

کنپٹی کے گھاؤ والا نوجوان بھی تھا۔

وہ ان چاروں کے ہمراہ ہال میں بھرے ہوئے لوگوں پر الوداعی نگاہ ڈالتے ہوئے باہر نکل آیا ساری گلیاں ویران سنسان تھیں کیونکہ تقریباً تمام لوگ ہال میں جمع تھے اور بچے کھچے لوگ بند دروازوں کے پیچھے دم سادھے لرز رہے تھے کہ نہ جانے کب کیا ہو جائے کوئی ٹھیک نہیں۔ اور آوارہ کتوں کے غول اور کوئی تنہا کتا بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ شاید وہ سب کے سب آدم کی اولاد ہی طرح کونے کھدروں میں سانس روکے دبکے ہوں گے۔ شاید جس وقت خدا نے "کُن" کہا تھا اس سے قبل دنیا میں ایسی ہی ویرانی ہوگی۔ جیسے ہی ان کے جوتے بے خیالی میں کسی چیز سے ٹکرا کر آواز نکالتے کھڑکیاں ذرا سا کھل جاتیں وہ چلتے چلتے رک کر ان کی طرف دیکھنے لگتے تو ساری کھڑکیاں کھڑاک سے بند ہو جاتیں۔

ہم لوگ ان ہی خاطر تو یہ صعوبت اٹھانے پر تیار ہوئے ہیں اور یہ ہم ہی سے ڈر رہے ہیں۔ کنپٹی کے گھاؤ والے نے کہا۔

ان میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ یہ اس خوف کا نتیجہ ہے جو ان پر برسوں سے مسلط ہے۔ اس کے پیچھے چلتے ہوئے چھریرے بدن والا بولا۔

آبادی سے کافی دور نکل کر پہاڑ کے نشیب میں برگد کے نیچے وہ لوگ بیٹھ گئے چھریرے بدن والے نے اپنے پتلے ہونٹوں میں موٹے سگار کو پھنسا کر سلگایا اور پہلا کش لینے کے بعد کہا،

"اب کیا ارادہ ہے ؟"

میرے خیال میں شاید آج کی واردات کے ڈانڈے اسی پہاڑ پر ملیں۔ قائد پہاڑ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

لیکن اتنے اندھیرے میں ہم لوگ اس پر کیسے چڑھ سکیں گے جبکہ ہمیں اس کا تجربہ بھی نہیں۔ کھچڑی نما بالوں والوں کی آواز ابھری۔

لگتا ہے تمہاری آنکھیں پہلے سے زیادہ خراب ہو گئی ہیں۔ کھچڑی نما بالوں والے پر کنپٹی کے گھاؤ والے نے طنز کیا

ہمیں زیادہ وقت برباد نہیں کرنا چاہیئے۔ اس لئے اٹھ کھڑے ہو۔ قائد نے بات کا رخ موڑتے ہوئے کہا۔

اب وہ چاروں اس کے پیچھے سست روی سے پہاڑ پر چڑھ رہے تھے کچھ اوپر چڑھ کر وہ چاروں ایک چٹان کا سہارا لے کر ہانپنے لگے تو قائد نے پھولتی ہوئی سانس کی آواز سن کر پلٹ کر دیکھا اور برا سا منہ بنا کر بولا۔ اگر مجھے پتہ ہوتا کہ تم لوگ اتنے کمزور ہو تو میں اکیلا ہی آتا۔

ہم کمزور نہیں ہیں بلکہ پہاڑ پر چڑھنے کا ہمارا یہ پہلا موقع ہے۔ وہ چاروں آگے پیچھے ہانپتے ہوئے بولے۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا چھریرے بدن والے کے بغل میں کھڑے نوجوان نے اپنی مہین آواز میں چٹان کی دوسری جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ وہ دیکھو۔ سب کی نظریں اس طرف چلی گئیں اور پھر سب کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور بے ساختہ سبھوں کے ہونٹوں سے بدبداہٹ ابل پڑی۔ ارے یہ کیا یہ تو ہم لوگوں کو ایک اکائی تسلیم کرنے سے انکار کرنے والے لوگ ہیں۔ مگر یہاں کیا کر رہے ہیں ؟

آؤ ذرا نزدیک چل کر دیکھنا چاہیئے۔ قائد نے پھسپھسا کر کہا۔ وہ سنبھل کر بڑھنے لگے اچانک کھچڑی نما بالوں والے کا پیر پھسلا اور وہ بغیر کوئی آواز نکالے ایک ہلکی سی سرسراہٹ کے ساتھ گہری کھائی میں گم ہو گیا۔ ان لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف رک کر تعزیت بھری نظروں سے دیکھا

لگتا ہے کہ جیسے یہ ہلکی سی سرسراہٹ ہی ہم لوگوں کا مقدر بن چکی ہے۔ ان میں سے کوئی بولا۔

خیر جو ہوگا دیکھا جائے گا چلو۔ کسی دوسرے کی آواز ابھری۔ ایک نوکیلی چٹان کی اوٹ میں چھپ کر ان لوگوں نے

نئی کتابوں کا تعارف

(تبصرہ کے لئے دو جلدوں کا آنا لازمی ہے)

پریم چند ـ کچھ نئے مباحث

مصنف :- مانک ٹالا

صفحات :- ۲۸۰ قیمت :- ۱۰۰ روپے

پتہ :- موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

جناب مانک ٹالا کی کتاب "پریم چند ـ کچھ نئے مباحث" دراصل پریم چند کے سلسلہ میں کچھ پرانے مباحث پر جدید ترین تحقیقات کی روشنی میں حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ پریم چند پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن بڑے فنکار پر لکھتے ہوئے اس کی شخصیت اور اس کے ادبی کارنامے کے چھوٹے سے گوشے بھی بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔

پریم چند کے ذہن اور ان کی ذہنیت کو سمجھے بغیر ان کے فن کی روح تک رسائی بھی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پریم چند کی بعض کہانیاں اور ان کے بعض کرداروں کا اندازِ پیشکش اور شبہ میں ڈال دیتا ہے کہ وہ ترقی پسند سے زیادہ عینیت پسند تھے۔ ایک ایسے عینیت پسند جو تہذیبی، معاشرت اور عقاید و مسلک کے قدیم اقدار کے دل سے پابند تھے اور اپنے کرداروں کو انہیں اقدار کے اتباع کی تلقین کرتے ہیں۔ یہ شبہ ہوتا ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا ازالہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ پریم چند کی زندگی کے دوسرے گوشوں پر نظر ڈالی جائے۔ ان کے مکاتیب دیکھے جائیں۔ ان کی عملی زندگی پر غور کیا جائے۔ ان کے مباحث میں ان کے خیالات تلاش کئے جائیں۔ اور ان کے اداریوں کو سامنے لایا جائے۔ جناب مانک ٹالا نے پیش نظر کتاب کے ذریعہ اس اہم فریضہ کی طرف توجہ کی ہے۔

پیش نظر کتاب ایک وسیع تر منظر نامہ سامنے لائی ہے۔ اس میں جناب مانک ٹالا نے پریم چند کی کئی کہانیوں کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ اور ان کہانیوں کے کردار کے عمل دخل سے ان کے خالق کے ذہنی خطوط پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں 'دو بھائی'، شدھی، پنچایت، آہ بے کسی، بوڑھی کاکی، کفن اور پوس کی رات وغیرہ کے مطالعات پیش کئے گئے ہیں۔

جناب مانک ٹالا نے پریم چند پر لکھتے ہوئے 'زمانہ' کی ان فائلوں کا بھی مطالعہ کیا ہے جس میں اول اول پریم چند کی تخلیقات شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان فائلوں میں 'مدیر زمانہ' کے لکھے ہوئے وہ شذرات بھی مل گئے جو پریم چند کے سلسلہ میں لکھے گئے تھے۔

مصنف کتاب نے پریم چند کی شخصیت اور ان کے نقطۂ نظر کی تفہیم کے لئے کئی اور مسائل حل کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ چنانچہ پریم چند کا آریہ سماج نظریات سے تعلق نیز تشدد یا

عدم تشدد کے سلسلہ میں پریم چند کا رد عمل اور اسی طرح کے دوسرے نکات بھی سامنے آئے ہیں۔

اس کتاب کا ایک حصہ ان تحریروں پر مشتمل ہے جو پریم چند کی لکھی ہوئی ہیں۔ اور شائع ہو کر اب تک گم شدہ حالت میں رسائل و جرائد کے صفحات پر موجود ہیں ان میں بعض … اور مضامین ہیں اور بعض تبصرے۔ جناب مانک ٹالا نے انہیں ایک جگہ جمع کر کے اور ان سے ضروری نتائج اخذ کر کے ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔ پریم چند پر خصوصی اور توسیعی مطالعہ کرنے اور ان سے متعلق تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے یہ کتاب چند اہم نکات پیش کرتی ہے اور ایک عظیم فنکار کے چھوٹے بڑے بہت سے پہلوؤں کے بارے میں قاری کا ذہن صاف کرتی ہے۔ کتاب موڈرن پبلشنگ ہاؤس نے شائع کی ہے اور اپنے معیار طباعت کو قائم رکھتے ہوئے اسے خوب تر انداز میں شائع کیا ہے۔

ڈاکٹر علیم اللہ حالی

شہرِ خیال

برادرم مسعود منظر صاحب

سہیل کا ہر شمارہ اپنے صفحات کو متاعِ فکر وفن سے مالا مال کئے ہوئے باضابطہ دستیاب ہو رہا ہے۔ نفع مذوری سے دست کش اور نفع رسانی کا قائل یہ مجلہ تقریباً نصف صدی سے اردو ادب کی بھرپور خدمت کرتا چلا آرہا ہے ور جلد ہی سال پنجاہم میں قدم رکھنے والا ہے۔ میری اپنی رائے میں سہیل کے تمام متعلقین اور اہل ادب حضرات پر یہ رض عائد ہوتا ہے کہ اس کے گولڈن جبلی کا اہتمام کچھ اس رح کیا جائے جو اپنے آپ میں ایک مثال ہو۔ یہ تجویز ابھی سے غور طلب ہے۔ کسی بھی طرح کے تعاون میں پیش قدمی کا حق یرا ہوگا۔ جمیل منظر صاحب کو اداب کہیں

مخلص ڈی این آریہ

محترم بھائی۔ ہدیہ خلوص

تازہ سہیل ملا۔ اداریہ پڑھا۔ وقت کی اہم آواز ہے جی لوگ زبان کے بٹوارے میں آجاتے ہیں ... لکھا کہ "اگر جمہوریت ہی کی زندگی اور سلامتی خطرے میں ہو تو پھر کیسی زبان — کیسی تہذیب — ؟ اور کیسی زندگی ۔؟؟؟"

بہت خوب — ان دنوں جو اقلیت کی نسل کشی ہو رہی اس تناظر میں اس اداریے کو دیکھئے۔ جب زبان والے ہی نہیں بچیں گے تو پھر اس زبان کو لے کر کیا کریں گے۔ اب تو بس زندگی بچانے کی ترکیب کرنی ضروری ہے۔ راہ بر ہی رہزن بن گئے ہیں۔ محافظ ہی لوٹ مار کر رہے ہیں۔ تو پھر نجات کیسے ممکن ہے اب آسمان سے فرشتہ تو آنے سے رہے۔ پھر یہ نسل کشی کب ختم ہوگی۔ اس "ہیول دلر" کا انت کب ہوگا۔؟ اس کا کوئی جواب ہے آپ کے پاس؟

بھاگلپور تو تاریخ کے اوراق میں امر ہوگیا۔ اس کا نام ولڈ ریکارڈ میں بھی آجائے گا۔ اس کی مثال رہتی دنیا تک لوگ دیں گے۔

بہرحال — یہ تو ابھی ابتدا ہے۔ آگے دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ ڈرامہ تو اب شروع ہونے والا ہے یہ تو صرف ایک جھلک تھی جس سے پورے سین کا اندازہ ہو سکے۔

مشتاق احمد نوری

مکرمی! سلام وعلیکم

دلی خواہش کے باوجود بھی سہیل کے لئے خریدار فراہم نہیں کر سکا تھا جس کے لئے شرمندہ ہوں۔ جن صاحبان نے حامی بھری تھی وہ اپنی بات سے پھر گئے۔ میرے علاقے میں لے دے کے صرف اردو اسکول کے اساتذہ سے ہی امید کی جا سکتی ہے کہ وہ رسالے خریدیں اور مطالعہ کریں۔ لیکن اردو والوں کی بے حسی پر خون کھولتا ہے کہ اردو کی معذری روٹی والے بھی اردو سے نابلد اور بے حس ہو گئے ہیں۔ وہ لوگ جو اردو اسکولوں میں اداروں میں کام کر رہے ہیں انہیں نہ اپنی زبان سے ہمدردی ہے نہ اسے زندہ رکھنے کا احساس ہے۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آپ لوگ اردو اخبار اور رسالے نہیں خریدتے۔ اردو کی ترویج میں حصہ نہیں لیتے۔ خود اہلیت اور قابلیت کی طرف توجہ نہیں کرتے رفتہ رفتہ اردو اسکولوں میں بھاری تعداد (غیر معیاری

اسکولوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔ آگے چل کر جب اردو پڑھنے والے نہ ہوں گے تب آپ لوگ اور آپ کی نسلیں اپنی تہذیب و زبان کو کیسے سمجھیں گی۔ اردو تہذیب نے تو دنیا میں اپنا نام کیا ہے اس سے دوری، جہالت کی مصداق ہے۔ تب ان سے کوئی جواب نہیں بن پڑتا۔ ہمارا شہر میں چھوٹے چھوٹے دیہاتوں گاؤں میں اردو والوں کا جال بچھا پڑا ہے لیکن معیار صفر ہے۔

منصور اعجاز

جمیل بھائی ؛ اسلام علیکم

"سہیل" مسلسل ملتا رہتا ہے۔ آپ کی محبت سے سرشار ہوں۔ مجھے بڑی تسکین ہوتی ہے اسے پڑھ کر۔ اس بار "نمود" کے تحت آپ نے خوب لکھا ہے کہ "اردو کو محض دوسری سرکاری زبان بنا دینے سے کیا ہوتا ہے جب کہ جمہوریت اور سیکولرزم کی زندگی ہی خطرے میں ہے۔ ہندی والوں کو تکلیف الگ ہے اور ادھر بھاگلپور اور آس پاس کے علاقوں میں مذہب کے نام پر بربریت جاری ہے۔ آپ نے بروقت موثر اداریہ لکھا۔

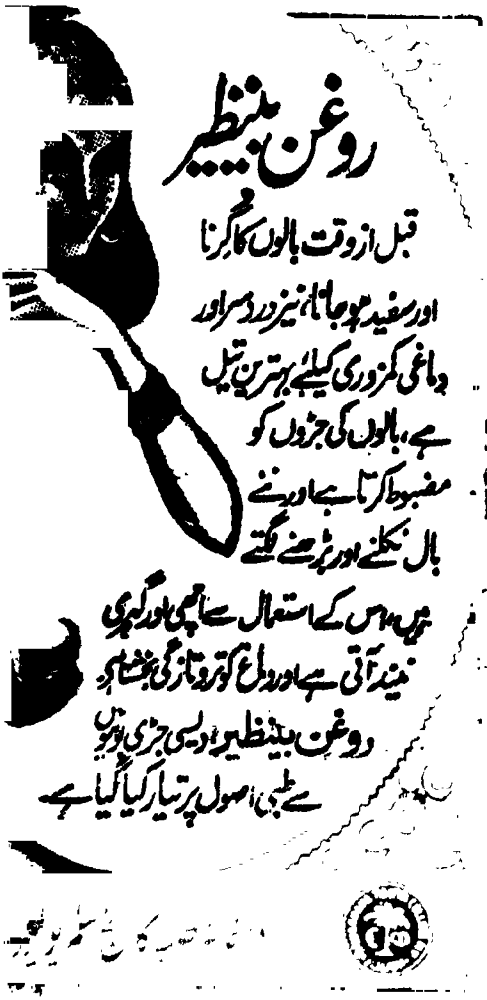
رفیق جابر کی غزل خوب ہے۔ جناب سید شہاب الدین دسنوی صاحب نے ہندوستان (کی جنگ آزادی) میں اردو کے تین اہم ادوار پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ اس مضمون میں بیشتر مقامات پر حروف اڑ گئے ہیں اس لئے پڑھنے میں بڑی دشواری ہوئی — بہرحال مضمون بہت اچھا ہے۔

کبھی مضمون نگار مرحوم ہو جاتا ہے تو کبھی صاحب موصوف یہ تو زندگی کا چکر ہے۔ ڈاکٹر شعیب راہی کا مضمون پڑھ کر ان کے لئے دعاء مغفرت نکلی۔

کلیم حیدر شرر، ساجن پردیسی، اعجاز، ضمیر درویش اور اظہر نیر کا بھی خوب ہے۔ ضمیر کے ساتھ درویش کا Combination

برابر قریب ہے۔ زبان کے لڑکھڑانے کا اندیشہ لگا رہتا۔ دونوں افسانے (شیخ سلیم اور ڈاکٹر نسرین) بھی خوب ہیں۔ شمارہ ہی بہت بھرپور ہے۔

رؤف خیر



ماہنامہ سہیل گیا

16/4/90



Feb – 90

Rs. 3.00

بانی :- حافظ محمد عبدالرحمٰن بسمل سنہاروی ——— بیادگار :- زین العابدین احمد و ادریس سنہاروی

ماہنامہ سُہَیل گیا

چیف ایڈیٹر :- مسعود منظر
ایڈیٹر :- جمیل منظر
معاونین :- شکیل احمد جمالی، عبدالقیوم ابدالی
• کتابت :- سید عبدالاحد گیاوی

شمارہ ۲ جلد ۵

بدل اشتراک

فی شمارہ .... ۲/۵۰ روپے
زرِ سالانہ .... ۳۰/۰۰ روپے
لائف ممبری .... ۵۰۱/۰۰ روپے

فہرست

نمود ۵
پاکیزہ لہو ...... جگن ناتھ آزاد ۷
سچ رنگ ...... عنوان چشتی ۹
ہندوستان میں ..... اصغر علی انجینیر ۱۰
سلمان رشدی ...... ڈاکٹر تارا چرن رستوگی ۱۷
فرقہ پرستی اور ...... قیصر زماں ۱۹
نظمیں ...... مجید مرزا تاباں ۲۳
اے قلم کار وسنو ...... صابر بدمانی ۲۴
غزلیں ..... رام پرکاش راہی، بلراج حیرت ۲۵
غزلیں ...... سید شکیل دسنوی ۲۶
غزلیں ... بدیع الزماں خاور، اختر شاہجہاں پوری ۲۷
کہانی ...... خروِن کمار دریا ۲۹
کہانی ...... الیاس قریشی ۳۳
شہرِ خیال ۳۷

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ سُہَیل

ریلوے سائیڈ روڈ گیا ۸۲۳۰۰۱

فون نمبر :- 21573

نمود

ادھر ہندوستان میں رجعت پسند اور فسطائی طاقتوں نے جو ماحول پیدا کردیا ہے وہ نہایت تشویشناک ہے۔ ہندوستان کے وطن دوستوں کے لئے بھی یہ ایک زبردست لمحۂ فکریہ ہے۔ اس ہنگامۂ رنگ اور متنوع طبقات و عقائد کی سرزمین میں سیکولرزم اور سوشلزم کا نظام ہی اس کے مختلف حصوں کو متحد و متفق رکھ سکتا تھا۔ اس کی شکست خدانخواستہ ایک آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہے جو خونیں اور دہشت انگیز فضا سامنے آرہی ہے اس کے نتائج ہندوستان کو کہاں لے جائیں گے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

سوال یہ ہے کہ ہم کدھر جارہے ہیں، کیا ہم کسی گہری سازش کا شکار ہوکر خود اپنی اقتصادیات، اپنی سالمیت، اپنی آزادی و خوشحالی، اپنی قدیم انسانی اقدار اور اپنی متحد قومیت کو مجروح نہیں کررہے ہیں ـــــــ یقیناً ایسا ہی ہورہا ہے۔ غور کیجئے تو پتہ چلے گا کہ آج پورے ہندوستان کو کوئی خارجی طاقت کٹھ پتلی بنائے ہوئی ہے۔ یہ کٹھ پتلی کس کے اشارے پر ناچ رہی ہے شاید اسے خود بھی معلوم نہیں۔ منظر کے پیچھے سے ڈور ہلانے والا جانتا ہے کہ کب کون سا رقص دکھایا جائے۔ اور اب بھی جو خونی رقص کا نمونہ پیش کیا جارہا ہے۔ وہ ہمارے ملک کو، ہمارے معاشرہ اور تہذیب کو نہ معلوم کس تاریک غار میں پہنچا رہا ہے۔

مشکل یہ ہے کہ فسطائی طاقتوں کا سحر سامری ہماری وہ صلاحیت بھی صلب کررہا ہے جہاں ہم یہ پہچان کرسکیں کہ ہمارا دوست کون ہے اور دشمن کون ؟؟

ہندوستان کی تمام ترقی پسند اور انسانیت دوست طاقتوں کو اب متحد ہوکر ملک کی بقا اور ترقی اور انسانیت کے تحفظ کے لئے ایک بار پھر پوری طاقت سے جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے۔

(ادارہ)

اعلیٰ معیارِ تعلیم کا مرکز

مرزا غالب کالج

★ آپ کے بچوں کے سنہرے مستقبل کا ضامن ★

★ تمام مضامین میں آنرس

★ مستقبل قریب میں پی۔ جی کی توقع

★ تیزی سے پھیلتی قدم جماتی اور متوجہ کرتی ہوئی تعلیمی اور تربیتی فضا

△ مرزا غالب کالج گیا کی وہ خصوصیات ہیں جو بلاشبہ رشک آلود ہیں ہمیں اور آگے بڑھنے میں آپ کا خلوص بھی آپ کا تعاون درکار ہے

پرنسپل
ڈاکٹر حمید احمد

★

سکریٹری
سید نقی امام

پاکیزہ لہو

جگن ناتھ آزاد

حاصل نہ ہو کیوں طبع کو دریا کی روانی
آزاد! مرے لب پہ ہے گاندھی کی کہانی

گاندھی کہ اگر اس کی سیاست پہ کریں غور
اس دیس میں تھا اکبرِ اعظم کی نشانی

اور آپ اگر کھوج میں روحانیت اس کی
ہر آنکھ کو آئے وہ نظر بدھ کا ثانی

جاں اس کی پریشان غم و دردِ بشر میں
دل اس کا نہاں خانۂ افکار و معانی

آزادیِ انسان کے تصور میں گرفتار
مرکوز، اسی نقطے پہ اس کی ہمہ دانی

○

وہ جس کے خیالوں کی جہاں گیر تجلّی
کرتی رہی ظلمات میں تنویر فشانی

جس دیس میں آباد غلامی رہی صدیوں
اس دیس میں اک حریتِ فکر کا بانی

یوں پیکرِ خاکی میں تھا پوشیدہ دل اس کا
الفاظ میں جیسے ہو نہاں گنجِ معانی

○

پھر اس نے بنایا دلِ ہر اہلِ وطن میں
کمتر تھے کہ بہتر تھے، اعالی کہ ادانی

ہر دور رہا نذرِ وطن زیست کا اس کی
تھا اس کا لڑکپن کہ ضعیفی کہ جوانی

شاداب کیا یوں چمنستانِ وطن کو
ہر رنگِ چمن اس کی ہے خوں نابہ فشانی

جب عمر کے آخر میں بھی اس کو نظر آیا
افزوں ہے وطن کا مرضِ تشنہ دہانی

وہ اپنا لہو دے کے گیا خاکِ وطن کو
تھی خاکِ وطن کی جو اسے پیاس بجھانی

رگ رگ میں وطن کی یہ لہو دوڑ رہا ہے
پاکیزہ لہو، اس کی محبت کی نشانی

○



آزادی کے ستون
اپنے حقوق کا استعمال کیا
کئی دیگر ممالک میں کئی سرکاریں بدلیں
یقین
آوازِ خلقت
آوازِ قوم

سچ رنگ

اے مرکزِ علم و فن و تہذیبِ کہن جاگ
اے منبعِ اخلاص و معانی و سخن جاگ
اے موجۂ پاکیزگیٔ گنگ و جمن جاگ
اے پیکرِ مستی و گل و سرو و سمن جاگ
اے خاکِ وطن، درِ عدن، رشکِ ختن جاگ
اے ارضِ وطن، ارضِ وطن، ارضِ وطن جاگ

خالی ہے خزانہ کی طرح روح کی جھولی
عصمت کی طرح لگتی ہے انصاف کی بولی
مدت سے ہے سسکی ہوئی تہذیب کی جھولی
اس دور میں حق بات کا انعام ہے گولی
ایمان کے مہتاب، محبت کے گگن جاگ
اے ارضِ وطن، ارضِ وطن، ارضِ وطن جاگ

ہر دشت میں، ہر گاؤں میں، ہر شہر میں افلاس
ہر لطف میں، ہر پیار میں، ہر قہر میں افلاس
آسودگیٔ شوق کی ہر لہر . . . ہیں افلاس
دیکھا نہ تھا ایسا تو کبھی دہر میں افلاس
آسودگیٔ چشمِ تمنائے زمیں جاگ
اے ارضِ وطن، ارضِ وطن، ارضِ وطن جاگ

عنوان چشتی

قینچی کی طرح چلتی ہیں یاروں کی زبانیں
ہیں تیر معانی تو ہیں الفاظ کمانیں
گھر صبح کو لٹتے ہیں سرِ شام دکانیں
سستی ہیں بہت شہر کے بازار میں جانیں
کیا ظلم ہے، انصاف کے ماتھے کی شکن جاگ
اے ارضِ وطن، ارضِ وطن، ارضِ وطن جاگ

پوشاک و زباں، صورت و سیرت پہ تصادم
علم و فن و تہذیب و خرافت پہ تصادم
نسلوں پہ، مذاہب پہ، حکومت پہ تصادم
حد یہ ہے کہ صوبوں کی سیاست پہ تصادم
ہونے کو ہے اک حشر بپا امنِ چمن جاگ
اے ارضِ وطن، ارضِ وطن، ارضِ وطن جاگ

ہر فلسفی و شاعر و صورت گر و معمار
ہر صوفی و ملا و مغنی و جہاں دار
ہر رہبر و مفتی و مدبر ہے۔ اداکار
مشکوک ہے اب خیر سے انسان کا کردار
انسان کے کردار کے سورج کی کرن جاگ
اے ارضِ وطن، ارضِ وطن، ارضِ وطن جاگ

اصغر علی انجینئر

ہندوستان میں اُردو زبان کا مسئلہ

آزاد ہندوستان میں اُردو تعصب کا شکار ہے اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا لیکن اس حقیقت پر بھی ہمیں دھیان دینا چاہئے کہ یہ مسئلہ دراصل آزاد ہندوستان میں پیدا ہوا۔ تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو اردو کے خلاف باقاعدہ جدوجہد ۱۸۳۷ء میں شروع ہو گئی تھی۔ ۱۸۳۷ء میں انگریزوں نے فارسی کی جگہ انگریزی اور ہندوستان کی علاقائی زبانوں کو ہندوستانی زبان کی حیثیت دی اور اس کے نتیجے میں بہار، مرکزی صوبے، شمالی مغربی صوبے اور اودھ میں اردو نے فارسی کی جگہ لے لی۔ ظاہر ہے ہندوؤں کے تعلیم یافتہ طبقوں نے سرکار کے اس اقدام کو ہندی مخالف قرار دیا اور اردو ہندی کشمکش کی ابتدا دراصل یہیں سے شروع ہوئی۔

دراصل اس مسئلے نے کچھ مخصوص حالات میں ہندو مسلم تنازعے کی صورت بھی اختیار کر لی۔ ویسے زبان کا تعلق کسی مذہب یا مذہبی گروہ سے نہیں ہوتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر کسی مذہب کی تعلیمات کا سرمایہ موجود ہو تو اس کا گہرا رابطہ اس زبان سے ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ عربی زبان کا مذہب اسلام سے ہے۔ لیکن ہم یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کر سکتے کہ ایک بڑی تعداد عرب عیسائیوں کی بھی ہے جن کی مادری زبان عربی ہے اور انہیں عربی زبان و ادب سے اتنی ہی محبت ہے جتنی عرب مسلمانوں کو یہ صحیح ہے کہ ہندوستان میں مغلیہ دور کے زوال کے بعد اسلامی تعلیم کی تبلیغ و ترویج کے لئے اردو زبان کا استعمال ہوا اور اس طرح اس کا گہرا رابطہ مسلمانوں سے ہو گیا۔ لیکن اسے صرف مسلمانوں سے وابستہ کرنا لسانی اعتبار سے ایک زبردست غلطی ہوگی۔ شمالی ہندوستان میں یہ عوامی زبان کی حیثیت رکھتی تھی اور بڑی حد تک آج بھی رکھتی ہے۔ ہندو، مسلم، سکھ اور شمالی ہند کے عیسائی بھی اردو کا عام طور پر استعمال کرتے رہے ہیں۔

لیکن جب انگریز حکومت نے عدالت کی زبان کے طور پر انگریزی اور علاقائی زبانوں کا استعمال شروع کیا اور شمالی ہند کے اکثر صوبوں میں اردو کا استعمال طے پایا تو ایک نئی کشمکش شروع ہو گئی اور اس کشمکش نے فرقہ وارانہ صورت اختیار کی جس کی دو وجہیں تھیں۔ پہلی وجہ تو روزگار سے متعلق تھی اور دوسری سیاسی اقتدار سے

اسی وقت سے مشترکہ تہذیب کے حامی طبقات میں دراڑیں پڑنا شروع ہو گئیں۔ چنانچہ پال براس اپنی کتاب LANGUAGE - RELIGION AND POLITICS IN NORTH - INDIA میں کہتے ہیں کہ ہندی کے حامیوں نے جو تحریک انتظامیہ اور عدالت میں فارسی رسم الخط کے استعمال کے خلاف اور دیوناگری رسم خط کے حق میں چلائی تھی اس کو ہندو میموریلسٹوں نے راشٹریہ اور بدیسی زبان کے استعمال پر ہندو اور مسلمان کے درمیان سنگھرش اور سرکاری نوکریوں کے مقابلے میں تبدیل کر دیا۔" [۱]

یہاں براس ہماری توجہ ایک اہم پمفلٹ A DEFENCE - OF URDU LANGUAGE - ANA CHARACTE کی طرف مبذول کراتا ہے جو مدن موہن مالویہ کے پمفلٹ کے جواب میں تحریر کیا گیا تھا۔ یہ پمفلٹ مالویہ کے پمفلٹ کے تین سال بعد ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا اور اس پر مصنف نے اپنا نام بھی تحریر نہیں کیا۔ لیکن یہ پمفلٹ اپنی جگہ پر بڑا اہم ہے۔ اس پمفلٹ میں اس بات پر افسوس ظاہر کیا گیا کہ ہندی کے حامیوں کو ہندو عوام سے اور اردو کے حامیوں کو مسلم عوام سے جوڑ کر مذہبی جذبات کو مشتعل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر صرف رسم الخط کی بنیاد پر تفریق نہ کرتے ہوئے زبان اور بولی کی بنیاد پر یہ تفریق کرنا ہے تو یہ بھید ہندو اور مسلمان کے درمیان نہیں ہونا چاہئے بلکہ پڑھے لکھے اور ان پڑھ کے درمیان ہونا چاہئے۔ اردو کو تعلیم یافتہ شہریوں کی زبان کہا گیا ہے۔ ہندی کو گاؤں میں رہنے والوں کی غیر معیاری بولیوں کا مجموعہ کہا گیا۔ دیوناگری رسم الخط کے متعلق یہ کہا گیا کہ اس کا استعمال تعلیم یافتہ طبقوں کے درمیان چھوٹی اقلیت تک محدود ہے۔ [۲]

انیسویں صدی کے جو بھی حالات رہے ہوں ہم آج کے ماحول میں اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ اردو تعلیم یافتہ شہریوں کی اور ہندی گاؤں کے رہنے والوں کی غیر معیاری بولیوں کا مجموعہ ہے۔

آج ہندی بھی ترقی اور تعلیم یافتہ شہریوں کی زبان ہے اور اس کے خلاف کوئی تعصب رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آج کے حالات میں ہمیں بلا جھجک اس بات کا اعتراف کرنا چاہئے کہ ہندی اور اردو دونوں ترقی یافتہ شہری زبانیں ہیں اور دونوں زبانوں میں حکومت کے انتظامی کاروبار چلائے جانے کی صلاحیت موجود ہے۔ ہم تاریخی تفصیل اور حوالوں میں نہیں جانا چاہتے کیوں کہ ہم آج کے حالات میں اس کے صحیح مقام کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ ہماری نظر تاریخی حقائق پر بھی ہونا ضروری ہے کیونکہ اتنے پیچیدہ مسئلے کا تاریخی تسلسل ہونا فطری بات ہے اردو ہندی کے سوال پر فرقہ پرستی کا مسئلہ ضرور پیدا ہوا لیکن یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ اردو زبان، عموماً اور اردو ادب کا خصوصاً فرقہ پرستی سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ اردو ادب اس کی بہترین مثال ہے۔ اردو کا مزاج ہی، اگر ہم اس کے عمل کو اپنے سامنے رکھیں، سیکولر ہے۔ اردو پیدا ہی ہوئی فوجی خیموں اور بازاروں میں جہاں مختلف لسانی اور مذہبی گروہوں کا آپس میں سنگم ہوتا تھا۔ اردو ادب میں تنگ نظری کا شائبہ تک نظر نہیں آئے گا۔ دراصل اس کا ادبی ورثہ فارسی ادب کی روایتوں سے مالا مال ہے اور فارسی ادب مذہبی تنگ نظری سے بنیادی طور پر انحراف کرتا ہے اور اس کا مذاق اڑاتا ہے۔ اس کی رواداری "یا مسلمان اللہ اللہ اور یا برہمن رام رام" والے مصرعے سے جھلکتی ہے۔ اردو ادب دراصل اسی تسلسل کا نتیجہ ہے۔

فرقہ وارانہ کشمکش اور تقسیم وطن کی جدوجہد کی جو بھی تاریخ رہی ہو اردو کو پاکستانی تحریک سے جوڑنا شرارت نہیں تو زبردست غلطی ہے۔ جنگ آزادی میں جو اردو ادب کا حصہ ہے شمالی ہندوستان میں اور کسی زبان کا نہیں۔ اردو ادب کا ہی نہیں اردو زبان کا بھی بڑا حصہ ہے۔ وہ وہابی تحریک سے وابستہ علماء ہوں یا مولانا

ابوالکلام آزاد، سب نے اردو زبان کا استعمال کیا اور آزادی کے جانبازوں کا لہو گرمایا۔ بھلا مولانا آزاد کے الہلال اور البلاغ کے رول کو کون فراموش کرسکتا ہے۔ خلافت تحریک کی بھی یہی زبان تھی اور جنگ آزادی میں خلافت تحریک کا جو رول رہا ہے وہ ظاہر ہے۔ اگر خلافت تحریک نہ ہوتی تو مسلم عوام کا ایک بڑا حصہ اتنی تیزی سے جنگ آزادی سے نہ جڑ جاتا۔

بیسویں صدی کے تیسرے دہے سے اردو ادب کا غالب رجحان ترقی پسندی رہا ہے اور ترقی پسند ادب نے حریت اور آزادی کی نئی قدروں پر زور دیا اور ہر طرح سے انسانی آزادی اور سماجی انصاف جیسی اعلیٰ اقدار کا پرچار کیا چاہے وہ پروپیگنڈہ ادب کی سطح پر ہی کیوں نہ ہو۔ یہاں ہمارا تعلق ادبی اوصاف سے نہیں لسانی خدمات سے ہے۔ بھلا ہندستان کی آزادی کو فروغ دینے میں اردو ادب اور خصوصاً ترقی پسند ادب کو ہم کیسے نظر انداز کرسکتے ہیں۔

بعض تنگ نظر سیاست داں اردو کا ناطہ پاکستان تحریک سے جوڑ دیتے ہیں۔ لوک دل کے لیڈر چرن سنگھ نے جنتا حکومت میں وزیر داخلہ بننے کے بعد بھی ایسے غلط خیالات کا اظہار کرتے رہے۔ جو یہ کہتے رہے ہیں کہ پاکستان تحریک کی بنیاد اردو کا مسئلہ تھا وہ صرف اردو کے ساتھ ہی نہیں مسلمانوں کے ایک طبقے میں علیحدگی پسند (SEPARATIST) تحریک کے ساتھ بھی ناانصافی کرتے ہیں۔ حقائق سے بے خبری کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ علیحدگی پسند تحریک کے پیچھے بڑے پیچیدہ سیاسی اور معاشی عوامل کارفرما تھے۔ اردو تو ایک طرف تقسیم وطن کی ذمہ داری کسی ایک مذہبی گروہ پر بھی ڈالی جاسکتی ہے یا نہیں اس پر بھی مورخوں میں آج خاصی متنازعہ فیہ بحث چھڑی ہوئی ہے۔ اب ہم آزادی کے دور سے اردو زبان کے مسئلے کے تعلق سے بحث کرنا چاہیں گے۔ گاندھی جی ہندستانی زبان کے حامی تھے جو دیوناگری اور فارسی رسم الخط میں لکھی جائے۔ تقسیم وطن کے بعد بھی وہ اس موقف پر قائم رہے۔ اس کا ثبوت وہ گشتی خط کے ذریعہ وہ گذارش ہے جو انہوں نے تمام گورنروں سے کی تھی۔ مہاتما نے یہ گذارش کی تھی کہ وہ جس صوبے میں بھی جائیں وہاں کی زبان ضرور سیکھیں اور جب وہ ایسے علاقوں میں جہاں پر ہندستانی کا چلن ہو تو وہ اس کو دیوناگری اور اردو رسم الخط میں سیکھیں[۳۵] لیکن افسوس کی بات تو یہ ہے کہ مہاتما کی طرح رواداری اور فراخدلی اوروں میں کہاں تھی۔ یہ بات عام ہوگئی کہ اردو کو پاکستان میں جگہ مل گئی ہے اسے وہاں قومی زبان کا درجہ دیدیا گیا ہے اب اس کا ہندستان میں کیا کام۔

یہ دلیل کتنی غلط ہے یہ ذرا غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے پہلی بات تو یہ بات ہی غلط ہے کہ کوئی زبان ایک سے زیادہ ملک کی قومی زبان نہیں ہوسکتی۔ انگریزی برطانیہ کی قومی زبان ہے اور امریکہ کی بھی۔ اس کا تعلق اس بات سے ہوتا ہے کہ کہاں کس زبان کے بولنے والے کتنے ہیں۔ اردو پاکستان کی زبان بنے یا نہ بنے ہندوستان میں جہاں کثیر تعداد میں اس زبان کے بولنے والے ہیں انہیں اپنا حق ملنا ہی چاہیئے۔ اور پھر یہ دلیل تو دو دھاری تلوار کی طرح ہے۔ اگر ہندستان میں اردو کو اس لئے جگہ نہیں دی جاتی کیونکہ پاکستان میں اسے جگہ مل گئی تو پھر پاکستان میں اردو کی جگہ جتنی کم ہوتی جائے ہندستان میں اتنی ہی زیادہ ہونی چاہیئے۔ یہ کون نہیں جانتا کہ پاکستان میں علاقائی زبانیں اپنا مقام حاصل کرنے کے لئے اردو کی اہمیت کم کررہی ہیں اور وہاں اردو داں مہاجروں کو اردو کے حقوق کے لئے اردو پرلیش کی مانگ کرنا پڑ رہی ہے۔ اس لئے بہتر یہی ہوگا کہ پاکستان سے ہم اردو کا رشتہ نہ جوڑیں اور اس کے وصف یا نقص کی ہندستان کے سیاق و سباق میں ہی بات کریں۔

ہندستان میں آزادی کے بعد علاقائی زبانوں کو ان کا حق دلانے کے لئے اسی اعتبار سے صوبائی تقسیم ہوئی۔

بے شک یہ بڑا اہم جمہوری قدم تھا اور عوام کی سیاسی اور معاشی امنگوں کو پورا کرنے کے لئے بڑا اہم قدم بھی۔ لیکن ہندستان کے کئی علاقے ایسے ہیں جہاں ایک سے زیادہ بولیاں ہی نہیں زبانیں بھی بولی جاتی ہیں۔ شمالی ہندستان میں خصوصاً یوپی اور بہار میں ہندی کے علاوہ اردو سب سے اہم زبان ہے (ویسے مغربی ممالک کے اعداد و شمار کے مطابق اردو دنیا کی تیسری سب سے بڑی زبان ہے۔ ویسے یہ ایک الگ بحث ہے) کیا کسی علاقے کی ایک ہی زبان ہوگی؟ کوئی زبان کسی علاقے میں ثانوی حیثیت اختیار نہیں کر سکتی؟ اگر عوام کی سیاسی، معاشی اور تہذیبی امنگوں کو پورا کرنا جمہوریت کا فرض منصبی ہے ذایک علاقے میں اگر ایک سے زیادہ زبانیں بولنے والے ہیں اس علاقے میں جمہوریت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ایک سے زیادہ زبانوں کو جگہ دینا ہوگی۔

یہ کوئی خیالی بات نہیں ہے کہ اردو یوپی، بہار وغیرہ میں ہندی کے بعد سب سے بڑی زبان نہیں ہے۔ اس بات کا اعتراف حکمراں پارٹی نے اپنے یوپی کے ۱۹۸۴ء کے مینی فسٹو میں ہی کر لیا ہے ں مینی فسٹو (منشور) میں یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ کانگریس اگر بارہ حکومت میں آئی تو وہ پورے یوپی میں اردو کو ثانوی زبان درجہ دیگی۔ لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ اس وعدے کو اکرنے نیت ولعل سے کام لیا جب دسمبر کے اواخر ں کل ہند رابطہ کمیٹی کا ایک وفد وزیر اعلیٰ مسٹر نرائن دت تیواری ے ملا اور تقریباً ایک گھنٹہ بات چیت کی لیکن وزیر اعلیٰ نے وفد سے کوئی واضح طور پر وعدہ کیا اور نہ اردو کو ریاست میں کانگریس کے نتخابی منشور کے مطابق دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے سے متعلق یقین دہانی کرائی گئی۔

بالآخر رابطہ کمیٹی نے لکھنؤ میں ۸ جنوری ۱۹۸۹ء سے ک ہڑتال کا آغاز کیا جس میں رام لعل، ملک زادہ منظور احمد، مولانا اسحاق سنبھلی وغیرہ نے گرفتاریاں بھی دیں۔ اردو رابطہ کمیٹی نے ۱۹۸۹ء کو "اردو تحریک کے سال" کے نام سے منسوب کیا ہے۔ اسی لئے سال نو کا آغاز اس نے لکھنؤ میں ڈاکٹر امبیڈکر کے مجسمہ پر علامتی بھوک ہڑتال سے کیا تھا۔

اس سوتیلے پن کے رویے کو نہ صرف غیر جمہوری بلکہ تعصبانہ اور غیر منصفانہ بھی کہا جائے گا۔ ہر لسانی گروہ کو اپنے تہذیبی ورثے کے تحفظ کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ زبان ہی تہذیب کے تخلیقی اور روائتی اظہار کا واحد وسیلہ ہے۔ اگر کسی زبان کا ہی تحفظ نہ ہوگا تو اس لسانی گروہ کی تہذیب اور تہذیبی امنگوں کے فروغ کا سوال پیدا نہیں ہوگا۔ یہاں میں یہ بھی عرض کرنا چاہوں گا کہ سوال صرف تہذیب ا... کے اظہار اور تحفظ کا ہی نہیں، روزی روٹی کا بھی ہے۔

دراصل ۱۹۴۷ء کے بعد اردو۔ ہندی کے سوال پر جو جدو جہد شروع ہوگی اس میں ایک اہم سوال روزی روٹی اور روزگار کا بھی تھا۔ اردو اگر عدالت کی زبان بنی رہتی تو ہندی طبقے کے روزگار کے مواقع کم ہو جاتے۔ یہ بات کوئی ڈھکی چھپی بھی نہیں تھی۔ یوپی میں اردو عدالتی زبان ہونے کی وجہ سے مسلمان اعلیٰ سرکاری ملازمتوں میں سب سے آگے تھے۔ پال براس نے اس سلسلے میں قابل وثوق اعداد و شمار پیش کئے ہیں۔

لیکن آج اردو داں طبقے کی حالت یوپی میں بالکل الٹی ہے۔ یہ تعلیمی میدان اور معاشی میدان میں سب سے پچھڑے ہوئے ہیں۔ اگر اردو کو یوپی میں ثانوی زبان کا درجہ دیا جائے تو مسلمانوں کو روزگار کے بہتر ذرائع میسر ہوں گے۔ اسکولوں کے علاوہ عدالتوں اور سرکاری دفاتر میں اردو داں طبقے کے لئے نئی آسامیاں پیدا ہوں گی۔ اس لئے اردو کا مسئلہ محض تعصب کا نہیں معاشی مقابلے کا بھی ہے۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ کئی مراکز ... فرقہ وارانہ فسادات ... کہ معاشی رقابتیں ہی کے لئے

ہی کروائے جاتے ہیں۔ مرادآباد، میرٹھ وغیرہ کئی شہروں کی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

اس سلسلے میں بہار کی بھی مثال دی جاسکتی ہے۔ حالانکہ بہار کی پوری ریاست میں اردو کو ثانوی زبان کا درجہ دیا گیا ہے۔ اس کے نفاذ کے لئے ۱۹۸۱ء میں عبدالمغنی صاحب کے بیان کے مطابق پندرہ اضلاع کو ہی منتخب کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ابھی تک حکومت کے بار بار وعدوں اور انجمن ترقی اردو بہار کی کوششوں کے باوجود مزید اضلاع میں اردو کے سرکاری استعمال کے احکام جاری نہیں کئے گئے ہیں اور اضلاع کی نئی تقسیم کے مطابق ابھی ۲۴ ضلع اور باقی ہیں جن میں اردو کے سرکاری استعمال کے احکام جاری ہونا باقی ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان ۱۵ اضلاع میں بھی اردو کا استعمال تسلی بخش طور پر نہیں ہو رہا ہے۔ اور اس کی وجہ خود اردو بولنے والوں کے علاوہ متعصب اور فرقہ پرست حکام کی بھی ہے یہ حکام یہ نہیں چاہتے کہ اردو داں طبقوں کو اپنی معاشی امنگیں پوری کرنے کے مواقع فراہم ہوں۔

بہرحال کانگریسی سیاست دالوں اور متعصب حکمرانوں کا جو بھی رول رہا ہو ہمیں حیرت تو اپنے ترقی پسند ہندی کے مصنفوں پر ہوتی ہے جو مارکسی قومیتوں کے نظریئے کو قبول کرنے کے باوجود اردو کے ساتھ دوسروں کی طرح تعصب برتتے ہیں۔ یہ نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ ۱۹۸۶ء میں ترقی پسند تحریک کی گولڈن جوبلی کے جشن میں اردو ہندی کا زبردست تنازعہ کھڑا ہوگیا اور ہندو بین اردو۔ ہندی کے خیموں میں بٹ گئے ہیں۔ اگر چند معقول دوست مداخلت نہ کرتے تو اردو والے جشن کا بائیکاٹ ہی کر دیتے۔ یہ صحیح ہے کہ اس تنازعے میں شخصی جھگڑے بھی شامل تھے لیکن بہرحال سوال تو زبان کا ہی اٹھایا گیا تھا۔ اس جشن میں ایک لسانی کمیشن بھی مقرر کیا گیا تھا جو اردو۔ ہندی کے سوال پر اپنا فیصلہ دے۔ لیکن کی بات ہے کہ اس سے قبل کہ یہ کمیشن اپنا کام شروع کرے کے ایک اہم رکن شری نامور سنگھ نے اردو کے خلاف ایک قلمبند کر کے شائع کرادیا۔ اب اس میں کوئی حیرت کی بات ہے کہ اس لسانی کمیشن نے آج تک اپنا کام شروع نہیں فیصلہ دینے کی بات تو دور ہے۔ (پتہ چلا ہے کہ اس نے اب ڈرافٹ ریزولیشن تیار کی ہے)

ترقی پسند ہندی ادیبوں کا یہ رویہ بڑا افسوس ناک یہاں سوال رواداری اور فراخدلی کا بھی نہیں ہے۔ رو کی توقع تو ہم ان سے کرتے ہیں جو اردو کو اصولاً اس کا مراعات دینا چاہتے ہیں۔ ترقی پسند ادیب تو اصولاً کو اس کا اپنا جائز حق دینے کے ترقی پسند تصور رکھتے ہیں۔ لیکن یہ ترقی پسند ادیب اصول پر عمل کرنا اردو کے ساتھ عام انسانوں کی طرح رواداری اور فر لئے بھی امادہ نہیں ہیں۔ اقلیتوں اور ان کی زبان کے رواداری برتنا جمہوریت کا تقاضہ ہے۔ اور اقلیتی تہذیب اور ان کی زبان کو پوری ایمانداری سے او فروغ دینے کے لئے غیر معمولی کوشش کرنا سوشلزم ہے۔ یہاں چند باتیں اردو داں طبقے کی اپنی ذمہ اور کمزوریوں سے متعلق بھی کرنا ضروری ہے۔ اردو کے جو ناانصافیاں ہو رہی ہیں اس کے ہم خود بھی بڑی ذمہ دار ہیں۔ آج دلی، یوپی، بہار، ہریانہ، مدھیہ پردیش راشٹر، اندھرا پردیش، کرناٹک، گجرات وغیرہ ریاستی سرکار نے اردو اکیڈمیاں قائم کی ہیں اور ہر سال روپے منظور کئے جاتے ہیں۔ لیکن اکیڈمیاں اردو دینے کے مرکزوں کے بجائے سیاسی اکھاڑے بنے کہیں رکنیتوں کے جھگڑے ہیں تو کہیں انعام حاصل

اردو کی کتابوں کو انعام میرٹ پر نہیں دوسری وجوہات کی
دوں پر دیئے جاتے ہیں۔ اکثر انعام یافتہ کتابیں دوسرے
یسرے درجے کی ہوتی ہیں۔ کیا ایسی باتوں سے اردو ادب کو
ن کو فروغ ملے گا؟ انعامات بھی عام طور پر شاعری اور افسانوں
دہ سے زیادہ تنقیدی کتابوں کو دیا جاتا ہے۔ (۱۰) اکیڈمیوں
ح تک ادب کے علاوہ دیگر علوم کو فروغ دینے اور ان علوم پر
ی کی گئی کتابوں کی ہمت افزائی کرنے کے لئے کچھ نہیں کیا ہے۔
ہے کہ کسی بھی زبان کے لئے تخلیقی ادب کا سرمایہ بڑا اہم
ہوتا ہے لیکن دیگر سماجیاتی اور سائنسی علوم کی بھی
ہمیت ہوتی ہے۔ کوئی ترقی یافتہ زبان ان علوم کو نظر انداز
سکتی۔ ان علوم پر کتابوں کی ہمت افزائی کرنا تو دور
ہے ان اکیڈمیوں کے رسالوں میں بھی اہم علمی مضامین
نہیں ہوتے۔ ہم نے اپنی زبان کے سرمائے کو شاعری اور
ی ادب تک محدود کر دیا ہے۔

ادب میں بھی ناولوں اور ڈراموں کو جو اہمیت ملنا
نہیں مل رہی ہے۔ یہ کیا کم المیہ ہے کہ ادھر ۲۵۔۳۰
ں اردو میں کئی اچھے افسانے لکھے گئے مگر اہم ناولوں کی
رہی ہے اور ڈراموں کا ذکر کرنا ہی بے سود ہے۔ اس
رف تو بہت ہی کم توجہ دی گئی ہے۔ خیر یہاں میں ادبی
ے گفتگو نہیں کرنا چاہتا یہاں تو ہمارے سامنے لسانی
ہے۔ لیکن اس سلسلے میں یہ بات پورے زور کے ساتھ
ہوں گا کہ اردو اکیڈمیوں کا رول قطعاً تسلی بخش نہیں
۔ رہی تو اردو والوں کی ہی ذمے داری ہے، ہندی والوں
۔ اردو کی لسانی تحریک کر نشیں تھا نہیں قربانی کا مطالبہ
ہے۔

آخر میں میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ جن وادی لیکھک
سا، دو کو اپنا حق دلانے کی جو تحریک شروع کی ہے وہ
جرأت مندانہ ہے۔ اور بڑی قابل تعریف۔ تمام ترقی پسند ادیبوں
کو، جو زبان کو اپنا حق دلانے کے حق میں ہیں، جن وادی لیکھک
سنگھ کا عملی طور پر ساتھ دینا چاہئے اور ان کے ہاتھ مضبوط
کرنا چاہئے۔ احیاء پرستی اور بنیاد پرستی کے اس دور میں، جب تہذیبی
اور مذہبی شناخت کی شدت بڑھتی جا رہی ہے یہ کام اور اہم اور
ضروری ہو جاتا ہے۔

اردو کے حامیوں اور پرستاروں کو بھی اس بات کا
خیال رکھنا ہے کہ اردو کا مسئلہ کسی بھی حالت میں مذہبی احیاء
پرستی سے جڑ کر جارحیت کی حدوں کو نہ چھونے لگے۔ اردو کے
کاز کو اس سے زیادہ نقصان پہنچانے والی اور کوئی بات نہیں
ہو سکتی۔ سیکولرزم اور معقولیت اور درمیانہ روی کی حدوں
میں رہ کر ہی یہ لڑائی لڑنا ہے۔ اسی میں اردو کا مفاد ہے۔

۱ؔ دیکھئے مظہر مہدی "اردو اور ہندی کی کشمکش، ۱۹۴۷۔
۱۸۳۷۔ تاریخی اور سیاسی پس منظر، پیش رو دہلی، جلد ایک شمارہ
دو، ستمبر سے دسمبر ۱۹۸۸ء

۲ؔ مظہر مہدی ایضاً

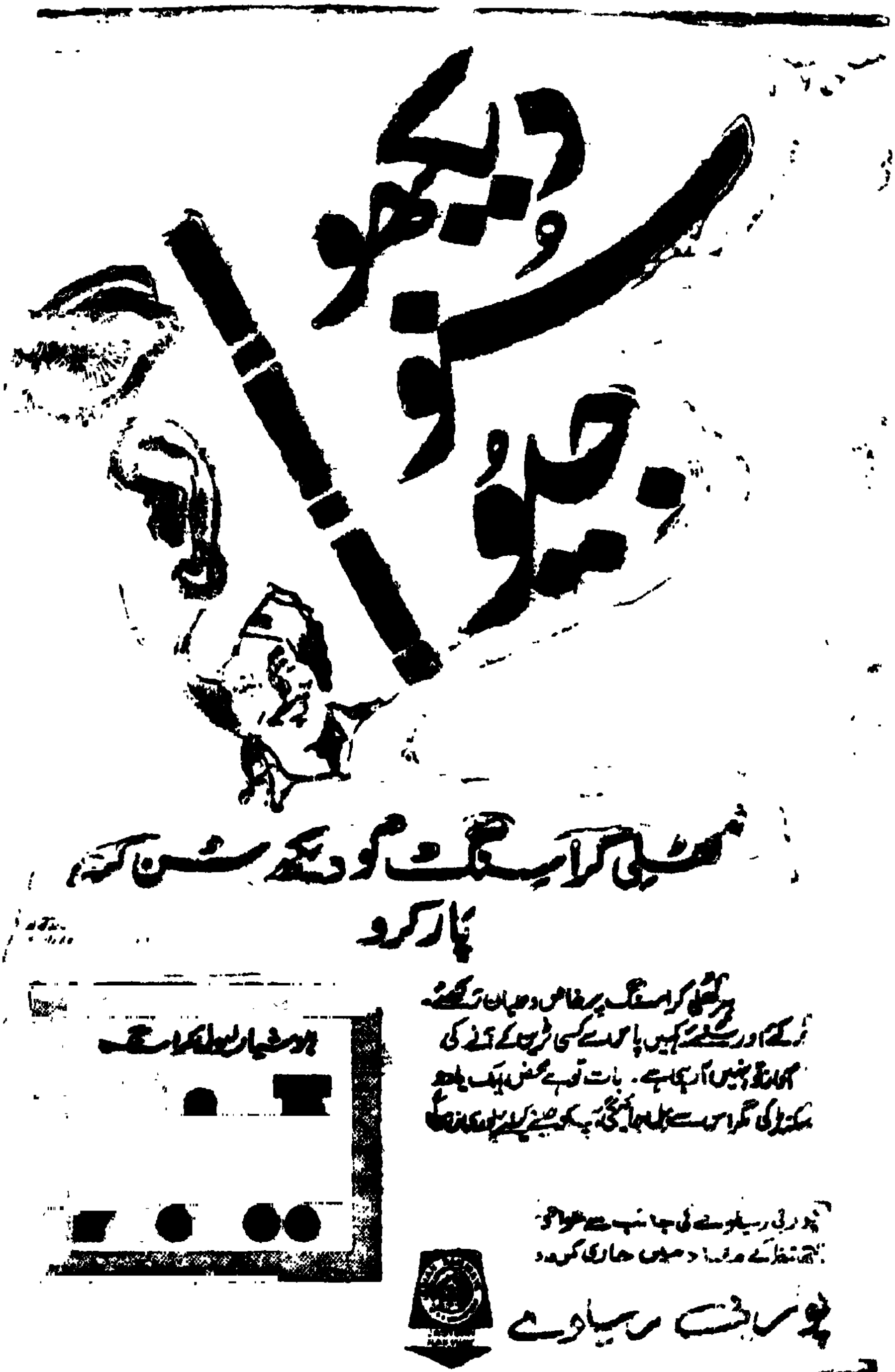
۳ؔ دیکھئے مضمون "اردو روٹی روزی کا مسئلہ" ہندوستان
بمبئی، ۲۹ ستمبر ۱۹۸۸ء

۴ؔ دیکھئے "اردو ٹائمز" ۲۹ دسمبر ۱۹۸۸ء

۵ؔ دیکھئے "اردو ٹائمز" ۱۰ جنوری ۱۹۸۹ء

۶ؔ دیکھئے عبد المغنی سے ابرار رحمانی کا انٹرویو پیش
رو، محولہ بالا شمارہ، صفحہ ۴۰

۷ؔ میں اس واقعے کا چشم دید گواہ ہوں اور بیچ بچاؤ کرنے
میں بھی حصہ لیا تھا۔


دیکھو
پار کرو

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی

سلمان رشدی کا ناول یعنی آیات ابلیسی

(THE SATANIC VERSES)

چونکہ یہ موضوع خاصا حساس ہوگیا ہے ں حد تک جذبات کی لپیٹ میں آگیا ہے کہ عقل سلیم خاموشی ہی کا مشورہ دیتی ہے۔ میں نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ میں ضوع کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ انگریزی اخبارات و ا نیز اردو پریس میں اس کتاب پر جو بھی کہا گیا میں نے بڑی ہی سے پڑھا۔ سید شہاب الدین، شاہی امام (؟) عبداللہ ، علی صدیقی، علی خمینیؒ نیز دیگر بزعم خود پیش حرف" ت نے جو کچھ کہا اس کو میں درخود اعتنا نہیں سمجھتا ر سیاسیات سب کچھ کہلوا سکتی ہے اور کروا بھی سکتی ہے' سیاسیات ایک پیشہ سے زیادہ کچھ نہیں رہی ہے اور یاست جو کچھ کہتے ہیں اس کو محض اشتہار بازی زاویہ دیا تا ہے۔

الشاہد کلکتہ کے مارچ / اپریل ۸۹ء میں مولانا لدین خان صاحب کا مضمون بہ عنوان "سلمان رشدی یطانی کلام" مشمول ہے۔ اس مضمون کو بنہایت غور سے پڑھا

کیونکہ مولانا موصوف اب ایک مخصوص سیکولر حق پسندانہ آواز کا نام ہے۔ چونکہ اسلامیات سے خاصی دلچسپی رہی ہے۔ اور میری شناسائی کے حلقے میں ندوہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، اسلامک انسٹیوٹ تغلق آباد، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، کشمیر یونیورسٹی وغیرہ ادارے شامل ہیں۔ لن ترانی سے احتراز کرتا ہوں مگر پیش نظر حقیقت کو دیکھتے ہوئے قدرے اپنی خدمات کے بارے میں عرض کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مطالعہ اسلامیات نے ابھی تک مجھ سے درج ذیل کتب لکھوائی ہیں۔

ISLAMIC MYSTICISM: SUFISM

MUSLIM WORLD: ISLAM BREAKS FRESH GROUND

A VOCABULARY OF SUFI TERMS &

SIX SAINTPOETS OF PERSIAN. (زیر طباعت)

یعنی میں اسلام سے بیگانہ نہیں ہوں اور حجۃ الوداع کو اسلام کا منشور سمجھتا ہوں بلکہ اس کو اگر انسانیت

کا منشور کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

اسلامیات کے مطالعے نے مجھے بتایا ہے کہ رشدی نے جو کچھ کہا ہے وہ مستشرقین کی کتابوں سے ماخوذ ہے، یہی نہیں یہ بھی کہا گیا ہے کہ رسول اللہ عیسائی تھے اور انہوں نے نیسٹورین گرجے میں بپتسمہ (BAPTISM) لیا تھا۔ دانتے نے اپنے شاہکار (DIVINE COMEDY) میں رسول اللہ اور حضرت علی دونوں کو طربیہ ربانی کے ۲۸ کینٹو (CANTO) میں دوزخ کی آگ میں جلتے ہوئے پیش کیا گیا ہے۔ دانتے کی کتاب کا بہترین ترجمہ ڈوروتھی سیرز (DOROTHY SAYERS) کا ہے۔ موصوفہ نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ قرون وسطیٰ میں یورپ میں یہی خیال کیا جاتا تھا کہ رسول اللہ اور حضرت علی دونوں نے مسیحی مذہب میں افتراق پیدا کیا تھا۔

مستشرقین کے تعلیقات و تاویلیات نیز دانتے کی طربیہ ربانی کے پیش نظر یہ نتیجہ بھی مستنبط کیا جا سکتا ہے کہ رشدی کے ہاں جو کچھ ہے وہ مانگے کا اُجالا ہے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ رشدی کے ناول کا وہ کردار جس کا نام فرشتہ جبریل چمچہ ہے رشدی سے مشابہت رکھتا ہے۔ یہ چمچہ بمبئی ہی کا ہے جو انگلینڈ فکر معاش میں پہنچا۔ انگلینڈ کے سماج سے ہم آہنگ ہونے کی کاوشوں میں مصروف رہا۔ ایک انگریز عورت سے شادی بھی کرلی جو بعد کو طلاق دے کر تو دو گیارہ ہو گئی اب چمچہ گھر کا کتا ہے نہ گھاٹ کا۔ چمچہ پریشان ہے وہ کرے تو کیا کرے۔ مراجعت کے خوابوں میں بھی پناہ لیتا ہے۔ انگلینڈ تو اس کو قبول نہیں کرسکتا اور ہندوستان واپس جا کر اس کا کیا حال ہوگا اس کے اندیشہ خیال سے باہر ہے۔

یہ کردار بہت جاندار کردار ہے، جس کے احوال و کوائف نیز خد و خال، خیالات و جذبات رشدی سے مماثلت رکھتے ہیں۔

دوسرے کرداروں میں جان کی رمق نہیں ہے۔ پاکستان ک وزیر اعظم بے نظیر بھٹو نے کتاب پر اپنا اظہار خیال کرتے ہوئے بڑا اہم مشورہ دیا۔ انہوں نے کہا کہ ایسی کاوشوں کو نظر انداز کر دینا ہی صحت اقدام ہے کیونکہ زیادہ شور شرابے سے ان کو قارئین جلدی میں ملنے لگتے ہیں۔

جناب نجیب محفوظ جن کو ابھی حال ہی میں نوبل پرائز گیا ہے آیات ابلیسی کو پسند تو نہیں کیا ہے مگر انہوں نے یہ بھی ک ہے کہ اسلام کو حکایتی و داستانی رنگ و روپ دینا ہوش مند کی بات نہیں ہے۔ رشدی نے مطالعہ کے لئے انگیز تو کیا ہے محفوظ صاحب خود بھی بہترین ناول نگار ہیں۔ عربی ادبیات میں یہ تیسرے شخص ہیں جنہوں نے نوبل پرائز حاصل کیا ہے۔ پہلے دو نو عیسائی ہیں۔ خلیل جبران (انتقال فرما چکے ہیں) اور ابو ماضی مرحو کی رائے دیکھنے میں نہیں آئی ہے۔

نورانی صاحب، رفیق ذکریہ، عبدالمغنی وغیرہ مضامین سے یہی تاثر ملتا ہے کہ ان حضرات نے رشدی ک ناول پڑھی ہی نہیں، صرف انگلینڈ کے جرائد اور اخبارات میں نکلنے والے تبصروں ہی سے لکھ لکھا کر کام چلایا ہے۔

بہرکیف، فضا کو مسموم کرنا، گرد و پیش کو تعطل کر دینا اور اول جلول کہنے پر اتر آنا بھدی بات ہے۔ رشدی ک ناول پر ہنگامہ آرائی سعی لاحاصل ہے۔ دور جدید کو قرون میں دھکیلنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ نیرد چودھری نے ہندو کے خلاف لکھا، انہوں نے بھی انعام حاصل کئے۔ اب رشدی میدان میں اترے ہوئے ہیں اور بس۔

ایسی تصانیف پر ہنگامے بپا کرنے والے بالعموم ایرے غیرے ہوتے ہیں۔ نظر انداز کرنا احسن ہے کیونکہ اول جلول باتوں کو شہرت نہیں ملتی۔

قیصر زماں

فرقہ پرستی اور ذرائع ابلاغ

علی گڑھ ان ترقی یافتہ اور حساس شہروں میں ایک ہے، جہاں فرقہ پرستی کے ابھرنے کا خطرہ ہمیشہ بنا رہتا ہے۔ انتخاب کے قریب ہونے سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے احاطے میں سیاسی اکھاڑے بازوں کے متحرک ہونے کی وجہ کر فرقہ پرستی کا خدشہ زیادہ محسوس کیا جاتا ہے۔ انہیں حالات میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ رابطہ عامہ نے "فرقہ پرستی اور ہمارے ذرائع ابلاغ کا رول" کے موضوع پر تین روزہ سمینار منعقد کیا۔ سمینار کے دو دنوں میں "فرقہ پرستی کے مسائل اور پرنٹنگ میڈیا" الیکٹرونک میڈیا (Elaetroniamedia) اور فلم جیسے ذرائع ابلاغ کے کردار کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی۔ سمینار کے تیسرے دن کا موضوع اسی مناسبت سے گنیش شنکر ودیارتھی اور راشٹریہ اندولن تھا۔

فرقہ وارانہ مسائل اور ذرائع ابلاغ کے موضوع پر دنوں کے مباحثے کو سمینار کے ڈائریکٹر کنور پال سنگھ نے پیش کیا، ان کے مطابق فرقہ پرستی ہمیشہ ہی حکمراں جماعت کا ہتھیار رہی ہے۔ انگریزی حکومت نے فرقہ پرستی کو حکومت کے بچاؤ کی خاطر استعمال کیا۔ اور آج وہی مقام ہماری موجودہ حکومت زیادہ بھونڈے طریقہ سے کر رہی ہے۔ اس پر لوگوں کا اتفاق تھا کہ آج کے موجودہ سماج میں الگ الگ ذرائع ابلاغ، رسائل و جرائد، اخبارات و ریڈیو اور دوردرشن کے ذریعے الگ الگ موضوع پر بکاؤ مال کے شکل میں لوگوں تک پہنچانے کی کوشش شعوری اور غیر شعوری طور پر کیا جا رہا ہے موجودہ نظام کی دشواریوں کی وجہ کر اور حکومت کو حصول مقصد کی خاطر بھی ایسا کیا جا رہا ہے۔

سمینار کا شروعات کرتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر سید ہاشم علی نے زور دے کر کہا کہ ملک کی موجودہ نظام فرقہ پرستی کے مسائل کو ابھار رہی ہے۔ انہوں نے افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ آزادی کے بعد ہندو محلوں میں اسکول کھلے ہیں لیکن مسلم محلوں میں پولس کی چوکیاں قائم ہوئی ہے۔

مشہور ڈرامہ نگار حبیب تنویر نے کہا کہ صرف غیر ملکی طاقتیں ہی نہیں بلکہ حکومت کے ٹھیکیدار اور اجارہ دار طبقے دونوں نے مل کر فرقہ پرستی کا کھیل کھیلا ہے —

انہوں نے قومی یکجہتی کے لئے علاقائی تہذیبوں کو مضبوط کرنے پر زور دیا۔

سدھیر پچوری نے اپنی تقریر میں کہا کہ آزادی سے پہلے لوگوں کے پاس مستقبل کا خوبصورت خواب تھا، ایک مقصد تھا۔ اس کے برعکس آج بے روزگاری اور لوٹ کھسوٹ کے مسائل ابھرے جڑی ہوئی اس سماجی نظام کے پاس نوجوانوں کو دینے کی خاطر کوئی خواب اور مستقبل نہیں۔ موجودہ نظام صرف اندھیرا، بے چارگی اور غیر محفوظ ہونے کے مسائل بانٹ رہا ہے۔ موجودہ حکومت نے راجہ اجاریوں کو حاشیوں سے اٹھا کر سماج کی اونچی سطح پر بٹھایا ہے اور ایسے نظام میں مذہب بکاؤ مال کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

دہلی یونیورسٹی کے کمارسیں چکرورتی نے انگریزی رسالہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ رسائل یا اخبارات علاقائی سطح کے ہوں یا کہ قومی اور ملکی سطح کے ان کی پہلی کوشش کم و بیش یہ ہوتی ہے کہ کون سا موضوع بکنے والا ہے؟ اور ایسے حالات میں خاص انداز سے حادثوں کی رپورٹنگ بھی فرقہ پرستی سے معمور ہوتی ہے۔ ہندی رسائل اور اخبارات کے تناظر میں یہ خیالات سدھیر پچوری کے تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ صحافت سے متعلق شافع قدوائی نے اردو رسائل اور اخبارات کو اس قسم کا بتایا۔ شافع قدوائی کا یہ بھی کہنا تھا کہ خاص طور پر آزادی کے بعد اردو کے رسائل اور اخبارات نے مسلم معاشرے کے سینٹی منٹ کو ابھار کر اپنا مارکیٹ بنایا ہے یہی صورت حال اقلیتی طبقے کے رہنماؤں کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے اخبارات کے مدیران کرام کسی نہ کسی سطح پر رہنمائی کا کردار بھی ادا کرتے ہیں۔ اور فرقہ پرستی پر اپنی دوکانیں سجاتے ہیں۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمد حسن نے بھی شافع قدوائی کے خیالات سے اتفاق کیا۔ اور محمد حسن نے کہا کہ آزادی کی لڑائی میں بہت سے اردو اخبارات کے مدیروں نے قلم کے ذریعہ آزادی کے لئے، اور قومی یکجہتی کے لئے جد و جہد کیا تھا اور کچھ نے تو جام شہادت تک نوش کیا۔ اردو کے بڑے اخبارات ہند سماچار، تیج اور بلٹز کے مالک اور مدیر ہندو ہی رہے ہیں۔ یہ بدقسمتی ہے کہ اردو جو آزادی سے قبل ہندوستان کے بڑے حصے میں بلا تفریق مذہب ہندو مسلمان سکھ اور عیسائی کی زبان تھی۔ اسے آج مذہب سے جوڑ کر اور مسلمانوں کی زبان ثابت کر کے فرقہ پرستی کا ماحول پیدا کیا جا رہا ہے۔ محمد حسن نے کہا کہ آج تو لڑائی عوام اور فاسسٹ طبقے کے درمیان ہے اور جس کا بیج ہندو راشٹر کی شکل میں بویا جا رہا ہے۔

گرونانک یونیورسٹی سے آئے ہوئے مقدر سیوا سنگھ نے کہا کہ پنجاب میں پنجابی اور ہندی کے رسائل اور اخبارات فرقہ پرستی کے اس بکاؤ مال پر خوب پھل پھول رہے ہیں، ہندی اور پنجابی رسائل اور اخبارات میں فرقہ پرستی اس حد تک قائم ہو چکی ہے کہ ایک طرف اگر شہید بھگت سنگھ کو آدرش ہندو ثابت کرنے کی کوشش ہوئی ہے تو دوسری جانب امرت دھاری سکھ ثابت کیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود وہاں کے الگ الگ فرقوں میں آج بھی سماجی اور گھریلو رشتے قائم ہیں۔

رمیش کنتل سنگھ کا کہنا تھا کہ پنجاب میں فرقہ پرستی کی تصویر اور ہے ملک کے دوسرے حصوں سے قطعی الگ ہیں۔ وہاں سماجی ماحول ابھی تک بہتر ہے۔ پنجاب کا خاص مسئلہ دہشت پسندی کا مسئلہ ہے۔ اور جس کا شکار سبھی طبقوں کے افراد ہوئے ہیں۔ روزنامہ ہندوستان کے وشوامترا اپادھیا نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آزادی کے قبل رسائل اور اخبارات ایک مشنری کی تھی جب کہ آزادی کے بعد اسی کی صورت بکاؤ مال کی ہو گئی ہے۔ انہوں نے رسالوں اور اخبارات

پر سرمایہ داروں کے دباؤ کی بھی نشاندہی کی ۔

راجندر یادو نے رسالوں اور اخباروں پر سرمایہ داروں کے علاوہ بڑی بڑی کمپنیوں کے دباؤ کو واضح کیا جو رسالوں اور اخباروں کو اشتہار کی شکل میں مالی امداد دیتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جہاں موجودہ حالات میں اقلیتی طبقہ خوف و دہشت کا شکار ہے وہیں دوسری طرف اقلیت کے موقعہ پرست رہنما اور سیاست داں کا معیار بھی اسی فرقہ پرستی پر قائم ہے ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے رضوان حسین کا ماننا تھا کہ اقلیت کی فرقہ پرستی اور اکثریت کی فرقہ پرستی جیسے الفاظ کی جگہ منفی اور مثبت فرقہ پرستی کے الفاظ زیادہ موزوں ہیں۔ کسی بھی شہر میں کسی خاص علاقے میں کسی بھی فرقہ کے منفی فرقہ پرستی کا ماحول بن سکتا ہے ۔

فرقہ پرستی اور الیکٹرونک میڈیا کے سیشن میں بحث کا خاص موضوع دور درشن رہا۔ جہیش درپن کا کہنا تھا کہ دور درشن نے آج کے انسان کو اکیلا بنا دیا ہے، غیر فرقہ پرستی کا ڈھونگ رچنے والا حکمراں جماعت دور درشن کے ذریعے مذہب اور پاکھنڈ کا پرچار کر رہا ہے۔ "بوند بوند" سیریل کے ڈائریکٹر اور رائٹر اصغر وجاہت نے کہا کہ دور درشن کے ذریعے تعصب، غیر سائنسی اور متنازعہ مذہب کے ذریعے ایک کھوکھلا سماج قائم کرنے کا اشتہار کیا جا رہا ہے انہوں نے مزید کہا کہ دور درشن آج صرف سرکاری منڈپ بنا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ دور درشن کو چلانے میں صابن، کپڑا اور تیل بیچنے والے تاجر اور سرمایہ دار ہیں، جن کی کوئی سماجی ذمہ داری نہیں ہوتی۔ اس لئے انہوں نے کہا کہ دور درشن عوام کا ایک مضبوط ذریعہ ہے ۔ وہ عوام کی پونجی ہے ۔ لہٰذا عوام کی مذمت کی کوششوں سے الگ رہنا ٹھیک نہیں ۔ کچھ ایسے ہی خیال رضا امام کا بھی تھا۔ انہوں نے مزید کہا کہ عوام اور دور درشن کا رشتہ ختم ہو گیا ہے۔ جہاں دور درشن صرف خبریں دیتا ہے اور سنہرا و خوبصورت سنسار پیش کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن اور ڈاکٹر قاضی عبدالستار نے کہا کہ دور درشن کے ذریعے غیر سائنسی سوچ، موقعہ پرستی اور مذہبی اندھ وشواس اور پاکھنڈ کا پرچار ہو رہا ہے ۔

فرقہ پرستی کے مسائل اور فلم — کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے رمیش اپادھیائے نے کہا کہ "گرم ہوا" جیسی فلم کو چھوڑ کر دوسری فلموں میں فرقہ پرستی کے مسائل اور مذہبی جذبات کے ساتھ سطحی خیالات سے بھری ہوئی اور جعلی ہوتی ہیں۔ فلم تو اب ایک انڈسٹری کی شکل میں ہے۔ جہاں فائدہ حاصل کرنا ہی ایک خاص مقصد رہتا ہے ۔ سائنسی نظریات، مسائل اور امور سے بچات اور اس قسم کی دوسری امیدیں فلموں سے کرنا عبث ہے ۔ اقتصادی مسائل میں الجھ کر دوسرے موضوعات ختم سے ہو گئے ہیں۔ اس کے علاوہ فرقہ پرستی اپنے آپ میں ایک بڑا مسئلہ ہے ۔ اسے ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی کے آئینہ میں دیکھنا غلط ہے

پروفیسر سکینہ نے موضوع کی سنجیدگی کو بتاتے ہوئے اور فرقہ پرستی کے مسائل کو سمجھنے کے لئے آزادی کی لڑائی اور ملکی وفاداری کے کردار کو سمجھنا ضروری بتلایا۔ انجم نسا بیگم کا خیال تھا کہ آج کی فلم آدمی کے موقع پرستی کو واضح کرتی ہے ۔ اور بتایا جا رہا ہے کہ مِنِشٹم سا ہیرو آکر تمام مسائل کو ختم کر دے گا اس موضوع پر اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر شہریار نے کہا کہ آج مڈل کلاس منفی قدروں کا شکار ہے۔ اور اسی ذہنیت کی فلمیں بن رہی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اقلیت طبقہ کی فرقہ پرستی اپنی سمٹتے رہنے کا مصداق ہے ۔ اس لئے اپنے وجود کی بقا کی خاطر فرقہ سے الگ رہنا اس لئے ضروری ہے ۔ اس کے برعکس اکثریت فرقہ پرستی ملک کے وجود کے لئے خطرے کی علامت ہے ۔

تمام لوگوں کے اظہارِ خیال کا تجزیہ کرتے ہوئے ستیہ پال چوہان نے حکمراں جماعت کے ذریعے فرقہ پرستی کو بڑھاوا دینے کی سیاست پر حملہ کرتے ہوئے کہا کہ آج کے اس سائنسی دور میں حکومت کی سرپرستی میں سمجھ بوجھ کر جاتے ہیں اور اس کی وجہ کر بے قصور اور مظلوم انسان موت کے گھاٹ اتارے جاتے ہیں۔ سیاسی سوداگروں اور شعبدہ بازوں کے ذریعے عوامی اور فلاحی تقریبوں کے دوران ناریل توڑنے اور زمین پوجنے کو لازمی سمجھا جانے لگا ہے اور دوردرشن یا ریڈیو کے ذریعے اس کا بھرپور اشتہار بھی کیا جاتا ہے اور یہ عمل ملک کی سالمیت اور یکجہتی کو بگاڑنے والا ہے۔ فرقہ پرستی سے پیدا شدہ آج سب سے بڑا خطرہ جمہوری حقوق اور قدروں کی پامالی ہے اور موجودہ حکومت کا سب سے بڑی دین ہے۔

ایم۔ جے۔ اکبر اپنی تقریر میں تواریخ کا تجزیہ کرتے ہوئے ثابت کیا کہ آج فرقہ پرستی کی خاص وجہ جنتا دور حکومت میں آر۔ ایس۔ ایس والوں کا رسائل، اخبارات، ریڈیو اور دوردرشن میں شامل کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے افراد ہندو راشٹر کی سطح ہموار کر رہے ہیں۔ بھرت سنگھ نے سوال اٹھایا کہ کیا وجہ ہے کہ آخر غیر کانگریسی حکومت والی ریاستوں میں رام شیلا پوجن یا بابری مسجد جیسے معاملوں کو لے کر لاکھ کوششوں کے باوجود فرقہ پرستی کا بخار نہیں چڑھ سکا۔

تیسرے روز کا سمینار موضوع کے مناسبت سے گنیش شنکر ودیارتھی اور راشٹریہ اندولن، کے موضوع پر ایک سیشن تھا، اس سیشن کے آغاز میں تواریخ کے معروف و مشہور شخصیت عرفان حبیب نے اپنی تحقیق کے موضوع کے حوالے سے کہا کہ گنیش شنکر ودیارتھی مذہب کے ساتھ سیاست کو نہیں ملایا اور وہ ہمیشہ اس کے خلاف رہے وہ بھارت کے نہ صرف سیاسی بلکہ سماجی اور اقتصادی آزادی کے بھی خواہاں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مزدور، کسان کے آندولنوں کو بھرپور مدد کیا اور فرقہ پرستی کے خلاف قلم اور زبان سے جہاد کیا۔

مشہور سماج وادی اور فریڈم فائٹر علی اشرف نے راشٹریہ اندولن اور ہندوستانی تاریخ کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ فرقہ پرستی کے جذبات کبھی دبی ہوئی لہر کی شکل میں اور کبھی حکمراں جماعت کے ہاتھوں کھلی ہوئی ہتھیار کی شکل میں موجود رہا ہے۔ ان مسائل کو ختم کرنے کے لئے ایک نئی سماجی اور ثقافتی کرانتی کی ضرورت ہے۔ گوپال کرشن خرمانے گنیش شنکر ودیارتھی کا قائم کیا ہوا پرتاپ کے اہم کردار کو اجاگر کیا۔ پربھاکر شرمانے گنیش شنکر ودیارتھی کے اخبار کے مزاج اور معیار کا تجزیہ کرتے ہوئے اسیشن دو بھائی جیسے لکھنے والوں کو خراج عقیدت پیش کیا۔ بھرت سنگھ نے راشٹریہ اندولن کے دوران ابھرتی ہوئی مختلف فرقہ پرستوں کے وجوہات اور اسباب پر روشنی ڈالی۔

سیشن کے چیف گیسٹ اور مرکزی حکومت کے ذریعے تیار کئے گئے بھارت کے راشٹریہ اندولن کے تواریخ کے معاون ایڈیٹر جی کے گیرانانے انگریز سرکار کے نوکرشاہوں کو فرقہ پرستی کا ذمہ دار ٹھہرایا۔

اس طرح یہ تین روزہ سمینار میں فرقہ پرستی اور اس کے مسائل، سیاست، تاریخ اور ذرائع ابلاغ و میڈیا کے رشتوں کا گہرائی سے تجزیہ پیش کیا اور اختتام کو پہنچا۔

اس سمینار سے مختلف مکتبہ فکر کے قیمتی اور گرانقدر افکار و خیالات کو جاننے کا موقع ملا۔ اس سے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی فضا قائم ہوئی۔ دلوں سے نفرت اور کدورت کو مٹانے کی کوشش کی گئی۔ مخالفت اور منافرت کی خلیج مٹی۔

مجیبہ مرزا تاباں

تیسرا نقطہ

آؤ ہم اور تم کہیں مل کر بیٹھ جائیں
اور اس کو اپنے درمیان تیسرا نقطہ مان کر
کسی کاغذ پر مرتسم کرلیں
تین، پانچ اور سات
ہم اپنے خود ساختہ مثلثوں میں قید
ہر بات کو خوف سے تکتے آرہے ہیں
کب تک ہمارا خون دشمنوں کی رگوں میں
طاقت بن کر دوڑتا رہے گا
سنو! اب زندگی بہت تیز رفتار ہوگئی ہے
ان کرم خوردہ دیواروں کو توڑ کر
خون اور لوہے کی نئی عمارت بنانے تک
ہم کو چاہیئے
درمیان کا یہ فاصلہ اپنے ذہنوں کے اندر طے کرتے رہیں
ایسا نہ ہو کہ خون چوسنے والے حشرتیوں کی
یہ سرگرمیاں اور بھاگ دوڑ
سماج کے نام پر ہمارے ہاتھ میں ایک کشکول دیدے

زندگی نئے معنی کی تلاش میں

شب تاریک میں ڈھولوں کی آوازیں
ہولے، چیختا جنگل
کہ آسیبوں کا حملہ ہے
ہواؤں میں گونجتے شبدوں کے مرنے کی کتھا کیا ہے
کوئی گوتم، کوئی گاندھی
کچھ اک بات تو ہم اس کو منتر مان لیتے ہیں
کفن خوش رنگ ہوگا اور یہ لاشیں
نمائش کے لئے شیشوں کے کمروں میں سجادیں گے
کہ آنے والی نسلیں جان لیں شاید
ہم ایسی زندگی جینے پہ قادر تھے — جو مردہ تھی!
گلے میں سانپ ہیں سونے کے اور ہونٹوں پہ جینے کی تمنا ہے
تمنا، جس کی خاطر نوجوانوں سے
لہو مانگا، خریدا، جعلسازی کی
ہم اپنے بوڑھے جسموں اور توہم زاد قدروں کا
لباس کہنہ و بوسیدہ پہنے
زندہ رہنے کا عجب ناٹک سا کرتے ہیں!
ہوائیں تیز تر ہیں
اور لفظوں کی نئی شاخیں
نئے معنی، نئے مفہوم کے شعلے اگاتی ہیں
شتر مرغوں کے جھرمٹ، ریت میں آنکھیں چھپائے ہیں
مگر کب تک!
مگر کب تک!

صابر رومانی

اے قلم کارو سنو ......

لوگ بے بہرہ ہیں اپنے آپ سے
بے ارادہ چل رہے ہیں چہرے پر چہرہ سجائے
بے نشاں منزل کی جانب
ٹیڑھے میڑھے راستوں پر
فکر فردا سے جدا ہیں حال میں خود کو بھلائے
آج ہے ہر شخص اپنی ذات میں گم بے طرح
کس کو دشمن سمجھے کوئی کس کو سمجھے آشنا ؟
کون انساں رہنما ہے کون دہشت گرد ہے ؟
پہچاننا ان میں بہت دشوار ہے اچھا برا
آدمی بس آدمی ہے یہ فرشتہ تو نہیں
خیر و شر سے ہے مرکب اس کی ہستی کا خمیر
خیر ہے لیکن بہت کم
شر کا حصہ ہے زیادہ اس لئے ہے وہ شریر
ہے یہ ممکن شر بدل کر خیر ہو جائے کسی دن
جب نہیں مذہب سکھاتا رکھنا آپس میں نفاق
پھر ہوا ہے آدمی ہی آدمی کا کیوں عدو ؟
کیوں نہیں ہوتا کبھی بھی ان میں باہم اتفاق ؟
کیوں ہیں جب سادھے ہوئے ارباب دانش ؟
اہل مذہب کس لئے ہیں شر چھپائے ؟
سرد خانے میں ہے رکھی کس لئے دانشوری ؟
خانقاہ میں منتظر کب غیب سے الہام آئے ؟

بولتا کوئی نہیں
یہ نہیں ہوتا کہ راہِ آدمیت ہی بتائیں
خیر و شر کے فرق کو واضح کریں
بے شعوروں کی ہے منزل کون سی ان کو سمجھائیں
عصرِ حاضر کے قلم کارو سنو
کیا تمہارا رشتہ قائم ہے عوامی زندگی سے
ہے تو پھر کیوں لکھ رہے ہو مدح اپنے قاتلوں کی
جوڑتے ہو کیوں گل و بلبل کا رشتہ شاعری سے
خودکشی سے کم نہیں یہ مجرمانہ خاموشی
ڈال کر اپنے گریبانوں میں دیکھو ہاتھ تم
کیا کرو گے لکھ کے یارو داستانِ حسن و عشق
ہے ضروری اب عوام الناس کا دو ساتھ تم

رام پرکاش راہی

نازیا منہ بن کے جب قدموں کے سر ہو جائے گا
پھر وہ آغاز سفر، ختم سفر ہو جائے گا
روز و شب کا سلسلہ اک ناامیدی سے نباہ
یہ بسر ہونے کی شے ہے یہ بسر ہو جائے گا
کشتیاں ڈوبیں تو موجوں پر یہی کتبہ ملا
ڈوبنے والوں کا اب پانی ہی گھر ہو جائے گا
اس کی یہ سب سے بڑی دانشوری کہلائے گی
آب و دانہ کے لئے جو بے ہنر ہو جائے گا
شل ہوئے ہیں ہاتھ تو غیرت کا تکیہ بھی بہت
اور کیا اپنی دعاؤں کا اثر ہو جائے گا
دیکھ راہی مرحلوں کی خوش ادائی پر نہ جا
یہ سفر، ورنہ سفر اندر سفر ہو جائے گا

∞

بلراج حیرت

اتنی سعادت بھی کیا کم ہے
تیری ملامت میرا بھرم ہے
ہم دنیا والوں کا مقدر
جھوٹی خوشیاں جھوٹا غم ہے
لوک ہلاہل پی کے جئے ہیں
میرے لئے تریاق بھی کم ہے
ان لوگوں کا حال بھی دیکھئے
جن لوگوں پر تیرا کرم ہے
ایک بھیانک خواب ہے دوزخ
جنت بھی انساں کا بھرم ہے
کیا تم اسے بھی پڑھ سکتے ہو
ایک عبارت دل پہ رقم ہے
حیرت اسے ہم کیسے بتائیں
غیرت ہستی بار الم ہے

∞

سیّد شکیل دسنوی

گر ملے اے ہمسفر یہ لوٹ کر کہنا اسے
پاؤں میں الجھے ہوئے ہیں رہ گزر کہنا اسے
گھر مرا صحرا بنا کر جانے والا گر ملے
منتظر ہیں آج بھی یہ بام و در کہنا اسے
گاؤں کی پگڈنڈیوں پر گر ملے وہ منتظر
کر گیا بے سمت مجھ کو یہ سفر کہنا اسے
اپنی آنکھیں نم نہ کرنا، ذکر گر آئے مرا
حال گر پوچھے مرا تو مختصر کہنا اسے
گاؤں میں کوئی پتہ پوچھے اگر میرا شکیل
شہر کے یہ راستے ہیں اپنا گھر کہنا اسے

★

نگاہ مجھ پہ تھی، لیکن دھیان کس کا تھا
تری گلی میں وہ اجڑا مکان کس کا تھا
جہاں پہنچ کے خود عزمِ سفر ٹھہر جائے
یہ رہ گزر میں حسیں سائبان کس کا تھا
تمہیں تھا کتنا بھروسہ گزرے لمحوں کا
رفیق کس کا تھا ظالم، یہ بیابان کس کا تھا
چلو یہ مان لیا میں ہی اپنا قاتل تھا
حلف یہ کس نے لیا تھا، بیان کس کا تھا
زمیں سر پہ تھی، کیسا سفر تھا یہ سیّد
مرے قدم سے جو نکلا وہ آسمان کس کا تھا

★

بدیع الزماں خاور

کھڑا تھا کون کہاں، کچھ پتا چلا ہی نہیں
میں راستے میں کہیں موڑ پر رکا ہی نہیں
ہوائیں تیز تھیں اتنی کہ ایک دل کے سوا
کوئی چراغ سرِ رہگزر جلا ہی نہیں
کہاں سے خنجر و شمشیر آزماتا میں؟
مرے عدو سے مرا سامنا ہوا ہی نہیں
دکھوں کی آگ میں ہر شخص جل کے راکھ ہوا
کسی غریب کے دل سے دھواں اٹھا ہی نہیں
ہمارا شہر تمنا بہت حسین تھا مگر
اُجڑ کے رہ گیا ایسا کہ پھر بسا ہی نہیں
وہ بن گیا مرا ناقد بیتا نہیں کیونکر؟
مرا کلام تو اس نے کبھی پڑھا ہی نہیں
میں اپنے دور کی آواز تھا مگر خاور
کسی نے بزمِ جہاں میں مجھے سنا ہی نہیں

اختر شاہجہانپوری

جو بنے رہتے تھے کل تک آئینہ میرے لئے
ان سے پوچھو کوئی پتھر بھی بچا میرے لئے
یہ مرے احباب تو ہیں میری آنکھیں میرا دل
اس سے بڑھ کر اور ہو سکتا ہے کیا میرے لئے
مفلسی کی اوڑھنی یا تنگدستی کی قبا
جو بھی ہے لے گردشِ ایام لا میرے لئے
میں کبھی کی اپنی بازی ہار بیٹھا ہوں مگر
اب بھی وہ چوکھٹ پہ رکھتی ہے دیا میرے لئے
کاش مل جائے مجھے بھی تیری قدرت کی اماں
چل پڑا ہے پھر بزیدی قافلہ میرے لئے
مجھ کو تو اک عمر گزری خون دل روتے ہوئے
تو فقط اک بار ہی آنسو بہا میرے لئے
حادثہ کہدوں گا اختر بے ضمیروں کی طرح
کچھ نہیں ہے سازشوں کا مسئلہ میرے لئے

تپِ دِق سے جنگ

1. اگر آپ دو ہفتے سے زیادہ سے کھانسی میں مبتلا ہیں یا اپنے تھوک یا بلغم میں خون پاتے ہیں تو آپ پھیپھڑوں کی ٹی بی کے شکار ہو سکتے ہیں۔

2. بلغم کا معائنہ کرائیں، خاص طور پر بلغم کا یہ معائنہ پرائمری ہیلتھ سینٹر، ڈسپنسری یا ٹی بی سینٹر میں کرا سکتے ہیں۔



3. تپ دق کا مکمل علاج ہو سکتا ہے بشرطیکہ ڈاکٹر کی تجویز کی ہوئی دوائیں پابندی سے متعینہ مدت تک کھائی جائیں۔

4. پرہیز علاج سے بہتر ہے، اس لئے اپنے بچے کو بی سی جی کا ٹیکہ لگوائیں۔

سنٹرل ہیلتھ ایجوکیشن بیورو (ڈی۔جی۔ایچ۔ایس)
وزارت صحت و خاندانی بہبود، کوٹلہ روڈ، نئی دہلی 0002

شروَن کمار وَرما

بھاگی ہوئی لڑکی

● بس دھوپ میں تپ رہی تھی۔

وہ کوئی باقاعدہ بس اسٹینڈ نہیں تھا۔ کسی سیاسی دباؤ کے کارن بسوں کا وہاں رکنا لازمی ہو گیا تھا۔ دو چار چھوٹی موٹی دوکانیں اور ڈھابے بھی کھل گئے تھے۔ سڑک سے ذرا ہٹ کر پیپل کا ایک گھنا، پرانا درخت تھا۔ جس کے سائے میں ایک طرف، ڈھنجل سائیکل ورکس تھا۔ دوسری طرف چھولے قلچے والا بیٹھنے لگا تھا۔ پتا لیمن اور سوڈا واٹر کی ریڑھی بھی وہیں کھڑی رہتی تھی۔ پچھلی طرف ہینڈ پمپ تھا۔ بس کا انتظار کرنے والے مسافر بھی، دھوپ سے بچنے کے لئے وہاں جگہ بنا لیتے تھے۔ آس پاس کی زمین بنجر تھی جس پر دن بھر دھول اڑا کرتی تھی۔

مسافر گرمی سے پریشان تھے۔ بس کو بہر حال وہاں ٹھہرنا تھا۔ سب سے اگلی سیٹ پر بیٹھا بزرگ، جو تمام راہ ڈرائیور اور کنڈکٹر کو اخلاقیات اور مذہب پر لیکچر دیتا آیا تھا۔ اب اداسی سے، دور تک پھیلی بنجر زمین کو دیکھ رہا تھا۔ دونوں نوجوان جو راستے میں مزے لے لے کر لڑکیوں کی باتیں کرتے آئے تھے۔ اب پیپل کے سائے میں بیٹھی، کالی، پچکے گالوں اور ابھرے دانتوں والی مذہبن کو دیکھ رہے تھے۔

"یار، یہاں بس روکنے میں کیا تک ہے؟" ایک نے شکایتی لہجے میں کہا اور مذہبن کے چہرے سے نظریں ہٹا کر پتا سوڈا واٹر فیکٹری، پر بنی بھدّی سی عورت کی تصویر کو دیکھنے لگا۔

پچھلی سیٹوں پر ہونے والی گرما گرم سیاسی بحث بھی بند ہو چکی تھی۔ ادھیڑ عمر کے دونوں مرد، جن کی سسرال اتفاق سے ایک ہی گاؤں میں واقع ہوئی تھی اور جن کی بیویاں مائکے میں تھیں۔ دور تک پھیلی بنجر زمین کو زرخیز نہ بنا سکنے پر حکومت کی نکتہ چینی کر رہے تھے۔

ڈرائیور نے آ کر اسٹیئرنگ وہیل سنبھالا۔ کنڈکٹر نے پچھلے دروازے میں کھڑے ہو کر بس کی ٹین تھپتھپائی، انجن اسٹارٹ ہوا، بس نے ہلکا سا جھٹکا بھی لیا۔ پھر انجن بند ہو گیا۔

"اب کیا ہوا سردار جی؟" نوجوان نے اداسی سے پوچھا۔
بس کے چلنے کے احساس سے مسافر [illegible] اٹھلا

میں جو دیکھے سے جل اٹھے تھے، بجھ گئے۔ ڈرائیور نے نوجوان کی بات کا جواب دینا شاید مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وہ گاؤں کی طرف سے آنے والے کچے راستے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گاؤں کی طرف سے ایک لڑکی، بس کو رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے تقریباً بھاگتی چلی آ رہی تھی۔

بائیں طرف والی سیٹوں پر بیٹھے مسافر لڑکی کو دیکھ رہے تھے۔ لڑکی ہانپتی ہوئی بس میں سوار ہوئی۔ مسافروں نے اپنی نشستوں پر پہلو بدلے۔ جو اونگھ گئے تھے انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ بزرگ نے بنجر زمینوں سے نظر ہٹا کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ اٹھ کر اس کا اٹیچی کیس تھاما۔ نوجوانوں نے ایک جگہ پر سمٹ کر اس کے لئے جگہ بنائی لیکن وہ انہیں نظر انداز کر کے دو بوڑھوں کے ساتھ جا بیٹھی۔ دونوں بوڑھے جو اپنی بھینسوں کے ابھارے اور نکمے ڈاکٹر کی نااہلیت کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے، خاموش ہو گئے۔ لڑکی کے بال خشک اور بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے سے پریشانی عیاں تھی اس کا لباس جلدی اور لاپرواہی کی داستان سنا رہا تھا۔ اٹیچی کیس کے شانے، دونوں تالے خراب تھے — ڈھکنا کچھ ابھرا ہوا تھا، جیسے اس میں سامان ترتیب اور سلیقے سے نہ رکھا گیا ہو۔

بس چل دی۔ مسافروں نے کچھ راحت محسوس کی۔ لڑکی باہر اڑتی دھول کو دیکھ رہی تھی۔ نوجوانوں کو گردن گھما کر لڑکی کو دیکھنے میں تکلیف ہو رہی تھی۔ بزرگ نے انجن کے کور پر آ کر بیٹھے کنڈکٹر کو جب اس لڑکی کی طرف دیکھتے دیکھا تو دوبارہ اخلاقیات اور مذہب پر لیکچر دینا شروع کر دیا۔ اس مرتبہ کنڈکٹر بزرگ کی باتوں میں قطعی دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔

دونوں نوجوان اب اپنے معاشقوں کی کہانیاں سنانے لگے تھے۔

"اتنی جلدی میں بھی گھر سے نہیں نکلنا چاہئے۔" ایک نے
"میں نے کسی کو وقت دے رکھا ہے۔" دوسرا مسکرا
"کپڑے تو بدل کر آنا چاہئے تھا۔ سوئے اٹھے اور دیئے۔"

"اس کا اپنا ہی مزہ ہے۔"

ادھیڑ عمر کے دونوں مرد، جو اپنی بیویوں کو لینے اپنی سسرال جا رہے تھے پھر چہکنے لگے تھے۔

"شادی کے بعد عورت کو زیادہ دن مائکے میں نہیں رہنا چاہئے۔"

"مرد کی تو مٹی خراب ہو جاتی ہے۔"

"ایک عورت بھی گواچی (گم شدہ) گاں (گائے) ہو کر جاتی ہے۔"

"کیا ہوتا جا رہا ہے دنیا کو۔" پچھلی سیٹوں سے اخبار والے سردار جی کی آواز سنائی دی — "روز کسی نہ کسی لڑکی کے گھر سے بھاگنے کی خبر چھپتی ہے۔"

"بھاگی کیوں ہو گی، بس وغیرہ سے گئی ہو گی۔"

اس پر کچھ مسافر ہنسے۔ دبی دبی۔ غلیظ ہنسی

"یہ لڑکی کسی بات پر کان ہی کھڑے نہیں کرتی۔ ادھیڑ عمر والے ایک مرد نے کہا۔

"معاملہ گڑبڑ ہے۔" دوسرے نے فوراً تجزیہ کر دیا۔

"فرار ہو رہی ہے۔" نوجوان نے دبی آواز میں جاسوسی کی

"اکیلی ہی۔" دوسرا متوجہ ہوا

"بڑی چالاک ہوئی ہیں آج کل کی لڑکیاں، یار پہلے ہی پلان کیا ہو گا۔ اب تو سب کچھ پہلے ہی وکیل، ڈاکٹر کی صلاح سے ہوتا ہے۔"

بس میں سرگوشیاں ہوتی رہیں۔ لڑکی چپ چاپ، آنکھیں موندے بیٹھی رہی، اس کا چہرہ زردی مائل ہو رہا تھا۔ ہونٹ جیسے شدید پیاس سے خشک ہو رہے تھے۔ کنڈکٹر نے بزرگ کی دا

ـ پر چلنے والی باتوں کو نظر انداز کر کے ڈرائیور سے کہا۔
استاد جی، بیڑی کچھ ڈاؤن لگ گئی ہے۔"
ڈرائیور نے ہاتھ بڑھا کر عقبی آئینہ کا زاویہ اس طرح
، دیا کہ اس میں لڑکی کا عکس بالکل صاف ہو گیا۔
" آہو (ہاں) ورک شاپ میں جانے والی لگتی ہے۔"
" ہیڈ لائٹس تو ٹھیک ٹھاک ہے۔
" رات کو پتہ چلے گا۔"
"کل جو گاڑی ملی تھی، اس کا تو لولو رام " ہی ہو رہا تھا۔
جو مزہ نئے ٹائر ٹیمبوں پر گاڑی چلانے کا ہے، وہ
ں پر کہاں۔ خوب بھگا کر کھٹاک سے بریک لگا ؤ تو گڈی
ی) کی چیکیں (چیخیں) نکل جاتی ہیں۔"
اخبار والے شخص نے اپنے ساتھی جس سے وہ مورتی
پر بحث کے دوران تکرار پر اُتر آیا تھا۔ کہا
کچھ کہو جی، مورتیوں کے دو فائدے ہیں۔ ایک تو من
تا نہیں تیجے مورتی کلا کو بڑھاوا ملتا ہے۔ خوبصورت مورتیاں
کپڑے، گہنے۔۔ قبول مالائیں اور بار سنگھار من میں سوچھ
،) وچار پیدا کرتے ہیں۔ اس لئے تو بھگوان کی بنائی ہوئی
ں، سبھی دیوی جی، مسکراتی ہوئی اچھی لگتی ہیں۔"
آریہ سماجی نے لڑکی کی طرف دیکھا اور بولا
" مورتی پوجا سے گیان پراپت نہیں ہوتا۔"
" آنند تو ملتا ہے۔"
" گیان سے ترک اور ترک سے وِواد پیدا ہوتا ہے۔"
، نے کنڈکٹر کو سمجھایا۔
" استاد جی، نرس لگتی ہے۔" کنڈکٹر نے بہت سوچ
ے بعد کہا۔
" نرسیں تو نمکین ہوتی ہیں، یہ استانی ہو گی۔"
" ٹیلی فون آپریٹر بھی ہو سکتی ہے۔"

" کنکشن ملاتی ہے۔"
سردار جی دیکھنا، سامنے سے ٹرک آ رہا ہے۔" بزرگ
نے بتایا۔
" جب سے لڑکیاں کام کرنے لگی ہیں، گھر سے نکلنے کا
کا بہانہ مل گیا ہے۔" ادھیڑ عمر کے شخص نے کہا: " فیملی پلاننگ
کے اشتہاروں نے اور بھی سہولت پیدا کر دی ہیں۔"
" کنواری ہے۔ ؟" نوجوان نے جیسے خود سے کہا۔
" نہیں غیر شادی شدہ۔" دوسرا مسکرایا۔ چہرہ پڑھو چہرہ،
سب لکھا ہے وہاں۔
" ہے بہت چالاک، چہرہ کیسا بنا رکھا ہے تاکہ کسی کو
کوئی شک بھی نہیں ہو۔"
بس نہر کے ایک پل پر رکی۔ لڑکی نے بس سے اترنے
سے پہلے کنڈکٹر سے ٹکٹ دینے کے لئے کہا تو اس نے مسکرا کر
جیسے ٹال دیا۔
" کوئی بات نہیں، پھر کبھی سہی۔ آتے جاتے ہی رہنا ہے۔"
لڑکی نے اداس سے کنڈکٹر کی طرف دیکھا، ہاتھ میں
پکڑے پیسے پرس میں ڈالے اور اٹیچی اٹھا کر اترنے لگی۔ اکڑی
ہوئی ہیری میں چپل پھنسنے سے اسے جھٹکا لگا۔ اس نے خود
کو سنبھالنے کے لئے بس کا سہارا لیا تو اٹیچی کیس اس کے ہاتھ
سے نکل کر نیچے جا گرا۔ ڈھکن کھل گیا تمام چیزیں ادھر ادھر
بکھر گئیں۔ کئی مسافر ایک ساتھ اس کی مدد کے لئے اترے
نوجوان ادھیڑ عمر کے دونوں مرد، آریہ سماجی پرچارک،
بھینسوں والے جاٹ اور کنڈکٹر اس کی چیزیں اٹھا اٹھا کر دینے
لگے۔ بھیڑ میں گھری سڑک پر بیٹھی جلدی جلدی ہر چیز اٹیچی میں
ڈالے جا رہی تھی۔ ایک نوجوان آریہ سماجی پرچارک کو ایک
طرف ہٹا کر سڑک کے قریب پہنچ گیا۔ اس کا ننھا سا رومال اور
ایک لفافہ تو جھکے سے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ لیکن پتہ لکھا ہوا

کاغذ اسے تھما دیا۔ اور بولا۔

" یہ ادھر پڑا تھا بس کے نیچے۔"

" یہ میرا نہیں ہے۔ لڑکی نے اداسی سے کہا اور کسی طرح اپنی ہچکیں بند کر کے گاؤں کی طرف جانے والی سڑک پر ہو لی۔

جب بس دوبارہ چلی تو نوجوان نے وہ رومال نکال کر سونگھا۔

سالی لہسن پیاز کی بو آرہی ہے۔ ویسے میں ثبوت لے آیا ہوں۔ یار کو ملنے گئی ہے۔"

" گوپی جنید جاسوس کی اولاد۔ یہ کیسے کہدیا۔"

" ثبوت لایا ہوں جان من" اس نے جیب سے لفافہ

" یہ تو ٹیلی گرام ہے۔ لکھا ہے۔ ماں سخت بیمار ہے۔ فوراً آؤ۔"

" ہت تیرے کی۔ بور کر گئی سالی" نوجوان نے اور ٹیلی گرام مروڑ کر باہر پھینک دیا۔

کنڈکٹر بس میں چھائی خاموشی سے اکتا کر ٹیپ کردی۔

" او ہی کڑی (لڑکی) نہیں اے۔"



الیاس قریشی

ہم میں ٹنگا، میں

مسیش نے گھنیری جھیل میں ڈوبی آنکھوں کا
قفل توڑ کر اس کی طرف دیکھا وہ آنکھیں موندے اندر ہی
اندر بیدار رہا تھا وہ مسکرا بھی رہا تھا رو بھی رہا تھا کہ شاید
حالات کی مشین سے احساس کی قندیل بجھا دی ہے کہ مسکرانے او
رونے پر اس کی طرح مجھے بھی اختیار نہیں رہا۔ اب تو سارے
احساسات مشین کے کل پرزے ہیں۔

میں اس کی طرف ایک ٹک دیکھتا رہا کہ اتنے میں
خاموشی کا لشکر بیدار ہوا اور تلوار میں سونت کر مجھ پر پل پڑا
میں اس سے گویا ہوا ہم کب تک ایسے رہیں گے؟

میری آواز اس کی سماعت کے جنگل میں اس سرے
سے اس سرے تک سنسناتی ہوئی چلی گئی تو اُس نے پلکوں کو
اٹھا کر میری طرف دیکھا اور پھر گھنیری چپ کی جھاڑیوں کو
سمیٹ کر بولا جب تک مقدر میں لکھا ہے۔

میں نے آواز کو زبان پر رکھ کر چکھا کوئی بھی ذائقہ
نہ پایا تھا میں نے پھر پوچھا لیکن کوئی تو حد ہو گی۔

وہ آنکھوں کے گھوڑوں کو ارد گرد سرپٹ دوڑاتے
ہوئے بولا۔ وہ... وہ تو حالات پر منحصر ہے اور حالات کے

گھوڑے پر کوہ ندا کا دیو بیٹھا ہم پر کوڑے برسا رہا ہے اور
اب ہم ہم نہیں رہے میں بن گئے ہیں صرف میں جس سے اچھی
طرح واقف بھی نہیں۔

میں سر جھکا کر بولا۔ ہاں اب تو صرف میں ہی رہ گیا ہے
لیکن یہ میں ہے کیا۔

وہ دکھ کی لہروں کو چہرے پر سجاتے ہوئے بولا۔
میں صرف میں ہے جو شاید ہمیں نظر نہ آنے کی قسم کھا چکا ہے
کہ ناکردہ گناہوں کا بوجھ ہمیں ڈھکیلے ہوئے ہے۔

پھر ہم دونوں آنسوؤں کے کٹورے چہرے پر انڈیلتے
ہوئے آسمان کی طرف سر اٹھا کر دعا مانگنے لگے۔

اے وہ کہ جسے ہم جانتے ہیں
پہچانتے نہیں
ہمیں کون سے
ناکردہ گناہوں کی سزا دے رہا ہے
جسے ہم نے کیا ہی نہیں
اے وہ کہ جسے ہم جانتے ہیں
پہچانتے نہیں

ہمارے سروں پر
منڈلاتے خشک بادلوں سے کہو
کہ اپنی کوکھ
ہمارے واسطے کھول دے
کہ سلگتے موسموں کا عذاب
ہمیں جھلسا رہا ہے اور
صدیوں کی گرد
ہم پر دبیز ہوتی جارہی ہے

ایک بار پھر ہم دونوں جیپ کے جنگل میں گھس پڑے
اور اپنے میں کو تلاش کرنے لگے ہیں کہ میں کا دکھ ہم پر بہت بھاری
ہے ساری جھاڑیاں و سارے پتوں میں تلاش کرنے کے بعد
گدلے پانی میں چل پڑے اور ڈبکیاں لگانے لگے کہ شائد یہیں کسی
کونے میں دبکا ہو مگر وہ نہ ملا اور ہم تھکن سے چور چور ہوگئے
تو وہ بولا ہم ہم نہیں رہے اور ہمارا رہا سہا آخری سہارا میں
جدا ہوگیا اب یہاں اپنا کچھ بھی تو نہیں رہا کہ جس کے لئے ہم کوہ ندا
کے دیو سے لڑیں کہ اپنا یہاں کچھ بھی تو نہیں رہا کہ جس کے لئے
ہم کوہ ندا کے دیو سے لڑیں کہ اپنا یہاں کچھ بھی تو نہیں رہا۔

میں غم کے لشکر سے خود کو بچانے کی ناکام کوشش
کرتے ہوئے بولا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جس طرح ہم اسے کھوج
رہے ہیں اسی طرح وہ ہمیں تلاش کر رہا ہو۔

وہ بولا ہو سکتا ہے کہ پہلے ہمارے پیچھے میں دوڑتا
تھا اور ہم اسے نظر انداز کرتے تھے کہ اچانک وہ گم ہوگیا تو اب
ہم اسے تلاش کر رہے ہیں اور وہ نہ جانے کہاں غائب ہوگیا ہے

میں بولا اب تو ہمارے اندر صرف جدائی کے گیت ہی
سرسراتے ہیں
برگد کی اس اونچی ٹہنی پہ
جہاں نرم و ملائم
ہرے پتوں کے کمزور رگوں میں
ٹہنی سے جدا ہونے کا خوف
سرسراتا رہتا ہے یا
جہاں ایک انجانا سایۂ
زندگی و موت کو
الگ الگ خانوں میں
بند کئے ہوئے ہے یا
جہاں زندگی کے سارے بلب
جلنا بجھنا بھول کر
جیپ کا ایک موٹا کمبل اوڑھے پڑے ہیں
کیا میں وہاں ہے

اس نے دور دور تک نگاہوں کے گھوڑے د
اور جب آخری گھوڑا تھکن سے نڈھال ہو کر گر پڑا تو اس
نگاہوں کی لگام سمیٹ لی اور آنسوؤں سے چہرے سے
گرد کو مقدور بھر صاف کرنے لگا تو میں اکتا کر بولا کیا،
لوٹ بھی نہیں سکتے ؟

وہ بولا اب مراجعت ممکن نہیں کہ ہم بے فکری۔
کاندھوں پر سوار انجانے میں جان بوجھ کر اتنی دور او
مقام پر آنکلے ہیں کہ اب سوائے آگے سفر کرنے کے لوٹنا
نہیں رہا۔

میں امید کے کبوتر اڑاتے ہوئے بولا۔ ہم اپنے قدمو
نشان کے سہارے لوٹ سکتے ہیں۔

وہ بولا کوہ ندا کا دیو قدموں کے نشان مٹا چکا
اور واپسی کے سارے راستوں پر اسی کا پہرہ ہے

اب ہم دونوں آسمان کی طرف سر اٹھا کر زور ز
سے چلا کر کہنے لگے۔ اے وہ کہ جسے ہم جانتے ہیں پہچانتے ہ
تو کہاں ہے .... تو کہاں ہے ..... تو کہاں ہے اور جب

چلاتے چلاتے سانس پھول گئی تو رک کر دم درست کرنے لگے اور ساتھ ہی ساتھ چیخ چیخ کر کہنے لگے۔ اے وہ ابابیلو

کہ تم نے ہمیں
ہاتھیوں والوں سے
بچانے کی خاطر
اپنی چونچوں میں
کنکریاں لے کر آئے تھے

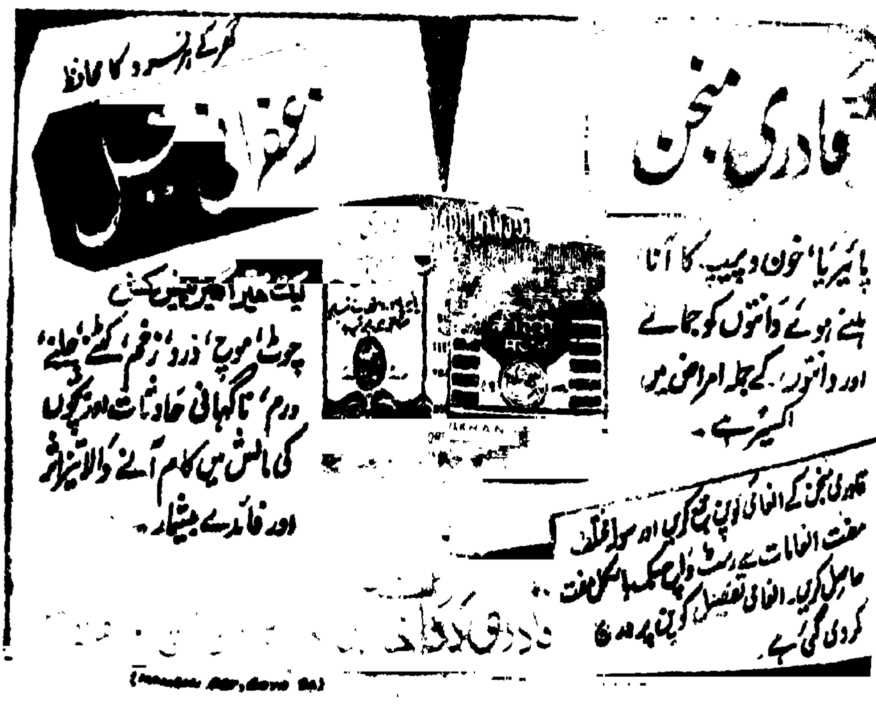
اب تم کہاں ہو
ہماری بوڑھی و جوان آنکھیں
آسمان کی وسعتوں میں
تمہیں تلاش کر رہی ہیں
کہ ہمیں پھر تمہاری ضرورت آن پڑی ہے۔
کہ ہم پر کوہ ندا کا دیو مسلط ہے

ہم دونوں تھک کر چپ ہو گئے کچھ دیر کے بعد وہ گویا ہوا ہم ایک ایسے مقام پر آ گئے ہیں جہاں سے واپسی کا سفر ممکن نہیں اور آگے سفر جاری رکھنا بھی محال ہے کہ آگے گھنا سیاہ اندھیرا راستہ روکے کھڑا ہے۔

میں بولا۔ شاید ہم صرف حالات ہیں کہ ہم پر میعاد کا ... لہراتا ہوا سوار ہمیں جس طرف چاہتا ہے موڑ دیتا ہے کہ ہم صرف حالات ہیں۔

(بقیہ۔ فرقہ پرستی اور ذرائع ابلاغ)

سوچنے اور سمجھنے کا معیار بدلا اور قریب سے قریب تر ہونے کا جذبہ پیدا ہوا۔ اگر اس قسم کے موضوعات پر ہندوستان کے دیگر شہروں میں نشست اور سیمینار کیا جائے تو موجودہ سلگتے ہوئے ماحول میں فرقہ پرستوں کو ابھرنا مشکل ہو جائے



نیشنل سیونگ کی رقم کے بڑھتے پروگرام

نیشنل سیونگ کے پروگراموں میں رقم لگا کر اپنا مستقبل سوارئیے

- کسان وکاس پتر — جمع کی گئی رقم 5½ سال میں دوگنی ہو جاتی ہے۔
- اندرا وکاس پتر — جمع رقم پانچ سالوں میں ہی دوگنی ہو جاتی ہے۔
- راشٹریہ بچت پرمان پتر آٹھواں نگم — لگائی گئی رقم چھ سالوں میں دوگنی سے بھی زیادہ جمع رقم اور حاصل شدہ سود پر انکم ٹیکس کی دھارا 80 سی کے تحت چھوٹ۔
- راشٹریہ بچت یوجنا 1987ء = 11% سالانہ سود حاصل ہے سال میں جمع کی گئی پوری رقم اور حاصل سود پر انکم ٹیکس سے چھوٹ۔
- 15 سال کا لوک بھوشیہ نیدھی — جمع رقم پر 12% پوری طرح انکم ٹیکس سے مستثنیٰ جبکہ وردھی سود کی ادائیگی۔ و تیرہ ٹیکس میں چھوٹ۔ سال کی جمع رقم پر 80 سی کے تحت بھی انکم ٹیکس سے چھوٹ۔
  ماہنامہ آمدنی پروگرام — 10,000 روپیہ جمع کرنے پر ہر ماہ 100 روپیہ سود حاصل ہوگا۔ 6 سال کے بعد 10% بونس سمیت 11,000 روپیہ واپس
- جمع رقم ریٹائرڈ سرکاری ملازمین جمع رقم — جمع رقم پر 9% کی در سے سود کی ادائیگی ہر طرح کے ٹیکس سے مستثنیٰ ہے۔ سود کی ادائیگی ہر چھ ماہ کے بعد 30 جون اور 31 دسمبر کو لے سکتے ہیں بغیر کسی سیما کے ویلتھ ٹیکس سے مستثنیٰ

نیک خواہشات کے ساتھ

ڈائریکٹر راشٹریہ بچت، محکمہ مالیات، بہار

شہرِ خیال

محترمی ۔ تسلیم

تازہ شمارہ مل گیا ہے ۔ دیکھا ۔ ڈاکٹر گیان چند کا مضمون خاص دلچسپی سے کیونکہ اس کا موضوع خصوصاً میرے کام کا ہے ۔ اور کچھ اس لئے بھی کہ اس میں میرا ذکر کافی ہے! یہ تو اپنے عقیدوں کی بات ہے ۔ اس میں بحث کے لئے بہت گنجائش بھی کہاں ، مگر مجھے یہ دیکھ کر تکلیف ہوئی کہ بڑے بڑے اہلِ علم بھی بعض معاملوں میں کس قدر تنگ نظر ہوتے ہیں ۔

امید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے

نیاز مند —— امرت رائے الٰہ آباد

محترمی ، تسلیم

سہیل کے دو شمارے ایک ساتھ موصول ہوئے ۔ اس عنایت کے لئے شکر گزار ہوں ۔ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کے مضمون سلمان رشدی کی سیاہی اڑی ہوئی ہے جس کی وجہ سے یہ پڑھا نہیں جا سکا ۔ اگر اس کی کوئی صاف کاپی ہو تو عنایت کریں

آپ کا :- رام لعل ۔ لکھنؤ

محترم مسعود صاحب ۔ آداب

"نمود" میں آپ کے خیالات و تاثرات کو جھٹلایا نہیں جا سکتا ۔ اس بارے میں کوئی دوسری رائے نہیں ہو سکتی کہ قلم کاروں ، اور فنکاروں کو سیاسی اداروں کی طرف نہ دیکھ کر خود کوئی مثبت کردار ادا کرنا چاہئے ۔

یہ ناممکن تو نہیں کہ ہر دور میں ایسا ہی ہوا ہے ۔ انقلابِ فرانس ہو کہ انقلابِ روس ، ادیبوں اور شاعروں کی آواز ان کا پیش خیمہ رہی ہے ۔

اس کارِ خیر میں جرأتِ رندانہ کی ضرورت ہوتی ہے ۔ آج کل جب ذاتی مفاد ، قومی اور ملکی مفاد سے بدتر ہے ۔ اس قسم کی امید رکھنا غلط نہیں تو خواب دیکھنا تو ہے ہی ۔ آج عوام جن حالات کا شکار ہیں ، ہمارے سیاسی رہنماؤں کی دانستہ کوششوں کا نتیجہ ہے کانگریس کے مہاتما گاندھی کی تصویر لٹکا کر ہندوستان میں کیپٹلزم کی جڑیں مضبوط کی ہیں اور تمام برائیاں ، کمزوریاں ، خامیاں اور بے ایمانیاں جو اس نظام سے لازماً پیدا ہوتی ہیں ، ہمارے سامنے منہ پھاڑے کھڑی ہیں ۔

کانگریس نے ان پڑھ ، بھولے بھالے عوام سے سفید جھوٹ بولا اور ووٹ حاصل کرتی رہی ۔ اپنی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے اس سیاسی جماعت نے گراس روٹ لیول پر بدکردار اور ناقابلِ یقین قولوں کی سرپرستی کی ۔ تنظیمی ڈھانچے میں ان کا عمل دخل اس قدر بڑھا دیا کہ اب ہر طرف سوائے بھرشٹاچار ، رشوت ، بے ایمانی اور سیاسی ہتھکنڈے بازی کے اور کچھ نظر نہیں آتا ۔

عوام سے یہ مذاق آج بھی جاری ہے ۔ ہمارے موجودہ معاشرے کی بنیاد ہی سرمایہ دارانہ نظام کے اصولوں پر رکھی گئی ہے ۔ کبھی زبان کا مسئلہ ، کبھی دھرم کو خطرہ ، کبھی مذہب کے نام پر فسادات یہ سب لوگوں کو

اصل موضوع سے گمراہ کرنے کے لئے ہے۔ مہنگائی، کرپشن، زوال آمادہ تعلیمی ڈھانچہ — ریڈیو، ٹیلی ویژن، اکادمیاں، انعام و اکرام، سرکاری نوکریاں، غیر ملکی دورے اور دوسری سہولیات آج قلمکاروں اور فنکاروں کو سر بازار خرید رہی ہیں۔ جو نہیں بکتا اسے مٹا دیا جاتا ہے۔

کہتے ہیں حکومت بدلی ہے۔ کیا سچ مچ ایسا ہوا ہے۔ چہرے بدلے ہیں۔ کانگریس نکالے جانے والے کیا ایک دم سے نیک اور مخلص ہو گئے۔ ذاتی عناد اور رنجشوں کو بنیاد بنا کر کئے گئے فیصلے کبھی عوام کے حق میں نہیں ہوا کرتے۔ جنتا دل دیکھیں ان جتوں کو بھی نسبت ہے (دوری) کو لتعاون۔ بننے سے کیا بی جے پی کا کردار بدل گیا۔ اجیابکے مذہب میں یقین رکھنے والی قوت اور ان کے سربراہوں سے سمجھوتہ کر لینے سے کیا مسائل کا حل نکل آیا ہوگا۔

پنجاب اور کشمیر کے حالات اس نئی حکومت کے آنے کے بعد اور بھی خراب ہوئے ہیں اور مزید ہوں گے۔ مہنگائی بڑھی ہے، اشیاء خورد نی کی قیمتیں بڑھی تو اس لئے نہیں کہ پچھلی حکومت نے سرمایہ داروں سے کروڑوں روپیہ لیا تھا۔ اب کم کیوں نہیں ہوتیں۔

پھر بھی مایوس ہونا کفر ہے۔ جو لوگ اپنی قیمت وصول کرتے ہیں وہ سیاست داں ہوں کہ ادیب یا شاعر، ہوتے تیسرے درجے کے ہیں۔ ایسے لوگوں کی کسی دور میں کمی نہیں رہی۔ ان سے کوئی امید رکھنا خود فریبی میں مبتلا ہونا ہے۔ پھر بھی ایسے کچھ لوگ تو ہوتے ہی ہیں جو زہر پی جایا کرتے ہیں، بکتے نہیں۔

لیکن آپ کے یہ چند الفاظ بھی انہیں کے لئے ہیں۔ ایک یہ سے درخت پھوٹتا ہے۔ ایسا ہوگا۔ انشاء اللہ

تازہ شمارہ میں رؤف خیر صاحب کی نظمیں اور غزل بہت پیاری ہیں۔ غزل کے مقطع میں تخلص دیکھئے کس خوبصورتی سے آیا ہے میری ان سے مبارکباد پہونچا دیجئے۔

عزیز گرامی، سلام مسنون

سہیل کا تازہ شمارہ کل ملا۔ بدقسمتی سے جناب اصغر انجینئر اور ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کے مضامین کی طباعت ایسی ہے کہ ایک جملہ بھی پڑھنے میں نہیں آسکا۔ اس لئے اگر ممکن ہو تو ایک صاف جلد بھیج دیجئے اور اگر سبھی جلدوں کا حال ایسا ہے تو یہ دونوں مضامین جو بہت اہم ہیں دوبارہ شائع کیجئے تاکہ قارئین اس سے مستفید ہو سکیں۔

ایک بات اور۔ بہت دنوں سے سوچ رہا ہوں کہ اس سلسلے میں خاموش رہوں مگر آج بات زبان پر آ گئی۔ مجلس مشاورت میں زیادہ نام ایسے ہیں جو سہیل کے لئے کچھ نہیں کر رہے ان میں سر فہرست ڈاکٹر قمر رئیس کا نام ہے جو اقبال کر چکے ہیں۔ سہیل کے لئے کچھ نہیں کر پا رہے ہیں۔ کیا اس قسم کے ناموں کو مجلس مشاورت میں شامل کرنا سہیل کو کوئی فائدہ پہونچا تا ہے

آپ کا — ملراج حیرت، نئی دلی

مکرمی برادر جمیل صاحب، آداب

آپ کا خط ملا تھا اس کے علاوہ دونوں شمارے ملے، میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ اس بار شمارہ کی کتابت اور طباعت غنیمت ہے۔ آپ پروف ریڈنگ پر توجہ دیں۔ نیز طباعت پر اور بھی توجہ دیں۔

بقیہ احوال بخیر ہیں۔ آپ کے جواب اور آپ کی خیریت کا انتظار کروں گا۔ خدا کرے مزاج بخیر ہوں۔

نیاز مند۔ محمد قیصر زماں۔ گریڈیہہ

مشفق من! سلام و آداب

میں نے سہیل کا تازہ شمارہ پڑھ کر اپنے ایک ادب نواز دوست کو دے دیا تاکہ نمود کا ہلکا سا خاکہ ا

اس وقت جبکہ فسطائی قوتیں جا بجا سر اٹھا رہی ہیں اور رجعت پرستی ہماری پیش قدمی کے لئے سد راہ بنی ہوئی ہے۔ ترقی پسند تحریک کو اور تیز کرنے کی ضرورت ہے آج بھی اس کی اہمیت و ضرورت اتنی ہی ہے جتنی کہ پچاس پچپن برسوں پہلے تھی۔

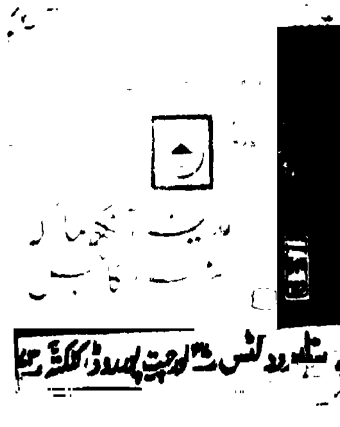
خلوص کار۔ صابر رومانی،

مکرمی جمیل منظر صاحب، سلام مسنون

سہیل کا تازہ شمارہ کل کی ڈاک سے ملا۔ آپ ہیچمدان کو دفعتاً فوقتاً یاد کر لیتے ہیں اس کے لئے بے انتہا شکر گذار ہوں۔ گذشتہ دنوں کچھ زیادہ ہی مصروف رہا اور سہیل سے رابطہ نہ بنائے رکھ سکا معذرت خواہ ہوں۔ ویسے کالج میں سہیل پابندی سے زیر مطالعہ رہا ہے اور اس میں جو نکھار آرہا ہے میں بھی اس کا ایک عینی شاہد ہوں۔

خدا کرے آپ بخیر ہوں۔

آپ کا۔ یعقوب یاور



محبی مدیر صاحب۔ آداب

ابھی ابھی کالی کٹ (کیرالا) سے واپسی ہوئی تو دیکھا کہ سہیل کے کئی شمارے پڑے ہوئے تھے۔ دیکھ کر دل خوش ہوگیا کہ مجھ غریب پر ابھی تک آپ عنایت فرما رہے ہیں جبکہ میں نے زر تعاون بھیجنے میں بہت کوتاہی کا ثبوت دیا ہے۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے ہو یہ بہت بعد میں ہوا خیر سے میں خوش نصیب ہوں کہ مجھے اپنی غلطی کا پتہ تو چلا۔ جب کہ اردو والے اب احساس سے عاری ہو چلے ہیں۔ اب تو لوگوں کا ذہنی معیار اتنا گر گیا ہے کہ صرف باتصویر اور دلچسپ رسائل ہی خریدتے ہیں جن سے صحت مند ذہن کو کوئی غذا نہیں ملتی۔ اگر آپ بھی کچھ ایسا کریں کہ پھر دیکھئے گا کہ سہیل کی شرح اشاعت کتنی بڑھ جاتی ہے۔ مگر ایسا کرنا آپ کو زیب نہیں دیگا۔ اس لئے جیسا نکل رہا ہے نکلنے دیجئے۔ خدا نے چاہا تو ایک دن سہیل پھر اپنا پرانا وقار ضرور واپس لے آئے گا۔ خدا جلد کوئی ایسی صورت نکال دے گا کہ میں سہیل کے لئے کچھ کر سکوں۔

نیک خواہشات کے ساتھ

آپ کا، حقانی القاسمی

محترمی مدیر سہیل

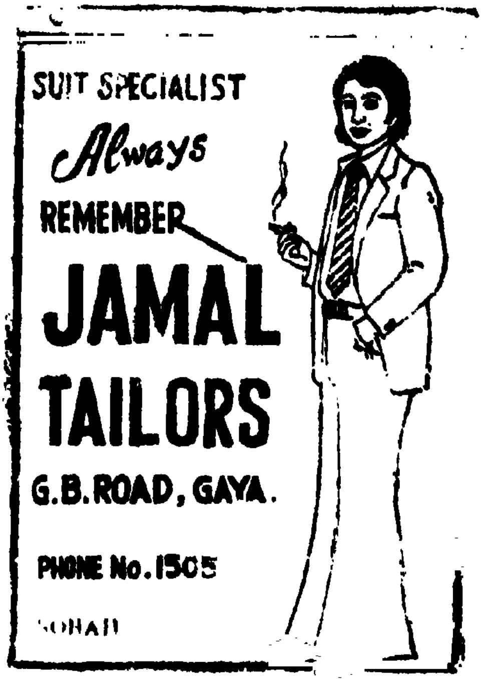
آپ سے مخاطب ہونے کے لئے مجھے مناسب الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔ آج سے تقریباً بیس سال پہلے سہیل میں میری ایک کہانی کا ترجمہ آیا تھا۔ اس کے بعد کبھی "سہیل" کو کچھ بھیجا یا نہیں بھیجا کچھ یاد نہیں۔ ویسے بھی میں ایک طویل عرصہ تک ادبی ۱۹۸۰ تا ۱۹۸۸ سے کافی دور ہو گیا تھا۔ ادھر تین سال سے پھر تجدید شوق ہوئی ہے۔


GASOONA
UNANI PRODUCTS


TEKKA
ROSE WATER
عطر مجموعہ
TEKKA
KEORA WATER
عطر فردوس
P-11 NEW HOWRAH BRIDGE



... مسلم یونیورسٹی علیگڑھ



ماہنامہ



March - 90

Rs. 3.00

بانی :۔ حافظ محمد عبدالرحمٰن بسمل سنسہاروی —— بیادگار :۔ زین العابدین احمر وادرلیس سنسہاروی

ماہنامہ سُہیل گیا

فہرست

نمود ۵
افسانہ جدید افسانہ .... ڈاکٹر محمد حسن ۷
غزلیں ..... ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد ۱۰
کشمیر میں اردو نثر نگاری ..... ڈاکٹر برج پریمی ۱۱
غزل .... فضا ابن فیضی ۱۶
ڈاکٹر ظ۔ انصاری ..... قیصر عثمانی ۱۷
غزل .... علی عباس ازل ۲۱
نیا موسم .... شردن کماروِرما ۲۱
غزلیں ...... یعقوب یاور ۲۲
غزلیں .... کرشن پرویز ۲۳
غزلیں ..... اختر شاہجہاں پوری ، اعجاز طالب ۲۵
تیری آواز ..... جینت پرمار
موسم ... سریش دلال ۔ ترجمہ :۔ جینت پرمار ۲۶
دعا ..... صابر رومانی ۲۷
ہو کبھی اور نہیں بھی ..... ہنسراج رہبر ۲۸
بازیافت .... شام بارکپوری ۳۴
نئی کتابوں کا تعارف ، تاراچرن رستوگی ، مطالعاتِ ۳۷
شہرِ خیال ۴۱

مجلسِ مشاورت

ڈاکٹر تاراچرن رستوگی
ڈاکٹر قمر رئیس
اصغر علی انجینئر
قیصر عثمانی
ڈاکٹر برج پریمی
شاہد احمد شعیب
ڈاکٹر محمد مثنیٰ
ڈاکٹر علیم اللہ حالی

چیف ایڈیٹر :۔ مسعود منظر
ایڈیٹر :۔ جمیل منظر
معاونین :۔ شکیل احمد جمالی ، عبدالقیوم ابدالی
• کتابت :۔ سید عبدالاحد گیاوی •

شمارہ ۳ جلد ۵

بدلِ اشتراک
فی شمارہ :۔ ۳/- روپے
زرِ سالانہ :۔ ۳۶/- روپے
تاحیات ممبری ۵۵۱ روپے

◆ خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ ◆

ماہنامہ سُہیل گیا
ریلوے سائیڈ روڈ ، گیا ، (بہار)

فون نمبر ۲۳۱۵۷۳

نمود

سیاسی تبدیلی — سماجی اور معاشرتی تبدیلی کا باعث ہوتی ہے۔
اور
تبدیلی کی لہریں
جب تیز رفتار ہوتی ہیں
تو ادب اور تہذیب پر بھی اس کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں
یہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے
مگر
ایسا لگتا ہے کہ "اردو والوں" پر یہ بات صادق نہیں آتی۔ ان کا ذہنی انجماد ہی ان کا مذہب و ایمان ہو کر رہ گیا ہے۔
اردو کی بعض انجمنوں کی ساخت تو جو تھائی دہائی قبل جیسی تھی —— اب بھی ویسی ہی ہے
ان انجمنوں کے اربابِ اقتدار —— دس بیس برسوں سے "کرسی" پر قابض ہیں اور صدر وغیرہ کے عہدے کو خاندانی میراث تصور کر کے لاکھوں کے سرکاری گرانٹ کو بھی ذاتی سرمایہ سمجھ کر من مانی کرنا اپنا "جمہوری حق" تصور کرتے ہیں۔
یہی نہیں —— یہ لوگ اردو زبان کو مذہبی تنگ نظری کا جامہ پہنا کر اردو کی ہمہ گیریت اور قومی کردار کو بھی مجروح کرتے ہیں۔
انہیں جیسے اس کی خبر ہی نہیں کہ "تبدیلیوں" کے تناظر میں
اردو زبان و ادب کیا سمت اختیار کر رہی ہے۔
اس سلسلے میں اردو اکامیوں کی طرف جب ذہن جاتا ہے تو مایوسی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ان کی اسکیموں اور پروگراموں میں کہیں واضح مقصد نظر آتا ہے اور لسانی تحفظ و ارتقا کی کوشش نظر آتی ہے۔
صرف انعامات تقسیم کرنا اور ایسے جلسے اور سمینار منعقد کرنا جس کا کوئی OUT COME ہی سامنے نہ آئے۔
بس یہی اکادمیوں کا کام رہ گیا ہے۔
انعامات کی تقسیم میں
اردو اکادمی کی نظر ان مجاہدوں کی طرف کبھی نہیں گئی جنہوں نے لسانی تحفظ و بقا اور اپنی زبان کے حقوق اور مقام کے لئے [illegible] کر دی ہے۔

یقیناً اس کا مقام شاعروں اور ادیبوں سے بہت بلند ہے۔
مگر
اُردو اکادمی کے انعام یافتگان کی فہرست میں ایسے لوگوں کا نام ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملے گا۔

یہ ساری باتیں
اُردو والوں کے ذہنی انجماد ہی کا نتیجہ ہیں
انہیں نہ بدلتے ہوئے حالات کا احساس ہے
اور نہ تبدیلی کے عوامل پر ان کی نگاہ ہے
صورت حال جب ایسی ہے
تو
اُردو عوام ہی کو سامنے آنا ہوگا
اُردو کے نام پر انجمنوں کو جمہوری کردار دینا ہوگا۔
اور برسوں سے کرسی پر غیر جمہوری طریقے پر جمے ہوئے
اُردو دشمنوں کو
اُردو تحریک کے منظر نامے سے ہٹانا ہوگا
حالات کے صحیح تناظر کو سمجھتے ہوئے
ہمیں
فعال اور متحرک ہونا ہوگا
کیونکہ اُردو عوام
ذہنی انجماد کا شکار نہیں
وہ تبدیلیوں کی تیز رفتار لہروں کو سمجھ رہے ہیں۔

(اداریہ)

محمد حسن

افسانہ ——— جدید افسانہ، جدید تر افسانہ

پچھلی چند دہائیاں اردو افسانے کی دہائی کی دہائیاں ہیں۔ افسانہ تنقید سے دست و گریباں رہا ہے، تنقید، بلکہ اچھی خاصی تنقید برے اور خاصے برے افسانوں کے بارے میں لکھی جاتی رہی اور ان برے، بہت برے افسانوں کو جن میں سے اکثر تو سرے سے افسانے ہی نہیں تھے پڑھنے والوں پر مسلط کرتی رہی اور پڑھنے والے خاموشی سے ان بڑبولے قسم کے افسانوں کو رد کرتے رہے۔ اور صبر و سکون سے نئے افسانے کے طلوع ہونے کا انتظار کرتے رہے۔

انتظار کی مدت خاصی لمبی تھی اور اس مدت میں بہت سے اچھے افسانے بھی دھوم دھڑکے والے برے افسانوں کے انبار میں دب کر رہ گئے۔ بعض اچھے افسانہ نگار بھی دفن ہو گئے مگر دھیرے دھیرے ہی سہی دھند چھٹی۔ تجریدی، افسانہ۔ بیانیہ سے آزاد افسانہ، جدید افسانہ وغیرہ بہت سی اصطلاحیں ابھریں اور مٹ گئیں۔ ان پر بحث بھی خوب ہوئی۔ اعتراض پڑھنے والے کو کسی اصطلاح سے کبھی نہیں تھا۔ ... ایک ہی سوال تھا کہ افسانہ افسانہ بھی ہے یا نہیں۔ یعنی اس کے جمالیاتی احساس میں کبھی کوئی اضافہ کرتا ہے یا نہیں وہ اس کی حسیت پر کبھی کوئی نقش چھوڑتا ہے یا نہیں۔

اور یہ سوال نہ محض بیانی پن سے جڑا ہوا تھا نہ محض بیانیہ سے اس کا تعلق تھا طرز احساس کی تازگی سے اور احساسات کے تجزیے سے حاصل کردہ بصیرت سے اور ان دونوں کی کمی تھی۔

اچھی بات تھی کہ جدید افسانے نے نعروں کے بجائے اپنے اوپر گزرے تجربات اور مشاہدات ہی پر توجہ مرکوز کی زندگی کے وسیع تر معاملات اور کائنات کی ہمہ گیریت بھی اپنے بس میں نہ ہو تو اپنے ہاتھ کی ماچس کی ڈبیا ہی پر کہانی لکھنی چاہیے تجربے میں سچائی اور تجزیے میں بصیرت ہو تو خواہ کہانی تجریدی ہو یا بیانیہ، علامتی ہو یا سوانحی ہر حالت میں قابل قدر ہوتی ہے۔

معاصر اردو افسانہ بڑے ناموں کے سائے میں پلا بڑھا ان میں نام تھے کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، غلام عباس، ... قاضی عبدالغفار، خواجہ احمد عباس ... کے بعد جو نسل

آئی اس نے ان سب سے خوشہ چینی کی مگر اپنی راہ الگ نکالی
جن میں اہم نام تھے قرۃ العین حیدر، قاضی عبدالستار، عابد
سہیل، رام لال، رتن سنگھ اور اقبال مجید کے اور پھر ایک مختلف
رنگ و آہنگ کے ساتھ سریندر پرکاش، بلراج مینرا اور
جوگندر پال کے۔

ایمرجنسی کے آتے آتے احتساب نے ایک نئے قسم کے
علامتی افسانے کو جنم دیا جن میں بات کھل کر کہنے کے بجائے
علامتوں میں کہی جانے لگی مگر وہ علامتیں ایسی صاف اور حقیقی
ہوتی تھیں کہ بات پڑھنے والے تک بلا شک و شبہ پہنچ جاتی تھی
اس دور کی کہانیوں میں اقبال مجید کی 'پوشاک' حسین الحق کی
سرکس یاد آتی کہانی، سلام بن رزاق کی 'زنجیر ہلانے والے' انیس
رفیع اور فیروز عابد کی کہانیاں اس نئے احساس کی بڑی بھرپور
مثالیں فراہم کرتی ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ قتل عام کا سلسلہ
بھی جاری تھا اور بعد کے دور میں تو فرقہ وارانہ فسادات اور
منافرت نے گویا جگ جیت لیا۔ اور اس طرز کی کہانیوں میں شتاق
مومن، علی امام نقوی، عبدالصمد اور شفق کی کہانیوں نے
اس منافرت بھری فضا سے بکھری ہوئی جھلکیاں اٹھالیں۔

لیکن سوال صرف فرقہ وارانہ فسادات ہی کا نہیں تھا۔
ایسا لگتا تھا جیسے قدروں کا سارا نظام ہی الٹا پلٹا ہو گیا ہے
اور اس کے رشتے مذہب اور علاقے کی منافرتوں سے لے کر انسانوں
کے باہمی رابطے تک پھیلے ہوئے تھے ہندوستان اور پاکستان
میں آباد منقسم خاندانوں اور منقسم معاشرتوں تک پھیلے ہوئے
تھے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر ملکوں، نسلوں اور تہذیبوں
کے بقائے باہم کو کاٹتے جا رہے تھے۔ اتنی بڑھتی ہوئی کوڑھ
کے خلاف شاید سب سے زوردار اور کسی قدر والہانہ چیخ تھی
کنور سین کی کہانی "اس بار نہیں" جس کے ہیرو کو اپنی
اشاری ہے سے کوڑھ میں مبتلا اور اس سے بے خبر پوری آبادی

نظر آتی ہے۔ مگر وہ انہیں ان کی بیماری سے باخبر کر کے
سے سولی پر چڑھنے یا زہر پینے کو تیار نہیں۔ اشرف کی
سے "فوٹو" جو اپنے وطن کی جڑوں سے اکھڑے ہوؤں
داستان تھی یا پھر شفق کی "مہاجر" جس میں تشدد اور
ریزی نئی نسل کے نوجوان کے لئے تفریح کا ذریعہ بن
ہے یا پھر انور قمر کی کہانی "کابلی والے کی واپسی" جو افغا
کے حالات پر ایک نئے رُخ سے نظر کرتی ہے۔

اردو افسانے کی تیسری آواز جو ایمرجنسی کے ز
میں واضح طور پر ابھری تھی وہ اور آگے بڑھی اور تیسری آو
نہ تو سکہ بند قسم کی نعرہ بازی تھی اور نہ جدیدیت کے ؤ
کی تقلید۔ اس نسل نے بہت کچھ اپنے احساسات کو
کر اپنی چھوٹی موٹی حقیقتوں کو موضوع بنانا سیکھا
کا دائرہ محدود ضرور تھا لیکن براہ راست تجربے کا دائرہ
سے اکثر کے ہاں تجربے کو قوت اور نظریات کی صلاحیت
تھی۔ مگر وہ ایک نئے احساس کی بازیافت پر اصرار
کر رہے تھے۔

جدید تر افسانہ اس سے ایک قدم اور آگے بڑھ
ہے۔ اول تو وہ محض علامتی ہونے پر تیار نہیں اس کی
ایسی شفاف ہونی چاہئیں جن سے افسانے کو پیدا کرنے
کرب ظاہر ہو اور اس کرب کے ماخذ ہمارے چاروں
نہایت بے دردی سے بکھرے ہوئے ہیں دوسرے و
افسانوں کو خالص ذاتی بنانے پر بھی رضامند نہیں۔
اس جدید تر افسانے کے اکثر لکھنے والے ذات اور کائنات
شخصیت اور دور کی درمیانی سرحد پر سفر کرتے نظر آ
ایک لمحے میں وہ نجی کیفیت کی بات کرتے ہیں تو دو
جملے میں ان کا دور، ان کا ملک، ان کی دنیا سبھی کچھ
داخل ہو جاتا ہے۔ تیسرے جدید تر افسانہ صرف اخ

تک ختم ہونے کو تیار نہیں ہے بلکہ احتجاج سے آگے کے بھی امکانات کو کم سے کم ٹٹول کر ضرور دیکھنا چاہتا ہے ایک مبہم سا صبح ، بہت الجھا ہوا دھم سا سویرا سہی مگر کہیں اس کی جھلک ضرور نظر آتی ہے ۔

یہاں میں صرف چار افسانہ نگاروں کا ذکر کروں گا جن میں سے دو بہار کے ہیں ایک اتر پردیش سے اور ایک پنجاب سے ۔ بہار سے افسانہ نگاروں میں حسین الحق کی ایک کہانی ایسی فضا کے متعلق ہے جہاں ظلم و ستم آخری حد تک پہنچے ہوئے ہیں لوگ مارے جارہے ہیں اور ظلم و ستم سے بچنے کے لئے سنڈاس میں چھپے ہوئے بھی کردار ایک بچے کے بچ جانے پر مسرت کا اظہار کرتا ہے کہ آخر یہ کم بخت ظلم و ستم کے اجارہ دار چوک ہی گئے ایک بچہ زندہ بچ گیا جو شاید نئی بصیرتوں کا امین ہے ۔ عبدالصمد کی کہانی پیوندکاری ہے جہاں ایک شخص شہر کے بیمار اور مفلوک الحال گداگری کی فہرست اور ان کی بیماریوں کا تفصیل جمع کرتا ہے اور جب اس کی خدمات کا اعتراف ہوتا ہے تو وہ ان سے بے خبر ہو جاتا ہے ۔ مشرف عالم ذوقی اور قاسم خورشید نے تو اور آگے بڑھ کر انقلابی سرگرمیوں کی تصویر کشی کی ہے اور ان میں امید کی کرن اور حوصلے کی روشنی تلاش کی ہے ۔

پنجاب سے ترون کمار ورما کی کہانی اسی دھندلکے کا حال بیان کرتی ہے اور جسم فروشی کے اڈوں میں بھی انسانی بے چارگی کی تاریکیوں سے ابھرنے والے انسان کا جلوہ دکھتی ہے ۔ اتر پردیش کے ارن کمار کی کہانی فسادات کے بے نام اور بے زبان شہیدوں کا بیان ہے مگر اس بیان کے پیچھے انسان کی عظمت اور بے چارگی کا جو روپ ابھرتا ہے وہی اردو افسانہ کا جدید تر روپ ہے ۔

غرض تیسری آواز سے جدید تر افسانے تک ہندوستان کے اردو افسانے نے اپنے اوپر نئے سرے سے اعتماد کرنا سیکھا ہے کہ تجریدی ، علامتی ، بیانیہ اور غیر بیانیہ کو اصطلاحوں میں کچھ نہیں رکھا ہے ۔ کہانی صرف اچھی یا بری ہوتی ہے اور اس کی اچھائی یا برائی افسانہ نگار کی تجزیاتی بصیرت اور اس کی فنی اور فکری ایانت پر منحصر ہوتی ہے جو اسے ذات میں کائنات کا اور کائنات میں ذات کا جلوہ دکھا سکے اور یہ فال نیک ہے ۔

جگن ناتھ آزاد

تری نوا سے شکایت ہے مجھ کو مرغِ چمن
کہ تار تار ہوا ہے خرد کا پیراہن
قفس نصیب پرندوں کو سازگار نہیں
ہوائے دشت و بیاباں، فضائے صحنِ چمن
تمام کشتیٔ قلب و نظر خدا جانے
یہ موجِ نکہتِ گل یہ خرامِ رنگِ چمن
نصیب سبزۂ خوابیدہ کا نہ جاگ سکا
چمک چمک کے فسردہ بھی ہو گئی ہے کرن
خرامِ گردشِ دوراں، ذرا تو مہلت دے
ذرا میں دیکھ تو لوں نوبہارِ سرو و سمن
خزاں کے تند بگولو ذرا ٹھہر جانا
چمن کے ساتھ نہ لٹ جائے آبروئے چمن
طلسمِ رنگِ چمن ہے بہار کیا شے ہے
خزاں، خزاں ہے شکستِ طلسمِ رنگِ چمن

ساحل ہے طوفاں، طوفاں ہے ساحل
ہشیار اے دل! ہشیار اے دل!
تیرا کرم ہے بادِ بہاراں
ہر شاخ زخمی، ہر پھول بسمل
اے اہلِ زنداں، آنکھیں تو کھولو
ٹوٹے پڑے ہیں بندِ سلاسل
ہمت نہ ہارو! اے جاں سپارو!
وہ آئی منزل وہ آئی منزل
پھولوں کی خوشبو ظاہر میں احباب
باطن میں لیکن شمشیرِ قاتل
سچی طلب تھی مفقود ورنہ
قدموں تک آتی خود کھنچ کے منزل
سینے میں تو نے غم کو بسایا
آزاد! لیکن کیا غم کا حاصل؟

قطعہ

کوئی نہ ہمدم تو ہے نہ ہے رفیقِ کہن
اسی سے پیار کروں میں یہی ہے میرا وطن؟
وطن سے دوریٔ منزل کا یہ سوال نہیں
وہ بے وطن ہوں کہ جس کا نہیں ہے کوئی وطن
کنارِ سندھ یہ ہم جس کو چھوڑ آئے ہیں
وہ بات تجھ میں کہاں اے دیارِ گنگ و جمن

★

ڈاکٹر برج پریمی

کشمیر میں اُردو نثر نگاری

ریاست جموں و کشمیر میں اردو زبان کی شروعات
سوا سو سال پہلے ہوئی۔ ڈوگرہ عہد سے قبل کشمیر میں افغانیوں
سکھوں کی عملداری رہی اور اہلِ کشمیر برسوں غلام در غلام
اس زمانے میں یہاں فارسی زبان اور ادب کا چلن رہا۔
یریوں نے یہاں بھی اپنی ذہانت اور ذکاوت کا ثبوت فراہم
ے اس زبان میں قابلِ قدر سرمایہ پیدا کیا۔ لیکن جب ڈوگرہ
آغاز ہوا اور مہاراجہ گلاب سنگھ (۱۸۴۶ - ۱۸۵۶ء)
برطانوی مفادات کے پیشِ نظر کشمیر کو خریدا اور اس طرح ریاست
ن و کشمیر کی حکومت کا قیام عمل میں آیا تو سیاسی مصلحتوں
پنجاب اور لاہور کی حکومتوں کے ساتھ کشمیر سرکار
تعلقات بھی قائم ہوئے جس کے نتیجے میں بعض لوگوں کا باہر آنا
ناگزیر بن گیا۔ عوامی سطح پر بھی وسائل معاش کی تلاش اور
تی مقصد کے حصول کے لئے بھی ان تعلقات میں اضافہ
ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ باہر جانے والے سیلانی اپنے

فارسی دانی کے باوصف مروجہ اردو میں شُد بُد حاصل کرنے میں
کامیاب ہوئے۔

ڈوگرہ عہد میں کچھ عرصہ تک نقیبوں کو ہندوستان کے
مختلف شہروں سے بلا کر اپنے دربار میں اس غرض کے لئے تعینات
کیا گیا تھا کہ وہ بھی ڈوگرہ دربار میں مغلیہ جاہ و جلال کا سا انداز
پیدا کریں۔ چنانچہ جب مہاراجہ دربار میں آتا تھا تو اس کی آمد
کا اعلان مغلیہ انداز سے کیا جاتا تھا۔ ان نقیبوں کے ساتھ
ان کے پورے پورے خاندان بھی تھے جن کی بول چال کی زبان
اردو تھی۔ اس طرح سے بھی اردو زبان کا عمل دخل شروع ہوا۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ کشمیر کی آبادی کا خاصا حصہ اٹھارویں
اور انیسویں صدی کے دوران ہندوستان کے دوسرے حصوں میں
ہجرت کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ ان میں سے اکثر خاندان وہیں کی خاک
میں جذب ہو گئے اور اردو زبان کی تیز رفتار ترقی سے متاثر ہو کر
انہوں نے شعر و ادب کے ایسے نادر گل بوٹے سجائے جن کا الگ مقام ہے

ڈوگرہ سلطنت کے بانی مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد میں ریاست
کی درباری زبان فارسی تھی، لیکن خطہ جموں کے بیشتر علاقوں میں
ڈوگری زبان کا بول بالا تھا جو لسانی اعتبار سے پنجابی اور اردو

کے قریب ہے۔ اس لئے اردو زبان یہاں پر اپنے ادبی خد و خال مرتب کر چکی تھی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ (۱۸۵۷ء-۱۸۸۵ء) کا عہد مقابلتہً امن وسکون کا زمانہ تھا۔ مہاراجہ کو نئے علوم وفنون سے دلچسپی تھی۔ اس لئے نئے علوم کے ساتھ نئی تعلیم کی ترویج میں اس نے کافی دلچسپی کا اظہار کیا۔ اپنی رعایا کو مغربی علوم وفنون سے آشنا کرنے کے لئے اس نے اپنے دربار میں عالم اور فاضل جمع کئے۔ ان میں بیشتر فارسی کے عالم تھے۔ یہ فارسی زبان بولتے اور لکھتے تھے۔ مہاراجہ کا وزیر اعظم دیوان کرپا رام کئی فارسی کتابوں کا مصنف تھا۔ وہ [illegible] زبان میں بھی دسترس رکھتا تھا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے ریاست کی انتظامی صورت حال پر رپورٹیں مرتب کروایا اور ان کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ یہ رپورٹیں اردو میں مرتب کی جاتی تھیں۔ ان رپورٹوں کو ریاست میں اردو نثر کا ابتدائی نمونہ کہا جاسکتا ہے۔

یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے جب عنانِ حکومت سنبھالی اور ابتدائی برسوں کی مشکلات کے بعد حکومت میں استحکام پیدا ہوا تو مہاراجہ کو علم وادب کی اشاعت کا خیال آیا [illegible] میں ایک سنسکرت کالج قائم کیا۔ اس کے علاوہ ایک لائبریری اور ایک دارالترجمہ کا اہتمام بھی کروایا۔ اس دارالترجمہ کے توسط سے سنسکرت اور فارسی کی کتابیں شائع ہوئیں اور بہت سے مسودے ڈوگری، ہندی اور اردو میں ترجمے ہوئے۔ اس ادارے کے زیر اہتمام ریاستی نظم ونسق سے متعلق کئی رپورٹیں مرتب ہوئیں۔ (۱۸۸۲ء-۱۸۸۳ء) کے دوران تیار کی ہوئی ایک رپورٹ میں درج ہے۔

" ۱۰۵۱۴ روپیہ اجرت ترجمہ اس سال میں صرف ہوا [illegible] حال میں کئی کتاب جو انگریزی سے شاستری [illegible] میں، ختم ہوئی ہیں ...... "

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو کی کتابیں جو عربی یا دوسری زبانوں سے اردو میں منتقل ہوئی تھیں ان کو باضابطہ طور پر شائع کیا جاتا تھا اس عہد کے کئی مسودات ملتے ہیں جن میں سے اکثر انگریزی، فارسی اور عربی سے اردو میں ترجمہ ہوئے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ دیوناگری حروف میں بھی لکھے گئے ہیں۔ ان مسودات کی تیاری میں غلام غوث خان، پنڈت بخشی رام، مولوی فضل الدین، لالہ نسبت رائے، وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ عالم اور فاضل مہاراجہ کے دربار کے ساتھ وابستہ تھے اور انہوں نے طب، انجینیرنگ، منطق، تاریخ، مذہب، کاغذ سازی، انشاء جیسے موضوعات سے متعلق مسودات تیار کئے۔ ان کی زبان صاف ستھری ہے۔ کہیں کہیں ادبی چاشنی ملتی ہے۔ جہاں کہیں انگریزی اصطلاحات کی ضرورت محسوس ہوئی ہے وہاں ان کو انہیں چھیڑا گیا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں ابھی اردو زبان کو ریاست کی سرکاری زبان ہونے کا شرف عطا نہیں ہوا تھا۔ لیکن زبان عام پڑھے لکھے لوگوں میں مقبول ہو رہی تھی۔ چنانچہ دارالترجمہ کے دائرہ عمل سے باہر بھی کئی نثری کارنامے وجود میں آئے۔ چودھری مہتہ شیو سنگھ ۱۸۶۴ء ۱۸۶۵ء کے دوران بخارا کا سفر کیا۔ واپسی پر اس نے اردو میں اپنا سفرنامہ قلمبند کیا۔ یہ ریاست میں سرکاری طور پر پہلی اردو تحریر تسلیم کی گئی ہے۔ ۵۰۰ صفحات پر مشتمل یہ سفرنامہ بڑا دلچسپ ہے۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے کارناموں میں بدیا بلاس پریس کا قیام بھی ایک اہم کارنامہ ہے۔ یہ پریس ۱۸۶۷ء میں قائم ہوا۔ اسی سال ریاست کا پہلا اخبار "بدیا بلاس" سرکاری گزٹ کے طور پر جاری ہوا۔ یہ اخبار دیوناگری اور اردو دونوں حروف میں شائع ہوتا تھا

اس عہد کے اہم ادیبوں میں پنڈت ہرگوپال کول خستہ کا نام سرفہرست ہے۔ خستہ، شبلی اور حالی کے ہم عمر تھے۔ وہ کشمیری الاصل تھے اور سال ہا سال ریاست سے باہر لاہور اور پٹیالہ میں رہ چکے تھے۔ قیام لاہور کے دوران وہ "رادھے ریفارمر" "خیر خواہ کشمیر" "دلشی کی پکار" اور اسی قبیل کے کئی پرچوں کے ساتھ وابستہ رہ چکے تھے۔ لاہور میں ان کا تعارف پنجاب کے ڈائریکٹر تعلیمات کرنل ہالرائیڈ کے ساتھ ہو چکا تھا۔ وہ انجمن پنجاب کی کارکردگیوں سے بھی واقف تھے۔ اس لئے نہ صرف یہ کہ وہ اپنے عہد کے نئے خیالات اور تصورات سے واقف تھے بلکہ اردو زبان کے مزاج سے بھی واقف تھے۔ خستہ اعلیٰ پایہ کے شاعر اور نثر نگار تھے۔ وہ ۱۸۷۷ء میں کشمیر لوٹے اور آتے ہی اپنی خداداد قابلیت کے باعث مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دربار کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔

خستہ کے کئی نثری کارنامے ہیں۔ ان کی "گلدستہ کشمیر" اردو نثر میں غالباً کشمیر کی پہلی تاریخ ہے جو عہد قدیم سے لے کر مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ کتاب ۱۸۸۲ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ خستہ رنبیر سنگھ کے عہد کے چشم دید گواہ تھے۔ اس لئے تاریخی اعتبار سے بھی اس کتاب کی اہمیت ہے۔ خستہ کی دوسری تصنیف "رسالہ گلزار فوائد" ہے۔ یہ دراصل ایک قصہ ہے جس میں ڈپٹی نذیر احمد کی مراۃ العروس کا تتبع کیا گیا ہے۔ اسلوب سلیس اور واضح ہے۔ کہیں کہیں مقفیٰ اور مسجع عبارت کا التزام کیا گیا ہے۔ خستہ کی نثری کارناموں میں ان کے انشائیے بھی شامل ہیں۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے انتقال کے بعد مہاراجہ پرتاپ سنگھ ۱۸۸۵ء میں تخت نشین ہوئے۔ اس عہد تک اردو پڑھے لکھے لوگوں کا حلقہ بڑھ گیا تھا۔ اور اردو زبان ذریعہ اظہار بن گئی تھی۔ مہاراجہ نے اس زبان کی مقبولیت کے پیش نظر ۱۸۸۹ء میں اسے سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کر لیا۔

ہرگوپال کول خستہ کے چھوٹے بھائی سالک رام سالک اس عہد کے دوسرے اہم نثر نگار ہیں۔ سالک کا ادبی ذوق بھی خستہ کی طرح لاہور کی ادب پرور فضاؤں میں پروان چڑھا تھا۔ وہ عرصہ دراز تک اودھ اخبار لکھنؤ میں مضامین لکھتے رہے۔ انہوں نے خود بھی لاہور سے اپنے بھائی کے ساتھ "خیر خواہ کشمیر" نام کا ایک ہفت روزہ جاری کیا تھا۔ [illegible] عہد میں عیسائی مشنریوں اور مبلغوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ مغربی خیالات کی ترویج سے اور عیسائیت کی تبلیغ روکنے کے لئے مختلف مذاہب کے پڑھے لکھے لوگوں میں ہلچل پیدا ہوئی۔ [illegible] دوران سالک کشمیر آ چکے تھے۔ یہاں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی سرپرستی میں سناتن دھرم سبھا تشکیل ہوئی تھی۔ جس کے زیر اہتمام عیسائیوں کے خلاف کئی کتابچے چھاپے گئے۔ سالک نے بھی "مورتی منڈن" "دھرم اپدیشن" اور "شاستر ارتھ" جیسی کتابیں مرتب کیں۔ اس کے علاوہ لغات اردو اور محاورات اردو کے نام سے بھی چھوٹی چھوٹی کتابیں مرتب کیں۔ سالک کی اردو خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ انہوں نے رنبیر دنڈ بدھی (قانون تعزیرات جموں و کشمیر) کی مبسوط شرح تحریر کی۔ اس کے علاوہ مجموعۂ ضابطۂ دیوانی، قانون رجسٹری اور دوسری قانونی دستاویزات کی شرح بھی لکھی ہے۔ خالص ادبی کارناموں میں ایک اچھی تصنیف "گنجینۂ فطرت" یا "مناظر فطرت" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ "داستان جگت روپ" سالک کا ایک اور ادبی [illegible] ہے جو شائع نہ ہو سکا۔ "تحفۂ سالک" ایک سفرنامہ ہے جس میں قصے کی تکنیک کا التزام کیا گیا ہے۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں لاہور اور دوسری جگہوں سے ریاست کا رابطہ [illegible]

ذریعے قائم ہوا۔ ان اخبارات میں ریاست کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی مسائل پر مضامین شائع ہونے لگے جس سے یہاں کے لوگوں میں صحافت سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اور لکھنے والوں کی صلاحیت کو ابھرنے کا موقع دستیاب ہوا۔ محمد الدین فوق کی مساعی اس ضمن میں نمایاں ہیں۔ فوق نے لاہور اور کشمیر سے مختلف اخبارات جاری کئے اور اپنے قلم کی توانائیوں کے ساتھ اہل کشمیر کو غفلت کی نیند سے بیدار کرنے کا کارنامہ انجام دیا۔ فوق اپنے عہد کے سب سے بڑے ادیب تھے۔ انھوں نے ناول افسانہ، سوانح، تذکیر و تانیث، تاریخ کے شعبوں میں متعدد کارنامے انجام دیئے۔

۱۹۲۴ء میں لالہ ملک راج صراف نے ریاست کا پہلا اخبار "رنبیر" جموں سے جاری کیا۔ اس اخبار کی اشاعت نے اردو نثر کی توسیع اور ترقی کے لئے راہیں کھول دیں۔ اور نئی صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقع فراہم کیا۔ اس طرح سے نئے نثر نگاروں کا ایک بڑا حلقہ پیدا ہوا۔ ان میں مولوی زین الدین سالگرام کول، جیا لال کلم، مولوی عبداللہ وکیل، پریم ناتھ بزاز، نشیب جذبھو، پریم ناتھ رونق، بلدیو پرشاد شرما، عشرت کشتواری، دینا کرشن کچرو شیون، علامہ حیدر جستی، شمس شیرازی، تارا چند ترسل سالک خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

سری نگر کا پہلا اخبار "وتستا" پریم ناتھ بزاز کی ادارت میں ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا اس کے بعد بزاز صاحب اور شیخ محمد عبداللہ نے ۱۹۳۵ء میں "ہمدرد" شائع کیا۔ ہمدرد ریاست کا پہلا مصور ہفت روزہ تھا۔ اس سال کشمیری پنڈتوں کی انجمن کے پرچے "مارتنڈ" کا اجرا بھی ہوا۔ ان اخبارات نے صحافت کا ایک نیا معیار قائم کیا۔ ان اخباروں کے ذریعے ترقی کا معیار بلند ہوا۔ اہم نثر نگار پیدا ہوئے۔ دینا ناتھ وارکو

شاہد، نیاز کامراجی، انور ریکی، وشو ناتھ ورما آنند کول، بامزی، شیام لال ، تیرتھ کاشمیری وغیرہ تھے۔

اس دور کی اہم تصانیف پریم ناتھ بزاز کی "کشمیر کا گاندھی"، تیرتھ رام کاشمیری کی "دیوتا"، وشو ناتھ ورما کی "تلاش حقیقت" اور سوم آنند پراغی اور آفتاب کول وانچو کی چھوٹی چھوٹی کتابیں ہیں۔

رنبیر، وتستا، ہمدرد اور مارتنڈ کے بعد آج تک اخبارات کی اشاعت کا سلسلہ برابر شروع ہوا۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء تک اخبار کی تعداد ۱۵۰ تک پہنچ گئی تھی آزادی کے بعد اس تعداد میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ ان اخبارات میں روزنامے بھی ہیں، ہفت روزہ بھی اور پندرہ روزہ بھی۔ دلیش، چاند، کیسری، خدمت، حقیقت، نور، جیوتی، آفتاب، سرینگر ٹائمز، نوائے صبح، اقبال، ہمارا استاد، کشمیر، سویرا، امر، پاسبان، سدرشن، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ رسائل میں پریم، فردوس، کونگ پوش، تعلیم جدید، آزاد، گلریز، تعمیر، جیوتی، وکیل، ہما، جھرنا، کینواس، دلیش، ادبیات، شیرازہ، ہمارا ادب، بازیافت، اقبالیات، قابل ذکر ہیں۔ مختلف وقتوں پر چھپنے والے ان رسائل نے کشمیر کے تخلیقی ذہن کی بازیافت کی اور اردو نثر کے امکانات روشن کئے۔

اردو نثر کی توسیع کے ساتھ ساتھ فکشن کے مختلف شعبے بھی معرض وجود میں آئے۔ چنانچہ افسانے، ناول، ڈرامے ادب لطیف، انشائیے، تحقیق و تنقید غرض کہ ہر شعبے میں ریاست کے قلم کاروں نے اپنے قلم کی جولانیاں دکھائیں۔ اور نہ صرف ریاست میں بلکہ پوری اردو دنیا میں اپنی دھاک جما دی۔ آج ہمارے کتنے ہی قلم کار ہیں جن کی اردو دنیا میں اپنی پہچان ہے اور جن کی آواز پایۂ اعتبار رکھتی ہے۔ فکشن کے شعبے میں پریم ناتھ پردیسی، پریم ناتھ در، نرسنگھ داس نرگس، کشمیری

لال ذاکر، موہن یاور، ٹھاکر پونچھی، علی محمد لون، غلام حیدر حسنی، نند لال بے غرض، دینا ناتھ دار یکو شاید، شیام لال ییکہ، گنگا دھر دیہاتی، محمود ہاشمی، تیرتھ کاشمیری، سوم ناتھ زتشی، جنہیں نند لال بیکر ناتھ، تیج بہادر بھان، حامدی کاشمیری، برج پریمی، ہری کرشن کول، کشوری منچند، جیوتیشور ہتھک، ہش سروج، نور شاہ، امر مالموہی اور دوسرے بیسیوں تابناک ستارے ہیں۔ جن کی تخلیقات ہر زمانے میں ذوق و شوق سے پڑھی جاتی رہی ہیں۔

ہمارے محققین اور ناقدین نے ادھر تنقید اور تحقیق کے میدان میں اچھا کام کیا ہے۔ ادبی تنقید کے ابتدائی نمونوں میں محمد عمر نور الہٰی صاحبان کی معرکتہ آرا تصنیف ناٹک ساگر تسلیم کی جا سکتی ہے۔ جو پہلی بار ۱۹۲۴ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کو ڈرامہ نگاری کے فن پر پہلی اردو تصنیف تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد ان ہی محققین نے الاحت کی اندر سبھا مرتب کر کے شائع کی۔ اس میں مقدمہ اور حواشی شامل کر کے اس کی افادیت میں اضافہ کیا۔

دوسرے ناقدوں اور محققوں میں نند لال طالب، ڈاکٹر عزیز احمد قریشی، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، محمد یوسف ٹینگ، ڈاکٹر اکبر حیدری، پروفیسر پشپ، رحمان راہی، برج پریمی، موتی لال ساقی، کاشی ناتھ پنڈتا، امین کامل، طالب پرشاد، مشعل سلطانپوری، نشاط انصاری، رشید نازکی، ظہیر العزیز عابد پشاوری، زمان آزردہ، اور بیسیوں دوسرے تابندہ ہیں۔ ان ادیبوں، نقادوں، اور محققوں نے ادب، تہذیب اور ثقافت کے مختلف پہلوؤں پر مضامین اور مستقل کتابیں تصنیف کیں جو نہ صرف ان کی وسعت نظری پر بلکہ جن میں اسالیب کی رنگا رنگی بھی نظر آتی ہے۔

■■■

غزل

فضا ابن فیضی

سیدھی سادی بات ہے، شیشے سے شیشہ گر کا رشتہ
لفظ و معنی کی رفاقت، پھول سے پتھر کا رشتہ

سب یہاں اک دوسرے سے، اندر اندر کٹ چکے ہیں
دیکھنے میں، گو بہت مربوط ہے دنیا بھر کا رشتہ

فاصلے میں ناپنا چاہوں، مکاں و لا مکاں کے
جوڑ دے، اپنی ہواؤں سے، مرے شہپر کا رشتہ

دشت میں بے چہرگی کے، میں ہی تنہا رہ گیا ہوں
ورنہ آئینوں سے اب بھی ہے وہی پیکر کا رشتہ

چوکھٹیں سونی، مکاں خالی، کہاں دوں جا کے دستک
جانتا ہوں میں بھی، بے زنجیر سے کیا در کا رشتہ

پاؤں کو ڈھانپیں، تو سر کھل جائے، یہ ذلت ہے کیسی؟
ہاتھ کب آیا ہمارے، وقت کی چادر کا رشتہ

جانتا ہے وہ، خرابی میں بھلا ہے، اک خیر مضمر
اس لئے باندھا ہے صبا سے، خود ہی یہ صرصر کا رشتہ

رات بھر رویا ہوں، لیکن خشک ہے پھر بھی وہ دامن
کن سرابوں سے ہے آخر، میری چشم تر کا رشتہ

ظاہر و باطن کی آساں تو نہیں، معیار بندی
ٹوٹ جائے اس کشاکش میں نہ یہ اندر کا رشتہ

تم نے جن لفظوں سے سیکھا، سامنے کی بات کہنا
میں انہیں لفظوں میں ڈھونڈوں، معنی دیگر کا رشتہ

دور تک شہر ہوس میں، قحط سالی کا ہے موسم
اب کہاں، ہم سے فضا! وہ گندم و گوہر کا رشتہ

قیصر عثمانی

ڈاکٹر ظ۔ انصاری بدشات میں

یہ اس زمانے کی بات ہے جب ظ۔ انصاری ڈاکٹر ظ۔ انصاری نہیں بنے تھے اور ماہم کے کسی علاقہ میں رہتے تھے۔ کالی شیروانی اور علی گڑھ کٹ پاجامہ میں ملبوس وہ مجھے کبھی کبھار سر راہے مل جایا کرتے تھے۔ لیکن میری ان ملاقاتوں کا ٹوٹا پھوٹا سلسلہ علیک سلیک سے آگے کبھی نہیں بڑھا۔ ظ۔ انصاری ان دنوں یعنی چالیس سال قبل انقلاب میں ایک کالم نگار کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔

اسی زمانے کی بات ہے چوپاٹی کے قریب ایک ہال میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا بڑی باقاعدگی کے ساتھ ہر ماہ شاندار جلسہ ہوا کرتا تھا جس میں علی سردار جعفری، خواجہ احمد عباس۔ نیاز حیدر، اختر الایمان، مجروح سلطانپوری اور وشوامتر عادل وغیرہ کے علاوہ ظ۔ انصاری بھی شریک ہوتے تھے۔ ان جلسوں کی خاص بات یہ تھی کہ وہاں ہمارے ترقی پسند ادیب اور شعراء صرف اپنی تخلیقات نہیں سنایا کرتے تھے بلکہ ان پر بڑی۔ زوردار تنقیدیں بھی ہوا کرتی تھیں ایسا لگتا تھا جیسے وہ ہال شعر و ادب کی بہترے قدآور پہلوانوں کا ایک زبردست اکھاڑا ہو۔ جہاں تک میری یاد داشت کا تعلق ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ظ۔ انصاری ان جلسوں سے کچھ بیزار بیزار سے رہتے تھے یا انجمن ان سے بیزار رہتی تھی۔ وہ مجھے بالکل یاد نہیں۔ ہو سکتا ہے یہ محض میری قیاس آرائی ہو۔

پھر چند سال بعد جب ظ۔ انصاری ڈاکٹر ظ۔ انصاری بن کر ماسکو سے بمبئی واپس آئے تھے اور ایمبیسڈر ہوٹل کے ایک شاندار کمرے میں مقیم تھے میں ان سے ملنے گیا تھا۔ اور اس دن یہ جان کر مجھے دلی مسرت ہوئی تھی کہ انہوں نے ایک روسی زبان کے ادیب کے اشتراک میں ایک ضخیم اردو۔ روسی لغت مرتب کیا تھا اور شاید اسی زمانے میں براہ راست روسی زبان میں غالب پر ایک معیاری کتاب بھی تحریر کر کے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا تھا۔ اس کے بعد وہ پھر روس واپس ہو گئے اور کئی سال تک میں ان سے بے خبر رہا۔

غالباً چھٹی دہائی کے وسط میں ایک دن میرے بزرگ دوست نیاز حیدر میرے دفتر (گوکل نئے کارپوریشن)

میں آدھمکے اور اپنی افتادِ طبع کے زیرِ اثر کام کے اوقات میں بھی وہ مجھے گھسیٹ کر فنیس سنٹر بلڈنگ سے باہر لے آئے۔ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر چند منٹوں میں ہم دونوں تاڑدکو کی ایک گلی میں جا پہنچے جہاں انہوں نے پہلے تو مشروب سے خود کو سیراب کیا پھر بالکنی مندر کے پیچھے سمندر کے کنارے ایک چٹان پر بیٹھ کر معجنگ کے کئی گلاس چڑھائے تو انہوں نے بڑے اطمینان سے کہا "اب سناؤ اپنی نظم" اس زمانہ میں فلمی دنیا سے متعلق میری ایک طویل نظم "پرچھائیوں کا دلیس" کا خاصہ چرچا تھا۔ جب میں اپنی نظم کا کوئی ایک بند سنا رہا تھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مجھے دن میں تارے نظر آنے لگے ہوں۔ دراصل میری نظم کا وہ بند اتنا پسند آیا تھا کہ انہوں نے مجھ کو زمرد دست کشمیری کی صورت میں ایک منفرد قسم کی داد دی تھی اور بڑے پیار کے ساتھ کہا تھا کہ کل میں ٹھیک تیرے دفتر آتا ہوں اور وہاں سے تجھے ٹیکسی میں بٹھا کر سیدھا ظ۔ انصاری کے پاس لے چلوں گا آج کل ظ۔ انصاری "آئینہ" کی ادارت کے علاوہ ایک مکتبہ بھی قائم کرنے والے ہیں جہاں مصنفوں کے ساتھ ناانصافی سے کام نہیں لیا جائے گا۔ غرض کہ دوسرے دن وعدے کے مطابق وہ میرے دفتر میں آئے اور کچھ ہی دیر میں ٹیکسی "شیریں" والی گلی میں جا پہنچی۔ ہم دونوں لفٹ کی طرف جا ہی رہے تھے کہ ظ۔ انصاری صاحب لفٹ سے باہر آئے اور یہ کہتے ہوئے کہ "میں جلدی میں ہوں" آگے بڑھ گئے۔ مجھے اس وقت یہ بات کچھ ناگوار ضرور لگی تھی لیکن ساتھ ساتھ یہ خیال بھی آیا کہ کبھی کبھی انسان سے مصروفیتوں کا بے ساختہ سرزد ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

اس واقعہ کے شاید ایک دو سال بعد متذکرہ بالا نظم "پرچھائیوں کے دیس" کو کتابی شکل میں ذاتی طور پر پیش کرنے کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ فلمی دنیا کے ہیرو سنجے جو اب سنجے خان کہلاتے ہیں غیر معمولی طور قدر داں تھے۔ میرے یہ گہرے مراسم دیوندر گوئل کی "لاکھ" کی شوٹنگ کے دوران پیدا ہوئے تھے اور نے بڑے پیار اور ضد کے ساتھ اس کتاب کی اشاعت بار اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ چنانچہ ایک دن جب یہ آیا کہ "پرچھائیوں کا دیس" کا مقدمہ بین الاقوامی مالک ظ۔ انصاری صاحب سے کیوں نہ لکھوایا جائے نے انہیں اس سلسلے میں ایک مختصر سا خط لکھا جو میں انہوں نے ایک کارڈ کے ذریعہ بڑے خلوص کے اپنی آمادگی کا اظہار کیا تھا اور جب انہوں نے مقدمہ "یہ نظم اور دوسری باتیں" کے عنوان سے میرے حوالہ کیا تو میں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ میں اسے بلا کم و کاست اپنی کتاب میں شائع کر دو میں دیباچہ کو قصیدہ بنا کر پیش کرنے کا قائل نہیں۔ وہ مقدمہ یا دیباچہ میری کتاب میں شائع ہوا تو ایک معتبر شاعر، ادیب، نقاد اور پروفیسر نے ایک ساتھ اپنا ایک جوابی مضمون تحریر کر کے میرے نام خط میں انہوں نے یہ صاف صاف لکھا تھا کہ اس ظ۔ انصاری کا یہ مقدمہ شائع نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اس میں انہیں میری "سادگی" اور انصاری صاحب کاری" نظر آئی تھی۔ اردو کے مشہور نقاد ظ۔ انصاری نے اپنے دیباچہ میں ایک جگہ تحریر کیا تھا۔

"پرچھائیوں کا دیس" کے ذہین مصنف قیصر عثمانی سے اگر ہم پہلے سے واقف نہ ہوتے تب بھی یہ نظم پڑھ کر یہ اندازہ لگا سکتے تھے کہ مصنف

خود بھی اس دلیس کی پرچھائیں ہے
تماشائی نہیں خود تماشے کا حصہ ہے
اور اس کی شاعرانہ یا فنکارانہ لیاقت
چاند تاروں کی دنیا کے کسی کام نہ آئی..."

اس کے جواب میں پروفیسر موصوف نے لکھا تھا۔

"آپ کیا کر سکتے تھے اور کیا نہیں۔
اس کی بات کیوں اٹھائی جائے۔

آگے چل کر لکھا تھا۔

قیصر عثمانی کی نظم پر آپ کی
سوچی سمجھی رائے یہ معلوم
ہوتی ہے کہ

"یہ بےضرر تو ہے بے شرر نہیں"

سوال یہ ہے کہ آخر آپ کو اس نظم میں "ضرر" کی تلاش ہی کیوں تھی؟ ضرر کا سوال ہی اٹھانا ایک مخصوص ذہنیت کا آئینہ دار ہے۔ میری دعا ہے کہ ظ۔ انصاری نے جتنی "شرر" کا ہوا کھڑا کیا ہے۔ اشرار اسے ہوا دیکر قیصر عثمانی کی تعمیری کوششوں کو ضرر نہ پہنچائیں"

ظ۔ انصاری صاحب کے مقدمہ کی کچھ اور باتوں پر بھی پروفیسر موصوف نے سختی سے اعتراض کیا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مقدمہ میں جو کچھ تحریر کیا ہے اس سے ذاتی طور پر مجھے کبھی اختلاف نہیں رہا۔ انصاری صاحب نے اگر میری نظم کو "ذاتی محرومی کاری ایکشن" بتایا ہے تو یہ بات بھی کچھ غلط نہیں۔ اگر میں فلمی دنیا میں آکر شکیل، ساحر، یا مجروح بن جاتا یا فلم کے کسی اور شعبہ میں ناموری حاصل کر لیتا تو مجھے یقین ہے کہ یہ نظم عالم وجود میں کبھی نہیں آسکتی تھی۔ عرض کرتا۔ انصاری کی کہہ ہوئی ان باتوں نے مجھے کبھی مدد وار نہیں کیا ہے،

وجہ ہے کہ جب میں نے اپنی کوششوں سے "ماڈرن ہبی میٹ ادبی سنگم" کی داغ بیل ڈالی اور میں ہی اس کا جنرل سکریٹری بنا تو ایک سال میں نے انجمن کی میٹنگ میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ اس مرتبہ مشاعرہ میں ڈاکٹر ظ۔ انصاری کو بطور مہمان خصوصی شریک ہونے کی دعوت دی جائے تو انجمن کے ایک ممبر دوست نے کہا تھا کہ میں ظ۔ انصاری کو اچھی طرح جانتا ہوں اور یہ میرا دعویٰ ہے کہ وہ ہمارے مشاعرے میں کبھی نہیں آئیں گے۔ اس دعویٰ کے پیچھے کون سی وجہ کارفرما تھی یہ تو مجھے معلوم نہ ہو سکا لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب میں نے انصاری صاحب کو شرکت کی دعوت دی تو وہ بڑی خوشی کے ساتھ رضامند ہو گئے اور مشاعرے میں شاعری میں "لفظ اور خیال" کے باہمی رشتے پر اتنی خوب صورت تقریر کی کہ لوگ عش عش کر اٹھے۔ انہوں نے کہا تھا۔

" ادب سنگم ہی ہوتا ہے۔ کوئی
ادب کسی زمانے کا ایسا نہیں رہے
جسے متحدہ یا خالص کہا جائے۔
وہ اپنے ماحول اور ماضی سے رنگا
رنگ اثرات قبول کرتا ہے۔ اور اس
کی بدولت تازہ اور زندہ رہتا ہے۔
اس لئے خود ادب اور ادبی تحریک
رفتہ رفتہ ایک سنگم بن جاتی ہے۔"

ڈاکٹر ظ۔ انصاری کی اس تقریر سے ایک سردار جی اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ انہوں نے ازراہ عقیدت انصاری صاحب کے قدموں میں دو روپے کا ایک نوٹ رکھ دیا اور جب ایک صاحب نے اس پر اعتراض کیا تو ڈاکٹر صاحب نے سردار جی کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے ایک بڑی جیبھتی [illegible]

کے بڑے بڑے ایوارڈ سے بھی زیادہ وقیع اور اہم ہے "۔
"ادبی سنگم" کے اس عظیم الشان مشاعرے کے صدر تھے، ہربنس لال گوسوامی خنجر اور مہمان خصوصی تھے کشال امروہوی۔

اس کے بعد سنہ ۱۹۷۴ء کا سالانہ مشاعرہ امیر خسرو کے نام منسوب تھا۔ اس میں کرشن چندر، جاں نثار اختر اور نوشاد کے علاوہ قیصر الجعفری، یوسف ناظم، حسرت جے پوری اور مراٹھی کے جدید شاعر نارائن سروے بھی شریک ہوئے تھے۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے اس موقع پر اپنی تقریر میں فرمایا تھا۔

" امیر خسرو دہلوی کی ولادت طلوع اسلام کے چھ سو سال بعد ہوئی اور ان کی موت کو چھ سو سال بیت چکے ہیں۔ اس طرح ان کی شخصیت اس پورے عرصہ کے درمیان اپنا خاص اثر اور مقام رکھتی ہے۔ انہوں نے بارہ تیرہ سو سال کے بیچ اپنی زندگی گذاری ہے جن کے بارے میں مورخین کا کہنا ہے کہ دنیا نے آج تک اتنا بڑا شاعر پیدا نہیں کیا۔ وہ صوفی منش ضرور تھے مگر تارک دنیا نہیں۔ انہوں نے حب الوطنی اور مذہب پرستی کو ایک ہی رنگ میں رنگ لیا تھا۔

۱۹۷۶ء کے سالانہ مشاعرہ میں ڈاکٹر ظ انصاری نے اپنی افتتاحی تقریر میں یہ خیال ظاہر کیا تھا۔
" شاعری کا اصل ایک سماجی فریضہ ہے جو انسانیت کو خوب صورت تصور، خوبصورت زبان، خوبصورت تخیل اور زندگی کی خوبصورتیوں کو سنوارتا ہے کیوں کہ حسن اور صداقت

میں ایک ازلی رشتہ چلا آتا ہے۔"
آج لوگ شاعروں اور ادب کے قدر دانوں کے درمیان ساحر لدھیانوی صاحب کو بہترین فلمی گیت کا ایوارڈ دینے والے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے فلموں کو ادبی گیت دیئے ہیں اور گیتوں کو ادبی معیار۔ انہوں نے اپنی شاعری میں موضوعات بدلے ہیں اس سے مجھے اختلاف بھی رہا ہے۔ تلخی بھی ہوئی ہے لیکن اب تو ملاقات ہی کم ہوتی ہے۔ لڑنے جھگڑنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ اس طرح کی لڑائیاں ادب کیلئے مفید ہوتی ہیں "۔
غرض کہ ادبی سنگم کا شاید ہی کوئی ایسا سالانہ مشاعرہ ہوا ہو جس میں ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے شرکت نہ کی ہو۔ ہاں ایک بار جب وہ ہمارے مشاعرے کا افتتاح کرنے والے تھے دہلی اپنے کام میں ایسے پھنسے کہ مقررہ تاریخ پر ان کا بمبئی واپس ممکن نہ تھا۔ لیکن اپنی اس کمی کو دور کرنے کی غرض سے انہوں نے ازراہ کرم دہلی سے مجھے فون کیا تھا اور کہا تھا کہ " میں نے یہاں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کو آپ کے مشاعرے کے افتتاح کے لئے آمادہ کر لیا ہے، وہ جلد ہی بمبئی پہنچنے والے ہیں۔ آپ ان سے ہوٹل سی رلیس میں رابطہ قائم کیجئے گا۔"
یہ تھا ڈاکٹر ظ۔ انصاری کا "ادبی سنگم" کے ساتھ ان کی وابستگی کا عالم۔ جبھی تو اردو کے مشہور و معروف طنز نگار یوسف ناظم نے اپنے کسی مضمون میں طنز کیا تھا کہ ادبی سنگم کا مشاعرہ ظ۔ انصاری کے بغیر ممکن ہی نہیں۔
بہرکیف، میں یہاں اس مضمون کو طول دیئے بغیر یہ کہنا چاہوں گا کہ میں نے انصاری صاحب کی تحریریں پڑھی ہیں اور تقریریں بھی سنی ہیں اور میں نے یہ اچھی

غزل

علی عباس ازل

یہ آرزو کہ جھگڑوں سے نجات مل جائے
کچھ ایسی ہے کہ بے معنی حیات مل جائے

جو توڑنا ہے تعلق تو توڑ لیجئے مگر
یہ انتظار نہ کیجے کہ بات مل جائے

نچوڑا ریت کو سوکھی زباں پہ۔ آگے چلے
کسی کو ہوگی یہ خواہش فرات مل جائے

یہ کائنات تو بنتی ہے کچھ دنوں کے لئے
میں کوششوں میں ہوں مجھ کو ثبات مل جائے

فرشتے دیکھے تو گھبرا کے جستجو چھوڑی
کہ آدمی بھی فرشتہ صفات مل جائے

ہو مت شکن کو گداز ئ سنگ کا عرفاں
خدا کرے اسے آزر کا ہات مل جائے

بہت تلاش کئے معنی حرف آخر کے
ازل بتانا جو ایسی لغات مل جائے

▲▲

نیا موسم

شرون کمار ورما

نظامِ گلشن کچھ ایسے ہاتھوں میں آگیا ہے کہ عندلیبیں
جو فکرِ تعمیرِ آشیاں میں اڑیں تو تنکے بھی مل نہ پائیں

بہار آئی ہے، کہہ رہے ہیں، چمن میں سیلاب رنگ و بو ہے
مگر یہ حالت ہے صحنِ گلشن میں آج کلیاں بھی کھل نہ پائیں

رفو کی تدبیر کے بہانے یہ مشورے آج ہو رہے ہیں
کہ پا بہ زنجیر وحشیوں کے کبھی چاک سینوں کے سل نہ پائیں

وہ قافلے جو تلاشِ منزل میں اپنا سب کچھ لٹا کے نکلے
سنا ہے رہبر کی مہربانی سے راستے سے بھٹک گئے ہیں

سوائے گردِ شکستگی آج ان کے دامن میں کچھ نہیں ہے
نظر کی قندیل بجھ گئی ہے، اداس چہرے لٹک گئے ہیں

نہ راستوں میں چراغ کوئی، نہ منزلوں کے نشان باقی
وہ جن سے امیدِ رہبری تھی، وہ لوگ دامن جھٹک گئے ہیں

عجیب سامانِ بے دلی ہے، عجیب حالت ہے زندگی کی
نہ راستے میں اماں کسی کو، نہ چین ملتا ہے آج گھر میں

کچھ اس طرح کی ہوا چلی ہے، کچھ اس طرح سے نظام بدلا
شعورِ سوز و وفا کسی کو، نہ رنگِ طرزِ حیا نظر میں

عجیب راہوں پہ چل رہا ہے یہ کاروانِ نظامِ ہستی
نہ دن نکلتا ہے منزلوں پہ، نہ شام ہوتی ہے اب سفر میں

▲▲

یعقوب یاور

یہ ایک خواب تھا، دھوکا تھا، تاج اپنا ہے
میں کل کو بھول گیا ہوں تو آج اپنا ہے
بس ایک تخمِ تسلی، فرات والوں کو
لہو کے کھیت کا سارا خراج اپنا ہے
میں معترف ہوں روایاتِ لب فروشی کا
لبوں کا قفل بھی آخر رواج اپنا ہے
زمیں طواف میں رہتی ہے آفتاب کے گرد
دلوں کے بیچ تفاوت مزاج اپنا ہے
حروفِ صوت کی تیزابیت ہے عکسِ عمل
قلم سماج کا ہے اور سماج اپنا ہے
اب آگ ہو کہ لہو فرصتِ نگاہ کہاں
بساطِ عیش ہے گردش میں راج اپنا ہے
دیارِ غیر میں اب نوکری کرو یاور
بہت اکڑتے تھے تم کام کاج اپنا ہے

ہم اپنی پشت پہ کھلی بہار لے کے چل دیے
سفر میں تھے سفر کا اعتبار لے کے چل دیے
سڑک سڑک مہک رہے تھے گل بدن سجے سجے
تھکے بدن اک گلے کا ہار لے کے چل دیے
جبلتوں کا خون کھولنے لگا زمین
تو عہدِ ارتقا خلا کے پار لے کے چل دیے
پہاڑ جیسی عظمتوں کا داخلہ تھا شہر
کہ لوگ آگہی کا اشتہار لے کے چل دیے
جراحتیں ملیں ہمیں بھی انکسار سے جو
جھکا کے سر صداقتوں کی ہار لے کے چل دیے
سنا کہ حسن بٹ رہا ہے روز ان کی بزم
تو ہم بھی دوستوں کی ایک قطار لے کے چل دیے

کرشن پرویز

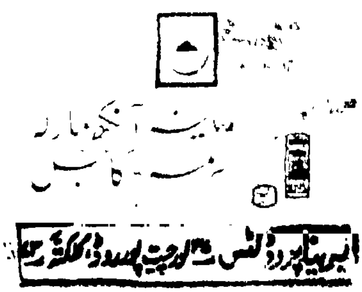
جب غم کی وادیوں میں اترنے لگی ہوا
اپنے ہی سرد سائے سے ڈرنے لگی ہوا
جتنے بھی آرتی کے دیئے تھے بجھا گئی
کس طرح مندروں سے گزرنے لگی ہوا
وہ برہمی میں اور بھی دلکش لگے ہمیں
زلفوں کو چھیڑ کر جو گزرنے لگی ہوا
ہم نے جو انتظار میں سپنے سجائے تھے
ان میں حسین رنگ سے بھرنے لگی ہوا
آرائشوں کے سارے سلیقے چرا لیے
دیکھا تمہیں تو اور نکھرنے لگی ہوا
جانے پیام گل کو دیا کیا، کہ کھل اٹھے
اب نامہ بر کا کام بھی کرنے لگی ہوا
دیکھا جو صبح دم ترے حسن و جمال کو
کیوں ٹھنڈی ٹھنڈی سانس سے بھرنے لگی ہوا
پرویز سج گئی تھی جو سورج کی پالکی
زینہ بہ زینہ رات اترنے لگی ہوا

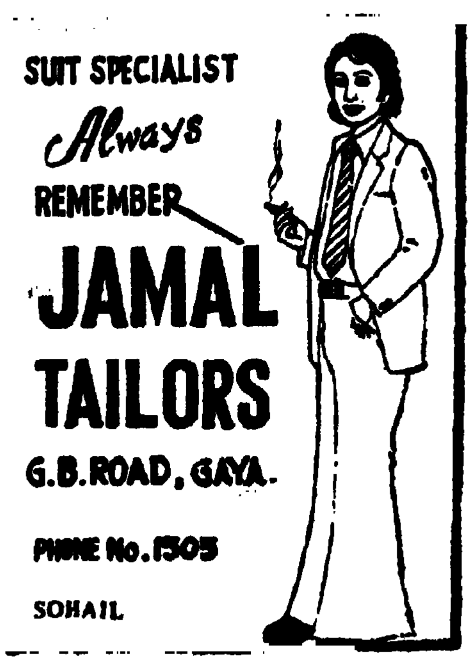
★

کچھ بھی رہے نہ فرق گناہ و ثواب میں
تھوڑا سا گنگا جل بھی ملا دو شراب میں
تاریخ وقت میں تو نہیں مل سکا مقام
لکھنا ہمارے نام کو دل کی کتاب میں
کچھ پل کی بات ہوتی ہے تختہ کہ تخت ہے
اتنا سا فاصلہ فقط انقلاب میں
چھوٹے سے اک قصور کی اتنی بڑی سزا
کس کے گناہ لکھ دیئے مرے حساب میں
جلوہ تمہارے پیار کا گر چاندنی میں تھا
پرتو تمہارے حسن کا ہے آفتاب میں
مدت کے بعد آئے ہو قابو نہ رہ سکا
کیا کیا نہ کہہ گیا ہوں تمہیں اضطراب میں
پرویز کو جو پیار کے قابل سمجھ لیا
غلطی نہ ہو گئی ہو کہیں انتخاب میں

★


شربت
نزلہ
دماغین
خون صفا




SUIT SPECIALIST
Always
REMEMBER
JAMAL
TAILORS
G.B.ROAD, GAYA.
PHONE No. 1505
SOHAIL

اختر شاہجہاں پوری

راہِ وفا میں چند قدم ہی چلا ہوں میں
محسوس ہو رہا ہے بہت تھک گیا ہوں میں
جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں اسے غور سے سنو
اے سونے والو صبح کی پہلی صدا ہوں میں
کشتی اگر رہے گی سلامت تو میں بھی ہوں
بس یہ سمجھ لو اپنا ہی اب ناخدا ہوں میں
پتھر ملامتوں کے نہ پھینکو مری طرف
اپنی نگاہ سے بھی تو اب گر چکا ہوں میں
پھر بھی دیارِ دل میں اجالا ہے ہر طرف
گل تیری آرزو کا دیا کر چکا ہوں میں
اب بھی تو پستیاں ہیں مری دسترس سے دور
کتنی بلندیوں سے گرایا گیا ہوں میں
ہر در کھلا ہے مجھ پہ جو باب قبول سا
اختر کسی یتیم کا حرفِ دعا ہوں میں

★

اعجاز طالب

حیران ہوں میں اس کی کہانی عجیب ہے
سب کچھ ہے اس کے پاس مگر دل غریب ہے
جھوٹی تسلیوں سے بڑھے گی حیات کیا
میں جانتا ہوں خوب مرا دن قریب ہے
الفاظ بیچتے ہیں طوطے ہے ایک شخص
دنیا سمجھ رہی ہے کہ سچا ادیب ہے
دھاگے سے نبض دیکھے شفایاب بھی کرے
دنیا میں اب کہاں کوئی ایسا طبیب ہے
شاید لکھا ہوا ہے مقدر میں ڈوبنا
جب شل ہیں ہاتھ پاؤں تو ساحل قریب ہے
میدان کارزار سا لگتا ہے سارا شہر
طالب کسے سکون کا لمحہ نصیب ہے

★

جینت پرمار

تیری آواز

جہاں سے ہم گزرے تھے
ان وادیوں میں
کئی بار تیری آواز
سنائی دیتی ہے
میرے خوابوں میں
صدائے بازگشت کی طرح

تب
تجھے ڈھونڈتا ہوں
رنگ برنگے پھولوں میں
ہرے بھرے جنگلوں میں
میرے قدموں سے ٹکرا کر
بکھرتی لہروں میں
قوس قزح میں
چاند ستاروں میں
چھپا ہوا تیرا چہرا!!
میرے خواب جہاں رت ہیں
ندیاں اور جھرنے
اُمڈ آتے ہیں
تیرا سایہ بن کر
پھر بھی میں تجھے ڈھونڈ نہیں پاتا
سنائی دیتی ہے
صرف تیری آواز ___!!!

●●

جدید گجراتی نظم — سریش دلال
ترجمہ — جینت پرمار

موسم

برسوں کی کھڑکی سے
دیکھتا ہوں گزرتا ہوا موسم
پلاس کے رنگ کو دیکھا ہے میں نے کوئل کے کنٹھ میں،
بسنتی ہوا میں بنی ہوئی سُنی ہے کونپلوں کی مسکراہٹ
خشک ڈالیوں میں بھٹکتے پت جھڑ کے آسیب سے باتیں کرنی پڑی ہے
بے رس کھوکھلی خالی آکاش
کبھی بجلی ___
گھرے بکھرے بادل
برسوں سے
کھڑکی پر

●●

دعاء ....

صابر رومانی

ہم کہ ہیں بیٹھے ہوئے نوخیز پیڑوں کے تلے
جا چکا ہے پت جھڑ کا موسم آگئی فصل بہار
ہم منائیں گے یہاں جشنِ مسرت اس گھڑی
ہے دعا تم بھی ہمیشہ خوش رہو اے ہونہار
والہانہ جوش سے تم بھی مناؤ جشن آج
لہلہاتا ہے چمن ہر سمت ہے خوشبوں کا راج
ہے دعا ایسا ہو مستقبل تمہارا تابناک
اور گزرے زندگی بھی پر سکون و خوشگوار
دکھ تمہیں وہ جھیلنا ہرگز نہ ہو اے نورِ عین
جھیلتے جس کو رہے ہم بچپنے سے آج تک
ہے تمہاری چاہ یہ تم اور بھی ہو ذی وقار
زرد چہرے ناتواں سے جسم کے پیکر لئے
چیتھڑوں میں ہم سدا ملبوس ننگے سر رہے
توڑ کر رکھ دی کمر محنت کے بھاری بوجھ نے
ہم ترستے ہی رہے اچھی غذاؤں کے لئے
تربیت کے فیض سے محروم ہو کر رہ گئے
ہم ترستے ہی رہے تعلیم بہتر کے لئے
آگ کے دریا کو ہم کو پار کرنا ہے پڑا
تاکہ تم کو لوریاں دیں اور رکھیں خوش مزاج
حوصلے باقی رہیں پر جوش ہو خوش فکر ہو

گیت بھی گاؤ کرو تن من سے اپنے کام کاج
دور ہی تم سے رہیں آفات عالم ہر گھڑی
بڑھتے جاؤ آگے یگ یگ روشنی پاتے رہو
منزل مقصود پاؤ چل کے سیدھی راہ پر
اس دعا میں پیار ہے پنہاں ہمارا سر بسر
کام جو ہم نے کیا اس کو بڑھاتے جاؤ تم
عمر پاؤ طول تر، ہو تندرستی بے مثال
سرزمینِ دہر سے غربت مٹاتے جاؤ تم
ہم کہ جانے کے لئے بیٹھے ہیں اب سوئے لحد
خوش گمانی ہے تمہارے کارنامے دیکھ کر
ہم کہ ہیں بیٹھے ہوئے نوخیز پیڑوں کے تلے
ہے دعا وہ زندگی پاؤ نہ تم ہرگز کبھی
جس طرح کی زندگی جیتے رہے ہم آج تک

*

ہنسراج رہبر

ہو بھی اور نہیں بھی

دیکھک بھائی کا خط آج پھر آیا تھا۔ اس کا یہ تیسرا خط تھا وہی بات جو پہلے دو خطوں میں تھی اس تیسرے خط میں پھر دہرائی گئی تھی کہ تم سرکس کی نوکری چھوڑ کر گھر چلے آؤ۔ جوکر کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے آدمی کو عزت اور احترام سے جینا چاہئے۔

پہلا خط آیا تو اسے تعجب ہوا اور وہ وشواس نہیں کر سکا کہ خط واقعی اس کے بھائی بکرم نے لکھا ہے جو اب ادیب بن گیا ہے جس کے مضامین و افسانے اور تصویر بھی اخباروں اور رسالوں میں چھپتی ہیں اور اس نے کئی قومی انعام حاصل کئے ہیں۔ وہ تو نہایت کند ذہن تھا۔ رٹ رٹا کر بڑی مشکل سے امتحان پاس کیا کرتا تھا۔ شروع کے پندرہ سال اس کے بھائی کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے بسر کئے تھے۔ ایک دن وہ بھائی سے لڑ جھگڑ کر گھر سے بھاگ آیا تھا اور تب سے اب تک سرکس میں جوکر کا رول ادا کر رہا تھا۔ یہ رول ادا کرتے اسے تیس۔ پورے تیس برس گذر چکے تھے۔ اس کی عمر اب پینتالیس برس تھی اور وہ دل اور دماغ دونوں سے تندرست آدمی تھا۔ بھائی سے، گھر کے کسی بھی شخص یا رشتے دار سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ سرکس ہی اس کی زندگی اور سرکس ہی اس کا گھر تھا۔ سرکس میں کام کرنے والے کلاکار اس کے دوست، رشتے دار اور جو کچھ بھی ہو سکتے تھے۔ صرف وہی تھے۔ ان چھوٹے بڑے کلاکاروں میں وہ ایک کلاکار تھا۔ دنیا اسے جوکر کہتی ہے تو کہتی رہے وہ جوکر کا رول ادا کرنے والا ایک انسان۔ ایک کلاکار تھا اور اسے اپنی کلا پر فخر تھا۔

اس بھائی اور گھر کی یاد تک بھلا دی تھی۔ اب اچانک تیس برس بعد بکرم کا خط آیا۔ تو اسے تعجب ہونا قدرتی تھا۔ اس دوران بھائی ادیب بن گیا ہے، ٹھیک ہے۔ اسے عزت اور احترام حاصل ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے لیکن بھائی کو اس کے جوکر ہونے پر کیا اعتراض ہے؟ اس سے بھائی کے عزت و احترام پر کیا بٹہ لگتا ہے؟ اس نے خود تو عزت و احترام پالیا ہے مجھے عزت و احترام دلانے کا کونسا طریقہ سوچا ہے! کیا وہ مجھے گھر پر بلا کر اور اپنا عزت و احترام دکھا کر میرا چوندھا کر دینا چاہتا ہے!

وہ اپنے بکرم بھائی سے دو سال بعد پیدا ہوا تھا یعنی عمر میں اس سے دو سال چھوٹا تھا۔ لیکن عجیب یہ تھا کہ وہ

بھائی سے قد میں بھی دو فٹ چھوٹا تھا۔ بجرم کا قد پانچ فٹ تین انچ اور اس کا اپنا قد تین فٹ تین انچ تھا۔ قد کے اس فرق کے کارن ہی دونوں کی زندگی کا بہاؤ الگ الگ سمت میں ہوا۔ اس کا نام کشور رکھا گیا تھا لیکن اس نام سے اسے کوئی نہیں پکارتا تھا۔ سب اسے بونا بونا کہتے تھے۔ وہ ان کے لئے تفریح اور تضحیک کی چیز تھا۔ اس سے ان کا سلوک ایسا تھا جیسے وہ ربڑ کا بنا جاپانی کھلونا ہو۔ جب محلے کے دوسرے بچے اسے بونا، بونا کہتے تو بجرم بھی ان میں شامل ہو جاتا اور اسے چڑھا کر خوش ہوتا۔

بجرم کو پڑھنے کے لئے اسکول بھیجا گیا اس کی تعلیم پر خاص طور پر دھیان دیا جاتا تھا۔ اور بار بار نصیحت کی جاتی تھی کہ اگر ڈاکٹر، انجینئر یا بڑا افسر بننا چاہتے ہو تو جی لگا کر پڑھو اور اچھے نمبروں سے امتحان پاس کرو۔ کلاس میں فسٹ یا سکنڈ آؤ۔ پچھڑ جاؤ گے تو محض ایک کلرک بن پاؤ گے اور پھر زندگی بھر پچھتاؤ گے۔ لیکن بجرم پر نصیحت کا یہ اثر ہوتا کہ وہ رٹ رٹا کر مشکل سے امتحان پاس کرتا اور ہمیشہ پچھڑا رہتا۔

لیکن قد کے بونا پن نے کشور کے لئے ڈاکٹر، انجینئر اور بڑا افسر تو کیا کلرک بننے کا امکان بھی ختم کر دیا تھا۔ اسے اسکول نہیں بھیجا گیا۔ اس خیال سے کہ ان پڑھ نہ رہ جائے گھر پر ہندی پڑھنے کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ اسے اپنے کی بے اعتنائی کا گلہ تھا اور وہ دوسروں کی تفریح اور تضحیک کی چیز بن کے احساس سے پریشان تھا۔ جب اس کی عمر دس گیارہ برس تھی تو اس نے بچوں کے ایک رسالے میں "کتے کی دوستی" نام و منیاسی لوک کتھا پڑھی۔ مطلب یہ تھا کہ دنیا بناتے وقت کتے نے بھگوان سے یہ بردان مانگا کہ دھرتی پر جو سب سے بلوان پرانی ہے میں اس کا سیوک بنوں۔ بھگوان نے کہا ٹھیک ہے جاؤ دھرتی پر جا کر اس پرانی کو کھوج لو۔ کتا ...

بنا لیکن اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ دھرتی پر سب سے بلوان پر ہاتھی یا شیر نہیں؟ انسان ہے۔ عقل بڑی ہے، عقل ہی کی وجہ سے انسان سب سے طاقتور اور اشرف المخلوقات ہے۔ میں بھی انسان ہوں، انسان! اس نے دل ہی دل میں دوہرایا اور اس کی گردن فخر سے اونچی ہو گئی۔

من میں خیال آ جائے تو انسان اس کے اظہار کا طریقہ سوچ لیتا ہے۔ کشور نے تصویریں بنانے کی مشق کی۔ وہ کتابوں اور رسالوں میں دیکھ دیکھ کر ہاتھی، شیر، ہرن اور گھوڑے وغیرہ کی اور انسان کی تصویریں بنانے لگا۔ رفتہ رفتہ ہاتھ سدھر گیا۔ دو ڈھائی سال مشق سے وہ اچھی تصویریں اور کارٹون بنانا سیکھ لیا۔ ایک مرتبہ اسنے ایک کارٹون بنایا جس میں ایک شکل اس کی اپنی اور دوسری پڑوسی لڑکے رلیو کی تھی۔ رلیو محلے میں سب سے بڑے قد لڑکا تھا۔ اسے اپنے قد کا غرور تھا۔ وہ "بونا بونا" کہہ کر کشور کا سب سے زیادہ مذاق اڑاتا اور پھبتیاں کسا کرتا تھا کشور جو کارٹون بنایا تھا اس میں اس نے اپنا قد نارمل اور رلیو کو بھِنا دکھایا تھا۔

"دیکھو! یہ کیا، بونا میں نہیں، بونا تو ہے" رلیو نے چیخ کر کہا۔

"آدمی قد سے نہیں عقل سے ... کیسا ہے۔"

کشور نے جواب دیا اور ٹھینگا دکھاتے ہوئے آگے کہا۔ بونا تو ہے تو جو صرف قد دیکھتا ہے۔ اندر کا گن نہیں دیکھتا؟ اس نے اپنا کارٹون فتحمندانہ انداز میں رلیو کی آنکھوں کے سامنے پھیرایا۔ جو بچے وہاں جمع ہو گئے تھے سب کے سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ رلیو کا منہ ذرا سا نکل آیا۔ وہ کشور کے سامنے واقعی بونا دکھائی پڑا۔

اپنی اس کامیابی سے اس میں خود اعتمادی پیدا ہوئی ... تصویریں بنانے کی مشق جاری رکھی۔ ایک دن اس نے ایک

ایسی تصویر بنائی جس کا انحصار اس کہانی پر تھا جس نے اس میں جیتے انسان ہونے کا احساس پیدا کیا تھا۔ اس تصویر میں ہاتھی، شیر اور انسان تین شکلیں اس طرح بنائی گئی تھیں کہ ہاتھی اور شیر تیر کمان سے لیس انسان کے اشاروں پر ناچ رہے تھے۔

"یہ ہے عقل کا کرشمہ" کشور نے مجلے میں تصویر کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

تصویر کی خوب تعریف ہوئی ایک ادھیڑ عمر بزرگ نے کشور کی پیٹھ تھپکتے ہوئے شفقت آمیز لہجے میں کہا۔ شاباش بیٹا۔ یہ تصویر تمہاری اپنی عقل کا کرشمہ ہے۔

"خاک کرشمہ ہے ہاتھی شیر بے کار بنا دیئے محاورہ تو یہ ہے کہ عقل بڑی یا بھینس" بکرم نے ناک بھوں چڑھا کر طنزاً کہا۔

"اور محاورہ یہ بھی ہے کہ بندر کیا جانے ادرک کا سواد" کشور نے اس انداز میں منہ بنا کر جواب دیا اور سب بچے کھلکھلا کر

"دیکھا، تمہیں بندر کہہ رہا ہے۔" رلپو نے بکرم کو اکسایا۔

"بونے، بڑھ چڑھ کر باتیں مت بنا۔ بکرم لڑنے پر آمادہ ہو گیا۔

رٹو، طوطے تو بھی زیادہ ٹر ٹر مت کر۔ کشور نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

اس بڑے بھائی کے تکبر پر چوٹ پڑی۔ بکرم غصے میں بھر گیا اور اس نے بھائی کے ہاتھ سے تصویر جھپٹ لی۔ کشور قد میں خواہ چھوٹا تھا لیکن جسم کا مضبوط تھا۔ تصویر کو پھٹنے سے بچانے کے لئے وہ بھائی پر جھپٹا اور ہاتھا پائی میں اسے دھکا دے دیا۔ بکرم اوندھے منہ زمین پر گرا منہ ایک اینٹ سے ٹکرایا اور اوپر کے دو دانت ٹوٹ گئے۔

یہ واقعہ پچھلے دو سال کے بغض اور نفرت کا نتیجہ تھا جب سے کشور کی تصویروں اور کارٹونوں کی تعریف ہونے لگی تھی بکرم کے من میں بھی تعریف حاصل کرنے کی حسرت پیدا ہوتی تھی۔ وہ کتاب سے کوئی کہانی یا محاورے رٹ لیتا ہے اور انہیں دہرا کر قابلیت کا مظاہرہ کرتا۔ لیکن اس ادھار کی قابلیت سے وہ سننے والوں کو متاثر کرنے میں ناکام رہتا۔ تعریف ہمیشہ کشور ہی کی ہوتی تھی۔ عمر میں چھوٹے اور قد میں بھی چھوٹے بھائی کی تعریف اس سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ اس سے اس کے من میں بغض اور نفرت کا جو جذبہ پیدا ہوا اس کے اظہار کا وہ کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ ایک دن کشور کی تصویروں اور کارٹونوں کی چرچا کرتے ہوئے سامنے والی پڑوسن اس کی ماں سے کہہ رہی تھی، نیلا، تمہارا یہ چھوٹا بیٹا کتنا سمجھدار اور کتنا گنی ہے۔ بھگوان نے جانے اسے کس کارن بونا بنا دیا۔

ماں کی ممتا بلبلائی اور وہ رقت آمیز لہجے میں بولی "بہن یہی تو دکھ ہے۔ اس سمجھ اور گن کے ہوتے ہوئے بھی کون اسے اپنی بیٹی دے گا۔ بے چارہ عمر بھر کنوارا رہے گا۔"

بکرم نے ماں کی بات سنی اور اس کی کینہ پرور فطرت نے اسے اس مختصر فقرے میں بدل دیا۔ "بے چارہ عمر بھر کنوارہ رہے گا!" وہ کشور کے سامنے اس فقرے کو بیسیوں مرتبہ دوہرا چکا تھا۔ کشور نے اپنے غصے کو ہمیشہ دبائے رکھا لیکن آج وہ اچانک ابل پڑا۔

بھائی کو روتا چلاتا دیکھ کر وہ وہاں سے ایسا بھاگا کہ پھر لوٹ کر نہیں آیا۔ اسے گھر سے اور اس ماحول سے نفرت ہو گئی تھی۔ اسے بغض اور توہم دونوں گوارا نہیں تھے۔ وہ کسی طرح بھی بے چارہ نہیں تھا۔

تب سے وہ سرکس میں جوکر کا کام کر رہا تھا۔ بھاگتے ہوئے گھوڑے کی پیٹھ پر اچک کر بیٹھ جانا یا جھولے سے اچانک گرنا اور قلابازیاں کھاتے ہوئے پھرتی سے پاؤں کے بل سیدھا کھڑا

وغیرہ کرتب سیکھ لئے تھے۔ اس تماشائیوں کی تفریح ہوتی۔ وہ ہنستے، خوب ہنستے لیکن کشور خود گمبھیر بنا رہتا۔ جوکر کی یہ خاص خوبی ہے اور اس سے وہ کلاکار مانا جاتا ہے کہ دوسرے ہنسیں اور وہ خود گمبھیر بنا رہے۔ تماشائیوں کی ہنسی میں طنز اور تضحیک بالکل نہیں ہوتی تھی۔ وہ سادہ دل کو خالص ہنسی تھی جس سے ماحول کھل اٹھتا تھا۔ اس ماحول میں سارے غم بھول جائے کھیل تماشے دیکھنے کا مقصد ہی یہی ہے۔

بار بار ایک ہی طرح کے کرتب دکھاتے دکھاتے اور ایک ہی طرح کی ہنسی سنتے سنتے اس کا من اوب جاتا۔ وہ سوچتا کوئی نیا کھیل، نیا کرتب دکھائے جس سے تماشائیوں کا مذاق ارفع ہو اور ان کی ہنسی میں تنوع پیدا ہو، اس لئے اپنی شکل بدل کر، نئے نئے سوانگ بھر کر وہ اسٹیج پر آتا۔ لیکن تماشائیوں پر اس کا خاص اثر نہ ہوتا۔ وہ اس کے سوانگ کا مطلب سمجھنے میں قاصر رہتے۔ بغیر سمجھے ہنسی میں گہرائی اور تنوع کیسے آتا۔ کرشن جب ارجن کو دلیل سے قائل نہیں کرسکا تو جیسے کرشن نے اسے اپنا وراٹ روپ دکھا کر چکا چوندھ کیا تھا۔ کشور نے بھی اپنے بوناپن پر ہنسنے والے تماشائیوں کو اپنے اندر کا اشرف المخلوقات، دکھا کر چکا چوندھ کرنے کی سوچی۔

اس نے دو لمبے لمبے بانس لئے ان کے درمیان پاؤں رکھنے کے لئے گلیاں گاڑ دیں۔ گلیوں پر پاؤں رکھ کر بانسوں کے سہارے چلنے کی مشق شروع کی، لیکن توازن بنائے رکھنا مشکل، بہت مشکل تھا۔ وہ گرتا۔ اٹھتا اور پھر سے چلنے کی کوشش کرتا۔ ہفتوں، مہینوں کی لمبی مشق سے آخر توازن قائم رکھنے میں کامیابی حاصل ہوگئی۔ ایک دن وہ ان بانسوں پر کھڑا ہو کر اسٹیج پر آیا۔ تیز تیز چلتے ہوئے دو تین چکر لگائے اور آخری چکر میں ادھر ادھر اٹھا کر اور تالی بجا کر اعلان کیا۔ دیکھو، دیکھو، یہ ہے انسانی دھرتی کا سب سے بڑا بلوان۔

تماشائی ہنسے ضرور، لیکن ان کی ہنسی سطحی اور چھچھلی تھی وہ اس کا مقصد سمجھنے سے قاصر تھے۔

ششیوں کا کھیل دکھانے والے رنگ ماسٹر بھورا سے اس کی خوب جمتی تھی۔ اور وہ اپنے من کی بات صرف اس سے کہتا تھا۔ "بھورا بھائی۔ لوگوں کی سوچ میں گہرائی بالکل نہیں۔ ان کی ہنسی ہمیشہ چھچھلی اور سطحی ہوتی ہے" اپنے نئے کھیل کی ناکامی کے بعد کہا۔

"مسٹر کشور" بھورا چند لمحے خاموش رہنے کے بعد سنجیدہ لہجے میں آہستہ سے بولا "جس قوم کا وچار بونا ہو جائے وہ قوم بونی ہو جاتی ہے"۔

کشور جب سرکس میں آیا بھورا تبھی سے رنگ ماسٹر تھا۔ اب اس کی عمر ستر برس کے قریب تھی۔ مونچھوں اور بھنوؤں کے بال تک سفید تھے۔ لیکن چہرے پر ایک بھی جھری نہیں تھی۔ دم خم برابر بنا ہوا تھا۔ اپنا کھیل دکھانے کے بعد کسی سے کوئی مطلب نہیں۔ وہ دن بھر کتاب پڑھتا یا خاموش بیٹھا سوچا کرتا۔ سرکس کے سب کلاکار اس کی عزت کرتے تھے اور پیار بھی کرتے تھے۔ لیکن اس کے پاس جاتے ہوئے لوگ جھجکتے تھے جیسے کوئی تیز آنچ کے پاس جاتے ہوئے جھجکتا ہے۔ صرف کشور تھا جس میں یہ جھجک نہیں تھی، وہ بلا جھجک بھورا کے پاس چلا جاتا۔ بات چیت خواہ نہ ہو تو بھی نزدیک بیٹھے رہنے میں اپنے پن کی محبت محسوس کرتا۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ بھورا بھی اسے اپنے بیٹے یا چھوٹے بھائی کی طرح پیار کرتا تھا۔ اس کی زندگی کا جو راز سب سے پوشیدہ تھا وہ بھی کشور کو معلوم تھا۔ اس نے ایک مرتبہ ڈاکہ ڈالا تھا یہ سیاسی ڈاکہ تھا اور اس میں ایک

قتل بھی ہوگیا تھا۔ وارنٹ نکل گیا تھا۔ گرفتاری سے بچنے کے لئے وہ مفرور ہوگیا اور نام بدل کر سرکس میں نوکری کرلی۔

سیما کا پیار کشور کے لئے دنیا کی سب سے انمول چیز تھی ویسے سرکس کے چھوٹے بڑے سبھی کلاکاروں سے اس کا میل جول تھا۔ وہ ان کے ساتھ گھل مل کر رہتا تھا۔ اپنی اور ان کی تفریح کے لئے وہ اپنی مصوری سے بھی کام لیتا تھا۔ کئی طرح کی کمیاں تھیں لیکن زندگی مزے سے گذر رہی تھی ہم پیشہ کلاکاروں میں وہ بھی ایک کلاکار تھا بونا یا بے چارہ نہیں۔

تیس برس بعد بھائی کا خط آیا تو وہ تذبذب میں پڑ گیا کہ جائے یا نہ جائے۔ پچھلی تلخی اور نفرت یاد آتی تو من جانے کو نہ کرتا۔ لیکن پھر سوچتا کہ بھائی کا تیسرا خط ہے اس نے پیار اور اصرار سے بلایا ہے تو من جانے کو کرتا۔ آخر بھائی بھائی ہے اور گھر گھر ہے، ایک بار جا کر دیکھے تو سہی بکرم اتنا بڑا لیکھک کیسے بن گیا ہے؟ اتنی عزت اور اتنا نام کیسے پالیا ہے؟

وہ گھر چلا آیا۔ اور دیکھا کہ بھائی کے واقعی بڑے ٹھاٹھ ہیں۔ پرانے مکان کی جگہ نئی طرز کا بنگلہ ہے سونے کا کمرہ الگ، کھانے کا الگ اور شاندار ڈرائنگ روم ہے۔ جس میں خوبصورت صوفہ سیٹ اور شاندار قالیچہ اور اونچی اونچی گدے دار کرسیاں ہیں۔ دیواروں پر خوشنما تصویریں اور گملوں میں رنگے اسٹولوں پر دلکش مورتیاں فریج ٹی وی، وی سی آر ـــــ کسی چیز کی کمی نہیں۔

لیکھک بھائی نے بڑے تپاک سے اس کا سواگت کیا۔ اور اپنی چھپی ہوئی کتابیں دکھائیں۔ ان میں ایک دو درجن کے قریب افسانوں کے مجموعے تھے۔ ان میں سات آٹھ مجموعے خود اس کی طبع زاد کہانیوں کے تھے اور باقی تین چار مجموعے دوسروں کی کہانیوں کے تھے۔ جنہیں اس نے صرف مرتب کیا تھا۔ لیکن ان پر بھی اس کا نام مرتب نہیں مصنف کے طور پر چھپا تھا۔ آٹھ مجموعے جو اس کی اپنی کہانیوں کے تھے ان کی خصوصیت یہ تھی کہ پہلے مجموعے میں آٹھ کہانیاں تھیں اور ایک کہانی کے نام پر اس کا نام رکھا گیا۔ جب نویں کہانی لکھی تو دوسرا مجموعہ پچھلی آٹھ کہانیاں شامل کرکے چھپا اور نام آٹھویں کہانی کے نام پر رکھا گیا اور اسی طرح دسویں کہانی کے نام پر تیسرا اور گیارہویں کہانی کے نام پر چوتھا مجموعے پر مجموعے چھپتے چلے گئے۔ تعداد بڑھی، حجم بڑھا اور حجم کے اعتبار سے قیمت بھی بڑھی۔

" یہ کیا چکر ہے؟" کشور نے ایک نظر کتابوں پر اور ایک نظر بھائی پر ڈال کر پوچھا۔

" چکر وکر کچھ نہیں، یہ پرچار اور بیوپار کا جگ ہے۔ اس میں سب چلتا ہے۔ بکرم نے کشور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔ اور ذرا توقف کے بعد وضاحت کی۔ کوئی نہیں دیکھتا کہ کتاب میں کیا لکھا ہے، کتاب پاٹھک نہیں خریدتا سرکار خریدتی ہے۔ بہرکیف راجیہ میں خرید کمیٹیاں بنی ہوئی ہیں۔ دو تین کمیٹیوں کا میں بھی ممبر ہوں۔ اور دوسرے کمیٹیوں میں دوسرے لیکھک بندھو ہیں۔ وہ میری کتاب خریدواتے ہیں اور میں ان کی کتابیں خریدواتا ہوں ان چھ کتابوں کے چار چار ایڈیشن ہوچکے ہیں۔ اور ان پانچ پر انعام ملا ہے۔"

اس کے لہجے میں ذرا بھی اتار چڑھاؤ نہیں تھا وہ صاف سپاٹ یوں بول رہا تھا جیسے اس نے اپنے ضمیر کو مات سے مبرا کرلیا ہو۔ جیسے اس کے بدن میں کانٹے چبھنے کی ذرا بھی گنجائش نہ ہو اوپر کے جو دانت ٹوٹ گئے تھے وہ اس کے سونے کے لگوا لئے تھے اور بات کرتے وقت خوب چمک رہے تھے۔

" اوہ یہ بتائیے آپ نے میرے لئے کیا سوچا ہے؟ میں گھر پر رہ کر کیا کروں گا؟"

شور نے اسے بیچ میں ٹوک کر پوچھا۔

" تمہیں چیتر اور کارٹون بنانا آتا ہے۔ شائد اس
ران مشق چھوٹ گئی ہو۔"

" نہیں۔ میں سرکس میں بھی چیتر اور کارٹون بناتا رہا ہوں۔
میری ہابی ہے۔"

اب اپنی اس ہابی کو پیشہ بنا لو۔ کتابوں کے ٹائٹل بنایا
رو۔ تمہارا دماغ بھی اچھا ہے۔ ایک ٹائٹل کا دو ڈھائی سو
پیہ آسانی سے مل جاتا ہے۔ ایک مہینے میں پانچ چھ ٹائٹل بناؤ
ر باقی جو وقت بچے اس میں اپنی مرضی کے چیتر بناؤ۔ چیتروں کی
ائش لگاؤ۔ چرچا میں کرواؤں گا۔"

اس نے بھائی پر ہاتھ رکھ کر یقین دلایا اور سونے
دانت چمکاتے ہوئے آگے کہا۔ "ایک بار کام بن جائے
پیسہ ہی پیسہ ہے۔"

" اور نام سمان بھی ؟"

" ہاں۔ ہاں۔ نام سمان بھی۔" کشور کے لہجے میں جو طنز تھا۔
ہم نے اس پر بالکل دھیان نہیں دیا اور بات جاری رکھی۔
را "موہ بھنگ" ناول اس وقت پریس میں ہے۔ ناول
رتہ پرستی کے خلاف ہے۔ ہیرو کا دھرم سے موہ بھنگ ہوتا
ہے۔ سب سے پہلے تم اس کا ٹائٹل بناؤ۔"

بجرم مقامی کالج میں ہندی کا لکچرر تھا۔ ہفتے میں
نچ چھ گھنٹے پڑھانے کے بعد فرصت ہی فرصت تھی اور فرصت
علاوہ لفظوں کا وافر ذخیرہ تھا۔ کالج میں جس تیز رفتاری
سے پڑھاتا تھا۔ گھر پر اس رفتار سے کہانی، ناول، کویتا اور
تنقید ہر صنف میں لکھتا تھا۔ کتابیں چھپتی تھیں۔ ادبی محفلوں
ور سیمیناروں میں حصہ لیتا تھا۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگرام
تے تھے۔ وہ رٹو طوطا رام نہیں۔ ادبی حلقوں کا جانا مانا دانشور
تھا۔ ایسے ہی جانے مانے دانشور اس سے ملنے آتے تھے اور وہ
ان سے ملنے جاتا تھا۔

کشور نے بھائی اور اس کے ارد گرد بنے ماحول کو چند ہی
روز میں بخوبی سمجھ لیا۔ اور یہ بھی سمجھ لیا کہ بھائی اور ماحول
میں اور کا تعلق ہے۔

اس دوران اس نے ٹائٹل بنانے کی مشق بھی کر لی۔ اور
بھائی کو "موہ بھنگ" ناول کا ٹائٹل بنا کر دکھایا۔

" خوب، بہت خوب۔" بجرم ٹائٹل دیکھ کر کھل اٹھا اور
تعریف کرتے ہوئے بولا۔ "خیال بھی ٹھیک ہے اور رنگ بھی ٹھیک
ہے لیکن میرا ایک سجھاؤ ہے۔"

" کیا ؟"

" پس منظر میں ایک مندر بناؤ اور ایسے بناؤ کہ ہو بھی اور
نہیں بھی۔"

" کیا مطلب ؟"

" گول مول۔ کچھ بھی سیدھا اور صاف نہ ہونا ہی ساہتیہ اور
کلا ہے۔"

کشور کو رنگ ماسٹر بھورا کی بات یاد آئی۔ جس قوم کا
وچار بونا ہو جائے وہ قوم بونی ہو جاتی ہے۔

وہ چند لمحے چپ چاپ بھائی کی طرف دیکھتا رہا اور
اور پھر دھیرے۔ بہت دھیرے سے کہا۔ "بے چارہ لیکھک !"

بجرم نے یہ بات سُنی، شاید نہیں سنی اور شاید وہ
سننا بھی نہیں چاہتا تھا۔

اگلی صبح کشور گھر پر نہیں تھا۔ بھائی کو بغیر کچھ بتائے
سرکس میں لوٹ آیا۔

شاہم بارکپوری

بازیافت

ایک مکھی اڑکر انسان کے پاس گئی اور بولی "تم تمام جانداروں میں افضل اور برتر ہو، تم ہر کام کرسکتے ہو اس لئے مجھے ایک دُم لگادو"

انسان نے حیرت سے پوچھا "تمہیں دُم کی کیا ضرورت ہے؟"

مکھی بولی: "تمام جانداروں کے دُم ہے، اس لئے میں بھی دُم لگاکر خوبصورت نظر آنا چاہتی ہوں"

"میں کسی جانور کو نہیں جانتا جس کی خوبصورتی کی وجہ دُم ہو" انسان بولا۔ "دُم نہ ہونے کے باوجود تم ٹھیک ہو۔ دیکھو میں بغیر دُم کا انسان ہوں"

یہ سُن کر مکھی ناراض ہوگئی اور انسان کو پریشان کرنے کے لئے اس کے سر پر بھنبھنانے لگی۔ پہلے وہ شانے پر بیٹھی، ناک کے پاس بھنبھنانے لگی پھر کان کے پاس چکر لگانے لگی۔ آخرکار انسان نے تنگ آکر کہا "بہتر ہے کہ تم جنگل، ندی اور کھیتوں میں جاؤ، اگر تمہیں کوئی چرند، پرند اور آبی جانور کی خوبصورت دُم دکھائی دے تو اس کی دُم مستعار لےلو۔ میری طرف سے اجازت ہے"

یہ سُنتے ہی مکھی خوش ہوکر اڑتی ہوئی کھڑکی سے باہر نکلی۔ باغ میں رنگ برنگ کے پھول کھلے تھے۔ پھول کی پتیوں پر ریشم کا ایک کیڑا رینگ رہا تھا۔ وہ کیڑے کے پاس پہنچ کر زور سے بولی۔ "ریشمی کیڑے، تم اپنی دُم مجھے دیدو جو صرف تمہاری خوبصورتی کا باعث ہے۔"

کیڑا جز بز ہوکر بولا۔ "دراصل یہ صرف میری دُم ہی نہیں بلکہ میرا پیٹ بھی ہے۔ میں کبھی اسے سکیڑتا ہوں اور کبھی پھیلاتا ہوں، اس لئے مجھے سینے سے رینگنے والا کیڑا کہنا چاہئے۔"

مکھی نے اپنی غلطی محسوس کی۔ وہ پھر اڑی۔ اڑتے اڑتے ندی کے کنارے پہونچی۔ ندی میں مچھلی اور جھینگا تیر رہا تھا۔ وہ مچھلی سے مخاطب ہوئی "اپنی حسین دم مجھے دیدو۔ جو صرف تمہاری سندرتا کا باعث ہے"

مچھلی چیں بجبیں ہوکر بولی: "یہ صرف سندرتا کے لئے نہیں ہے۔ میرے عضو کا اہم جزء ہے۔ جب میں تیرنا چاہتی ہوں تو دُم کو موڑتی ہوں۔ میں کسی طرح بھی اپنی دُم تمہارے حوالے نہیں کرسکتی"

تب مکھی نے جھینگا سے درخواست کی "تم اپنی دم مجھ

سونپ دو۔"

جھینگا نے لٹکا سا جواب دیا۔ "یہ میرے بس سے باہر ہے۔ دیکھو پانی میں تیرنے کے لئے میری ٹانگیں کتنی پتلی اور کمزور ہیں لیکن میری دم چوڑی اور سخت ہے۔ جب میں پانی میں اپنی دم ہلاتا ہوں، جدھر چاہتا ہوں، چل پھر سکتا ہوں۔ میری دم میرے لئے پتوار کا کام دیتی ہے۔"

ناامید ہو کر مکھی فضا میں اڑی، کچھ دور جھاڑی میں ایک ہرنی کو اپنے بچے کے ساتھ دیکھا۔ ہرنی کے ایک چھوٹی سی دُم تھی۔ مکھی بھن بھن کرنے لگی۔

"ہرنی اپنی چھوٹی سی دُم مجھے دیدو۔"

ہرنی سہم گئی اور بولی "میں اپنی دم کیوں دوں۔ میں اگر اپنی دُم تمہیں دیدوں تو اپنے بچے کو ختم کر دوں گی۔"

مکھی نے حیرانی سے پوچھا۔ "بچے کا تمہاری دُم سے کیا واسطہ ہے؟"

ہرنی نے عجیب کہانی بیان کی۔ "جب شیر دھاڑتا ہوا میری جانب بڑھتا ہے تو میں جھاڑی میں چھپ جاتی ہوں۔ بچے میرے پیچھے ہوتے ہیں۔ وہ بڑی آسانی سے جھاڑی میں مجھے تلاش کر لیتے ہیں۔ میں اپنی دُم سفید رومال کی طرح ہلاتی رہتی ہوں۔ ساتھ میمنوں کو ہدایت دیتی جاتی ہوں کہ ایک اس طرف، دوسرا اس طرف ..... وہ جھاڑی میں سفید سی چیز ہلتی دیکھ کر میرے پیچھے آ کر دبک جاتے ہیں۔ اس طرح ہم لوگ شیر سے اپنی جان بچاتے ہیں۔"

مکھی مایوس ہو کر پرواز کر گئی۔ وہ اڑتی رہی اڑتے اڑتے اس نے جنگل میں ایک ہُدہُد کو درخت پر بیٹھے دیکھا۔ اسے دیکھ کر مکھی کو امید کی کرن نظر آئی۔

"ہُدہُد تم اپنی دلکش دم مجھے بخش دو۔ یہ صرف تمہیں سندر دکھانے کے لئے ہے۔"

ہُدہُد نے ناک بھوں چڑھا کر کہا۔ "تمہارا دماغ تو صحیح ہے؟ میں لکڑی سے غذا کیسے حاصل کروں گا۔ بچوں کے لئے گھونسلے کیسے بناؤں گا۔"

مکھی بولی۔ "تم اپنی چونچ سے کام لے سکتے ہو۔"

"چونچ صرف چونچ ہے۔ میں بغیر دم کے کچھ نہیں کر سکتا۔ تم دیکھو میں کیسے لکڑی کاٹتا ہوں۔"

یہ کہہ کر ہُدہُد نے اپنی سخت دُم درخت کی چھال میں پیوست کر دی۔ جسم لٹکا کر اپنی چونچ سے درخت کترنا شروع کر دیا۔ درخت کی لکڑی بھوسی کی طرح فضا میں اڑنے لگی۔

بہرحال مکھی کو یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑی کہ ہُدہُد نے دم کے بل پر درخت کاٹنا شروع کیا تھا۔ اس کے بغیر وہ کام ممکن نہ تھا۔

مکھی اور کہیں اڑ کر نہیں گئی۔ اس نے غور کیا تھا "جاندار کی دُم اپنے اپنے کام کے لئے مخصوص ہے۔ اس کے لئے واپسی کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ میں انسان کو سبق پڑھاؤں گی۔ وہ جب تک اپنی دُم نہیں دیتا، اسے تنگ کرتی رہوں گی۔ آخر اس نے اپنی دُم کہاں چھپا رکھی ہے؟"

انسان کھڑکی میں بیٹھا باغ کا نظارہ کر رہا تھا۔ مکھی اس کی ناک پر آ بیٹھی۔ انسان نے ناک ہلائی تو وہ اسکی پیشانی پر براجمان ہو گئی۔ انسان نے سر جھٹکا، وہ پھر ناک پر آ بیٹھی۔ انسان بیچارگی سے بلبلا اٹھا۔ "مکھی مجھے بخش دو۔"

مکھی بھنبھناتی ہوئی بولی۔ "میں تمہیں معاف نہیں کر سکتی۔ تمہاری وجہ سے مجھے سخت پریشانی ہوئی۔ خواہ مخواہ کی بھاگ دوڑ سے جان نکل گئی۔ میں نے تمام جانداروں کو دیکھا۔ سبھوں کو دُم کی ضرورت ہے۔ تمہاری دم کہاں گئی؟

"اری بھاگیوان! دُم کی بات تو ڈارون نے کبھی کی تھی لیکن انتہائی تلاش کے باوجود مجھے اپنی دُم نہ مل سکی۔"

"بہانہ نہیں چلے گا۔ اپنی دُم کا دکھڑا سنا کر مجھے ٹال نہیں سکتے۔" مکھی سر پر مسلط ہو گئی تھی۔

انسان نے دیکھا کہ مکھی سے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ وہ وبال جان بنی ہوئی تھی۔ اس کے دماغ میں ایک ترکیب آئی

"بی مکھی۔ وہ دیکھو میدان میں گائے چر رہی ہے۔ اس سے دریافت کرو کہ اُسے دُم کی ضرورت ہے یا نہیں؟"

مکھی کھڑکی سے اڑتی ہوئی گائے کی پیٹھ پر بیٹھ گئی اور پوچھا۔ "اے گائے! تمہاری دُم کس لئے ہے؟" گائے خاموش رہی۔ کچھ بولی نہیں۔ مکھی اس کی پیٹھ پر رینگنے لگی۔ اچانک زناٹے کی آواز آئی۔ گائے نے اپنی دُم پیٹھ پر کھینچ ماری۔ مکھی اُچھل کر زمین پر گری اور مر گئی۔

انسان نے حیرت سے ایک نظر مری ہوئی مکھی کی طرف دیکھا اور دوسری بار گائے کی طرف —

ایک منظر سامنے سے گزر گیا۔ ایک حقیقت کی بازیافت ہوئی!

اور یوں محسوس ہوا کہ جیسے اُسے زندگی کا عرفان ہو گیا۔

▲▲

فارم - IV

شرائط و ضوابط کے لئے ۸ دیکھئے

ماہنامہ سہیل گیا

۱۔ مقام اشاعت — ریلور سائیڈ روڈ، گیا۔ ۸۲۳۰۰۱

۲۔ وقفہ اشاعت — ماہنامہ

۳۔ پرنٹر کا نام و پتہ — مسعود منظر، ریلور سائیڈ روڈ گیا

کیا ہندوستان کے شہری ہیں — ہاں

اگر غیر ملکی ہوں تو وطن کا نام — ××

۴۔ پبلشر کا نام و پتہ :۔ مسعود منظر، ریلور سائیڈ روڈ، گیا

کیا ہندوستان کے شہری ہیں :۔ ہاں

اگر غیر ملکی ہوں تو وطن کا نام :۔ ××

۵۔ ایڈیٹر کا نام و پتہ :۔ مسعود منظر، ریلور سائیڈ روڈ گیا

کیا ہندوستان کے شہری ہیں :۔ ہاں

اگر غیر ملکی ہوں تو وطن کا نام — ×

۶۔ ان اشخاص کا نام و پتہ جو رسالہ کے مالک ہوں اور جو مکمل سرمایہ کاری

میں مسعود منظر اپنی جانب سے اعلان کرتا ہوں کہ میرے علم و یقین کے مطابق مذکورہ بالا تفصیلات صحیح اور درست ہیں۔

دستخط۔ مسعود منظر

ریلور سائیڈ روڈ، گیا۔ ۸۲۳۰۰۱

تاریخ مارچ ۱۹۹۰ء

تبصرہ کے لئے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے

نئی کتابوں کا تعارف

تبصرہ نگار
ڈاکٹر ستار احسن رستوگی

گہوارۂ علم و ہنر

مصنف :۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد
ناشر :۔ ساغر نظامی میموریل اکیڈیمی، نئی دہلی
قیمت :۔ پچیس روپے
ملنے کا پتہ :۔ انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر
۲۱۲۔ راؤز ایوینیو، نئی دہلی

کتابت و طباعت کے اعتبار سے دل کش، گٹ اپ نہایت دل نشیں "گہوارۂ علم و ہنر" مجموعہ کلام جگن ناتھ آزاد لکھی ہوئی ۱۲ نظموں پر مشتمل ہے۔ یہ ۱۲ نظمیں بغایت معیاری ہونے کے ساتھ ساتھ آفاقیت، انسان دوستی، ثقافت، انسانی اقدار کو محیط ہونے کی وجہ سے اردو شاعری کو نئے جہات سے آشنا بھی کرائی ہیں۔ پروفیسر آزاد اب ایک تحریک بن چکے ہیں۔ ہندوستانی ثقافت اور مادر وطن سے بے پناہ محبت کو اور عالمی اقدار کو شعری و فکری معراج تک پہنچا دیا ہے۔

پروفیسر آزاد بڑے صحافی بھی رہے ہیں اور رسالہ "آج کل" (اردو) کی مجلس ادارت میں شمولیت سے بھی زبان و ادب کی خدمت کرتے رہے۔ شاعری کے نقطۂ نظر سے، ان کی ولادت، پرورش شاعرانہ ماحول میں ہوئی کیوں کہ ان کے تیا سورگیہ پروفیسر تلوک چند محروم کے نام و کام بہت پہلے ہی شہرت سے آشنا ہو چکے تھے۔ گھر پر کتابوں کے انبار، تیاجی سے ملنے والوں کا سلسلہ، مراسلت وغیرہ آزاد کی نشو و نما میں شریک و سہیم کہے جا سکتے ہیں اور ان سب کی نشاندہی بھی کی جا سکتی ہے۔ اس پہلو پر آزاد کی دو تصانیف بہت ارتکازی اہمیت کی حامل ہیں، "آنکھیں ترستیاں ہیں" اور "حیات محروم"۔

اقبالیات میں ان کا مقام و مرتبہ کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔

آزاد صاحب کو نثر و نظم دونوں پر قدرت حاصل ہے۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ اردو شاعروں میں گنے چنے ہی اچھی نثر لکھ سکتے ہیں۔ آزاد صاحب سوویت روس کی متعدد یونیورسٹیوں اور اداروں کی دعوت پر ۱۹۸۰ء میں وہاں گئے۔ اقبالیات نیز اردو ادبیات سے متعلقہ مختلف النوع موضوعات پر مخاطبہ کے لئے۔ شاعر آزاد نے ایک سفرنامہ "پشکن کے دیس میں" سپرد قلم کیا۔ یہ سفرنامہ اردو میں لکھے ہوئے دوسرے سفرناموں سے مختلف ہے کیونکہ اس میں ادبیات

سماجیات، ثقافتی امور وغیرہ کا بھرپور ذکر ہے۔

سفرنامہ "پشکن کے دیس میں" اور زیر تبصرہ "گہوارۂ علم و ہنر" دونوں میں ایک لحاد و جہات فکری، کہکشاں در کہکشاں نظر آتے ہیں۔ ہندوستان اور روس کے علاقوں کا صدیوں پرانا رشتہ ہے جو وہاں کے لوگ جانتے ہیں اور اب ہم آزاد صاحب کے توسط سے آشنا ہو رہے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ ان سے ایک خاتون پروفیسر بیگم جمال نے علم سکھائے گیا گیا۔

عجیب بات یہ مجھ کو بتائی سکھانے
کہ لکشمی کا بھی تیوہار ہم مناتے ہیں
گذر چکے ہیں جو اجداد ان کے واسطے ہم
پکا کے کھانا اسے میز پر سجاتے ہیں
اور اس خیال میں رہتے ہیں ہم تمہاری طرح
کہ یہ پکا ہوا کھانا انہی کو جاتا ہے
اور اس طرح سے بزرگوں کو جو کھلاتا ہے
ثواب پاتا ہے
مہینہ جون کا آتا ہے جب تو شام کو ہم
مقدس آگ سے روشن گھروں کو کرتے ہیں
یہ آگ شام سے تا صبح جلتی رہتی ہے
خوشی ہمارے دلوں میں مچلتی رہتی ہے
دیار غیر کی لڑکی بتا رہی تھی مجھے
ہمارا ہند سے صدیوں پرانا رشتہ ہے
میرے عزیز وطن
اس کے اس خیال کے ساتھ
ادیب و شاعر و عالم بھی تھے شریک کئی
میں سوچتا ہوں کہ تیرے چراغ شوق کی ضو
کہاں کہاں نہ گئی

چونکہ ہند و روس کے مابین صدیوں پرانا رشتہ ہے لہٰذا ہندیات (INDOLOGY) کا روس کی متعدد درسگاہ اور اکیڈمیوں بالخصوص اہتمام ہے۔ سنئے جگن ناتھ آزاد۔

میرے عزیز وطن
عجیب مقام پہ لائی ہے مجھ کو وقت کی رو
کہ ہر زبان سے تیرا ہی ذکر سنتا ہوں
کسی زبان پہ ہے گاندھی، کسی پہ رامائن
کوئی کتاب ہے ٹیگور پر کوئی مجھ پر
کسی کی نوک قلم پر ہے ذکر گیتا کا
کوئی ہے محو ثنا خوانی مہابھارت
ترے ادب کو کوئی ماں کا دودھ کہتا ہے
عجیب مقام ہے یہ
ادھر
کسی کا مطمح فکر و نظر ہے بنگالی
ادھر مطالعہ سنسکرت میں غرق کوئی
کوئی ہے یہاں سینتی کمار کا عاشق
وہاں ہوا ہے کوئی شانتی نکیتن کو
یہ کس دیار میں لائی ہے مجھ کو وقت کی رو

سوویت روس درحقیقت دیار امن و آشتی ہے۔ الوداع کہتے ہوئے یہ منظوم حصہ ملاحظہ ہو۔

الوداع اے ارض روس
حوصلہ ایمان تیرا، عزم ہے تیرا یقین
مستقل قدروں کا گہوارہ ترا ماحول ہے
وہ جو مذہب کے محاسن ہیں تو ہے ان کا امین
جادۂ علم و عمل پر تو بہت آگے ہے آج
چھوڑ کر پیچھے نزاع کفر و دیں
فلسفہ کو ...

مبصر:۔ عطا عابدی

● آزادی کے بعد دہلی میں اُردو غزل

مرتب :۔ پروفیسر عنوان چشتی

قیمت :۔ ۶۱ روپے

ناشر :۔ دہلی اردو اکادمی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

پروفیسر عنوان چشتی لگاتار شاعری، تنقید اور تحقیق کے میدان میں وقیع خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ۱۹۸۹ء میں ان کی دو کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں (۱) حرفِ برہنہ اور (۲) "آزادی کے بعد دہلی میں اردو غزل" آخر الذکر کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو غزل کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں ۱۸۰ شاعروں کا انتخاب کلام شامل ہے جن میں اجمل اجملی، جگن ناتھ آزاد، امن لکھنوی، انور صابری، امیر قزلباش، باقی، بسمل سعیدی، بیخود دہلوی، آریا مغنی، غلام ربانی تاباں، من موہن تلخ، نور جہاں ثروت، اوید وششٹ، حسن نعیم، حیات لکھنوی، شجاع خاور، ...ن نرائن راز، روشن صدیقی، زبیر رضوی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، رفعت سروش، سلام مچھلی شہری، نریش ...ر شاد، شہاب جعفری، طالب دہلوی، صغیر احمد صوفی، ...ش ملسیانی، عنوان چشتی، کرشن موہن، گوپال متل، ...ک چند محروم، محسن زیدی، مخمور دہلوی، مخمور سعیدی، رام کرشن مضطر، آنند نرائن ملا، مظفر حنفی، منور لکھنوی، اور مشیر جھنجھانوی وغیرہ کی غزلوں کا انتخاب شائع کیا ہے۔ ان منتخب غزلوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر عنوان چشتی نے انتخاب میں ذوقِ سلیم اور تنقیدی شعور دونوں کو رہنما بنایا ہے۔ یہ انتخاب دہلی میں غزل کی ایک دلنواز اور بصیرت افروز دھنک کی تشکیل کرتا ہے۔ اور قاری پر غزل کے چالیس سالہ سفر کا ہر انداز کا پوری طرح انکشاف کرتا ہے۔ تھوڑے وقت میں دہلی کی غزل کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بے حد مفید اور موزوں ہے۔

پروفیسر عنوان چشتی نے اس کتاب میں ایک مفصل اور بصیرت افروز مقدمہ بھی شامل کیا ہے۔ انھوں نے ابتدا میں دہلی کی ادبی، سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ثقافتی اہمیت کا ذکر کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ "دہلی ایک بین الاقوامی شہر ہے۔ یہ سیاسی، ادبی، ثقافتی اور سماجی تحریکوں کا سرچشمہ ہے اس لئے زندگی کی مثبت اور منفی لہروں کا گہوارہ بھی ہے۔" اس اجمال کی تفصیل پیش کرتے ہوئے پروفیسر عنوان چشتی نے دہلی میں گزشتہ چالیس برس کے ادبی اور شعری رویوں اور رجحانوں کی شناخت کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ دہلی [illegible]

داد صحنی دے رہے ہیں۔ جو موجودہ دور کی ادبی فضا کی تشکیل کرتے ہیں۔ مثلاً کلاسیکی غزل کا رجحان، نو کلاسیکی غزل کا رجحان، غزل میں فکری اور فلسفیانہ رجحان، غزل کا ترقی پسند رجحان، غزل کا جدیدیت پسندی کا رجحان اور غزل میں تغزل اور رومانیت کا رجحان۔ پروفیسر عنوان چشتی نے ان رجحانوں کا تفصیل سے تجزیہ کیا ہے اور ہر رجحان کا مزاج کا تعین بھی کیا ہے۔ انہوں نے ان رجحانوں کا تجزیہ کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے۔

" دبستان دہلی کا وجود اپنی جگہ باقی ہے۔ اگرچہ اس کی پرانی خصوصیات میں مرور زمانہ سے تبدیلیاں آگئی ہیں مگر ان کی اپنی خوشبو اپنا ذائقہ ہے۔ آزادی کے بعد ہماری سماجی، تہذیبی، سیاسی اور اقتصادی زندگی میں جو تیز رفتار تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی ادبی تحریکات کے جو سائے پڑے ہیں۔ اردو غزل نے ان کو اپنے مزاج کے مطابق قبول کیا ہے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اردو غزل کسی ٹھہرے ہوئے تالاب کا پانی نہیں۔ بلکہ ایک بہتا ہوا دریا ہے۔ اس دریا کے سفر میں پہاڑی ندی کی چہل بل ہے۔ اور میدانی دریا کا سنجیدہ خرام بھی ہے۔"

اس تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر عنوان چشتی ادب اور زندگی کا جو تصور رکھتے ہیں وہ جامد نہیں ہے بلکہ نامیاتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر دور کا ادب اپنے دور کے مجموعی حالات سے اثر قبول کرتا ہے۔ اردو شاعری بہت حساس اور باشعور ہے۔ اس نے قدم قدم پر اپنے فنکارانہ کس بل کا ثبوت دیا ہے۔

اس کتاب کو اردو اکاڈمی نے اعلیٰ کاغذ پر دلکش کتابت اور طباعت کے ساتھ منظر نواز جاذب گرد پوش میں پیش کیا ہے۔ اس پیشکش پر پروفیسر عنوان چشتی کے ساتھ اکاڈمی بھی مبارکباد کی مستحق ہے۔

بقیہ ظ انصاری......

محسوس کیا ہے کہ ان کی تحریر و تقریر میں ایک ایسی یکسانیت پائی جاتی ہے کہ جب میں ان کی تقریر سنتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ ان کا کوئی مضمون پڑھ رہا ہوں اور جب کوئی تحریر پڑھتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے میں ان کی کوئی تقریر سن رہا ہوں۔ میرے خیال میں ڈاکٹر ظ۔ انصاری کا یہ ایک ایسا دلکش اور منفرد اسٹائل ہے جس میں ان کی تحریر تقریر کی دھیمی دھیمی ادبی آنچ یکساں طور پر مجھے محسوس ہوتی رہی ہے۔

بقیہ از گہوارۂ علم وہنر

اردو کے شعری اثاثے میں جگن ناتھ آزاد کی ذا تبصرہ تخلیق خاصا اضافہ کرتی ہے۔ اگر انتقاد یاتی ارتکاز سے کام لیتے ہوئے اس کو ورڈز ورتھ۔ WORDS WORTH)۔ کی معروف تخلیق Lyrical Ba کے ہم پلہ کہا جا سکتا ہے۔ اور بالتفصیل ثبوت فراہم کئے جا سکتے ہیں "گہوارۂ علم وہنر" کے بطن و ظہر گونہ ترنم کارفرما ہے اور اس ترنم صداقت کی لے بھی شامل ہے۔ امید ہے کہ اس تخلیق کا اردو حلقوں میں خیر مقدم کیا جائے گا۔

شہرِ خیال

★ مجیبی تسلیم

ابھی ابھی سہیل کا تازہ پرچہ ملا

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کا مضمون پڑھ کر تکلیف ہوئی۔ لوگوں کے ذہنوں کے تاریک گوشوں کو اپنے صفحات پر اس طرح منتقل کرنے کی جگہ سہیل کیوں ہو؟

اردو زبان و ادب کسی کی جاگیر نہیں اس میں فرقہ پرست بھی ہیں اور سیکولر بھی۔ مگر فرقہ واریت کا آلہ کار بن کر اس قسم کے مضامین کی ہمت شکنی ضرور کرنی چاہیئے۔ ہندی کے مسلمان ادیبوں کی جو بات انھوں نے صفحہ ۵ پر اٹھائی ہے وہ بھی مہمل ہے۔ ہندی کے اردو ادیب ہی ہیں کتنے

غرض رستوگی صاحب کی فرقہ وارانہ ذہنیت سے تکلیف ہوئی اور آپ نے اس ذہنیت کو اردو پر تھوپنے کی اجازت دی اس سے مزید دکھ ہوا۔

اتر پردیش اردو اکادمی پر حملہ اور بہار میں دوسری زبان کے مرتبے کا مضحکہ بھی اسی ذہنیت کا غماز ہے۔ سارا رویہ نہایت تنگ نظری کا مظہر ہے۔

——— محمد حسن (دہلی)

★ عزیز گرامی! سلام مسنون

سہیل برابر موصول ہوتا ہے۔ گذشتہ سال اقبال کے متعلق رستوگی صاحب کلکتہ کا مضمون پڑھا بڑی تکلیف ہوئی۔ ہر اہل قلم کو اپنے نظریات و خیالات پیش کرنے کی آزادی ہے۔ اختلاف نظریات بھی روا ہے لیکن کسی کی کردار کشی غیر اخلاقی بات ہے وہ سہیل کی مجلس ادارت میں شامل ہیں اس لئے میں نے چاہا کہ العزیز سے اجازت کے بعد مقالہ نگار موصوف کی غلط فہمیوں کا ازالہ کر دوں لیکن صحت کی خرابی کے باعث العزیز سے رابطہ قائم نہ کر سکا۔ اور بات آئی گئی ہو گئی۔ انجینئر صاحب کا مضمون ٹھوس اور منطقی ہوتا ہے میں شوق سے پڑھتا ہوں۔

——— بیتاب صدیقی (سبزی باغ پٹنہ)

★ جمیل بھائی

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی اردو والوں سے شاکی معلوم ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب! اردو والے "ہندو شاعر" ہندو ادیب" تعصب کی بنا پر نہیں بلکہ اس مصرعہ کے مصداق ح کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا، اس زمانہ میں تعریف و توصیف اور حوصلہ افزائی کے خیال سے کہتے ہیں۔

میرا ایک دوست کنول شاہ آبادی ۱۹۸۰-۸۱ء میں معمولی رسائل میں بھی غزلیں بھیجتا تو واپس کر دی جاتی تھیں۔ ایک روز میں نے مزاقاً کہا، ارے کافر! اپنے نام سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتا؟

"کیسے؟"

رمیش پرشاد کنول لکھ کر

اسی شام ایک غزل (قافیہ نالش پر ردیف رکا) شب خوں کو بھیجوائی گئی جو چھپ گئی۔ کنول اندنوں ڈپٹی کلکٹر ہے۔ ایسی مثالیں اور بھی ہیں

صفحہ ۱۱ پر ڈاکٹر صاحب رقمطراز ہیں"......

انگریزوں نے ہمیشہ لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی پر عمل کیا۔

انگریزوں کا بستر تو گول ہو چکا۔ لیکن ہندوستان میں آج بھی یہی کچھ ہو رہا ہے —

صرف ۱۵ .... یوپی اردو اکادمی سب سے زیادہ ناکارہ ادارہ ہے ..... آٹھ دس کتابوں کو چھوڑ کر بقیہ تمام تر دو کوڑی کی ہیں:

بہار اردو اکادمی تو یوپی اردو اکادمی سے بھی دو چار ہاتھ آگے ہے۔ مجھے کہنے دیجئے کہ سگ دنیا کے آگے ہڈیاں پھینک کر حکومت اپنا الو سیدھا کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ مسودوں پر مالی امداد منہ دیکھ کر دی جاتی ہے، دو ہی کوڑی کے مسودے کیوں نہ ہوں

—— منیر سیفی (سرکلر روڈ، پٹنہ)

★ ڈیر سنطر ! محبت

سہیل برابر ملتا ہے۔ اور اب تازہ شمارہ بھی ملا۔

تازہ شمارہ بہتر ہے۔ میں نے دونوں مضامین یعنی ڈاکٹر تاراچرن رستوگی اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کے مضامین پڑھے، واقعی یہ دونوں مضامین فکر انگیز ہیں اور پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یوں بھی دونوں صاحبِ علم ہیں اور چوٹی کے قلم کار —

—— شانتی رنجن بھٹاچاریہ (کلکتہ)

★ عزیزم سلمہٗ ! دعا

سہیل کا تازہ شمارہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ خدا کرے کتابت اور طباعت کی موجودہ صورت برقرار رہے۔ اس کا ہمیشہ خیال رکھئے۔ ڈاکٹر تاراچرن رستوگی اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

کے مضامین قابل قدر ہیں۔ سید احمد قادری کا افسانہ "درد بستی" آج کے ماحول کی درندگی کا ایک نہایت عبرتناک نقشہ قاری کی نگاہوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔

منظومات میں ملک زادہ منظور احمد، مظہر امام، رؤف خیر اور مینا جوگن کی تخلیقات قابل ستائش ہیں۔ دیگر مضامین کا مطالعہ باقی ہے۔

اُمید ہے کہ سہیل کا معیار آئندہ اور بھی بلند ہوگا۔ .... خیر طلب ——

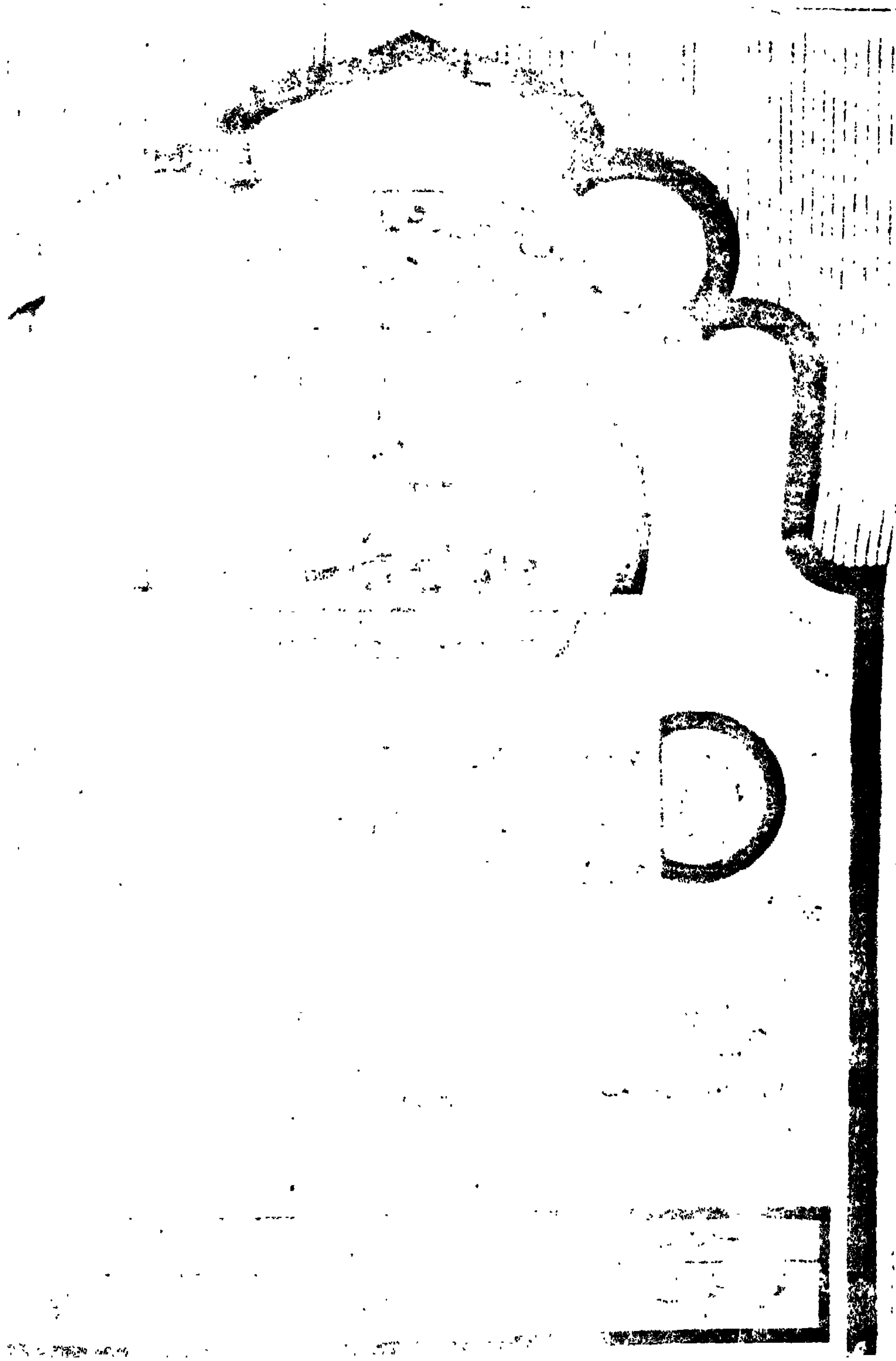
—— قیصر عثمانی (بمبئی)

۸۸



ڈاکٹر برج پریمی
پیدائش — ۱۹۳۵ء
وفات — ۲۰ اپریل ۱۹۹۰ء

Rs 3.00



بانی: حافظ محمد عبدالرحمٰن شمشاد ہاروی ــــــــ یادگار: زین العابدین احمد اویسی [illegible]

ماہنامہ سہیل گیا

مجلس مشاورت

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
ڈاکٹر قمر رئیس
اصغر علی انجینئر
قیصر عثمانی

شاہد احمد شعیب
ڈاکٹر محمد مطیع
ڈاکٹر حلیم اللہ حالی

چیف ایڈیٹر: مسعود منظر
ایڈیٹر: جمیل منظر
معاونین: شکیل احمد جمالی، عبدالقیوم ابدالی

• کتابت: سید عبدالاحد گیاوی •

شمارہ [illegible] جلد [illegible]

بدل اشتراک:
فی شمارہ ــــــ ۳/ روپے
زر سالانہ ــــــ ۳۶/ روپے

فہرست

آہ! ڈاکٹر بہت پر یمی ۴
اسلوب: کشکول ..... رفیق جابر، رفعت اللہ بن فیضی ۵
اسلوب فنکار کا قصہ .... ظہیر زماں ۶
منظر شہاب ..... ڈاکٹر امام اعظم ۹
کلیم عاجز کی شاعری ..... جوہر عبداللہ ۱۳
ساگر سرحدی ..... محمد خالد عابدی ۱۷
روشنی دنیا میں مشاہدہ ..... ڈاکٹر اختر بستوی ۲۳
خودکار سوال کی زد پر ..... خالد عبادی ۲۳
غزلیں .... علی عباس ازل، اختر شاہجہانپوری ۲۴
غزلیں ..... رؤف رحیم، یعقوب یاور ۲۵
غزلیں ..... منیر سیفی ۲۶
غزلیں ..... نذیر فتحپوری ۲۷
ماں کہا کرتی تھی ..... ڈاکٹر اودیش سرن لمان ۲۹
شناخت ..... ڈاکٹر ریحانہ قاضی ۳۲
شہر خیال: عبدالغنی دستوی، حسن نظیم، [illegible] محمد قادر ادیب، رشید الحق حقانی القاسمی، قاضی [illegible] شرف عالم ذوقی، نشاط الایمان، یعقوب طاہر، اودھ [illegible]

• خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ •

ماہنامہ سہیل
ریلوے سائیڈ روڈ، گیا ۸۲۳۰۰۱

آہ! ڈاکٹر برج پریمی

پچھلے دنوں اردو کے مشہور کہانی کار، نامور ادیب اور ماہنامہ سہیل کی مجلس ادارت کے رکن، محقق ڈاکٹر برج پریمی مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ وہ ۵۴ برس کے تھے۔ ڈاکٹر برج پریمی ۱۹۳۵ء میں دراہی یار حبہ کدل سری نگر کشمیر میں پیدا ہوئے تھے۔ ڈی اے۔ وی اسکول مہاراج گنج (سری نگر) سے میٹرک پاس کر کے محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے جلد ہی ایم۔ اے بی۔ ایڈ اور دوسرے محکمانہ امتحانات بڑے امتیاز سے پاس کر لئے۔ "سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے" کے موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ پیش کیا اور منٹو کے محققین میں شمار ہونے لگے۔ ڈاکٹر موصوف اسٹیٹ ایجوکیشن محکمہ میں مختلف ذمہ دار عہدوں پر فائز رہے۔ آج کل وہ کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ریڈر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔

ڈاکٹر برج پریمی متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ریاست جموں و کشمیر سے انہیں والہانہ لگاؤ تھا۔ سعادت حسن منٹو پر ان کی کتاب ابھی چند برس قبل شائع ہوئی جس کو ملک اور بیرون ملک کے ادبی حلقوں نے کافی سراہا۔ ڈاکٹر برج پریمی کو اپنے تحقیقی کارناموں کے پیش نظر ریاست اور بیرون ریاست کے اردو اکادمیوں نے مختلف ایوارڈوں سے نوازا۔ جن کی ادبی اداروں اور انجمنوں نے ڈاکٹر صاحب کے بے وقت انتقال پر گہرے صدمے کا اظہار کیا ہے۔ اور سوگوار کنبے سے تعزیت کا اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کافی عرصے سے ہندوپاک کے مشہور ماہنامہ "سہیل" سے بھی وابستہ تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی چند مشہور تصانیف یہ ہیں :- (۱) سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے (۲) حرف جستجو (۳) چند تحریریں (۴) ذوق نظر (۵) کشمیر کے مضامین (۶) جلوہ صد رنگ

ان کی زیر طبع تصانیف :- منٹو کتھا، (۲) اوپیندر ناتھ اشک کے خطوط (۳) پریم ناتھ در کے افسانے (۴) پریم ناتھ پردیسی۔ عہد شخصیت فنکار (۵) کشمیر میں اردو ادب کی نشوونما (۶) سپنے لہو کے لوگ۔

رفیق جاجپوری

"میرے بعد"

(وطن سے ہجرت کے بعد شاعر کا اہلِ وطن سے سوال)

مہرباں کس پہ ہیں اب اہلِ جفا میرے بعد
کس کے خرمن پہ گری برقِ بلا میرے بعد
اے نسیمِ سحری یہ تو بتا کیسے ہیں
وہ مرے ہمنفس و شعلہ نوا میرے بعد
گردِ آلام سے اب کس کی جبیں ڈھلتی ہے
کس کے رُخ پر ہے مصائب کی گھٹا میرے بعد
کون اب مرحلۂ دار و رسن تک پہنچا
کیا ہے اب شیوۂ اربابِ وفا میرے بعد
کس نے کی جراتِ ہنگامۂ تجدیدِ حیات
کون وقفِ غمِ ایام ہوا میرے بعد
کون سنتا ہے بصد ولولۂ شوق و خلوص
قلبِ گیتی کے دھڑکنے کی صدا میرے بعد

★

فضا ابن فیضی

فساد جب شہر میں ہوا، روشنی کی بارش مکان پر تھی
سلگ رہا تھا میں جس کے سائے میں، دھوپ اس کی [illegible]
یہ دیکھتے دیکھتے ہی، ہوا پرندہ نے جست کیسی
ابھی، [illegible] ہوا تھا، ابھی [illegible] نشان پر تھی
وہ کون تھا، جو نڈھال ہو کر اتر گیا پانیوں کی تہ میں
ابھی، ہوا کے دباؤ کی ابتدا، مرے بادبان پر تھی
بکھر گئے، ٹوٹ کر جہاں بال و پر، وہیں تھا پڑاؤ میرا
تمام لذت سفر کی، یہیں مختصر سفر کی تکان پر تھی
عجب ہوا چل پڑی، کہ جل بجھ کے رہ گیا خاک [illegible]
منڈیر پر جو چراغ روشن تھا، جو شفق آسمان پر تھی
دریچے، در، [illegible] بام، [illegible] سو کبھی کھڑکیوں کے
لہو کی وحشت سے [illegible] آگ اپنے مکان پر تھی
چمک رہا تھا [illegible] نقش ناتمام [illegible] بہت حسین تھا
مرے دریچے [illegible]
[illegible] ہم بھی دلوں کی دھڑکن [illegible]
عجب تماشے کا شہر وہ، مگر اداسی، [illegible] دکان پر تھی
[illegible] ہم
[illegible]
کسی کو اس کی خبر نہیں تھی، ہوا کے تیور بدل چکے تھے
[illegible] نشان پر تھی
[illegible]
ورق ورق [illegible] زبان پر تھی

قیصر زماں

"اسلوب، فن کار کا قصہ"

کسی کے اسلوب کا تجزیاتی مطالعہ اس کی انفرادیت کو اجاگر کرتا ہے۔ اسٹائل یا اسلوب دراصل شخصیت کا بھرپور اور مکمل عکس پیش کرتا ہے۔ نفسیات کے مطالعہ نے یہ بات واضح کی ہے کہ شخصیت دو چیزوں کے امتزاج سے بنتی ہے۔ ایک تو کسی بھی فرد کا خارجی برتاؤ دوسرا اس کی داخلی خصوصیات، اسلوب کی تعمیر میں شخصیت کے ان دونوں پہلوؤں کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں۔ یونگ کے مطابق شخصیت کو میلان طبع کی بنیاد پر دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ بیرون سمتی (Extrovertead) اور درون سمتی (Introvertead) بیرون سمتی کا رجحان خارجی ماحول کی جانب ہوتا ہے اور درون سمتی کا اس کے برخلاف خارجی ماحول سے لاتعلقی ہے۔ یونگ کے نظریے کے مطابق شخصیت کی ان دونوں قسموں میں کسی ایک نفسی فعل کو اولیت حاصل ہوتی ہے۔ یعنی فکر، احساس اور حواس۔ لیکن کسی فنکار پر ہم کسی ایک ٹائپ کو چسپاں نہیں کر سکتے۔

ڈاکٹر محمد حسن نے نرگسیت، فکر اور سادیت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے۔ نرگسیت سے مغلوب فنکار کی انا (Ego) اس کے بیان سے جھلکتی ہے۔ وہ فن کی کمال نمائش سے چوکتا نہیں۔ اس کے برخلاف وہ فن کار جن کی شخصیت میں دردمندی اور دلجوئی کے جذبات غالب ہوتے ہیں اس کے اسلوب میں ملائمیت اور نرمی، لب و لہجہ میں مٹھاس اور دلداری کی جھلکیاں ہوتی ہیں۔ جن کے یہاں فکر کی حکمرانی ہوتی ہے وہ ہر بات دو ٹوک کہنے کا عادی ہوتا ہے۔ الفاظ کے استعمال میں غایت درجہ کا کفایت شعار ہوتا ہے۔ ہر لفظ وہ انتخاب کرنے سے پہلے اس کی معنویت کو پرکھ لیتا ہے اور نپے تلے انداز میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتا ہے۔ جن فن کار کی شخصیت پر سادیت کا غلبہ ہوتا ہے ان کا اسلوب جارحانہ ہوتا ہے، "تلخ و ترش الفاظ و ترکیبوں" کا استعمال ان کی نگارشات کی نمایاں خصوصیات ہوتی ہے اور ان کا لب و لہجہ روکھا ہوتا ہے۔

جس طرح عام لوگوں کے کردار میں عمومیت ہوتی ہے اور اس کی کوئی نمایاں خصوصیت نہیں ہوتی اسی طرح عام فنکار کا

کا اسلوب بھی منفرد نہیں ہوتا۔ کسی بھی فنکار کا ڈکشن (MA-NNER OF EXPRESSION) اس کے علاوہ اس کے استعارے، تشبیہات، علامتیں اور کنائے اس کی تحریر یا فن پارے کو جو امتیازی وصف بخشتے ہیں اس سے اسلوب نمو پذیر ہوتا ہے۔ شخصیت کی نمائندگی کے اس نظریئے سے صرف نظر کر کے بھی اسلوب کا تعریف اور تعارف کرایا جا سکتا ہے۔

بعض ایسے فن کار ہوتے ہیں جن کی تحریروں میں منطقی اثباتیت (LOGICAL POSIVITIEM) یا تجزیاتی اظہار (ANAL-YTICAL EXPRESSION) پایا جاتا ہے۔ بعض کے یہاں تضادات کے ذریعے کسی مثبت مفہوم کی ادائیگی کا انداز اختیار کیا جاتا ہے، کسی کے یہاں ڈرامائی اظہار (DARAMATICAL EXPRESSION) نمایاں ہوتا ہے یہ تمام چیزیں اپنے اپنے مقام پر اسلوب کی تشکیل (PER-SOUEFIED) کرتے ہیں اور اس طرح کسی کے انفرادی اسلوب کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن منطقی اثباتیت اور تجزیاتی اظہار اسلوب کے تعین میں یا اس کے متشکل ہونے میں ڈکشن (MANNER OF EXPRESSION) بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ڈکشن کے ذریعے ہم واضح طور پر اسلوب انفرادیت کو سمجھ پاتے ہیں لیکن یہ کوئی قاعدہ کلیہ تو نہیں اسلوب ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن میں مجموعی الفاظ کسی خاص صورت گری سے قاصر ہوں اور محض عقلی اور منطقی تجزیاتی توضیحی طرز اظہار کی بنا پر اسلوب کی عمارت تعمیر کی گئی ہو۔ مثال کے طور پر حالی کے اسلوب میں نقطوں کا اہتمام یا شکوہ الفاظ کی کارفرمائی نظر نہیں آتی مگر ان کا منطقی طرز اظہار ان کے اسلوب کو موثر اور متشکل بناتا ہے۔ اس کے برخلاف شبلی کے یہاں شعری آہنگ اور منطقی بیان کی آمیزش سے اسلوب کی تخلیق ہوتی ہے لیکن یہی عنصر مولانا آزاد کے یہاں ان کے ڈکشن سے اسلوب کی تخلیق ہوتی ہے۔ اور غالب کے یہاں مکالماتی اظہار ہے۔

اسلوب کے متعلق لوکاچ نے کہا ہے (STYLE CAN NOT BE THOUGHT) اور یہ حقیقت بھی ہے کہ آج تک اسلوب کا کوئی جامع اور حتمی تعریف نہیں ملتا۔ مغربی نقادانِ فن نے اسلوب کی تعریف پر اتفاق کرتے ہوئے کہا ہے کہ "شخصیت کی اظہار کی تکنیک اور اظہار کی انفرادیت کا نام اسلوب ہے" یہ صحیح ہے کہ اسلوب کی اصطلاحی معنی فن کار کی اظہار کی تکنیک سے وابستہ ہے شاید اس لئے کسی کے نزدیک اسلوب فنکارانہ "طریقہ" کار ہے۔ اور کہیں اسلوب اظہار کا شعوری "طریقہ" کار ہے۔ بعض نے اسلوب کو شخصیت کا اظہار بتایا ہے تو ایمرسن کے نزدیک اسلوب فنکار کے ذہن کی زبان ہے۔ ہمارے یہاں اسلوب کے پارکھوں نے لسانیات اور جمالیات کی روشنی میں اسلوب کے اس قضئے کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ آل احمد سرور لکھتے ہیں۔

> "بیان کا مسئلہ زبان کا مسئلہ ہے۔ حسن بیان اور اس کے بعد انفرادیت کا مسئلہ ادب کا مسئلہ ہے۔ ادب کے مطالعے میں بھی سب سے پہلے زبان کے حدود متعین کرنا ہے۔ نثر کی زبان اور نظم کی زبان میں فرق ہے۔ حالانکہ دونوں ادب کی شاخیں ہیں۔ یعنی دونوں میں حسن بیان کی نوعیت مختلف ہے۔ نظم کی زبان تخلیقی ہوتی ہے، نثر کی تعمیری ....
> .... نظم میں ہر لفظ بقول غالب "گنجینۂ معنی کا طلسم ہے" نثر میں وہ اینٹ جو دوسری اینٹ کے ساتھ مل کر تاج محل بنتی ہے۔"
>
> (نظم اور نظمیے)

مسعود صاحب نے بیان کو مستند بتاتے ہوئے بیان کے حدود کو متعین کرنا لازمی قرار دیا ہے۔ کچھ اسی طرح سلیم شہزاد نے بھی لکھا ہے۔

"اسلوبیات کا تعلق ان تمام تر وسیع لسانی مظاہر سے ہے جو کسی جملے کی حدود کے پرے پائے جاتے ہیں۔ اس بیان پر کہا جا سکتا ہے کہ اسلوبیات میں مفرد جملوں کی بجائے زبان کی وسیع تر ساختوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ یہ ساختیں نثر میں پیراگراف اور نظم میں بندوں کی صورتوں میں مہیا ہوتی ہیں جنہیں اظہار خیال کی اکائیاں فرض کرتے ہوئے ان میں متکلم کے اسلوب کی دریافت کی جاتی ہے۔"

(لسانی تنقید کی قوال، جواز ۲۲)

جب ہم کسی فنکار کے اسلوب سے بحث کرتے ہیں تو اپنی توجہ محض ادب و فن کے چند مقررہ اور مانوس نکتوں کی تلاش و جستجو تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اس کی بھی کوشش ہوتی ہے کہ ان میں فن کار کی شخصیت کا رنگ کہاں تک نمایاں ہے اور اس کے زیر اثر ان میں کیا معنوی تبدیلیاں ہوئی ہیں فن کار نے کس موضوعات کو برتا ہے اور جذبات و احساسات کی تنظیم یا افکار و خیالات کی تشکیل کے لیے کون سا طریقہ اپنایا ہے، اپنے مطالعے اور مشاہدے کو منضبط کرنے کے لیے تجربے ہوئے تاثرات کو باہم ایک رشتے میں منسلک کر کے انہیں موزوں اور مناسب راہ دینے کی کوشش کی ہے۔ جب تک ان سارے امور پر غور نہ کر لیا جائے تب تک کسی فنکار کے اسلوب کا صحیح اور واضح قدر و قیمت کا تعین مشکل ہے۔

ڈاکٹر امام اعظم

ذات و کائنات کا شاعر منظر شہاب

وقت اور بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ادب کے اندر تبدیلی اور نئے تجربوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہ سلسلہ ہر عہد میں اپنے اپنے طور پر ابھرتا ہے اور اس عہد کی پہچان بھی بن جاتا ہے۔ تبدیلی اور تجربہ تقریباً ناگزیر ہے۔ لیکن جو تجربے ہوتے ہیں اور جب کوئی نئے ڈائمنشن کی بات آتی ہے تو اسے قبول کرنا ذرا دشوار ہوتا ہے۔ بدلتی ہوئی قدریں عملی زندگی میں ظاہری چیزوں کی ساخت کو بھی یکسر بدل دینے کے درپے رہتی ہیں اور اس سے فرار کا خطرہ ہے اور یکسر کا تغیر ہونا جمود کو ختم دیتا ہے۔ ایسی صورت میں دو چیزیں سامنے آتی ہیں۔ ایک تو وہ تجربے جن کو [illegible] کا نام دیا جاتا ہے۔ فیشن کے طور پر تجربہ اگر ادب کے میدان میں کئے جاتے ہیں تو میکانکی عمل ہوتا ہے اور جب [illegible] نے تجربوں کے لئے تحریک دیا ہے تو اسی میں خطرہ مکتب کو بھی ختم دیتی ہے اس میں پائداری اور استحکام موجود ہوتا ہے۔ کمٹمنٹ اور

نن کمٹمنٹ کی باتیں بھی ادب میں کی جاتی ہیں مگر ادب کی جانچ اور ادبی تخلیق کی قدر و قیمت متعین کرنے میں ناقدوں کو اس تعصب سے اوپر اٹھنے کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ اگر کوئی آدمی یا کوئی فنکار کسی مخصوص نظریے اور فکر کا حامی ہو تو اس کا مطلب قطعی یہ نہیں کہ اس کے یہاں تخلیقی یکسانیت ہوگی۔ کیونکہ تخلیقی عمل محض نظریاتی اساس کی محتاج نہیں اس لئے کہ نظریہ تو [illegible] کے طور پر تخلیق کی رگوں میں جاری و ساری رہتا ہے اور جس قدر قدرتِ اظہار میں فنی مہارت موجود ہوگی اسی قدر فن نمایاں ہوگا اور [illegible] کی کیفیت اس کی تخلیق میں نہیں ہوگی۔ اگر کوئی نظم یا کوئی شعر فطری طور پر وجود میں آیا ہو تو اس میں تازگی، توانائی، شگفتگی اور نیا پن ہوگا گرچہ ہر عہد کی اپنی پہچان ہوتی ہے لیکن ایک اچھا شاعر اپنے عہد کی پہچان کے ساتھ ساتھ اپنی انفرادی پہچان بھی بناتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر وہ محض تجربہ برائے تجربہ کر رہا ہو تو یقینی طور پر یکسانیت اور اپنے عہد کے

معاصر شعراء کی طرح اس کے یہاں بھی کم و بیش یہی طرز
اظہار اور [illegible] دیکھنے کو ملتا ہے۔ تجربہ اگر فطری تحریک
کے سبب ظہور میں آیا ہو تو اس کا رنگ واضح ہوگا۔
منظر شہاب کا تعلق بہر صورت ترقی پسندوں کی
نسل سے ہے۔ اشتراکی فکر ان کے یہاں موجود ہے۔
استحصال کے خلاف ان کی آواز بھی بلند ہوتی ہے۔
معاشرتی زندگی کی ناانصافیوں کو منظر شہاب بے نقاب
کرتے ہیں۔ خود زندگی کے گوناگوں مسائل میں الجھے رہے ہیں
اور ایک زوال پذیر معاشرے میں ان کا جنم ہوا۔ جہاں ان
کے لئے تمام تعیش تو کیا اس کا تصور بھی محال نظر آتا
ہے۔ لیکن ان کے یہاں کچھ کرنے کا عزم کچھ پانے کی خواہش اور
تبدیلی کی تمنا ہر پل، ہر لمحہ انہیں تحریک دیتی رہتی ہے اور
اسی سبب ان کا دل و دماغ ایک مخصوص آہنگ میں سوچتا
اور محسوس کرتا ہے۔ ان کے یہاں یہ ساری باتیں کسی میکانکی
ریاضت کے سبب نہیں ہے۔ بلکہ فطری تقاضوں کے عین
مطابق ہے۔ اس لئے وہ فکری نظریے ان کی شاعری
پر حاوی نہیں ہوتے۔ ایک زیریں لہر کے طور پر ان کی
شاعری میں جاری و ساری رہتے ہیں۔ اور فن کی حسن کاری
کسی طور مجروح نہیں ہوتی۔ منظر شہاب خود ہی فرماتے ہیں۔

"موضوع سے وفاداری لائق ستائش
جذبہ ہے۔ لیکن اس کے اظہار میں شعری
لوازمات سے بے اعتنائی کو سراہا نہیں جا
سکتا۔ اگر فنکار حرف کی جادوگری اور
آہنگ کی عشوہ طرازیوں کا رمز شناس نہیں
تو اس کا موضوع خواہ کتنی ہی افادیت کا
حامل ہو تخلیقی ادب کا حصہ نہیں بن سکتا۔
یہ بھی حقیقت ہے کہ ہیئت کی تمام تر فن
کاری کے باوجود ایسے موضوعات جو
سماجی ارتقاء میں خارج ہوں، تخلیقی ادب
کی سطح کو پست کر دیتے ہیں۔ ادب یا کسی
بھی فنون لطیفہ میں ناوابستگی کا سوال بے
معنی ہے۔ فن کار کبھی معنی کبھی ہیئت اور کبھی
دونوں سے وابستہ رہتا ہے۔

(پیراہن جاں۔ پیش لفظ)

منظر شہاب اس اقتباس میں جہاں شعری لوازمات
سے بے اعتنائی کو رد کرتے ہیں وہیں یہ بھی فرماتے ہیں ۔۔۔
ایسے موضوعات جو سماجی ارتقاء میں خارج ہوں، تخلیقی
ادب کی سطح کو پست کر دیتے ہیں۔ منظر شہاب نے چونکہ یہ
نظریہ مارکسزم سے برآمد کیا ہے اس لئے ان کا ایسا کہنا مناسب
بھی ہے۔ سماجی تبدیلیوں کا اثر ادب پر گہرا مرتسم ہوتا ہے۔ اس
لئے جب سوچنے کے انداز میں تبدیلی ہوگی تو پیش کرنے کے انداز
میں بھی تبدیلی ہوگی۔ لفظوں کی معنویت بھی بدلے گی اور ممکن
ہے کہ فارم میں بھی تبدیلی ہو کیونکہ موضوع خود ہی فارم کو بھی جنم دیتا ہے
خود ہی انداز بیان کو بھی اپنے طور پر ڈھالتا ہے۔ اگر موضوع میں تنوع
ہو اور فارم کی تبدیلی اس کے دسترس سے باہر ہو تو غالب کی طرح تنگنائے غزل
کا شکوہ کرنا پڑتا ہے۔ یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں کہ یہ کہا جائے کہ ہیئت کی تمام تر فن
کاری کے باوجود ایسے موضوعات جو سماجی ارتقاء میں خارج ہوں، تخلیقی ادب کی سطح کو پست
کر دیتے ہیں۔

بہر صورت یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ جس سماجی ارتقاء
کی بات منظر شہاب کرتے ہیں خود تخلیقی عمل میں اس کو رد
کرتے ہیں۔ اگر ان کی تخلیقات کا جائزہ لیا جائے تو خود
ان کے [illegible] نارس ٹوٹتے نظر آئیں گے۔ نثر میں وہ افادی
فلسفی نظر آتے ہیں لیکن شاعری میں وہ فن کار۔ اسی
سبب یہ تضاد ان کے یہاں موجود ہے۔ مثلاً فرماتے ہیں۔

"ادب زندگی کی تصویر کشی کا نام ہے"

حقیقت تو یہ ہے کہ ادب اور زندگی دونوں ہمہ دم ایک دوسرے کی جلوہ گری کے لئے بے تاب ہیں۔ معلوم سے نامعلوم کی طرف اشتیاق اور منفی سفر میں مصروف ہیں۔ زندگی کی مانند ادب کو بھی کسی مخصوص رنگ میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے ہزاروں دلفریب قد و قامت ہیں اور ان کے لئے ہزاروں دلکش اور دلنواز ملبوسات۔

(پیراہنِ جاں۔ پیش لفظ)

مجموعی طور پر جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ منظر شہاب بحیثیت شاعر اپنے نظریاتی منظر شہاب سے بالکل ہی مختلف ہیں۔ مثلاً ؎

تمام بس کے مسافر میں اضطراب سا تھا
کہ اک نظر بھی اسے دیکھنا خواب سا تھا

یہ شعر INNER URGE سے وجود میں آیا ہے۔ اس میں کوئی فلسفہ، کوئی نظریہ بیان نہ کر کے زیریں لہر کے طور پر بھی نہیں بہہ رہا ہے اور جہاں وہ نظریئے سے مغلوب ہو جاتے ہیں تو فرماتے ہیں ؎

بڑھ کے توڑے غرورِ خسرو کا
ضربِ تیشہ سوا کرے کوئی

ظاہر ہے کہ یہ شعر تاثیر کے لحاظ سے پہلے شعر کے مقابلے میں کمزور ہے۔ کیونکہ اس میں میکانکی عمل ہے اور اس میں فطری عمل کی کارفرمائی۔ مگر مجموعی طور پر منظر شہاب شاعر ہیں اور نظم غزل دونوں کے شاعر ہیں۔ پابند اور آزاد نظمیں بھی لکھی ہیں اور گیت بھی۔ لیکن ان کی آزاد نظمیں جیسے شہر سے لمحے میں کیا کھویا ہے چکا ہے اگر جتنی بھرپور نظمیں ہیں اتنی ان کی پابند نظمیں نہیں۔ [illegible] نظم میں جو

جو سوچنے کا سلسلہ ہے وہ نظم کے ختم ہو جانے کے باوجود بھی جاری رہتا ہے۔ نظم مختصر ہے لیکن اس کا کینوس بہت بڑا ہے۔ اور اس میں ان دیکھے نامعلوم محسوسات کی پوری کائنات سمٹی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

ان کی غزلیں اپنے اندر فنکارانہ جوہر رکھتی ہیں۔ جن کے چند اشعار قابلِ ذکر ہیں ؎

غمِ دوراں کو کلیجے سے لگا لیں ہم بھی
درد والوں کے لئے دردِ زمانہ بھی تو ہے

یہ اور بات ہے کہ بتوں کو خدا کہیں
لیکن خدا کو ہم نے بنایا نہیں صنم

ضرور صبح تلک بارشیں ہوئی ہوں گی
اداس آنکھ کا آنگن دھلا دھلا سا ہے

وہ بے زبان تکلم وہ بے صدا ترسیل
خموش رہ کے بھی سب کچھ کہا کہا سا ہے

وہ غمگسار بالآخر بلائے جاں نکلا
جسے زمین سمجھتے تھے آسمان نکلا

سراغِ قتل، شہادت، ثبوت سب گم تھے
لہو خموش تھا، خنجر بھی بے زباں نکلا

ایک شعر میں پرانے موضوع کو کس سلیقے سے نیا رنگ دیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے ؎

یہ کشش ہے حُسن کی، یا سحرِ احسن بیان
غیر بھی کرنے لگے ہیں ذکرِ جاناں دیکھئے

اس میں شک نہیں کہ منظر شہاب کے اشعار میں تاثیر ہے جس کو وہ خود بھی محسوس کرتے ہیں، فرماتے ہیں ؎

تیرے اشعار میں اچھوتا تغزل ہے شہاب
رنگِ افکار کو تو خونِ جگر دیتا ہے

الفاظ کی نشست و برخاست بھی ان کے یہاں خوب ہے ملاحظہ ہوں ۔

یہ تشنہ لبی، یہ سوزِ جگر، یہ خندہ زنی، یہ دیدۂ تر
ساقی کی عنایت کے صدقے کیا کچھ نہ ملا مستانے کو

عجب کشمکشِ ذہن و دل رہی یارب
اسے صنم نہ ملا، اور اسے خدا نہ ملا

فسادات سے متاثر ہو کر ایک نظم، ہم نہ بھولیں گے، بہت خوب ہے۔ اس کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیے ۔

خود اپنے شہر میں مدفون مجبوروں کی فریادیں
تغافل ہائے اہلِ اختیاراں ہم نہ بھولیں گے

ایک تہنیتی نظم میں مظہر امام کو مبارکباد دیتے ہوئے جو عہد کیا ہے وہ بہت خوب ہے۔ کہتے ہیں ۔

ہو مبارک تجھے مظہر یہ نیا ذوقِ سفر
ہمسفر تیری ہوئی شاہدِ خیبر پیکر
حوصلے راہِ محبت میں لٹاتے ہیں تجھے
اک ذرا ضبط، چھلک جائے نہ دل کا ساغر
مضطرب عشق ہے محبوب سے ملنے کے لئے
غنچہ بے تاب ہے طوفان میں کھلنے کے لئے

اس میں شک نہیں کہ شعر کہنے کا سلیقہ منظر شہاب کے یہاں خوب ہے اور بڑے ہی سلیقے سے کوئی بات کہہ جاتے ہیں۔ جیسے یہ شعر ۔

رکا جو دل کا مسافر تو ہر قدم پہ اسے
جمالِ یار کے تیور پکارنے کو ملے

[illegible] حقیقتوں میں غریب کا کیا عالم ہے اسے بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

فریب کار سہی، دل کا غمگسار تو تھا
وہ اک خیال جو برسوں رہا گمان کی طرح

منظر شہاب نے آزاد قطعات کے بھی تجربے کئے ہیں۔ ایک قطعہ ملاحظہ فرمائیے ۔

جاگتے روپ کے کندن کے تلے رات ڈھلے
جگمگا اٹھتے ہیں زرّیں لمحے
سر بھرے ہونٹ سے گرتے ہوئے گھنگھرو کی صدا
تتلیاں نیند کی اڑ جاتی ہیں، جل جاتے ہیں سپنوں کے دیے

یہ ایک اچھا تجربہ ہے اور اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ منظر تبدیلی کے خواہاں ہیں۔ ان کے لہجے کا دھیما پن ہی ان کے اشعار کا حسن ہے۔ جیسے یہ شعر ۔

اٹھی نگاہ تو جلووں نے کی قدم بوسی
بڑھے جو ہاتھ تو گیسو سنوارنے کو ملے

ان کے یہاں انداز کی شوخی بھی ہے اور عصری آگہی بھی۔ یہ شعر دیکھئے ۔

بے تکلف نہ بنیں ورنہ مصیبت ہوگی
آپ کی شوخیٔ ناداں سے جی ڈرتا ہے

میں سمجھتا ہوں کہ اگر منظر شہاب کے ادبی نظریات سے ہٹ کر منظر شہاب کو دیکھا جائے تو وہ زیادہ بڑے شاعر نظر آتے ہیں اور ان کے احساسات اور تجربے محض فکری حدود و قیود اور نظریے کے محتاج نہیں بلکہ یہ انہوں تک ہمیں لے جاتے جہاں نظریے ٹوٹتے اور بکھرتے ہوئے نظر آتے ہیں جیسے یہ خود شیشے کی کار [illegible] بہر حال مجھے کہنے دیجئے کہ منظر شہاب کا فکری [illegible] خواہ کسی نظریے سے وابستہ ہو لیکن ان کا شعور [illegible] اور نظریات کی قیود [illegible]

جوہر عبداللہ

کلیم احمد عاجز کی شاعری

کلیم احمد عاجز کی آواز شعر و سخن کی دنیا میں ایک منفرد اور توانا آواز ہے۔ ان کا مخصوص لب و لہجہ غزل میں ایک نئی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ انقلابات کے بلند بانگ نعرے اور پیچیدہ استعارات سے ان کا کلام مبرا ہے یہاں ایک مخصوص قسم کی غنائیت ملتی ہے جو اول تا آخر رچی بسی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں بے حد دلکشی، لبھاؤ اور اپیل کی خاصیت ہے۔ لفظی تک بندیوں سے گریز کرتے ہوئے جذبہ و احساس کی گرمیاں اشعار میں ایک ساحرانہ کیفیت (MAGICAL QUALITY) پیدا کر دیتی ہے۔

دیکھا جائے تو جدید شاعری اب ان بندھے ٹکے اصولوں اور روایات کی اسیر نہیں۔ بلکہ نئے تخیل و تجربات کی آماجگاہ ہے۔ ظاہراً غزل کی وہی ساخت ہے جو ابتداء سے اس کا حصہ تھی، لیکن داخلی طور سے موضوع، اظہار اور بیان میں بے حد تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ سیاسی، [illegible] و معاشی پیچیدگیوں کی وجہ سے آج غزل انسانی [illegible] و احساسات کی ترجمان ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جدید شعراء کے یہاں ایک لمبا فاصلہ ملتا ہے عاجز اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ ان کے یہاں نہ تو قدیم روایتوں کی جلوہ سامانیاں ہیں اور نہ ہی جدید اصولوں کی سختیاں، بلکہ ان کے درمیان ایک اعتدال کی کیفیت نظر آتی ہے۔ روایتوں سے نہ تو مکمل طور پر انحراف ہے اور نہ ہی اس کے ساتھ مل کر رہنے کی عادت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شناسا الفاظ اور جانی پہچانی تراکیب کے باوجود بھی آج ان کے کلام کی الگ پہچان ہے۔ یہ پہچان ہے ان کے لب و لہجہ کی اور استعارات و تشبیہات کی جو دلوں کو چھو لیتی ہے اور قاری پر شدید تاثر چھوڑتی ہے۔ اس کا اعتراف خود عاجز بھی کرتے ہیں ؎

دل میں نہ ہو گداز تو بولی میں کچھ نہیں
لفظوں کے ساتھ آنکھ مچولی میں کچھ نہیں

عاجز کے استعارات و تشبیہات میں ذاتی احساسات (Personal feelings) کا اظہار ملتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے یہاں "دیواری" کا ایک خاص تصور ملتا ہے جو عام ہوتے ہوئے بھی ان کی ذاتی

تجربات و مشاہدات کا آئینہ دار ہے۔ عاجز کی دیوانگی وہ دیوانگی ہے جسے مصلحت کوشی، دنیاداری، فریب اور چاپلوسی سے غرض نہیں بلکہ اس کی ساری پونجی اس کا غم ہے جو کہ بحر بیکراں کی طرح ان کے دل میں موجزن رہتا ہے۔ انہوں نے خود ہی کہا ہے ؎

ہم تو دیوانے ہیں ہم کو مصلحت سے کیا غرض
اپنی چادر سے بھی باہر پاؤں پھیلائیں گے ہم

یہ دیوانگی ان کے یہاں بے نیازی کی صفت پیدا کرتی ہے۔ یہ جنونی کیفیت نہیں ہے۔ بلکہ اس میں وہ طاقت ہے کہ زمانے کو اپنے دائرے میں مقید کر لیتی ہے۔ عقل اور دیوانگی کا کتنا اچھا ربط ہے ؎

عقل کے پیچھے زمانہ ٹھوکریں کھاتا ہوا
یوں چلا جائے ہے جیسے کوئی دیوانہ چلے

عاجز کی دیوانگی مرض نہیں بلکہ متعدد سماجی امراض کا علاج ہے اور یہ ایسی روحانی طاقت ہے کہ سارے زمانے کا زمام کار اپنے ہاتھوں میں لے کر حوادثات زمانہ پر قابو بھی پا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر ؎

دیوانے شہر دار و رسن کو نکل گئے
اب آہوان دشت کی ٹولی میں کچھ نہیں

ان کی دیوانگی خودی سے بھرپور ہوتی ہے۔ اس میں جذب مستی ہوتی ہے۔ اور یہ مشکل مرحلوں میں خود ہی اپنا راستہ نکال لیتی ہے ؎

اگر چاہے گا جی اپنا تو خود آزاد ہو لیں گے
یہ اہل ہوش کیا دیوانوں کی زنجیر کھولیں گے

دیوانہ پن ایک ایسی کیفیت ہے جو شخص کو احساس و ادراک کے بے حساب خزانے عطا کرتی ہے۔ وہ اپنے فکر و شعور کا علم [illegible] سرگرم سفر رہتا ہے۔ عقل اس دیوانگی کے سامنے تہی دست عاجز و لاچار نظر آتی ہے۔

جدا دیوانہ پن اب ایسے دیوانے سے کیا ہوگا
مجھے کیوں لوگ سمجھاتے ہیں سمجھانے سے کیا ہوگا

عاجز کی دیوانگی میں انفرادیت کے ساتھ وہ انہونا پسندانہ رویہ بھی ہے جو آدمی کو انانیت پسند (Egoist) بنا دیتا ہے۔ اور یہی انفرادیت ان کے اشعار میں زیریں سطح پر کام کرتی رہتی ہے۔

اس کے علاوہ عاجز کے یہاں زنجیر، جنون، محبت، زلف اور غم ایسے لغات شعری (Poetic Dictions) استعمال ہوتے ہیں جو ایک دوسرے سے مربوط اور آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ ان الفاظ کے انتخاب کے پس منظر ان کی نجی احساس محرومی ہے جو معاشرے کی دین ہے اسی نے ان کی زندگی اور شاعری میں سوز و گداز پیدا کیا ہے۔

عاجز کی شاعری چند حادثات کا مجموعہ ہے جو ان کے دلوں میں زبردست طریقے سے سرایت کر گئی ہے۔ وہ حادثہ جو انسانیت کی ہار تھا۔ اور جہاں اہل خرد و ہوش کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔ ان کی والدہ ماجدہ اور خاندان کے لوگ فساد میں شہید ہو گئے تو عاجز کے لہولہان جذبات شعری پیرائے میں ڈھل گئے۔ اور اس طرح ان کی غزل کا خمیر تیار ہوا۔ ان کی غزل کی آواز وہی ہے جو ان کے دل کی آواز ہے۔ یہ ان کسک اور گہری چوٹیں جب آنکھ کی راہ اختیار کرتی ہیں تو گریہ کہلاتی ہیں۔ جب زبان سے ظاہر ہوتی ہیں تو نالہ یا مرثیہ کہلاتی ہیں لیکن شاعر قلم کا سہارا لیتی ہیں تو تغزل کہلاتی ہیں۔ عاجز کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے اور یہ اشعار انہیں حقائق کے عکاس ہیں ؎

آرام سے چھپ جاتے ہے پردے میں غزل کے
وہ آگ جو سینے میں چھپائے نہ بنے ہے

اور

غزل کا وہی ساز اٹھائے ہوئے ہیں
کلیجے پہ جو چوٹ کھائے ہوئے ہیں

یا

تم کبھی نہیں سمجھو تو بڑا ظلم ہے پیارے
ہر شعر میں دل کا کوئی پیغام رہے ہے

ن کا غم صرف ان کا غم ہی نہیں رہتا ہے وہ قاری کو بھی نے درد میں شریک کر لیتے ہیں۔ عاجز کا غم ان کا اپنا تجربہ ہے سروں کی طرح محض اوڑھا ہوا احساس نہیں۔ انہوں اپنے غم کے ساتھ ایک عمر بسر کی ہے۔ وہ اپنے غم کے تدلیس کے قائل ہیں۔ شکایتیں کرکے یا رونا رو کر وہ اپنے کا اشتہار کرکے اسے رسوا کرنا پسند نہیں کرتے۔

ترے غم میں تماشہ بن گئے ہیں
جو دیکھے ہے ہمیں دیکھا کرے ہے

پایا ہوا غم کبھی ویسا ہی زود اثر ہوتا ہے جیسی کہ ن کی ہوئی شراب۔ عاجز کے غم میں نشتریت کی وجہ یہی کہ وہ اپنا غم کسی سے بیان نہیں کرتے۔

ٹینہ فساد میں عاجز کے گھر کے بیشتر افراد شہید ئے اس کی یاد عاجز کے لاشعور میں ہمہ وقت مضطرب ہے اور شعور یا تحت شعور کی معمولی سی تحریک پ مت پر شعری پیکر میں ڈھل جاتی ہے۔ عاجز کے اشعر میں خاص طور سے اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے

یوں ہی ہر سال غم تازہ کرے ہے
بہار آتی ہے جب آیا کرے ہے

بلکہ ان کی قلبی کیفیت کا بھی آئینہ دار ہے۔

اب کے پھر برسات میں گنج شہیداں پر چلیں
آسماں روئے گا اور اپنی غزل گائیں گے ہم

عاجز کو خود اس بات کا احساس ہے کہ ان کی غزلوں میں جو تاثیر اور کشش ہے وہ ان کی قلبی کیفیات کی وجہ سے ہے۔ ان کی روح کا زخم اور ان کے دل کا درد قارئین کے دل میں دردمندی بھی پیدا کرتا ہے اور دردمندانہ صداقتوں کا احترام بھی پیدا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر عاجز کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

سخن عاجز کا کیوں پیارا لگے ہے
یہ کوئی درد کا مارا لگے ہے
کھلائے ہیں وہ گل زخموں نے ان کے
حسیں جن سے چمن سارا لگے ہے
لگے ہے پھول سننے میں ہر اک شعر
سمجھ لینے پہ انگارہ لگے ہے
یہ ہے ٹوٹا ہوا اس سنگ دل کا
جو دیکھے میں بہت پیارا لگے ہے

عاجز غموں کی پرورش کرتے ہیں۔ یہ ان کا سرمایہ ہے اور زاد سفر بھی، فکر و شعور کے قافلوں کا رہنما بھی اور خلوت و جلوت کا ساتھی بھی۔ دل کے درد کا درماں بھی اور وقت و حالات کی شدتوں میں دلجوئی کرنے والا بھی

ہم اسی گلی کی ہیں خاک سے یہیں خاک اپنی ملائیں گے
نہ بلائے آپ کے آئے ہیں نہ نکالے آپ کے جائیں گے

ایک اور جگہ اس طرح کہتے ہیں:

ایک درد ہے جو شام سے اٹھے ہے سحر تک
ایک سوز ہے جو صبح سے تا شام رہے ہے

بلکہ اس میں ان حادثات کا بھی بیان ملتا ہے جو انسانی معاشرہ میں آئے دن واقع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی شاعری میں انسانی زندگی کے مسائل کا گہرا شعور بھی ملتا ہے۔ ابولہان انسانیت کی تصویر کشی سے متعلق عاجز کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے۔

یہ کیا ہوا کہ سلامت نہیں کوئی دامن
چمن میں پھول کھلے ہیں کہ خار دیکھو تو

ظلم و ستم کی تصویر کشی اس طرح کی ہے

لہو دلوں کا چراغوں میں کل بھی جلتا تھا
اور آج بھی ہے وہی کاروبار دیکھو تو

غریبوں اور بیکسوں کے لئے دنیا کی کیا حقیقت ہے اس کا کیا ہی خوبصورت بیان ہے۔

دنیا میں غریبوں کے دو کام ہی آتے ہیں
جینے کے لئے مرنا، مرنے کے لئے جینا

اردو شاعری میں اس موضوع خاص پر اس سے بہتر شعر کم از کم راقم الحروف کی نظر سے نہیں گزرا ہے۔ یہ اشعار دراصل معاشرتی حقائق کی واضح تصویر کشی کرتے ہیں۔ عاجز زندگی اور اس کی حقائق کے رمز شناس اور انسان اور اس کے بنیادی حقوق کی پامالی کے نشانہ رکھتے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ عاجز معاشرہ کی طبقاتی کشمکش پر بھی نگاہ رکھتے ہیں۔

عاجز کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو ایک بات ضرور واضح ہوتی ہے کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ میر کی تقلید کرتے ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں ؎

اس قدر سوز کہاں اور کسی ساز میں ہے
کون یہ نغمہ سرا میر کے انداز میں ہے

حالانکہ عاجز اپنی تحریروں میں اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ وہ میر کے مقلد ہیں۔ لیکن ان کی غزلوں کی تراکیب ان کے لہجے میں وہی رچاؤ ہے جو میر کے یہاں ملتے ہیں۔ ان کا غم بھی میر کے غم کی طرح جلاتا ہے اور پڑھنے والوں کو بھی جلاتا رہتا ہے۔ ان کے دیوان میں ایسے بہت سے اشعار موجود ہیں جس پر میر کا رنگ نمایاں ہے۔ مثال کے طور پر اشعار ؎

غم کی آگ بڑی البیلی کیسے کوئی سمجھائے
اندر بڑی بڑی شعلے باہر نظر نہ آئے
ایک سویرا ایسا آیا اپنے ہوئے پرائے
اس کے آگے کیا پوچھو ہو آگے کہا نہ جائے

اسی طرح دوسری جگہ ہے ؎

زخم دل کا وہ نظارا ہے کہ جی جانے ہے
اتنا احسان تمہارا ہے کہ جی جانے ہے
یہ حسین دور جیسے موسم گل کہتے ہیں
اتنا رو رو کے گذارا ہے کہ جی جانے ہے

یا

جلائیں ہیں اتنے چراغ آنسوؤں کے
ترے بام و در جگمگائے ہوئے ہیں
کسی دن تو ہاتھ آئے گا ان کا دامن
جو دیوانہ ہم کو بنائے ہوئے ہیں

ان اشعار کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ یہاں میر کا لب و لہجہ نہیں ہے۔ لیکن وہ خود اپنے متعلق کہتے ہیں ؎

یہ طرز خاص ہے کوئی کہاں سے لائے گا جو ہم کہیں ہیں کسی سے کہا نہ جا

یقیناً یہ طرز خاص ہی ہے جو غزل کی دنیا میں ابھرتا جا رہا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ میر کی روایتوں کو انہوں نے [illegible] خود ان کی اپنی پہچان بن گئی ہے۔ [illegible] قدر محسوس کرتے ہیں کہ [illegible]

محمد خالد عابدی

ساگر سرحدی سے ایک انٹرویو

محمد خالد عابدی :- ساگر صاحب! آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

ساگر سرحدی :- سرحد کے ہزارہ ضلع "بفہ" نام کے گاؤں میں تقریباً پچاس باون برس پہلے پیدا ہوا۔ پیدائش کے کاغذات تقسیم کی نذر ہو گئے۔

محمد خالد عابدی :- ساگر صاحب، آپ کا اصلی نام کیا ہے اور ساگر سرحدی کیا آپ کا قلمی نام ہے؟

ساگر سرحدی :- اصلی نام گنگا ساگر ہے اور ساگر سرحدی قلمی نام ہے۔

محمد خالد عابدی :- ساگر صاحب، آپ کے والد صاحب کا اسم گرامی اور ان کا کاروبار کیا تھا اور آپ نے اپنے آبائی پیشے کو کیوں نہیں اپنایا؟

ساگر سرحدی :- نام [illegible] تلوار ہے۔ ان کا کاروبار تقسیم سے پہلے [illegible] اور شراب کے ٹھیکیدار تھے [illegible] بیٹھ کر شراب بیچتا تھا۔

محمد خالد عابدی :- ساگر سرحدی نام آپ نے خود تجویز کیا تھا [illegible]

ساگر سرحدی :- میں نے خود ہی تجویز کیا تھا۔ "سرحدی" سرحد کا باشندہ ہونے کی مناسبت سے لکھتا ہوں۔

محمد خالد عابدی :- میں اب یہ جاننا چاہوں گا کہ آپ کا پہلا ادبی رہنما کون ہے؟

ساگر سرحدی :- میرا ادبی رہنما کتابیں ہیں۔

محمد خالد عابدی :- آپ کی پہلی تخلیق کس زبان اور کس صنف میں تھی؟

ساگر سرحدی :- اردو زبان میں، بمبئی میں ایک اردو پرچہ "اُجالا" میں افسانہ چھپا تھا۔ افسانے کا نام یاد نہیں۔

محمد خالد عابدی :- ساگر صاحب! کیا یہ ادبی ذوق آپ کو ورثے میں ملا ہے؟

ساگر سرحدی :- ورثہ اس طرح کہ بڑا بھائی [illegible] اسٹیج کا ایک اچھا ایکٹر تھا۔

محمد خالد عابدی :- جب آپ کی پہلی تخلیق شائع ہو کر سامنے آئی اس وقت آپ کے اور آپ کے احباب شناسا وغیرہ کے کیا تاثرات تھے؟

ساگر سرحدی :- [illegible]

محمد خالد عابدی:۔ لکھتے وقت آپ کو بالعموم کس طرح کا ماحول درکار ہوتا ہے؟

ساگر سرحدی:۔ سکون اور خاموشی

محمد خالد عابدی:۔ کیا آپ اپنی کسی تخلیق کی "شانِ نزول" کے بارے میں بتانا پسند فرمائیں گے۔

ساگر سرحدی:۔ کوئی واقعہ یا کردار جب ذہن پر چھا جاتا ہے اور جانے کا نام نہ لے تو اپنے ساتھ اپنا فارم لے کر صفحے پر آ جاتا ہے۔

محمد خالد عابدی:۔ آپ نے پہلا ڈرامہ کب لکھا اور وہ کہاں شائع ہوا؟

ساگر سرحدی:۔ پہلا ڈرامہ "میرے دیش کے گاؤں" چھپوایا نہیں کیونکہ ڈراما اچھا نہیں تھا۔ اور اردو میں ڈرامے چھاپتا ہی کوئی نہیں ہے۔ "اجنبی" جو بعد میں لکھا گیا، "قند" کے ڈراما نمبر میں شائع ہوا تھا۔

محمد خالد عابدی:۔ ایک کامیاب ڈراما نگار میں کن صلاحیتوں کا ہونا ضروری ہے؟

ساگر سرحدی:۔ جو ایک کامیاب شاعر یا ایکٹر کے لئے ضروری ہے۔

محمد خالد عابدی:۔ ڈرامے میں کرداروں کی تخلیق کس طرح ہونا چاہیے؟

ساگر سرحدی:۔ ڈرامے کے تقاضے کے مطابق۔

محمد خالد عابدی:۔ ڈراما نگار کس چیز کا مرہونِ منت ہوتا ہے؟

ساگر سرحدی:۔ زندگی، پلاٹ، کردار، اسٹیج کی ضروریات اور کڑی محنت۔

محمد خالد عابدی:۔ اردو میں ڈرامے بہت کم لکھے گئے ہیں اس کی کیا خواص وجوہ ہو سکتی ہیں؟

ساگر سرحدی:۔ ڈراما اسٹیج کے لئے لکھا جاتا ہے اور اسٹیج نہ ہو تو ڈراما پڑھنے کی چیز بن کر زندہ نہیں رہ سکتا۔

محمد خالد عابدی:۔ آپ اردو ڈرامے میں کن نئی کوششوں اور تجربوں کے خواہش مند ہیں؟

ساگر سرحدی:۔ ہر وہ تجربہ جو زندگی کا بھرپور اظہار کر سکے اور ہر وہ فارم جو ذہن کو چونکا دے میرے نزدیک اہمیت رکھتا ہے

محمد خالد عابدی:۔ بنگالی، مرہٹی اور ہندی ڈرامے کے سامنے اردو ڈرامے کی کیا اہمیت و حیثیت ہے؟

ساگر سرحدی:۔ وہی جو ایک جوان کے سامنے بچے کی ہوتی ہے۔

محمد خالد عابدی:۔ ساگر صاحب! ایکٹ اور سین میں کیا بنیادی فرق ہوتا ہے۔ اگر آپ اس فرق کو کسی مقبول اردو ڈرامے کی روشنی میں سمجھا سکیں تو مناسب ہوگا۔

ساگر سرحدی:۔ ایک ایکٹ میں کئی سین ہو سکتے ہیں، افسانے میں جیسے ایک پیراگراف اہمیت رکھتا ہے اسی طرح ڈرامے میں سین، ایکٹ کا لازمی جزو ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے مثال دینے کی ضرورت نہیں۔

محمد خالد عابدی:۔ ڈرامے اور فلم کے مکالموں میں کیا بنیادی فرق ہوتا ہے؟

ساگر سرحدی:۔ فلم کے میڈیم میں کیمرہ شامل رہتا ہے۔ اور اچھی فلم وہی سمجھی جاتی ہے جس میں مکالمے کم سے کم ہوں۔ جب کہ ڈرامے میں صرف مکالموں کا سہارا لیا جاتا ہے۔

محمد خالد عابدی:۔ آپ کے کن کن ڈراموں کو اسٹیج کیا جا چکا ہے؟

ساگر سرحدی:۔ "بھوکے بھجن نہ ہوئے گوپالا" "میرے

دلیش کے گاؤں" "مرزا صاحباں" "تنہائی"
"دوسرا آدمی" "خیال کی دستک" "احساس کی چبھن"
"سپنوں کی تاریک گلی میں" "کسی سیما کی ایک
معمولی سی گھٹنا" اس کے علاوہ بھی ڈرامے ہیں جو
میں نے لکھے وہ اسٹیج ہوئے۔

محمد خالد عابدی :- کیا آپ اردو کے موجودہ ڈراموں سے
مطمئن ہیں؟

ساگر سرحدی :- اردو میں ڈراموں کی اتنی قلت ہے کہ یہ سوال
جواب طلب نہیں رہتا۔

محمد خالد عابدی :- اسٹیج ڈرامے کے مقابلے میں آج "ریڈیو
ڈراما" بہت زیادہ کامیاب اور مقبول ہے۔ کیا
یہ دعویٰ درست ہے؟

ساگر سرحدی :- اردو ڈرامے اسٹیج تک کم پہنچتے ہیں اور
ریڈیائی ڈرامے کسی دور میں مقبول تھے لیکن آج
فلمی کہانیاں ان کی جگہ لے چکی ہیں۔

محمد خالد عابدی :- کیا یہ خیال درست ہے کہ اسٹیج ڈرامے
کی ترقی یافتہ شکل "فلم" ہے؟

ساگر سرحدی :- دونوں میڈیم مختلف ہیں۔

محمد خالد عابدی :- فلم سے اسٹیج ڈرامے کی تقریباً موت
ہو گئی ہے اس میں کہاں تک صداقت ہے؟

ساگر سرحدی :- بالکل غلط

محمد خالد عابدی :- کیا وجہ ہے کہ امتیاز علی تاج کا "ڈراما"
"انارکلی" اسٹیج نہیں کیا جا سکا؟

ساگر سرحدی :- اسٹیج کی ضروریات کو مدنظر نہیں رکھا گیا
تھا اس لئے صرف پڑھنے کی چیز بن کر رہ گئی۔

محمد خالد عابدی :- کیا اسٹیج ڈرامے کے ارتقاء میں ٹیلی ویژن
معاون ثابت ہو سکتا ہے؟

ساگر سرحدی :- ہو سکتا ہے، ویسے براڈوے ڈراموں پر
فلمیں بنائی گئیں جو ہٹ ثابت ہوئیں۔

محمد عابد خالدی :- ساگر صاحب! خود کے لکھے ڈراموں میں
آپ کا بہت زیادہ پسندیدہ ڈراما کون سا ہے
اور کیوں؟

ساگر سرحدی :- "دوسرا آدمی" - کیوں کا جواب میرے
پاس نہیں ہے

محمد خالد عابدی :- ساگر صاحب کیا آپ اپنے اس پسندیدہ
ڈرامے کو یا کسی اور ڈرامے کو مستقبل قریب میں
"فلمانے" کا خیال رکھتے ہیں؟

ساگر سرحدی :- جی ہاں

محمد خالد عابدی :- اردو ڈرامے کا مستقبل؟

ساگر سرحدی :- جو اردو زبان کا مستقبل ہے۔

محمد خالد عابدی :- اور جناب! ہندوستان میں اردو اسٹیج ڈرامے
کا مستقبل کیا ہے؟

ساگر سرحدی :- ڈراما اسٹیج سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

محمد خالد عابدی :- آپ ادب سے فلموں میں کس طرح داخل
ہوئے؟

ساگر سرحدی :- روزگار کے لئے

محمد خالد عابدی :- بحیثیت کہانی نویس آپ کی پہلی فلم؟

ساگر سرحدی :- کوئی نہیں

محمد خالد عابدی :- اور بحیثیت مکالمہ نویس کے آپکی پہلی فلم؟

ساگر سرحدی :- "انوبھو"

محمد خالد عابدی :- "گفتگو" اور "مکالمہ" میں کیا بنیادی فرق
ہے۔

ساگر سرحدی :- گفتگو کا سر پیر نہیں ہوتا اور مکالمہ سوچ سمجھ کر
لکھا جاتا ہے۔

محمد خالد عابدی:۔ مکالمے کی جامع اور مستند تعریف کیا ہو سکتی ہے؟

ساگر سرحدی:۔ جو پلاٹ کو آگے بڑھائے اور کردار کو واضح کرے۔

محمد خالد عابدی:۔ مکالمے لکھتے وقت کن باتوں اور ضرورتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے؟

ساگر سرحدی:۔ سادگی اور پرکاری۔

محمد خالد عابدی:۔ "مکالمہ ہم کلامی" لکھنا زیادہ دشوار ہوتا ہے یا "مکالمہ خودی" ( ) ؟

ساگر سرحدی:۔ ڈراما لکھنا خود دشوار ہے

محمد خالد عابدی:۔ کیا فلموں میں "ASIDE" مکالموں کی ضرورت کبھی پیش آتی ہے؟

ساگر سرحدی:۔ یہ فارم پر منحصر ہے۔

محمد خالد عابدی:۔ فلموں میں اور کس طرح کے مکالمے رائج ہیں۔ اور ان کی کیا اصطلاحیں ہیں؟

ساگر سرحدی:۔ لفاظی، فقرے بازی، سستی جذبات نگاری

محمد خالد عابدی:۔ "مکالموں پر زور دینے سے" ایکشن" کا زور از خود ختم ہو جاتا ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟

ساگر سرحدی:۔ فلموں کی حد تک یہ صحیح ہے۔

محمد خالد عابدی:۔ کیا آپ لکھتے وقت فلم ایکٹر کی شخصیت اور اس کی نفسیات وغیرہ پر خاطر نظر رکھتے ہیں؟

ساگر سرحدی:۔ یقیناً، کیونکہ اس کے بغیر اچھے مکالمے لکھے ہی نہیں جا سکتے۔

محمد خالد عابدی:۔ کیا "مکالمہ" "منظر نامہ" سے الگ ایک آزاد فن ہے یا منظر نامہ کا ایک حصہ اور متبادل؟

ساگر سرحدی:۔ ایک حصہ

محمد خالد عابدی:۔ کیا "مکالمہ" منظر نامے سے نکالا جاتا ہے

ساگر سرحدی:۔ منظر نامے ہی سے نکلتے ہیں۔ نکالا نہیں جاتا

محمد خالد عابدی:۔ آپ کے نزدیک "منظر نامہ" کی تعریف کیا ہے؟

ساگر سرحدی:۔ کہانی کو VISUAL کی شکل میں ٹکڑوں میں بانٹنا "منظر نامہ" ہے۔

محمد خالد عابدی:۔ کیا یہ ضروری ہے کہ جو مکالمے لکھے وہ منظر نامہ بھی لکھے؟

ساگر سرحدی:۔ کوئی ضروری نہیں۔

محمد خالد عابدی:۔ "کہانی" اور "منظر نامہ" میں "مکالمے" کا کیا رول ہوتا ہے؟

ساگر سرحدی:۔ وہی جو جسم میں خون کا۔

محمد خالد عابدی:۔ فرض کیجئے کہ ایک فلم بنگالی یا ملیالم زبان میں مقبول ہوتی ہے۔ وہی فلم جب ہندی یا اردو میں بنائی جاتی ہے تو اس وقت اس کے مکالموں کا ترجمہ کیا جائے گا یا از سر نو لکھے جائیں گے۔

ساگر سرحدی:۔ اچھے مکالموں کا استعمال کیا جائے گا۔

محمد خالد عابدی:۔ ADDITIONAL DIALOGUE WRITER ۔ کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے؟

ساگر سرحدی:۔ اگر مکالمہ لکھنے والا کسی وجہ سے فلم چھوڑ جائے۔ تب ضرورت پیش آتی ہے

محمد خالد عابدی:۔ فلموں میں ڈائیلاگ ڈائریکٹر کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے اور اس کی کیا ذمہ داریاں ہوتی ہیں؟

ساگر سرحدی:۔ اگر ڈائریکٹر ہندوستانی زبان سے واقف نہیں ہے تو تلفظ اور لہجے کی درست ادائیگی کے لئے ڈائیلاگ ڈائریکٹر کو رکھا جاتا ہے۔

محمد خالد عابدی:۔ کیا یہ ذمہ داری مکالمہ نویس یا ڈائیلاگ ڈائریکٹر کی ہے کہ وہ اداکار کا لہجہ، تلفظ اور

ادائیگی کو سنبھالے اور سنوارے ؟

ساگر سرحدی :- نہیں

محمد خالد عابدی :- بحیثیت مکالمہ نگار کے، آپ کے ذاتی تجربات کیا ہیں ؟

ساگر سرحدی :- زیادہ خوشگوار نہیں

محمد خالد عابدی :- آپ کے پسندیدہ مکالمہ نویس کون ہیں اور پسند کی وجہ ؟

ساگر سرحدی :- اس بارے میں، میں کبھی سوچتا ہی نہیں۔

محمد خالد عابدی :- منظرنامہ (Screen Play) کس طرح تیار کیا جاتا ہے ؟

ساگر سرحدی :- پلاٹ کو سامنے رکھ کر۔

محمد خالد عابدی :- آپ کن اسکرین پلے رائٹرس سے متاثر ہیں اور کیوں ؟

ساگر سرحدی :- میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو سنوارنے نکھارنے میں مصروف رہتا ہوں۔

محمد خالد عابدی :- فلم میں مصروف رہنے کے ساتھ ساتھ کیا آپ ڈرامے میں بھی دلچسپی لیتے رہیں گے ؟

ساگر سرحدی :- لیتا رہوں گا۔

محمد خالد عابدی :- آپ کی کچھ فلمیں :-

ساگر سرحدی :- دوسرا آدمی، انکار، کرم یوگی، شہری بابو، بالو لوگ، نندانہ اور لوری۔

محمد خالد عابدی :- اردو زبان کے بغیر فلم کی مقبولیت مشکوک ہے۔ کیا یہ دعویٰ درست ہے۔

ساگر سرحدی :- فلموں کے لئے "اردو" لفظ کا استعمال کرنا درست نہیں۔

ڈاکٹر اختر بستوی

○ دوڑتی دنیا اور میں

دیکھتا ہوں، چشمِ حیرت سے میں اپنے سامنے
برق رفتاری سے ہر ہر چیز کو جاتے ہوئے
دور تک کی دوڑتی دنیا کا نقشہ دیکھ کر
خوف آتا ہے مجھے پلکیں بھی جھپکاتے ہوئے
جانے کیوں ایسے میں، ہوتا ہے کبھی یہ بھی گماں
میں کسی چلتی ہوئی گاڑی میں ہوں بیٹھا ہوا
خود مجھے تیزی سے دوڑائے لئے جاتی ہے وہ
ورنہ موجودات کا منظر تو ہے ٹھہرا ہوا

●

○ مشاہدہ

دیوار میں روزن تو ہوا کرتے ہیں لیکن
دل میں نہیں ہوتا کوئی اس دور میں روزن
پڑتی ہے نظر سب کی تماشوں پہ جہاں کے
رہتا ہے نگاہوں سے چھپا سینے کا درپن
دیتی ہے ہر اک چیز زمانے کی دکھائی
ہوتا نہیں خود اپنا ہی دیدار میسّر
باہر کے مناظر میں ہیں الجھی ہوئی نظریں
آنکھوں سے ہیں اوجھل وہ نظارے جو ہیں اندر

●

خالد عبادی

○ خود کار سوال کی نوک پر

اک دن خود سے پوچھوں گا میں
کیا لگتا ہوں اس بچے کا
جو اپنی بھوری آنکھوں سے
دیر تلک تکتا ہے مجھ کو
پھر — جیسے اکتا جاتا ہے
لیکن اس کی پیاری ممی !
بور نہیں ہوتی ہے مجھ سے
اک دن خود سے پوچھوں گا میں

وہ ننھا منا سا بچہ
آخر کیا لگتا ہے میرا ؟

●

○ راستے اداس ہیں

اداس، ہیں یہ راستے
تو کس لئے اداس ہیں
نہ جانتا ہوں میں نہ تم
کہ — دونوں ہی ہیں بے خبر

سفر میں رہ کے بے سفر
غبارِ راہ میں ہی گم !

یہ راستے اداس ہیں
تو اس لئے اداس ہیں

●

علی عباس ازل

رات کوئی شبدوں سے اپنے باندھ گیا تھا ایسا سماں
صبح جاگی سورج نکلا پھر بھی دن تھا دھواں دھواں
دکھ ساگر بھی میں نے متھا اور زہر بھی سارا میں نے پیا
فیوانے تو بوندیں پی تھی وہ بھی حلق سے اتری کہاں
سر پر بوجھ تو گاہک کا ہے اس کے گھر پہونچا دوں گا
لو تعجل دل ہے میرا اپنا اس کو میں پھینک آؤں کہاں
آج سنا ہے پھر اک سیتا اگنی پریکشا دے کے جلی
اسکوٹر، ٹی وی جو لاتی تو عصمت بھی ہوتی عیاں
میں احسان نہ مانو تو بھی درد و غم ہیں اس کے گواہ
تم نے جو بھی مجھ کو دیا ہے اس سے کم ہیں دونوں جہاں
آ تو گئی ہے دروازے تک رنگ سجائے تھالی میں
اب دیکھیں رنگولی کھینچے یا ڈالے منزل کے نشاں
چپ سادھے جب تیر و غالب بیٹھے ہیں تو اے سعدی بھی
گونگا وہ بھی ازل کا جیسا کیسے کہے گا درد نہاں

اختر شاہجہاں پوری

نہ ہو منتشر تو جلوہ گر نہ ہونا
بساطِ دید سے باہر نہ ہونا
اگر نقشِ کفِ پا دے نہ پاؤ
کسی کی راہ کا پتھر نہ ہونا
سکوتِ مرگ ہے بستی پہ طاری
تعجب ہے ترا مضطر نہ ہونا
بشارت فتح کی ہے اہلِ لشکر
مرے شانے پہ میرا سر نہ ہونا
ہے ترسیل درونِ دل ضروری
مگر برہم سرِ منبر نہ ہونا
گھڑی بھر چین سے رہنے نہ دیگا
بہاروں میں بھی بال و پر نہ ہونا
ہے مظہر تیری کوتاہی کا اختر
ترے حالات کا بہتر نہ ہونا

رؤف رحیم

طائرِ روح نہ ہی جسم کا پنجرہ اپنا
ہے کسی اور کے ہاتھوں میں یہ جینا اپنا
انگلیوں پر مرے عیبوں کو گنانے والے
آئینے میں تو کبھی دیکھ لے چہرہ اپنا
یہ علامت ہے کہ سورج ہے تنزل کی طرف
اپنے قد سے جو بڑا ہو گیا سایہ اپنا
بے خودی میں ترے سجدوں کو ملا تھا عرفان
ہائے کمبخت! کہاں ہوش سنبھالا اپنا
ہارنے والا ہو بدظن تو نہیں جیت اپنی
فتح وہ ہے کہ بنے جس میں پرایا اپنا
فکر اشعار کے سانچے میں ڈھلی جاتی ہے
فہم و دانش سے بہر حال ہے رشتہ اپنا
گردشِ وقت کبھی پاس نہیں آسکتی
اس کو معلوم ہے کتنا ہے کلیجہ اپنا
اپنی تقسیم نے دنیا سے نرالی تقسیم
حق میں اوروں کے اجالا ہے اندھیرا اپنا
دوسروں سے نہ رکھو تم کوئی امید رحیم
آدمی بوجھ اٹھاتے ہیں خود اپنا اپنا

یعقوب یاور

نوٹ :- اس غزل میں بحر کا خیال نہ رکھتے ہوئے صرف آہنگ پر شعر کہے گئے ہیں
یاور

خوش رنگ رنگ آگہی سفر دے دامن مرا آنسوؤں سے بھر دے
میں آگ آگ پھر بدن نہالوں دیوار برف برف کوئی در دے
نفرت کے مکان کا مکیں ہوں مولا مجھے پیار پیار گھر دے
یا دھوپ کا فرش ہی اٹھا لے یا رات کو موت کی خبر دے
دنیائے ہوس اجاڑ ہو رہی ہے شہرت کا شباب رنگ بھر دے
آواز کی نگاہ دوربین کر الفاظ کو بنائے جو تھے شر دے
الہام کے سلسلے کٹے ہوئے ہیں - ق - ابلاغ کو ندائے معتبر دے
منزل کی طلب کا ذکر پھر ہو راہی کو مذاق راہ بر دے
یا میسر کو زمیں سے اٹھا لے یا شاعروں کو علم چشم تر دے
سورج کا ہے مزاج خانقاہی تاروں کو ذوقِ شعلہ و شرر دے
جنت میں اتار کر عموں کو دوزخ کو بے اعتبار کر دے
اوزان کے لئے ہو باعثِ رشک آہنگ کی غزل میں وہ اثر دے
تا پھر ملے تریاق بے زبانی
یاور کی نوا میں زہر بھر دے

غزلیں

نکلوں میں کیسے گھر سے کھُلا سر لئے ہوئے
بپھرا ہوا ہجوم ہے پتھر لئے ہوئے

جائے اماں نہیں کوئی میدانِ زیست میں
سورج کھڑا ہے چار سو لشکر لئے ہوئے

برسات کا کرم ہوا کچے مکان پر
دیواریں بیٹھنے لگیں چھپر لئے ہوئے

اس شہرِ خواب زار میں کس کو صدائیں دوں
بیٹھا ہوں روشنی کا سمندر لئے ہوئے

تیرا منیرؔ ہے کہ جو پتھر کے شہر میں
پھرتا ہے زخم ہائے پیمبر لئے ہوئے

—

میں تیرگی کا زخم لئے پھر رہا ہوں آج
پوچھا نہ روشنی نے مرے درد کا مزاج

کیونکر نہ زندگی کی بکھر جائیں کرچیاں
شیشوں کے شہر میں ہوا پتھروں کا راج

آؤ کہ جنگلوں کی طرف لوٹ جائیں ہم
آبادیات میں ہے فسادات کا رواج

مجبوریاں جہیز کی صولی پہ چڑھ گئیں
پھر بھی ترس نہ کھا سکا خارش زدہ سماج

رسوائیوں کے لعل و گہر اس میں ہیں جڑے
مجھ کو منیرؔ سیفی جو بخشا گیا ہے تاج

—

خوابوں میں سنسار بہت البیلا لگتا ہے
نیند سے جاگوں تو مٹی کا ڈھیلا لگتا ہے

ہم جو کچھ کرتے ہیں وہ تو سوچ نہیں سکتا
بے چارہ ابلیس ہمارا چیلا لگتا ہے

کوئی لگاؤ تو اب اس کے غم کا اندازہ
بھیڑ میں رہ کر بھی جو شخص اکیلا لگتا ہے

بھیڑ ہے اتنی کہ باہر آؤں کیسے
میرے گھر میں تنہائی کا میلہ لگتا ہے

سیفیؔ کیسے موڑ پہ لے آئی ہے یہ دنیا
مجھ کو میرا سایہ بھی سوتیلا لگتا ہے

—

منیر سیفی

نذیر فتحپوری

دل کی کیا بات کہیں اس سے دلیلوں جیسی
بحث کرتا ہے ہمیشہ جو وکیلوں جیسی

شام کو پیار میں ڈھل جاتی ہے نفرت کی سحر
دشمنی چلتی نہیں پچھلے قبیلوں جیسی

پھر بھی چلتے رہے پھولوں کی روش پر ہم لوگ
خواہشیں قلب میں چبھتی رہیں کیلوں جیسی

دل کے صحرا میں اٹھا ایسا ہوائی طوفاں
ڈھے گئیں حسرتیں سب ریت کے ٹیلوں جیسی

ہم نے ڈالے کئی گوشوں میں بھنور بھی لیکن
خامشی چھا ہی گئی زیست پہ جھیلوں جیسی

توڑ کر اس کو پہنچنا ہے تمہارے دل تک
ایک دیوار جو حائل ہے فصیلوں جیسی

وصل کے خواب لرزتے رہے پلکوں پہ نذیرؔ
دوریاں راہ میں حائل رہیں میلوں جیسی

●

اس کا کوئی غم نہیں وہ مجھ کو پتھر دے گیا
غم اگر کچھ ہے تو یہ ہے پھول کہہ کر دے گیا

اس کی کیا کیا آرزو تھی، میری کیا کیا خواہشیں
وقت دونوں کو مگر بے رنگ منظر دے گیا

اس سے بڑھ کر اور کیا دیتا سخاوت کا ثبوت
میں نے مانگیں چند بوندیں، وہ سمندر دے گیا

میں نے رنگوں کے حوالے سے جو کیں باتیں تو وہ
مسکرا کر تتلیوں کا ایک لشکر دے گیا

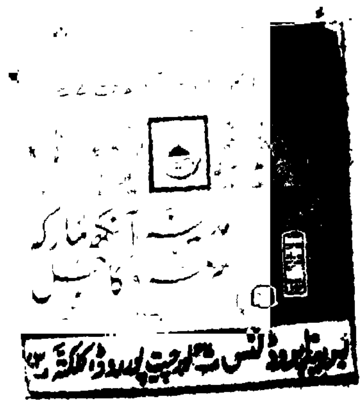
آنے والے دور میں دہرایا جائے گا بہت
جو کہانی کو مری حرفِ مکرر دے گیا

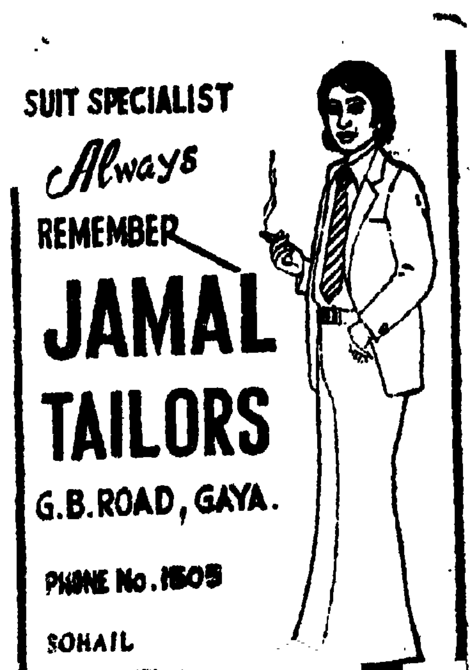
میں لہو کی شاخ سے ٹوٹا ہوا اک پھول تھا
پھر بھی ساون آ کے مجھ کو زرد چادر دے گیا

پھر سنائیں گے حدیثِ نغمہ و فن ہم نذیرؔ
وہ اگر تخلیق کے محراب و ممبر دے گیا

●


شربت
نزلہ
کھانسی، زکام، نزلہ کے لئے
دماغین
خون صفا
چند مشہور اور بہترین دوائیں
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ




SUIT SPECIALIST
Always
REMEMBER
JAMAL
TAILORS
G.B. ROAD, GAYA.
PHONE No. 1505
SOHAIL

ڈاکٹر اودے سرن ارمان بہاری

"ماں کہا کرتی تھی"

جس بنچ پر بیٹھا میں ریل گاڑی کے آنے کی گھڑیاں گن رہا تھا اسی پر ایک خوبصورت نوجوان بھی بیٹھا تھا اور وہ جیب تھیلی میں سے مونگ پھلیاں نکال نکال کر چبا رہا تھا اسی میں چھلکے بھی ڈالتا جاتا تھا۔ کچھ دیر تک تو میں نے یہ سمجھا کہ شاید وہ مونگ پھلی چبانے میں اتنا محو ہے جو چھلکے زمین پر پھینکنے کے بجائے تھیلی ہی میں ڈال لیتا ہے۔ میں نے اس بات پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ مجھے بھی بھوک لگ رہی تھی اس لئے میں نے ایک درجن کیلے لے لئے۔ اتنے کیلے میں کھا تو نہیں سکتا تھا صرف یہی سوچ کر لے لئے تھے کہ سفر میں جب کبھی بھوک ستائے گی تو کھا لوں گا۔ اور خریدنے کے لئے پلیٹ فارم پر جانا بھی نہیں پڑے گا۔ آگے کا انتظام کرنے کی انسان کی عام ذہنیت رہی ہے۔ ایسا کرنے سے میرا وقت بھی بچا اور پریشانی سے مکتی بھی ملی میں نے جلدی سے ایک کیلا چھیلا اور اس کا چھلکا بنچ کے نیچے پھینک کر کھانے لگا۔ کھاتے کھاتے میرا دھیان پھر ادھر گیا دیکھا تو وہ اب بھی اسی طرح چبا رہا تھا۔ اب میں سمجھ گیا کہ وہ بھول سے نہیں جان بوجھ کر ہی چھلکے مونگ پھلیوں کی تھیلی میں ڈال رہا تو دل ہی دل میں ایک سوال ابھرا "ایسا کیوں؟" میں نے اس حماقت کی وجہ جاننے کے لئے اس کی طرف دیکھا تو وہ مجھ سے پہلے میرے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی کچھ کہنے کے موڈ میں تھا۔ مگر وہ مجھے متفکر انداز سے دیکھ رہا تھا۔ اب مجھ سے چپ نہ رہا گیا اور میں نے سوال داغ ہی دیا۔

"بیٹے تم مونگ پھلی کی تھیلی ہی میں چھلکے بھی ڈالے چلے جا رہے ہو ایسا کرنے سے تم کو مونگ پھلی ڈھونڈنے میں پریشانی محسوس نہیں ہوتی؟"

اب اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "پریشانی تو ہوتی ہے بڑے بی! مگر اس پریشانی میں بھی ایک لطف ہے ریل گاڑی آنے میں ابھی کچھ دیر ہے وقت گذارنے کا اس سے اچھا طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ مونگ پھلی کے چھلکے مونگ پھلیوں میں ڈالنے سے مونگ پھلی ڈھونڈنی پڑتی ہے اور اس طرح کچھ وقت بھی لگتا ہے اور کام بھی کرنا پڑ رہا ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ پلیٹ فارم پر گندگی پھیلانے سے بھی بچ رہا ہوں۔ بعد میں کہیں کوڑا دان دیکھ یہ چھلکے اس میں ڈال دوں گا۔ ہر انسان کو صفائی کا دھیان تو رکھنا

ہی چاہئے۔"

نوجوان کی باتیں سن کر میرا دھیان بنچ کے نیچے پڑے کیلے کے چھلکے پر گیا اور مجھے غلطی کے ساتھ ندامت بھی محسوس ہوئی۔ تھوڑی دیر پہلے میں جسے بے وقوف سمجھ رہا تھا وہ اب میری نظر میں ایک سمجھدار بہ سلیقہ انسان معلوم ہونے لگا تھا۔ میری گھُوٹ ہٹ گئی تھی اور میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ بے وقوف وہ نہیں بلکہ میں ہوں۔ لمحہ بھر میں میرے جی میں آیا کہ اس چھلکے کو اٹھا کر لائنوں میں پھینک دوں مگر کچھ سوچ کر پھر ٹھٹھک گیا۔ غلطی کا اعتراف بھی آسان کام نہیں ہوتا ہے۔ میں اس نوجوان کے بارے میں نہ جانے کیا کیا سوچنے لگا۔ اسی وقت میری بنچ کے دوسری طرف ایک بچے نے مچلتے ہوئے ماں سے کہا۔ "میں بھی کیلا لوں گا۔"

ماں نے بچے کو جھوٹا دھارس بندھاتے ہوئے ٹالنے کے خیال سے کہا۔ "ابھی کھلائیں گے کیلے والے کو آنے دو۔" بچہ اور بوڑھا مانگ پوری ہونے میں تاخیر برداشت نہیں کرتا ہے۔ مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی اور دو کیلے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے اس بچے نے بھی کیلے دیکھتے ہی پوری بے باکی سے ہاتھ آگے بڑھا دیئے۔ ماں باپ مسکراتے رہے اور بچے کو روکا نہیں اس نوجوان نے امید کے خلاف میرا ہاتھ اپنے ہاتھ سے پیچھے کرتے ہوئے مجھے کیلیاں دینے سے روک دیا اور کہا" میری ماں کہا کرتی تھی کہ گھر سے باہر نکل کر نہ کسی سے کچھ لو اور نہ کسی کو کچھ دو نہ کسی کا کچھ کھاؤ نہ کسی کو کچھ کھلاؤ۔"

میں نے اس کی باتیں بغور سن کر کہا۔ "میری ماں بھی کہا کرتی تھی۔ قرض کا ڈھیر اور بھگتا وے حیران کے گھر کو تالا۔ سالے کے سنگ بہن کو بھیجے تینوں کا منہ کالا۔" اتنا کہہ کر میں اس کا ردعمل جاننے کے لئے چپ ہو گیا وہ بھی دلچسپ ہو گیا۔ وہ بھی چپ تھا شاید اس کہاوت کے معنی مطلب سمجھنے میں مشغول ہو گیا تھا۔ ہو سکتا ہے تھوڑی دیر بعد وہ یہ سوال کرتا کہ وضاحت کے ساتھ اس شعر کا مطلب بتائیے۔

نوجوان کے تمام الفاظ میرے دل و دماغ میں گونجتے رہے کسی کا کچھ مت کھاؤ کسی کو کچھ مت کھلاؤ کسی سے کچھ مت لو کسی کو کچھ مت دو۔ کیا بڑے بوڑھوں کی ساری باتیں ماننے لائق ہوتی ہیں۔ کسی کا کچھ مت کھاؤ اور کسی کا کچھ مت لو یہ باتیں تو ٹھیک لگتی ہیں مگر دو باتوں سے میں اتفاق نہیں کرتا۔ کسی بھوکے کو کچھ نہ کھلانا کسی ضرورت مند کو کچھ نہ دینا یہ باتیں غلط ہیں ہر انسان ایک دوسرے کی مدد کے لئے پیدا ہوا ہے اگر ایسا نہیں کیا تو انسانیت ہی ختم ہو جائے گی۔ میں نے کہا۔ بیٹے کیا یقین کرتے ہو کہ اسلاف کی تمام باتیں ماننے کے قابل ہوتی تھیں۔" یہ سنتے ہی نوجوان بولا۔

میں آپ کے اس سوال کرنے سے پہلے ہی سمجھا کہ آپ یہ ضرور پوچھیں گے آپ کی طرح مجھے بھی ماں کی بات پر شک ہوا تھا۔ مگر میں نے ان کو ناخوش نہ کرنے کے خیال سے اپنا شک ظاہر نہیں کیا تھا۔ آج وہ اس دنیا میں نہیں ہیں مگر ان کی باتوں پر شک کر کے جو تجربات میں نے حاصل کئے ہیں وہ ابھی میرے ساتھ ہیں اور اپنی اولاد سے بھی کہہ جاؤں گا۔

بڑے بوڑھوں کی باتیں مان کر چلنے ہی میں بھلائی ہے کیا اور خوبصورت زندگی جینے کے لئے معقول اصولوں کا ہونا بہت ہی ضروری ہوتا ہے۔ کسی تجربہ کار انسان کی باتوں پر شک کر کے اپنی زندگی کے قیمتی وقت کو تعمیری کام نہ لگا کر تجربے میں لگا دینا بے خوفی ہے سمجھدار وہی لوگ ہوتے ہیں جو دوسروں کے تجربوں سے فیضیاب ہوتے ہیں۔

ایک بار میں دہرادون جا رہا تھا۔ ٹکٹ کے لئے میں کھڑا تھا۔ کچھ لوگ ادھر ادھر لائن سے باہر بھاگ

نے جیسے کے لائن میں کھڑے ہوکر ٹکٹ لینے میں ان کی آبرو
جرف آتا تھا۔ اسی وقت ایک ادھیڑ عمر خوبصورت عورت
پس ہاتھ میں لئے لائن کے قریب آئی گھڑی بھر کو اس نے
ہنپنا کے ساتھ ادھر ادھر دیکھا پھر مجھ سے بولی" بھائی
صاحب میرا یہ نوٹ تڑا دیجئے بڑی کرپا ہوگی۔ پلیز" نیم وا
آنکھیں کرکے مسکراتے ہوئے اس ڈھنگ سے اس نے
ھینچ کر پلیز کہا کہ مجھ پر جادو سا چل گیا میں نشیب و فراز
پھی نہ سوچ سکا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی پریشانی
دور کرنے کے خیال سے دس کا نوٹ لے کر اسے سنبھل کر
کیا پرکھا بھی نہیں جیب میں ٹھونس لیا اور ایک ایک کے
س نوٹ اس کی طرف بڑھا دیئے اس نے بھی میری
طرح بنا گنے سمجھے بنا دیکھے بھالے بلاؤز میں سرکا لئے۔ تحفظ
ے لحاظ سے اس سے بہتر جگہ عورت کے پاس دوسری اور
ہاں ہے بھی نہیں نہ یہاں چھاپا پڑ سکتا ہے نہ چوری جاری
ڈر ہے۔ اس کے بعد اس نے میرے آگے پھر ہاتھ پھیلایا
در بولی" باقی نوٹ" یہ سن کر میں گھبرا گیا یہ مذاق بھی نہیں
رہی تھی کیونکہ اس کے چہرے پر اب تبسم کی جگہ سنجیدگی
تھا کوئی غیر عورت باہر یوں کسی سے مذاق کرتی بھی نہیں
ہے میں نے ہمت جٹا کر کہا" کیا دس کی جگہ گیارہ لینے
کے ارادے ہیں؟" یہ سنتے ہی اس نے فوراً تیور بدل کر
سختی کے ساتھ کہا" تم جس کو دس کا نوٹ سمجھ رہے ہو
بابو جی وہ سو کا تھا سو کا دوبارہ پرس کھول کر تو دیکھو"
اتنا کہہ کر پہلے سے لائن سے باہر کھڑے ایک آدمی کو مخاطب
کرکے اس نے گواہی تیار کی" کیوں بھائی صاحب آپ نے بھی
دیکھا ہوگا مجھے سو کا نوٹ دیتے ہوئے" وہ شخص ایکدم
بولا" ہاں ہاں میرے سامنے آپ نے سو کا نوٹ دیا ہے" اسی
وقت ایک اور شخص بولا" یہ تو میں نے بھی دیکھا تھا نوٹ

دس کا نہیں سو کا تھا۔ دو گواہیاں میرے خلاف فوراً پیش
ہوگئیں۔ اس کے بعد آس پاس کے سبھی لوگ مجھے مشکوک
نظروں سے دیکھنے لگے۔ اس عورت نے اپنا پرس کھول کر
دکھاتے ہوئے کہا۔ میرے پرس میں ایک نوٹ بھی دس کا
نہیں ہے سارے ہی سو سو کے نوٹ ہیں۔ یہ دیکھتے ہی بنا
سوچے بچارے روبوٹوں کی طرح سب نے ایک زبان ہوکر
مجھ ہی کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا میں نے اپنی صفائی
کے لئے اور اس کو جھوٹا اور مکار ثابت کرنے کے لئے ہر
طرح کی قسم کھائی مگر پوری بھیڑ میں کوئی میرا طرفدار نہ
تھا۔ جیسے طلاق کے کیس میں شریف آدمی کے سامنے کھڑی
مکار بدکار عورت کی کبھی عدالت برائی نہیں دیکھتی آدمی
ہی کو غلط مان لیتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح اس عورت کا
پلڑا بھاری ہوگیا۔ اور میں مات کھا گیا۔ اس روز مجھے محسوس
ہوا کہ جب کسی کے سچ کی ہار ہوتی ہے تو کیسا لگتا ہے۔ میری
زندگی میں وہ پہلا دن تھا جب میں ستیم ایو جیتے (سچ ہی جیتتا
ہے) پر سے بے یقین ہوگیا اور جھوٹ بھی جیتتا ہے یہ ماننے
لگا۔ موقع کی نزاکت نے میرے گھٹنے ٹکا دیئے اور میں نے
نوے روپے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے اور اپنی جان
چھڑائی۔ تھینک یو کہہ کر اس عورت نے راہ فرار اختیار کی
تھوڑی دیر بعد وہ دونوں گواہ بھی ہوا ہوگئے۔ میں ٹکٹ لے
کر گاڑی میں جا بیٹھا عالم سکون میں جب میرے ہوش و حواس
سنبھلے اور پورے واقعہ پر نظر دوڑائی تو ایسا محسوس ہوا
کہ وہ دونوں گواہ اس کے ساتھی تھے اور وہ عورت کسی
مکار گینگ کی یونٹ تھی۔ یہ سب بھٹے تھے۔ آپ کی ہی طرح
میں نے ماں کی نصیحت پر عمل نہ کرکے تجربے پر یقین کیا اور
اس گت کو پہنچا۔ ایسے تجربے ہر ایک کے لئے سبق آموز
ہوتے ہیں۔

ایک بار مجھے ہردوار جاتے ہوئے اسٹیشن پر ایک مسافر یہ کہتے ہوئے اپنا جھولا تھما گیا "میں لیٹرین جا رہا ہوں ذرا دیر کو آپ اس پر نظر رکھئے" انسان انسان کے کام آتا ہی ہے کسی کی مدد کرنا بری بات نہیں ہوتی ہے۔ سیدھے سبھاؤ میں نے اس جھولے کو اپنے پاس رکھ لیا جب وہ صاحب تشریف لائے تو میں نے اٹھا کر ان کو دیدیا۔ انہوں نے بڑی خوش مزاجی سے ڈرامہ بازی کرتے ہوئے شکریہ ادا کیا لیکن جھولہ کھکھوڑ کر دیکھتے ہوئے بولے "اس میں میرا پرس نظر نہیں آتا" میں نے اتنا تو کہہ دیا کہ غور سے دیکھئے اسی میں ہوگا مگر بعد کو میں اس پرس والی عورت کو یاد کرکے گھبرا گیا کہیں اسی طرح آج بھی غلطی تو نہیں کر بیٹھا۔ اس نے پھر ڈرامائی انداز اپنایا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "پرس تو اس میں نہیں ہے۔ جب جھولا آپ کو دے کر گیا تھا تب تو وہ اس میں تھا۔ ضرور آپ نے اسے نکال لیا ہے۔ مجھے گاڑی سے جانا ہے وہ آنے والی ہے۔ میرے پاس وقت نہیں ہے وہ آنے والی ہے یا تو میرا پرس دیدو ورنہ میں شور مچاتا ہوں اور پولیس کو بلاتا ہوں" یہ کہتے کہتے وہ بڑا بھیانک ہوگیا تھا وہ غصہ سے سرخ ہوگیا تھا اس کے تیور بدل گئے تھے، اس کی آواز میں تیزی آگئی تھی وہ ہر بات اونچی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ابھی چند دن ہوئے شہر میں فسادات ہوکر چکے تھے۔ ذرا کہیں شور شرابہ ہوتا تھا تو لوگ گھبرا جاتے تھے۔ اس کی بلند آواز سن کر کئی لوگ میرے پاس آکر جمع ہوگئے تھے۔ سب کی زبان پر ایک ہی سوال تھا "کیا ہوا؟" اس مکار نے ساری کہانی سنا کر لوگوں کی ہمدردی حاصل کرلی ایک مچھندر بولا "تمہارا پرس کس رنگ کا تھا؟" وہ جھوٹ بولا۔ "نیلے رنگ کا تھا" پھر اس نے پوچھا "اس میں کیا

کیا تھا۔ کیا کوئی ایسی چیز تھی جس سے ہم کو یہ یقین ہو کہ تم صحیح ہو؟" یہ سنتے ہی اس نے جواب دیا "اس میں ہر کے نوٹ تھے اور ایک سونے کی انگوٹھی تھی جس کا نگ سرخ رنگ تھا" یہ سن کر میرے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی میں پسینہ پسینہ ہوگیا میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ میری جیب میں رکھے بٹوے کے رنگ اور اس میں رکھی انگوٹھی کے بارے میں اس کو کیسے علم ہوا۔ میں عجیب میں پڑ گیا۔ وہ مچھندر زبردستی میری پینٹ کی جیب بٹوا نکالنے لگا۔ میں چپ چاپ کھڑا رہا اب مجھے اپنی ہار نظر آرہی تھی اگر میں اپنی تلاشی دینے سے مکرتا لوگ مجھے شک کی نظروں سے دیکھتے تھے وہ کئی ہم جیب تھے ایسا کرنے پر مجھے کس کر پکڑ لیتے اور پٹائی بھی کرسکتے تھے کیونکہ مجرم وہ نہیں بلکہ میں بن چکا تھا۔ بٹوا نکلنے اس میں پہلے ہی سے تحفظ کے خیال سے رکھی سونے سرخ نگ کی انگوٹھی اس مکار کو مستحق حقیقی قرار میں مددگار ثابت ہوجاتی۔ میں جو سوچ رہا تھا وہی دیکھتے دیکھتے لوگوں نے مع انگوٹھی کے وہ پرس اُ کو دیدیا اور وہ فوراً نو دو گیارہ ہوگیا میں کمبخت رہا رہ گیا۔ اب میرے دماغ میں یہ بات گھوم رہی تھی کہ کاش میرے پرس میں میرا فوٹو اور ایڈریس بھی ہوتا تو آج کی نہ کھانی پڑتی۔ ماں کی دوسری نصیحت پر عمل نہ کرنے کا تجربہ سامنے آیا: اس نوجوان نے تھوک سٹکتے کچھ دم لے کر مجھ سے آگے کہنا شروع کیا "سبھی لوگ کے ساتھی ہوسکتے ہیں اور وہ یقیناً ایک بھٹیا تھا جس نے مجھے اسٹیشن پر انگوٹھی نکال کر بٹوے میں رکھتے ہوئے دیکھ لیا ہوگا۔ کسی کو کچھ مت دو کسی سے کچھ مت لو۔ یہ دونوں باتیں تجربے نے صحیح ثابت کردیں۔ میری ماں ٹھیک کہا

ہی یقین ہو رہا ہے۔
کسی کو کچھ مت کھلاؤ کسی کا کچھ مت کھاؤ۔ یہ دو باتیں میرے پڑوسیوں کے تجربے پر کھری اتریں۔ ٹھاکر صاحب کا بیٹا لڑکا مدن ڈبل ایم اے بی ایس سی ایل ایل بی کہیں کلیریکل جوب میں کمپیٹیشن کے لئے جا رہا تھا اسے کسی مکار بھٹنے نے دوستی گانٹھ کے مل کے چالاکی سے کچھ کھلا دیا جب وہ بے ہوش ہوگیا تو اس کا سب کچھ لے کر اپنے قبضے میں کیا اور اس کو پلیٹ فارم سے نیچے پٹری پر دھکیل دیا گاڑی سے کٹ جاتا کسی کو اصلیت کا پتہ بھی نہیں چلتا مگر اس کی زندگی تھی تھوڑی دیر بعد ایک مسافر کی آگے جھک کر گاڑی کی دوری دیکھتے وقت اس پر نظر پڑگئی اور اس فرشتہ سیرت انسان نے کئی مسافروں کی مدد سے اس کو اوپر اٹھوالیا اور ریلوے پولس کے حوالے کر دیا جس نے ریلوے اسپتال میں بھرتی کر دیا اور وہ ٹھیک ہوگیا۔ یہ تھا کسی کی دی ہوئی چیز کھانے کا انجام۔ اب سنئے کسی کو کچھ مت کھلاؤ کے نتیجے کے بارے میں۔

میرے دوسرے پڑوسی پنڈت جی کے لڑکے ہرنرائن ایم اے پی ایچ ڈی نے دہلی سے دکان کا سامان لاتے ہوئے راستے میں ایک اسٹیشن پر جذبۂ انسانی دوستی دکھاتے ہوئے کسی کو کچھ کھلایا پلایا اور خود بھی اس میں سے کچھ کھایا پیا اس اجنبی کے ساتھ برتی گئی یہ خوش اخلاقی ہرنرائن کو بہت مہنگی بیٹھی۔ میٹھا کھاتے ہی وہ پچھاڑ کھا کر نیچے گر گیا اور لوٹنے پیٹنے لگا اس کے منہ سے جھاگ بھی نکلنے لگی۔ یہ ڈھنگ دیکھ چند آدمی بھی جمع ہوگئے ہر ایک کے منہ پر ایک ہی بات کہ اس کو کچھ ملاکر کھلا دیا گیا۔ زمین پر لوٹنے والے نے کہا " اس شخص نے مجھے میٹھے میں زہر ملا کر دیدیا ہے کوئی مجھے فوراً اسپتال پہنچا دو ورنہ میں مرجاؤں گا جلدی کرو اور ثواب کمالو" یہ سن کر پنڈت جی کے لڑکے کو پسینہ آگیا۔ اس کے جسم میں کاٹو تو خون نہیں رہا

کسی نے بھی اس کی سچائی پر دھیان نہیں دیا اور قسم بھی کارگر ثابت نہیں ہوئی بلکہ کسی نے بلند آواز میں یہ اور کہہ دیا کہ قسمیں کھانے والے سچے ہی کب ہوتے ہیں۔ اونچے اونچے عہدوں پر معمور ہونے سے پہلے سبھی لوگ ملک کے حق میں وفادار بنے رہنے کی قسم کھاتے ہیں وقت موقع پڑنے پر سبھی غدار نکلتے ہیں اور دغا دیتے ہیں۔ جتنے منہ اتنی ہی باتیں ہوتی رہیں آخرکار کچھ لوگ اس کو اسپتال پہنچانے کو تیار ہوگئے — مگر خرچ کون کرے گا؟ اس سوال پر آکر سب ایک دوسرے کا منہ تاکنے لگے۔ موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے ہرنرائن نے سارا خرچ خود اٹھانے کی ہاں کردی۔ اور پانچ سو روپے جو سب لوگوں نے طے کئے تھے۔ فوراً ادا کردیئے۔ دو آدمی نیم ہوشی کی حالت میں اس کو رکشے میں بٹھا کر لے گئے تھوڑی دور جا کر وہ خود ہی سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اسے کون سا کچھ ہوا تھا۔ بھیڑیئے لوگ طرح طرح سے لوگوں کو ٹھگتے ہیں۔ اس کے بعد میں نے کسی کو کچھ کھلانا بھی بند کردیا شرافت کا دشمن تو ہر دور میں ہوتے آئے ہیں مگر اس دور میں یہ سن کر بچے والی نے بچے کو گود میں بٹھالیا۔ اس کا چہرہ اداس ہوگیا تھا اور وہ نوجوان کو نفرت بھرے انداز سے دیکھنے لگی تھی جیسے کہ وہ یہ محسوس کر رہی تھی کہ یہ نوجوان نہیں ہوتا تو اس کے لڑکے کو دو کیلے مل جاتے۔

میں نے ان تجربات سے کچھ سیکھا اور اس کی ماں کی باتیں معلوم ہوئیں مگر پھر بھی میں دو باتوں پر متفق نہیں تھا میں نے نوجوان سے کہا " بیٹے تمہاری ماں کی تعلیم تو واقعی عمل کرنے لائق ہے تجربات کی کسوٹی پر بھی کھری اتری مگر کسی کو کچھ نہ کھلانے اور کسی کو کچھ نہ دینے کی بات پچاس فیصدی ہی صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ ایسا کرنے سے تو دان پن کے جذبے کو ٹھیس پہنچے گی۔"
" دان پن گھر بیٹھ کر کیجئے گھر سے باہر نکل کر نہیں " نوجوان

(بقیہ صفحہ ۲۶ پر)

روحی قاضی

شناخت

دس سالوں کے بعد آج وہ اس سرزمین پر پہنچا جہاں وہ پیدا ہوا، پل کر جوان ہوا اور آدھی عمر کو پہنچ گیا..... بچپن، جوانی اور نصف عمری کے حالات اور تجربات نے اسے ہنگامہ خیز شہر سے دور چلے جانے کے لئے مجبور کیا۔ اپنے ذہن کی سالمیت کی خاطر شہر کے ہنگامے اور ہل چل سے بچنے کے لئے گاؤں کی کھلی فضا اور صاف ہوا میں سانس لینے کے لئے گیا تو تھا لیکن وہ فضا اور ہوا بھی اسے راس نہ آئی .... نت مسائل نے اسے شہر لوٹنے پر آمادہ کر دیا اور جب اپنے شہر لوٹا تو اسے پتہ چلا کہ اس کا یہ شہر بدل چکا ہے ا اس لئے کہ وہ ستون جس پر اس شہر کی چھت قائم تھی اس پر نیا رنگ و روغن ہے۔ راستوں کے سمت بدل گئے ہیں۔ مشہور شاہراہوں کے نام بھی تبدیل کر دیئے گئے ہیں۔ نئی لائٹ، نئی شیشہ، نئی موٹریاں، سب کچھ نیا تھا لیکن انسانوں کے رنگ ڈھنگ وہی تھے چہرے پر فکر، آنکھوں میں الجھن لیکن یہ کیا..... ان کی رفتار میں آہستگی کیوں ہے۔ کیا یہ لوگ کمزور ہو گئے ہیں یا سست..... دس سال قبل تو راستوں پر یوں چلتے تھے جیسے کہ بھاگ رہے ہوں..... نہیں یہ کمزور نہیں ہوئے اور نہ ہی سست، دراصل تیز قدم ہوں بھی تو کس طرح راستوں پر جگہ جو کم ہے آخر انہیں اپنے دوسرے ساتھی کا خیال تو کرنا ہی ہے وہ تیز گام ہوئے تو دوسرے لوگ دھکا کھا کر گریں گے آگے پیچھے، دائیں بائیں..... صرف دس سالوں میں کشادہ راستے تنگ ہو گئے جیسے کسی ہٹ فلم کے چھوٹنے کے فوراً بعد اس سنیما ہال کے نکاسی کے راستے آدمی کے ریلے کی بنا پر تنگ نظر آتے ہیں..... اگلے دس سالوں میں کیا ہوگا..... اب کل کی فکر کون کرے آج کی الجھن سے سبکدوش ہو لوں.. اپنا آبائی گھر تو رہا نہیں بھائیوں نے جب میرے خطوں کا جواب نہیں دیا تو رہنے کے لئے جگہ کہاں سے دیں گے کوئی بات کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ایک بے چارہ دلال ہی تو ہے جو دلالی کی امید پر میرا ساتھ دے رہا ہے۔ اب تک جتنے بھی مالک مکان سے

ہم ملے ہیں وہ شناخت مانگتے ہیں۔ کیسے کہوں کہ مجھے پہچانو۔ ۔ ۔ میری ضمانت دو۔ ۔ ۔ ۔ کاش یہ لوگ بھی کرائے پر مل جاتے۔ " مل جائیں گے صاحب! پیسے کچھ زیادہ لگیں گے" "لیکن میرے پاس تو زیادہ پیسے نہیں۔" "صاحب آپ تو اسی شہر کے ہیں بہت سے لوگ ہوں گے آپ کی پہچان والے"

"ہاں ہیں تو ٹھیک ہے سب سے پہلے اس شخص سے ملتا ہوں جو رشتہ داروں میں سب سے عزیز تھا۔ بہت سی دشواریوں کے بعد جب وہ اپنے سب سے عزیز رشتہ دار کے یہاں پہنچا تو تین بار بیل بجانے کے بعد جدید طرز کا دروازہ کھلا اور ایک نو عمر لڑکی نرم لہجے میں بولی۔" انکل جی۔ آپ کل آیئے۔ ڈیڈی ابھی نہیں مل سکتے۔ ۔ ۔ ۔" "بیٹے انہیں تم میرا نام بتاؤ اور کہو کہ ان سے میرا ملنا آج ہی ضروری ہے"

"اچھا انکل میں کہہ کر آتی ہوں کیا نام بتایا آپ نے"

"میں عبدالعزیز بیگانہ ہوں۔ ۔ ۔"

یہ نو عمر بچی وہی ہے جو میرے سامنے ایک سال کی تھی۔ بالکل صفیہ جیسی ہے۔ شاہد اور میں دونوں نے ایک ساتھ ہی تعلیم حاصل کی۔ ۔ ۔ ۔ میں آرٹ کی طرف مائل تھا اور یہ کامرس کی طرف، ہمیشہ فائدہ اور نقصان کی بات کرتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ میں آرٹ کا مارا۔ ۔ ۔ ۔ روح، ضمیر، انا اور اصول کی بھول بھلیوں میں خود کو گم کرتا چلا گیا۔

لٹریچر کی اعلیٰ سند خلا کی طرح خالی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عزت و شہرت جسے چھوا تو نہیں جاسکتا صرف محسوس کیا جاسکتا وہ بھی ذہن سے اور ذہن جیسے تن بدن کی ضرورت ایک دن بے مصرف خالی ڈبہ بنا دیتی ہے۔ نظریئے اور نظر نے ہم دونوں کی راہیں بدل دیں اور شاہد دیکھتے ہی دیکھتے کامیاب بزنس مین بن گیا۔ ۔ ۔ ۔ فلیٹ۔ ۔ ۔ کار۔ ۔ ۔ ۔ من چاہی بیوی۔ ۔ ۔ سوسائٹی میں اونچا مقام۔ ۔ ۔ ۔ جسم سے جینے والے ہی اب جیتے ہیں اور میں عبدالعزیز بیگانہ۔ ۔ ۔ ۔ اعلیٰ ذہن، بے مثال ضمیر کا مالک خوددار اور بااصول آدمی کیسے جیتا رہا۔ ۔ ۔ ۔ نہ مناسب نوکری نہ مناسب گھر اور نہ ہی من چاہی محبت۔ ۔ ۔ ۔ اپنی محبت بھی جاہ و منصب کی سولی پر لٹکا دی گئی آخر میں کیا دیتا صفیہ کو صرف سوکھے اشعار۔ ۔ ۔ ۔! محفلوں میں حاصل کی ہوئی واہ۔ ۔ ۔ واہ بھی تو گرفت میں لے کر صفیہ کی ہتھیلی پر نہیں ڈال سکتا تھا۔ ۔ ۔ اچھا ہوا جو چچا نے صفیہ کے لئے شاہد جیسا ہونہار اور کامیاب تاجر ڈھونڈا ورنہ صفیہ غریب بھی میرے فن کارانہ اصولوں کی نذر ہو جاتی اور آج میرے ساتھ گاؤں کی دھوپ میں تپ کر کالی ہو جاتی۔ ۔ ۔ ۔ کالے چہرے اور تھکے وجود کے ساتھ زندگی کے وسائل کی تلاش میں شہر آتی تو شناخت کے لئے دربدر بھٹکتی اور اس کی سینڈل بھی میری چپل کی طرح ٹوٹی اور گھسی ہوتی۔ ۔ ۔ ۔!!

" انکل جی۔ ۔ ۔ انکل جی۔ ۔ ۔"

"ہاں بیٹے کیا کہا ڈیڈی نے۔ ۔ ۔"

" ڈیڈی نے کچھ نہیں کہا ممی نے کہا۔ ۔ ۔ بے گانے ہو یا دیوانے۔ کہہ دو ابھی نہیں مل سکتے آرام کر رہے ہیں بھری دوپہر اوپر سے اتنی گرمی یہ بھی کوئی آنے کا وقت ہے۔ ۔ ۔"

ہاں بیٹے۔ ۔ ۔ ٹھیک کہتی ہیں صفیہ بھابی۔ ۔ ۔"

انکل جی میری ممی کا نام صفیہ نہیں۔ ۔ ۔ ۔ صفیہ تو میری امی تھیں"

امی تھیں۔ ۔ ۔ ۔ کیا مطلب۔ ۔ ۔ ۔؟ وہ کہاں گئیں۔ مجھے بتاؤ بیٹے میں کوئی غیر نہیں۔ ۔"

" لیکن انکل جی۔ ۔ ۔ ۔ آپ تو پسینے سے بھیگ گئے ہیں میرے کمرے میں آیئے میں اکیلی ہوں کچھ دیر آرام کر لیجئے پھر میں آپ کو اپنی امی کا حال سناؤں گی۔ ۔ ۔ ۔؟

بیٹے! تمہارے ڈیڈی ممی نے ڈانٹا تو .....

"ڈانٹیں گے جو دیکھیں گے۔ چھ بجے شام سے پہلے ماں کا کمرہ کھلے گا ہی نہیں آج سنڈے جو ہے...!

اچھا اچھا چلو چلو .... کاش! لوگ صرف بچے ہوتے ....!"

"ہاں بیٹے بتاؤ کہاں گئیں تمہاری امی ؟"

"بتاتی ہوں پہلے انگور کھائیے!"

"تم بھی کھاؤ، کس کلاس میں ہو ؟

میں ریتا Standard میں ہوں ابھی تو مجھے بہت پرابلم ہوتا ہے ریزلٹس اچھے نہیں آتے۔ امی تھیں .... تو Rank آنا ضروری تھا... ڈیڈی کو میرا بالکل خیال نہیں صرف فیس وقت پر دیدیتے ہیں اور ممی تو بس نام کی ممی ہیں...!"

"یہ ممی کب آئیں تمہارے گھر.... ؟"

"یہ آتی تو تھیں اکثر مگر دو سال پہلے ڈیڈی کی برتھ ڈے پر آئیں تو پھر نہیں گئیں اور جب امی نے کہا "یہ یہاں رہے گی تو میں نہیں رہوں گی۔" تو ڈیڈی نے امی کی خوب پٹائی کی اور گھر سے نکال دیا ڈیڈی نے مجھے کمرے میں بند کر دیا میں ساری رات روتی رہی۔ ایک بار دائی ماں امی سے ملی تھی جب بھی میں دائی ماں سے کہتی کہ مجھے بھی امی سے ملا دو تو وہ کہتی کہ امی بہت دور چلی گئیں صرف مجھے ایک پتہ دیا اور خط لکھنے کو بولی۔

میں خط لکھتی ہوں امی کبھی جواب دیتی ہیں مگر خط دائی ماں کے گھر آتا ہے میں اپنی امی کو بہت یاد کرتی ہوں .... انکل جب میں ڈاکٹر بن جاؤں گی اپنی امی کے ساتھ رہوں گی ....!

ہاں بیٹے ضرور .... تم دل لگا کر تعلیم حاصل کرو پھر اپنی ماں کے لئے بیٹا بن کر ان کے دکھ دور کر دینا .....!

"انکل کیا بیٹی بن کر میں ان کے دکھ دور نہیں کر سکتی .....؟

"کیوں نہیں بیٹی .... اچھا تم اپنی امی کا پتہ بتا سکتی ہو....؟

"ہاں ضرور یہ لیجئے، میں خط اسی پتے پر لکھتی" بدنام بستی، واٹ گنج اور صفیہ..... آنکھوں کی دھندلاہٹ کو ہتھیلی سے مسلتے ہوئے اس نے ایک ٹیکسی کو آواز دی ...... ایک بوسیدہ سے مکان کے دروازے پر ایک ضعیفہ نے جس کی طرف اشارہ کیا وہ اسی طرف ہو لیا.......

"سنئے ذرا صفیہ بائی کو بلا دیجئے!

"کہئے کیا... کام ہے..... ارے عزیز تم....!

"صفیہ میں تمہیں نہیں پہچان سکا اور تم نے مجھے پہچان لیا مجھے اپنی شناخت چاہئے تھی سو مل گئی....!"

بقیہ: ماں کہا کرتی تھی

نے کالر سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔

دو کھیت کے ننگے غریب ضرور تمند تو باہر بھی ہوتے ہیں جو جس کے اہل ہو اور موقع محل اجازت دیتا ہو ویسا کرنے میں کیا نقصان ہے؟

میں نے نوجوان سے کہا۔ یہ سن کر اس نے دھرا سا جواب "اس تیز رفتار مشینی زندگی میں کس کے پاس اتنا وقت ہے جو صحیح فا کا فیصلہ کر کے قدم اٹھائے جیسے مذاہب کے اصول بنا بحث کئے بغیر کے ساتھ مانے جاتے ہیں ایسے ہی بزرگوں کی باتیں بھی آنکھیں بند کر مان لینی چاہئے۔ یہ سن کر میں خاموش ہو گیا اور آج بھی اس کی باتیں

شہرِ خیال

○ عزیزم

سہیل مل رہا ہے

صحت کی خرابی کی وجہ سے لکھنے پڑھنے کا وہ زور نہیں ہے۔ آپ اردو کی بڑی خدمت کر رہے ہیں۔

موجودہ ناسازگار حالات میں سہیل جاری رکھنا آسان بات نہیں۔

گیا ہی کے 'ندیم' نے غالبًا دو بہار نمبر نکالے تھے آپ بھی کچھ اچھے نمبر نکالیے۔

موضوع شخصیات کے بجائے ادوار یا اصناف ہو۔ صوبہ بہار کی بعض خصوصیات پر بھی مضامین ہوں تو بہت خوب — خدا کرے آپ اچھے ہوں۔

عبدالقوی دسنوی (بھوپال)

○ عزیز گرامی ہزار اللہ دعائیں

سہیل کے گذشتہ شمارے میں جناب اصغر علی انجینئر کا پر مغز اور دلچسپ مضمون "ہندوستان میں اردو زبان کا مسئلہ" پڑھا۔ موصوف نے صحیح فرمایا ہے کہ ہندوؤں کے تعلیم یافتہ طبقوں نے شمالی ہند میں اردو کے سرکاری زبان بننے کی مخالفت کی اور اسے ہندی مخالف قرار دیا لیکن وہ اردو اور ہندی کی رقابت کا سبب نہیں بتاتے۔ انجینئر صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ شمالی ہندوستان میں اردو عوامی زبان کی حیثیت رکھتی ہے اور اسے لسانی اعتبار سے صرف مسلمانوں سے وابستہ کرنا ایک زبردست غلطی ہوگی لیکن یہ نہیں بتاتے کہ یہ غلطی کس نے کی کب کی اور کیوں کی۔ ان کی خاموشی اشارہ کرتی ہے کہ یہ زبردست غلطی ہندوؤں نے کی جو بعد میں اردو دشمنی کا باعث بن گئی۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ یہ غلطی مسلمانوں نے کی اور انھوں نے اردو کو ہندوؤں کی زبان کبھی تسلیم نہیں کیا۔ حتیٰ کہ وہ آج بھی یہ غلطی کر رہے ہیں اور موصوف کی زبان میں صرف اتنا تسلیم کرتے ہیں کہ شمالی ہند کے ہندو، سکھ اور عیسائی بھی عام طور پر اسے استعمال کرتے رہے ہیں۔ اس حقیقت سے ہر اردو تاریخ نویس چشم پوشی کرتا رہا ہے کہ زبان کو عوام بناتے ہیں اور خواص صرف سدھارتے ہیں اور اردو علاقے میں ہمیشہ اکثریت ہندوؤں کی رہی ہے۔ بہ الفاظ دیگر اردو کو بنانے اور سدھارنے میں اکثریت ہندوؤں کی رہی لیکن مسلمانوں نے انہیں ہمیشہ دوسرے درجے کا شہری قرار دیا۔ شروع میں تاریخی اور سیاسی حالات کو اس رویے کے لئے ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے لیکن انگریزوں کے برسرِ اقتدار ہونے کے بعد یہ سیاسی اور تاریخی حالات بدل گئے اور تب تک عوام کی سطح پر اسلام بھی یہاں کے تہذیب و تمدن سے کسی حد تک مسخ ہو چکا تھا لیکن یہ غلط رویہ نہ بدلا۔ چنانچہ معروف بابائے اردو مولوی عبدالحق ۱۹۵۹ء میں فرماتے ہیں کہ اردو اصل اسلامی زبان ہے اور ہمارے بزرگوں کی بدولت وجود میں آئی۔ اس رویے نے نہ جانے کتنے ہندو میر غالب کا گلا گھونٹ دیا یا انہیں اپنی بے اعتنائی سے ہمیشہ کے لئے گمنامی کے غار میں مشکیں باندھ کر ڈال دیا اور بے شمار ہونہاروں کو ہندی کی طرف دھکیل دیا۔ ان ہونہاروں میں پہلا اہم نام بھارتیندو ہریش چندر کا ہے جو فارسی کے شاعر بھی تھے اس

کے برخلاف ہندی والوں نے اپنے مسلمان شاعروں اور ادیبوں کو ہمیشہ سر آنکھوں پر بٹھایا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر تاراچند رستوگی صاحب نے اپنے مضمون "اردو زبان و ادب کے متعلقات پر بھرپور نظر" میں ایک بڑا دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ موصوف کو دہلی میں ساہتیہ اکادمی کے اسسٹنٹ سکریٹری نے ہندی کے دو تین مشہور پروفیسروں سے متعارف کرایا۔ انھیں دنوں شان ہند نے ایک کتاب شائع کی تھی جس کا موضوع تھا "ہندی کے مسلم شعراء" ڈاکٹر رستوگی نے گفتگو کے دوران ان پروفیسروں کو مشورہ دیا کہ اس کتاب کا ہندی میں بھی ترجمہ کیا جائے۔ کچھ توقف کے بعد ایک ہندی پروفیسر نے جواب دیا "رستوگی جی! یہ فرق ہندی والوں میں نہیں ہے۔ ہم نے کبیر، ملک محمد جائسی، رس خان وغیرہ کو ہندی شاعر ہی کہا ہے۔ ہم ان کو مسلمان شاعر نہیں مانتے" اور اردو میں یہ حال ہے کہ نیاز فتحپوری صاحب جب فراق پر ایک توصیفی مضمون نگار میں لکھا تو اس کا عنوان تھا "اردو کا ایک ابھرتا ہوا ہندو شاعر" منشی پریم چند تو اس تنگ نظری سے پیچھا چھڑانے کے لئے ہندی کا دامن پکڑ بیٹھے اور دوسرے افسانہ نگاروں نے بھی ایسی زبان استعمال کرنا شروع کر دی جو دیوناگری رسم الخط میں بھی شائع ہو سکے اور مقبول عام کی سند حاصل کر سکے لیکن مجھ جیسے بدنصیب غیر مسلم اردو شاعر کہاں جائیں جن کے بزرگوں کی بھی مادری زبان اردو رہی ہے اور جن کے گھروں میں اردو رسم الخط سے ناواقف ہی نہیں بلکہ قطعی ناخواندہ خواتین بھی اردو بولتی رہی ہیں۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم اپنی اولادوں کو یہ ذلت کا ورثہ دینے کے عوض ہندی ادب کے ورثے کی طرف متوجہ کریں۔

انجینئر صاحب کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اردو زبان کو عموماً اور اردو ادب کو خصوصاً فرقہ پرستی سے کبھی تعلق نہیں رہا۔ کیا یہ آریہ سماج والوں نے شدھی کی تحریک میں جو اسلام کے خلاف تھی اردو کا استعمال نہیں کیا؟ کیا مسلمانوں نے "سب کے سب کافر ہیں جو قائل نہیں اس کے" جیسے مصرعے طرح دیکر اور خدا ذرا سی بات میں" بھوک کچوری" پر نالک سکوڑ کر اپنے سکولر ہونے کا ثبوت دیا ہے؟ کیا پنجاب میں سکھوں اور ہندوؤں نے اپنی مادری زبان پنجابی یا ہندی لکھوانے کے لئے اردو کا استعمال نہیں کیا؟ ان حقائق کی چشم پوشی کرنا اب بے سود ہی نہیں بلکہ خطرناک بھی ہے۔

اردو کی دوسری کمزوری خود انجینئر صاحب نے لکھ دی ہے یعنی اردو کا ادبی ورثہ فارسی ادب کی روایتوں سے مالا مال ہے۔ یہ اردو کی خوش نصیبی نہیں بلکہ بدنصیبی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فارسی ادب ایران پر ماضی بعید سے ہندوستانی تہذیب کے اس اثر کی صدائے بازگشت ہے جسے اسلام بھی زائل نہیں کر سکا۔ اس کی ایک مثال ہے ایران میں تصوف کا جنم لینا اور پروان چڑھنا ہے اور تازہ ترین مثال امام خمینی سے ایرانیوں کی اندھی عقیدت۔ اسلام بندے سے بندے کی اس درجہ عقیدت کو کفر قرار دیتا ہے۔ یہ کرشمہ ایران پر اس ہندوستانی تہذیب کے اثر کا ہے جس میں ہزاروں دیوی دیوتاؤں، آگ پانی زمین کے علاوہ آدمی جانور اور پیڑ پودوں کی پرستش بھی جائز ہے۔ جہاں توحید کے قائل بھی ہیں اور خدا کے وجود سے منکر بھی۔ جہاں نسلوں، عقیدوں، زبانوں ذات پات اور رسم و رواج کا شدید اختلاف رواداری میں مخل نہیں ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ زبان و ادب کی ترقی اسی وقت ممکن ہے جب [illegible]

تہذیب اور ادبی ورثے سے وابستہ ہوں اور غیر ملکوں سے دہی صنائع رعایت، تشبیہ، استعارہ یا تلمیح مستعار لیں جس کا اپنے یہاں فقدان ہو۔ اردو شاعری میں ایسا نہیں ہوا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اردو میں عظیم شاعری پیدا نہ ہو سکی اور مرحوم پروفیسر کلیم الدین احمد صاحب کہہ بیٹھے کہ عالمی ادب میں اردو کا کوئی مقام نہیں۔

اگر جو کچھ میں نے عرض کیا وہ سچ ہے تو ہمارے لئے مناسب یہ ہوگا کہ ہم سیاسی جماعتوں اور حکمرانوں پہ الزام تراشی سے گریز کریں نیز اپنی اور اپنے بزرگوں کی کوتاہ نظری سے اردو کو پہونچے ہوئے نقصان کا مداوہ کریں۔ کیا اردو کے ٹھیکیدار ایسا کرنا گوارا کریں گے۔ مجھے شک ہے کہ ایسا نہ ہو سکے گا۔ امید ہے آپ سب بخیر ہوں گے۔

آپکا ــــ بلراج حیرت (نئی دہلی)

○ مکرمی! تسلیم

"سہیل" کا تازہ شمارہ آج ہی ملا۔ نظموں کا حصہ وقیع اور مضامین معیاری ہیں: "نمود" آپ کی جگر سوزی آئینہ دار ہے۔ جگن ناتھ آزاد جیسے بزرگ شاعر کی تازہ تخلیق کمال سخن کا جاندار نمونہ ہے۔ نظم "پاکیزہ لہو" اتنی لہو کو گرماتی ہے وہ دل گداز ہی نہیں دل نواز بھی ہے یوں لگتا ہے کہ باغ و بہار وطن میں اک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ہے، جو فرحت انگیز ہی نہیں نکہت بیز بھی ہے۔ صاحب موصوف چند سال پہلے حیدر آباد کے دارالسلام کے سالانہ نعتیہ مشاعرے میں تہاں میں بھی مدعو تھا وہاں ملاقات ہوئی تھی پھر ڈاکٹر نا منظر مشہور نعت گو شاعر کے ساتھ دفتر اخبار سیاست حیدر آباد میں عابد صاحب جائنٹ ایڈیٹر اخبار سیاست کے اجلاس میں تفصیلی ملاقات رہی۔ ایک یادگار ملاقات ہے

کے پردے پر رقص کرنے لگیں ہیں۔

پروفیسر عنوان چشتی نے باوجود خرابی صحت کے ایک صحت مند و توانا نظم سے قارئین کو سرفراز فرمایا ہے۔ جو دلوں کو چھو لیتی ہے "پیچ رنگ" میں رنگ و رعنائی ہی نہیں بھرپور تازگی و تازہ کاری بھی ہے۔ غرض یہ نظم جمال و کمال کا دلکش مرقع ہے۔

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کے قلم کی روانی میں افکار تازہ کی لہریں دعوت فکر و نظر کا سامان فراہم کرتی ہیں ایسا لگتا ہے ڈاکٹر صاحب نے سلمان رشدی کے بدنام زمانہ ناول ختم کرنے بھی نہ پائے تھے کہ قلم کو ہاتھ میں لے لیا اور اپنے تاثرات قرطاس ابیض پر پھیلا دیا۔ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی اردو زبان و ادب کے فاضل نقاد ہی نہیں اسلامیات کے عالم فاضل بھی ہیں۔ معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب سے کس طرح چوک ہو گئی کہ SATANIC-VERSES کا ترجمہ "آیات ابلیسی" کیا اور اسے زیب داستان بنا دیا۔ دراں حالیکہ لفظ آیات کے محل استعمال سے اسلامیات کے عالم خوب واقف ہیں کہ یہ لفظ قرآن ہی کے لئے مخصوص ہے۔ کلام ابلیس کو آیات ابلیس کہنا سوئے ادبی نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ ترجمہ بے ربط و بے محل بلکہ بالائے فہم و دانش ہے۔ اسی لئے مولانا وحید الدین خاں صاحب نے "سلمان رشدی کا شیطانی کلام" کہا ہے جس پر ڈاکٹر صاحب نے توجہ نہیں فرمائی۔ یہ بھول چوک دانستہ نہیں غیر دانستہ ہے جس کو نظر انداز کرنا ہی احسن ہے۔

"ہندوستانی انگریز" سلمان رشدی کے ابلیسی ناول کے موضوع کو حساس، جذباتی یا سیاسی بازیگری تصور کرتا ہوں جو جدید کی فکر نظر کا حامل تو ہو سکتا ہے

لیکن دستورِ اسلامی کے تحت اسلامی عدالت ایسے مرتد کو سزائے موت کا حکم دیتی ہے۔ بشرطیکہ وہ مسلم ہو اور اس مملکت کی رعیت ہو چونکہ وہ "ہندوستانی انگریز" ہے اس لئے اس قانون کی زد سے محفوظ ہے نیز ارتداد کا فتوی بھی بے اثر ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی منطق کا مورخانہ حسن و جمال دیکھئے، وہ فرماتے ہیں

" رشدی نے جو کچھ کہا ہے وہ مستشرقین کی کتابوں سے ماخوذ ہے۔ گویا مستشرقین مخالفت کے باوجود عیسائی کے عیسائی رہے بالکل اسی طرح ابلیسیت کے باوجود رشدی کی اسلامیت پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ مزے کی بات ہے کہ اسلامیات کے مطالعہ نے ڈاکٹر صاحب کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ــــ وہ قرون وسطیٰ سے دامن جھٹک کر دورِ جدید میں آگئے۔ اسی لئے انھیں یہ کہنا پڑا " اس دورِ جدید میں رشدی کی ناول پر ہنگامہ آرائی سعی لاحاصل ہے" اب انھیں کس طرح سمجھائیں کہ یہ اندازِ فکر فاضلانہ نہیں عامیانہ ہے بلکہ حق و باطل کی ترازو میں باطلانہ قرار دیا جائے گا۔ کیا دستورِ اسلامی کی روشنی میں رشدی کا قول و فعل مجرمانہ نہیں ہے؟ اگر اس کا جواب مثبت میں ہے تو پھر یہ مسئلہ جذباتی یا سیاسی کس طرح سے ہوا۔ اگر یہ مسئلہ خالص قانونی و دستوری ہے تو اس بین الاقوامی ملزم اور بین الاسلامی مجرم کے ساتھ کس ملک کے دستور کے مطابق کارروائی کرنی چاہئے۔ کوئی ہمیں بتلائے کہ ہم سب اثنی کیا۔ کونسے ملک کا دستور، کون سی جماعت یا طبقے کا دستور اخلاق اس امر کی اجازت دیتا ہے کہ مجرم کے مجرمانہ قول و فعل کی پردہ پوشی کی جائے یا چشم پوشی کی جائے۔ اگر ابلیسیت سے چشم پوشی کی جائے تو پھر ابلیسیت کا سدباب کس طرح ہو۔ مہابھارت کرشن اور ارجن نے ابلیسیت کے سدباب کے لئے تلوار اٹھائی تھی۔ یہاں قلم اٹھانے کی بات تو دا کی ہے ڈاکٹر صاحب تو لب کشائی سے بھی منع فرما ہیں۔

محمد عبدالقادر ادیب، منگلور

○ محترمی! تسلیم

ماہنامہ سہیل گیا کا تازہ شمارہ فروری ۱۹۹۰ء موصول ہوا۔ "نمود" میں آپ نے ملک کی بقا اور انسانیت کے تحفظ کے لئے آواز اٹھا کر وقت کی سب سے بڑی ضرو سے روشناس کرایا ہے۔

غزلیں، نظمیں اور افسانے پسند آئے۔ مبارک اب کی بار آپ نے طباعت پر بھی خاص دھیان دیا ہے

مجھے اس خط میں دراصل محترم ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کے مضمون کے تعلق سے کچھ عرض کرنا ہے۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر صاحب میرے ان پسندیدہ ادیبوں سے ایک ہیں جن کی تحریریں بہت ذوق و شوق سے پڑھتا ہوں۔ ابھی آج ہی ڈاک سے "زبان و ادب" کا تازہ شم اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۸۹ء آیا ہے جس میں رستوگی صاحب کا بھی ایک مضمون "مغلیہ تہذیب زندہ جاوید ہے" جس میں صدیوں سے مورخین کے درمیان ایک رائج غلط (یعنی اکبر کے "دین الہٰی" کے متعلق) کے خلاف ڈاکٹر صاحب مستند تاریخی شواہد کی روشنی میں لکھا ہے اور "دین ا کے لفظ کو آئینِ اکبری کے انگریزی مترجم بلاک مین کی ذ اختراع بتلایا ہے۔ بہرحال یہ خاصے کام کی چیز ہے "زبا میں شامل ان کے مضمون کے ذیل میں عجیب مغالطہ کا بھی تذ

ہے۔ جنہیں سویڈلیشن اکیڈمی نے اپنی ۸۷ سالہ تاریخ میں
کے ناول "جیلاوی کے بچے" (موضوعہ ۱۹۵۹ء) کو بنیاد
ر ادب کا نوبل پرائز دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ
جیسے عربی ادیب ہیں جنہیں یہ اعزاز دیا گیا ہے" اور
پرائز کے سلسلے میں دو نام اور خلیل جبران، اور ابو ماضی
انہوں نے لئے ہیں۔ یہ ڈاکٹر صاحب سے تسامح ہو گیا
ہونکہ نجیب محفوظ پہلے عرب ادیب ہیں جنہیں یہ اعزاز عطا
ہے۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے ابو ماضی کے تعلق سے یہ لکھا
"آیات ابلیس کے بارے میں ان کی رائے لنظر سے نہیں
گی" جبکہ ایلیا ابو ماضی جو کہ ایک ممتاز ہجری ادیب و
عر ہیں ۱۹۵۷ء میں انتقال فرما چکے ہیں۔ اب کہاں سے
مان رشدی کے ناول کے بارے میں ان کی رائے نظر آئے
شاید محترم رستوگی سے یہ بھول ہو گئی ہے یا وہ رو
لکھ گئے ہیں۔ صحیح حقیقت حال کی خبر نہیں ڈاکٹر صاحب
ا پر توجہ دیں تو عنایت ہوگی۔

نیاز مند — عبدالحق حقانی القاسمی
علی گڑھ

○ مدیر محترم سہیل (ماہنامہ) گیا

برادرم افتخار امام صدیقی کے طفیل ماہنامہ سہیل
ہد ایک شمارے دیکھنے کا اتفاق ہوا تو انہیں قطر تک لے
۔ شہر خیال میں قیصر عثمانی کے خط کا آخری فقرہ تھا —
یل، کاغذ، کتابت اور طباعت کے اعتبار سے بھی قابل
نمائش بن جائے۔

اس شمارے میں صفحہ ۶ تا ۱۶ کچھ پڑھ نہیں پائے
۔ نصف صدی سے جس پرچے کو خون جگر دیا جاتا رہا لیکن
کے لئے ہماری اردو اکیڈمیاں کچھ نہیں کر پائی ہیں۔ اردو

کے ان اکھاڑوں کے بارے میں ضرور لکھئے گا۔ جہاں نئے
پرانے پہلوانان اردو "ڈنڈ پیل رہے ہیں۔ پرانے پہلوانوں
کو کبھی نئے قوت آزماؤں کو کچھ سکھتے وقت تو ہل ہی جاتے ہیں
مگر جو میدان سے دور ہیں ان کے دنگل کا تو کوئی انتظام ہی
نہیں۔ سہیل مواد اور سواد کے لحاظ سے اچھا لگا۔ اس کی اچھائی
قائم رکھنا ضروری ہے۔ اچھے لوگوں کی اچھی خاصی فہرست
نظر آتی ہے۔ مگر یہ جو نظر بد سے بچانے کی خاطر آپ اس کو
سجا نہیں رہے ہیں تو اردو پر بھی ظلم ہوگا۔ ہماری دعائیں
آپ کے ساتھ ہیں۔ ادارے کے تمام اراکین و معاونین تک
ہماری نیک خواہشات پہنچا دیں۔

طالب خیر — قاضی فراز احمد (کویت)

○ برادرم مسعود صاحب! التسلیم

سہیل کے تازہ شمارہ میں اپنی کہانی "پریدہ رنگ
رسیدہ" پھر پڑھی اور خود پر غصہ آیا کہ کسی زمانے میں، میں بھی صوفیوں
کے چکر میں اچھی بھلی کہانی کا ستیاناس کرنے پر تلا ہوا تھا۔
پریدہ رنگ ..... کی میرے پاس نقل تک نہیں تھی۔
اس کہانی کو میں نے شاید آئی۔ اے۔ سی میں لکھا تھا۔ ممکن ہے
کہ پڑھنے والے میری تازہ کہانی سمجھ لیں۔ اس لئے بطور
صفائی یہ خط لکھ دیا ہوں۔ میں پرانی اس نوع کی کہانیوں
کی اشاعت کے حق میں نہیں ہوں۔ اس لئے کہ صرف احساس
کو میں کہانی نہیں مانتا۔ ہمارے عہد کے زیادہ تر فنکاروں
کا المیہ یہی ہے کہ وہ ایسے ہی کہانی بانٹ بیٹھے ہیں۔
خدا کرے آپ بخیر ہوں۔
مشرف عالم ذوقی

○ عزیز گرامی! السلام علیکم

اللہ کرے آپ لوگ مع الخیر ہوں

سہیل کے تازہ شمارے (علیگڑھ) کے ساتھ خلوص نامہ بھی دستیاب ہوا۔ آپ کے ان چند جملوں میں ادریس بھائی کو مخلوص بیکراں محسوس کیا۔ اور ادریس بھائی خوابیدہ ہوئے دکھائی دیئے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ!

اس شمارے کی تقریباً ہر تخلیق جاندار ہے۔ مضامین خاص طور پر پسند آئے۔ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی صاحب ایک جگہ صحیح بات کہنے سے چوک گئے ہیں۔ ان کا ایک جملہ ہے "زمخشری کے یہاں جو کچھ ہے وہ مانگے کا اجالا ہے"۔ وہ جملہ یوں ہونا چاہئے تھا۔ "رشدی کے یہاں جو کچھ ہے وہ مانگے کا اندھیرا ہے" آخر اسلام دشمن مستشرقین کے پاس ہے ہی کیا ——— اندھیرا ہی اندھیرا!

کوشش کیجئے مثبت پہلو اور نیک قدریں زیادہ سے زیادہ چیزیں شائع ہوں۔ انشاء اللہ میں اسی موضوع پر آئندہ قریب میں ایک افسانہ بھجواؤں گا۔

عزیزی جمیل اور دوسرے صاحبان تک میرا سلام پہنچا دیجئے۔

نشاط الایمان (کلکتہ)

○ عزیزم مسعود منتظر، دعائیں

میری طبیعت گذشتہ آٹھ نو مہینے سے مستقل خراب ہے، کیا تفصیل لکھوں، کبھی کچھ کبھی کچھ۔ اب قدرے بہتر ہوں۔

سہیل ملتا رہتا ہے۔ اس کرم کے لئے شکر گزار ہوں۔ اس وقت جو ملک کی صورت حال ہے اس سے بھی دماغ پریشان رہتا ہے۔ آپ نے "نمونہ" کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے وہی میرے بھی دل کی آواز ہے۔ ڈاکٹر رستوگی نے اردو زبان و ادب کے تعلق سے فکر انگیز باتیں لکھی ہیں۔

امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔

خاکسار حسن نعیم (بمبئی)

○ مکرمی جمیل منظر صاحب، آداب و نیاز

سہیل کا تازہ شمارہ ملتفت نواز ہوا۔ یہ آپ کا کرم ہے کہ آپ مجھے رسالہ بھیج دیتے ہیں لیکن آج کے بحرانی دور میں اردو کا رسالہ بغیر قیمت ادا کئے حاصل کرنا گناہ عظیم سمجھتا ہوں۔ وسائل آمدنی بہت محدود رہے ہیں۔ سہیل ایک عرصہ سے میرا پسندیدہ رسالہ رہا ہے۔ خواہش کے باوجود اس کا خریدار نہیں بن سکا تھا سیفیہ کالج کی لائبریری میں اسے دیدار کرتے رہتے ہیں۔

چند ہفتہ پہلے جب اس کی توسیع خریداری کے لئے آپ کا خط ملا تو میں یہاں چند دوستوں میں اس کا تذکرہ کیا تھا خدا جانے کسی پر میری درخواست کا اثر ہوا یا نہیں بہرحال میں کوشش کروں گا کہ سہیل کو چند خریدار مہیا کر سکوں۔ آئندہ جولائی سے میں بھی برسر روزگار ہونے والا ہوں اس کے بعد رسالے کی تاحیات خریداری کے لئے چندہ ارسال کروں گا تاکہ بلا ناغہ رسالہ میرے مطالعے میں رہ سکے اور اس کو پڑھتے وقت میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہ رہے۔

آپ کا ——— یاور (بھوپال)

○ جناب بھائی صاحب، سلام و نیاز

سہیل سے میری ہمدردی ہمیشہ ہی رہے گی۔ اردو کے جرائد اقتصادی کشمکش میں ہیں چونکہ اردو کا بازار سرد ہے اردو والے بھی گھٹتے جا رہے ہیں لیکن ہمیشہ ایک جیسے دن نہیں رہتے۔ میں تو ساٹھ سال کا کھوسٹ ہو گیا ہوں کیا پتہ وہ وقت دیکھوں کہ نہیں لیکن مجھے قوی امید ہے اور میری پیشین گوئی بھی کہ اردو ہند کی قومی زبان ہوگی۔ عرض کیا تھا

کسی دن حکومت یہاں ایک ہوگی ؛ یہ تفریق قوم جہاں ایک ہوگی
نہ تحریر و تقریر میں فرق ہوگا ؛ قلم ایک ہوگا زبان ایک

ارمان ———




گھر کے ہر فرد کا محافظ
ایک حیرت انگیز پیش کش
چوٹ، موچ، درد، زخم، کٹنے، جلنے
ورم، ناگہانی حادثات اور بچوں
کی مالش میں کام آنے والا تیز اثر
اور فائدے بیشمار۔
قادری منجن
QADRI MANJAN
پائیریا، خون و پیپ کا آنا،
ہلتے ہوئے دانتوں کو جمانے
اور دانتوں کے جملہ امراض میں
اکسیر ہے۔
قادری منجن کے انعامی کوپن جمع کریں اور سوا لاکھ
مفت انعامات سے رسٹ واچ تک بالکل مفت
حاصل کریں۔ انعامی تفصیل کوپن پر درج
کر دی گئی ہے۔
(MONAMI ART, GAYA 80)


TEKKA
ROSE WATER
عطر مجموعہ
TEKKA
KEORA WATER
عطر فردوس
TRADE MARK
عرق کیوڑہ نمبر ۲۰۰۰
عرق گلاب نمبر ۵۰۰۰
Show Room-GAZIPUR STAR CHEMICAL WORKS
P-11 NEW HOWRAH BRIDGE APPROACH RD. CALCUTTA-1

بانی :- حافظ محمد عبد الرحمٰن سبحک منسھاروی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یادگار :- زین العابدین احمد و ادریس منسھاروی

٭ فہرست ٭

نمود ———— ۵
پیغام اقبال ایک جائزہ — ڈاکٹر تاراچرن رستوگی ۷
ویریندر پٹواری کا فن — منظور احمد بابا ۱۸
اور خواب ٹوٹ گئے — ویریندر پٹواری ۲۴
جیت — سازینہ ۲۵
غزلیں — علی عباس ازل، شفیع خاں راز انادی ۲۶
غزلیں — ظفر صدیقی، سید شکیل دسنوی ۲۷
غزلیں — مصطفیٰ مومن، شبیر احمد قرار ۲۸
غزلیں — شاہد اختر ۲۹
منشی جی — امرت رائے ۳۰
وہ واپس نہیں آیا — تبسم احمد نسیم ۳۲
نئی کتابوں کا تعارف — قیصر زماں ۲۵

شہر خیال ۳۹
ڈاکٹر تاراچرن رستوگی، بلراج حیرت
علی امام نقوی، صابر رومانی
منصور اعجاز

سہیل گیا
ماہنامہ

مجلس مشاورت

ڈاکٹر تاراچرن رستوگی
ڈاکٹر قمر رئیس
اصغر علی انجینیر
قیصر عثمانی
شاہد احمد شعیب
ڈاکٹر محمد مثنیٰ
ڈاکٹر علیم اللہ حالی

چیف ایڈیٹر :- مسعود منظر
ایڈیٹر :- جمیل منظر
معاونین :- شکیل احمد جمالی، عبد القیوم ابدالی
کتابت :- سید عبد الاحد گیاوی

شمارہ ۵ جلد ۵۵

بدل اشتراک
فی شمارہ .... ۳/= روپے
زر سالانہ .... ۳۶/= روپے
لائف ممبری .... ۵۰۱/= روپے

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ
ماہنامہ سہیل
ریور سائیڈ روڈ، گیا ۔ ۸۲۳۰۰۱
فون نمبر 2.873

نثری

ہمارا ملک
نراجیت کا شکار نظر آنے لگا ہے
فاشزم نے جیسے اپنا چہرہ واضح کر دیا ہے
سیاسی اور سماجی مسائل کو دیکھنے کی "نگاہ" اور "طریقۂ کار" اس طرح بدلا جا رہا ہے جیسے ملک کی رنگارنگ تہذیب اور مختلف الجہت کلچر کا خاتمہ اور ایک "سنسکرتی" کا عروج ہی زندگی کا نصب العین ہو
فاشسٹ قوتوں کو
نہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب و تمدن کی تشکیل کے تاریخی عوامل کا علم ہے اور نہ ہی وہ ملک کی سالمیت اور اتحاد میں ہندوستانی عوام کے مشترکہ تاریخی رول سے واقف ہیں۔
تاریخ کی سمت، رفتار اور ارتقا کو صحیح تناظر میں نہ دیکھنے کی ضد کرنے والے لوگ اپنی بینائی کھو چکے ہیں ـــــ وہ تاریک راہوں کے مسافر ہیں
تہذیب و تمدن کو BACKWARD MARCH کی ترغیب دینے والی یہ تخریبی قوتیں
ایک سراب کے پیچھے دوڑ رہی ہیں۔
کیونکہ
زندگی، تہذیب اور تمدن کا سفر ارتقا کی جانب ہوتا ہے۔
ارتقا کے اسی سفر سے معاشرے کی فطری تشکیل ہوتی ہے ـــ اور اس عمل میں صدیاں لگتی ہیں
اس حقیقت سے گریز کرنے والے
دراصل ملک کی سالمیت اور اتحاد کے دشمن ہوتے ہیں ـــــ
مشترکہ تہذیب کے حسن و جمال کے ان دشمنوں کو
تاریخ اپنے دائرے سے خارج کر دیتی ہے
اس صدی کے عظیم مفکر ـــــ تحریک آزادی اور مشترکہ تہذیب و تمدن کے سب سے بڑے علمبردار ـــــ مولانا ابوالکلام آزاد کی
دانشمندانہ آواز

ہمیں کبھی فراموش نہیں کرنی چاہئے

"ہماری ہزاروں سال کی مشترکہ زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچا ڈھال دیا ہے۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے ہیں۔ وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ یہ سانچہ ڈھل چکا اور قسمت کی مہریں اس پر لگ چکیں، ہم اسے پسند کریں یا نہ کریں مگر ہم ایک ہندوستانی قوم اور ناقابل تقسیم بن چکے ہیں۔

ہم میں اگر ایسے ہندو دماغ ہیں جو چاہتے ہیں کہ ہزار برس پہلے کی ہندو زندگی واپس لائیں تو .... انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں ــــ
اسی طرح اگر ایسے مسلمان دماغ موجود ہیں کہ اس گذری ہوئی تہذیب و معاشرت کو پھر تازہ کریں جو ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے تھے۔
تو میں ان سے کہوں گا کہ وہ اس خواب سے جس قدر جلد بیدار ہو جائیں، بہتر ہے۔
کیونکہ یہ ایک غیر قدرتی تخیل ہے اور حقیقت کی زمین میں ایسے خیالات اُگ نہیں سکتے۔"

★

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی

پیغام اقبال ———
ایک جائزہ ———

مطالعۂ اقبال کو متعدد دشواریوں اور ان گنت مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ تجارتی و سیاسی وجوہ، متعصبانہ مضمرات ذہنی و قلبی، سستی شہرت کے حصول کی کوشش وغیرہ اقبال شناسی کی راہ کو مسدود کرتے رہتے ہیں۔ تجارتی اور سیاسی وجوہ کو سمجھنے کے لئے زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ قیام پاکستان سے ایک علیحدہ مملکت تو معرض وجود میں آئی لیکن نظریاتی حدود کی نشان دہی فکر اقبال کو ایک مخصوص زاویہ دیئے بغیر ممکن نہ تھی لہذا وہاں کا تمام تر علم وفضل دو قومی نظریہ کو اچھالنے پر صرف کیا جانے لگا۔ حالات کی ستم ظریفی سمجھئے یا یوں کہئے کہ تاریخ بدلہ لیتی ہے۔ پاکستان میں اب یہ مسئلہ بڑی شدت اختیار کرنے لگا ہے اور اس موضوع پر کہ وہاں کی حکومت کو اسلامی کہا جائے یا پاکستانی کھل کر بحث ہونا شروع ہو گئی ہے۔ قدرے اعراض معاف، بلوچستان کے سرکردہ قائد بزنجو اور ان کے ہم خیال اشخاص جو خاصی بڑی تعداد میں ہیں علانیہ کہہ رہے ہیں کہ مملکت کو اسلامی مملکت کہنا غلط بھی ہے اور گمراہ کن بھی کیونکہ کسی دیگر ملک کے مسلمان کو مراعات و حقوق کس طرح دیئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً پاکستان ابھی تک بنگلہ دیش کے بہاری مسلمان کو قبول نہیں کر رہا ہے۔ خیر یہ تو پاکستانیوں کا اپنا مسئلہ جس کا حل انہیں کو تلاش کرنا ہے۔ مگر اس کے ایک ادبی FALL OUT یعنی تابکارانہ اثر سے روگردانی نہیں کی جا سکتی۔ کیا اس نوعیت کی بحث و تمحیص سے فکر اقبال کے خاصے بڑے حصے پر ایک استفہامیہ نشان ثبت نہیں ہو جاتا۔ یعنی فکر اقبال کا وہ دائرہ جو نیل کے ساحل سے لے کر کاشغر وغیرہ تک ایک ہی مسلم قوم کو اپنی آغوش پادرانہ میں جگہ دئے ہوئے نظر آتا ہے۔ اس تناظر میں ہمارے ملک کے وہ لوگ جو اقبال کو ہادی بناکر پیش کرنے کی سعی لاحاصل کرتے ہیں غالباً حقائق سے چشم پوشی کرنا ترک کر دیں۔ دفعتاً فوقتاً اقبال شناسی کی طرف بڑھتے قدموں کی چاپ، غنیمت ہے۔ اب سنائی دینے لگی ہے۔ مثلاً

"شاعر مشرق، حکیم مشرق، مفسر اسلام، شاعر ملت علامہ ——— اور وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب اردو کے مشہور اور بڑے شاعر علامہ اقبال کے خطابات ہیں۔ ان خطابات کی بھیڑ میں شاعر اقبال کھو گیا۔ اب اس شاعر کا ہاتھ پکڑ کر بھیڑ سے الگ کرنا بہت ہمت کا کام ہے۔ شاعری اور

شیوۂ پیغمبری کو الگ کرنے کی ضرورت ہے... نقادوں نے اقبال کو ڈھال بنا کر کام کرتے ہیں...." (شیوۂ پیغمبری اور شاعری از مظفر، آہنگ (گیا) شمارہ مارچ۔ اپریل ۷۸ء)

برادرم سہیل عظیم آبادی نے جو ریاست بہار کے معروف نیشلسٹ مسلمان، بہاری گنگا جمنی تہذیب کے نمائندے اور بہت بڑے ادیب تھے۔ مجھ پر اکثر و بیشتر کرم فرماتے رہتے تھے۔ مشوروں سے نوازتے اور کوتاہیوں پر میری سرزنش و گوشمالی کرتے رہتے تھے۔ اپنے دو تین مکاتیب میں اقبال سے متعلق اپنی رائے سے نوازا ہے۔ آراء چوں کہ بڑی معروضی و ناقدانہ ہیں۔ پیشِ خدمت کی جاتی ہیں۔ دو خطوں سے اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:-

"........ اقبال کا کلام پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بہت جذباتی انسان تھے۔
؎ خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے،
اس کے بعد دیوتا کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔
وہ ایک ہی معاملے میں بھی Consistent نظر آتے ہیں اور وہ ان کی جارحانہ مذہبیت ہے۔ مذہبیت بری چیز نہیں لیکن جارحیت بری چیز ضرور ہے اور اب ساری دنیا ہر مسلک میں جمہوریت چاہتی ہے...."

(مکتوب بنام رستوگی مورخہ ۱۷ اگست ۷۶ء)

"...... میرے نزدیک یہ اہم بات ہے کہ اقبال نے کیا دیا ہے اور اس کا اثر دوسروں نے کیا قبول کیا ہے۔ اس لحاظ سے اقبال کا اثر محدود ہے۔ اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ وہ مسلمانوں کے شاعر تھے تو ماننا پڑے گا کہ مسلمانوں پر کوئی اچھا اثر نہیں پڑا۔ اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ وہ شاعر کے علاوہ مسلمان رہنما تھے اور پاکستان کے بانی وہی تھے تو مجھے بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں کو انہوں نے برباد کر دیا اور ان پر یہ الزام تا قیامت رہے گا۔ ہندوستانی (تقسیم سے پہلے) مسلمان جو پہلے ایک اکائی تھے اب تین حصوں میں تقسیم ہو کر رہ گئے۔ اب سوچئے کہ مسلمان طاقتور ہوئے یا کمزور۔ میرے خیال میں تو برصغیر کے مسلمانوں کو دو سو سال پیچھے کر دیا ہے، فکری لحاظ سے بھی۔ پاکستان میں وہ اسلامی نظام قائم نہیں ہو سکتا جس کا خواب اقبال نے دیکھا تھا اور اس کی نفی بنگلہ دیش نے کر دی۔ بنگلہ دیش کے قیام سے یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ پاکستان میں ابتدائی اسلامی اخوت بھی قائم نہیں ہو سکی۔ دو قومی نظریے پر عمل درآمد ہونا تو بہت دور کی بات ہے..... یہ بڑی بدنصیبی ہے کہ بیسویں صدی کے ہندوستان میں دو بڑے شاعر اقبال اور ٹیگور دونوں REVIVALIST تھے۔ ٹیگور نے اسے RATIONALIZE کرنے کی کوشش کی جس طرح مہاتما گاندھی نے مذہب کو۔ لیکن اقبال نے اسے CRUDE بنا دیا اور اس شخص کے لئے اقبال کے پاس کچھ بھی نہیں جو مسلمان اور ان کے ذہن کا مسلمان نہیں ہے۔ ٹیگور کے یہاں ایسی بات نہیں ہے۔ ٹیگور کے یہاں روحانی فلسفے کے غلبے کے باوجود انسانیت بہت زیادہ زور ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ٹیگور برہمو سماجی تھے۔ اگر وہ

جا رہی تھی۔

بھی CARDS ہوتے تو پھر اقبال ہی جیسے ہوتے.....۔

(مکتوب بنام رستوگی۔ ۱۰ر اگست ۷۶ء)

معروف ایرانی ادیب آقائی مجتبیٰ مینوی نے اپنی [تصن]یف "اقبال لاہوری" میں فکر و شعر اقبال کا ناقدانہ جائزہ [لیت]ے ہوئے ایک بات خاص توجہ طلب کہی ہے جس کو ابھی تک [ار]دو کے بیشتر ادیب غالباً اپنے ذہن نشین نہیں کر سکے ہیں۔ حظ ہو یہ اقتباس :۔

> ...... اقبال نے یہ نہیں دیکھا کہ جو کچھ وہ ہٹلر یا دوسروں کے بارے میں کہتا ہے خود اس پر بھی وارد ہوتا ہے۔ اگر ان لوگوں نے رنگ نسل یا ملک کو اپنا معبود بنا لیا ہے اور اس سلسلے میں جنگ اور خونریزی کو جائز سمجھتے ہیں تو اقبال..... ملت یا دین کو اپنا معبود مانتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ..... (مسلمان) اپنے مخالفین سے جنگ کریں۔ (صفحات ۲۷۔۲۸، بزم اقبال لاہور، ترجمہ تبسم صوفی)

[اق]بال کے یہاں سے ابھرنے والے اس رجحان کو مجنوں گورکھپوری [نے] اپنی چھوٹی سی تصنیف "اقبال" میں زیر بحث لاتے ہوئے لکھا [ہے] ...... اقبال کی آفاقیت اور لا وطنیت نے ایک دوسرا [ان]داز عنوان اختیار کر لیا۔ یعنی وہ قوم پرستی اور وطنیت کے [تنگ] دائرے سے نکل کر مذہب و ملت کے تنگ دائرے میں پھنس گئے۔ [آخ]ری دور میں اقبال کی شاعری میں ایک اور میلان پیدا ہو گیا جو [نسل پرستی اور ن]ازیت سے بھی زیادہ خطرناک ہے اور جس کو ہم عقابیت [کہیں] گے اور جو فاشیت (FASCISM) ہے۔ جس طرح [اقب]ال کے تصور میں حجاز نے اپنا تسلط جما لیا تھا اسی طرح [ع]قاب، شاہین، شہباز اور چیتے جیسے سفاک جانوروں نے ان کی فکر و بصیرت میں ایک مرکزی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ وہ انسان میں بھی بالخصوص "مرد مومن" میں انہیں پھاڑ کھانے والے جانوروں کی خصلت دیکھنا چاہتے ہیں جسے کتنی لذت لے کر کہتے ہیں ؎

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں ۔

ذرا ہم آپ تھوڑی دیر کے لئے سوچیں کہ یہ غارتگرانہ میلان عام ہو جائے اور زبردستوں کو زیردستوں پر ایسا ہی جھپٹنے کا معاشرتی اور قانونی حق دے دیا جائے تو ہماری دنیا کا کیا حال ہوگا اور وہ رہنے کے لئے کیسی جگہ ہوگی؟ اقبال نے یہ بھی نہ سوچا کہ اگر تہذیب انسانی کی آخری تمثیل یہی ہوتی تو اس کو ہلاکو اور چنگیز کے دور سے آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں تھی (صفحات ۳۶۔۳۹۔ اقبال دہلی ۱۹۵۵ء)

فراق گورکھپوری کی رائے گرامی بھی خاص توجہ طلب ہے۔

> ..... فلسفۂ خودی کی تحریک سے متاثر ہو کر کیا اقبال غیر مسلم قوموں میں بھی فلسفۂ خودی کی تبلیغ کرنا چاہیں گے؟ ..... اقبال کی ملت زدگی یا جنون ملت یا ملیت اور اس کے ساتھ ساتھ انسان دوستی کا دعویٰ دو دلے پن کا شکار ہو کر رہ گیا ہے ..... اقبال کی فکری شخصیت باہم متصادم قوتوں کا شکار ہو کر رہ گئی ہے جسے انگریزی میں SPLIT PERSONALITY کہتے ہیں۔ وہ ایک طرف تو وحدت انسانی کے قائل تھے اور دل سے قائل تھے اور دوسری طرف ملت زدہ تھے ..... متحدہ

قوم پرستی اور وطن پرستی کے جھکوں
سے اقبال کی انسان دوستی کے پاؤں
ڈگمگانے لگے اور یہ ڈگمگاہٹ اتنی شدید
تھی کہ اقبال وطنیت کو ایک شیطانی قوت
سمجھنے لگے اور مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا
جہاں ہمارا، کہہ کر اپنی بے چین روح
کو تھپتھپانے لگے۔ یہ نہیں سوچا کہ کس طرح
سے دنیا کے مسلمان سارے جہاں کو اپنا
وطن بنالیں گے۔ تمام ملکوں میں گھس بیٹھ
کر انہیں فتح کر کے یا ان کی قائم شدہ
حکومتوں سے بغاوت کر کے یا کسی اور
طریقے سے...... آج کے پیچیدہ
مسائل کا حل اگر اقبال سے پوچھا جاتا تو
وہ ان مسائل کا حل پیش نہیں کر سکتے تھے۔
ان کی روحانی حس یا روحانی محسوسات
اور تجربے ان مسلم اور غیر مسلم سنتوں
اور فقیروں یا روحانیت کے علمبرداروں
کے برابر ہرگز نہیں جو اپنی جادو بیانی سے
دلوں کو تسخیر کر لیتے ہیں۔ ان کی روحانیت
ایک لکڑی اور ذہنی سے جو معجزہ نہیں بنتی۔
ان کے کلام میں شفا نہیں ہے۔ دوڑ دھوپ
اور جبلت کے نعرے ہیں...... انسانی
وحدت یا انسان کی سلامتی یا انسانوں
میں باہمی تعاون کبھی اس امر پر منحصر ہو سکے
گا کہ دنیا بھر کے انسان ایک خدا، ایک
اوتار، ایک رسول، ایک الہامی کتاب،
ایک مذہب، ایک رسم و رواج کو مانیں
یا ایک کعبہ اور کاشی کو مانیں......
(علامہ اقبال سے متعلق خوش فہمیاں - از رگھوپتی سہے
فراق گورکھپوری، آج کل دہلی۔ شمارہ نومبر ۷۷ء)
محولہ فوق اقتباسات کا لب و لباب یہی ہے کہ اقبال
عسکریت و جارحیت کو روا رکھنا چاہا۔ وہ اپنے دل
مطلب اپنی شاعری میں چھپا سکے نہ اپنی نثر میں۔ ڈائری
بعنوان STRAY REFLECTIONS جس
ان کے لڑکے نے تالیف کی ایسے اندراجات سے بھری ہوئی
جو صلح کل کے منافی اسپرٹ کے حامل ہیں۔ چند اندراجات
اردو ترجمہ میں درج ذیل ہیں۔
"تمام قومیں ہم پر تعصب کا الزام لگاتی
ہیں۔ میں اس الزام کو قبول کرتا ہوں بلکہ آگے
بڑھتے ہوئے کہتا ہوں کہ ہمارا تعصب درست
ہے...... تعصب حب مذہب ہے اور
حب وطنی دراصل ملک کے لئے تعصب ہے
(ص ۲۴-۲۵) ملحوظ رہے اقبال نے آخری
دو جملوں کو خط کشیدہ کیا ہے۔
اسلام بت پرستی کے خلاف بطور
احتجاج معرض وجود میں آیا ہے۔ حب الوطنی
لطیف بنیادی بت پرستی و خدا سازی کے
علاوہ اور کیا ہے (ص ۲۶)
اورنگ زیب کی سیاسی ذہانت کا دائرہ
بہت وسیع تھا.... گزشتہ مسلم حکمرانوں
کی تاریخ نے اورنگ زیب کو یہ سکھایا تھا کہ ہندوستان
میں اسلام کی قوت کا انحصار جیسا کہ اس کے
جد امجد اکبر کا خیال تھا۔ عوام کی خیر سگالی پر
اتنا نہ تھا جتنا حکمران قوم کی طاقت پر تھا،

مگر ایسی گہری سیاسی بصیرت کا حامل ہوتے
ہوئے بھی وہ اپنے اباد اجداد کی غلط کاریوں
کا ازالہ نہ کر سکا..... بایں ہمہ اس کو
ہندوستان میں مسلمان قومیت کی داغ بیل
ڈالنے والا تصور کرنا چاہئے۔ (صہ ۴۴)

طاقت صداقت سے زیادہ یزدانی ہے۔ خدا
طاقت ہے لہٰذا تم بھی اپنے عرشی آبا کی طرح
ہو ــــ (صہ ۹۰)
جہاں طاقت نے باطل کو چھوا اور باطل
صداقت میں تبدیل ہوا (صہ ۹۲)

مسیحیت کے نزدیک خدا صداقت ہے۔ جبکہ اسلام
اس کو بحیثیت طاقت تصور کرتا ہے....
میری رائے ہے...... خدا تاریخ میں محبت
سے زیادہ بحیثیت طاقت مکشوف ہوتا ہے۔
...... تاریخی تجربہ کی روشنی میں خدا کو زیادہ
تر بحیثیت طاقت ہی سمجھا جاتا ہے....
(ص ۱۰۱)
تحمل و بردباری نیز مطابقت (یعنی اعتقاد
کے بغیر عقیدہ سے مطابقت) سب سے زیادہ
سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔ اگر تمہاری یہی
وضع ہے تو خاموش رہو اور کبھی اپنے موقف
کی دفاع مت کرو۔" (صہ ۱۱۳)

فلسفہ منطق حق کو کہتے ہیں اور تاریخ
[illegible]

کے اصول زیادہ صحیح معلوم ہوتے ہیں۔
(صہ ۳۵)
ڈائری سے لئے گئے درج بالا مندرجات کے ساتھ
جاوید اقبال کے خیالات جو انہوں نے ڈائری کے پیش لفظ
کے تحت ظاہر کئے ہیں، ملاحظہ ہوں۔
.... اگر اقبال اپنے تجریدی و
بے پیکر سیاسی نظریہ اور نصب العین کی
تکمیل ہونے تک یعنی قیام پاکستان تک
زندہ رہتے تو یہ یقین ہے کہ انہوں نے
اپنے نظریہ و نصب العین کو ترقی دے
کر ایک منزل پر پہنچا دیا ہوتا جس سے
پاکستانی قومیت کی داغ بیل پڑتی۔ لیکن
جب ہندوستانی مسلمان برطانیہ اور ہندوؤں
سے آزادی حاصل کرنے کے لئے جدوجہد
میں مصروف تھے اقبال رحلت فرما گئے۔
وہ زمانہ ایسا تھا کہ برصغیر ہندوستان
میں علاقائی قومیت یا وطن پرستی کے چکر
میں پڑ کر مسلمان ہندو اکثریت میں مدغم ہو کر
ایک مخصوص اکائی کی حیثیت سے بالکل
نیست و نابود ہو سکتے تھے لہٰذا اقبال
نے علاقائی قومیت یا وطن پرستی کی تردید
کے لئے مذہبی و فلسفیانہ جواز پیش کرنے
کے لئے سرگرم کوشش کی حالانکہ انہوں
نے مشرق وسطیٰ کے ممالک میں قومیت
اور وطن پرستی کے فروغ کو درست قرار
دیا۔ اقبال کے الفاظ ہیں"........
[illegible]

اقلیت میں ہوں، قومیت ایک مسئلہ بن
جاتی ہے۔۔۔۔مسلم اکثریتی ملکوں میں
اسلام قومیت سے مطابقت پیدا کرسکتا
ہے کیونکہ وہاں اسلام اور قومیت عملاً
ایک ہی ہو جاتے ہیں۔ اقلیتی ملکوں میں ایک
تہذیبی اکائی کی حیثیت سے خود ارادیت
کی تلاش درست ہے۔۔۔۔"

(Stray Reflection, Lahor, 1961.)

یعنی بقول جاوید اقبال نیز محمد اقبال، بالفاظ دیگر، مسلمانوں کے لئے وطن پرستی وہیں جائز ہے جہاں وہ اکثریت میں ہوں۔ "صرف مسلم اکثریتی ملکوں میں اسلام قومیت سے مطابقت پیدا کرسکتا ہے" اقبال کے پیغام پر تعارف لکھتے ہوئے۔ عبدالمجید سالک (بی۔اے)، منجملہ دیگر امور لکھا ہے کہ "۔۔۔۔اقبال کی تعلیمات کی متوازی تلقینات مشرق میں تلاش کریں یا مغرب میں لیکن یہ حقیقت۔۔۔۔ہے کہ وہ اسی پیغام کا حامل تھا جو آج سے چودہ صدی پہلے محمد رسول اللہ نے انسان کو دیا تھا۔ اسی میں تعمیر خودی ہے، اسی میں تہذیب انسانی ہے، اسی میں قوت تسخیر ہے اور اسی میں ارتقائے اخلاق روحانیت ہے اور اقبال اس کی صحیح تر کا مبلغ و مفسر ہے۔ اس رائے سے متعلق کریم اللہ پالوی نے اپنے مضمون "تصورات اقبال کا سرسری جائزہ" (نگار لکھنؤ، جنوری۔فروری ۱۹۶۳ء) میں بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ لکھا ہے کہ "لیکن یہ مقام وانتقاد مبلغ کا تو ہو سکتا ہے شاعر کا نہیں اور جب ایک غیر مسلم اسے یہ کہکر جھنجھوڑتا ہے کہ دنیا میں انسان ایک ہی ہے اور اس کی ترقی کی سعی میں مذہب و ملت کا اختلاف درست نہیں تو اقبال کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہوتا، چنانچہ اس زمانے میں ایک شاعر نے اقبال سے ان الفاظ میں خطاب کیا تھا۔

تجھے فلسطین و قرطبہ سے بڑی محبت ہے جانتا ہوں
مگر ہے گنگا کی سرزمیں سے سلوک تیرا مخاصمانہ
اسی نے پالا، اسی نے پوسا، اسی نے بخشی تجھے جوانی
تو دل کی آنکھوں سے دیکھ ان کو بتانے میں مخلصانہ
اگر یہ جنت ہے جنتی تو، اگر یہ دوزخ ہے دوزخی تو
یہ قول میرا ہے عاشقانہ یہ راز میرا ہے محرمانہ

کریم اللہ پالوی نے اپنے مذکورہ مضمون میں مولانا محمد علی جوہر کی تنقید اس تقریر پر جو اقبال نے سٹر اوڈگلوی کی حمایت میں پنجاب کونسل میں کی، نقل کی ہے۔ جو فی الواقع جاذب توجہ ہے مولانا موصوف نے فرمایا کہ "ڈاکٹر سر محمد اقبال چاہتے ہیں کہ ہندوستان جو بظاہر اب لاالہ جیت رائے کا ہے۔ پھر سٹر اوڈگلوی کا ہو جائے۔ یہ نسخہ ایک طبیب حاذق کا ہے جس کا جی چاہے اسے استعمال کرے لیکن مجھ جیسے عطائی کو اس سے شفا کی امید نہیں۔"

اقبال یورپ سے واپس آنے پر ہندوستان کی متحدہ قومیت کے مخالف ہو گئے تھے۔ اور وہ متحدہ قومیت کو مسلمان دشمن سمجھنے لگے ۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

مولانا ابوالکلام آزاد نے اس پر اچھا تبصرہ کیا تھا کہ "ہماری ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچا ڈھال دیا ہے۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ یہ سانچہ ڈھل چکا اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی۔ ہم اسے پسند کریں یا نہ کریں۔ مگر اب ہم ایک ہندوستانی قوم اور ناقابل تقسیم بن چکے ہیں۔۔۔۔۔"

ہم میں اگر ایسے جنوں دماغ ہیں جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی منجمد زندگی واپس لائیں تو انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں اور وہ پورا ہونے والا نہیں۔ اسی طرح ایسے مسلمان دماغ موجود ہیں کہ اس گذری ہوئی تہذیب و معاشرت کو پھر تازہ کریں جو ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے تھے تو میں ان سے کہوں گا کہ اس خواب سے جس قدر جلد بیدار ہو جائیں بہتر ہے۔ کیونکہ یہ ایک غیر قدرتی تخیل ہے اور حقیقت کی زمین میں ایسے خیالات اُگ نہیں سکتے۔"

"اقبال کے سیاسی رجحانات" (نگار جنوری فروری ۶۲ء) میں نیاز فتح پوری یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے کہ ...... قیام پاکستان کے محرک اول وہی تھے۔ اس سے انکار ممکن نہیں کہ اقبال بڑے راسخ العقیدہ مسلمان تھے لیکن ان کی اس مذہبی پختگی کا تعلق شعائر اسلامی Passive یا اخلاقی تعلیم سے اتنا زیادہ نہ تھا جتنا تاریخ اسلام اور اسلامی فتوحات سے، ان کے یہاں ہم کو عہد سعادت کی اخلاقی زندگی کا درس بہت کم ملتا ہے اور مسلمانوں کے ملوکانہ تسلط و اقتدار سے زیادہ یہاں تک کہ کبھی کبھی وہ اس جذبہ سے اس قدر مغلوب ہو گئے کہ خود شمشیر کی ثنا گستری پر اتر آئے۔ ...... یہی وہ چیز تھی جس نے ان کے یہاں شاہین کی تخلیق کی جو، سیر کو نہیں لاتا نگاہ میں...... "مسجد قرطبہ"... اقبال کا غیر فانی شاہکار ہے اور اس میں جوش و ولولہ پایا جاتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ مسجد قرطبہ کو دیکھ کر مسلمانوں کی سیاسی حکومت و اقتدار کی تصویر ... اور فاتح مرد مسلمان کی یاد میں بے اختیار ان کے قلم سے یہ بھی نکل گیا کہ

اس کی زمیں بے حدود اس کا افق بے ثغور
اس کے سمندر کی موج دجلہ و دینوب و نیل
ساقی ارباب ذوق، فارس میدان شوق
بادہ ہے اس کا رحیق تیغ ہے اس کی اصیل

اس میں شک نہیں اقبال بڑا ماہر شاعر تھا اور بڑا دردمند دل انھوں نے پایا تھا لیکن اس دردمندی کا تعلق اسلام سے زیادہ مسلم قوم سے تھا۔ وہ یہ تو ضرور چاہتے تھے کہ مسلمان ایک بار پھر دنیا پر چھا جائیں، لیکن اسلام پھر کیونکر زندہ ہو، اس پر انھوں نے کم غور کیا..." (نگار لکھنؤ، جنوری فروری ۶۲)

اگر نیاز فتح پوری، جو محفوظ سے پاکستان جانے کے لئے پر تول رہے تھے اور نگار لکھنؤ سے اور کراچی دونوں جگہ سے شائع ہونے لگا تھا، اقبال کو قیام پاکستان کا محرک اول سمجھتے تھے تو خالد لطیف گویا (حلقہ بگوش اسلام ہونے سے پہلے کنہیا لال گویا) کی رائے میں کل مملکت پاکستان کو اقبال کا حقیقتاً مقبرہ سمجھنا چاہئے...... وہ ایک مایوس اور دل برداشتہ شخص تھے کیونکہ ان کی خانگی زندگی خوشگوار نہ تھی۔ اپنے بڑے لڑکے سے ان کے خاصے سنجیدہ اختلافات تھے...... اقبال نے اپنی عمر سے بہت کم عمر کی لڑکی سے شادی کر لی تھی جس سے دوسرے مسائل پیدا ہو گئے۔ ان کی موت ایک اکیلے اور مایوس آدمی کی موت تھی ــــ بہ حیثیت وکیل کی بہ نسبت اقبال کو بہ حیثیت شاعر ہی سمجھا جانا چاہئے۔

(K.L. Gauba Friends and Foes, New Delhi - 1974 - 144-145) (اس سے کنہیا لال گویا، جلد معتز محاف، یکم مارچ ۱۹۳۳ء کو اقبال کی موجودگی

میں علاقہ بگوش اسلام ہوئے اوران کا اسلامی نام خالد لطیف° اقبال ہی نے تجویز کیا تھا۔ (صفحہ ۱۰۵ اور صفحہ ۲۳۰) (صفحہ ۵۵۵)۔ گویا کہ اقبال سے خاصے اچھے مراسم تھے لہٰذا اقبال سے متعلق ان کی رائے کو بھی اقبال کا تجزیہ کرتے وقت پیش نظر رکھنا چاہئے بالخصوص یہ بات کہ مملکت پاکستان کو اقبال کا حقیقی مقبرہ تصور کیا جانا چاہئے اور یہ بات کہ اقبال دل برداشتہ اور ایک مایوس اکیلے شخص تھے وغیرہ موخرالذکر حصے میں نفسیاتی پہلو بھی ہے۔ جس کو ہنوز اقبالیات کے تجزیہ میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔

بات سے بات نکلتی ہے۔ نفسیاتی جائزہ کا ذکر آتے چند ایسے واقعات کی طرف توجہ منتقل ہونے لگی جو اقبال سے متعلق کوئی اچھی رائے قائم کرنے میں مانع آنے لگتے ہیں، قتل چاہے وجہ جو کچھ بھی ہو، ہمارے معاشرے میں قابل تعزیر جرم ہے۔ روزگار فقیر حصہ دوم میں ایک واقعہ درج ہے کہ ستمبر ۱۹۳۲ء میں ایک شخص جس کا نام نتھو رام تھا اور جس پر اہانت رسول کا مقدمہ چل رہا تھا اس کو کسی عبدالقیوم نے چاقو سے ہلاک کر دیا۔ عبدالقیوم کو پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ لوگوں نے اقبال سے کہا کہ وائسرائے سے اس کی جان بخشی کرا دیں اقبال نے جواب میں کہا۔ "میں ایسے مسلمان کے لئے وائسرائے کی خوشامد کروں، جو زندہ رہا تو غازی ہے اور مر گیا تو شہید ہے"۔ اگر نتھو رام نے واقعی رسول اللہ کی شان میں بدکلامی کی تو تو کوئی عقل سلیم رکھنے والا ہندو ایسے شخص کے فعل کو قابل صد مذمت ہی سمجھے گا اور اس کو بھرپور سزا ضرور ملنا چاہئے۔ بایں ہمہ، اہانت ثابت ہونے کے بیشتر اس کا قتل کیا جانا کچھ عجب سا لگتا ہے۔ اس پر مستزاد اقبال کا ریمارک، جو غالباً کچھ جذباتی تھا، [illegible]

صرف نفسیاتی تھی اور بس! اس کے ساتھ ہی اس سوال کہ کیا اقبال کی وائسرائے تک ایسی رسائی تھی کہ وہ کورٹ کے فیصلہ کو بدلوا دیتے۔ نفی ہی میں جواب کی جانب جھلکتا معلوم ہوتی ہے۔ غالباً کسی ہندوستانی کو کبھی اتنی حد تک کسی وائسرائے نے منہ نہیں لگایا تھا۔ قیاس اسی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اقبال نے غالباً جواب نہ دیا ہو۔ اس واقعہ سے ایک اور واقعہ یاد آنے لگتا ہے۔ ایک کتب ناشر مہاشے راج پال کو ۶ اپریل ۱۹۲۹ء میں علم دین نامی ایک شخص نے اس لئے قتل کر دیا کہ انہوں نے کوئی مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچانے والی کتاب شائع کی تھی۔ اس واقعہ کو قادیان سے نکلنے والے ایک ہفتہ وار میں جو قادیانیوں کا ترجمان تھا اس سرخی کے تحت شائع کیا کہ ہر ہندو راجپال ہے۔ ہر مسلمان کو علم دین ہونا چاہئے۔ کہا جاتا ہے کہ توجہ مبذول کرائے جانے پر اقبال نے کہا "پہلی مرتبہ قادیانیوں نے کوئی ٹھیک بات کہی ہے۔ ملحوظ رہے، اقبال سنی تھے مگر ان کے خاندان کا ایک حصہ قادیانی تحریک سے متاثر ہو کر قادیانی عقائد پر ایمان لے آیا تھا۔ دروغ برگردن راوی۔

آریہ سماج کے معروف لیڈر سوامی شردھانند سرسوتی کو ۲۳ دسمبر ۱۹۲۶ء کو عبدالرشید نے دہلی آریہ سماج مندر میں قتل کر دیا۔ قاتل کا نام عبدالرشید تھا۔ قاتل کے وکیل آصف علی کو متعدد بار بغیر طلب اقبال نے یہ مشورہ دیا کہ ملزم کو پاگل ثابت کرنے کے لئے دلائل پر زور دینا چاہئے۔ بایں ہمہ ملزم کو سزائے موت سنائی گئی۔ ایک زمانہ پہلے کی بات ہے۔ بریلی سے شائع ہونے والے ہفتہ وار "شعاع" میں تفصیلات شائع ہوئی تھیں۔ مذکورہ شمارہ پیش نظر نہیں ہے مگر حافظے میں

لہ۔ صحیفہ [illegible] ۱۰۱ [illegible]

مجھ جیسا اشتراکی جدلیاتی فلسفے کا حامی مذہب
۔ مذہبی جنون کو پسندیدہ نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا۔
ہب کے ان منفیانہ پہلو کو غالباً سب ہی برا کہیں گے۔
سف سلیم چشتی کی اگر یہ بات صحیح ہے کہ اقبال نے
سے ایک مرتبہ یہ کہا تھا کہ انسان اور مسلم ہم معنی
فاظ ہیں جو مسلمان نہیں وہ انسان نہیں" (شرح
یامِ مشرق صفحہ ۳۶۵) تو اقبال سے متعلق درج بالا
عیت کی باتوں پر بھی یقین سا ہونے لگتا ہے۔

"...... اگر اقبال کی نفسیات پر دقتِ نظر
طالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے عوام کا نمائندہ ہونے
ے باوجود، وہ شاہ پرست اور شاہانہ جاہ و جلال کا پرستار
ہے، وہ سلاطین کو خدا کا سایہ جانتا اور انہیں اعلیٰ
حضرت کے جلیل القدر خطاب سے مخاطب کرتا ہے۔
ورنگ زیب کو وہ مجدد اور اسلامی ترکش کا آخری
ر شمار کرتے ہوئے اس کی برادر کشی اور پدر آزاری کو
ے قلم بھول جاتا ہے اسی عقیدت مندی کا نتیجہ تھا
۔ اس نے پیامِ مشرق جیسی زندۂ جاوید کتاب کو امیر
مان اللہ خان کے نام معنون کر کے اس کی شان میں (ایسے)
شعار کہے ہیں جن کا وہ کسی طرح بھی مستحق نہیں تھا....
درشاہ ۔ سابق شاہ افغانستان نے ایک بار....
بل آنے کی دعوت تھی۔ اس موقع پر بادشاہ نے
قبال کو علیحدگی میں ملاقات کا موقع دیا۔ اس کی کیفیت
سے متعلق) نظم کے پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے
۔ اگر اقبال کبھی پچھلے زمانے میں پیدا ہوتا تو یقیناً اس کے
[illegible] بادشاہوں کی مدح سرائی کے سوا کچھ نہ ہوتا
اشعار میں جو منظر بیان کیا گیا ہے سب سے زیادہ تکلیف
[illegible]

کو بوسہ دیتا ہے۔ اقبال کی اس ذہنی کیفیت کو ان کی
اقتصادی بدحالی نے زیادہ ابھارا وہ فکر معاش کے ہاتھوں
ہمیشہ پریشان رہے۔ آخر عمر میں رسول کریم کے روضہ مبارک
کی زیارت کا شوق جنون کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ لیکن زاد
راہ کی کمی کی وجہ سے یہ تمنا پوری نہ ہو سکی۔ اسی زمانے میں
ڈاکٹر راس مسعود والئ بھوپال کی سرکار میں ملازم تھے۔ اقبال
سے ان کے تعلقات نہایت دوستانہ تھے، چنانچہ ان کی سفارش
سے دربار بھوپال نے اقبال کو پانچسو روپے ماہوار وظیفہ
دینا منظور کر لیا۔ اقبال اس "بندہ نوازی" سے اتنے مسرور
ہوئے کہ اس فرمان کو جو انگریزی میں تھا فریم کرا کر رکھ دیا
تاکہ آنے جانے والے اس کا مطالعہ کر سکیں۔ انہوں نے
ضربِ کلیم کو نواب حمید اللہ خاں کے نام معنون کیا۔ انہیں
اعلیٰ حضرت کے بھاری بھرکم الفاظ سے مخاطب کیا اور ان
کی مدح میں...... غلو سے کام لیا — اب اشتراکیت
کو لیجئے اس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ مختلف طبقوں کے
اشتراکِ عمل سے معاشرے کو ایسے سانچے میں ڈھالا جائے
کہ دولت کی تقسیم مساوی ہو..... آغاز اسلام میں بلاشبہ
اسلامی معاشرہ اس طرح کے سانچے میں ڈھل چکا تھا اور
یہ حالات کم و بیش خلافتِ راشدہ کے اختتام تک قائم رہے۔
...... دولت کی تقسیم ایسی تھی کہ اہلِ ثروت کو زکوٰۃ اور
صدقہ قبول کرنے والا کوئی نہ ملتا تھا۔ اقبال اسی تمدن کی
طرف دعوتِ فکر دیتا ہے۔ بلاشبہ اسلامی معاشرے
کا اس دور کی حیثیت معیاری ہے لیکن اس کا اتنی جلدی مٹ
جانا ہی اس امر کا ثبوت ہے کہ انسانی سوسائٹی میں اس
نظام کا کوئی مقام نہیں تھا۔ جب ہم اس عہد کا ذکر کرتے
ہیں تو قومی افتخار کی گردن تن جاتی ہے لیکن یہ بھول جاتے
[illegible] کہ معاشرہ جغرافیائی اور اقتصادی حالات کا

پیداوار ہوتا ہے، اس وقت ملک کی آبادی چیدا کہ اشخاص
سے زیادہ نہ تھی ضروریات زندگی مختصر تھے لیکن جب اسی
معاشی کو اقوام عالم سے واسطہ پڑا تو طور طریقے بدل گئے
جھونپڑیوں کی جگہ محلات نے، کھیس کی جگہ ریشم نے اور
پانی کی جگہ شراب نے لی اور وہی سماں نظر آنے لگا جو دولت
ثروت کا منطقی نتیجہ ہے۔ ہٹلر نے بھی اپنے زمانۂ اقتدار میں
ایک ایسے ہی مثالی معاشرے کے قیام کی کوشش کی تھی
جس کا نام قومی اشتراکیت تھا۔ غریبوں کے لئے حکومت
ضروریات زندگی کی اپیل کرتی اور امراء بڑی فیاضی سے اس
کار ثواب میں حصہ لیتے لیکن اس وقتی کامیابی کی وجہ اس
نظام کی مقبولیت نہیں تھی بلکہ خود ہٹلر کی ہر دل عزیزی۔
نازی پارٹی کا اقتدار، اور سب سے زیادہ، اس کی
ہیبت کی تھی۔ اقبال اس نظام کو دنیا پر مسلط کرنا چاہتا
ہے۔ چنانچہ پیام مشرق میں امیر امان اللہ خان کو
مخاطب کر کے کہتا ہے۔

اے ترا فطرت ضمیر پاک داد
از غم دیں سینۂ صد چاک داد
تازہ کن آئین صدیق و عمر
چوں صبا بر لالۂ صحرا گذر

(اقبال اور نظریۂ جمہوریت از غلام ربانی عزیز، نسل نو
جنوری۔ فروری ۱۹۶۰ء)

"سید احتشام حسین کی درج ذیل رائے بھی
کم وزنی نہیں ہے۔

"......... اقبال کے طوفان بدوش خیالات
ہماری رگوں میں خون کی گردش تیز کر دیتے ہیں، لیکن
منزل کی راہ نہیں بتلاتے، ان کا فقر غیور ہونے کے باوجود
... نادر شاہ اور ظاہر شاہ کے سامنے جھک جاتا
ہے۔ اور ان میں یہ روحانی صفات ڈھونڈھ نکالا
ہے جس کے وہ حامل ہیں........ اقبال کا انسان تو
تخلیق کا پیکر ہونے، محنت کش اور کم آزار ہونے کے با...
خونریز بھی ہے اور اس تصور میں سرمایہ دارانہ ا...
کی تصویر نظر آتی ہے........ اگر انہوں نے سما...
زندگی کی کشمکش کو طبقاتی لوٹ کھسوٹ اور سام...
اور سرمایہ داری کے استحصال کی روشنی میں دیکھا
اگر عوام کی زندگی کے معمولی مطالبات پر نگاہ ڈالی ہو
تو وہ ہمیں واضح طور پر بتا سکتے کہ روحانی ارتقا
سے پہلے زندہ رہنے کے لئے اپنے ہی سماجی نظام ...
شدید کشمکش کی ضرورت ہے اور اس وقت ان
اشاروں کے اثباتی عملی پہلو نمایاں ہو کر یہ بھی
کہ انسان اپنی عظمت کے اظہار کے لئے کون سی راہ
اختیار کر سکتا، اور ایک غیر متوازی، غیر منصفانہ
زندگی کے بندھنوں کو کس طرح توڑ سکتا ہے" (...
کی شاعری عملی نقطہ نظر سے از احتشام حسین)
اب تنقیدی منتجات پر پہنچنے سے پہلے ولفر...
کینٹول سمتھ (Wilfred Cantwell Smith
کی ... تصنیف ...Islam in Modern History
(... New York 1963) سے رجوع فرمائیں
"......... ۱۹ ویں صدی کے اوائل سے ہندو...
پڑے مسلم معاشرہ میں ۲۰ ویں صدی سے ابال آنے لگا
اور یہ کوئی کم اہم کامیابی نہیں ہے۔ تبدیلی کے آثار ہر
جگہ دیکھے جا سکتے تھے۔ اور اقبال نے اس صورت حال...
تمام تر زینت اشتعال اور وجدانی جارحیت نے...
... نئے سانچے میں ڈھالا...... اس نے عشق
کو اللہ اور عقائد ... ڈھالا ... مسلم تشدد...

۱۹۲۶ء کے قتل عام کی روشنی میں اقبال کی بے روک ٹوک اسلامی جذبے سے بھرپور نظموں کو پڑھ کر پریشان کن پراگندی سے مملو تجربات کا احساس کروٹیں لینے لگتا ہے... (ص ۹۵)

سہیل عظیم آبادی، فراق گورکھپوری، صفدر، مجتبیٰ حسینوی، مجنوں گورکھپوری، نیاز فتح پوری، کریم اللہ پالوی، خالد لطیف گوبا، احتشام حسین، یوسف سلیم چشتی، غلام ربانی عزیز، ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر وغیرہ کی نگارشات سے محولہ اقتباسات اور اقبال کی ڈائری کے درج فوق اندرجات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اقبال کی "غلط آہنگی" سے سر پوشش کھلنے لگتا ہے۔ اقبال نے کہا ہے ؎

صاحب ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش

کیا اقتباسات سے مکشوف ہونے والی "غلط آہنگی" کو فرشتہ، جبریل، غیبی سفیر وغیرہ معنوں میں "سروش" کہنا مناسب ہوگا؟ یہ معمولی سوال نہیں ہے۔ ہندوستان کے سیکولر نظام میں اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا بالخصوص اس وقت جب، کچھ نام نہاد [illegible] د پیغام اقبال کی بات کرنے لگتے ہیں اور دوسروں سے بھی یہ امید کرتے ہیں کہ وہ اقبال کو ہادی و مرشد سمجھیں

فکر اقبال کا سیاسی پس منظر، ۱۹۳۱ء سے اقبال کی سرگرم مسلم لیگ وابستگی، متعصبانہ ذہنی رجحانات اور دماغ پر گہرے اقبال وغیرہ ایسے حقائق ہیں جن سے [illegible] صحت مند تنقید کبھی روگردانی نہیں کر [illegible]

معمولی، غریب گھر خوردہ فروش [illegible] کے یہاں جس کو سیالکوٹ شہر میں ایک ڈپٹی صاحب نے خرید کر دی تھی اقبال جیسا ذہین لڑکا پیدا ہوا۔ چونکہ خاندانی ماحول علم اور اونچی سوسائٹی میں پیدا ہونے والے فضائل سے بیگانہ تھا "دامن یزداں" تک ہاتھ بڑھانے کی توفیق و استعداد ہونے کے باوجود اقبال کے ذہنی و قلبی پس منظر میں وہ خیالات و جذبات جو علم نا آشنا خاندانوں سے متصف ہوتے ہیں، دیکھے جا سکتے ہیں۔ تعصبات سے بالاتر ہونا معمولی اکتساب نہیں ہوتا لیکن انسان کے لئے ہر قسم کے تعصبات کا استحصال کرنا لازم آتا ہے۔ مزید براں اقبال کو خاندان کی طرف سے آسودگی نصیب نہ تھی جس کا لازمی نتیجہ جھنجھلاہٹ ہی ہو سکتا تھا بڑے لڑکے سے سنجیدہ اختلاف اور کم عمر تیسری بیوی کی طرف سے خدشات وغیرہ واقعی سنگین المیے رہے تھے۔ وکیل کی حیثیت سے اقبال کامیاب وکیل نہ تھا لہٰذا فکر معاش بھی عمر بھر دامن گیر رہی۔ اقبال کا مرکز و محور اسلام ہونے سے کہیں زیادہ اسلام کی فاتحانہ تاریخ تھی۔ فکر اقبال دو قومی نظریہ کا حامل ہے، لہٰذا سیکولر سازینہ کو کوئی سرپال فراہم نہیں کر سکتا۔ شق الشخصیت (Split Personality زدہ ذہن و دماغ کی جانب توجہ بالخصوص اس وقت جانے لگتی ہے جب کوئی پیغام و ہدایت کی بات کرنے لگتا ہے پیغام پر زور دینے کے بجائے شعر اقبال پر توجہ مرکوز رکھنا چاہئے۔ شعر اقبال خاصی عظیم خصوصیات کا حامل ہے اور اسی کو ابھارنے کی ضرورت ہے۔ اور بس

میں چھوڑ دوں گا آج سے چھپ چھپ کے دیکھنا
اک بات تم بھی چھوڑ دو پردا کہیں جسے

پیغام کا ذکر چلا اور بات نشان استفہامیہ ثبت دینیات و نفسیات تک پہنچی۔ اقبال بحیثیت شاعر عظیم تھا۔ چھوٹا بلکہ بہت چھوٹا فلسفی تھا۔ اس کے یہاں کوئی پیغام

منظور احمد بابا

ویریندر پٹواری کا فن[1]

افسانہ اردو ادب کی مقبول ترین صنف ہے۔ اہلِ کشمیر نے دیگر علوم و فنون کی طرح اس شعبہ میں بھی اپنے چراغ روشن کئے۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ریاست میں تعداد کے اعتبار سے اس کا سرمایہ ابھی کم ہے لیکن معیار کے اعتبار سے اس نے بلوغیت کی دہلیز پر قدم رکھ دیا ہے۔ صحیح معنوں میں یہاں کی اردو افسانہ نگاری کی شروعات۔ محمد دین فوقؔ سے ہوتی ہے۔ فوقؔ کشمیری الاصل تھے انہوں نے تقریباً ہر صنفِ ادب میں زورِ قلم دکھایا ہے اس کا ثبوت ہمیں ان کی ایک سو سے زائد تصانیف سے ملتا ہے۔ جن میں شاعری، تاریخ، تحقیق، افسانہ نگاری وغیرہ شامل ہے۔ ان کے بعد ریاست کے دوسرے افسانہ نگار چراغ حسن حسرت کہے جا سکتے ہیں۔ جن کا افسانوی مجموعہ 'کیلے کا چھلکا' ۱۹۴۷ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ جب سے اب تک۔ اس قلیل عرصے کے دوران ہمارے سامنے کئی افسانہ نگار آئے۔ جنہوں نے مجموعی طور پر ریاست میں اردو افسانہ کے سرمایہ کو تقویت بخشی اس کارِ خیر میں ہمارے دور کے نوجوان افسانہ نگاروں کا بھی ہاتھ رہا ہے۔

دورِ جدید کے نوجوان افسانہ نگاروں میں صد میں ایک نام ویریندر پٹواری کا بھی ہے۔ وہ تقریباً اکیس برس سے زائد عرصہ سے پورے خلوص اور ایمانداری کے ساتھ فنِ افسانہ کی آبیاری کر رہا ہے۔ ویریندر پٹواری کا پورا نام پنڈت ویریندر رکمار پٹواری ہے۔ وہ گیارہ ستمبر ۱۹۴۸ء کو سری نگر (کشمیر) میں ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنا ادبی سفر ۱۹۶۵ء سے شروع کیا جب ان کا پہلا افسانہ 'سسکیاں' رسالہ 'صبح امید' (بمبئی) میں شائع ہوا۔ اسی ایک افسانے نے ان کے لیے ادبی تنظیموں اور ادبی رسالوں میں شریک ہونے

---

[1] یہ مضمون لکھا جا چکا تھا کہ پٹواری کا ایک اور افسانوی مجموعہ 'بے چین لمحوں کا تنہا سفر' منظرِ عام پر آیا۔ اس لئے اس نئے مجموعہ کے متعلق اس میں بحث نہیں ملے گی۔ اس میں پٹواری کا جائزہ ان کے ابتدائی دو مجموعوں کو مدِ نظر رکھ کر ہی لیا گیا ہے۔ (منظور)

نے راہ ہموار کر دی۔ اب تک ان کی ایک سو سے زائد کہانیاں
ملک کے تقریباً تمام معتبر ادبی و نیم ادبی، علمی و نیم علمی جرائد میں
شائع ہو کر مقبول عام ہو چکی ہیں۔ ان کی کہانیوں کی مقبولیت
کے پیش نظر سیمانت پرکاشن نے ان کا پہلا افسانوی مجموعہ
"فرشتے خاموش ہیں" (مطبوعہ ۱۹۸۰ء) شائع کیا۔ اور
اس کے بعد "ماڈرن پبلشنگ ہاؤس" نے ان کے دوسرے
افسانوی مجموعہ "دوسری کرن" (مطبوعہ ۱۹۸۵ء) کو شائع
کیا[۱۲]۔

ان دونوں افسانوی مجموعوں کے مطالعے سے ویریندر
پٹواری کے ذہنی سفر کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔
ویریندر پٹواری نے ادبی ماحول ورثے میں پایا۔
والد مسرور تخلص کرتے تھے جو کشمیری زبان میں مشق سخن کرتے
تھے۔ ان کے گھر میں علمی و ادبی مجلسیں بھی ہوا کرتی تھیں۔
گھر کے دوسرے افراد کو بھی ادبی ماحول سے بے حد لگاؤ تھا۔
اپنے طالب علمی کے زمانہ میں ہی انہیں بڑے لوگوں اور
اونچے خیالات سے سابقہ پڑا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ویریندر
پٹواری کے فن کی تربیت ہو رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں
نے ماضی کے گہرے احساس اور روایات کی روشنی میں
اپنے فن کو سنوارا ہے۔ خود لکھتے ہیں۔

میرے والد محترم پنڈت پریم ناتھ
پٹواری مسرور کشمیری اپنے وقت کے جانے
پہچانے شاعر تھے۔ نازکی صاحب و پریم
ناتھ پردیسی صاحب کے ہمعصر۔۔۔۔
میرے بڑے بھائی (کون) پروفیسر پی۔
این۔ دھر، جو وزیر اعظم ہند کے پرسنل
سکریٹری رہ چکے ہیں (۱۹۷۰ء۔۱۹۷۷ء)
[illegible]

ان کی قربت کا شرف حاصل تھا۔ اس لئے
میری کاوشوں کو تقویت مل گئی۔

(ایک خط)

ویریندر پٹواری نے اپنے بزرگوں سے بہت کچھ
کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے افسانہ نگاروں
کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، بھاسکر ناتھ وغیرہ سے
بھی قبول کئے ہیں۔ کرشن چندر اور پٹواری کی شخصیت
میں بڑی حد تک یکسانیت ہے۔ اور ان کے رجحانات
ملتے جلتے ہیں۔ لہٰذا پٹواری نے اس آئینہ میں بہت سے
دیکھنے کی کوشش کی۔ اپنے مزاج اور اپنے خلوص سے
شخصیت کو بہت قریب محسوس کیا۔ لیکن ان کے افسانے
چندر کے افسانوں کے برعکس فنی نقطۂ نگاہ سے بہت
کامیاب نظر نہیں آتے۔ تاہم کرشن چندر کی ہی طرح
پٹواری کا مطمح نظر بھی انسانی ذات اور انسانی سماج
رہا ہے۔ وہ ہمارے گرد و پیش کی باتیں کرتا ہے۔ ہمارے
سیاسی، سماجی اور معاشرتی نقطے ابھار کے
اس بات کی وضاحت یوں کی ہے، لکھتے ہیں۔

"میرے افسانوں کے موضوع عام
طور پر سماجی یا سیاسی ہوتے ہیں۔ یوں سمجھ
لیجئے، میں گرد و پیش کا جائزہ لیتا رہتا ہوں
جو دیکھتا ہوں وہی لکھتا ہوں۔ اگر کسی عورت
کا نیم برہنہ سینہ سامنے ہو تو میری نظر
پھٹے ہوئے کپڑے پر رک جاتی ہے۔ عریاں
جسم پر نہیں۔

(ایک خط سے)

اپنے افسانوں میں ویریندر پٹواری نے اس قسم
خیالات کا اظہار کرکے ترقی پسندی کا ثبوت

کوئی مطالبات نہیں ہے لیکن جب کوئی عقیدہ ئے تو اس کو مزاج و شعور میں جذب کرنے کا سلیقہ ہے۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ ترقی پسندوں کا شعور احساس اس عقیدہ میں شامل نہ ہو سکا۔ یہی وجہ پسندی سپاٹ بن گئی۔ اور تخیلی اور وجدانی نہیں ہوئی خارجیت و داخلیت کی نفسیاتی سے بات بنتی ہے۔ خارجی قدروں کی سپاٹ اور داخلی ذہنی نظام سے گریز کرکے فن کم ندہ نہیں رہ سکتی۔ دیریندر پٹواری کے یہاں موجود ہے لیکن ہمہ گیری اور تہہ داری کی ضرورت ان کی فکر اور زیادہ تخیلی، وجدانی اور اندرونی ن میں زیادہ سے زیادہ ہمہ گیری آجائے۔ یہ فکری کمی ان کے کئی افسانوں سے جھلکتی ہے — کے برتنے کے سلسلے میں پٹواری کے یہاں "کرافٹ" زیادہ ملتی ہے اور فن کاری کم۔ ان کے افسانوں مثلاً "دوسری کرن"، "جوگن" اور "سپر"، "دشمن" کا مطالعہ کرتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ ان کا نظام بہت ہی کمزور اور سطحی ہے۔ امید ہے فکر و فن میں آگے چل کر اور بھی پختگی اور گیرائی

دیریندر پٹواری کی افسانہ نگاری کی عمر گرچہ ابھی ہے لیکن اس قلیل سے عرصہ میں وہ فنی افسانہ نکات سے آشنا ہوتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ معلوم ہے کہ افسانہ میں کسی ایک حادثہ، ایک واقعہ، پہلو یا ایک جھلک کی تصویر سے زیادہ کی گنجائش نہیں کہ اس میں سب سے مقدم چیز "وحدتِ تاثر" کی تاثرات، نقطہ یا کوئی ایسا اشارہ اس

میں موجود نہیں ہو سکتا جو لاتعلق اور بے ضرورت ہو یا جس سے افسانہ کی یک رنگی میں فرق پڑ جائے یا جس سے قاری کی توجہ مرکزی واقعہ یا کردار یا نکتہ سے ہٹ جائے چنانچہ ساخت کے لحاظ سے وہ افسانہ کامیاب ہوگا جس میں کوئی غیر متعلق شے موجود نہ ہو۔ پٹواری کو اس بات کا بھرپور احساس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں جوگندر پال کے افسانوں کی طرح ایک ہی افسانے میں متعدد مسائل ایک دوسرے سے دست و گریباں نہیں رہتے ہیں۔ بلکہ ان کے ہر افسانہ میں ایک ہی مسئلہ در آتا ہے۔ جس میں کہانی کے بنیادی عناصر بھی ملتے ہیں اور حقیقتوں کا بیان بھی ہے۔ لیکن اس کے برعکس ان کہانیوں کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی بعض کہانیاں، موضوع اور ہیئت، دونوں اعتبار سے ایک ہی سلسلے کی کئی کڑیاں ہیں۔ شاید یہ ان کے خوب سے خوب تر کی جستجو کا ہی نتیجہ ہے۔

دیریندر پٹواری کے افسانوں کا مرکزی خیال محبت اور خیر خواہی کے ساتھ امن کی ابدی قدریں بنی ہوئی ہیں۔ نیز سماج، معاشرہ اور سیاست کے بعض پہلوؤں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو اس بات میں تامل نہیں کہ پٹواری کا بنیادی موضوع حقیقت نگاری اور ذات کی گہرائی ہے۔ انھوں نے لفظ لفظ میں زندگی اور سماج کے ایسے ہی کئی پہلو روشن کئے ہیں۔ اس اقتباس پر غور کیجئے تو خود بخود اس جلت کا اندازہ ہو جائے گا۔

"بوڑھیا تیتر کو دیکھ کر چونک پڑی اور اس کے حلق میں پھنسی ہوئی بات باہر نکل گئی۔"

"خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم غریبوں کی تو ہی سنتا ہے۔ ..."

ہوا ہوتا تو شاید ہم لوگ بھوکے نہ ہوتے،
بیٹے نے بندوق دور پھینک دی اور
اچھل کر تیتر کو دبوچ لیا اور پھر اس کی
گردن مروڑ کر وہ شہر جانے کی تیاری کرنے لگا
آج وہ دونوں بہت خوش ہیں صرف
اس لئے کہ ایک مرغابی اور تیتر کے عوض ان کو
مل کے مالک سے دو دن کا راشن اور دو عدد
کارتوس ملنے والے ہیں۔

(جگ بیتی)

ویریندر پٹواری نے "دشترکتہ" میں اس حیوان کو بے نقاب کیا ہے جسے یہ سماج ایک جھوٹی عقیدت، شرافت اور مذہبیت کی تہوں کے نیچے چھپا کر رکھنا چاہتا ہے۔ پٹواری نے جگہ جگہ سماج کے اس مکاری اور ابلہ فریبی کو عریاں کیا ہے۔ "دشترکتہ" ایک چھوٹے سے گاؤں میں کئی برس سے رہا ہے وہ ان گاؤں والوں کے لئے مسیحا ہے۔ لیکن وہ اپنے مرحوم چوکیدار کی بیٹی کے ساتھ جو سلوک روا رکھتا ہے اس سے پٹواری نے احسن طریقہ پر بیان کر کے اپنی "نیک سیرت" انسان کی ہوس پرستی کو آشکارا کیا ہے۔ اسی قبیلے کا ایک اور افسانہ "فرشتے خاموش ہیں" ہے۔ یہ ایک ایسے باعزت شہری، جس کے ماتھے پر سیندور کا بڑا سا تلک بھی لگا رہتا ہے، کا پردہ فاش کرتا ہے۔ جو بظاہر جنگل کا ٹھیکیدار ہے لیکن اصلی کاروبار اس کا کم سن لڑکیوں کو اغوا کر کے بیچنا ہے۔ اس کردار کی زبان خود سنئے :۔

..... چلو اچھا ہوا جو اس منحوس لڑکی
سے چھٹکارا مل گیا۔ پتہ نہیں زندہ رہ جاتی تو
نہ جانے کیا کیا تباہیاں پھیلاتی، پہلے ہی
روز کتنی الجھنوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔
اس لڑکی کے لئے ایسے کچھ خرچ تو نہیں کرنا
پڑا تھا۔ بے دام کی اغوا شدہ لڑکی تھی، جو
کم از کم دو ہزار روپے میں بک ہی جاتی۔ مگر
اتنی منحوس تھی کہ میرے بیس سالہ تجربے
کے چاند پر گہن ضرور لگ جاتا اور لوگ
جان جاتے کہ میں جنگلات کا ٹھیکیدار
نہیں ....."

(فرشتے خاموش ہیں)

جو طنز اس کہانی میں موجود ہے وہ اس کی واقعیت کو اور بھی دوبالا کر دیتا ہے بلکہ پٹواری تو واقعیت نگاری کرتے وقت زندگی کے بعض گھناؤنے تجربات کے استعمال سے بھی پرہیز نہیں کرتا۔ اس طرح کا ایک اور افسانہ "کل کیا ہوگا......" ہے۔ جس میں ان سیاسی لیڈران پر ایک تیکھا چوٹ ملتا ہے۔ جو عوام کی معصومیت سے فائدہ اٹھا کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح پٹواری کی حیثیت ایک ایسے نقیب کی بن جاتی ہے جو سماج کے ایسے افراد سے ہوشیار رہنے کے لئے کہتا ہے۔

ویریندر پٹواری جواں سال افسانہ نگار ہیں اور ان کی تحریر میں، تخیل میں، قوت تخلیق میں رعنائی اور تازگی موجود ہے۔ ان کا دل بہت حساس ہے، وہ دکھ درد اور تکلیف کو برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ امر ان کے دیگر افسانوں، کینسر، کاغذ کے پھول، ریت کی دیوار، گھسو، نابالغ وغیرہ سے بھی صاف ظاہر ہوتا ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں ذات اور کائنات کی نبض پر انگلیاں رکھے ہوئے زمانی اور وجودی مسئلوں کی تشخیص کر رہا ہے۔ وہ مسئلے جو جدید انسان کے گرد و پیش ان کے اندر عمودی چٹانوں کی طرح کھڑے ہیں۔ ان ہی مسئلوں کو پٹواری نے فن کارانہ جابکدستی

پیش لایا ہے :-

" برف سے ڈھکی ہوئی چوٹی پر
جاکر میں خود زور سے چلاتا ہوں ۔
" میں اگر " میں " نہیں ـــــ تو پھر بھی "
کون ہوں ؟
" تم ، اگر تم نہیں ـــ تو پھر کون ہو ـ
یہ سرگوشیاں اگر میرا وہم ہیں
تو پھر
یہ صدائیں کس کی ہیں
یہ قدموں کی آہٹ
اگر تمہارا قرب ہے تو پھر ،
برف پر یہ نشان کس کے ہیں ؟
میں چلاتا رہا ـــ چلاتا رہا
ـ ـ ـ ـ میں کون ہوں)

" کبھی کبھی رات کی تنہائیوں میں وہ اپنے تان پورا سے لگا کر ساز چھیڑتی ہے ۔ یا پھر ساز کے ساتھ آواز ہم آہنگ کر کے گاتی بھی ہے ۔ اس کی آواز میں کتنا سوز الفاظ میں کتنا درد ہے ۔ اس کا طرز بیان ہی ایک ہے ۔ آس پاس کے لوگوں کو اس ساز و آواز کے اکثر سسکنے کی آواز بھی سنائی دیتی ہے ۔"

(پیاسی سیپ)

ان کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم پر عجیب قسم کا جادوئی اثر طاری ہو جاتا ہے یہ "فسوں" ان افسانوں میں جگہ جگہ ملتا ہے ۔ ان میں جو درد کرب ہے اس میں ہم اپنا ہی کرب محسوس کرتے ہیں اور سسکیوں میں ہم اپنی ہی آواز سن لیتے ہیں ۔ اور آنسوؤں میں ہمیں اپنا ہی لہو نظر آتا ہے ۔ دوسرے یہ کہ پٹواری اپنے افسانوں میں "سناتے" کم ہیں اور "دکھاتے" زیادہ ہیں ۔ یہی ان کے فن کی ایک خاص بات ہے ۔

پٹواری کے کئی افسانوں میں ہلکے ہلکے رومانوی نقوش بھی ملتے ہیں ۔ مجبور ، ڈرپوک ، موت اور زندگی ، پیاسی سیپ ، وغیرہ افسانوں میں ایسے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں ۔ لیکن اس رومانیت میں بھی واقعیت نگاری ملتی ہے ۔ اصل میں پٹواری زندگی کے بارے میں "حقیقت پسندانہ" نظریہ رکھتے ہیں ۔ وہ تخیل کے گھوڑے نہیں دوڑاتے ، بلکہ ان کے یہاں حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے اور اسی صداقت کے پیش نظر پٹواری کے افسانے بے حد کامیاب ہیں ۔

ویریندر پٹواری کے یہاں یک رنگی نہیں بلکہ ان کے موضوعات میں وسعت اور تنوع پایا جاتا ہے ـــ " روشنائی سے سلولائیڈ تک " فلمی صنعت پر لکھی گئی ایک دھواں دار کہانی ہے ۔ ہمدرد ، ماں ، منا ، ہوک ، خواب خواب وغیرہ میں ہماری تہذیبی اور معاشرتی زندگی کے بعض پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے ۔ "پوسٹر" میں یہ بتایا گیا ہے کہ اگر ایک نوجوان عورت ایک ہجڑے خاوند کے پلے باندھ دی جائے تو دونوں میں نباہ کیسے ہوگا ۔ مجبور میں احساسات کی گھٹن اور خیالات کے کشمکش کی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے ۔ کینسر سائنس کے احساس شکست کی کہانی ہے ۔ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ سائنس اپنی بے پناہ ایجادات کے باوجود ابھی تک انسانی زندگی کو تحفظ دینے میں ناکام ثابت ہوا ہے ۔

غرض ان افسانوں میں دھنک کے سات رنگ ہی نہیں ہیں بلکہ "ذات" سے لے کر کائنات تک کے سارے

رنگ ملتے ہیں۔

ویریندر پٹواری نے کئی کامیاب ہیئتی تجربے بھی کئے ہیں۔ اسی طرح کے ہیئتی تجربے ان کے بعض افسانوں مثلاً گھر، اور پھر، میں کون، وغیرہ میں نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس طرح ان کے یہاں نہایت مختصر اور راست کہانیاں بھی ملتی ہیں۔ جیسے ڈرپوک، دشمن، سوال، نادان وغیرہ۔ لیکن یہ کہانیاں افسانہ کے فنی لوازمات پر پوری اترتی ہیں۔ پٹواری کو افسانے کی روایات کا بھرپور احساس بھی ہے اور وہ اسے آگے بھی لے جانا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں جدید اور روائتی افسانہ کا ایک خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔

ویریندر پٹواری کی زبان نہایت صاف، شستہ اور ڈھلی ہوئی ہے۔ ان کی کوشش رہی ہے کہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مطالب پیدا ہو سکے۔ اسی لئے ان کے یہاں چھوٹے چھوٹے جملے ملتے ہیں یہ پٹواری کی خوبی بھی ہے اور فنکاری بھی۔

ہم امید کرتے ہیں کہ پٹواری آئندہ بھی لکھتے رہیں گے اور اس سے اچھا ادب تخلیق کریں گے جس سے افسانہ کے فن کو تقویت اور ریاستی اردو افسانہ کی روایت کو طوالت اور توانائی حاصل ہوگی۔

بقیہ: کتابوں پر تبصرہ...

اور عرض داشت کے طور پر خود مرتب نے لکھا ہے

تذکرہ لکھنا اور علاقائی شعراء کا فہرست مرتب کرنا کوئی بری چیز نہیں۔ لیکن تذکروں کا مزاج جدید دور میں تنقید سے وابستہ ہے۔ لہٰذا تذکرہ نگار کو خیال رہے کہ جس شاعر کا تذکرہ کرے کم از کم ان کے نام کے علاوہ ان کی شاعری پر کچھ

لکھا جائے۔ ورنہ صرف فہرست سازی سے وقت اور... کے زیاں کا احتمال رہتا ہے۔ کم و بیش زیر تبصرہ کتاب اس سے الگ نہیں۔

رنگوں کے امتزاج کو اگر محنت اور عرق ریزی... لکھا اور مرتب کیا جاتا تو ایک اہم تذکرہ ہوتا۔ کتابت... غلطیاں راہ پا گئی ہیں، طباعت غنیمت اور قیمت ۲۵ روپے زیادہ ہے۔

اور خواب ٹوٹ گئے!

ویریندر پٹواری

(۱)

ایک رات
سکوت کا عالم
اور ایک ٹوٹے پھوٹے مکان کے اندر
وہ ماں بننے والی ہے
اور وہ ایک باپ
اچانک کتوں کے بھونکنے کے ساتھ
ایک آواز
گویا آسمان پھٹ گیا ہو
پھر ایک آہ
ایک تڑپ
اور ایک فریاد
وہ درد سے کراہنے لگی ہے
اور وہ پاس کے آغوش میں
سر چھپائے
مگر آس لگائے
کسی کی آمد کا انتظار کر رہا ہے
پھر ایک آواز
اور شور
جانے آسمان پھر پھٹ گیا تھا
یا زمین میں دراڑ پڑ گئی تھی
وہ لب سی رہی ہے
اور وہ بے بس ہو کر

(۲)

ایک کولہو کے بیل کی طرح
یا پھر ایک مجروح دانشور کی طرح
ایک ہونے والی ماں کے ارد گرد چکر لگا رہا ہے
اور ملتجی آنکھوں سے
کبھی اس کے زرد چہرے اور کبھی اس کے
پچکے گال۔ سوکھے ہونٹ
یا دھنسی ہوئی آنکھیں
اور ایک ہڈیوں کے ڈھانچے کو
گھور گھور کر دیکھتے ہوئے
کچھ سوچ رہا ہے کچھ سمجھ رہا ہے
اور ایک خواب دیکھ رہا ہے
دور دور تک پھیلے ہوئے
سرسبز لہلہاتے ہوئے کھیت
اور کھیتوں کی لہک
کتنی اچھی لگ رہی تھی وہ
فصلوں کی مہک
اور پھر سرگم کی لے پر
رقص کرتی ہوئی
صبح ——
ایک نئی صبح —
اور سورج کی کرنوں کے ساتھ
آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی

(۳)

ایک ماں
گود میں بچہ لئے
اپنے مرد کا ہاتھ پکڑ کر
بکھاوج کی تھاپ پر ناچ رہی ہے
جیسے ہرے پتوں پر چمکتے ہوئے
شبنم کے قطرے
یا چشموں سے ابلتا ہوا پانی
وہ مسکرانے لگا
ہنسنے لگا۔ قہقہے لگانے لگا
مگر اچانک شور برپا ہوا
وہ بال نوچنے لگی
اور وہ خاموش تھا
جانے یہ طوفان تھا
سیلاب تھا یا بارود کا دھماکہ
وہ چلانے لگی
اور گولیوں سے چھلنی اس کے ہمدم کا جسم
لہو لہان تھا۔ برف کی طرح ٹھنڈا تھا
باہر اندھیرا تھا
ہر طرف پولیس کی قطاریں
ہڑتال — گھیراؤ — کرفیو
شور و غل — آہ و پکار

(۴)

اور ایک لمبی دھوپ نما سے لپٹی ہوئی
ایک ماں
جس کا بچہ پیٹ کے اندر مر چکا تھا

جیت

سانینہ

اٹھو
دیکھو
میں جیت کر آئی ہوں
میں نے ان کے کاٹھ کے پاؤں انہیں لوٹا دیئے ہیں
اور اب بار بالکل اکیلی آئی ہوں

چلو
آنسوؤں سے بھیگا اپنا چہرا
ان کے شبدوں سے دھو ڈالو
میں نے بھی اپنی جیت میں اپنے آنسوؤں کو
انہیں زہریلے حرفوں میں دھویا ہے
اور
ان کی بیساکھیاں انہیں لوٹا دی ہیں

لوگ
میری اس جیت پر
مجھے مبارک باد دینے آئے ہیں

میں چپ چاپ سن لیتی ہوں
اور اپنی اندھیری کوٹھری کی
دیواروں کے بیچ
ہنستی ہوں

کیسے پاگل ہیں یہ لوگ
میں نے ان کی بیساکھیاں انہیں لوٹا دیں
تو یہ مجھے مبارکباد دیتے ہیں
یہ نہیں پوچھتے
کہ میں نے کس پر فتح پائی ہے
ان کی بیساکھیوں پر
یا اپنے اندھیروں پر ——!!!

علی عباس امل

رسم دنیا کا جو سامان بنائے رکھے
خود کو اپنے سے ہی انجان بنائے رکھا

نام اس کا ہی صحیفوں میں نہیں ہے جس نے
ہیکل و تخت سلیمان بنائے رکھا

بندگی نے بڑا اکسایا خدا بننے پر
بس انا نے مجھے انسان بنائے رکھا

دے گئی تشنہ لبی جرأت انکار مجھے
حلق خشک نے احسان بنائے رکھا

سر نہ سجدے میں جھکا ہات دعا کو نہ اُٹھے
دل کو ہر حال میں قرآن بنائے رکھا
عین فطرت ہے پرستش تو محبت پوجیں
ہم نے ہر خونی کو بھگوان بنائے رکھا
تر بھی ٹوپی نہ کھری بات ازل سے جھوٹی
اک اسی کفر نے ایمان بنائے رکھا

شفیع اللہ خاں آزاد وی

زندگی بھر ٹھوکریں کھانے کا اندازہ ہوا
جب ترے در سے بھٹک جانے کا اندازہ ہوا
اجنبی سے لگ رہے ہیں جانے پہچانے ہوئے
اب تمہارے شہر میں آنے کا اندازہ ہوا
عمر بھر پیتے رہے جام شراب زندگی
جب کہیں تھوڑا سا مے خانے کا اندازہ ہوا
صبح کے دامن میں ہے خاموش پروانوں کی خاک
اب وفاداروں کے اٹھ جانے کا اندازہ ہوا
تلملا کر سر جھکیں آنکھوں میں آنسو آ گئے
آج ان کو غم سے ٹکرانے کا اندازہ ہوا
ہوش والے بیخودی میں چاک داماں ہو گئے
خوب دیوانے کو سمجھانے کا اندازہ ہوا
دفعتاً ظالم نگاہیں پھیر کر ہنسنے لگی
اب ہمیں دنیا کو اپنانے کا اندازہ ہوا
زندگی کی حقیقت کوئی بھی سمجھا نہیں
زندگی کے صرف افسانے کا اندازہ ہوا
پھیکی پھیکی سی نظر آتی ہے بزم کائنات
راز اب ان کے چلے جانے کا اندازہ ہوا

ظفر صدیقی

اس وقت چراغوں کو لہو ہم نے دیا ہے
جب حد سے ہوا زور اندھیروں کا بڑھا ہے

مندر کا نشاں اور نہ مسجد کا پتہ ہے
کیا کچھ نہ یہاں نام پہ مذہب کے ہوا ہے

یہ خون، یہ مقتول، یہ تلوار، یہ قاتل
یہ شہر مرا ہے کہ کوئی کرب و بلا ہے

پہچاننا آساں نہیں پہچاننے والو!
چہروں کی تہوں میں بھی پنہاں چہرہ چھپا ہے

قاتل ترے قدموں پہ کبھی جھک نہیں سکتا
جب تک یہ مرا سر مرے کاندھے سے لگا ہے

طوفاں سے بچائے گا وہ کیا اپنا سفینہ
دہشت سے جو بزدل کی طرح کانپ رہا ہے

ماضی کی طرف لوٹ رہا ہے یہ زمانہ
اک باپ نے بیٹی کا گلا گھونٹ دیا ہے

اوپر سے لگتا ہے ظفرؔ اب بھی سلامت
اندر سے جو دیکھو تو بہت ٹوٹ چکا ہے

●●

سید شکیل دسنوی

جلو میں جس کے شامل اک جہاں ہے
تمناؤں کا کیسا کارواں ہے

سفینہ زیست کا کچھ یوں رواں ہے
نفس موجیں، ہوا کا بادباں ہے

نہیں محدود کچھ وسعت یوں دل کی
ہمارا ذہن لیکن بے کراں ہے

خدا کا شکر ہے بیاہ وکہ اب تک
زمیں نیچے ہے، سر پہ آسماں ہے

ہمارا ہر شعر سچ پوچھو تو سیدؔ
جو گزری ہے، اسی کی داستاں ہے

●●

مصطفیٰ مومن

میرے سوال کا پہلے جواب لکھ دینا
پھر اس کے بعد مکمل کتاب لکھ دینا
یہ انگلیاں کبھی تعاقب میں دوڑ جائیں گی
تو ریگ زار پہ جا کر سراب لکھ دینا
بکھیر دینا فضاؤں میں چاندنی ہر سو
اور شاخ شاخ پہ اک انقلاب لکھ دینا
یہ جانے کون سا لمحہ وفا سے بھر جائے
یہی تو وقت ہے دل کی کتاب لکھ دینا
عجیب شخص ہے خوابوں میں پل رہا ہے ابھی
قلم ہے ہاتھ میں تیرے حساب لکھ دینا

★

فصل گل میں بھی رہے حیران ہم
کیا بتائیں اب خدا کی شان ہم
اب فرشتہ کہنے والا کون ہے
قرض لے کر دیئے انسان ہم
شام ہوتے ہی تقدس جیب میں
صبح دم پھر صاحب ایمان ہم
ادھ کھلی آنکھوں پہ کھلتے بھی تو کیا
کس طرح کھوتے بھلا پہچان ہم
نرم نفسی ہو تو ہم خوشبو مسزاج
معرکہ ٹھہرے تو پھر طوفان ہم
دور ہے خود اشتہاری کی وبا
کیوں بنیں اخبار کا سامان ہم
مختصر کرتی رہی دنیا تو کیا
کتنے کتنے بھی رہے عنوان ہم

••

شبیر احمد قمر

اپنے بھی تو بے چارے اغیار نظر آئے
گھر میں بھی قیامت کے آثار نظر آئے
بندے کو خدا کہنا ہم نے تو نہیں سیکھا
ویسے بھی گھروندے کیوں گھر بار نظر
صحرا کی حقیقت بھی کھل جائے تو اچھا
جنگل میں تو بستی کے آثار نظر آ

ہر چشم بصیرت کا رونا یہی رونا
اس پار کا منظر بھی اس پار نظ
یہ شہر جفا پیشہ سودائی ہے
جب دیکھے دیوانہ بازار نظر آ
سچ یہ ہے کہ موسم کی مٹھی میں زما
بت جھڑ میں تو پتھر بھی خوددا
انجام تو ظاہر ہے کشتی کا خدا
گرداب کے ہاتھوں میں پتوار
تہذیب کا رونا ہے ہنسنے ہو تو
دیوار بھی جب دیکھو اخبار نظ

صدیوں کا لہو برسوں لمحوں
تب جا کے کہیں ایسے اشعار نظ

شاہد اختر

...شن دل و دماغ میں برسات بھی نہیں ہے
...اداب یعنی شہرِ خیالات بھی نہیں ہے
...یں گذر رہی ہیں مری اس محاذِ دل پر
...س عزتِ سادات بھی نہیں ہے
...لیا ہوا کہ ہم ہوئے بے دست و پا یہاں بھی
...یسی تو اپنے شہر میں کچھ بات بھی نہیں ہے
...جو تو ہر طرف سے مری ذات میں نمایاں
...چو تو اس سے میری ملاقات بھی نہیں ہے
...سے لپٹ کے رونے کا موسم گذر نہ جائے
...ب کے ردائے گردشِ حالات بھی نہیں ہے

ہمیں تو وقت کی رفتار نہ کچھ راس آئی
زندگی تھی بڑی مکار نہ کچھ راس آئی

میرے حصے میں کڑی دھوپ امکان بہت
ان کو بھی سایۂ دیوار نہ کچھ راس آئی

اب کوئی بات سلیقے سے نہیں بنتی ہے
عمر بھر آئی گفتار نہ کچھ راس آئی

میں بھی خاموش رواں سمتِ سفر ہوں لوگو!
اپنی تو حشمتِ سربازار نہ کچھ راس آئی

غزلیں

رات آئے گی تو رو رو کے بسر کرنا ہے
کرے کم مجھ کو بھی اتنا تو سفر کرنا ہے
خوبصورت سا کوئی حادثہ ہو جانے تک
اس کے کوچے میں مجھے رات بسر کرنا ہے
خود جلانا ہے سرِ شام مراسم کے چراغ
اور پھر اپنے لئے دیدۂ تر کرنا ہے
یوں بچھڑ جائے ایسا بھی کہیں سوچا تھا
اب تو یادوں کے سہارے ہی گذر کرنا ہے
اب تو دیوار کا سایہ بھی نہیں ہے اختر
اب ترے شہر میں کیا عمر بسر کرنا ہے

امرت رائے

اردو ترجمہ :- سید احمد قادری

منشی جی

لئے ہوئے باغیچے کی تصویر یہاں کمزور اور پھیکی پڑتی ہے۔ ایک منشی جی میرے پڑوس میں رہا کرتے تھے۔ انھیں پورے ادھا درجن لڑکیوں کے باپ ہونے کا ثواب حاصل تھا۔ جیسا ہوتا ہی ہے، لڑکیاں بالغ اور نابالغ دونوں ہی قسم کی تھیں۔ لیکن بدقسمتی تو یہ تھی کہ ایک لڑکی ہاتھ پیلے کرکے بندرگاہ سے اپنا لنگر چھڑا بھی نہ پائی تھی کہ قطار کی دوسری لڑکی بالغیت کی پتلی دہلیز لانگھ کر، آگے آکھڑی ہوتی تھی۔ یہی اس کا درد بھی تھا۔ مزاق بھی تھا۔ اس میں شک نہیں کہ مزاق ذرا بے رحم تھا۔

اللہ کے فضل سے، ہمارے منشی جی کی لڑکیاں کانی کبڑی نہیں تھیں۔ لیکن ساتھ ہی وہ اپسرائیں بھی نہ تھیں، نہ ہو پائی تھیں، اور نہ اب ہو پانے کی امید تھی۔ یعنی کہ وہ سانولی تھیں۔ لیکن کرشن جی بھی تو کالے تھے۔ یعنی کے ان کی آنکھیں چھوٹی تھیں لیکن چین جیسے بڑے ملک میں وہ تو ایک حسن تھا۔ یعنی کہ انہوں نے کایا کچھ موٹی پائی تھی۔ لیکن یہ تو بڑی بات ہے اس سے نسل سدھرتی ہے۔ مگر لوگ اس دلیل خیال نہیں تھے۔ نتیجہ کے طور پر منشی جی کو ہر شادی کے ایک موٹی رقم، بدصورت اولاد پیدا کرنے کے جرم میں لیا کے ادا کرنا پڑتی تھی۔

دو کو تو منشی جی نپٹا چکے تھے لیکن اگلے جیٹھ اگلی لڑکی تیار ہو جائے گی اور یہی بات منشی جی پر اپنا وزن ڈال کر ان کا گلا گھونٹ رہی تھی۔ اور اپنے نکیلے سے بے رحمی کے ساتھ ان کی کھال نوچ رہی تھی۔ اس میں دو باتیں سمجھ لینے کی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ منشی جی چالیس روپیہ ماہانہ پاتے تھے۔ گھرانہ لمبا چوڑا ہے، ج ہے جو تو صرف لڑکیاں ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اس لڑ ایک خاص خرابی ہے، اس کی بائیں آنکھ میں ایک پھلی۔ ہر شخص، اندھا بھی۔ یہ جانتا ہے کہ پھلی سے زیادہ نکمی چیز میں دوسری نہیں ہو سکتی اور جانکار لوگ تو یہ بھی میں کہ اس کے ہونے والے دولہے نے جو ادھر ادھر سرکو بازاروں سے جو تھوڑی بہت بیماریاں سمیٹ کر اپنے بسالی ہے، وہ بھی منشی جی کی لڑکی ریکھا کی اس

...نا میں کم ہی ہے۔ اسی لئے خاص طور پر کچھ زیادہ
...بنا ہوگا کیونکہ ان ہی روپیوں کی مدد سے لڑکے والوں
...وں میں بھی تو غبارے کے برابر پھیلتی اگائی ہوگی نہ؟
...ب اس بات کا تعلق ہے۔ منشی جی ان سارے
...ڈوں سے واقف ہیں، ان ہتھکنڈوں کی کھال
...ر چمکتے روپے اور دمکتی گنیاں تو نہیں پیدا کر سکتی
...جانتے ہیں۔ سبھی تجربہ کار لوگ یہ بھی جانتے ہیں
...موقع پر جب روپیہ اگاہنا ہوتا ہے، تو معمولی عقل
...رض کر دینا ضروری ہوتا ہے۔ ممکن ہے ایسا قاعدہ
...شاید ہے بھی۔ منشی جی نے ہر ممکن اور ناممکن طریقے
...پیہ اگایا، کیونکہ روپیہ اگاہنا ہی تھا۔ مکان قرض
...باڑھ میں ڈگمگ کرنے لگا۔ لیکن کسی کو غم کیوں
...لگا، نشے کا پہلا خمار جو ٹھہرا۔
...چاروں طرف عزت ہوئی۔ چاروں طرف شور
...روں طرف لوگوں نے باتیں کیں، حیرت کی، حسد
...شور انسان کو دل دے تو منشی جی جیسا۔
...منشی جی نے بے دریغ روپیہ خرچ کیا۔ اتنا کہ
...ہ کلاکار کی طرح، اپنا پرایہ، گھربار، امیر
...سں پڑوسی، سب کچھ بھول گئے!
...اور آج دو دن سے منشی جی کے یہاں فاقے ہو رہے
...ر تیسری صبح جب ان کی وفادار بیوی، ان کی طرف
...کاہوں سے دیکھ کر طمیس کے ساتھ پوچھتی ہے کہ
...سا دن کیسے کٹے گا۔ بھوکوں، پیاسوں گزر
...بھی یا نہیں۔ اور یہ ان کی اس فاقہ مستی کا
...بے چاری کمزور، کم عمر، نادان لڑکیوں کے لئے کیا
؟
تو......

ہمارے منشی جی صرف ایک پل کو آنکھ اوپر
اٹھا کر جواب دیتے ہیں۔ تم بھول گئیں۔ ابھی اسی
دن تو، یاد ہے نہ؟ میں نے آٹھ پہل جو منیاں لٹائی
تھیں، ہماری کتنی بڑی جیت کا نظارہ تھا وہ، مفلسوں
نے مراد پائی، بھکاریوں نے آنکھیں ٹھنڈی کیں اور آج
ابھی تم آئی ہو۔ یہ منحوس خبر لے کر، کیوں؟ ابھی تو
شائد ہم کچھ دن بنا کچھ کھائے ان غریبوں کی بے شمار
دعاؤں اور اپنے کمائے ہوئے بڑپن کی لوٹ چبا کر ہی زندہ
رہ سکتے ہیں۔ ابھی کمانے کی ضرورت ہی کیا؟ آخر کھانا ملنے
پر بھی تو آدمی روتا ہی ہے۔ بچے بلبلاتے ہی ہیں۔ بے درد
سماج آنکھیں دکھاتا ہی ہے..... چھی!

اور جب ان کی بیوی چاہ رہی تھی کہ اس سوال پر
اور پہلوؤں سے بھی غور کیا جائے تب تک منشی جی سب
کچھ اپنے پاس سے جیسے سرکا کر ہندوستان کا انڈسٹریل
نقشہ سامنے پھیلائے ان تجارتی مراکز پر آنکھ گڑانے
میں مصروف ہو چکے تھے جہاں کے مالکوں ایجنسیاں کھل
سکتی ہوں۔ اور وہ کچھ بڑبڑا رہے تھے، جو ان کی
مجبور بیوی سمجھ نہ سکی!!!



وہ واپس نہیں آیا

نسیم احمد نسیم

اور جب انہیں کوئی محفوظ جگہ نظر نہیں آئی تو وہ پاس ہی کے جنگل میں منہ اٹھائے گھستے چلے گئے۔ سورج کی تیز شعاعیں دم توڑ رہی تھیں اور اندھیرا ان پر غالب آ رہا تھا۔ اس بھیڑ جنگل میں خلاف طبع وہ کچھ سکون محسوس کر رہے تھے۔ لیکن انہیں احساس اس وقت ہوا جنگلی جانوروں سے اپنی حفاظت کے متعلق سوچتے، کانٹوں کی طرح سر سے سر جوڑے بیٹھے تھے لیکن انہیں احساس اس وقت ہوا جب شام رات کے تاریک غار میں جا کر کھو چکی تھی۔ وہ شخص جس نے اپنے ساتھی کو جنگل میں پناہ لینے کی بات سمجھائی تھی، اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے جنم جنم سے وہ ایسی خاموش ماحول کا عادی ہے۔ جبکہ اس کے ساتھی کو وقتی امان اب بڑے خطرے میں تبدیل ہوتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ ویسے اگر وہ چاہتے تو اس رات کے اندھیرے میں بھی بچ بچا کر باہر نکل سکتے تھے۔ اور قبائلیوں کی بستیوں میں پناہ لے سکتے تھے۔ جو ان سے صرف ایک میل کی دوری پر تھیں لیکن بے وقت میں ہمراہی کی ضرورت کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے ساتھی کو

"کیا تم سو گئے؟" اس نے اپنے دوست کو

"کیا ہے؟" اس کے ساتھی نے طبیعی سا ...

ہوئے کہا۔"

دیکھو، رات میں یہاں رکنا موت کو دعوت

..... سن رہے ہو تم؟

"ہوں۔" اس نے بے معنی سا جواب دیا

ارے ہوں کیا، کچھ بولو تو سہی۔ آخر تم

ہو؟

"میری مانو تو ابھی رک جاؤ۔" اس نے نیم وا ... سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔ جس میں التجا کی خفی ... جھلک تھی۔ اس بات پر اس کے دوست نے اسے ... نظروں سے دیکھا۔ اور اپنے آس پاس کے ڈراؤنے ... کو اس طرح گھورنے لگا جیسے یہ فوراً شیر اور چیتے ... اختیار کر لیں گے اور ان پر جھپٹ پڑیں گے۔ جھا ... دیکھ کر اسے ایسا لگا جیسے ان کے اندر ان کی مو ... ہو رہی ہو۔ یک لخت اس نے اپنے جسم میں سنسنی ... کی اور جلدی سے نظر گھما کر اپنے دوست کی طرف

بہل گیا
یہ آرہا تھا۔
" ابے سنتے ہو ؟"
" ابے کیا ہے ؟"
" میں پوچھتا ہوں کیا تم نے مرنے کا قطعی ارادہ کر
ہے۔ اگر یہی بات تھی تو بھاگے ہی کیوں تھے ؟"
" نہیں ایسی بات نہیں، میں جینا چاہتا ہوں۔ ابھی
ہی کیا ہے ؟"
تو پھر یہاں کیوں رکے ہو۔ کیا موت کے منہ سے
عمر کی دعا سننے کی خواہش رکھتے ہو ؟" اس کے
تھی نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔
" نہیں میں یہاں مصلحتاً رکا ہوں۔ سمجھنے کی کوشش
ہمارا ٹھہرنا عبث نہیں، بلکہ بے حد ضروری ہے۔ میری
و آؤ سونے کی جگہ تلاش کرتے ہیں۔ صبح آگے کریں
گے " یہ سن کر اس کا ساتھی بالکل جل
کر رہ گیا۔ اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اس لئے بس
منہ میں اسے لعن طعن کرتا ہوا وہیں لیٹ گیا۔
اسے سونے کا بالکل ارادہ نہیں تھا۔ لیکن خنک
نے اسے پیار سے تھپک تھپک کر سو جانے پر آمادہ
اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ اپنے ساتھی کے خراٹے
ساتھ اپنی آواز ملانے لگا۔ ابھی انہیں سوئے ہوئے
بھی نہ گذرے تھے کہ اس پاس کی جھاڑیوں
میں کچھ لوگوں کی سرگوشیاں سنائی دیں۔ وہ ایسی
گفتگو کر رہے تھے جس سے یہ پتہ کرنا آسان تھا کہ
نے بھی موقع غنیمت شمار کر کے جنگل کی راہ لی ہے۔
اب رات صبح کو اپنی تاریکی سونپنے جا رہی تھی۔ صبح
ستارہ اپنی منزل کی طرف آہستہ روی کے ساتھ
رہا تھا۔ [illegible]

چکی تھی۔ وہ کافی گھبرائے ہوئے سے تھے اور بڑی عجلت میں دوسری طرف
نکل رہے تھے۔ شاید پر امن پناہ گاہ کی جستجو میں۔ اس
نے پھر اپنے ساتھی کو جھنجھوڑا۔ اب کی مرتبہ وہ غصے سے
بلبلا اٹھا۔
" کیوں تنگ کرتے ہو، کیا یہاں چین بھی نہیں لینے
دو گے..... اُف آدمی کے پاس آدمی کا ہونا ہی تو
ساری پریشانیوں کا سبب ہے" اور بھی وہ نہ جانے
کیا کیا بڑبڑانے لگا۔
" دیکھو دوست! رات کا آخری پہر ہے، اب جنگلی
جانور آنا ہی چاہتے ہیں۔ اور پھر ہم تم شاید اس دنیا
میں نہ رہیں۔ میری بات مان لو۔ اور واپس چلو....."
اس کے حراساں دوست نے یہ بات اس قدر عاجزی
سے کہی تھی کہ وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ وہ اسے چند ثانئے
تک ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھتا رہا ــ اور پھر ہنسا۔
" آؤ تھوڑی دیر میرے پاس بیٹھو۔ میں تمہیں ایک
نہایت ہی حسین واقعہ سناتا ہوں۔" اتنا سن کر اس
کا ساتھی تھوڑا بدکا اور اسے تحیر آمیز نگاہوں سے دیکھتا
ہوا کھڑا ہو گیا۔ لیکن اس نے جبراً اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے
پاس بیٹھا لیا۔
" ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے ایک خواب دیکھا ہے،
تم اسے پورا سن لو، پھر کوئی فیصلہ کرنا۔ اتنا کہہ کر اس نے
خواب بیان کرنا شروع کیا۔
" جب میں نے آنکھیں بند کیں تو دیکھا کہ ایک بیابان
جنگل ہے، جس میں بالکل تنہا سہما سہما سا کھڑا ہوں۔ اور
جنگلی جانوروں کی چیخ و پکار میرے کانوں کے پردے
پھاڑے دے رہے ہیں۔ خوف و ہراس سے میرا حلق خشک
[illegible]

جگہ کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ڈھیر سارے دیو ہیکل آدمیوں نے آکر مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ان کے دانت لمبے لمبے اور ہاتھ پاؤں بالکل بھالوؤں جیسے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر فرطِ مسرت سے میرے گرد ایک چکر لگایا اور اسی جگہ پر اچھلنے کودنے لگے۔ اور پھر ان میں سے ایک نے بڑھ کر مجھے کسی بچے کی طرح دونوں ہاتھوں سے اٹھایا اور اپنے کندھے پر بٹھا لیا۔ اور ایک اور چل دیا۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کے باقی ساتھی چلنے لگے۔ آخرکار وہ سب ایک جھاڑی میں پہنچے اور مجھے زمین پر ڈال کر چلے گئے لیکن ان میں سے ایک میرے پہرے پر بٹھا دیا گیا۔ تاکہ میں کہیں بھاگ نہ سکوں۔ جھاڑی میں ایک بوسیدہ پنجرہ لٹک رہا تھا۔ جس میں ایک چڑیا قید تھی اور مجھے دیکھ کر برابر شور کئے جا رہی تھی۔ اور پنجرے میں تیزی سے ادھر ادھر پھدک رہی تھی۔ مجھے اس کی بے بسی پر بہت ترس آیا جب وہ دیو نما آدمی تھوڑی دیر بعد خراٹے لینے لگا تو میں دھیرے سے اٹھا اور پنجرے کا دروازہ کھول دیا۔ وہ چڑیا آزاد ہوتے ہی حیرت انگیز طور پر ایک حسین و جمیل شہزادی میں تبدیل ہو گئی۔ اسے دیکھ کر میرا خوف ہوا ہو گیا اور میں مبہوت سا ہو کر ایک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ اس نے احسان مند نگاہوں سے مجھے مسکرا کر دیکھا اور میرا ہاتھ لے کر چوم لیا۔ اس کے ہونٹوں کے لمس سے میں اپنا ہوش کھو بیٹھا۔ اس نے مجھے آنکھیں بند کرنے کو کہا۔ اور جب میں نے آنکھیں بند کر لیں تو مجھے ایسا لگا کہ میں ہوا میں بہت اونچائی پر پرواز کر رہا ہوں۔ تقریباً دو گھنٹے تک یہ سلسلہ برقرار رہا۔ اور جب ہماری پرواز ختم ہوئی تو میں نے آپ کو ایک نہایت ہی خوبصورت ... یعنی شاہی محل میں پایا۔ شہزادی نے اپنے باپ سے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ اس کا باپ یہ سن کر بہت خوش ہوا۔ اور اس نے شہزادی کی شادی میرے ساتھ کر دی۔ مجھے شاہی لباس پہنایا گیا۔ میرے گلے میں سچے موتیوں کی مالائیں ڈالی گئیں۔ میری کمر میں سنہری دستوں والی تلوار لگائی گئی اور آخر میں نازک اندام کنیزوں نے لا کر مجھے شہزادی کے کمرے تک چھوڑ دیا اور کھلکھلاتی ہوئی واپس چلی گئیں۔ نصف شب کا عمل تھا۔ جیسے ہی میں نے حجلۂ عروسی میں قدم رکھا، تم نے مجھے بیدار کر دیا۔ اور سارا مزہ کرکرا ہو کر رہ گیا۔ آج برسوں بعد ایسا خواب دیکھا ہے۔ اب مجھے اپنے خواب کی تعبیر کے لئے یہاں رکنا پڑے گا۔ اگر تم بھی رک جاؤ تو میں تمہیں۔۔۔۔

اتنا سنتے ہی اس کا دوست یکایک کھڑا ہو گیا۔ اور اسے خوف زدہ نگاہوں سے گھورتا ہوا پیچھے ہٹنے لگا۔ یہ دیکھ کر اس نے کہا: "اگر تم جانا ہی چاہتے ہو تو جاؤ میں تمہیں روکوں گا نہیں۔ ہاں اگر تم باقی رہے تو مجھ سے آکر ضرور ملنا۔ میں تمہاری واپسی کا انتظار کروں گا۔ یہ کہہ کر وہ اپنے دوست کی طرف سے بیگانہ ہو کر خلا میں گھورنے لگا ــــ

اس کا ساتھی اسے چھوڑ کر جا چکا تھا۔ آج دو سال کی مدت گزر گئی۔ لیکن بہت وعدوں کے باوجود وہ پھر واپس نہیں آیا ــ

● جواب طلب امور کے لئے

ڈاک ٹکٹ کا شامل آنا لازمی

اور ضروری ہے ●

نئی کتابوں کا تعارف

(تبصرہ کے لئے دو جلدوں کا آنا لازمی)

(تبصرہ نگار، قیصر زماں)

آواز کا سایہ (شعری مجموعہ)

شاعر:- عبدالقادر ادیب،
قیمت:- ۲۵ روپے
ملنے کا پتہ:- 29. C.M.H. Road
سکنڈ اسٹیج، اندرا نگر، بنگلور ۳۸

آواز کا سایہ محمد عبدالقادر ادیب کا شعری مجموعہ ہے۔ جو کرناٹک اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ہوا — عبدالقادر ادیب کہنہ مشق اور بزرگ شاعر ہیں۔ مشہور شاعر محمود ایاز، مدیر "سوغات" اور "حمید الماس" ساہتیہ اکیڈمی انعام یافتہ شاعر کے گراں قدر رائے بھی شامل ہے۔

"ادیب صاحب کل وقتی شاعر اور ادیب نہیں ہیں، اپنی پیشہ وارانہ سرگرمیوں کے علاوہ کئی سماجی اور ثقافتی اداروں سے عملی وابستگی رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میں نے ہمیشہ شعر و ادب کی دلچسپیوں میں منہمک پایا اور یہ بات اس کا ثبوت ہے کہ شعر و ادب سے ان کا تعلق سنجیدہ اور گہرا ہے، زیر نظر مجموعہ کلام میں اظہار و بیان کی خوبیاں بھی ملیں گی اور موضوعات کا تنوع بھی"

(محمود ایاز)

"ادیب صاحب سالہا سال تک اپنے وجود کی تلاش اور اس کی شناخت میں مصروف رہے۔ آخرکار چالیس برس بعد شاید شعر کے پہلو میں ان کو اپنے وجود کی روشنی ملی، جب اس روشنی سے ذہن منور ہوا تو ادیب صاحب کو زندگی اور فن کی نئی نئی سمتیں نظر آئیں"

(حمید الماس)

اس کے علاوہ دیباچے کے طور پر خود شاعر نے تفصیل سے اپنی زندگی کے حالات و کوائف کو بیان کیا ہے دیباچے کا مطالعہ ان کی شاعری کے مطالعے میں سودمند اور معاون بھی ہے۔

زیر نظر مجموعہ کلام میں حمد اور نعت کے علاوہ ۲۲ نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کو شعری اصناف پر قدرت حاصل ہے۔ مجموعہ کے مطالعے سے آسودگی کا احساس ہوتا ہے۔ معاشرے اور سماج کا آگہی کا فرد کی زبوں حالی اور اس کی آسودگی کا گیان ان سبھوں کی آمیزش ان کے فن کا حصہ ہے۔ نظموں میں آواز کا سایہ، شب زنجیر، فردا، زندگی، انجان، ماورا، اور واردات خوبصورت نظمیں ہیں۔

آبلہ پائی سے ڈرنے والے / تجھ کو منزل کے نشاں
نہ ملو گے سرگوں / ہر قدم [illegible]

...ال کے نقوش / صاحب فردا ہوں گے "

(فردا)

لمحوں کے پستوں پر / رک رک کے سوچتا ہوں /
...ے ہوئے سے نے / انسان کو کیا دیا ہے / یکساں میں یوں
...ے / اک دوسرے سے لیکن / انجانے سے رہے ہیں "

(انجان)

غزلیں اپنی روایتوں سے جڑے ہونے کے باوجود نئی
...ل کے امکانات سے وابستہ اور روشن نظر آتی ہیں۔

مجھ پہ کیسا یہ مقدر کا کرم ہے دیکھو
صبح اگمید بھی اب شام الم ہے دیکھو

میرے سر پہ سایہ ہے سبز سبز سالوں کا
بے خبر شجر بھی ہیں جیسا اذن دینے والوں میں

میرے سخن کو درد کا اسلوب مل گیا
یعنی غزل کو لہجہ مطلوب مل گیا

حسن کے جلووں سے ہوگی بزم حریفاں روشن
میری تقدیر کہ وہ مجھ کو بلانے آئے

کہیں تنہا ہوں کہیں آرزو کا صحرا ہوں
میں اپنے دور کی آواز ہی کا سایہ ہوں

...فنکار کا تخیل، اس کی نظر، اس کا احساس اور
...ندگی کا ... انفرادی ہوتا ہے۔ خارجی دنیا سے متاثر
...ونے کے باوجود اس کی انفرادیت قائم رہتی ہے۔ ادیب کی
...غزلیں اپنی روایتوں سے جڑے ہونے کے باوجود نئی غزل کے
... اور امکانات سے وابستہ نظر آتی ہے۔

آواز کا سایہ عبدالرحیم نشاپوری کے بنائے ہوئے
خوبصورت سرورق سے مزین ہے۔ کتابت اور طباعت بہتر
اور قیمت مناسب ہے۔

○

گلاب رت (شعری مجموعہ)

شاعر :- مصطفیٰ مومن
تقسیم کار :- سریدرس ہولیو، بھولی روڈ، دھنباد (بہار)
قیمت :- سات روپے

گلاب رت مصطفیٰ مومن کا مجموعہ کلام ہے، جو فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے مالی تعاون سے شائع ہوا۔ سرورق شمس ندیم کا بنایا ہوا ہے۔ کتاب کے پشت پر شاعر کی تصویر کے ساتھ "گلاب رت" کے عنوان سے ایک نظم بھی منسلک ہے۔

زیر نظر مجموعہ اس معنی میں انفرادی حیثیت کا حامل ہے کہ اس میں تمام تر غزلیں ہی ہیں، صرف "گلاب رت" کے عنوان سے اکلوتی نظم ہے اور کتاب بھی اسی نام سے منسوب ہے۔

مجموعے میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا لکھا ہوا پیش لفظ شامل ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے شعراء کس بے اعتمادی اور بے اعتباری کا شکار ہیں جو اپنی تخلیق کو بغیر کسی رائے کے شائع کرنے سے گھبراتے ہیں۔ کبھی کبھی اہم اور نمائندہ شاعر بھی "تقریظ" اور تعریف کے چکر میں غارت ہو جاتے ہیں۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ کہنا یہ ہے کہ مناظر عاشق ہرگانوی نے اپنے پیش لفظ میں جس موقف کا اظہار کیا ہے کم از کم مصطفیٰ مومن کی شاعری کا تعلق سے نہیں۔ پیش لفظ میں ہرگانوی صاحب نے بلجیم کے نامور مصور راجر سولولی کے علاوہ مجہئین نقاد راجر خیرا ڈ کے لمبے لمبے اقتباس کو نقل کیا ہے، ان اقتباس کے بغیر بھی مصطفیٰ مومن پر لکھا جا سکتا تھا اور خوب لکھا جا سکتا تھا۔ ڈاکٹر ہرگانوی کا پیش لفظ

کم از کم میری سمجھ سے بالا تر ہے۔ موصوف فرماتے ہیں،
• مصطفیٰ مومن کے نزدیک اس باطنی آہنگ کی
نشاندہی وجدانی ماورائے ادراک کے سرچشمے سے پھوٹتی
ہے۔ اور جمالیاتی کاوشوں میں مدغم ہوکر حاوی درجہ اختیار
کرتی ہے۔ (صفحہ ۶)
• مصطفیٰ مومن کی غزلوں میں زمانے کا اجتماع ہے"
(صفحہ ۶)
" احساس اعتبار سے مصطفیٰ مومن شعری تجربہ کو
تخلیقی عمل کے ذریعہ جو قالب عطا کرتے ہیں، وہ حواس
کی روائتی ترتیب و تزوین سے آزاد ہوتا ہے۔" (صفحہ ۶)

پیش لفظ میں ایسے جملے، فقرے اور پیراگراف
کے مناظر کثرت سے دیکھنے کو ملتے ہیں۔
بہرصورت، مصطفیٰ مومن کی غزلیں اردو کے
رسائل و جرائد میں پڑھنے کا موقع ملتا رہا ہے۔
زیر تبصرہ مجموعے کے مطالعے سے اس کی شاعری اور
فن کاری کی آر پختگی کا احساس ہوتا ہے۔ مصطفیٰ مومن
اپنے فکر و وقت کو جذبے کی آنچ میں تپ کر شعر کہنے کا سلیقہ
اور ہنر رکھتے ہیں۔ چند شعر

نہ روتے تھے، نہ ہنستے تھے، نہ کہتے تھے کسی سے کچھ
وہ کیسے لوگ تھے، جن کے دنوں میں آرزو کیا تھی

ننگی ہوا کا جسم ہے الفاظ سے خالی تمام
جلتے ہوئے صحراؤں میں بھٹکا کئے معنی تمام

یخ زدہ رستوں میں کوئی جسم سا بنتا گیا
دھوپ کی شدت سے ہر منظر نیا بنتا گیا

نہ جانے آگ کی جھیلوں میں ڈوبے ہیں تو کتنے
[illegible]

آگ پی آگ تھی بکھری وہ منظر کیسا تھا
شہر رخ انگاروں سے مدکشن نکھر گیا تھا

مذکورہ اشعار کی انفرادیت اور معنویت شاعری کی انفرادیت
کا ثبوت ہے۔ مصطفیٰ مومن اس لگن اور محنت سے شاعری
کرتے رہے تو اردو کے جدید اور نمائندہ شاعروں میں اپنا
مقام ضرور بنا لیں گے۔
خوبصورت گرد پوش سے مزین مجموعے کی قیمت
صرف سات روپے ہے بلاشبہ شاعر نے خالی منافعت کے توقع
کے بغیر پڑھنے والوں تک اپنی کتاب کو پہنچانا چاہتے ہیں۔
فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی کی مالی تعاون کا خوبصورت
نذرانہ قیمت کی شکل میں ادا کردیا گیا ہے۔ یقین ہے
پڑھنے والے زیادہ سے زیادہ خرید کر پڑھیں گے۔

تناظر (اٹھارہویں کتاب)

سال اشاعت:- مئی ۱۹۸۹ء تا اپریل ۱۹۹۰ء
قیمت:- ۸۰ روپے
تقسیم کار:- ادارہ شام یاراں ۱۴ ای / ۱ جھنڈے والان ایکسٹنشن، نئی دہلی - ۱۱۰۰۵۵

تناظر کا ہر شمارہ ایک اہم تخلیقی ادب کا دستاویز
اور اردو اینتھالوجی کے شکل میں شائع ہوا کرتا ہے۔ موجودہ
شمارہ یعنی اٹھارہویں کتاب کی شکل میں چار مالی عنوان کے
تحت کیا گیا ہے کہ
• صحیفہ اور رک شاہیں تو لوگوں کے لئے کار آمد
ہیں، جن میں تقریر سے جادو جگانے کا جوہر ہوتا ہے یا شاعر
کے مداریوں اور میراثیوں کی طرح لپک لپک کر سامعین
کو مرعوب کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ حقیقت کیا ہے کہ ان
[illegible]

مگر ادب کی زلف کبھی نہیں سنوری ۔ تقریر کا اثر چند گھنٹے رہتا ہے، تحریر میں صدیوں تک زندہ رہنے کی صلاحیت ہے۔"

(ادارہ)

اس شمارے میں فکشن کے نام سے کہانیاں اور افسانے شامل ہیں، جن میں اردو کے علاوہ عالمی ادیبوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ چند کے نام یہ ہیں۔

سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، قاضی عبدالستار، انتظار حسین، اقبال مجید، احمد یوسف، دیوندر ستیارتھی، شوکت حیات، اور زاہدہ زیدی، کا فکا، چیخوف، سلنکیشیر، ٹولسٹائی وغیرہ۔

شعر و ادب کے تحت، کہنہ مشق، مشہور اور جدید شاعروں کی غزلوں اور نظموں کا نمائندہ انتخاب ہے۔ علاوہ چلتے چلتے یعنی منتخب شعر پاروں کی فائل سے مختصر انتخاب۔

ادبی کشکول میں اظہار تشکر کے طور پر مرتب نے فرمایا ہے کہ ـــــ "ہم نے وعدہ کیا تھا کہ ہماری ہر اشاعت خصوصی پیش کش اور ان تمام اصناف سخن کا سفینہ ہوگی، جن پر زبان و ادب کے ناخداؤں کو ناز ہے۔ جہاں تک ممکن ہوا ہم نے اپنا قول نبھایا ہے۔"

یہ انیتھالوجی مناظر کے اولین جلدوں یا ان نثری و شعری تخلیقات کا انتخاب ہے جو ہمیں موصول تو مدتوں پہلے ہو چکی تھیں۔ مگر جن کی بروقت اشاعت نہ ہو سکی تھی۔ وہ جنوں اہل ذوق حضرات جو اپنے نجی کتب خانوں میں مناظر کی تمام جلدیں ایک ساتھ رکھنے کے خواہش مند ہیں ایک عرصہ سے ہمارے دور اول کی جلدوں کی مانگ کر رہے تھے یہ شمارہ انہی کا تحفہ ہے۔

دوسری زبانوں میں انیتھالوجی کا چلن عام ہے۔ اردو میں بھی اس نوعیت کا انتخاب بہت پہلے شاہ راہ میں شایع ہوا کرتا تھا۔ ۸۳-۱۹۸۲ء میں ابوالکلام قاسمی نے "انکار" کے نام سے دو کتاب شایع کی لیکن تیسری جلد کی اشاعت کی نوبت نہ آئی۔ غنیمت ہے کہ مناظر ۱۹۷۷ء سے ۱۹۹۰ء تک میں اٹھارویں کتاب اور ایک اہم انیتھالوجی اردو ادب کے قارئین کو پیش کیا ہے۔ بلاشبہ یہ انیتھالوجی نمائندہ ادیبوں اور شاعروں کا نمائندہ ادبی کشکول ہے۔

کتابت اور طباعت روشن اور شاندار ہے۔ گیٹ اپ خوبصورت۔ مضبوط جلد سازی اور ۵۵۰ صفحات ہے اور قیمت ۸۰ روپے مناسب ہے۔

رنگوں کا امتزاج

مرتب: سیفی سرونجی ۔ قیمت ۲۵ روپے

ملنے کا پتا: سیفی لائبریری ۔ سرونج (ایم۔پی)

رنگوں کا امتزاج کے عنوان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی شعری مجموعہ ہے، لیکن مذکورہ کتاب سرونج کے شعراء کا تذکرہ ہے جسے سیفی سرونجی نے مرتب کیا ہے۔ خود مرتب کا بیان ہے کہ۔

" سرونج کے شعراء کا تذکرہ اس سے قبل مرحوم دلکش ساگری نے "گمنام گوشے" کے نام سے مرتب کیا تھا، لیکن مرحوم دلکش ساگری کی کتاب "گمنام گوشے" کی اشاعت کے بعد مجھے ہمیشہ تشنگی محسوس ہوتی رہی، یہی سوچ کر میں نے سرونج کے شعراء پر کچھ مضامین لکھے جو آفتاب جدید، ندیم، اور رفقا میں شایع ہوتے رہے۔

رنگوں کے امتزاج میں اکیس شاعروں کا تفصیلی تذکرہ ہے اور بقیہ صفحات پر سرونج کے جدید شعراء کے علاوہ ۱۹۸۰ء کے بعد کے نوجوان شعراء کا تذکرہ بے حد سرسری طور پر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ "رنگوں کا امتزاج" میں حرف آغاز (اسماعیل ذبیح)، کچھ مصنف کے بارے میں (رؤف جاوید)

شہرِ خیال

(مکتوب نگاروں کے خیالات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں)

پروفیسر محمد حسن صاحب کے نام ایک خط

پروفیسر محمد حسن صاحب تسلیمات

دراں حالیکہ میں "مراسلہ بازی" بالخصوص اس نوعیت کی مراسلہ بازی سے جو صرف چپقلش پر مرکوز ہو بہت دور رہتا ہوں مگر میں نے جب جرأت کی ہے تو چند معروضات پیش کر دینا بے محل بھی نہیں سمجھتا۔

مجھے مسرت ہوتی اگر آپ میری سکالرشپ پر اعتراضات کرتے۔ میرے آپ کے درمیان بہت بڑے فاصلے ہیں۔ تعلیمی لحاظ سے بھی اور تصانیفی اعتبار سے بھی۔ ان امور پر اگر مزید روشنی ڈالنے کی ضرورت ہوئی تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔

ہندوستان کے سامنے صرف اردو زبان ہی ایک مسئلہ نہیں ہے۔ ملک کی سالمیت خطرے میں ہے۔ کشمیر سے لے کر آسام تک انتشار پیدا کرنے والی قوتیں مصروف کار ہیں اور ان قوتوں میں فرقہ وارانہ عناصر کا مخصوص رول ہے۔ جماعت اسلامی ہو، آر۔ ایس۔ ایس ہو، وشو ہندو پریشد ہو، مسلم لیگ ہو غرض کہ کوئی ہو، ان میں سے کسی کے ساتھ ایک پلیٹ فارم پر آنا حب الوطنی کا ثبوت فراہم نہیں کرتا۔ ہمارا اردو تحریک پر جماعت اسلامی کا غلبہ ہے، جو لغایت مذموم ہے پر جانے کیوں اردو میں ایسے "سرپھروں" کی کمی نہیں رہی ہے جو بڑی آسانی سے فرقہ واریت کا الزام لگاتے آئے ہیں۔ سرشار فرقہ پرست تھا، نسیم فرقہ پرست تھا، چکبست کو سروری نے اپنی تصنیف "جدید اردو شاعری" میں فرقہ پرست بتا دیا، پریم چند کو فرقہ پرست بتایا گیا، فراق گورکھپوری کو پاکستان کے کسی صدیقی نے فرقہ پرست قرار دیا، اور مجھے نہ جانے کتنے دفعہ اس القاب سے نوازا گیا۔ سہیل بھائی (سہیل عظیم آبادی) نے مجھے لکھا تھا کہ پریم چند اگر فرقہ پرست تھے تو ہندوستان میں ایسا کوئی شخص نہیں ملے گا جو فرقہ پرست نہ ہو۔ تعجب ہے کہ آپ "ابہام" کو نہیں سمجھتے PLEURTSIG-NATION یعنی جو کثیر معنویت کی نشاندہی کرے وہ ابہام ہے۔

آپ کے خط میں جو قابل لحاظ باتیں مگر غلط فہمی سے عبارت باتیں تھیں ان کا بھرپور جواب اپنے مضمون جو زبان کی اصلاح سے متعلق ہے دینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ عمر رسیدگی نیز حالات گذیدگی ایسے مواقع میں جو کوئی کام سنبھل کر کرنے ہی نہیں دیتے۔

اردو اور فارسی سے محبت رہی ہے مگر عمر گذری ہے انگریزی ادبیات کی درس و تدریس میں اور بس۔

آپ کا تارا چرن رستوگی

محبی مسعود جمیل صاحب۔ تسلیم

سہیل کا تازہ شمارہ ابھی کچھ دیر پہلے ملا اور سب سے پہلے "شہرِ خیال" پر نظر پڑی۔ محمد حسن صاحب کا خط پڑھ کر یاد آیا کہ میں نے بھی گذشتہ ہفتے جناب اصغر علی انجینیئر کے مضمون سے متاثر ہو کر آپ کو ایک خط لکھا تھا جسے شاید میرے ذہن کے تاریک گوشے کا اظہار اور فرقہ واریت کا آئینہ دار قرار

ـہ دیا جائے۔ میں چاہوں گا کہ اگر آپ کے سامنے کوئی مجبوری نہ ہو تو اس خط کو شہر خیال میں شائع کر دیں تاکہ میں بھی اپنے ذہن کے تاریک گوشوں کو مشتہر کرنے والا اور فرقہ واریت کو آلۂ کار بنانے والا کہا جا سکوں۔ امید ہے آپ مجھے مایوس نہ کریں گے۔

امریکہ نے بھی پنڈت جواہر لال نہرو کی غیر جانبدارانہ خارجی پالیسی کو جو آج تک ہندوستان کی خارجہ پالیسی کا ایک اہم ستون ہے بزدلی کہا تھا اور کئی برس تک کہتا رہا۔ لیکن انجام کیا نکلا؟ یہی کہ ایسے الزامات بعد میں خوشگوار ثابت ہوئے ہیں۔ اب آپ کے شہر خیال پر ایک نظر — محمد حسن صاحب کو ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کے ہندی مسلمان شاعروں کا ذکر با حوالہ مہمل نظر آیا ہے اور وجہ؟ "ہندی کے اردو ادیب ہیں ہی کتنے" چونکہ سہیل مجھے برابر موصول ہو رہا ہے۔ میں نے بھی ڈاکٹر رستوگی کا وہ مضمون پڑھا ہے۔ موصوف نے ایک گفتگو کا حوالہ دیکر صرف اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ ہندی والے اپنے شاعروں کو مذہبی فرقوں میں نہیں بانٹتے۔ اور میں نے دیکھا ہے کہ دوسری زبانوں میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ لیکن اردو کا معاملہ مختلف ہے۔ اس زبان میں صرف مسلمانوں کو شاعر کہا جاتا ہے دوسرے ہندو شاعر ہیں۔ عیسائی شاعر ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس بات کا تعلق تعداد سے نہیں بلکہ ایک ذہنی رویئے سے ہے۔ ورنہ مسلمانوں میں بھی ۷۲ فرقے ہیں اور اگر یہ اصول صحیح ہے تو مسلمان اردو شاعروں کو بھی ان فرقوں میں تقسیم کیا جا سکتا تھا۔ اس رویئے کو اہم یا غیر اہم تو کہا جا سکتا ہے لیکن اس کا بیان مہمل کیسے ہوا۔ اس انکشاف کو غلط بھی ثابت کیا جا سکتا ہے اور بصورت دیگر جائز بھی۔

پٹنہ سے بیتاب صدیقی صاحب نے ڈاکٹر رستوگی پر اقبال کی کردار کشی کا الزام لگایا ہے۔ موصوف یہ تو درست فرماتے ہیں کہ کردار کشی غیر اخلاقی ہے لیکن اخلاق کشی کے متعلق ان کا ذہن الجھا ہوا نظر آتا ہے۔ کردار کشی ہے کسی شخص کے فکر و عمل کو اس طرح توڑ مروڑ کر پیش کرنا کہ وہ دوسروں کی نظر میں برا بن جائے جبکہ اقبال برسوں سے ڈاکٹر رستوگی کی تحقیق کا موضوع رہا ہے اور اس موضوع کو جتنے عنوانات ڈاکٹر رستوگی نے دیئے ہیں ہندو پاک میں اور کسی نے نہیں دیئے۔ محقق کا کام حقائق کی پردہ کشائی ہے۔ اس سے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ اس کی تحقیق سے کونسا بت ٹوٹتا ہے اور کون بنتا ہے۔ تحقیق میں غلط فہمیاں نہیں ہوتیں جن کا ازالہ کیا جا سکے۔ ہاں تحقیق کے نتائج غلط ہو سکتے ہیں لیکن انہیں غلط ثابت کرنے کے لئے ٹھوس ثبوت چاہیئے۔ محض خیال سے کام نہ چلے گا

شہر خیال ہی میں منیر سیفی صاحب نے ایک بڑی دلچسپ بات کہی ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ ہندو شاعر یا ہندو ادیب اردو میں تعصب کی بنا پر نہیں بلکہ ہندوؤں کی تعریف و توصیف اور حوصلہ افزائی کے خیال سے کہتے ہیں اس کے ثبوت میں انھوں نے ایک واقعہ بھی درج کیا ہے۔ بس یہ نہیں بتایا کہ ایسا کرنے والے کون ہیں اور انہیں ایسا کرنے کی اجازت کس نے دی اگر بتاتے تو شاید کافر قرار دیئے جاتے۔ موصوف کی یہ بات بھی ادھوری ہے کہ اردو اکادمیاں مسودوں پر مالی امداد منظور کر دیتی ہیں۔ دہلی کی اردو اکادمی نے ایک غیر معروف شاعر کے مسودے کو مالی امداد کے ناقابل قرار دے کر واپس کر دیا اور جب شاعر نے وہ مسودہ خود شائع کر دیا تو اس پر چار ہزار روپے کا انعام دیدیا۔ شاعر نے انعام کے لئے کوئی کوشش نہیں کی تھی اور اس کا دہلی اردو اکادمی کے ٹھیکیداروں سے بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔ یعنی ہماری اردو اکادمیاں شیوجی کی طرح وردان دیتی ہیں جن کو پانے کے لئے تپسیا بھی ضروری نہیں ہے۔ بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ

یہ ہندوؤں کی "تعریف و توصیف اور حوصلہ افزائی" اردو کے لئے مضر ثابت ہو رہی ہے۔

امید ہے مزاج بخیر ہوں گے

آپ کا ـــــ ملراج حیرت (نئی دہلی)

○ محترم ـــــ آداب

حیرت صاحب کا خط پڑھ کر ذرا سی بھی حیرت نہیں ہوئی، کیونکہ ڈاکٹر گپتا کے خیال میں فرقہ واریت تعلیم یافتہ طبقے میں زیادہ ہے۔ (انڈین ایکسپریس ۲۳ نومبر ۸۹ء) حیرت صاحب اردو اور اردو والوں پر فرد جرم اس وقت عائد کر رہے ہیں جبکہ غیر کانگریسی حکومت نے گجرال کمیٹی کی سفارشات کو بیوروکریسی کے سرد خانے سے نکال کر ان سفارشات کے نفاذ کی خاطر کچھ ذیلی کمیٹیاں تشکیل دی ہیں تاکہ اردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کا کسی طور تدارک ہو سکے۔

حیرت صاحب اردو اور ہندی کے فکری رویئے اور مذکورہ زبانوں کے اہل قلم کی کشادہ ذہنی نیز ان میں سے چند مثلاً نیاز فتح پوری اور بقول حیرت معروضہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی تنگ نظری کے بارے میں اپنے دل کی بات ان کی زبان سے ادا کئے ہوئے جملوں کے سہارے بیان تو کر گئے۔ لیکن نیاز اور عبدالحق کی تنگ نظری کا کوئی ثبوت نہ پیش کر سکے۔ اگر نیاز مرحوم نے کوئی غیر ذمہ دارانہ بیان دیا تھا تب بھی نیاز کا خیال تمام اردو والوں کا خیال کس طرح ہو سکتا ہے۔ عبدالحق نے جس عہد میں یہ بیان دیا ہوگا اس دور میں پڑھے لکھے افراد "میں" اور "ہم" کے فرق سے بخوبی واقف تھے۔ ان لفظوں کی معنویت سے تو آج بھی لوگ واقف ہیں۔ ویسے حیرت صاحب نے جو بیان عبدالحق سے منسوب کیا ہے اس کی صحت اس وجہ سے بھی مشتبہ ہو جاتی ہے کہ موصوف تحریر فرماتے ہیں کہ "اردو اسلامی زبان ہے۔ میرے خیال سے یہ خیال بھی حیرت

صاحب کا ہے۔ ورنہ عبدالحق مرحوم اُسے "اسلامی زبان" تو حالت نزع میں بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ دراصل قصہ محض اتنا سا ہے کہ آزادی کے بعد کانگریس سرکار اور اس کے ہم خیال افراد نے پاکستان کے وجود کو ایک تاریخی حقیقت تسلیم نہ کرتے ہوئے ہندوستانی عوام کے سامنے عمداً گمراہ کن بیانات دے کر لسانی عصبیت سے فضا کو مسموم کرنا شروع کر دیا تھا جس میں انہوں نے مذہب اور اردو زبان کا بے جا اور بدترین استعمال کیا تھا بدقسمتی سے یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ سرکاری سطح سے اردو کو مسلمانوں سے وابستہ کرنے کی احمقانہ کوششوں کے باعث آج بہرحال اردو اور ہندی کے درمیان خلیج پیدا کر دی گئی ہے۔ نیز ہندوستانی عوام کے درمیان تفریق پیدا کرتے ہوئے دیگر زبانوں کے افراد اردو کو مسلمانوں کی زبان تسلیم کرنا شروع کر دیا ہے۔ جبکہ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ زبان کا مذہب کے ساتھ کبھی بھی کوئی سیدھا تعلق نہیں رہا ہے۔ بالخصوص اردو کے ساتھ تو کبھی بھی نہیں۔ مثال کے طور پر بنگلہ دیش، پاکستان، عرب امارات پھر اندرون ہند آ جائیں تو حیدرآباد، مہاراشٹر اور پنجاب کے مسلمان۔ جن کی مادری زبان کبھی بھی اردو نہیں رہی۔ البتہ مغلیہ دور حکومت میں اردو کو "عوامی رابطہ" کی زبان کے طور پر نافذ کیا گیا تھا جس کی وجہ سے غیر منقسم ہندوستان میں باہمی اتحاد و اتفاق کی فضا بنی رہی تھی۔ اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اس زبان "اردو" کی بنیاد پر مغلیہ دور حکومت کے کسی فرماں روا نے عوام پر کبھی بھی کسی قسم کے جبر کی ہلکی سی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ مغلیہ انتظامیہ سرکاری کام کاج چلانے کی خاطر کچھ اداروں میں مخصوص زبان (فارسی) کا استعمال کیا کرتی تھی۔

سے مجبور ہو کر ہم آج ذلت کے احساس میں مبتلا ہیں۔ یہ احساس اردو کا دیا ہوا تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ موصوف یہ کہتے کہ ط

ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے
یاران تیزگام نے منزل کو پالیا

علی امام نقوی

○ مکرمی! تسلیمات و آداب

ماہنامہ سہیل کے دو شمارے یکے بعد دیگرے موصول ہوئے۔ ان میں میری نظموں کو شائع فرمانے کا شکریہ۔

آپ کے اداریے سے دوسرے ذہن کی بھیڑی ہوئی۔ محترم اصغر علی انجینئر صاحب کا مضمون "ہندوستان میں اردو زبان کا مسئلہ" احوال واقعی سے روشناس کرتا ہے اور تاریخی کو مسئلے کے مناسب حل کی تلاش کی ترغیب دیتا ہے۔ اردو زبان کے مسئلے کو مذہبی احیا پرستی سے جوڑ کر جارحیت کو برقرار رکھنا ایسا قدم ہے جس کے نقصان کی تلافی ممکن نہیں۔

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی صاحب کا مختصر مضمون "سلمان رشدی" کا ناول معلومات افزا ہے۔ یقیناً خواہ مخواہ واویلا مچا کر قابل نظر انداز چیزوں کو شہرت دیتا ہے۔

شرون کمار ورما کا افسانہ "بھاگی ہوئی لڑکی" ہمارے موجودہ مہذب سماج کے المیہ کی داستان ہے۔

ڈاکٹر محمد محسن صاحب کا مختصر ترین مضمون "افسانہ جدید افسانہ جدید تر افسانہ" میں تجویز کردہ میزان قابل تقلید ہے۔ امید کہ مزاج بخیر ہوں گے۔

خلوص مند۔ صابر رومانی

○ مکرمی! السلام علیکم

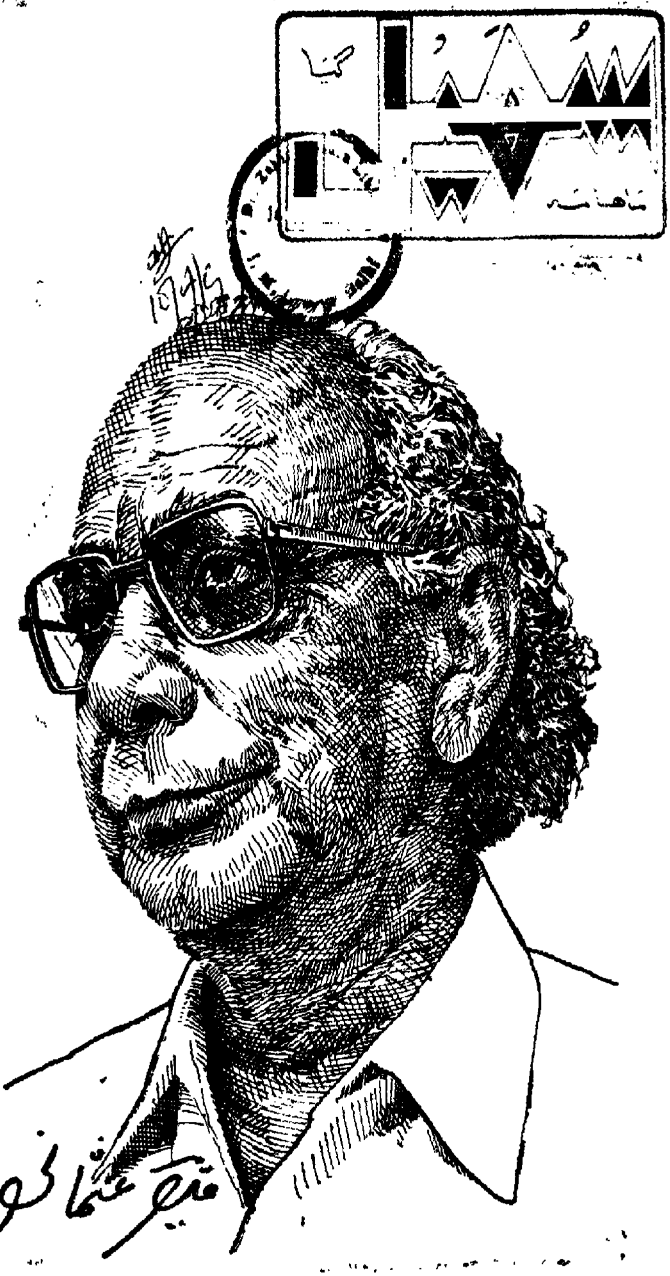
امید ہے بفضل تعالیٰ بخیر ہوں گے۔

سہیل کے تازہ شمارے میں تارا چرن رستوگی

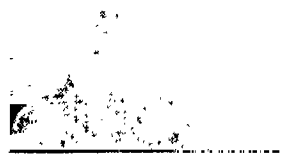
سے متعلق خطوط میں دو خط مختلف اور تین خطوط میں یکسانیت ہے۔ تعصب زبان فرقہ واریت ادب میں بھی سرایت کر چکی ہے اس بحث کو مشتہر نہ کیا جائے تو اچھا ہے ورنہ بات بڑھے گی اور خربوزہ کو دیکھ کر خربوزے رنگ بدلیں گے۔ نتیجہ اچھا نہیں برا ہوگا بگڑا ہوا ماحول اور بگڑنے کا اردو زبان و قومی یکجہتی کو نقصان پہنچے گا۔ اردو محبت کی زبان ہے۔ قومی یکجہتی اور اتحاد کی زبان ہے۔ اردو سے اتحاد کا کام لیا جائے۔ اردو کی ظلم، ناانصافی، استحصال اور غلامی کے خلاف آزادی، اتحاد، مساوات کے لئے جدوجہد کی ایک لمبی تاریخ ہے جسے ہندوستان اور ہندو مسلمان بھول نہیں سکتے۔ اس کا احساس ہر ہندوستانی کو کروانا چاہئے۔ اور سب خیریت ہے سہیل اور اسٹاف کے لئے نیک خواہشات۔

منصور اعجاز





ایک شمارہ قیصر عثمانی کے نام

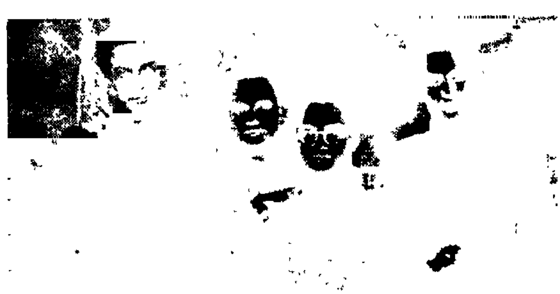


بیٹھے ہوئے دائیں سے۔ شاہد نیاز، قیصر عثمانی، (مدیر سہیل)
پیچھے ہوئے دائیں سے۔ عطاء اللہ پالوی، سہیل عظیم آبادی (۱۹۷۰ء)



[illegible] شباب کے ساتھ

قیصر عثمانی، ساحر لدھیانوی کے ساتھ (۱۹۷۰ء)



[illegible]

PARCHHAYION KA DESH

In his preface to his little book of clever observation in verse entitiled "Land of Shadows" the author Kaisar Usmani writes.

"The truth is always bitter"……… and explains to those who find some verses unworthy af a writer and unfortunate with deep respect I wish to say that I have just placed a mirror before the Film Industry and if certain aspects of its face appear uncouth, It is not the mirror's fault (nor, indeed, the author's)

His style is telling; its utter simplicity has caught the complexity of both filmie art and the hallowness of the film world.

"Parchaiyon Ka Des" is an unusual book of verses which flow with ease towards a revelation of sorry conditions one often comes accross in the film world and leave one sad hearted. The verses are eye openers, packed with sarcasm of which Kaisar Usmani is a Master. As example let me quote adopting the original.

"This is Chat garden which
is devoid of fragrance
Where every bough wears
a dress of paper
On all sides is gaping
artificiality
and the limit is that false
greenness
grims even his its winter

I congratulate Kaiser Usmani and his fine effort.

Harendra Nath Chattopadhyay

25-1-84

بانی:- حافظ محمد عبدالرحمٰن بسمل سنسہاروی مرحوم ۔ بیادگار:- زین العابدین احمر وادریس سنسہاروی

سُہیل گیا

ماہنامہ

جلد ۵ ★ جون، جولائی ۱۹۹۰ء ★ شمارہ ۶،۷

ایک شمارہ:- قیصر عثمانی کے نام

اس شمارے کی قیمت ۱۰۰ روپے

بدلِ اشتراک

فی شمارہ :- ۳/- روپے ● زر سالانہ :- ۳۶/- روپے ● الف نمبری :- ۵۵۱/- روپے

★ خط وکتابت وترسیلِ زر کا پتہ :- ماہنامہ سُہیل، ریور سائیڈ روڈ، گیا ۸۲۳۰۰۱ ★

فہرست

ہریندر ناتھ چٹوپادھیائے ــــــــ ۵
نمود ــــــــ ۹
قرۃ العین حیدر ــــــــ ۱۱
عطاء اللہ پالوی ــــــــ ۱۳
یوسف ناظم ــــــــ ۱۹
جمیل مظہری، جلیل بازید پوری (انٹرویو) ــــــــ ۲۳
سی۔ ایل۔ کاوش ــــــــ ۳۳
سلمیٰ صدیقی ــــــــ ۳۹
عادل رشید ــــــــ ۴۱
عزیز قیسی ــــــــ ۴۳
بلراج ساہنی ــــــــ ۴۷
علیم اللہ حالی ــــــــ ۴۹
شیدا امام ــــــــ ۵۱
ندا فاضلی ــــــــ ۶۱
گلشن جعفری ــــــــ ۶۳

مناظر عاشق ہرگانوی ــــــــ ۵
سید احمد قادری ــــــــ ۱۹
عبداللہ کمال ــــــــ ۱
زیڈ۔ اے۔ جوہر ــــــــ ۷
محمد حسین منشی ــــــــ ۱
رفیق جعفر ــــــــ ۵
قیوم اثر ــــــــ ۹۱
حفیظ وارثی ــــــــ ۹۶
مدھوسودن ــــــــ ۰۱
اشوک کمار، دھرمندر، پران ــــــــ ۰۲
طیب عثمانی ــــــــ ۰۳
فیاض حالی ــــــــ ۰۴
قیصر عثمانی "میرا گھر میرا وطن" ــــــــ ۰۶
قیصر عثمانی "جشن کشمیر" ــــــــ ۰۹
قیصر عثمانی "ایک نوجوان بیوہ سے" ــــــــ ۱۱۱

نمود

قیصر عثمانی اردو شاعری میں کوئی بڑا نام نہیں ہے۔

میں یہ بات اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ہمارے یہاں شاعروں اور ادیبوں کو ناپنے کا جو فیتہ ہے وہ کچھ عجیب سا ہے۔ جلسے جلوس کر کے، ملک بھر میں مشاعروں اور ادبی اجتماعوں میں شرکت کر کے رسالوں میں متواتر اپنی تخلیقات اور خطوط شائع کر کے، کسی ازم کی مخالفت یا وکالت میں سرگرم عمل ہو کر مشہور ہونے والوں اور اپنے ادبی کیریر کے لئے ہر طرح کا حربہ اپنانے والوں کو عام طور پر 'بڑے پن' کا تاج پہنایا جاتا ہے ——— اور قیصر عثمانی نے کبھی ان کاموں کا اختیار اور طرۂ امتیاز کی فکر نہیں کی۔

شاعری انہیں کیا دے سکتی ہے، ان کے کون کون سے مسائل حل کر سکتی ہے۔ انہیں دولت و مقبولیت کے حصول میں اسے کس طرح استعمال کرنا چاہئے۔ یہ سوالات کبھی قیصر عثمانی کے لئے قابلِ اعتنا نہیں رہے لیکن وہ شعر و ادب سے اپنے فطری رشتہ کو کبھی نہیں بھولے۔ اور ہر دور میں ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کئے بغیر تخلیق فن میں منہمک رہے۔ ظاہر ہے کہ تیاگ، خود فراموشی، بے نیازی اور استغنا کی جو بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے وہ قیصر عثمانی کو بھی ادا کرنی پڑی، ایسا آدمی دنیائے شعر و ادب میں کسی بڑے نام کا حامل کیوں ہو سکتا ہے۔

ماہنامہ سہیل نے 'بڑے پن' کو ایک دوسری عینک سے دیکھنے کی روش اپنائی ہے اور قیصر عثمانی کے نام یہ مخصوص شمارہ اس کی ایک روشن مثال ہے۔ قیصر عثمانی کے تخلیقی کردار کی اس خصوصیت کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے داخلی تخلیقی کرب نے انہیں رنگ و نور کی دنیا میں بھی مطمئن نہیں رہنے دیا۔ ایک چمک دار دنیا سے وابستگی عام حالات میں آدمی کو پورے کا پورا اپنے اندر ضم کر لیتی ہے۔ قیصر عثمانی نے اپنے اندرون میں اس وابستگی کی مداخلت کبھی گوارا نہیں کی، درمیانِ قعرِ دریا رہ کر بھی قیصر عثمانی ہمیشہ 'دامن تر مکن ہشیار باش' پر عمل کرتے رہے ——— اور یہ ان کی سچائی کی ایک دل آویز دلیل ہے۔

شعر و ادب کو نام نہاد بڑے فنکار کی نہیں سچے فنکار کی ضرورت ہے۔ ماہنامہ سہیل کا یہ نمبر سچائی کا ایک انعام ہے، بہت چھوٹا سا انعام۔

انعام معطی کی بساط کا مظہر ہوتا ہے۔ انعام یافتہ کی شخصیت کی میزان نہیں اس لئے یہ حقیر ہے تو ہماری بے بضاعتی کا آئینہ دار ہے، کوئی ہمارے اخلاص کو چیلنج نہیں کر سکتا۔

(ادارہ)

نئی حکومت : عزم اور ارادے

بہار کی موجودہ حکومت انتظامیہ کے نئے طریقے اور عوام کے مسائل کے تئیں متحرک ہے۔ نئی حکومت صوبہ کے چوطرفہ ترقی اور عام لوگوں کے مسائل کے حل کے لئے پر عزم ہے۔ صوبائی حکومت کے ان ارادوں نے نئی امیدوں کی کرنیں جگائی ہیں۔

وزیر اعلا شری لالو پرشاد کی قیادت میں صوبائی حکومت کے کچھ فیصلے

فرقہ وارانہ

- فرقہ وارانہ حادثوں کے لئے اس ضلع سے متعلق ضلع مجسٹریٹوں اور پولس سپرنٹنڈنٹوں کو مشترکہ طور پر ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا۔
- فرقہ وارانہ فسادات کے روک تھام کے لئے خاص پولس فورس بنایا جائے گا۔ متاثرہ افراد کو راحت اور دوبارہ بسانے کے کام میں تیزی لائی جائے گی۔
- مختلف تنظیموں کے ذریعہ امن وامان کی کوشش۔
- وزیر اعلا کے ذریعہ ۲۴ گھنٹوں کی بھوک ہڑتال۔
- ذمہ دار افراد کے خلاف فوراً تادیبی کاروائی۔
- حال میں رام نومی کا تیوہار امن وامان سے گذرا جو حکومت کے عزم کی علامت ہے۔

آپ کی سرکار آپ کے لئے

جاری کردہ: محکمہ اطلاعات وتعلقات عامہ، بہار

P. R. NO-123 (INF-92) 90-91

"پرچھائیوں کا دیس"
میری نظر میں

قرۃ العین حیدر

ہندوستان کی فلمی دنیا کے عجیب وغریب اور تکلیف دہ حالات سے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ مقالے اور کتابیں تصنیف کی گئی ہیں۔ سیمینار منعقد کئے جاتے ہیں۔ دوسری طرف پردۂ سیمیں کے منظر و پس منظر کی سنسنی خیز عکاسی پر بہت حد تک فلمی صحافت کا دارومدار ہے لیکن قیصر عثمانی کی نظم اس تنقید و تعریف اور سنسنی خیزی سے علیحدہ ایک موثر اور فنکارانہ مرثیہ ہے۔ ایک ایسا مرثیہ جس کے اختتام پر شاعر کے پاس مستقبل کے لئے پیغام امید بھی موجود ہے۔ دولت اور منافع کی بھیانک حد تک غلط تقسیم ہندوستانی فلم انڈسٹری کی کریہہ خامیوں کی ایک بنیادی وجہ ہے اور یہ صنعت موجودہ سماجی ڈھانچے کا محض ایک حصہ ہے۔ اس لحاظ سے فلم انڈسٹری کا ایک المیہ در اصل پورے معاشرے کا المیہ ہے۔ جہاں کروڑوں انسان زندگی کی معمولی آسائشوں سے محروم ہیں۔ اور مٹھی بھر افراد عیش و عشرت اور اقتدار کی ایسی زندگیاں بسر کر رہے ہیں جن کے مقابلے میں پرانے راجاؤں اور نوابوں کے عیش و عشرت کے افسانے بھی اب کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ قیصر عثمانی نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جو ہم سب کو اور ہمارے ناخداؤں کو پہلے سے بخوبی معلوم نہ ہو۔ مگر جب وہ کہتے ہیں کہ

" ہر جگہ علم کے پندار کو رسوا دیکھا
اور
خاک کے ذروں کو ہم دوشِ ثریا دیکھا
اور
دوشِ پرفن کے بصیرت کا جنازہ دیکھا
اور
فن کو ہر حال میں سر اپنا پٹکتا دیکھا
اور
نام بے وزن مگر شعر میں سکتا دیکھا"

وغیرہ تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ یہ طویل نظم فلمی تہذیب کے متعلق نہ صرف ایک حساس اور موثر کمنٹری ہے بلکہ یہ اچھی شاعری بھی ہے۔

" یہ گلستاں بھی ہے ممنون بہار اُردو "

اور

" سر تصویر مگر نام پہ پردہ دیکھا

کی داد نہیں دی جا سکتی۔

لیکن قصہ دراصل یہ ہے کہ جب تک پورے سماج کا ڈھانچہ نہیں بدلا جاتا "ادب آداب" اہل قلم کے ہاتھوں اسی طرح روتے رہیں گے۔

یادش بخیر

عطاء اللہ پالوی

آج سے تقریباً چار جگ پہلے، جس زمانے میں مسٹر عبدالحیٔ کی قیصر عثمانی کی عرفیت سے گیا میں شہرت پذیرائی کی دماغ سہیل پڑ رہی تھی، ان کے سخت اصرار اور شدید مطالبہ پر چند دنوں کے لئے غالباً اکتوبر ۱۹۴۳ء میں مجھے بھی عظیم آبادی کے ساتھ گیا جانا پڑا اور ان کے یہاں کریم گنج میں کئی دن ٹھہرنا پڑا تھا۔

قیصر کے بیرونی کمرے میں ان کی ایک بڑی تصویر آویزاں تھی۔ اس تصویر میں ان کی پیشانی اتنی چوڑی اور تابناک نظر آتی تھی کہ مجھے ایک دیدہ ور کا قول یاد آگیا تھا کہ "چوڑی پیشانی اقبال مندی کی نشانی ہے"۔ اس تصویر کے نیچے ان کا یہ شعر خوبصورت حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔

جبیں سے پھوٹ رہی ہے کرن محبت کی
نہاں ہیں دل میں ترے کوئی ماہ پارہ کیا؟

قیصر کی شاعری کی تو مجھے خبر ہوئی تھی مگر میں یہ نہ جانتا تھا کہ ان کے دل میں فلمی دنیا کی طلسماتی فضا میں سما جانے کا شوق انتہائی جوش و خروش کے ساتھ [illegible] انگڑائیاں لے رہا ہے۔

قیصر "شعر" اور "چائے" کے بڑے رسیا تھے۔ انہوں نے میری اور سہیل کی بڑی خاطر داری و قدر دانی کی تھی۔ گیا کا شاید ہی کوئی چائے خانہ ایسا بچا ہو جہاں انہوں نے ہم دونوں کو لے جا کر چائے نہ پلائی ہو اور روزانہ کم از کم ۱۰-۱۲ پیالی چائے پینے پر مجبور نہ کر دیا ہو۔ البتہ انہوں نے ہم دونوں کو کوئی فلم نہیں دکھائی تھی جس سے اندازہ ہوتا کہ وہ فلمی شائق ہیں۔ اس دور کی ایک یادگار، ہم سب کی تصویر میرے گھر میں آویزاں ہے۔

قیصر کے دل کا یہ پوشیدہ راز کہ وہ فلمی دنیا میں داخلے کے بڑے شیدائی تھے [illegible]

کے مخالف بھی۔ کیونکہ قیصر ایک خوش فکر، ہونہار اور ابھرتے ہوئے شاعر ہیں اور مجھے بھی ایسا لگتا تھا کہ وہ آئندہ بہار کے ایک بلند پایہ شاعر کا مقام حاصل کرلیں گے، اور میں ان کی اقبال مندی کا خواہاں اور اسے دیکھنے کا متمنی تھا۔

گیا کے دوران قیام ایک دلچسپ واقعہ قابل ذکر ہے قیصر اور سہیل علامہ ریاست علی ندوی کے ملاقاتی تھے اور ان سے ملنے کے خواہاں۔ موصوف اس زمانے میں ماہنامہ "ندیم" گیا کے مدیر تھے۔ میں لوگوں سے ملاقات بڑھانے یا مشہور لوگوں سے ملنے ملانے کا شائق کبھی نہیں رہا۔ اس لئے میں نے وہاں جانے سے انکار کردیا۔ ندوی صاحب میرے نام سے واقف تھے۔ میرا ایک دو مضمون انہوں نے بہ اصرار طلب کرکے "ندیم" میں شائع بھی کیا تھا، مگر صورت آشنا نہ تھے۔ قیصر اور سہیل جب بہت بضد ہوئے تو میں اس شرط پر راضی ہوا کہ وقت ضرورت میں اپنا تعارف آپ کراؤں گا۔ آپ دونوں کو اس معاملے میں دخل نہ دینا ہوگا۔

ندوی صاحب نے غالباً مجھے اپنے پرانے شناساؤں کا ساتھی سمجھا اور تعارف کی نوبت ہی نہیں آئی۔ کافی دیر تک علمی ادبی موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ چائے پی جاتی رہی۔ جب ہم لوگ رخصت ہونے لگے تو یکایک ندوی صاحب نے میرے متعلق قیصر اور سہیل سے سوال کردیا کہ آپ کون صاحب ہیں؟ تم لوگوں نے تعارف نہیں کرایا؟ میں نے سبقت کرکے عرض کیا کہ میرا نام عبدالحق ہے اور میں ایک دیہاتی اسکول میں معلم ہوں۔ ندوی صاحب بڑے فاضل، بڑے ذہین و ذطین، بڑے دیدہ ور اور بڑے منصف تھے۔ فرمانے لگے۔ ہم لوگوں کے درمیان جتنی علمی و ادبی گفتگو ہوئی ہے اس سے تو میرے لئے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ ایک دیہاتی اسکول کا معلم اتنا باخبر ہوسکتا ہے ... تاریخ مغلیہ کا ... سی

اہم اور مشہور و معروف کتاب کے مصنف ہیں۔ ایک مقبول ایام ماہنامہ کے مدیر ہیں۔ میں اتفاق سے گیا آیا ہوا ہوں۔ سوچا کہ آپ کی زیارت کرلوں۔ کیا آپ دیہاتی اسکول کے معلموں کو نرا جاہل ہی تصور فرماتے ہیں؟ انہوں نے معذرت کی اور ہم لوگ چلے آئے۔ بعد میں، جب میرے گیا کے تاثرات "میرا سفرنامہ" کے عنوان سے "سہیل" (گیا) کے فروری نمبر ۱۹۴۲ء میں چھپے اور ندوی صاحب نے پڑھا جس میں ندوی صاحب سے اس ملاقات کا بھی ذکر تھا تو سہیل تو ان کو نہ ملے البتہ موصوف نے سارا بخار قیصر پر اتارا، جس کا علم مجھے قیصر کے خط سے ہوا۔

بعد میں ایک مرتبہ سہیل عظیم آبادی نے خبر دی کہ قیصر کلکتہ جاکر، پبلسٹی آفیسر کی حیثیت سے، فلمی دنیا سے وابستہ ہوگئے ہیں۔ کچھ ہی دنوں کے بعد پھر انہوں نے ہی بتایا کہ قیصر فضلی برادرز لمیٹیڈ کمپنی کے ساتھ بمبئی چلے گئے۔ ۱۹۴۲ء میں میری ملازمت ہوگئی۔ اور میں چھپرہ چلا گیا۔ اور پٹنہ، گیا ہر جگہ کے حالات سے بے خبر ہوگیا۔ نہ قیصر کی کوئی خبر ملی اور نہ سہیل سے کوئی تعلق رہا۔

فلمی دنیا کی زرفشانی نے ابتداً اردو زبان کے بڑے شاعروں کو اپنی طرف کھینچا تھا۔ اس کی دلکش رنگینیوں اور پراثر سحر آگینیوں نے اچھے اچھے ہونہار نوجوانوں کے دلوں میں محشرستان بپا کیا تھا۔ وہاں کے دلچسپ ذوق نمائش نے ایک سے ایک خوبصورت دوشیزاؤں کے دل کو گدگدایا تھا اور وہاں یہ سب لوگ، یکے بعد دیگرے، پہنچتے گئے تھے۔ فلمستان میں داخلہ کو بہت سے نوجوان زندگی کی معراج سمجھتے تھے اور سینکڑوں دوشیزاؤں کے دل میں طوفان بپا رہا۔

جہاں تک کہ شاعروں کا تعلق ہے وہ زر کشش کے لئے فلمی دنیا میں داخل تو ضرور ہوتے گئے مگر اپنی شاعری کی موت کو سامنے دیکھ کر جلد ... واپس ... ہو ... کو

ہر آگئے تھے۔ تاہم انہیں یہ ہمت نہ ہوئی تھی کہ اس دنیا سے متعلق اپنے تاثرات کو بے محابا بیان کر سکیں یا جو کچھ انہوں نے وہاں دیکھا تھا عوام کو دکھا سکیں۔

ناریل باہر سے بڑا سخت دکھائی دیتا ہے، مگر اس کو توڑنے پر یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کے اندر کیسی تری جمی اور گھلی ہوئی ہے۔ کا پھل باہر سے بڑا خوبصورت اور رنگ برنگی نظر آتا مگر اس کو چکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس کا حسن کیسا تلخ و بد مزہ ہے۔ کسی چیز کی حقیقت باہر سے دستیاب نہیں ہوتی۔ فلمی دنیا کی بیرونی سحر سامانیاں اور نمائشی قیامت زائیاں نوجوانوں اور دوشیزاؤں کے دل میں شوق و جذبہ کا سمندر موجزن کر دینے والی ہوتی ہیں۔ انہیں دیکھ کر ہر سنجیدہ شخص کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہے

تو ہر چہ می نمائی ہستی ؟

ہونہار شاعروں میں قیصر عثمانی اس طلسمی دنیا میں داخل ہوئے اور خوبصورت دام میں گرفتار ہوئے تو پھر باہر نہ نکل سکے اور اب تک محسور بھی رہا اور ملول بھی۔ غالباً اس کا خاص وجہ ہے۔

قیصر عثمانی محض عشق و محبت والے شاعر نہیں تھے جو غزل گوئی میں لایعنی کتب اور بے معنی دردِ خ باقی کو ہی معراج شاعری سمجھیں۔ فلمی دنیا سے انتہائی حد تک دلچسپی کی وجہ ان کی جوانی کے تقاضے اور مع مبالغہ لئے ہوئے افسانے ہی نہ تھے بلکہ شاید قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ ایک ایسی شخصیت کو اس رنگین دنیا میں پہنچا دے جو دیدۂ بینا، قلب سلیم اور حساس دماغ رکھنے والی ہو اور وہ اتنی صلاحیت بھی رکھتی ہو کہ وہاں جو کچھ دیکھے شاعری کے کیمرے میں اس کا فلم تیار کرے جسے عوام دیکھ سکیں۔

اس وقت میرے سامنے قیصر عثمانی کی ایک کتاب "پرچھائیوں کا دیس" ہے جو ۵۵ بند پر مشتمل ایک مسدس ہے۔

مراثی بھی مسدس کی شکل کے ہوتے ہیں جس کو میر انیس نے اپنایا اور اسے معراج کمال عطا کر دیا۔ اس مسدس کا مقصد مذہبی جذبہ کی تسکین اور ادب و شاعری کو نقطۂ عروج پر پہنچا دینا تھا۔ اقبال کی مشہور نظم "شکوہ، جواب شکوہ" مسدس ہیں جو عظمت و شہرت کے آسمان پر تابندہ ہیں جس میں قادر الکلامی، شاعرانہ حسن اور جذبۂ اصلاح کارفرما ہے۔ مگر مسدس کا لفظ سامنے آتے ہی حالی کے مسدس (مد و جزر اسلام) کی طرف ہی بے ساختہ ذہن منتقل ہو جاتا ہے جو مسلم قوم کی اصلاح کی غرض سے لکھا گیا تھا اور اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوا تھا۔

"پرچھائیوں کا دیس" بھی ایک مسدس ہے جس کی انفرادیت فلمی دنیا کی فلم، شاعرانہ حسن کے ساتھ عوام کو دکھانا اور مسلم نوجوانوں اور دوشیزاؤں کو حقیقت کا انکشاف کرا کے ان کی آنکھوں پر پڑے ہوئے پردے کو ہٹاتا ہے۔ اس کی حیثیت بھی اصلاحی ہے۔

مسدس وہ نظم ہے جس کے چار مصرعے ہم قافیہ ہوں اور آخر کی بیت بطور گرہ دوسرے قافیہ کے ساتھ ہو۔ "پرچھائیوں کا دیس" کی انفرادیت و خصوصیت یہ ہے کہ گرہ کا ہر چھٹا مصرع ہے۔ "فلمی دنیا میں عجب میں نے تماشہ دیکھا"

آخر کے کچھ بند اس قید سے مستثنیٰ ہیں۔ اسی صفحات کی یہ کتاب بہت صاف ستھری چھپی ہے۔ یہ ایک نہایت با معنی اور پر کیف مسدس ہی نہیں، شعری حسن و نزاکت کی حامل شاعری ہی نہیں بلکہ حقیقت مآبی اور صداقت پروری کا مصحف بھی ہے۔ قیصر صاحب نے اس فلمی دنیا میں جو کچھ بچشم خود دیکھا ہے اسے پوری کامیابی سے دوسروں کو بھی دکھایا ہے۔ اس کے مختلف بندوں میں متفرق مناظر کی عکاسی

کی گئی ہے۔ رعایت لفظی اور لطف بیان سے عمدہ طریقہ پر کام لیا گیا ہے۔ حقیقتاً یہ کتاب بجائے خود ایک درس آگہیں دل کش فلم ہے۔ کتاب کی ابتدا اس بند سے ہوئی ہے۔

یہ وہ گلشن ہے جو خوشبو سے سدا خالی ہے
پیرہن کاغذی پہنے ہوئے ہر ڈالی ہے
جس طرف دیکھئے نقالی ہی نقالی ہے
حد تو یہ ہے کہ خزاں کبھی ہریالی ہے
فصل گل میں کبھی کبھی رنگ خزاں کا دیکھا
فلمی دنیا میں عجیب میں نے تماشا دیکھا

[illegible] سارے [illegible] پنہاں ہیں اور اس پہلے بند میں فلمی دنیا کی پوری تصویر دنیا کی آنکھوں سے دیکھی جا سکتی ہے۔ [illegible] حقیقت کچھ نہیں ہے۔ سب کچھ ڈھونگ [illegible] در اصل ناپید ہے" پرچھائیں" کے سوا زندگی کا کہیں پتہ نہیں۔ اصل غائب صرف نقل کی کارفرمائی ہے۔ یہاں ہر چیز سودا کی طرح "بکتی" اور "خریدی" جاتی ہے۔

آرٹ بکتا ہے یہاں شعر و ادب بکتا ہے
حسن بکتا ہے یہاں "لغزش لب" بکتا ہے
ناز بکتا ہے ادا بکتی ہے سب بکتا ہے
خوب ہر مال یہاں بکتا ہے جب بکتا ہے
کبھی بڑھتے ہوئے بازار کو گرتے دیکھا
فلمی دنیا میں عجیب میں نے تماشا دیکھا

یہ منظر جتنا حسرتناک ہے، اتنا ہی حقیقت آب بھی ہے۔ [illegible] بکتا ہے" کیا اس کی وضاحت اس کے حسن شعری کو مجروح نہ کر دے گی؟ آخری مصرعہ تو غضب کا ہے۔

خوب ہر مال یہاں بکتا ہے جب بکتا ہے

فلمی دنیا کی ادھر اُدھر سے سنی ہوئی کہانیاں "ایسا کہانیاں"

نہیں۔ یہ وہ کچھ رہا ہے جو انہیں کے اندر زندگی گزا ہے۔ اسی کا نام ہے گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ یہ دیکھئے۔ شاعرانہ حسن سے ہی مالامال نہیں ہے بلکہ رعایت لفظی کی صناعیاں بھی یہاں کارفرما ہیں۔ انداز ہی شاعرانہ نہیں الفاظ بھی فنکارانہ استعمال ہوئے ہیں۔

کبھی اک ذرۂ ناچیز یہاں موتی ہے
قسمت لعل و گہر برسوں کبھی سوتی ہے
قلقل مینا ادھر راحت جاں ہوتی ہے
آنکھ نرگس کی اُدھر شام و سحر روتی ہے
جو زمیں بوس ہے وہ بام ثریا دیکھا
فلمی دنیا میں عجیب میں نے تماشا دیکھا

اس سے بھی زیادہ غمناک و حسرتناک منظر ملاحظہ ہو۔ خون کے آنسو روئیے۔

عقل عیار ہے اور حسن کی نادانی ہے
دام صیاد ہے طائر کی پریشانی ہے
دُرّ عصمت کی اک امید پہ قربانی ہے
آبرو کچھ بھی نہیں، بہتا ہوا پانی ہے
جس کو دیکھا اسی سیلاب میں بہتا دیکھا
فلمی دنیا میں عجیب میں نے تماشا دیکھا

"دُرّ عصمت کی اک امید پہ قربانی ہے" سنی آپ نے یہ کہانی — دیکھا آپ نے یہ تماشا — ؟ چشم بینا ہو تو اس اندھی نگری کو بھی دیکھتے ہی چلئے۔

پوری محنت کا جہاں اجر ہو آدھی روٹی
ساری دنیا میں نہ ہوگی کوئی منڈی ایسی
یہ وہ نگری ہے جہاں جنس ہنر ہے سستی
یہ وہ بستی ہے کہ کہئے جسے اندھی نگری

[illegible]

فلمی دنیا میں عجب میں نے تماشا دیکھا

حافظ شیراز کا مصرعہ آپ نے سنا تھا کہ وہاں

طوق زریں ہمہ در گردن خرمی بیم

قیصر عثمانی کا مشاہدہ بھی جانتے چلئے۔

طوق زریں جو یہاں گردنِ خر پاتی ہے
بد مذاق یہ زمانہ کو ہنسی آتی ہے
چاند تاروں کی یہ دنیا طلسماتی ہے
ایک ہی رات میں تقدیر بدل جاتی ہے

کھپ اندھیرے سے ابھرتا ہوا جلوہ دیکھا
فلمی دنیا میں عجب میں نے تماشا دیکھا

جس طرح پھول پہ عمل جراحی سے اس کی نزاکت کا خاتمہ ہو جاتا ہے، اسی طرح اس بند کے چوتھے اور پانچویں مصرعوں کی وضاحت اس کے شاعرانہ حسن و رنگ کو ملیامیٹ کر دے گی۔ آنکھ بند کر کے سوچئے کہ کیسا المناک منظر ہے؟ فلمی ہیروئنوں کو دیکھ کر، ہر جوان دوشیزہ کے سینے میں ہیروئن بننے کی تمنا بڑی شدت سے تڑپنے لگتی ہے۔ اور خود وہ پوزیشن حاصل کرنے کا شوق کروٹیں لینے لگتا ہے۔ مگر فلمستان میں اس کی کیا پوزیشن ہوتی ہے؟ اور وہ کن کن مرحلوں سے گذر کر اس منزل پر پہنچتی ہے؟ اور پھر اس کا کیا حشر ہوتا ہے؟ یہ قیصر صاحب سے سنئے ۔

شمع محفل بھی ہیں، شمع شبستاں بھی ہیں
لالہ و گل بھی ہیں خنجر و پیکاں بھی ہیں
رشک بلبل بھی ہیں جانِ بہاراں بھی ہیں
... بدلی جو ہوا ... بھی ہیں

پھر نہ اس بت کا کوئی چاہنے والا دیکھا
فلمی دنیا میں عجب میں نے تماشا دیکھا

قطرہ قطرہ یہ طرب گاہ خرابات بکی
کبھی اس ہاتھ بکی اور کبھی اس ہات بکی
ہر ادا جنس، تجارت ہوئی ہر بات بکی
مول ہر دن کا معین ہوا، ہر رات بکی

جس کی قیمت کا بھی کوئی نہ ٹھکانہ دیکھا
فلمی دنیا میں عجب میں نے تماشا دیکھا

چوتھا مصرعہ پڑھئے، پھر پڑھئے اور دیکھئے کہ فلموں میں جو "ہیروئن" آپ کو نظر آتی ہے اور جس پر نثار ہو جانے کو سینے میں دل مچلنے لگتا ہے وہ کس قیمت پر "ہیروئن" بننے کا فخر حاصل کرتی ہے اور اسے کب یہ رول ملتا ہے۔ وہ "پرچھائیں" جو پردہ فلم پر نظر آتی ہے کیا ... ہے؟ وہ حسن جو چادر سیمیں سے لوگوں کے دلوں میں اترتا نظر آتا ہے، کیا واقعی حسن ہے؟ دوسرا کون جانے۔ مگر قیصر صاحب بتلاتے ہیں کہ ؎

اک طرف حجرۂ آرائش و تزئین جمال
عیب کو حسن بناتا ہے جہاں زورِ کمال
کبھی ہوتی ہے یہاں دل کی تمنا پامال
کبھی ملتا ہے یہاں لطفِ شبستانِ وصال

جو "سرِ پردہ" نہیں وہ پسِ پردہ دیکھا
فلمی دنیا میں عجب میں نے تماشا دیکھا

یہ تو کامیابیوں کا حال ہے: "ناکامیوں" کا بھی حال سن ہی لیجئے۔

کسے مطلوب نہیں جوہر ذاتی کی نمود
فطرتاً سب میں طلب گار مقام محمود
کون ہے دل میں نہیں جس کے ہو موجود
ہیں مگر کتنے جنہیں ملتا ہے درِ مقصود؟

پھر یہاں خونِ تمنا سے پیالا دیکھا

عبدالحئی عرف قیصر عثمانی

یوسف ناظم

بمبئی میں ہر شخص (بشمول راقم) ایک نمونہ ہے۔ یہ ذات خود ایک اکائی ہے۔ اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس شخص کا آغاز کہیں اور ہوتا ہے اور وہ صرف اپنے اختتام کے لئے بمبئی آتا ہے۔ بمبئی میں جو کچھ وہ کرتا ہے اسے اردو میں کشمکش حیات کہا جاتا ہے۔ اس کشمکش حیات میں حیات کا عنصر بس اتنا ہی ہوتا ہے، جتنا کہ نئی شاعری میں شاعری کا ہوتا ہے — برائے نام۔ اس شہر میں جو شخص اپنی 'شناخت' پیدا کرلیتا ہے، سمجھنا چاہئے اس نے بہت کچھ کرلیا۔ شناخت سے مراد وہ نشان شناخت نہیں جو کسی زخم کا نشان داہنے کان کے نیچے یا کوئی تل زیریں لب کے مشرقی کنارے پر ہوتا ہے۔ یہ 'شناخت' بڑی مشکل سے پیدا بلکہ حاصل کی جاتی ہے۔ ورنہ بمبئی جیسے شہر میں جہاں ایک پڑوسی کا دوسرے پڑوسی کو جاننا منع ہے آدمی چند ہی دنوں میں خود کو پہچاننا بھول جاتا ہے اور چند دن بعد کسی شناسا سے پوچھتا ہے کیا میں وہی شخص ہوں جو پچھلے ... گیا سے یہاں آیا تھا۔

قیصر عثمانی بھی کوئی چالیس سال پہلے بمبئی آئے تھے۔ اس وقت یہ قیصر عثمانی نہیں تھے۔ عبدالحئی تھے۔ یہ عبدالحئی نام کچھ جادوئی قسم کا نام ہے۔ جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے اردو شاعری میں تین عبدالحئی ہیں — ایک تو اصلی عبدالحئی جن کا تخلص تاباں تھا لیکن ان کا کلام کسی سے ڈھکا چھپا نہیں تھا — یہ کئی سال پہلے کی بات ہے یعنی ان اصلی عبدالحئی کو آئے اور گئے کوئی دو صدیاں تو ہو چکی ہوں گی۔ یہ بھی میر تھے کیونکہ اس زمانے میں جتنے بھی شاعر تھے تقریباً سب کے سب میر تھے۔ میر تقی میر، خواجہ میر درد، میر ضاحک، سید محمد میر سوز، اور بھی شاعر ہوں گے جن پر محمد حسین آزاد کی نظر نہیں پڑی ہوگی۔ انہیں میں میر عبدالحئی تاباں بھی تھے۔ اس کے بعد دوسرے عبدالحئی تھے۔ ساحر لدھیانوی۔

انہیں" کہتے دیکھنے میں آج بھی تکلیف ہوتا ہے۔ اور کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے وہ یہیں کہیں ہوں گے اور کسی مشاعرے میں آکر دو چار کرارے شعر سنا دیں گے اور بیٹھنا چاہیں گے تو ہر طرف سے آوازیں آئیں گی "جشن غالب" نہیں "تاج محل" نہیں "خون پھر خون ہے" اور تیسرے عبدالحی نہیں یہ قیصر عثمانی، معلوم نہیں ان کے گھر میں بھی اطلاع ہے یا نہیں کہ یہ قیصر عثمانی اصل میں عبدالحیٔ ہیں۔ انہوں نے اپنا نام اس طرح چھپا کر رکھا جیسے نام نہ ہو "حشیش" ہو، ... کا صحیح نام معلوم ہوا اس نے بھی کہا۔ نہیں نہیں قیصر عثمانی ایسا نہیں کر سکتے۔ وہ اتنے پُراسرار نہیں ہو سکتے قیصر عثمانی کا نام بھی اتنا ہی پوشیدہ رہا جتنا کہ ان کا اصلی نام بمبئی میں وہ کئی سال ایک سالانہ مشاعرہ کرتے رہے ہیں۔ ان کا یہ سالانہ مشاعرہ بھی محمد طفیل کے "نقوش" کی طرح ایک خصوصی نمبر ہوتا تھا۔ شہر سے بہت دور مضافات میں ایک نہایت ہی غیر شاعرانہ نام کے مضافات "ملاڈ" میں یہ سالانہ مشاعرہ اس اہتمام سے منایا جاتا تھا گویا پھول والوں کی سیر کی طرح کا کوئی میلہ ہو۔ ایک مرتبہ شاعر یہاں کسی طرح پہنچ جاتا تو اس کا واپس جانا ناممکن ... دوسرے دن کا سورج طلوع ہونا ہی چاہیے ... کم صبح کاذب تو نمودار ہونی چاہیے۔ قیصر عثمانی ... کچھ کرتے تھے۔ دو دو ہزار واٹ کے گولے لگوائیں گے ... بنوائیں گے، شامیانے ایسی تیار کرائیں گے کہ شاعر کا جی چاہے کہ وہ اپنا کلام پڑھنے کی بجائے اپنا عقد پڑھوالے دو دو چار چار مائیکروفون اس طرح کھڑے کر دیں گے کہ شاعر ان کے پیچھے چھپ جائے ۔۔۔ یہ سب کچھ کریں گے ... شاعروں کی واپسی کا بندوبست نہیں کریں گے ۔۔۔ نہیں کہ وہ ... نہیں سکتے بلکہ اس لئے کہ کوئی شاعر

اپنی مرضی سے واپس نہ جائے۔ ہر شاعر دوسرے شاعر کا کلام سنے، اس لئے سنے کہ اس کا کلام دوسرے شاعر نے برداشت کیا تھا۔ قیصر عثمانی اپنے ان مشاعروں کی وجہ سے اتنے مشہور ہو گئے کہ اکثر لوگ انہیں "سالانہ مشاعرے" کے نام ہی سے پکارنے لگے۔ معلوم نہیں یہ تنہا کیسے یہ سارے انتظامات کر لیتے تھے۔ انہوں نے الہ دین کا چراغ صرف اسی مشاعرے کے لئے استعمال کیا۔ سال میں ایک مرتبہ اسے باہر نکالتے اور پھر سینت کر رکھ دیتے۔ کسی اور کے پاس یہ چراغ ہوتا تو اتنا گھسا جاتا کہ جن بھی چراغ پا ہو جاتا۔

قیصر عثمانی نے بمبئی کو ٹھیک طریقے سے سمجھ لیا تھا ... "ڈریس" اور "ریڈ ڈریس" کا شہر کہا جاتا ہے۔ یہاں آدمی ہمیشہ سوٹ پہنے رہے تو خود اس پر چاہے گذرے دیکھنے والوں کو بڑی مسرت ہوتی ہے اور جہاں تک ریڈ ڈریس کا معاملہ ہے اس کا مطلب ہے "طلاقت" (غطابت) اس کمال کا مظاہرہ عبدالحیٔ نے نہیں کیا۔ شاید انہیں ضرورت ہی نہیں پڑی۔ ان کا سوٹ ہی کافی تھا۔ ان کے بریف کیس نے جو ان کا ہمیشہ رفیق رہا۔ ان کا جھکاؤ دائیں جانب کو دیا (ساحر لدھیانوی بائیں جانب کے آدمی تھے) یہ ہمیشہ اسی طرف جھک کر چلتے رہے۔ کچھ بریف کیس تو ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں کچھ ہو یا نہ ہو آدمی بہر حال جھک جاتا ہے۔ قیصر عثمانی ادبی جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ سب کو نظر بھی آئیں۔ ادھر کئی سال سے انہوں نے اپنا سالانہ مشاعرہ نہیں کیا ہے (کیونکہ مشاعرہ بہر حال مشاعرہ ہوتا ہے عرس نہیں ہوتا) اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اب ان کی شہرت کی بنیاد تبدیل ہو گئی ہے (حالانکہ

[illegible] قطرہ [illegible] سب [illegible]
[illegible] وہی قیصر [illegible] جنہوں نے
[illegible] بند کئے ہیں ۔ قیصر عثمانی کے ساتھ
[illegible] بند کچھ منسلک ہو کر رہ گیا ہے ۔ کئی سال پہلے
[illegible] سستی کے ٹیرس پر ایک کیفے ٹیریا تھا
تھا اور یہ اس طرح مقبول ہوا تھا کہ شام کے پانچ
[illegible] پہنچانے والی لفٹ کے سامنے قطاریں لگ
جاتی تھیں ۔ [illegible] قطاروں میں نئے نویلے بیاہتا جوڑے
[illegible] عمر کو پہنچنے والے ان بیاہے لڑکے لڑکیاں کچھ
[illegible] نوجوان [illegible] کچھ ایسے لوگ جن کی نظر یا حسرت کبھی
[illegible] بلندی سے موجود ہوتے ۔ یہ عبدالحئی بھی اتنی پابندی
[illegible] کیفے ٹیریا میں جانے لگے کہ آخر کار منتظمین کو اسے
[illegible] کرنا پڑا ۔ مجھے اس کیفے ٹیریا سے انہوں نے ہی متعارف
[illegible] کیا تھا ورنہ میں اور اتنی بلندی — یہ "بند" اصل میں
[illegible] سے یوں منسلک ہوا کہ انہوں نے کئی سال پیشتر جب
[illegible] خواجہ حیدر علی آتش کی طرح جوان تھے ایک نظم
[illegible] تھی جس میں ۵۵ بند تھے ۔ اب یہی "بند" روپ بدل
[illegible] کر ان کے سامنے آ رہے ہیں ۔ ان کی نظم "پرچھائیوں کا
[illegible] تو بیاہ اتنی ہی مقبول ہوئی جتنی [illegible] کی "پرچھائیاں"
[illegible] "پرچھائیاں" کے ایڈیشن کے ایڈیشن چھپے
[illegible] قیصر عثمانی کی نظم نایاب ہو گئی ۔ اب تو شاید ان کے
[illegible] بھی اس کتاب کا نسخہ موجود نہ ہو ۔ ایسا یاد پڑتا
[illegible] ظ ۔ انصاری (ہمارے ظ ۔ انصاری) نے اس نظم کے
[illegible] لکھا تھا یہ نظم بے ضرر تو ہے بے شر نہیں ۔ (ظ
انصاری یہ الفاظ ہر جگہ استعمال کرتے ہیں) ۔ یہی نظم
[illegible] لوگوں کو یہ اطلاع بہم پہنچائی کہ [illegible] حضرت سید شاہ
عبدالحئی [illegible] پھیکوی مرحوم کے صاحب زادے جو

کریم گنج گیا سے بھاگ کر اور اپنا نام بدل کر بمبئی پہنچے ۔ کسی
خانقاہ سے نہیں فلمی دنیا سے متعلق ہیں ۔ قیصر عثمانی نے
بچپن میں قرآن کی سورتیں پڑھیں اور جوانی میں فلمی صورتیں
دیکھیں ۔ وہ تو کہئے پہلے کی سورتیں انہیں حفظ تھیں یہاں
پہنچ کر وہ انہیں بھولے نہیں ۔ یہاں کی صورتوں میں کھو جاتے
تو پتہ نہیں صورت حال کیا ہوتی ۔

قیصر عثمانی جب عبدالحئی تاباں کی طرح نوجوان
تھے تو گیا میں رسالہ "سہیل" کے ایڈیٹر ہوا کرتے تھے یعنی
[illegible] میں بھی وہ اتنے عالم فاضل تھے کہ ایک ادبی رسالے
کی ادارت کے فرائض انجام دے سکتے تھے ۔ مرشد خاندان
کا ایک نوجوان جسے کسی کے حلقہ ارادت میں ہونا چاہئے
تھا ایک رسالہ کے شعبۂ ادارت میں تھا ۔

"سہیل" بنیادی طور پر ایک ستارہ ہے ۔ اسی
لئے قیصر عثمانی کو بعد میں ستاروں کی دنیا سے واسطہ
پڑا ۔ اور اس فلمی دنیا میں انہوں نے طرح طرح کے تماشے
دیکھے (یہی ۵۵ بند والی نظم) — "سہیل" آج بھی شائع
ہوتا ہے اور اگر قیصر عثمانی جنہوں نے قدم اٹھانے سے
پہلے قلم اٹھایا تھا اس سے اپنا رشتۂ ازدواج منقطع
نہ کرتے تو ہندوپاک کے سب سے قدیم صحافی ہوتے ۔ لیکن
یہ کیا کم ہے کہ بمبئی شہر میں ان کے صرف سر کے بال سفید ہوئے
ہیں خون سفید نہیں ہوا ہے ۔ ورنہ یہ شہر تو ایسا ہے کہ
اگر کسی سے ناراض ہو جائے تو خرقہ و سجادہ رہن
رکھنے پر ایک قطرۂ آب بھی نہ ملے ۔ دلی میں تو غالب
کو اس کے بدلے بوتل بھی مل جاتی تھی ۔

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہن مے
مدت ہوئی ہے دعوت آب و ہوا کئے

قیصر عثمانی نے معلوم نہیں کب ایک ادبی [illegible]

کی ولدیت قبول کی تھی۔ یہ اس کی پرورش سے اب بھی دست کش نہیں ہوئے ہیں اور ہر مہینے کے دوسرے سنیچر کو اپنے گھر پر ایک مشاعرہ نہ سہی مشاعری ضرور کرتے ہیں۔ لوگ کم ہوں تو ان کے دیوان خانے میں شاعروں کے دیوان کھلتے ہیں۔ ان کی عمارت کی چھت پنڈال کا کام دیتی ہے۔ چھت پر مشاعرہ ہو تو اس میں فائدہ یہ ہوتا ہے کہ واہ واہ کا کتنا ہی شور ہو چھت اڑ نہیں سکتی۔

ابھی تھوڑے دن پہلے ان سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ فلمی دنیا میں ان کی نظروں کے سامنے اب تک کیا کیا ہوا اس کی روداد قلم بند کر رہے ہیں۔ "یادوں کے جزیرے" یا جزیرہ نما کچھ ایسا ہی نام بتایا۔ اس کتاب کے کچھ ٹریلرز "سہیل، روبی، فلمی ستارے" اور ہند پاک کے دیگر رسائل وجرائد میں آ بھی چکے ہیں۔ جب یہ کتاب چھپ جائے گی (جو ان کی چوتھی تصنیف ہوگی) تو یقین ہے ظ۔ انصاری (ہمارے ظ۔ انصاری) ضرور رائے دیں گے۔ بہ ضرر تو ہے بے ضرر نہیں۔ یہاں ایک بات یاد آ گئی۔ حضرت جلیل مانک پوری، آصف جاہ سابع کے استاد تھے اور جب بھی آصف جاہ سابع کا کلام حیدرآباد کے کسی اخبار میں چھپتا رائے استاد جلیل کے ساتھ ہی چھپتا۔ یہ رائے یہ رائے کچھ مقررہ الفاظ پر مشتمل ہوتی اور لوگوں نے تو یہاں تک کہنا شروع کر دیا تھا کہ حضرت جلیل نے اپنی رایوں کی مہریں بنا کر رکھ لی ہیں۔ یہ غلط ہے مہریں صرف بادشاہوں کی ہوا کرتی تھیں۔ اساتذہ کی نہیں۔ اور یہاں پر اس واقعہ کے ذکر کا کیا محل ہے۔

۱۵ر مارچ سنہ ۱۹۶۰ء کی تاریخ مجھے اس لئے یاد تھی کہ میں اس تاریخ کو بمبئی آیا تھا۔ اس ۱۵ر ۱۵ سال پورے ہو گئے۔ سوچا تھا کیوں نہ ایک سلو کی داغ بیل ڈالی جائے۔ پھر خیال آیا یہ کون کارنامہ ہے؟ —— ہاں یہ عبد الحی چاہیں تو گولڈن جبلی مشاعرہ ضرور کرا سکتے ہیں —— کوئی کام ہوگا —— سنہرے کارڈ چھپیں۔ لوگ دوڑے آئیں اور قیصر عثمانی حسب معمول ان کی دا کوئی انتظام نہ کریں۔

فلم و ادب کے سنگم قیصر عثمانی سے ایک گنگا جمنی ملاقات

ملاقاتی

• جمیل منظر (مدیر سہیل گیا)

• جلیل بازید پوری

قیصر عثمانی صاحب جتنے کامیاب شاعر ہیں اتنے ہی کامیاب ادیب بھی ہیں۔ ان کی منظوم تخلیق "پرچھائیوں کا دیس" ایک کتاب ہی نہیں بلکہ فلم زدہ لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے ایک سوغات ہے۔ اس کتاب کو آپ ایک ادبی ڈش بھی کہہ سکتے ہیں جس کے ذائقہ اور خوشبو میں انفرادیت ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد میں نے تو یہی محسوس کیا ہے کہ قیصر عثمانی صاحب نے فلمی دنیا سے وابستہ ہونے کے باوجود ہمیشہ ادب کو فلم پر ترجیح دیتے رہے ہیں۔ شاعر ہونے کے باوجود ان کی رگِ شوق فلمی گیتوں کے لئے اور بھرے بھرے نوٹوں کے لئے کبھی نہیں پھڑکی۔ جبکہ فلمی دنیا کی چمک دمک سے اچھے اچھوں کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ مگر ان کی آنکھیں فلمی قمقموں سے محفوظ ہیں۔ یہ فلمی کیبن میں بیٹھنے کے باوجود ادب کے دروازے پر دستک دے رہے ہیں اس لئے کہ ادب سے دیوانگی کی حد تک ان کو پیار ہے۔ مجھے تو ان کی کتاب "پرچھائیوں کا دیس" پڑھنے کے بعد ان کے بارے میں بیلی (Bailey) کا قول یاد آرہا ہے جس کا اردو ترجمہ ہے۔ شاعر خیالات پیدا نہیں کرتے بلکہ خیالات خود شاعروں میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ جیسے جنگلوں اور میدانوں میں خدا کی قدرت سے خود رو درخت اور پھول پیدا ہوتے ہیں۔ شاعر کی روح اور اس کا جسم فطرت سے وابستہ ہے۔ اس کے دل پر کائنات کی تمام صورتیں منقوش ہیں۔ شاعر کتابوں میں قید نہیں وہ قوت اور روح جس کی تجھے تلاش ہے تیرے ہی آس پاس موجود ہے تجھ میں ہے اور پھر ہر جگہ موجود ہے۔

شاعری کے رنگارنگ پھول قیصر صاحب میں بھی خود بخود ہی کھل رہے ہیں اس لئے کہ ان کے مشاہدات اور تجربات میں گہرائی اور گیرائی ہے شاعری کی اسا سے

بڑھ کر اور کیا تعریف کی جا سکتی ہے کہ ایک شاعر حقیقت کو انقلاب امکانات کے ساتھ محسوس کرے اور اس میں تخیل کی آمیزش سے رومانی چاشنی پیدا کر دے۔ مدیر سہیل گیا جمیل منظر صاحب سے جب میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے قیصر عثمانی صاحب سے انٹرویو لینے کی خواہش کا اظہار کیا کیونکہ وہ سہیل "کا قیصر عثمانی نمبر" نکال رہے ہیں۔ میں نے انہیں فون کیا اور پھر جذبۂ شوق کے تحت ہم دونوں اتوار کی شام ملاقات اسی وقت ان کی رہائش گاہ پر پہنچے جب سرمئی اجالے سیاہ اندھیرے کی گود میں جانے کے لئے بے تاب تھے وہ ہم دونوں کے لئے پہلے ہی سے منتظر تھے رسمی باتوں کے بعد چائے کی گوری گوری دو پیالیاں آ گئیں اور "انٹرویو" کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

جلیل :- آپ کے ذہن میں شاعری کی تحریک کیوں پیدا ہوئی۔ اگر شاعر نہ ہوتے تو کیا ہوتے؟

قیصر :- شاعری قدرت کی دین ہے اور تحریک ماحول کی پیداوار۔ میرے والد محترم الحاج حضرت سید شاہ عبدالعزیز آزاد مرحوم پایہ کے محقق، ناقد اور فارسی اردو کے شاعر تھے۔ جنہیں تلمیذ غالب حضرت سید شاہ باقر حسین باقر پیر بیگھوی کے عزیز اور شاگرد ہونے کا فخر حاصل تھا۔ گھر کیا تھا شعر و ادب کا گہوارہ تھا۔ لیکن گھر عربی فارسی اور اردو کی بے شمار کتابوں سے بھری ہوئی الماریوں سے مزین تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے عہد طفلی میں جب اردو کی ایک ابتدائی کتاب "حکایات شیریں" میرے زیر مطالعہ تھی تو اس کی چھوٹی چھوٹی کہانیوں کو نظم کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اس وقت میری عمر آٹھ سال سے زیادہ نہیں تھی اور میں نے جس کہانی کو سب سے پہلے منظوم کرنے کی کوشش کی تھی اس کا پہلا شعر تھا — جا رہی تھی ایک دن بڑھیا کہیں

راستے میں اک مسافر مل گیا

آپ نے پوچھا ہے کہ اگر میں شاعر نہ ہوتا۔ اگر نہ ہوتا تو صرف ایک ایسا بندۂ خدا ہوتا جو زندگی کی تہ در تہ حقیقتوں سے نابلد ہوتا ایک ایسے پیڑ کی طرح ہوتا جو ہرے بھرے پتوں سے خالی ہے۔ ایک ایسا فرد ہوتا جس میں زندگی کی گوناگوں لطافتوں کو محسوس کرنے کی صلاحیت نہ ہوتی۔ جگر مراد آبادی نے شاید اسی خیال سے یہ شعر کہا تھا۔

اللہ اللہ رے ہستی شاعر

قلب غنچہ کا آئینہ شبنم کی

جمیل :- پہلا شعر، پہلی غزل یا پہلی نظم آپ نے کس طرح جنم دی اور اس کا عنوان کیا تھا؟

قیصر :- پہلا شعر تو وہی ہے جو میں اوپر سنا چکا لیکن میری پہلی نظم (کسی کی اصلاح کے بغیر) ہے جو صرف پانچ شعر پر مشتمل تھی اور جو بڑی آب و تاب کے ساتھ مونگیر سے شائع ہونے والے ماہنامہ "طالب" کے پہلے صفحہ پر رنگین نقش و نگار کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ میں اپنی اس اولین کوشش میں جب اس قدر کامیاب ہوا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس وقت میری عمر غالباً تیرہ چودہ سال ہو گی اور میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ میری یہ نظم اردو سے والہانہ محبت کا نتیجہ تھی۔

جمیل :- لیکن شاعر آپ کی نظر میں کون ہے؟

قیصر :- میری نظر میں شاعر وہی ہے جس کی نشاندہی جگر مراد آبادی نے مندرجہ بالا شعر میں کی ہے۔

جمیل :- آپ کن شاعروں سے متاثر ہیں ؟

قیصر :- اوائل عمر میں مجھے جن شعراء نے بہت زیادہ متاثر کیا اس میں جوش ملیح آبادی، اختر شیرانی، احسان دانش اور علامہ جمیل مظہری کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔

جمیل :- جدید شاعری اور ترقی پسند شاعری آج دو قسم کے ذہنی رویے ہیں ۔ اس بارے میں آپ اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں اور یہ بھی بتائیں کہ آپ کی شاعری جدیدیت سمیٹے ہوئے ہے یا ترقی پسندی ؟

قیصر :- بنیادی طور پر شاعری ہر دور میں شاعری ہی رہتی ہے البتہ مختلف ادوار میں اس کی ہیئت ضرور بدل جاتی ہے اور اسے بدلنا بھی چاہئے ۔ شعر و ادب اپنے اپنے دور کا آئینہ دار ہوتا ہے ۔ اور وہ جس ماحول میں ہوگا اس سے اس کا اثر پذیر ہونا ضروری ہے۔ ترقی پسند شاعری سے پہلے کسی شاعری کو عام طور سے یا رجعت پسند شاعری کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے میں اس شاعری کی طرف اشارہ کر رہا ہوں جو گل و بلبل کی شاعری کہلاتی تھی ایک دور ایسا آیا جب ہی اسے ادیبوں اور شاعروں نے ادب برائے زندگی کا نظریہ اپنایا اور سامراجیت کے خلاف بھی لکھنا شروع کیا ۔ چنانچہ ہمارے شعر و ادب نے یکسر نیا رنگ نیا آہنگ اختیار کر لیا اور اسی لئے رنگ اور نئے آہنگ کا نام ترقی پسند ادب پڑ گیا ۔ اس نئے رنگ میں خوب خوب لکھا گیا اور مقبول ہوا پھر حصول آزادی کے بعد رفتہ رفتہ حالات میں تبدیلی آتی گئی انسان ذہنی اور روحانی الجھنوں میں بھی کچھ زیادہ ہی مبتلا ہونے لگا ۔ اور کرب تاکی عام زندگی کا مقدر بن گئی ۔ چنانچہ اس کرب ناکی دور میں جو بھی شاعری کی گئی یا کی جا رہی ہے وہ سراسر ایک نئے رنگ کی حامل ہے ۔ خیالات میں نیا پن، اسلوب میں نیا پن، الفاظ کے رچاؤ میں نیا پن کی حد تک تو اس قسم کی شاعری کی قدر کرتا ہوں ۔ اسے آپ جدیدیت کہئے یا ترقی پسندی کی توسیع کچھ بھی کہہ لیجئے ۔ آج کے حالات میں چلنے والی یہ جدید شاعری یقیناً سراہے جانے کے قابل ہے لیکن جدیدیت کے نام پر کی جانے والی ناقابل فہم شاعری یا افسانہ نگاری مجھے بالکل پسند نہیں ۔ میں نے بہت کم شعر کہے ہیں شاید ایک ہزار اشعار سے زیادہ کا سرمایہ نہ ہو لیکن جو کچھ بھی کہا ہے محسوس کر کے کہا ہے اب آپ اسے میری کمزوری سمجھئے یا خوبی جانیے ۔ جب تک مجھے کوئی چیز متاثر نہیں کرتی میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا ۔ خواہ نثر ہو یا نظم ۔ ویسے میں بذات خود کسی زمانے میں ترقی پسند ادب کا زبردست حامی تھا اور جب رسالہ "سہیل" گیا کا ایڈیٹر بنا تو میں نے اسے ترقی پسند ادب ہی کا ترجمان بنانے کی کوشش کی تھی لیکن اب تو حقیقت یہ ہے کہ ترقی پسند ادب بھی کچھ پرانا پرانا سا لگتا ہے ۔ میری شاعری ترقی پسندی سے تو متاثر ہو سکتی ہے لیکن جدیدیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔

جمیل :- الفاظ آپ کے تخلیقی احساسات کے اظہار میں مانع ہوتے یا معاون ؟

قیصر :- حقیقت یہ ہے کہ جب میرے دل و دماغ پر اداسی غالب ہوتا ہے کوئی واقعہ، کوئی حادثہ یا کوئی خاص ماحول میری روح کو جھنجھوڑنے لگتا

ہے تو میری شعری تخلیق بے ساختہ الفاظ کا جامہ پہنا شروع
کر دیتی ہے۔ الفاظ یقیناً اس سلسلے میں معاون
ثابت ہوتے ہیں۔

جلیل :- کیا کسی منظوم تخلیق کے بعد آپ مکمل طور پر
سبکدوش ہو جاتے ہیں اور اطمینان محسوس کرتے
ہیں؟

قیصر :- ویسے تو جب کسی نظم کی تخلیق کا عمل جاری رہتا
ہے مجھے کوئی خاص کد و کاوش نہیں کرنی پڑتی خیال
خود بخود الفاظ کے سانچے میں ڈھلنا شروع ہو جاتا
ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی غیبی طاقت
ہے جو ایک خاص وقت میں مجھ سے شعر غزل یا نظم
کہلوا دیتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جب نظم مکمل ہو جاتی
ہے تو میں قطعی طور پر اطمینان محسوس نہیں کرتا۔
میری خود تنقیدی کی عادت اسے زیادہ سے زیادہ
سنوارنے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔

جمیل :- کیا آپ اپنے لئے لکھتے ہیں یا دوسروں کیلئے؟

قیصر :- اس کا جواب میں کیوں دوں گا جیسے کوئی حسینہ
آئینہ کے سامنے موجود اپنا بناؤ سنگار کرتی ہے لیکن
دوسرے وقت یہ بھی ضرور سوچتی ہوگی کہ وہ بعد
میں دیکھنے والوں کے لئے کتنی پرکشش ثابت ہوگی
شاعر کے دل میں بھی تخلیق عمل کے وقت یہ احساس
ضرور رہتا ہوگا اور میں بھی اس سے مبرا نہیں ہوں۔

جمیل :- اپنے تخلیقی سفر میں آپ کن کیفیات اور تجربات
سے دوچار ہوتے ہیں؟

قیصر :- بہت دلچسپ سوال ہے۔ میں جب کبھی اپنے
تخلیقی سفر میں ہوتا ہوں تو میں اپنے گرد و پیش سے
قطعاً بے خبر ہو جاتا ہوں۔ ایک ایسی کیفیت میں
مبتلا ہو جاتا ہوں کہ دیکھنے والے میرے چہرے
غیر معمولی تغیرات کو فوراً بھانپ لیتے ہیں۔ م
اس کا پتہ نہیں چلتا۔ جن دنوں فلمی دنیا سے متا
میری نظم "پرچھائیوں کا دیس" وجود میں آ
رہی تھی میں ان کیفیات سے بہ طور خاص دو
ہو رہا تھا۔ ایک دن کا ذکر ہے میں چرچ گیٹ
اپنے گھر کے لئے لوکل ٹرین میں ملاڈ جا رہا تھا را
کا وقت تھا اور ریل کا ڈبہ کھچا کھچ بھرا تھا۔
میں بیٹھے ہوئے کچھ گجراتی افراد اپنی زبان میں ا
طرح باتیں کر رہے تھے جیسے وہ اپنے گھر کے دا
خانے میں بیٹھے ہوں۔ لیکن کچھ دیر بعد میں نظ
تخلیق کے دوران کچھ ایسا کھو گیا کہ مجھے با
پتہ نہیں چلا کہ ٹرین کتنے اسٹیشنوں کو پیچھے
چکی ہے۔ آنکھیں کھلی تھیں لیکن ہوش غا
جب یہ کیفیت کچھ کم ہوئی تو مجھے یہ دیکھ کر بڑ
حیرت ہوئی کہ جس بھرے ڈبے میں میں بیٹھا تھ
وہاں دو چار آدمی رہ گئے تھے۔ ٹرین ویرار
چکی تھی یعنی ملاڈ سے تقریباً بیس میل دور

جمیل :- بہ حیثیت شاعر آپ زندگی کی تشریح کس
طرح کریں گے۔

قیصر :- زندگی خدا کی حسین ترین دین ہے اس حقی
کے باوجود کہ آج دنیا میں ہر طرح کا بحران ہے
زندگی سے بڑا پیار ہے اور زندہ دلی میری فطرت
میں داخل ہے کسی شاعر نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ ز
زندہ دلی کا ہے نام مردہ دل خاک جیا کرتے
اگر میرا بس چلے تو میں ہمیشہ جینا چاہوں اور مکم
حسن و توانائی کے ساتھ مگر قادر مطلق کے نقط

کوکون بدل سکتا ہے؟

جلیل :- کیا پرانے شاعر ماضی میں سانس لے رہے ہیں اور موجودہ حقیقتوں کو قبول نہیں کر رہے ہیں؟

نفیس :- کچھ پرانے شاعر ضرور ایسے ہیں جو صرف ماضی میں سانس لے رہے ہیں وہ اپنی پرانی ڈگر سے ہٹنے کو شاید کفر سمجھتے ہیں لیکن کئی ایسے بھی ہیں جو جدید رنگ میں بھی جو کچھ کہہ رہے ہیں خوب کہہ رہے ہیں۔ وہ موجودہ حقیقتوں سے گریز نہیں کرتے۔

جلیل :- آپ کو کس قسم کے واقعات سے تحریک ملتی ہے؟

نفیس :- ایسا کوئی بھی واقعہ جو دل کو چھو جائے مجھے لکھنے پر فوراً آمادہ کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر جب میں بیس سال کا تھا مجھے ایک حسین و کم سن بیوہ کو دیکھ کر بڑا دکھ ہوا تھا اس کا سر سے پاؤں تک سفید لباس میں ملبوس ہونا پہلے صرف ایک شعر کا محرک بنا۔ پھر پوری نظم ہو گئی اس نظم کا متذکرہ بالا شعر تھا۔

اجلے کپڑوں میں ہے تو کیسی مگن
زیبِ تن ہو جیسے شوہر کا کفن

میرا یہ شعر سن کر ایک دن علامہ جمیل مظہری مرحوم تڑپ اٹھے تھے اور مجھے اپنے گلے سے اس طرح لپٹا لیا تھا جیسے ان پر کوئی دورہ پڑ گیا ہو۔ ایک دوسری مثال جب میں حالات سے مجبور ہو کر اپنا گیا کا آبائی گھر بیچ دیا تو بعد میں مجھے اس کا کچھ اتنا احساس ہوا کہ ایک نظم "میرا وطن میرا گھر" ہو گئی۔ یہ میری چند معروف و مقبول نظموں میں سے ایک ہے جس نے مجھے بھی رلایا ہے اور دوسروں کو بھی۔

جلیل :- آپ کی زندگی کے خواب کیا ہیں؟

نفیس :- ایک دیرینہ خواب یہ ہے کہ اگر اللہ نے موقع دیا تو ایک دن عالمی سیر ضرور کروں گا۔ دیکھئے یہ خواب کب شرمندۂ تعبیر ہوتا ہے۔

جلیل :- اپنی شاعری کے بارے میں غیر جانبداری سے کہئے؟

نفیس :- یہ شعری سرمایہ کچھ زیادہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے اس وقت کچھ کہا ہے جب میں کسی واقعہ یا مشاہدہ سے متاثر ہوا ہوں فطری طور پر میں نظم کا شاعر ہوں فطری طور پر میں نظم کا شاعر ہوں بچپن سے نظمیں کہہ رہا ہوں۔ غزلیں بھی کہی ہیں لیکن میں ان سے کچھ زیادہ مطمئن نہیں ہوں۔ "بیوہ" "میرا وطن میرا گھر" "کشمیر" اور "پرچھائیوں کا دلیس" میری پسندیدہ نظمیں ہیں۔ "پرچھائیوں کا دلیس" مسدس کی شکل میں ۵۵ بند کی ایک طویل نظم ہے جس نے مجھے شہرت بھی دی ہے اور عزت بھی۔ میں نے اس نظم کے لئے دانستہ طور پر مسدس کا فارم اختیار نہیں کیا تھا بلکہ برسوں کے مشاہدات و تجربات کے نتیجہ کے طور پر جو لاوا میرے اندر پیدا ہو رہا تھا وہ بے ساختہ مسدس کا پیکر اختیار کر کے سامنے آ گیا۔

جلیل :- اردو کے دم بھرنے والے ادیب کیا اپنے گھروں میں بچوں کو اردو پڑھا رہے ہیں؟

نفیس :- یہ صحیح ہے کہ آج ہی سارے بچے زیادہ تر اردو سے نابلد ہوتے جا رہے ہیں لیکن اس کے لئے صرف والدین کو قصوروار قرار دینا زیادتی ہے دراصل بات یہ ہے کہ حصول آزادی کے بعد اردو کو اسکول سے نکالے جانے کے بعد یہ تبدیلی آئی ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں اردو اور فارسی دونوں زبانیں نصاب میں شامل تھیں اور بچے ذوق و شوق سے اردو اور فارسی

پڑھا کرتے تھے لیکن آج جو صورت حال ہے وہ ایسی نہیں ہے کہ ہمارے بچے عام طور سے اردو پڑھیں اس افراتفری کے زمانہ میں والدین کو اتنی فرصت کہاں ملتی ہے کہ وہ اس مسئلہ پر دھیان دیں۔ آج جب کہ نئے وزیر اعظم راجیو گاندھی کی قیادت میں ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور متعدد تبدیلیاں سامنے آرہی ہیں ضرورت ہے کہ حکومت کی سطح پر تعلیم و تدریس کا ایک نیا سانچہ بنایا جائے اور ایسا ہو کہ ہر طالب علم شروع ہی سے اردو کے ساتھ ہندی پڑھے اور ہندی کے ساتھ اردو۔ اس طرح یہ دونوں زبانیں قریب سے قریب تر ہو جائیں گی لیکن رسم الخط بدلنے کا مشورہ میں کبھی نہیں دوں گا۔ کیونکہ اردو کا رسم الخط بین الاقوامی رسم الخط ہے۔

جمیل :۔ فلموں میں اردو کا مستقبل کیا ہے؟

قیصر :۔ جب سے ہندوستان میں فلموں کا شروع ہوا ہے فلمسازوں نے اردو کی ہندوستان گیر مقبولیت سے فائدہ اٹھایا ہے اور اٹھاتے چلے جا رہے ہیں۔ یہاں ایک حقیقت اور بیان کر دوں ہماری فلمی دنیا کے وہ حضرات بھی جو اردو کے نام سے الرجک ہیں مجبوراً مکالموں اور گیتوں کے لئے اردو کے شاعروں اور ادیبوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں "پرچھائیوں کا جلوس" کا ایک بند سنئے۔

مہر و مہ سے بھی حسیں روئے نگار اردو
سرمۂ چشم بصیرت ہے غبار اردو
یہ گلستاں بھی ہے ممنون بہار اردو
پھول تو پھول ہیں کانٹے بھی نثار اردو
سر تصویر مگر نامہ بے مروہ دیکھا
فلمی دنیا میں عجب میں نے تماشا دیکھا

مجھے یقین ہے فلموں میں اردو کا مستقبل ہمیشہ شاندار رہے گا۔

جمیل :۔ اگر فلموں سے اردو کو نکال دیا جائے تو کیا ہوگا؟

قیصر :۔ وہی حال ہوگا جو گلاب کے بدن سے خوشبو نکال دینے کے بعد ہوگا۔

جمیل :۔ اردو مکالمے اور گیتوں کے باوجود ہندی سرٹیفکیٹ کیوں؟

قیصر :۔ اسے فلم والوں کی ستم ظریفی کہہ لیجئے یا مصلحت پسندی۔ اگر حکومت چاہتے تو اس مسئلہ کا حل نکال سکتی ہے۔ بہ شرطیکہ انصاف پسندی کا دامن نہ چھوڑا جائے

جمیل :۔ آپ کی مشہور کتاب "پرچھائیوں کا جلوس" لکھنے کی تحریک کیوں پیدا ہوئی؟ اور آپ نے اس کتاب کے توسط سے کیا کہنے کی کوشش کی ہے۔ آپ کی نظر میں فلمی دنیا کیا ہے اور عورت کا اس دنیا میں مقام کیا ہے ——؟

قیصر :۔ برسوں فلمی دنیا میں رہتے ہوئے میرے دماغ میں جن مشاہدات اور احساسات کا لاوا جمع ہو رہا تھا وہ ایک دن پھٹ پڑا اور کئی سال تک اشعار کی شکل میں باہر آتا رہا۔ میری اس نظم کو سن کر اکثر حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے اس نظم کی تخلیق میں حد سے زیادہ محنت کی ہے۔ لیکن میں سچ کہہ رہا ہوں کہ یہ حقیقت نہیں کہ یہ نظم خود بخود ہو گئی ہے ہاں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ فلمی دنیا میں رہ کر مجھے جن تلخ و شیریں تجربات سے دو چار ہونا پڑا اور سالہا سال تک [illegible] کہتا رہا ہوں اس نظم

کی تحریک کا محرک کہی جاسکتی ہے میں نے بذات خود
اس نظم کے ذریعہ کچھ کہنے کی کوشش نہیں کی ہے
بس یہ نظم ہوگئی ہے اور جو کچھ اس میں ہے وہ پڑھنے
والوں کو متاثر کرتی ہے اس نظم کا ایک بند سنئے۔

کبھی اک ذرہ ناچیز بیاباں ہوتی ہے
قسمت و لعل و گہر برسوں کبھی سوتی ہے
قلقل مینا ادھر راحت جاں ہوتی ہے
آنکھ نرگس کی ادھر شام و سحر ہوتی ہے
جو زمیں بوس ہے وہ یا اثر دیکھا
فلمی دنیا میں عجب میں نے تماشا دیکھا

ایک اور بند اسٹوڈیو میں کام کرنے والے لائٹ مین
کے بارے میں

مرغ و ماہی نہ جنہیں دختر انگور ملے
ہر گھڑی بادۂ محنت سے وہ مخمور ملے
جن کے ہاتھوں سے ستاروں کو یہاں نور ملے

ان کے کاشانوں میں ہر وقت اندھیرا دیکھا
فلمی دنیا میں عجب میں نے تماشا دیکھا

ایک اور بند سنئے۔

عقل عیار ہے اور حسن کی نادانی ہے
دام صیاد ہے طائر کی پرافشانی ہے
در عصمت کی اک امید یہ قربانی ہے
آبرو کچھ بھی نہیں بہتا ہوا پانی ہے
حسن کو دیکھا اسی سیلاب میں بہتے دیکھا
فلمی دنیا میں عجب میں نے تماشا دیکھا

جمیل :۔ آپ اتنے دنوں تک فلمی دنیا سے منسلک رہنے کے بعد بھی ادب سے رشتہ کیوں جوڑے ہوئے ہیں؟ کیا ادب آپ کو روٹی دے رہا ہے صحت دے رہا ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے ادب آپ کو کچھ بھی نہیں دے رہا ہے۔

قیصر :۔ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ ادب سے میرا خونی رشتہ ہے اور خون کے رشتے کی اہمیت سے آپ بھی ضرور واقف ہوں گے۔ ادب میری گھٹی میں پڑا ہے۔ کوئی بھی جگہ ہو، کوئی بھی ماحول ہو ایک پیدائشی ادیب یا شاعر اس سے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ خواہ اس کے ذریعہ اسے روٹی اور صحت ملے یا نہ ملے۔ اس وقت مجھے ایک محبوب شاعر احسان دانش کی یاد آرہی ہے جب وہ جوان تھے وہ پنجاب کی سرزمین میں نہ جانے کہاں کہاں معماروں کے ساتھ ایک مزدور کی حیثیت سے کام کرتے تھے لیکن اس وقت بھی شاعری ان کی جان تھی تو ہی ان کا سب کچھ تھی۔

جمیل :۔ آپ نے فلمی دنیا میں رہ کر گیت کار بننے کی کوشش کیوں نہیں کی اس طرح آپ لاکھوں میں کھیل سکتے

قیصر :۔ نہ جانے کیوں شروع ہی سے پیسہ حاصل کرنے کی ہوس میرے دل میں کبھی نہیں رہی۔ فلمی دنیا میں آنے کے بعد بھی میرا یہی حال رہا جب کہ اکثر کرم فرما جیسے میرے استاد ڈائرکٹر سبطین فضلی مرحوم اور فلم ساز و ہدایت کار دلیو مذر گوئل اکثر مجھے گیت کار بننے کی ترغیب دیا کرتے تھے لیکن میں نے کبھی اس میں کشش محسوس نہیں کی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ علامہ آرزو لکھنوی مرحوم جیسے پایہ کے شاعر نے بھی لکھنؤ سے کلکتہ جاکر اس مخصوص فن کو اپنایا تھا۔ آپ اسے میری بیوقوفی کہہ لیجئے یا دیوانگی

مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا رہا ہے جیسے یہ کوئی بازاری کام ہو۔ میں یہ بھی سوچتا رہا ہوں کہ فلموں کے لئے گیت لکھنا شاعری جیسی مقدس صنف کے ساتھ زنا بالجبر کرنے والی بات ہے۔ اور پھر کبھی کبھی یہ خیال بھی آتا ہے کہ کسی بھی حال میں میرا اس طرف راغب نہ ہونا شاید کوئی نفسیاتی کیس ہو۔ یقین کیجئے ریڈیو سے نشر ہونے والے گیتوں کے ساتھ گیت کار کی حیثیت سے اپنا نام سننے کی بجائے کسی رسالہ یا اخبار میں اپنا نام پڑھ کر مجھے دلی مسرت ہوتی ہے۔

جمیل:۔ آپ کے محبوب مشاغل کیا ہیں ؟

فیض:۔ کتب و رسائل پڑھنا اور شام کے وقت بلاناغہ چرچ گیٹ کی سمندری فضا میں سیر کرنا، میرے محبوب مشاغل ہیں۔

جمیل:۔ آپ کو سب سے زیادہ کیا پسند ہے

فیض:۔ عورت

جمیل:۔ آپ کو کن لوگوں سے زیادہ چڑ ہے ؟

فیض:۔ مجھے ایسے لوگوں سے زیادہ چڑ ہے جو دن رات شیخی بگھارتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں اور محض اپنی تفریحِ طبع کے لئے دوسروں کی دل آزاری کرتے ہیں۔

جمیل:۔ آپ کی پہلی نثری تخلیق کون سی تھی اور اس کا عنوان کیا تھا؟

فیض:۔ میرا پہلا مضمون کلکتہ کی سیر جنوری ۳۲ء میں رسالہ "بچوں کی دنیا" الہ آباد کے سالنامہ میں شائع ہوا تھا اور بڑے اہتمام کے ساتھ اس مضمون کے ساتھ کلکتہ کے کئی مقامات کی تصویریں بھی شائع ہوئی تھیں میں اپنی اس کوشش میں اتنا کامیاب ہوا کہ اس کے بعد لکھنا اور پڑھنا میرا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔ چھپنے کے معاملہ میں اوائل عمر سے ہی خوش نصیب واقع ہوا ہوں۔

جمیل:۔ آپ ایک زمانے میں افسانے بھی لکھا کرتے تھے کیا ان کا کوئی مجموعہ شائع ہوا ؟

فیض:۔ سنہ ۱۹۳۷ء سے سنہ ۱۹۵۵ء تک میں نے وقتاً فوقتاً افسانے لکھے ہیں۔ میرا ایک افسانہ "پانچ انگلیاں" شمع دہلی میں شائع ہوا تھا اور اس قدر مقبول ہوا تھا کہ کسی پروفیسر ادیب نے اس کا اڑیہ زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ مجموعہ اس لئے شائع نہ ہو سکا کہ اس زمانے میں اپنے مطبوعات کے تراشے رکھنے کی عادت نہیں تھی۔ میرے پاس اپنا ایک افسانہ بھی محفوظ نہیں۔ البتہ میرا ایک ناولٹ "اور طوفان تھم گیا" جو پہلے "شمع بکڈپو" سے شائع ہونے والا تھا بعد میں "مکتبہ نئی زندگی دہلی" نے شائع کیا تھا۔ اس کے مالک سید انیس الرحمٰن مدیر "پرچم ہند" تھے۔ اس کے علاوہ میرے فلمی مضامین کا مجموعہ "فلمستان" سنہ ۱۹۴۶ء میں مکتبہ سلطانی بمبئی نے شائع کیا تھا۔

جمیل:۔ آپ کے پہلے افسانہ کا عنوان کیا تھا اور آخری افسانے کا عنوان بھی بتائیں؟

فیض:۔ "آوارہ" میرا پہلا افسانہ تھا اور ایک [illegible] ایک [illegible] "آخری اوارہ" سنہ ۱۹۵۵ء میں رسالہ سہیلی میں شائع ہوا تھا اور آخری افسانہ فلم آرٹ [illegible] میں "نرگس کی سازش" "سوراغ" اور "عزت کی [illegible]" بھی [illegible] طویل افسانے ہیں۔

جلیل :- اسکول اور کالج میں لکھنے پڑھنے کے علاوہ آپ کی کوئی ایکٹیوٹی رہی ہو تو بتائیے؟

فیصی :- اسکول کے زمانہ میں ایک قلمی رسالہ کا ایڈیٹر تھا اور جب بی۔ این۔ کالج تھا تو میں نے اپنی کوشش سے وہاں ایک ادبی انجمن بزم آرزو قائم کی تھی جس کا میں پہلا جنرل سکریٹری تھا۔ اس سلسلے میں میرے شفیق استاد پروفیسر سید حسن کا ذکر کرنا ضروری ہے جنہوں نے اس بزم کے قیام اور سالانہ مشاعرے کے انعقاد میں میری بڑی ہمت افزائی کی تھی اس زمانے میں کالج کے پرنسپل مسٹر معین الحق تھے جنہیں اسپورٹس سے تو دلچسپی تھی لیکن شعر و شاعری سے الرجک تھے۔ پھر بھی یہ میری خوش نصیبی تھی کہ میرے پیہم اصرار پر بالآخر وہ راضی ہو گئے تھے۔

جلیل :- اس سے پہلے شاید ایک سال آپ پٹنہ کالج کے بھی رہ چکے ہیں۔ وہاں کی کوئی خاص بات ہو تو بتائیے؟

فیصی :- پٹنہ کالج کا وہ زمانہ بڑا شاندار تھا۔ پرنسپل تھے جے۔ ایس۔ آرمر اور پروفیسروں میں وہاں ایم ٹی گل رجانی، مفضل الرحمٰن، پی، کلیم الدین احمد عبدالمنان بیدل، اور نجم الہدیٰ گیلانی جیسی عظیم شخصیتیں موجود تھیں۔ اس کالج میں ہر سال "بزم ادب" کے زیر اہتمام ایک سالانہ جلسہ ہوتا تھا جس کے ادبی مقابلہ میں پوری پٹنہ یونیورسٹی (صوبہ بہار کی واحد یونیورسٹی) کے کالجوں کے طلباء حصہ لیا [illegible]تے تھے سنہ ۱۹۴۷ء کے ادبی مقابلہ میں میں نے بھی حصہ لیا تھا اور مجھے لطیفہ افسانہ "کالج گرل" کے لئے پہلے انعام چاندی کے کپ کی صورت میں ملا تھا۔ اس وقت میں سترہ سال کا تھا پھر تعلیم ختم کرنے کے بعد جب میں پٹنہ سے گیا واپس آ گیا تھا تو وہاں بھی "دائرہ اردو" کے نام سے میں نے ایک انجمن کی داغ بیل ڈالی تھی۔ ہر ماہ اس کی نشست میرے مکان واقع کریم گنج گیا میں ہوا کرتی تھی اور جس کی روداد اردو کے علاوہ کلکتہ کے انگریزی اخبار میں بھی چھپا کرتی تھی۔

جلیل :- آپ کالج کے زمانے میں کہاں کہاں چھپا کرتے تھے؟

فیصی :- کالج کے زمانے میں بھی میرے وقت کا بیشتر حصہ ادبیات کے مطالعہ میں گذرتا تھا۔ آپ کو یہ جان کر شاید حیرت ہو کہ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں میرے تراجم لاہور کے "ادب لطیف" "شاہکار" اور رومان وغیرہ میں اکثر شائع ہوا کرتے تھے۔ اور "ادب لطیف" کے ایڈیٹر مرزا ادیب اپنے خطوط کے ذریعہ مجھے یورپی مفکرین کی شاہکار تخلیقات کو اردو میں منتقل کرنے کا پرزور مشورہ دیا کرتے تھے کئی تخلیقات "ندیم" گیا میں بھی شائع ہوئی تھی۔

جلیل :- "یادوں کا سفر" لکھنے کی تحریک کیوں پیدا ہوئی اور اس کے پڑھنے کے بعد قارئین کے تاثرات کیا ہیں؟

فیصی :- بات یہ ہے جلیل صاحب کہ میں اب اپنی عمر کی اس منزل میں ہوں جب یادیں زندگی کا سہارا بن جاتی ہیں۔ میری زندگی میں بہت سارے شاعر و ادیب اور فلمی ہستیاں آئیں۔ میں نے انہیں قریب سے دیکھا ہے [illegible] اور [illegible] جب کہ

عمر کے ساتھ دوسری دلچسپیوں میں کمی واقع ہوتی ہی رہی ہے۔ میں اپنے عہد گذشتہ کی یادوں سے دل بہلا رہا ہوں۔ یادوں سے متعلق میرے یہ مضامین نہ صرف ہندوستان کے کونہ کونہ میں مقبول ہوئے ہیں بلکہ خلیجی ممالک، لندن اور پیرس سے بھی متعدد تعریفی خطوط آئے ہیں جنہیں پڑھ کر یہ اندازہ ہوا کہ قارئین کو میرے لکھنے کا اسٹائل بطور خاص زیادہ پسند آیا ہے۔ میرا مضمون مینا کماری جب "روبی" دہلی میں شائع ہوا تو اس نے قابل رشک مقبولیت حاصل کی۔ کئی قارئین نے مجھے اپنے شہر میں بلا کر اپنا مہمان بنانے کی خواہش بھی ظاہر کی ہے۔ میں اپنی اس کامیابی کے لئے اللہ کا شکر گذار ہوں یہ سب اسی کا کرم ہے اور کچھ نہیں۔

جمیل :- خواجہ احمد عباس، علی سردار جعفری، عصمت چغتائی، اختر الایمان، ظ۔ انصاری، کیفی اعظمی اور مجروح سلطانپوری اس بمبئی میں رہتے ہیں۔ منٹو بھی کچھ دن بمبئی میں تھے، ساحر لدھیانوی، راجندر سنگھ بیدی، جاں نثار اختر، اور کرشن چندر کی زندگی کا بھی بہت بڑا حصہ یہیں گذرا ہے۔ آپ کے تعلقات کم و بیش ان سب سے رہے ہوں گے۔ لیکن یہ بتائیے کہ ان میں سے آپ کس کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے ---؟

قیصر :- میں بلا تامل کہوں گا کرشن چندر نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ ان کی انسان دوستی حسن اخلاق اور اردو سے ان کی مجرمانہ محبت کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔ ایک سال ہمارے انجمن "ادب سنگم" کا سالانہ مشاعرہ تھا میں ان کے دولت کدے پر حاضر ہوا اور صاحب افتتاح کی حیثیت سے شریک ہونے کی درخواست کی تو وہ کسی پس و پیش کے بغیر راضی ہو گئے اور جب کچھ دن بعد ہمارے مشاعرے کی تاریخ "شرنگار" ہمسر کے ایک فنکشن (جس میں وہ مدعو تھے) سے ٹکرا گئی تو اس کے باوجود وہ یہ کہہ کر ہمارے مشاعرے میں شریک ہوئے کہ میں نے پہلے سے پہلے وعدہ کیا تھا۔ کرشن چندر جی مجھ سے یوں بھی خوش تھے کہ اردو دشمنوں کے خلاف جب میں نے کئی سال قبل اپنی مہم شروع کی تھی تو وہ اکثر یہ کہا کرتے تھے "قیصر صاحب! اب میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں آپ سے میری ایک پرزور درخواست ہے کہ اردو کے خلاف جب بھی کبھی کوئی آواز اٹھے آپ اسے دبانے کی ضرور کوشش کیجئے گا آپ کے منہ توڑ مضامین پڑھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ آپ اس سلسلے میں ہمیشہ چوکنا رہا کیجئے۔ ایک دن کا ذکر ہے جب کرشن چندر اس دنیا میں نہیں تھے تو میں کسی کام سے محترمہ سلمیٰ صدیقی صاحبہ سے ملنے گیا تھا۔ باتوں باتوں میں ان سے یہ معلوم ہوا کہ کرشن چندر جی کبھی کبھی یہاں تک کہا کرتے تھے کہ اردو کے لئے اگر میں شہید بھی ہو جاؤں تو یہ میری خوش نصیبی ہوگی۔ اللہ کرے اردو زبان کا ایک بال بھی بیکار نہ ہو اور کرشن چندر کو ابدی سکون حاصل ہو۔

انٹرویو ختم ہو چکا تھا اور الوداعی مصافحہ کے بعد جب ہم ان کے رہائش گاہ سے باہر نکلے تو ان کا شیریں خلوص بار بار ہمارا تعاقب کر رہا تھا --- قیصر صاحب جتنے اچھے شاعر ہیں اتنے ہی مخلص اور خلیق انسان بھی ہیں۔

فلمی پرچھائیاں اور قیصر عثمانی

سی۔ ایل۔ کاوش

قیصر عثمانی ذہین وفطین ہیں ــــ ماضی میں جب وہ ذہین کے ہم قافیہ تھے تب ان سے کلکتہ میں ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ چھریرا بدن، درمیانہ قد، گیہواں رنگ۔ گھونگھریالے بال اور مخمور آنکھیں، دیکھنے کی چیز تھے۔ روپ میں شامِ اودھ کی ملاحت تھی۔ اور بات کرتے ہوئے زبان میں لکھنؤ کی شگفتگی اور لہجے میں بہار کی مٹی کی خوشبو ــــ یہ تو تھی ان کی خارجی شخصیت ــــ داخلی شخصیت جس سے آدمی کا وقار ہوتا ہے اور جسے آدمیت کہتے ہیں اسے کھوجنے کے لئے انسان کے ضمیر کا پتہ چلانا پڑتا ہے۔ اس کے تحت الشعور میں اترنا ہوتا ہے کیونکہ انسان کی بنیاد اخلاق پر ہوتی ہے اور اخلاقی قدریں ماحول سے ملتی ہیں۔ اس وقت ہمارے موجودہ ماحول میں دو طرح کے لوگ بستے ہیں۔ ایک وہ ہیں جو آپ سے ملیں گے تو سوچیں گے کہ آپ ان کے کس مصرف کے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو آپ سے مل کر سوچیں گے کہ وہ آپ کے کس کام آسکتے ہیں۔ آپ کی کتنی اعانت کر سکتے ہیں۔ آپ اگر کسی مشکل میں ہیں تو اس کا مداوا ان کے توسط سے کیا ہو سکتا ہے؟ اور انہیں قدروں سے انسان کی داخلی شخصیت کا پتہ چلتا ہے۔ کھرے کھوٹے انسان کو پرکھا جاتا ہے آج کے نفسا نفسی کے دور میں آدمی روٹی اور دوسرے لوازمات لے لئے لڑتا ہے مگر قیصر عثمانی کہتا ہے۔

• آدمی جب روٹی کے ٹکڑے کے لئے اور دنیاوی بڑائی کے لئے کسی پر غراتا ہے تو مجھے اس کی دم ہلتی نظر آتی ہے... آپ کو شاید نظر نہ آئے اس کے منہ سے کیف زہریلا کف بھی نکلنے لگتا ہے۔ اور میں سوچتا ہوں۔ اب یہ کسی کو کاٹے گا۔ وہ بھی اسی طرح غرائے گا اور کٹ کھنا ہو جائے گا۔ اس کاٹا کاٹی میں انسان اپنا چولا بدلتا ہے۔ کب اس کو

آپ اشرف المخلوقات کہتے ہیں؟

اس کے سوال کے جواب میں جب کوئی کہتا ہے کہ SURVIVAL OF THE FITTES قدرت کا اصول ہے۔ قیصر صاحب! تب عینک کے موٹے شیشوں کے پیچھے ان کی آنکھیں مسکراتی ہیں۔ اور اپنی وزن دار آواز میں کہتا ہے "یہ تو جنگل کا قانون ہے۔ انسان نے اپنے آپ کو جانور سے الگ کیا ہے۔ آدمی انسان کے زمرے میں تب شامل ہوتا ہے جب وہ بنا کسی غرض کے دوسرے کے کام آتا ہے۔

اس آدمی سے میں پوچھتا ہوں کیا آپ کی پیدائش وہاں ہوئی ہے جہاں بدھ نے "نروان" پراپت کیا تھا۔ یا بودھی درخت کے نیچے آپ نے چلّہ کھینچا ہے۔ یا کسی معصوم سجاتا نے آپ کو کھیر کھلائی ہے؟ تب وہ کھلکھلا کر ہنستا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ وہ بودھی نروان درکش سے چھ سات میل دور گیا کی دھرتی پر ہی پیدا ہوا ہے جہاں سے کچھ دور پر بھگیسہ نام کی سادات کی بستی میں حضرت عثمانؓ ذی النورین کا ایک شجرہ کہتا اس کا وہ ثمر ہے۔ تب میں مسکرا کر کہتا ہوں گویا کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی۔ وہ کہتے ہیں دور کی نہیں قریب کی۔

جی ہاں قریب کی تو کہنی پڑے گی کیونکہ نام کے ساتھ "عثمانی" جڑا ہوا ہے۔ آپ سید ہیں۔ یہ بھی معلوم ہے اور اسی لئے آپ اپنا ہر عمل اخلاق کی کسوٹی پر کس لیتے ہوں گے۔

وہ پھر مسکرا کر دیکھتے ہیں اس طرح کہ جیسے کہہ رہے ہوں۔ اچھا جی مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ عمل کے لئے کسوٹی بھی ہوتی ہے۔ اچھائی تو انسان کے اندر سے نکلتی ہے۔ قدرت کی دین ہے۔

عام طور سے لوگ ادب سے بھاگ کر فلم کی طرف آتے [illegible]

لئے کئی جوڑ توڑ کرتے ہیں اور جو لائے جاتے ہیں وہ شرطا استواری کے قائل ہوتے ہیں۔ جہاں بیٹھ گئے اٹھنے اور چلنے کا نام نہیں لیتے ۔۔ قیصر عثمانی بھی فلم لائن میں آکر بیٹھ گئے۔ شیدا کیورروی کے سا[illegible] کلکتہ لائے گئے اور فضلی برادران کے دروازے ہوئے تو نقش سلیمانی ہو کر جم گئے۔ فضلی برادرا[illegible] منتقل ہوئے تو قافلے کے ساتھ یہ بھی بمبئی میں تھے۔ پاکستان ہجرت کرنے لگے تو مسلمان ہونے کے نا[illegible] بھی دعوت دی گئی ہوگی۔ مگر یہ سیکولر مزاج کے آدمی۔ مذہب سے گہرا واسطہ ہونے پر بھی صوفی[illegible] کے ہیں۔ مذہب کے نام پر بسائے گئے ملک کو[illegible] کیا۔ حالانکہ رشتہ دار، عزیز اور احباب کا[illegible] جا چکے تھے۔

۱۹۴۸ء میں ایس۔ ایم نواب نے بمبئی پکچرز کی بنیاد رکھی تو قیصر کو پروڈکشن کنٹرولر [illegible] گیا ۔۔ وہاں بھی ٹھاٹ سے رہے۔ شاہین [illegible] دروازے پر کمپنی کے نام کے ساتھ لکھا تھا۔ "[illegible] پروڈکشن کنٹرولر۔ یہ اعزاز صرف قیصری کو [illegible] تو پروڈکشن کنٹرولر ہو کر بیچ کا مال ہو جاتے ہیں۔

ادیب یا شاعر جب کسی فلمی ادارے میں کا مختار بنا دیا جاتا ہے تو ادیب ہو تو چاہتا ہے کہ کہانی پر یہ ادارہ فلم بنائے اور شاعر ہو تو یہ چاہتا اس فلم کے گانے اسے ہی لکھنے کو ملیں۔ مگر قیصر [illegible] لئے کچھ نہیں لکھا۔ نہ کہانی، نہ ڈائیلاگ اور نہ گا[illegible] شاہین پکچرز میں تھے تو وہ آسانی سے گیت [illegible] سکتے تھے۔ کیونکہ سب کچھ تو یہی تھے۔ دو[illegible] سمجھایا۔ میاں کہاں آ گئے ہو۔ گنگا تو [illegible]

ہے۔ ہاتھ دھولو۔ بال بچے دار ہو بھائی اور تم تو شاعر
الٰہذا اچھے ہی نہیں بلکہ بہت اچھے ہو۔ ایک گانا بھی ہٹ
تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ مگر قیصر ٹس سے مس نہ
ے۔ کہتے تھے جاں نثار اختر کا میں مداح ہوں۔ وہ بھوپال
بیکار ہو کر بمبئی آئے ہوئے ہیں اور ان کی بیگم بستر علالت
۔ ان کی زندگی کا مسئلہ ہے اور وہ جائز حق دار ہیں
نغمہ نگار کی حیثیت سے انہیں مستقل طور
بستہ کر لیا گیا۔ پھر میوزک ڈائریکٹر ایس۔ ڈی۔ برمن
لفت کے باوجود قیصر نے زور لگایا کہ اختر کے گیت
منگیشکر سے گوائے جائیں (لتا آج کی طرح اس زمانے
کامیاب سنگر تھیں) اور کئی دنوں کی دوڑ دھوپ کے
ان کی کوشش بارآور ثابت ہوئی۔ یہ کارہائے نمایاں
داخلی شخصیت کا پتہ دیتے ہیں۔

قیصر کا ذکر کرتے ہوئے ایک نقاد نے لکھا ہے
بد محنت، صلاحیت اور تکنیک شناسی کے بغیر آپ
"دو پاٹن کے بیچ" ثابت نہیں رہ سکتے۔ کیا قیصر عثمانی
صلاحیت نہیں؟ وہ تکنیک شناس نہیں ہیں؟ شدید
نہیں کر پاتے؟ ـــــ عجیب سوال اٹھ کر سامنے
ہیں۔ اور قیصر کی چالیس سالہ زندگی کی فلمی مشقت بھی
نے دکھائی دیتی ہے۔ تکنیک اگر وہ نہ جانتے تو دو دن
ی فلمی ادارے کے ساتھ منسلک نہ رہ سکتے۔ پھر کیا
ہے کہ دوسرے شاعروں اور ادیبوں کی طرح
کی قیمت نہیں لگائی گئی۔

اصل میں قیصر کا تحت الشعور یہ جانتا ہے کہ فن
کمرشلائزڈ (Commercialised) ہوتا ہے
ولگر (Vulgar) ہو جاتا ہے۔ فن پر ہی کیا منحصر ہے۔

جاتا ہے۔ ادھر شمس العلماء علامہ تاجور نجیب آبادی نے
"شاہکار" کے سالنامے میں ایک پتے کی بات لکھی تھی کہ فلمی
دنیا میں کھوٹا سکہ چلتا ہے۔ اگر کھرا سکہ چلتا تو ادبی
جرائد کو ایڈٹ کرنا مشکل ہو جاتا۔

مگر میرا کہنا ہے کہ محض کھرا سکہ نہیں چلتا میاں
اس میں تھوڑا کھوٹ ہونا ضروری ہے۔ میں نے ایک صراف سے
پوچھا کہ میں نے تمہیں کھرا سونا زیور بنانے کے لئے دیا تھا۔
تو نے اس میں کھوٹ کیوں ملایا؟ تو اس نے کہا تھا کہ کھرے
سونے کا زیور نہیں بن سکتا۔ تھوڑا کھوٹ ملانا ہی پڑتا ہے۔

اب فلمی دنیا کی کامیاب ہستیوں پر نظر ڈال کر دیکھئے
میں کامیاب لوگوں کے نام نہیں لیتا۔ فلم کی ناکام ہستیوں میں
منشی پریم چند کا نام بھی شامل ہے۔

اردو کے شاعر و ادیب عبدالحئی ساحر لدھیانوی جو
رسالہ "ادب لطیف" سے آئے تھے اپنے وہ گیت لے کر جو
انہوں نے اپنے پیار کی خاطر لکھے تھے۔ لیکن اپنے پیار کی
نشانی انگوٹھی بیچ کر بمبئی سے لاہور چلے گئے۔ پھر آئے تو
شاید انہوں نے اپنے خالص ادبی سونے میں تھوڑا کھوٹ
شامل کر لیا تھا۔ اسی لئے کامیاب ہو گئے۔ دوسرا شاعر و
ادیب عبدالحئی قیصر عثمانی رسالہ "سہیل" گیا کے ایڈیٹر تھے
وہ بھی آئے مگر انہوں نے فلمیں نہ لکھیں نہ لکھنے کی ہوس
ہی رکھی اس لئے پردۂ سیمیں پر ان کا نام تو آتا رہا مگر گیت
کار، مکالمہ نویس یا نغمہ نگار کی حیثیت سے نہیں بلکہ دیگر
شعبوں میں آتا رہا۔ اگر یہ بھی تھوڑا کھوٹ ملا لیتے تو
فلم کا قیمتی زیور بن جاتے ـــــ عبدالحئی ساحر لدھیانوی
اور عبدالحئی قیصر عثمانی دونوں فلموں سے متعلق ہیں۔ ساحر
نے "پرچھائیاں" بلاننگ بنائی اور قیصر نے [illegible]

"پرچھائیوں کا دیس" سے ظاہر ہے۔

مولانا حالی نے مسلمان قوم کی زبوں حالی پر ایک مسدس لکھا۔ انہیں سرسید جیسا قدرداں مل گیا اور مسدس ادب کا کامیاب ترین صحیفہ بن گیا۔ قیصر عثمانی نے فلمی زبوں حالی پر "پرچھائیوں کا دیس" لکھی۔ وہ بھی ایک کامیاب ترین ادبی کوشش ہے۔ وہ بھی مسلسل نظم ہے۔ اور مسدس کی شکل میں، مگر قیصر عثمانی کو کوئی فلمی سرسید مل جاتا تو وہ بھی ادب میں کام کی چیز بن جاتے۔ مگر فلم کو آج تک وہ مرتبہ نہیں ملا جو اس زبردست میڈیم کو ملنا چاہیے تھا۔ فلم کو ہندوستان میں آج تک تفریح کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ جو لوگ سنجیدہ عظیم فلمیں بنانے والے تھے تو رخصت ہو گئے یا بے ہودہ اور چھچھوری فلموں نے ان کے راستے مسدود کر دیئے۔ "پرچھائیوں کا دیس" کا ایک بند ہے۔

عظمت کے جو دلدادہ ہیں سودائی ہیں
جو ہیں پابند خودی
جو ہیں پابند خودی وہ گل صحرائی ہیں
اوج پر ان کا ستارہ ہے جو ہرجائی ہیں
خاک کے ذروں کو ہم دوشِ ثریا دیکھا
فلمی دنیا میں عجب میں نے تماشا دیکھا

اس تماشے کو دیکھ کر جب قیصر متاثر ہوا کہہ اٹھا۔

اس مسدس کے ایک بند کا ایک شعر
جن کی تحریر پریشاں یہ جہالت ہے نثار
سر برآوردہ یہی اور یہی ہیں زردار

اور پھر کہتے ہیں۔

کھوٹا سکہ اسی بازار میں چلتے دیکھا
فلمی دنیا میں عجب میں نے تماشا دیکھا

قیصر کے کلام میں سلاست ہے روانی ہے شاعر ہیں۔ ان کی جمالیاتی حس بھی جوان ہے۔ عمر کے ساتھ شاعر کا ذوقِ جمال رو بہ انحطاط نہیں بلکہ ترقی پذیر ہوتا ہے اور قیصر کی سرشت ہی جمال پرست ہے۔

کسی انسانی افق پر ایک دن کبھی اس جمال کا منظر دیکھا تھا تو اس پر وجدانی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ دادر کی اس تو تی پھوٹی کھولی میں اس نے ایک جلوہ دیکھا۔ اس کی شرمیلی نگاہ نے اس سے جانے کیا کہہ دیا کہ شاعر گنگنا اٹھا۔

اف یہ تیری نگاہ دزدیدہ
جس میں شوخی بھی ہے حجاب بھی ہے
دیکھ کر بھی نہ دیکھنے کی ادا
اس ستم کا کوئی جواب بھی ہے؟

یہ جلوہ بعد میں فلم کے پردے پر آیا اور لوگوں کو اس کی دزدیدہ نگاہی نے موہ لیا۔ پھر اسے ملکہ کے نام سے لوگ یاد کرنے لگے۔ اگر قیصر میں جرأت ہوتی تو اس کی شاعری اور رنگین ہو جاتی۔ مگر انسانیت کے محور پر گھومنے والا شاعر تھا اس مضمون میں اسے ملکۂ جذبات کی زندگی کے بارے میں

"یہ ملکۂ جذبات ہے یا ایک کار جو کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو، کتنی ہی قیمتی کیوں نہ ہو اپنی مرضی کی مالک نہیں ہوتی۔ اس کی نقل و حرکت پر صرف ایک ڈرائیور ہی قادر ہوتا ہے۔ وہ جہاں چاہے لے جائے جہاں چاہے چھوڑ دے۔"

[illegible]

کے ڈرائیور نے اس کی قدر نہیں کی اور پھر ایک دن وہ بنا ڈرائیور کے ہی چل پڑی اور قدم قدم پر ایکسی ڈنٹ کرتی ہوئی انسانی جنگ یارڈ (JUNKE YARD) میں جا کر ہزاروں من مٹی کے نیچے دب گئی۔ میناکماری کو اس کے ماں باپ کی قبر کے پاس جگہ نہیں مل سکی۔ اس بات پر بھی قیصر لاکھوں آنسو رویا۔

قیصر اردو کے ادیب ہیں۔ اردو سے جنون کی حد تک پیار ہے اس لئے قلم کی زبان پر کہتے ہیں۔

مہر و مہ سے بھی حسین روئے نگار اردو
سرمۂ چشم بصیرت ہے غبار اردو
یہ گلستان بھی ہے ممنون بہار اردو
پھول تو پھول ہیں کانٹے بھی نثار اردو

اور پھر پتے کی بات یہ کہ ـــــ

سر تصویر مگر نام پہ پردہ دیکھا
فلمی دنیا میں عجب میں نے تماشا دیکھا

فلمی دنیا میں رہ کر بھی قیصر نے شعر و ادب کا دامن نہیں چھوڑا جب کہ اس نگری میں بہت کم ایسے ہوں گے جو ادب کو یاد کریں کیونکہ ادبی شوق ادیب و شاعر کو فاقہ کشی میں مبتلا کر دیتا ہے اور صرف شہرت کی غذا پر اسے زندہ رکھتا ہے۔ اس لئے فلمی ادیب یہ فلمی اور ادبی غم نہیں پالتے جو ادب کے بگھ پر بیٹھ کر یہاں آتے ہیں۔ وہ اترنے کے بعد موٹر میں بیٹھتے ہیں۔ اُسے کفارا سمجھ کر اس کی طرف دھیان نہیں دیتے مگر قیصر عثمانی ہیں کہ اس بلائے جان کو اب تک سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ شاید قیصر نے اسی جذبۂ عشق سے مغلوب ہو کر ۱۹۷۰ء میں "ادبی سنگم" کی بنیاد رکھی تھی جس کے تحت ملاڈ میں کئی ایسے تاریخی مشاعرے منعقد ہوئے کہ حسن کمال کو ملبسنز (اردو) میں لکھنا پڑا کہ قیصر عثمانی نے اپنی محنت و جاں فشانی سے ملاڈ کو اردو کا ایک نیا خطہ بنا دیا ہے جہاں ہر سال اس کے ادبی جلسے ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے نامور شاعر اور علمی شخصیتیں اس میں شامل ہوتی ہیں۔ غروب آفتاب کے بعد مجلس شروع ہوتی ہے اور دوسرے دن فجر کے قریب اس وقت ختم ہوتی ہے جب مرغ سحر بانگ دے چکتا ہے۔ اور مؤذن بولنے لگتا ہے۔ اللہ اکبر اللہ اکبر

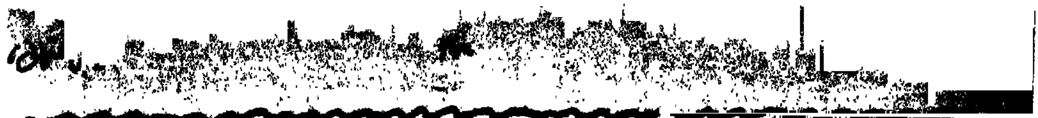
تب قیصر نعرہ لگاتا ہے۔ "ادبی سنگم" زندہ باد۔

تب صدر جلسہ کہہ اٹھتے ہیں۔

مرحبا قیصر تیری آواز "ہندوستانی پاکستانی"

(بقیہ۔ یادش بخیر)

بہرحال "پرچھائیوں کا دیس" بڑا ڈراؤنا۔ نہایت ناخوشگوار اور بڑا ہی دردناک ہے۔ اس دنیا میں بڑے بڑے قادر الکلام شعراء داخل ہوئے اور پھر سب کچھ دیکھ کر باہر آئے۔ مگر کسی کو بتانے کی ہمت کر سکے تھے کہ انہوں نے وہاں کیا کیا دیکھا؟ البتہ قیصر عثمانی قدرت کی طرف سے اس کام پر مامور ہوئے تھے کہ جو کچھ وہ دیکھیں دوسروں کو دکھائیں بھی اور اب انہوں نے جو کچھ دکھایا ہے وہ اس قدر حسرت مآب اور حوصلہ شکن ہے کہ خدا کی پناہ!



نیشنل سیونگ کی رقم کے بڑھتے پروگرام

نیشنل سیونگ سکیم پروگراموں میں رقم لگاکر اپنا مستقبل سنواریں

● کسان وکاس پتر ــــ جمع کی گئی رقم ½5 سال میں دوگنی ہو جاتی ہے۔

● اندرا وکاس پتر ــــ جمع رقم 5 سالوں میں ½ دوگنی ہو جاتی ہے۔

● راشٹریہ بچت پرمان پتر آٹھواں نگم ــ لگائی گئی رقم 6 سالوں میں دوگنی سے بھی زیادہ! جمع اور حاصل شدہ سود۔ ٹیکس کی دھارا 80 سی کے تحت چھوٹ۔

● راشٹریہ بچت یوجنا 1987 ــــ 11% سود حاصل ہے ــ سال میں جمع کی گئی پوری رقم اور حاصل پر انکم ٹیکس سے چھوٹ۔

● 15 سال کا لوک بھوشیہ نیدھی ــــ جمع رقم پر 12% پوری طرح انکم ٹیکس سے مستثنیٰ، چکرورِدھی، سود کی ادائیگی ــ دھیمہ ٹیکس میں چھوٹ! سال کی جمع رقم پر 80 سی کے تحت بھی انکم ٹیکس سے چھوٹ!

● ماہانہ آمدنی پروگرام ــــ 10,000 روپیہ جمع کرنے پر ہر ماہ 100 روپیہ سود حاصل ہوگا۔ 6 سالوں کے بعد 10% بونس سمیت 11,000 روپیہ واپس۔

● ریٹائرڈ سرکاری ملازمین، جمع پروگرام ــــ جمع رقم پر 9% کی در سے سود کی ادائیگی۔ ملنے سے ٹیکس سے مستثنیٰ ہے۔ سود کی ادائیگی ہر 6 ماہ کے بعد 30 جون اور 31 دسمبر لے سکتے ہیں۔ بغیر کسی کے ویلتھ ٹیکس سے مستثنیٰ۔

ــــ نیک خواہشات کے ساتھ

ڈائرکٹر راشٹریہ بچت، محکمہ مالیات، بہار

I. P. R. D. No 85 (Mar.-70) 90-91

"پرچھائیوں کا دیس" کے خالق
قیصر عثمانی

سلمیٰ صدیقی

"پرچھائیوں کا دیس" جناب قیصر عثمانی کی ۵۵ بند کی طویل نظم کا عنوان ہے۔ بظاہر یہ اشعار بمبئی کی فلمی زندگی سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں۔ لیکن اس میں تجربے کا گہرا اور تجربے کی آنچ کی مدھم مدھم تپش بھی — قیصر عثمانی … کہ اس "آباد خرابے" میں مقیم ہیں۔ اور فلمی دنیا … سے وابستہ بھی۔ یہ مجھے اچنبھے کی بات لگتی ہے اس لئے کہ عثمانی صاحب سے پہلی بار ملنے کے بعد ان کے رکھ رکھاؤ، مہذب طور طریقے … نشست و برخاست دیکھنے کے بعد رہ رہ کر اس بات کا احساس ہوتا تھا کہ موصوف کسی غلط جگہ پر قسمت کے کسی غلط فیصلے کی بنا پر پائے جاتے ہیں۔ فلمی … اور چھچھلی زندگی کیوں ان کے حصے میں آئی؟ انہیں تو کسی ادبی ادارے سے منسلک ہونا چاہئے تھا۔ لیکن ہمارے معاشرے کا یہی تو المیہ ہے کہ جسے جہاں ہونا چاہئے وہ وہاں نہیں پایا جاتا ہے — اپنی زندگی کا بیش قیمت زمانہ عثمانی صاحب نے کیوں اس شہر کے نام وقف کر دیا؟ وہ نہ صرف یہ کہ خود ایک معتبر ادیب اور شاعر ہیں بلکہ جس خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں اس کا الگ ایک قابل احترام مقام ہے لیکن بمبئی ہے بھی تو عجیب و غریب شہر، اسے شہر کہنا بھی زیادہ صحیح نہیں ہے۔ دراصل یہ ایک عادت بھی ہے۔ جوں جوں آپ بمبئی کے رہن سہن اور شب و روز میں مبتلا ہوتے جاتے ہیں یہ شہر آپ میں رہنے بسنے لگتا ہے۔ بمبئی کی مثال روائتی کمبل جیسی ہے۔ یعنی "کمبل نہیں چھوڑتا ہے"۔

عثمانی صاحب اب بمبئی شہر کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔ فلمی اور ادبی گائڈ کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ ملاڈ کے سالانہ مشاعرے کے روح رواں ہیں۔ ادبی، سماجی اور فلاحی مشاغل میں پیش پیش رہتے ہیں۔ کسی بھی مشاعرے، ادبی مجلس، سوشل کار کردگی کے نام پر موصوف کو … بھر کے بلیک میل کیا جا سکتا

ہے کہ ہر ایسی انجمن کی سرپرستی اور نگرانی وہ بہ آسانی قبول کر لیتے ہیں جس میں رات دن کی تگ و دو ۔ گھڑی گھڑی کی جھک جھک مالی اور جسمانی زیرباری پورے طور پر کارفرما ہوتی ہے ۔ غریب کامیاب ہو جاتی ہے تو عثمانی صاحب اس کو ہی اپنا انعام سمجھتے ہیں اور کوئی ایسی ہی ذمہ داری قبول کرتے ہیں ۔ حیرت صرف ایسی ہی بات پر نہیں ہے مجھے تو یہ بھی بہت حیرت انگیز لگتا ہے کہ فلمی دنیا میں اتنے عرصے رہ کر بھی عثمانی صاحب کسی فلمی سکنڈل کا بھی شکار نہیں ہوئے ۔ ہو نہ ہو اس میں بھی عثمانی صاحب کی بنیادی یا خاندانی شرافت آڑے آجاتی ہوگی ۔ اور صاحب ! جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ خاندانی شرافت اور نجابت اور روایات کے پیکر سخت گیر پاسبان ہوتے ہیں ۔ چنانچہ عثمانی صاحب بھی اپنی شرافت کے اسیر ہیں ۔ اور نہایت پابندی اور ذمہ داری سے بمبئی میں مقیم ہیں ۔۔ لیکن بمبئی کے قیام کے دوران ان کے ذہن میں آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں " کے مصداق گاہے گاہے شعر اترتے ہیں اور وہ یہ کہہ کر دل ٹھنڈا کر لیتے ہیں ـــــ کہتے ہیں ۔

اک اشارے میں یہاں ہوتے ہیں طوفاں پیدا
بجلیاں ابر دھنک، چشمۂ حیواں پیدا
جھیل تالاب ندی کوہ و بیاباں پیدا
اور بھی کتنے ہی ہو جاتے ہیں ساماں پیدا
کالے پردے پہ ستاروں کا چمکنا دیکھا
فلمی دنیا میں عجب میں نے تماشا دیکھا

وہ یہ بھی جانتے ہیں ۔۔۔

آرٹ بکتا ہے یہاں شعر و ادب بکتا ہے
حسن بکتا ہے یہاں "لقمۂ لب" بکتا ہے
ناز بکتا ہے، ادا بکتی ہے "سب" بکتا ہے
خوب ہر مال یہاں بکتا ہے خوب بکتا ہے
کبھی چڑھتے ہوئے بازار کو گرتا دیکھا
فلمی دنیا میں عجب میں نے تماشا دیکھا

قیصر عثمانی نے
فلمی تماشے کو
جب خود جی بھر کے دیکھ لیا
تو دوسروں کو بھی
اس تماشے میں شامل کر لیا
بس "منظوم تماشے" کو پڑھیے
اور بھرپور داد دیجئے ۔

میری دعا اور خواہش ہے کہ قیصر عثمانی صاحب اس طرح کی نظمیں اور بھی لکھیں اور اپنے قارئین کو زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہونے کی دعوت دیں

حسنِ کشمیر کہ ہے مظہرِ شانِ یزداں

قیصر عثمانی

حسن فطرت کے تنوع کا کرشمہ ہے یہیں
ہم سری کون کرے اس کی فلک جس کی زمیں
ارض خوش رنگ کہ ہے جس کا ہر اک ذرہ حسیں
نظر آتا ہے جدھر دیکھیے جنت کا سماں
حسنِ کشمیر کہ ہے مظہرِ شانِ یزداں

سینۂ کوہ پہ بل کھاتی ہوئی راہ گذر
رہ گذر ایسی کہ پیچ و خم گیسو ششدر
دیدنی سطح زمیں پر یہ فلک بوس شجر
ایک۔ اک منظر رنگیں پہ ہیں قرباں دل و جاں
حسنِ کشمیر کہ ہے مظہرِ شانِ یزداں

برف کی شال میں لپٹے ہوئے پربت ہیں یہیں
سلسلہ سرو کے دو رویہ سر فرش زمیں
زعفراں زار کے تا حد نظر جلوے کہیں
اور بہ صد ناز و ادا ہے یہیں جہلم بھی رواں
حسنِ کشمیر کہ ہے مظہرِ شانِ یزداں

سے ہر ایک کو اس دنیا کے سمجھنے میں بہ آسانی مدد مل سکتی ہے۔ اور وہ یہ جان سکتا ہے کہ یہ دنیا دراصل کیا ہے اور وہ ہرگز ہرگز نہیں ہے جو ہمیں دور سے نظر آتی ہے۔ قیصر عثمانی صاحب نے اس سراب سے ہمیں آگاہ کیا ہے جس کے چکر میں پھنس کر ہمارے نوجوان اپنا سب کچھ تباہ کر لیتے ہیں اور اس حساب سے ہمیں پرچھائیوں کا دیس کی اشاعت پر قیصر عثمانی صاحب کا دل سے شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔

اور شکریہ کی یہ اہمیت اس لئے اور بھی دوچند ہو جاتی ہے کہ قیصر عثمانی صاحب عملی طور پر اس دنیا سے وابستہ ہیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے لگی لپٹی سے کام نہیں لیا۔ اور وہ سب سچ سچ کہا ہے اور ہمیں بتا دیا ہے جو سچ ہے اور کے بس کا روگ ہرگز نہیں ہے۔ اور پھر ایسی صورت میں یہ بات تو اور بھی مشکل ہو جاتی ہے جب کہ وہ ہنوز اسی دنیا [illegible] ہیں۔ اور اس سے ان کا بڑا گہرا رشتہ قائم ہے لیکن وہ اس آن بان اور شان کے ایماندار آدمی ہیں کہ انہوں نے اپنوں اور بیگانوں کی ناراضگی کی کوئی پرواہ نہیں کی ہے۔ وہ اس بات سے واقف [illegible] ہیں کہ

"میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند"

فرماتے ہیں:

یہ وہ گلشن ہے جو خوشبو سے سدا خالی ہے
پیرہن کاغذی پہنے ہوئے ہر ڈالی ہے
جس طرف دیکھئے نقالی ہی نقالی ہے
[illegible] تو یہ ہے کہ خزاں میں بھی ہریالی ہے
فصل گل میں کبھی [illegible] خزاں کا دیکھا
فلمی دنیا میں عجب میں نے تماشا دیکھا

اور پھر انہوں نے اس دنیا میں رہ کر اس دنیا کی خصوصیت کو اب تک اپنایا بھی نہیں ہے ورنہ یہ فلمی دنیا سے اب تک ہزاروں نہیں لاکھوں کما چکے ہوتے۔ بس یہ زہر ہلاہل کو قند کہتے رہتے۔ ان کے محل کھڑے ہو سکتے تھے لیکن اس خود دار اور غیور انسان نے اپنی غیرت، حمیت اور انا کو ایک ذرا سا بھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ ورنہ اس فلمی دنیا کی اصلاح میں یہاں "مسکہ" کی کمی تو ہے لیکن، یہ بھی جی کھول کر "مسکہ" لگا سکتے تھے اور جب یہ مسکہ لگا لگا کر ایک نظر اپنے اردگرد ڈالتے تو یہ دیکھتے اب یہی مسکہ انہیں لگ رہا ہے اور یہ اپنے لگائے ہوئے مسکہ کا سود در سود تک وصول کر رہے ہیں۔ جو تحقیر پہلے انہوں نے برداشت کی تھی اب وہی تحقیر اور وہی گالی بڑے بڑوں کو لوٹا رہے اور لوگ کھیسیں نکالے اور ہاتھ جوڑے ان کی گالیوں کو یہ بطور انعام وصول کر رہے ہیں۔

لیکن قیصر عثمانی صاحب نے ایسا نہیں کیا اور جبھی ان کی عزت اور ان کی وقعت میری نظروں میں بہت زیادہ ہے۔ بہ حیثیت ادیب، شاعر اور فنکار ان کی عزت تو میرے دل میں پہلے سے تھی ہی لیکن ان کی اس خود داری اور انا سے ان کی وقعت میری نظروں میں بحیثیت انسان کے بھی بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔

"پرچھائیوں کا دیس" قیصر عثمانی صاحب کا ایک عظیم کارنامہ ہے اور میں ان کی اس بے لوث اور بے خوف پیشکش پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

— "پرچھائیوں کا دیس"

عزیز قیسی

یہ قیصر عثمانی کی فلمی دنیا کے بارے میں ایک طویل نظم ہے پچپن بند پر مشتمل ایک مسدس کی صورت میں — پہلا حصہ ترجیع بند ہے جس کا ٹیپ کا مصرع ہے۔

"فلمی دنیا میں عجب میں نے تماشا دیکھا"

اور دوسرا حصہ ہے ترکیب بند، جس میں ارباب حکومت اور فلم ورکرز سے تخاطب ہے۔ نظم تو خود شاعر نے بھی طویل مانا ہے۔ مجھے نظم طویل نہیں لگی مگر ایک جامع اور جاندار نظم ہے۔

صحت زبان، دروبست الفاظ، آہنگ و صوت کی ترتیب خود بہت مشق کی طالب ہے۔ اس پر مسدس لکھنا اور وہ بھی انیس، دبیر نظیر اور جوش کے ہیولا کی چھاؤں میں ..... کار شیشہ و آہن ہے۔ "چہرہ اور بیت" کا اندرونی تعلق اور خارجی ربط ٹیپ کے مصرع کی طرف توجیع کی ازدونیت اور اس بندش کو نباہ جانا قیصر عثمانی کے بڑے دل گردے کی بات ہے۔

اس مسدس کا ہر بند، ہر چہرہ، ہر بیت ان معیارات پر پورا اترتا ہو یا نہ ہو، یہ ضرور ہے کہ ان کی کوشش بہت پر اثر اور کامیاب ہے اور پوری نظم میں انیس (بلکہ دبیر اور جوش) نظیر اکبر آبادی اور اکبر الہ آبادی کے اسلوب کی گونج سنائی دیتی ہے۔ اور مسدس کے حدود میں یہ کوئی نقص نہیں، حسن ہے۔ اس لئے کہ اپنا اسلوب تو کار محال ہے اس میدان میں۔ مجموعی طور پر ان اسالیب کو برت لینا ہی بہت بڑی بات ہے جب وہ کہتے ہیں ؎

اک ستارے نہیں یہاں چھوٹے بڑے طوفان بھی پیدا
بجلیاں، ابر، دھنک، چشمۂ حیواں بھی پیدا

جھیل، تالاب ندی، کوہ و بیاباں پیدا

تو جوش کی یاد آتی ہے۔ اور جب وہ کہتے ہیں سے

کسی کوٹھی میں ہیں انبار سیہ دولت کے

تو نظیر ذہن میں آتے ہیں۔ اور کبھی جب

کالے پردے پہ ستاروں کا چمکتا دیکھا
کبھی چڑھتے ہوئے بازار کو گرتا دیکھا
شاہ کو زچ جو کرے یاں وہ پیادہ دیکھا

تو اکبر الہ آبادی کا خیال آتا ہے اور انہیں لہجوں کے امتزاج سے ایک بھرپور اثر پیدا ہوتا ہے۔ کہیں کہیں اسلوب کا یہ اختلاف، معنوی تاثر میں بھی اختلاف پیدا کرتا ہے۔ کہیں کہیں ایک ہی بند میں طنز، تلخی، استہزا، واقعیت اور سنجیدگی گھلے ملے نظر آتے ہیں۔

طنز اور اشارے کی معنویت اور شگفتگی نظم کے اس حصے میں شدت سے محسوس ہوتی ہے جہاں انہوں نے فلم کے مختلف شعبوں پر شعر کہے ہیں۔

عیب کو حسن بناتا ہے جہاں زور کمال
جو سر پردہ نہیں، وہ پس پردہ دیکھا

(میک اپ روم)

منحصر جب کہ زر و زن پہ ہوں فن کی خدمات
کیوں سنیں اہل دل اہل خرد کے کلمات

(ڈائرکٹر)

راگنی راگ سے آزردہ یہاں ایک طرف

(موسیقی)

ان کو جدت سے غرض کیا، انہیں سرقہ سے ہے کام
حیثیت بدرور، یہ ہیں صوت و ترنم کے امام

(میوزک ڈائرکٹر)

جوڑتے رہتے ہیں لفظوں کے یہ پیوند فقط
اور حقیقت میں جو شاعر ہیں وہیں چند فقط
لیکن ان کا بھی یہاں قافیہ بیسہ دیکھا

. . . .

وہ بھی کہلاتے ہیں شاعر جو بجائیں ڈفلی
نام میں وزن مگر شعر میں سکتہ دیکھا

(نغمہ نگار)

جن کی تحریر پریشاں پہ جہالت ہے نثار
سربرآوردہ یہی اور یہی ہیں ـــــ رردار
کھوٹا سکہ اسی بازار میں چلتے دیکھا

(اسٹوری رائٹر)

جن کے ہاتھوں سے ستاروں کو یہاں نور ملے
ان کے کاشانوں میں ہر وقت اندھیرا دیکھا

(لائٹ مین)

کوہ کن پر ہے مے عشرت پرویز حرام
یعنی چشمے جو نکالیں یہ انہیں پیاسا دیکھا

(ورکرز)

ہر ادا جنس تجارت ہوئی ہر بات بکی
مول ہر دن کا معین ہوا ہر رات بکی

(ہیروئن)

راتیں ان کی ہیں، دن ان کے ہیں زمانہ ان کا
کبھی ٹیڑھا نہیں ہوتا ہے نشانہ ان کا

(ہیرو)

اس نظم میں قیصر عثمانی بڑے بے باک تماشائی ہیں جو طنز بھی کر رہے ہیں اور غیر جذباتی بھی نہیں ـــــ آج فلمی دنیا کے ہر شعبے کے بارے میں فلم کے باہر کا آدمی بھی کچھ کچھ معلومات رکھتا ہے۔ اس طرح یہ کالے پردوں پر ستاروں کی چمک دیکھنے والے آدمی کے کانوں تک ان

ستاروں کی چمک کے رازوں کی جھلک پڑ چکی ہے اس لئے
ا اور شاعر کے درمیان پوری نظم میں ایک گہرا تعلق رہتا
جس سے نظم کی معنویت اور بڑھ جاتی ہے
معنویت کی بات چلی ہے تو اس بارے میں بھی کچھ
ں کروں گا۔ اسی طرح نظم دو حصوں پر مشتمل ہے اسی
ں اس کی معنوی ساخت کے بھی دو حصے ہیں ایک حصہ
" طنز اور تلخ نوائی" اور دوسرا حصہ ہے " دردمند
یدگی ـــ"!
قیصر عثمانی جیسا کہ اختر قادری اور ظ۔ انصاری
تعارف اور تقریظ سے معلوم ہوتا ہے خاندانی شرافت
نسبی اصالت اور تہذیبی وضعداری کے وارث ہیں اور
میراث اندوختے کی طرح لئے لئے وہ چوکی دہائی میں اس نگری
آئے تھے جہاں ہر فن کو بازاریت کے آنرے سے گھس گھسا کر
فن کے خانے میں فٹ کیا جاتا ہے۔ ان کا فن ـــ
س بازار میں بھی بہ خیر و عافیت زندہ ہے۔ نظم میں کہیں
ں اسی قیصر عثمانی کا طنز ہے جو برسوں سے اسی دریا
اپنا دامن بچانے کی فکر میں سرگرداں ہے اور دوسرا قیصر
نی وہ ہے جو اسی دریا کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ وہ خود
تا ہے اور خود تماشائی ـــ شاید قیصر عثمانی کی شخصیت
ں تضاد نظم کے معنوی امکانات کو لامحدود نہ کر سکا۔ اور
ں ایک سمت مقرر کر لی، یہ اگر نقص ہے تو یہ نقص خلقی ـ
فطری ہے۔ کوئی بھی فنکار اپنی شخصیت کو اپنے فن سے
ـ نہیں کر سکتا، کہیں وہ فن کو شخصیت کے تابع کر لیتا
اور کہیں شخصیت فن کے تابع ہو جاتی ہے۔ اور جب یہ
ا ایک دوسرے کی گرفت سے آزاد ہوتا ہے تو کبھی فن
بیچ اٹھتا ہے اور کبھی شخص ـــ کبھی وہ اپنے نظریات کی آبرو
ئے ہوئے بچانے کا کام کرتا ہے اور کبھی اپنے نظریات کی

شکست کا جواز زمانے کے جبر میں ڈھونڈنے کی کوشش کرتا
ہے۔ ظ۔ انصاری نے یہی بات اشارے میں کہی ہے۔
" جن لوگوں نے اس پرچھائیوں کے دیس کا
قریب سے نظارہ کیا ہے وہ قیصر عثمانی کو تلخ
حقیقت بیانی کا الزام دیں گے اور جنہوں نے
دور سے سُنا ہے وہ اس نظم کو ذاتی محرومی کا
ری ایکشن بتائیں گے "
میں قیصر عثمانی پر دونوں الزام عائد کرتا ہوں اس
لئے کہ یہ الزام بہت مبارک ہیں۔ یہی الزام شعر کہلواتے
ہیں۔ تصویریں بنواتے ہیں اور نغموں کو جنم دیتے ہیں - یہی
الزام فن کی تخلیق کا سبب ہیں۔ جب قیصر عثمانی کہتے ہیں۔

کسے مطلوب نہیں جوہر ذاتی کی نمود
فطرتاً سب ہیں طلب گارِ مقام محمود
کون سے دل میں نہیں بحرِ تمنا موجود
ہیں مگر کتنے جنہیں ملتا ہے درِ مقصود

تو پتہ چلتا ہے کہ یہ تماشائی جو گویا شہر کے صاحبان علم و فضل
کے ایک گھرانے کا چشم و چراغ ہے اور جس کا سلسلۂ نسب،
ذوالنورینؓ سے ملتا ہے، وہ اس سرکس میں آیا ہی کیوں؟
جہاں جوہر ذاتی، کا کوئی پارکھ نہیں وہاں تماشائی کیا کرے؟
وہ ارباب حکومت سے مخاطب ہوتا ہے پوری سنجیدگی اور
دردمندی سے اور نظم کے اسی حصے سے پتہ چلتا ہے
قیصر عثمانی اس لوٹم لاٹ سے اب تک بچا ہوا
ہے۔ جو کہہ رہا ہے۔

یہ نہیں ہے کہ ہے فن بے سروسامان یہاں
یہ بھی سچ ہے کہ ہے کچھ لوگوں میں ایمان یہاں

لئے یہ اعتراف ہے کہ سب کچھ کالا نہیں لیکن اس کا کہنا ہے کہ
ذوق سلیم مفقود ہے حُسن تنظیم معدوم ہے اور ـــ ارباب

حکومت کے لطف وکرم کا سایہ کبھی نہیں اور پھر وہ لٹیے لگوں سے کہتا ہے کہ بہت ختم کر چکے ماضی کا بہت داغ کھائے سینوں اور کلیجوں پر۔ تمہارے گھر کی چوکھٹ پر بھوکے بچے بلک رہے ہیں، چولہے بجھے ہوئے ہیں۔ چہرے افلاس سے جھلسے ہوئے ہیں، چراغوں میں تیل نہیں ہے۔ اپنے حق کے لئے طوفان بر پا کرو۔ عزم مصمم کی شمشیر اٹھالو" امت قارون کے مرض کا علاج تنظیم ہے۔ روایات کہن کی زنجیر کاٹ دو۔ یہ مرض کا علاج ہو نہ ہو، قیصر عثمانی کو مرض کا احساس ضرور ہے اور وہ اس مرض انبوہ میں جشن کے تماشائی نہیں۔ وہ سوچتے ہیں۔ محسوس کرتے ہیں اور اس احساس

اظہار پر قادر ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں نے کہا کہ یہ حملہ یک رخا ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قیصر عثمانی صاحب یہ صرف فلمی دنیا میں نہیں، خواب گاہ سے لے کر زندگی اس رزم گاہ تک، اس جہان خارج و الموجود میں، ہمہ آفاق فتنہ و شر ہے۔ اور صرف فلم کے گدھوں کی نہیں، ہر گدھے کی گردن میں سونے کی مالا ہے۔ آپ کاش فلمی دنیا کے بہانے اس دور قمر پر حملہ کرتے تب شاید یہ شاندار نظم عظیم ہو جاتی۔



قیصر عثمانی کی شعری تصنیف

"پرچھائیوں کا دیس"

بلراج ساہنی

"پرچھائیوں کا دیس" کو میں اچھی طرح جانتا ہوں بلکہ لگ بھگ پچیس برس سے اس دیس میں پرچھائیں کا رول بھی ادا کرتا آرہا ہوں۔ اردو شاعری کو میں بہت نزدیک سے تو نہیں جانتا پھر بھی اچھی یا بری شاعری میں تمیز کرنے کا کچھ کچھ دعویٰ کرتا ہوں۔

ہر زبان کی شاعری کے میدان میں ایسے استاد ملتے ہیں جو لفظوں کے ساتھ کھیلنا خوب جانتے ہیں لیکن ان کی شہرت دائمی نہیں ہوتی حالانکہ لفظوں کا ماہر ہونا بھی اپنی جگہ کوئی چھوٹا موٹا ہنر نہیں۔

میدان اسی کے ہاتھ رہتا ہے جو لفظ اور معنی دونوں میں شدت لے آئے۔ وہ شاعر سدا سدا کے لئے لوگوں کے دلوں میں بس جاتا ہے۔

قیصر عثمانی کی اس لمبی نظم میں جگہ جگہ مجھے یہ شدت نظر آتی ہے اور میں خود اپنے تجربہ کی بنا پر دل وجان سے ان کی کھینچی ہوئی تصاویر کی سچائی کا گواہ ہوں۔

کوئی بھی طویل نظم معیاری اتار چڑھاؤ سے آزاد نہیں ہوتی۔ فلم کی تکنیکی اکائیوں کو بیان کرتے ہوئے قیصر عثمانی صاحب بھی لفظوں سے خوب کھیلتے ہیں۔ اور ان حصوں کا مزہ لیتے وقت سادھارن پاٹھک شاید اتنی باریکیوں میں نہ جا سکیں جس قدر کہ ہمارے اہل زبان، جیسے کہ فلم ایڈیٹر کے بارے میں ان کا یہ بیان ؎

یہ جو اجزائے پریشاں کو بہم کرتے ہیں
پہلے سب "حشو و زوائد" کو قلم کرتے ہیں
"صوت و صورت" کو بہ یک سلسلہ ضم کرتے ہیں
جوں فسانہ میں "خم و پیچ" تو کم کرتے ہیں

ظاہر ہوا ... سے ... شمع ... ایک ... علمی دنیا ... عجب ... [illegible]

اور پھر ان اشاروں کو سمجھنے کے لئے فلم کی تکنیک سے کچھ نہ کچھ واقف ہونا بھی ضروری ہے۔ اور پس پردہ طنز کو سمجھنے کے لئے فلمی زندگی اور ماحول سے بھی جیسا کہ "میک اپ روم" کا ذکر کرتے ہوئے ان کا کہنا ہے ؎

اک طرف حجرۂ آرائش و تزئین جمال
عیب کو فن بناتا ہے جہاں زور کمال
کبھی ہوتی ہے یہاں دل کی تمنا پامال
کبھی ملتا ہے یہاں لطف شبستان وصال

جو سر پردہ نہیں وہ پس پردہ دیکھا
فلمی دنیا میں عجب میں نے تماشا دیکھا

بہرکیف مجموعی طور پر "پرچھائیوں کا دیس" ایک یادگار نظم ہے جو شاعر کے دل کی گہرائیوں، ضمیر کی تلخیوں اور دماغی الجھنوں سے براہ راست نکلی ہے۔ وہ اس لئے نہیں لکھی معلوم ہوتی کہ شاعر اسے لکھنا چاہتا تھا بلکہ اس لئے کہ لکھے بنا وہ رہ نہیں سکا۔ کیونکہ وہ خود اس پرچھائیوں کے دیس کا ایک جز ہے۔ اس کی نیرنگیوں کا چشم دید گواہ ہے۔ ایک بند میں اراکین حکومت سے یوں مخاطب ہوئے ہیں:-

فلمی دنیا کا عجب حال ہے سن لیں یہ حضور
کوئی قانون یہاں ہے نہ ہے کوئی دستور
چند سرکش ہیں یہاں اور ہزاروں مجبور
صاف لفظوں میں یہ سب کار سیہ کا ہے قصور

کیا ہے اندھیر یہاں پوچھئے ان کے دل سے
زندگی جن کی گزرتی ہے بڑی مشکل سے

بات تو یہی ہے اور سب جانتے ہیں مگر جو جانتے ہوئے بھی نہ جانیں، سنتے ہوئے بھی نہ سنیں ان کا کیا علاج؟ بہرحال قیصر عثمانی صاحب نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔

قیصر عثمانی کی شاعری

ڈاکٹر علیم اللہ حالی

ولی دکنی کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان کی شخصیت شمالی ہندوستان اور دکن کے درمیان ایک ادبی پل کی سی تھی۔ اس لئے کہ ولی نے شمال کو دکن کے مزاج شعری اور طرز بیان سے آگاہ کیا۔ اور دکن کو شمال کے لب و لہجہ سے متعارف کرایا۔ اور اس طرح ولی کا سفر شمالی ہند، شمال و جنوب میں ادبی لین دین کا باعث بن گیا۔ جناب قیصر عثمانی کے سلسلہ میں بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اردو کی عام دنیائے شعر و ادب اور فلمی دنیا کے بیچ رابطہ کا کام کیا ہے۔ جو لوگ قیصر عثمانی سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ شعر و ادب کا ذوق انہیں ورثہ اور ترکہ میں ملا ہے اور فلمی دنیا میں شرکت سے قبل ہی انہوں نے ایک شاعر و افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنی شخصیت میں وقار پیدا کر لیا تھا۔ اپنے ابتدائی دور میں وہ شعر و ادب کے جتنے خوبصورت فن پارے پیش کر رہے تھے اگر اس میں دوسرے قلم کاروں کی طرح منہمک رہتے تو آج نہایت ممتاز مقام کے حامل ہوتے۔ اس وقت تک وہ فعال، متحرک اور تخلیقی اعتبار سے مستعد شخصیت نہ جانے کن بلندیوں تک پہنچ جاتی ــ مگر فلمی دنیا کے انہماک نے انہیں ادبی دنیا سے بے نیاز رہنے پر مجبور کرنا چاہا۔ ہمارے سامنے متعدد مثالیں موجود ہیں جن کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ فلمی دنیا شخصیتوں کو بلا شرکت غیرے اپنانے پر مصر ہوتی ہے۔ چنانچہ بہت سے شعراء و ادباء نے اپنے آپ کو فلم کے مزاج و انداز کے سپرد کر دینے میں ہی عافیت سمجھی، یہ لوگ اگر ادبی کام کرتے رہتے تو ادب و شعر اور ثقافت و تہذیب کو طرح طرح سے منور کرتے، اب اس رنگین و پر فریب دنیا سے کون پوچھے کہ تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیئے۔

ان تمام ادباء و شعراء میں جنہوں نے ضرورت یا وقتی رجحان

کی وجہ سے اس طلسم ہوش ربا کی بستی میں قدم رکھا ہے جناب قیصر عثمانی اس حیثیت سے ممتاز ہیں کہ انہوں نے کبھی مکمل سپر اندازی نہیں کی۔ فلمی دنیا سے وابستہ رہتے ہوئے اپنی شعری و تخلیقی شخصیت کے تحفظ نے انہیں ہمیشہ ذہنی کشاکش میں مبتلا رکھا ہے۔ یہ کشاکش ویسی ہی ہے جس سے گذر کر غالب کہا تھا کہ ؎

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

فلمی دنیا کے سامنے Complete Surrender نہیں کرنے کا ہی یہ فیض ہے کہ آج بھی تخلیقی اعتبار سے قیصر عثمانی بیدار ہیں، یہ اس کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے اس دنیا سے وابستہ رہ کر بھی "پرچھائیوں کا دیس" جیسی کامیاب تخلیق پیش کی ہے جس نے انہیں شہرت و وقار کی دولت دی ہے۔ انہوں نے "میرا وطن میرا گھر" جیسی کامیاب نظم لکھا جس میں ماضی کی بازیافت کی حسین اور دل گیر کوشش کی گئی ہے۔ ماضی سے اٹوٹ رشتہ قیصر عثمانی کو کسی نئی وابستگی میں مکمل انہماک کا موقع ہی نہیں دیتی۔ بمبئی کے دلفریب اور رنگارنگ دنیا میں جا کر گذرے دنوں کو بھول جانے سے بالکل مختلف قیصر عثمانی نے اس طرف بڑھتے ہوئے قدم کے باوجود ہمیشہ رک رک کر ٹھہر ٹھہر کر حسرت زدہ نظروں سے پیچھے مڑ کر بھی دیکھا ہے۔ اور یہی امتیاز ہے جو دوسرے بہت سے فنکاروں کے مقابلے میں قیصر عثمانی کو حاصل ہے۔ بمبئی میں بیٹھ کر اپنے گاؤں کے آبائی مکان کے آنگن چھت اور دہلیز کے بارے میں شدت سے سوچنے اور محسوس کرنے والا آدمی اپنی مجبوریوں سے مکمل سمجھوتہ کیونکر کرسکتا ہے، فلمی دنیا سے تعلق کے باوجود قیصر عثمانی اپنی شخصیت کو ... نہیں کرسکے یہی ان کا سب سے بڑا قصور ہے۔ یہی ان کی شخصیت کا سب سے بڑا حسن ہے۔ "میرا وطن میرا گھر" ایک بند میں کہتے ہیں

یہ اک طرف ہیں منزل بالا کی سیڑھیاں
باقی ہیں جن پہ اب بھی میرے پاؤں کے نشاں
دہرا رہی ہیں عہد گذشتہ کی داستاں
کھلنے لگے صحیفۂ ماضی کے سب ورق
یاد آ گئے مجھے کئی بھولے ہوئے سبق

قیصر عثمانی کی شخصیت میں چھپی ہوئی عقیدت جو گئے گذرے دنوں سے گہری وابستگی، انسانی اقدار سے ان کی محبت، ایک ایک شئے میں تلاش حسن اور بے قرار مضطرب دل کی تڑپ ان کی تمام تخلیقات سے ہویدا ہے۔ بہت زمانہ قبل کی لکھی ہوئی نظم ایک نوجوان بیوہ کا مطالعہ کیجئے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ متذکرہ بالا صفات خصوصیات وہ نہیں ہیں جو ایک فنکار اپنے فنی سفر راستے سے بٹورتا جاتا ہے بلکہ وہ خلقی خصائص ہیں جو قیصر عثمانی سیدا وفیاض سے لے کر آئے ہیں حسن ان کے لئے سب سے زیادہ پرستش کی شئے ہے یہ حسن چاہے کسی مست طناز ہو یا پیکر حزن و ملال ہو، کہیں کشمیر کی وادیوں میں ہو یا گاؤں کی پگڈنڈی میں، جن کی ہر ادا انہیں روک لیتی ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ قیصر عثمانی حسن مغموم ... ہوتے ہیں۔ غم اور حسن دونوں کی ہی جلوہ کیفیات ... کی داخلی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے چنانچہ ان کے فن پاروں میں بھی ان دونوں عناصر کی جلوہ گری ... طور پر نظر آتی ہے۔ انہیں دونوں لطیف کیفیات سے ان کے فکر و سخن کو مہمیز لگتی ہے عین شباب میں ... ایک عام آدمی زندگی کا خیدوتی ہوتا ہے اور رعنائیوں سے لطف و اہتزاز حاصل کرنا چاہتا ہے۔ قیصر عثمانی

سن کے ایسے مناظر تلاش کر رہی تھی جہاں تجرونیت اور
ہجائی ہوئی تھی۔ ان کی نظم "ایک نوجوان بیوہ" کے
سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے شعری و تخلیقی تحرک و
بنیادی سبب خواب ناتمام، سوز پیہم، تھکن اور
یسے جذبے ہیں۔ درد و حزن سے معمور مزاج کے
ایک نوجوان بیوہ آتی ہے تو وہ اس سے اس طرح
بتا ہے کہ ؎

ہم ہوں تیری دید سے کیونکر نہال
حسن ہے تیرا محرم کا ہلال
اجلے کپڑوں میں تو کیسی لگتی
زیب تن ہو جیسے شوہر کا کفن

یہ درد نواز طبیعت میں ایک نوجوان شاعر کے دل
یس و تطہیر کی کیسی الوہی خصوصیت پیدا کر دی
کے اس منزل میں مزاج و انداز سے ہٹ کر حقائق
نئے زاویہ نظر سے دیکھنے کی امتیازی خاصیت نہ
یصر عثمانی کے اس عہد کی فنکاری پر روشنی ڈالتی ہے
ے مستقبل کی شاعری کے بارے میں بھی پیشن گوئی
۔ اور لعد کے نئی شعری کاوشوں سے بھی جب
کی تائید ہوتی ہے تو یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ انسان
لے کر بوڑھاپے تک بہت کچھ بدلتے رہنے کے باوجود
بر یہ نہیں بدلتا۔ قیصر عثمانی کا وہ تعلق جو انہیں
خلاقی انداز سے رہا ہے۔ مختلف تخلیقات میں الگ الگ
جھانکتا نظر آتا ہے۔ وضع داری، شرافت، خوش خلقی،
اس وناداری، روایت نوازی اور محبت و موانست
نے انہیں اپنے گھر سے ملی تھیں۔ وہ تخلیقی منزلوں
ان کی سربراہی کرتی رہیں، وہ اپنے گھر کو یاد
بہت سو ۔۔۔ [illegible]

یاد میں بھی ستائش ہیں کہ ؎

وہ لوگ کیا ہوئے جو مرے غم گسار تھے
دکھ سکھ میں جو شریک تھے جو وضع دار تھے
مخلص تھے مہربان تھے یاروں کے یار تھے
مہر و وفا کی بستیاں ویران ہو گئیں
جن محفلوں کی دھوم تھی سنسان ہو گئیں

(نظم میرا وطن میرا گھر)

متذکرہ بالا حقائق سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ قیصر عثمانی دل زندہ کے حامل ہیں، زندگی کو دیکھنے اور سمجھنے کے سلسلہ میں وہ ایک منفرد نقطۂ نظر کے قائل ہیں ادب و شعر کو وہ حدیث دل سمجھتے ہیں اور خارجی مصلحتوں سے شعر و ادب کو دور رکھنا چاہتے ہیں ـــ وہ اگر ان نکات پر مصر نہ ہوتے تو فلمی دنیا میں پہنچ کر "پرچھائیوں کا دیس" بھی نہیں لکھ سکتے۔

"پرچھائیوں کا دیس" میں باز درون خانہ کو طشت ازبام کر دیا گیا ہے ظاہر ہے کہ اس راز سربستہ کو وہی کھول سکتا تھا جو محرم راز بھی ہو اور شاعری کو قیصر عثمانی سے بہتر راز داں اور کون مل سکتا تھا۔ میں نے تمہیدی سطور میں یہ بات کہا کہ شعر و ادب اور فلم میں رابطہ پیدا کرنے کا کام قیصر عثمانی نے خوبصورتی کے ساتھ انجام دیا ہے لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ فلم و شاعری کو بےجان اور بے روح بلکہ اکثر و بیشتر سب کچھ لے کر شاعری کو بےجان اور بے روح بنا کر چھوڑ دیتی ہے اس لین دین کے چکر میں اکثر شاعری کا ہی نقصان ہوتا ہے۔ یہ تو قیصر عثمانی کا کمال ہے کہ انہوں نے اس دنیا کے تجربات (خواہ وہ فلم ہی کیوں نہ ہوں) کو شاعری کا روپ دیدیا ہے۔ فلمی دنیا کے کھوکھلے پن، اخلاقی زوال
قصنو ۔۔۔ [illegible]

کی داستانیں تو اور بھی ملتی ہیں لیکن "پرچھائیوں کا دیس" کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ان داستانوں کو ایک شاعر نے بیان کیا ہے ایک ایسے شاعر نے جو مسلسل فلمی دنیا کی اویزشیوں اور ملمع کاریوں سے نبرد آزما رہا ہے جیسے یہ معلوم ہے کہ شاعری کس قدر سچی ہوتی ہے اور فلم کتنی جھوٹی اور پر فریب جیسے یہ تلخ تجربہ حاصل ہو چکا ہے کہ فلم میں ادبی وقار کے ساتھ مرتبہ حاصل کرنا کتنا دشوار ہے۔ جیسے یہ بھی معلوم ہے کہ فلم حقیقت سے کتنی مختلف اور متضاد ہے ـــ اور یہ بات اس فرد کے لئے کتنی جاں گداز ہو سکتی ہے جس کا ذہن حقیقت کا خوگر ہو اور جس کی نگاہیں ہمیشہ لطیف سے لطیف تر حقائق کی متلاشی ہوں۔ غرض پرچھائیوں کا دیس" تضادات کی ایک ایسی دستاویز ہے جس میں ایک فرد کا ذاتی نوحہ بھی شامل ہے۔

اس نکتہ کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ اچھا فن پارہ تضادات کی فضا میں ہی سامنے آسکتا ہے۔ حق و باطل، نور و ظلمت اور نیک و بد کی انتہاؤں سے ہی شعر و فن کے سوتے پھوٹتے ہیں، قیصر عثمانی نے پرچھائیوں کا دیس" میں کہیں تضادات کا براہ راست اظہار نہیں کیا ہے لیکن ایک مکروہ شکل کی تصویر بنا کر انہوں نے فنکارانہ سطح پر اس حقیقت کا اظہار کر دیا ہے یہ حقیقت کس طرح اس فلمی ماحول میں ADULTRA-TION کا شکار ہو جاتی ہے۔ قیصر عثمانی کے موضوع وان کے لہجہ نے بڑی تقویت پہنچائی ہے تلخ حقائق کے لئے درشت لہجہ موضوع میں شدت اور تاثر پیدا کر رہا ہے۔ وہ اس امر کا اظہار کر دیتے ہیں کہ "پرچھائیوں کا دیس" گزارش احوال واقعی کے ضمن میں لکھی گئی ہے۔ اس بیان میں حسن بیعت کی جولانی۔ فرح مندی اور خوش دلی کی کیفیات نہیں مل سکیں۔ یہ تو خیر فنکار کا اعتذار ہے، حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ موضوع کی رعایت سے تلخ لہجہ اختیار کیا ہے مگر اس کے باوجود جگہ جگہ شاعری کا جگنو جگمگاتا رہتا ہے۔ رمز و کنایہ، تشبیہ و اشارہ، ترکیب و علامت اور ترتیب و الفاظ اور تشکیل فقرہ کی متعدد خوبیوں نے قیصر عثمانی کے بیان میں شاعری کے نقوش پیدا کر دیئے ہیں ایک کافی حد تک بیانیہ طویل نظم میں، جہاں فنکار الجھا الجھا اور نامساعد صورت حال سے بیزار اور ناخوش ہو بہت سی شعری خصوصیات کا پیدا ہو جانا اس بات کی علامت ہے کہ کسی حالت میں قیصر عثمانی کے ہاتھوں سے شاعری کا دامن نہیں چھوٹتا۔ چنانچہ بندوں سے منتخب ان فقروں اور تراکیب نیز کچھ مصرعوں کو دیکھئے جن میں شاعری کا حسن قطعی بے ساختہ طور پر آشکارا ہو جاتا ہے۔ چشمۂ حیواں، نغمۂ لب، بزم خرابات، نقش بے چارگی، آدم و حوا

؎ دام صیاد ہے طائر کی پر افشانی ہے

؎ در عصمت کی اک امید یہ قربانی ہے

؎ گرد افلاس سے چہرے کہیں دھندلاتے ہوئے

جنس ہنر دؔ اک طرف میان میں آسودہ خودی کی شمشیر مدہوش فریاد، عزت و ناموس کی دھول، طلب گار مقام محمود نظر بندۂ تعصب رشتۂ آواز، سرمۂ چشم بصیرت،

عشرت پرویز ؎ قطرۂ مئے لب نئے خوار پہ لرزاں کیجئے

اس طویل تر نظم میں سے یہ چند اشارات اور فقرے نیز مصرعے محض نمونتہً نقل کئے ہیں۔ دراصل یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایک بیانیہ اور خالص موضوعاتی شاعری میں بھی قیصر عثمانی نے شعری محاسن اور فنی وقار و معیار کو ملحوظ رکھا ہے، اس سے جہاں ان کی قدرت کلام کا اندازہ

وتا ہے وہاں ان کے معیار فکر و نظر اور انداز اظہار
پتہ بھی چلتا ہے۔

قیصر عثمانی کی شاعری کا حجم کم ہے لیکن ان کے جو
ر جتنے فن پارے ہمارے سامنے موجود ہیں ان میں شعری
ایات سے ان کا گہرا تعلق اور ایک سچے فنکار کا جذبۂ بے
تیار صاف جھلکتے ہیں۔ انہیں ہنوز اس بات کا موقع نہیں
ہے کہ وہ اپنی فنکارانہ شخصیت کا بھرپور اظہار کر سکیں
دنیا کی معروضیات اور جھوٹ اور فریب کے گھٹن پیدا
نے والے ماحول میں رہنے کے باوجود شعری و فنی فضاؤں
میں آزادانہ طور پر اڑان لگانے کی کسک قیصر عثمانی کے
اس مختصر حجم کی شاعری میں بھی ایک سچے اور اچھے فنکار
کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ وہ چونکہ فطری شاعر ہیں اس
لئے اپنی سچی شخصیت کی آزاد ترجمانی کے لئے انہیں بھر
اس خطے میں آنا ہے وہ اس لئے بھی کہ ماضی قیصر عثمانی کے
لئے سب کچھ ہے وہ انہیں جب جب پکارے گا وہ اپنی
اصلی شخصیت سے زیادہ سے زیادہ قریب ہوں گے اور
بہتر سے بہتر شعری تخلیقات پیش کریں گے۔

قیصر عثمانی اور اسکی عظمت

شیدا امام

زیرِ نظر سطور جس میں ایک شخصیت کو "بیان" کرنے کی کوشش کی جائے گی اگر وہ یعنی سید عبدالحئی جسے عرفِ عام میں قیصر عثمانی کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے خود اس کے قلم سے ہوتیں تو "بیان" میں نہ صرف نیکوئی پیدا ہو جاتی بلکہ مطلع سے لے کر مقطع تک کہیں بھی کوئی سخن گسترانہ بات نہ آنے پاتی۔ لیکن کیا کیا جائے جب کہ وہ یہ بار اٹھانے پر تیار نہیں ہے اور قرعہ فال ـــ بہ نام من دیوانہ زدند ـــ اسی موقع پر غالباً حسرت موہانی نے کہا تھا۔

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

آپ شاید یہ سوال کریں کہ اس مصرعہ میں "آپ" کا مرجع کون ہے؟ قیصر عثمانی یا راقم الحروف؛ عرض یہ ہے کہ جہاں تک قیصر عثمانی کا تعلق ہے اس میں "ذوق" بھی ہے اور "کرشمہ سازی" بھی۔ اگر یہ چیزیں نہ ہوتیں تو شعبدہ گاہ فلم میں اتنے طویل عرصہ سے منسلک نہ رہتا لیکن یہاں اس سے تخاطب نہیں۔ رہ گیا راقم الحروف تو اس کے ذوق کا یہ عالم ہے کہ ابتک اس کا کوئی "کرشمہ" شہود پر جلوہ گر نہیں ہو سکا۔ بشرطیکہ اسے بذلہ سازی پر محمول نہ کیا جائے۔ جواب ہے "ضرورت" یہ سب قیصر عثمانی کا "کرشمہ" اور زیرِ نظر سطور "ضرورت کے حسن" کا کرشمہ سازی ہے۔ ایک نے سہیل کے خصوصی نمبر کے لئے ضرورت سمجھی اور اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔ دوسرے پر وقت آ پڑا اور اسے مضمون لکھنا پڑا تاکہ "آبگینہ" میں ٹھیس لگنے کی آواز سننے ہی نہ آئے۔ ط

جو چاہے "وقت" کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

بات ضرورت تک تو پہنچ گئی لیکن اب سوچتا ہوں کہ کرشمہ سازی کا اظہار کس عنوان سے کیا جائے لیکن ویسا دیکھا جائے تو

یہ کوئی مسئلہ بھی نہیں۔ کیونکہ یہ دنیا تو دہی پروردگار عالم کی کرشمہ سازی کا ثبوت ہے۔ جس میں ہر روز کروڑوں انسان پیدا ہوتے ہیں۔ انہیں کی طرح قیصر عثمانی بھی ایک دن اچانک پیدا ہو گیا۔ والدہ کو خوشی ہوئی ہوگی، والد کو خوشی ہوئی ہوگی۔ پڑوسیوں کو پتہ چلا ہوگا جنہیں بقول راجندر سنگھ بیدی پتہ چلنا کوئی اچھی بات نہیں ہوتی۔ پڑوسی ضرور اچھے تعلقات کے پیش نظر مبارکباد دینے آتے ہیں تو گویا ان کے کہنے کے مطابق ایک قاعدہ بنا ہوا ہے کہ قیصر عثمانی پیدا ہو تو مبارک باد دو۔ کیلاش چندر پیدا ہو تو بدھائی دو۔ رام دیال یا کرامت بخش آجائیں تو خوشی مناؤ۔ ڈھول بجاؤ ——

رابندر ناتھ ٹیگور کہتے ہیں —— دنیا بھر میں ہر روز جو اتنے انسان پیدا ہو جاتے ہیں یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا انسان بنانے سے ابھی تھکا نہیں۔ خدا بھی ہنسی مذاق کی اوٹ میں کتنا ظلم کرتا ہے۔ چونکہ وہ تھک نہیں سکتا اس لئے انسان بناتا جا رہا ہے۔

چنانچہ خدا کی اس دریا دلی کا کرشمہ یعنی کہ قیصر عثمانی —— کو صوبہ بہار کے ضلع گیا کے ایک گاؤں پرپگہ میں —— بجائے —— منٹ ہمارے ٹیگور کے وعدے کی تائید میں پیدا ہو گیا اور رحیم انسان کی طرح بھول گیا کہ دنیا دکھ کا گھر ہے۔ ورنہ اس دنیا میں قیصر عثمانی کو بھیجنا رحمت تھی؟

ہر ماں باپ کی خواہش ہوتی ہے کہ ہمارا بیٹا بڑا ہو کر کلکٹر بنے۔ قیصر عثمانی کے پیدا ہونے کے بعد ان کے والد کی بھی یہی خواہش ہوگی۔ والدین بیچارے کا قصور۔ ان کی قوت فکر کلکٹر تک ہی ہوتی ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ قیصر عثمانی پیدا ہونے کے بعد دھیرے دھیرے بڑھنے لگا پھر بچپن کی دہلیز پھلانگ کر جوانی کے صدر دروازہ پر آکر کھڑا ہو گیا اور وہیں کھڑے کھڑے گنگنانے لگا۔

بھری دنیا میں جی نہیں لگتا
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی

قیصر عثمانی جو بچپن میں رنگ برنگی سیپیاں چنتا تھا اب وہ زندگی میں کسی کمی کو پورا کرنے کے لئے بے معنی قہقہوں کی گونج میں لمحاتی خوشیاں تلاش کرنے لگا اور جوانی کے صدر دروازہ پر کھڑے کھڑے پیچھے مڑ کر دیکھتا اور زندگی کو آنکھ مار کر کہتا —— میری جان اب تم رخصت ہو جاؤ اس لئے کہ اب آنے والی زندگی ہمارے دل میں سوز و گداز کی دنیا پیدا کرنے والی ہے۔ بس اب تم لوٹ جاؤ اس صدر دروازہ تک ہمارا تمہارا ساتھ تھا۔

اور ——

پھر آہستہ آہستہ وہ بالکل غیر محسوس طور پر صدر دروازہ سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا اور وہ جوں جوں قدم آگے بڑھاتا تو شعور بیدار ہو گیا۔ امنگیں دل میں مچلنے لگیں اور پھر اس کی زندگی کھلکھلا اٹھی اور اس کی سانسوں میں گیت بھر گیا۔ وہ ہر خوبصورت چیز سے عشق کرنے لگا اور اپنے ان احساسات کو پہلے تو نثر میں لکھنے لگا پھر شعر کے سانچے میں ڈھالنے لگا۔

اگر قیصر عثمانی شاعر نہ ہوتا تو ہوش و آگہی کی دنیا میں آنکھیں کھولنے کے بعد خوشگوار زندگی گذارنا اس کے امکان سے باہر تھا۔ شعر کے ذریعہ وہ اپنے پرشور جذبات کا اظہار کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ذوق سخنوری وارفتگی کی حد تک جا پہنچا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسکول اور کالج کے زمانے میں اس کی تمام

جو صرف "اردو ادب" پر مرکوز ہو گئی۔ اس کے والد الحاج ت محمد شاہ عبدالعزیز آزاد جو فارسی اور اردو کے ت ہی بلند پایہ ادیب و شاعر تھے اپنے بیٹے کے اس رجحانات سے بہت خوش ہوئے اور ایک دن اپنے بیٹے شر بنانے کے بجائے کو جو انہوں نے تصور کے صنم خانہ بنایا تھا خود ہی توڑ دیا اور ادب و شاعری میں اس کی ائی کرنے لگے اور زندگی کے آخری لمحہ تک یہ سلسلہ جاری ا۔

جب قیصر عثمانی صرف سترہ سال کا تھا اس کے کا انتقال ہو گیا اور ذمہ داریوں کا بوجھ قیصر عثمانی کے دھوں پر آپڑا تو دنیا کے دکھ درد اور اپنوں کی بے حسی ندازہ ہوا۔ اور تب زندگی کی بقا کے لئے تگ و دو کرنے ۔ لیکن وہ چونکہ کالج کے زمانہ ہی میں اردو کے مختلف یاری رسائل و جرائد میں مضامین نظم و نثر افسانے ڈرامے اور الات لکھ کر دنیائے ادب میں روشناس ہو چکا تھا اور عوام ہی مقبول تھا اس لئے اسے ماہنامہ "سہیل" (گیا) کے ادارہ میں ایڈیٹر کی حیثیت سے کام ملنے میں دشواری نہ ہوئی غالباً ۱۹۴۰ء کی بات ہے جب اس نے پہلی بار زندگی ں قدم رکھا تھا۔ اور تعجب کی بات یہ ہے کہ زندگی میں قدم رکھتے ہی اس میں احساس ذمہ داری پیدا ہو گیا تھا۔ ر حسن و خوبی کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش بھی ہوتا رہا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں میں اس کا ایک وقار قائم ہو گیا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب قیصر عثمانی سے میری ملاقات ہوئی اور ادریس سنبھاروی اور عارف سنبھاروی سے بھی قربت کا احساس ہوا لیکن بغیر کچھ کہے سنے قیصر عثمانی سے یہ ملاقات دوستی میں بدل گئی۔ اس لئے کہ دوستی میں اظہار کے لئے گویائی نہیں لمحوں کی ضرورت ہوتی ہے اور یوں بھی دانشور لکھتے ہیں کہ دوستی کو آنکھیں بند کر کے محسوس کرنا چاہئے۔ جس طرح محبوب سے آنکھیں بند کر کے محبت کی جاتی ہے۔ اسی طرح دوستی کو بھی سانسیں روک کر نفس نفس میں اتارنا چاہئے۔ محبت اور دوستی میں شناخت کی گھڑیاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرتیں کیونکہ کھلی آنکھیں دھوکا کھا جاتی ہیں۔ بند آنکھوں سے روشنی کے جھرنے پھوٹتے ہیں۔ دوستی کا چہرہ سب سے دلکش چہرہ ہے جسے نگاہوں سے اوجھل کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اور جس کی تصدیق بھی اس دن ہو گئی جب میں عازم کلکتہ ہوا تو قیصر عثمانی بھی میرا ہم سفر بن گیا۔

بات دراصل یہ تھی کہ جس طرح مجھے ادب اور قلم سے گہرا لگاؤ تھا۔ قیصر عثمانی بھی ادب میں اپنا ایک مقام بنانے کے بعد فلم کی دنیا میں بھی اپنی پہچان کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے جب اپنے شوق کی تکمیل کے لئے کلکتہ روانہ ہوا تو وہ بھی دوستی کا سہارا لے کر میرے ساتھ کلکتہ پہنچ گیا۔

کلکتہ پہنچ کر مجھے بغیر کسی سفارش اور تگ و دو کے ڈائریکٹر حافظ جی کی فلم "پردہ نشین" میں ہیرو کا کردار مل گیا اور قیصر عثمانی کو بھی اچانک فضلی برادران لمیٹیڈ میں پبلسٹی آفیسر کا کام مل گیا جسے پا کر وہ مطمئن بھی تھا اور بے انتہا خوش بھی۔

کلکتہ میں ہم دونوں ساتھ ہی رہتے تھے۔ ہم دونوں کے کام کی نوعیت مختلف تھی اور اوقات کار بھی مختلف تھے اس کے باوجود ہم دونوں خوشگوار زندگی گزارتے رہے۔ اس دور میں کئی بار ایسے رنگین لمحات بھی آئے جس کا ذکر کرنے سے کئی پردہ نشینوں کے نام آجائیں گے اس لئے میں نہیں چاہتا کہ رنگین و کیف اور لمحات کی سرمستیوں

کا ذکر کر کے کسی کو رنجیدہ کیا جائے۔ البتہ انہیں دنوں علاوہ سہیل عظیم آبادی اور پرویز شاہدی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ جن کا ذکر البتہ باعث فخر ہے۔ ان دو ہستیوں کے علاوہ بہار کے مشہور و مقبول کہانی کار رشید مظفر پوری سے بھی میری ملاقات ہوئی اور انہیں دنوں یونس احمر اور افسر ماہ پوری جیسے نامور ادیبوں سے بھی ملنا جلنا روز کا معمول ہو گیا۔ یہ ملاقاتیں کبھی میرے فلیٹ میں ہوتی تھیں اور کبھی یونس ہنظری کے دفتر "نقاش" میں اور اس طرح زندگی کے دن ہنسی خوشی گذرتے رہے۔

پھر اچانک یہ ہوا کہ قیصر عثمانی کی کمپنی بمبئی منتقل ہو گئی جس کے ساتھ وہ بمبئی چلا گیا اور میں بھی حالات سے مجبور ہو کر کیونکہ کلکتہ میں بمباری شروع ہو گئی تھی۔ اس لئے فلم میں کام مکمل ہوتے ہی واپس گھر آ گیا۔ گھر آنے کے تھوڑے دنوں بعد میری شادی سعیدہ سے ہو گئی جس کے ساتھ کچھ دنوں تک مسرت آگیں لمحات گذارنے کے بعد فلم کا شوق پھر مجھے کشاں کشاں بمبئی لے گیا۔

لیکن بمبئی آنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس دنیا میں سودے بازی بھی ہوتی ہے اور دل کے جذبوں کا گلا بھی گھونٹا جاتا ہے۔ بمبئی آنے کے بعد چار ماہ تک کام نہیں ملا۔ میں تھک گیا تھا ہر صبح سے شام تک دفتروں کے چکر لگاتے لگاتے میرے اعصاب تھکن سے جب چور ہو جاتے تو قیصر عثمانی کے دفتر میں جا کر اس کے پاس بیٹھ جاتا جہاں دلیوندر گوئل بھی کام کرتا تھا۔ اور شوکت ہاشمی بھی۔ ان سے گھنٹوں خیالات پر تبصرہ ہوتا رہتا پھر شام کو قیصر عثمانی کے ساتھ فلیٹ میں جاتا جہاں احسن رضوی مرحوم حقہ پیتے ہوئے ہم دونوں کا انتظار کرتے ہوتے۔ قیصر عثمانی ہر روز رات کو سونے سے پہلے بہت دیر تک آنے والے کل کے پُرامید لمحوں کا یقین دلاتا رہتا

اور جب واقعی ایک دن مجھے ایک بہت بڑی فلم "کہاں جان" میں کام مل گیا جس میں غالباً نو جہاں ہیروئن تھی تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی لیکن تقدیر نے میری خوشی چھین کر یہ ثابت کر دیا کہ مسرت فانی ہے۔ ناپائدار ہے عارضی برسات کی دھوپ یا ساون بھادوں کے چھاؤں کے مانند اور غم لافانی ہے۔ ابدی ہے اور میں اپنی والدہ کی موت کی خبر پا کر معاہدہ منسوخ کر کے گھر واپس لوٹ آیا مگر گھر آنے کے بعد ابدی زندگی کے راستے پر جو مملکت غم سے ہو کر جاتا ہے کئی اور اندوہناک سانحوں سے دوچار ہونا پڑا۔ دیکھتے ہی دیکھتے والد کا بھی انتقال ہو گیا اور سعیدہ بھی موت کی وادیوں میں گم ہو گئی۔ اس کے بعد میرے ننھے منے بیٹے نے جو ابھی جھولے ہی میں جھول رہا تھا اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

ان حادثات کے بعد جینے کی آرزو نہ رہی لیکن قیصر عثمانی وہ واحد دوست تھا جو مجھے جینے کا حوصلہ دیتا رہا۔ وہ اپنے ہر خط میں لکھتا تھا کہ تمہارا دل جو آج غم والم کا گہوارہ بنا ہوا ہے کل اسی دل میں خوشیاں جھومیں گی۔ کیونکہ یہی قانون قدرت ہے اس لئے زندگی سے فرار اختیار نہ کرو اور امید کا دامن تھام لو۔۔۔ امید ہی کا دوسرا نام زندگی ہے۔ مگر میں خائف تھا اپنے سائے سے۔ اور پھر اسی کیفیت میں، میں کلکتہ چلا گیا۔ جہاں پہنچ کر بھی سکون نہ ملا۔ بہت دنوں تک متفکر اور نڈھال بھٹکتا رہا۔ جب کبھی افق کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھتا تو محسوس ہوتا کہ ہم سب کا ایک ہی افق ہے۔ اور اس میں بہت سی خوبصورت یادیں پوشیدہ ہیں۔ یہ یادیں ایک جادو کا اثر رکھتی ہیں۔ اور کبھی کبھی یادوں کے سائے دھندلے ہو جاتے ہیں۔ اور جب مجھے محسوس ہوا کہ واقعی ایسا

تاہے اور میری یادوں کے سائے کبھی دھندلانے لگتے یں جیسے گرنے لگا اور ادھر اُدھر نگاہیں دوڑا کر ہارا ڈھونڈنے لگا کہ کوئی مجھے تھام لے اور گرنے سے بچالے عجیب اتفاق کہ سامنے والے فلیٹ میں جو لڑکی رہتی تھی، جس سے میں کئی بار مل چکا تھا اس نے آگے بڑھ کر بے سہارا دیا اور میں نے اس کو زندگی کا مرکز قرار دیکر سے حقوق شوہری سے سرفراز کیا۔ جب وہ صابرہ بن کر سیرے کاشانۂ حیات میں مجسم خوشی بنا کر داخل ہوئی و زندگی میں پھر سے بہار آگئی اور قیصر عثمانی کی بات یچ ثابت ہوئی کہ جو دل آج غم و الم کا گہوارہ بنا ہوا ہے ل اسی دل میں پھر سے خوشیاں جھومیں گی ۔۔!

شادی کے بعد میں اپنے ہوش و حواس کو قابو میں اکر سوچنے کے قابل ہو گیا اور میں نے بہت غور و فکر کے بعد ایک فلم بنانے کا منصوبہ بنایا اور "بغاوت" کے نام سے فلم بنانی شروع کردی جو مکمل بھی ہو گئی لیکن نمائش کے لئے پیش نہیں کی جا سکی کیونکہ کلکتہ کی فضا بگڑ گئی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف قتل و غارتگری اور بربریت کا مظاہرہ شروع ہو گیا تھا۔ ایک ہندو ایک مسلمان کو اور ایک مسلمان کو آزادی کی راہ پر ہلاک کر رہا تھا۔

وقت کی گردش میں حالات بنتے اور بگڑتے رہے یہاں تک کہ ملک تقسیم ہو گیا۔ ملک کیا بکھرا دنیا بکھر گئی ور اس کے ساتھ ساتھ کتنی ہی حسین و نازک قدریں چور چور ہو گئیں۔ بہت کچھ ملا اور بہت کچھ لٹ گیا۔ کتنے ہی نئے ساتھی ملے اور پرانے بچھڑ گئے۔ ان بچھڑنے والوں میں قیصر عثمانی بھی تھا کیونکہ وہ ہندوستان میں رہ گیا اور میں پاکستان آگیا کہ کیا اپنا وطن کیا پردیس ۔۔ ہر طرف ایک سی سمت کا نشان ملتا ہے۔

کہتے ہیں کہ دنیا میں دو چیزیں ایسی ہیں جو جا کر کبھی واپس نہیں آتیں۔ ایک گذرا ہوا وقت اور دوسرا انسانی جان۔ روح اگر ایک مرتبہ انسانی قلب سے باہر چلی جائے تو پھر واپس نہیں آتی ۔۔ اور ۔۔ وقت کے قدم اگر ایک مرتبہ آگے بڑھ گئے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے دوبارہ پیچھے کی طرف مڑنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ قیصر عثمانی کے ساتھ گذرا ہوا وقت بھی واپس نہیں آسکتا۔

لیکن اس کی "یاد" اب تک دل میں موجود ہے جب بھی ماضی کے جھروکے میں سے جھانک کر دیکھتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ میں اور وہ کبھی بچھڑے ہی نہیں تھے۔ اب بھی ایک دوسرے کی آواز سن سکتے ہیں ۔۔ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں اور اس یقین کو ایک دوسرے کے درمیان خط و کتابت سے اور بھی تقویت پہنچتی رہتی ہے اسے معلوم ہوتا رہتا ہے کہ میں کس حال میں ہوں۔ کیا کر رہا ہوں، کب میں نے "غم محبت" اور "ماحول" کے نام سے ناول لکھے، کس جذبے کے تحت فن اداکاری پر کتاب لکھی اور کب میں مینا شوری، چارلی، اعجاز اور ہمالیہ والا کو لے کر ایک بہت بڑی فلم "ستاروں کی دنیا" کے نام سے بنائی اور مجھے معلوم ہے کب وہ فضلی برادران لمیٹڈ سے الگ ہوا۔ کب اپنے دیرینہ دوست آنجہانی دیوندر گوئل کی فلم کمپنی گوئل سائن کارپوریشن سے منسلک ہوا اور آج اٹھائیس سال سے وہ اس کمپنی میں ایک معزز کی حیثیت سے کام کر رہا ہے جس کی ابھی حال میں ایک فلم "رشتہ کاغذ کا" کے نام سے بنی ہے۔ اس فلم کی ہدایت کاری آنجہانی دیوندر گوئل کے لڑکے اجے گوئل نے بڑی فنکارانہ انداز سے کی ہے۔ جسے دیکھ کر اس نوجوان ہدایت کار کے روشن مستقبل کا پتہ چلتا ہے۔ مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ اسی دوران قیصر عثمانی نے ایک طویل بیانیہ نظم

"پرچھائیوں کا دیس" کے عنوان سے لکھی ہے، جو قلمی دنیا کے ذاتی مشاہدات اور تلخ و شیریں تجربات پر مبنی ہے" جو اب کتابی صورت میں بھی دستیاب ہے اور جسے میں نے غور سے پڑھا بھی ہے۔

میں "پرچھائیوں کا دیس" کے بارے میں کچھ لکھنا اس لئے مناسب نہیں سمجھتا کہ جب تک اس طویل نظم کو کوئی خود نہ پڑھے اس کے حسن اور اس کی افادیت کا اندازہ نہیں ہو سکتا لیکن میں اتنا ضرور کہنا چاہوں گا کہ پوری نظم پڑھنے کے بعد ایک باصلاحیت اور ذی شعور شاعر کا پتہ ضرور چلتا ہے جس نے اشعار کے ذریعہ تعمیری اور انقلابی کام انجام دیا ہے۔

"پرچھائیوں کا دیس" کے علاوہ قیصر عثمانی نے "اور طوفان تھم گیا" کے نام سے ایک ناولٹ بھی لکھی ہے۔ یہ ناولٹ کردار نگاری کے فطری ارتقا کی سچی تصویر ہے۔ ہر کردار واقعات کے اعتبار سے اپنے ماحول کی نمائندگی کرتا ہے اس ناولٹ کے ماحول کی کڑواہٹ اور کردار کا کسیلا پن دراصل اس پورے معاشرے کی نمائندگی کرتا ہے جس کا گھناؤنا پن آج بے نقاب ہو چکا ہے۔

قیصر عثمانی قلم سے لے کر معاشرے کی برائیوں تک جو کچھ لکھا ہے۔ گہرائی اور گیرائی ہے اور وہ اس خوبی سے لکھنے میں اس لئے کامیاب ہو سکا کہ اس نے علم کی روح کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔ علم اس کے رگ و ریشہ میں رچ بس گیا ہے۔ اس نے علوم و فنون کے ساتھ ساتھ زندگی کا بھی وسیع مطالعہ کیا ہے اور زندگی کو اتنا قریب سے دیکھا ہے کہ مشاہدات نے اس کی فکر کے انداز کو بدل دیا ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کے دل میں ایک آگ ہے اور ایک تڑپ ہے۔

یہ آگ اور تڑپ اب بھی اس کے دل میں موجود ہے، لیکن اس بار اس کی تڑپ نے ایک نیا انداز اختیار کیا۔ جس کا اظہار وہ شخصیات پر ایک کتاب "یادوں کا ..." کے نام سے مرتب کر رہا ہے۔ میں نے اس کتاب کے کئی مضامین پڑھے ہیں جنہیں پڑھ کر یہ اندازہ ہوا کہ قیصر عثمانی شخصیت نگاری کا ذوق بھی رکھتا ہے۔ اس کے لہجے میں عجیب و بانکپن اور انداز میں مخصوص دل آویزی پائی جاتی ہے اور چونکہ اس میں جذبات نگاری سے شغف ہے اس لئے اس کی شخصیت نگاری میں سلیقہ بھی ہے جسے پڑھتے وقت ہر شخص لفظ اٹھتا بیٹھتا اور ہنستا بولتا نظر آتا ہے مگر اصل میں ہر شخص اندر سے دکھی ہے۔

قیصر عثمانی کی شخصیت میں بھی یہی خصوصیات ہیں، وہ بھی بظاہر ہنستا بولتا نظر آتا ہے۔ جس حال میں موجود دکھائی دیتا ہے لیکن اس کے دل کی گہرائی میں ہزاروں تمنا کا طوفان دم توڑتا نظر آتا ہے۔ اس کی آرزوئیں نازک شیشے کی کرچیاں بن کر اس کے سارے وجود کو مجروح رکھتی ہیں۔ وہ اپنے ناتمام بوجھ تلے دبتا ہی چلا جاتا ہے۔ اس کے چہرے کے گرد مسکراہٹ کی تصویر ہر وقت سجی رہتی اور اس کی اس بظاہر سجی مسکراہٹ کے درمیان سماج فریب کھاتا ہے۔ وہ اس وقت خوشی و شادمانی کی آخری معراج پر پہنچ جاتا ہے جب اس کے لئے اپنی پسندیدہ کا حصول ناممکن بن جاتا ہے۔

اور وہ ایسا رویہ اس لئے اختیار کرتا ہے کہ اس کا اس بات پر یقین ہے کہ جو لوگ یہ سوچتے ہیں کہ دنیا سب کچھ مل جاتا ہے وہ احمق ہیں۔ دنیا میں ہر خوشی اور تمنا پوری نہیں ہوتی۔ جو نصیبوں سے مل جاتا ہے اس کے سمجھوتا کر لینے کا نام ہی دنیا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑا منصف

"حقیقتوں سے لبریز" پرچھائیوں کا دیس"

نذاف اضلی

قیصر عثمانی کی طویل نظم جو "پرچھائیوں کا دیس" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئی ہے فلمی ادب کے لامحدود ذخیرے میں اپنے ڈھنگ کی انوکھی کوشش ہے۔ ہندوستانی فلم انڈسٹری سے وابستہ مصنفین اپنے ذہن کو کسی مارواڑی فلمساز یا کم علم سنگیت کار کے ہاتھوں بیچ کر ہی اپنی روٹیوں کی حفاظت کر پاتے ہیں۔ فن نمائش گھروں سے دور ذہنی یکسوئی کا گواہ ہوتا ہے اور اس حمام میں شخصیت کی پاکیزگی کے ساتھ ہی داخل ہوا جا سکتا ہے۔ یوں دنیا میں ہر وقت دنیا داری اور سمجھوتہ بازیوں کی نقابیں اوڑھے رہنے کا چلن ہے وہاں کبھی کبھار اگر کوئی بنا نقاب کے آئینہ کا سامنا کرتا دکھائی دے جائے تو تعجب ہی ہوتا ہے۔ قیصر عثمانی کی نظم "پرچھائیوں کا دیس" کو پڑھ کر ہم بھی اس قسم کے استعجاب کا شکار ہوئے ہیں۔ قیصر عثمانی نے لفظوں کا سہارا لے کر کچھ ایسی ہی جرأت مندانہ تصویریں بنائی ہیں۔

اس طویل عکسی نظم میں "فلم رائٹر" "اداکار" "موسیقار" سے لے کر ایک عام "لائٹ مین" تک کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ یہ تصویریں ویسی خوبصورت اور رنگین نہیں ہیں جیسی فلمی رسالوں میں شائع ہوتی ہیں یا اسکرین پر نظر آتی ہیں۔ ان تصویروں کو کیمرے سے نہیں بلکہ شاعر نے اپنی شخصیت کی باطنی نگاہوں سے محفوظ کیا ہے۔ اس میں نقاب کا دھوکا نہیں، نقاب کے پیچھے کی سچائی کے تاثرات ہیں۔ اس میں ہر چہرہ ٹوٹا اور بکھرا ہوا ہے۔ یہی ان کے اصلی چہرے ہیں۔ اس نظم میں ایک غیر متعلق تماشائی ایسی بے لاگی ہے۔ حالانکہ قیصر عثمانی اس پورے تماشا کے خود برسوں سے ایک کردار بنے ہوئے ہیں۔ وہ تماشا ہو کر بھی تماشائی نظر آتے ہیں۔ اور یہ، ان کے فن کی ایمانداری کا بھی ثبوت ہے۔ پیش لفظ کے روپ میں خط۔ انصاری کا مضمون غیر ضروری ہے اس میں صرف نقل اچھل کود ہے۔ نظم کا انداز بیان روایت سے عاری ہوتے ہوئے بھی موضوع کے مطابق ہی نظر آتا ہے۔ کہیں بار بار سنے گئے لفظوں کا استعمال کرب کی چبھن کے مسلسل اثر کو دھم کر دیتا ہے۔ یہ نظم موضوع کے اعتبار سے نئی ہے لیکن لہجہ میں میر اور انیس کے دور کے اتنا ہی قدیم ہے

کچھ قیصر عثمانی کے بارے میں

خلش جعفری (بمبئی)

کتاب سے اچھا کوئی تحفہ نہیں اور اگر صاحب کتاب یہ تحفہ بھیجے تو اس کی قدر و قیمت دو چند ہو جاتی ہے۔ قیصر عثمانی نے پچھلے مہینے سال نو کا تحفہ بھیجا ہے۔ اپنا مجموعہ کلام "حدیث دل"۔ قیصر عثمانی خوش اخلاق، خوش مزاج، خوش گفتار ہیں اور خوش کلام بھی۔ ان کے ڈھیر سارے اوصاف ہیں۔ گیا کے تقدس کا بھی کچھ ہاتھ ہوگا۔ لیکن بہت کچھ ان کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے جو انہوں نے والدین سے حاصل کی۔ یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ فلمی دنیا میں گلے گلے تک ڈوبے رہنے کے باوجود یہ انہیں نہیں بگاڑ سکی۔ اور قیصر عثمانی اپنی معرکتہ الآرا نظم "پرچھائیوں کا دیس" میں فلمی دنیا کے چہروں سے ایک کے بعد ایک کئی نقابیں نوچ پھینکتے ہیں اور اس کے مکروہ چہرے لوگوں کے سامنے عریاں کر دیتے ہیں۔ یہ نظم ان کی فنکارانہ دیانت داری کی نہایت روشن مثال ہے اور یہ اس اردو داں ہی سے نہیں جس نے یہ نظم پڑھی یا سنی ہے بلکہ ہر چھوٹے بڑے شاعر سے بھی داد تحسین حاصل کر چکی ہے۔ یہ ان چند موضوعاتی نظموں میں سے ہے جو شعری ادب میں اپنا منفرد مقام رکھتی ہیں۔ اور جو کبھی فنا کا منہ نہیں دیکھیں گی۔

قیصر عثمانی کو لکھنے پڑھنے کا شوق کم سنی نیز طالب علمی کے زمانے سے تھا۔ لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ انہیں مطالعے کا بھی بے حد شوق تھا۔ گیا اور پٹنہ کے اردو حلقوں میں ایک شاعر اور ادیب کی حیثیت سے قیصر عثمانی کی شہرت ہو گئی تھی۔

ابتدا میں قیصر عثمانی کو فلمی دنیا میں لکھنے کا نہیں پبلسٹی کا کام ملا۔ اور کلکتہ میں فضلی برادرس لمیٹیڈ کے ادارے سے وابستہ ہوئے پھر یہ ادارہ ۱۹۴۲ء میں بمبئی آگیا تو قیصر عثمانی بھی اس کے ساتھ یہاں آگئے اور اس کے بعد فلمی دنیا اور بمبئی دونوں نے نہ انہیں چھوڑا اور نہ ہی یہ ان دونوں کو چھوڑ سکے۔

قیصر عثمانی کہتے ہیں کہ انہوں نے محسوس کئے بغیر کبھی شعر نہیں کہا۔ محسوس کئے بغیر شعر کہنا دراصل شعر گھڑنے کے مترادف ہے۔ ردیف قافیے بٹھاتے جایئے اور اشعار موزوں کرتے جایئے۔ قیصر عثمانی کم کہتے ہیں اور "حدیث دل" ان کی کل متاع ہے۔ اس میں سے بھی طویل نظم "پرچھائیوں کا دیس" الگ کر دی جائے تو چند نظمیں اور غزلیں باقی رہ جاتی ہیں۔

قیصر عثمانی کی ایک ادا جو ادیبوں شاعروں اور [illegible] دوستوں کو لبھاتی اور بھاتی رہی ان کا ادارہ "ادبی سنگم" اور اس کی سرگرمیاں، بالخصوص اس کا سالانہ مشاعرہ تھا۔ یہ ایک طرح سے سالانہ ادبی اور شعری جشن ہوا کرتا تھا جس میں چھوٹے ... قریب و دور سے یوں کھنچے چلے آتے تھے جیسے

قیصر عثمانی نے کوئی مقناطیسی جال بچھا رکھا ہو ــــ!

قیصر عثمانی کی غزلیں اس بات کی غماز ہیں کہ وہ بڑے زود حِس ہیں۔ حالات و واقعات واردات و حادثات سے وہ جلد متاثر ہو جاتے ہیں ــــ ان کی کئی نظمیں احساس کی شدّت اور حدّت کا پتہ دیتی ہیں ــــ مثلاً "ایک لاش نگار خانے میں" "میرا وطن میرا گھر" "میں بھی احساس" کی شدّت موجود ـــ

قیصر عثمانی نے غزلیں بہت کم اور ناپ تول کر کہی ہیں اور ان کے بعض اشعار پر تو بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

دوستوں کی سرد مہری کے طفیل ؛ دشمنوں کے نام یاد آنے لگے

دوستوں سے قیصر عثمانی کو جو زخم پہنچے ہوں گے ان کا اندازہ اس شعر سے بھی لگایا جا سکتا ہے

چرکے وہ دوستوں نے دیئے ہیں کہ الاماں
اب راہ و رسم کی بھی مجھے آرزو نہیں

اور یہ شعر تو فنی صنعت کی بہتری معاشرے کی بھی بدلتی کیفیت کی عکاسی کرتا ہے

اللہ رے بدلے ہوئے حالات کا عالم
جو اپنا تھا کل آج وہ انجان لگے ہے

میں قیصر عثمانی کو "حدیث دل" کی اشاعت پر دلی مبارکباد دیتا ہوں۔

قیصر عثمانی کی غزلیہ شاعری میں تخلیقیت شناسی

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

قیصر عثمانی بنیادی طور پر نظم نگار ہیں۔ انہوں نے بعض بے حد
کامیاب نظمیں کہی ہیں۔ لیکن انہوں نے غزلوں کی طرف بھی توجہ کی ہے اور
شاعری کی بالکل نئی صنف آزاد غزل میں بھی طبع آزمائی کی ہے
نظم کے مقابلے میں قیصر عثمانی کا غزل سے سمجھوتہ خود اعتماد
کی دلیل ہے، کیونکہ سادے سادے سے اشعار میں خلوص کی جلوہ گری
ہے۔ اور گھلی ملی ہوئی شعریت ہے، سوشل کنسنٹ ہے۔ غم جاناں کی نا
ہے۔ معاشرتی، سیاسی، اور سماجی شعور کی ہم آہنگی ہے اور ان سارے
میں زندگی کا چلن ہے۔ علت اور معلول کے بدلتے ہوئے رنگ ہیں۔
قیصر عثمانی نے غزل کی اس روایتی تعریف کو غلط ثابت کر د
ہے کہ اس کے ذریعہ عورتوں سے باتیں کی جاتی ہیں۔ عورتوں کی باتیں
جاتی ہیں۔ اور عورتوں سے عشق بازی کے واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔ انہ
نے محمد شمس الدین قیس رازی کی اس دلچسپ تعریف کو بھی غلط ثابت
ہے کہ ہرن شکاری کتوں کے ہاتھوں بری طرح زخمی ہو کر مایوسی کے ع
میں جو صدائے دردناک بلند کرتا ہے اسے غزل کہا جاتا ہے۔
یوں تو اپنی غزلوں میں قیصر عثمانی نے عورتوں سے، عورتوں کی
عشق و محبت کی باتیں بھی کی ہیں مگر غزل کی زبان، اس کا طرز بیان ا
اس کا لہجہ ان کے پیش نظر رہا۔ مہذب، شائستہ، نرم، لطیف، حسی
ترقی یافتہ معاشرے میں عورتوں سے گفتگو کے وقت ملحوظ رکھا جا
انہوں نے تشبیہیں، استعارے، علامتیں یا کنائے، دنیائے حسن و عشق
حاصل کئے ہیں کہ بیان میں دلبری اور لطافت قائم نہ سکے۔ یہ حسن و عشق
مشاہدۂ حق سے گفتگو ہے۔ اور صدائے درد قیصر عثمانی کے یہاں معاشر

کے اتار چڑھاؤ کی وجہ سے ہے۔

غزل کے مزاج کا اہم ترین عنصر داخلیت ہے۔ قیصر عثمانی نے خارجی دنیا سے جو کچھ حاصل کیا ہے ان تاثرات، کیفیات اور جذبات کی آئینہ داری اپنی غزلوں میں کی ہے۔ ان کے یہاں نقوش بہت واضح اور نکھرے ہوئے ہیں۔ ان کے الفاظ خطوط کی طرح سیدھے ہیں۔ ان کی قوت اور گیرائی میں متانت ہے۔ عشق کی ناکامی، عشق کی عشوہ طرازی اور متاع عشق میں جمال محبوب کی کیفیت ملاحظہ کیجئے

رات بھر کب تک کوئی تارے گنے
اف محبت اور یہ ظالم انتظار

تیری یاد کے ساتھ آئے نہ آنسو
اگر مجھ کو تجھ سے محبت نہ ہوتی

تو نے مجھے بھلا دیا کچھ اس کا غم نہیں
اب تو بھی یاد آ نہ کبھی بے وفا مجھے

وصال یار میسر نہ ہو تو کیا غم ہے
خیال یار تو ہے جس کو دل ستاں کہئے

تصوف میں زلف پریشانی، الجھن اور انقباض پیدا کرتی ہے۔ تعینات کی علامت بن کر عبد کو معبود سے اور سالک کو محبوب سے دور رکھتی ہے۔ اسی طرح ادبی روایت میں بھی زلف الجھن کا باعث ہوتی ہے۔ تغزل میں دل اکثر زلفوں میں الجھے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ زلف، محبوب حقیقی کے چہرے پر تعینات کا پردہ ہے۔ اسی اعتبار سے پیچ در پیچ اور شکن در شکن ہے کہ تعینات بے حصر و بے حساب ہیں اور زلف سے روز و شب کا ظہور ہوتا ہے۔ لیکن قیصر عثمانی نے زلف کو نئی [illegible]

[illegible]

[illegible]

خوشبو اور مہلک قانون اتلاف افکار کے ماتحت یہ طاقت ہوتی ہے کہ اس کے ذکر سے سوئی ہوئی ک[illegible] جاگ اٹھتی ہیں۔ اس میں خیال کا وسیع سلسلہ ہو[illegible] ہے۔ قیصر عثمانی نے خوشبو کو گیسو، زلف اور کا[illegible] سے، یا محبوب کے بدن کی خوشبو سے یا رموز سے آ[illegible] تعلق سے الگ، ایک نیا روپ عطا کیا ہے ؎

خوشبو نہ جن کی پھیلے فضاؤں میں چار سو
گلشن میں ایسے پھولوں کی کچھ آبرو نہیں

قیصر عثمانی کی غزلوں میں یوں تو اردو کی روایتی غز[illegible] ملتا ہے لیکن انہوں نے اپنی طبیعت اور مزاج کے مر[illegible] رنگوں میں سے کچھ کو خارج کیا اور کچھ کو شامل کیا ہے [illegible] لفظوں میں ہم اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ قیصر عثمانی [illegible] میں اہم تجربات نہ کرنے کے باوجود تغزل کا ایک معیار [illegible] ہے۔ اپنا ایک خاص لہجہ اپنایا ہے جس میں رکھ[illegible] بے ساختہ پن ہے، صداقت ہے، تلخی ہے، حیات و[illegible] کے متعلق بنیادی حقائق ہیں۔ اور صورت حال کا ر[illegible] عنصر ہے۔ انہوں نے حیات اور اہل حیات یعنی آ[illegible] جنس سے سروکار رکھا ہے اور محبتوں اور نفرتوں [illegible] منفی خصوصیتوں کے نقوش اُجاگر کئے ہیں ؎

دوستوں کی سرد مہری کے طفیل
دشمنوں کے نام یاد آنے لگے

مجھ پہ کیا جادو چلے گا ایسے زاہد
جس کی نظریں سوئے خوباں اور [illegible]

جب سے نظام میکدہ بدلا ہے دوستو
وہ مے نہیں، وہ جام نہیں، وہ سبو نہیں

[illegible] معاشرہ کے شدید [illegible]

[illegible]

زپذیری دیکھئے ؎

ہے جہانِ رنگ و بو میں خونِ انساں رائیگاں
لے رہا ہے دینے والا قطرہ قطرہ اپنا سود
اے تمدن کیا کہیں ہم تیری اس تنظیم کو
جس سے بکھرے ہیں جہاں میں زندگی کے تار و پود

ا(ک) روشنی میں ماضی کا انسان مر چکا ہے۔ مکر و ریا اور منافقت
...لذر کر آج کا آدمی خون خرابے میں ایمان رکھتا ہے یہی
...ہے کہ ہمارے عہد میں اور مادی دنیا میں غلط اقدار کے
...ش نظر جینا، جینا نہیں رہا ہے۔ اجناس سے زیادہ سستی
...سانی زندگی ہے۔ قیصر عثمانی نے ایک غزل کے قطع میں ... آخر
...ندگی سچائی کو جس فنکارانہ سے پیش کیا ہے اس کی
...ال کم ملتی ہے ؎

قیصر ہر اک طرف ہے گرانی کا تذکرہ
لیکن ذرا بتائیے سستا لہو نہیں

...آدمی حالات سے سمجھوتہ کرتا ہے لیکن اندر سے سسکتا
...، ٹوٹتا ہے، روتا ہے اور وقت کے انتشار کے ساتھ
...رتا ہے ؎

احوال کیا سنائیں ہم اس کی بے کسی کا
مر مر کے جو جیا ہو، جی جی کے جو مرا ہو

...عثمانی نقل کرنے پر اس لئے مجبور ہیں کیونکہ ؎

سورج، ستارے، چاند سبھی جلوہ ریز ہیں
پھر بھی زمیں کو جیسے اندھیرا نگل گیا

یہ زمانہ بھی کیا قیامت ہے
ہر طرف اک ہراس ہے اے دوست

...انسانی زندگی کا یہ رنگ، یہ آہنگ اور یہ شکل ہے کہ
...ی کا لیس منظر گم ہو چکا ہے اور انسانیت کہیں خلاؤں
...محو پرواز ہے۔ قیصر عثمانی کا طنز ملاحظہ کیجئے ؎

ہے کون سا وصف اب جو ہے انسان میں باقی
انساں تو فقط نام کا انسان لگے ہے

لیکن ایسے ماحول میں بھی قیصر عثمانی بالاقساط یا کلی خودکشی کے شکار نہیں ہوتے بلکہ تلخیوں اور ناگواریوں کے بیچ دعاؤں کے طلب گار ہوتے ہیں ؎

کب سے ہوں زندگی کے صحرا میں
چھاؤں اب تو ملے گھنی کوئی

قیصر عثمانی کی یہ تنہائی مادی اور جسمانی کے ساتھ ساتھ ذہنی اور نفسیاتی بھی ہے۔ کیونکہ یہ کرشمہ سازی، داخلی اور خارجی عوامل اور ماحول کی کارفرمائی کے سبب وجود میں آتی ہے ؎

ویرانۂ حیات میں وہ تیرا میرا ساتھ
صحرا میں جیسے پھول کھلا اور جل گیا

تنہا نہ ہونے کے باوجود قیصر عثمانی کبھی کبھی اپنے آپ کو اپنے شہر میں اور اپنے فلیٹ میں اور بدیس میں بھی اجنبی سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ ذہنی اور نفسیاتی کیفیت ہے۔ شاید اس لئے کہ دنیائے خارج کی گوناگوں دلفریبیاں اور ماحول کی تمام جاذبیتیں ان کے آئینۂ دل میں لذتِ زندگی بخشنے کی بجائے خراشِ دل کی نمک پاشی کرتی ہیں اور رگِ خیال میں نشتر گھنگولتی ہیں ؎

قیصر وہ شہر کیا ہے جو راس ہی نہ آئے
لندن ہو، بمبئی ہو، پیرس ہو یا گیا ہو

لیکن قیصر عثمانی شاعر ہیں، فنکار ہیں۔ ان کے آئینۂ دل میں حقیقت کی پری جب رعنائی اور دلفریبی کے ساتھ انگڑائی لیتی ہے تو وطن کی اور نوجوانی کی بات انہیں بمبئی جیسے بڑے شہر سے گیا جیسے چھوٹے لیکن مقدس شہر میں واپس چلنے پر مجبور کرتی ہے۔ اور وہ تڑپ کر رہ جاتے ہیں۔ تخلیقیت شناسی کی مثال دیکھئے ؎

قیصر ہے دلفریب بہت شہر بمبئی

آتا ہے یاد پھر بھی دیارِ گیا مجھے
قیصر یہ سچ ہے شہرِ نگاراں سے بھی
کہتا ہے پھر بھی میرا دلِ زار چل گیا

شعور و تعقل کے دائرہ کو وسیع کرتے ہوئے اکثر قیصر عثمانی فکر کی پرواز کو حدودِ مکان سے بے نیاز کر دیتے ہیں اور بعض اوقات حقیقت کا کلی ادراک حاصل کرتے ہوئے یوں فلسفیانہ جواز پیش کرتے ہیں ؎

دل میں جو سوز ہو تو کرشمہ ہوا کرے
جو کام کوئی کر نہ سکے وہ دعا کرے
مجھ پر بھی ڈال دے کوئی ازراہِ التفات
وہ اک نظر جو خاک کو بھی کیمیا کرے

اور کبھی کبھی وہ ایسی منزل میں پہنچ جاتے ہیں جسے تصوف کی زبان میں ردیفِ صداقت کی تلاش کہہ سکتے ہیں ؎

میں اس مقام پہ ہوں جس کو لامکاں کہئے
زمیں نہ کہئے اسے اور نہ آسماں کہئے

انسان کی جبلتوں، حواس اور ملکات کے ساتھ مل کر نئی مرکب شکل اختیار کرنے کا ہنر قیصر عثمانی کی غزلوں میں انفرادیت کے ساتھ ملتا ہے اور اسی میں ان کی تخلیقی آگہی پوشیدہ ہوتی ہے ؎

اخلاق کی بدلتی قدریں ہیں نیا بھروسہ
جو آج آشنا ہے، وہ کل بھی آشنا ہو

یا پھر یہ شعر ؎

جس گھر سے گولے آگ کے پھینکے گئے تھے کل
سنتے ہیں آج لوگوں سے وہ گھر بھی جل گیا

قیصر عثمانی کی تخلیقیت شناسی ان کی آزاد غزلوں میں بھی ملتی ہے ایک آزاد غزل کے یہ چند اشعار دیکھئے۔ مطلع ہے ؎

ہر لمحے کی اکھڑی اکھڑی سانسوں کا یہ کہنا ہے

وقت بڑا نازک آیا ہے

آج زندگی اتنی الجھی بکھری ہوئی ہے اور وقت اتنا نازک ہے کہ ہر کوئی صلیب اپنے کاندھوں پر اٹھائے نظر آتا ہے کشمکش جد و جہد اور آفات و مصائب کو برداشت کرنے کے باوجود نالہ و شیون اور آہ و بکا کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے ؎

کیسی چلیں ہیں ہوا ہر جانب شہر کے چپے چپے میں
نالہ و شیون آہ و بکا ہے

جس ملک میں روزانہ نئے سے نئے اسلحے اور ہتھیار بنائے جا... اور میدانِ جنگ کی بجائے شہر اور قصبے میں انسانی کشت و... لئے تجربہ کیا جاتا ہو وہاں سے آہ و بکا کی ہی آوازیں سنائی دیں گی۔ آج پوری دنیا جدید تکنالوجی کی وجہ سے نشانے پر ہے تباہی و غارتگری کا پنجہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جار... کیمیاوی اسلحوں کی بنا پر نیست و نابود ہو جانے کا عمل... کے وقفے میں سمٹ گیا ہے۔ ایسی نازک صورت حال پیش نظر قیصر عثمانی جیسا حساس شاعر لوگوں کے اح... کو جگانے کا کام کرتا ہے اور یہ بڑی بات ہے ؎

گھر تو جلے ہی تھے لیکن انسان بھی زندہ جل کے
جیون گویا ایک چِتا ہے
لمحہ لمحہ ایک قیامت نفسی نفسی کا عالم
یہ دنیا بھی کیا دنیا ہے

عزتِ نفس کو برقرار رکھنے کے لئے اور اعتبارِ ذات کو نمایاں لئے آج کے "محبوب صفت" لوگوں پر یہ طنز قیصر عثمانی کی شاعری کا نمایاں وصف ہے ؎

نوکِ قلم سے نوکِ سناں کا کام چلے ہشیاری
اس قاتل کا کیا کہنا ہے

انسانی مجموعہ اضداد ہے لیکن عصرِ جدید کا آدمی ... LYPTIC - اور VISIONARY کے رجحان کے زیـ

اور طوفان تھم گیا

ایک تنقیدی جائزہ

سید احمد قادری

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ اردو ادب میں ناول بس اتنے لکھے گئے، جن کا شمار انگلیوں پر کیا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر دورِ جدید میں اردو ناول (ادبی) شاذونادر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس کی وجہ عام طور سے یہ بتائی جاتی ہے کہ عصرِ حاضر کی دوڑتی بھاگتی اور مشینی زندگی ایسی ہو گئی ہے کہ ناول کا قاری نہیں ملتا۔ پھر ناول نگار کو بھی اتنی فرصت نہیں، حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ آج بھی گلشن نندہ اور اس کے قبیل کے ناول نگاروں کے ناول سینکڑوں میں نہیں، ہزاروں میں نہیں، لاکھوں میں چھپتے اور فروخت ہوتے ہیں۔ اور ایسے سارے ناول سرکاری یا نیم سرکاری لائبریریوں کی الماریوں کے زینت نہیں بنتے، بلکہ لوگ انھیں خریدتے ہیں اور پڑھتے بھی ہیں۔ میری اس بات سے بہ آسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ادبی لوگ اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا محاسبہ نہیں کرتے ہیں، بلکہ طرح طرح کی تاویلیں دے کر پردہ ڈالنے کی سعی لاحاصل کرتے ہیں۔ عالم یہ ہے کہ اردو ناولٹ بھی، جس کا کینوس افسانہ سے بڑا اور ناول سے چھوٹا ہوتا ہے۔ اتنی تعداد میں منظرِ عام پر نہ آسکے، جتنی تعداد میں گلشن نندہ، نسیم انہونوی، مظہر الحق علوی، عفت موہانی، اے، آر خاتون، عطیہ پروین، مسعود جہاں، رضیہ بٹ اور مینا ناز وغیرہ کے ناول آئے۔

اردو ادب میں ناولٹ کی تعداد تو ناولوں کے مقابلے میں اور بھی کم ہے۔ لے دے کر بس "لندن کی ایک رات" "ایک چادر میلی سی" "مہر اور خون" اور "بے جڑ کے پودے" وغیرہ ہی ایسے ناولٹ ہیں، جن کا ادبی طور پر ذکر ملتا ہے۔

ناولٹ جو دراصل ناول اور مختصر افسانہ کے درمیان کی ایک کڑی ہے۔ اس میں ناول کی طرح پلاٹ، کردار، پس منظر، مقصدِ حیات اور طرزِ بیان

وغیرہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ وسعت اور پھیلاؤ نہیں ہوتا جو کسی اچھے ناول کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس میں مختصر افسانہ کی جو تنگ دامانی ہوتی ہے وہ نہیں ہوتی۔ اس لئے ناولٹ نگار، ناولٹ تصنیف کرتے وقت پل صراط پر سے گزرتا ہے اور بہت کم ایسے ناولٹ نگار ہیں جو اس پل صراط پر سے صحیح سالم گذر جاتے ہیں اور ادب کو معیاری ناولٹ دیتے ہیں۔

اس تناظر میں قیصر عثمانی کا تصنیف کردہ ناولٹ "اور طوفان تھم گیا" دیکھا جائے تو یقینی طور پر ناولٹ کی تمام جملہ خصوصیات اس ناولٹ میں دیکھنے کو ملے گی۔ اور بلا شک و شبہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ قیصر عثمانی نے ایک اچھا ناولٹ اردو ادب کو دیا ہے، حالانکہ مذکورہ ناولٹ کا ذکر تذکروں میں نہیں ملتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ عشق و محبت اور جنس اور رومان نے ناولٹ نگار کے اصل موضوع کو ابھرنے نہیں دیا۔

زیر نظر ناولٹ کے تین SITUATION دیکھئے، یہ تینوں SITUATION تین بات پیش کرتے ہیں۔

(۱) "نہیں منوہر نہیں" کامنی نے منوہر کے دونوں ہاتھوں کو پوری شدت سے جھٹک کر کہا اور اپنے ریشمی اسکرٹ کو جسم کے برہنہ حصہ پر تیزی سے پھیلا کر اس کے دونوں کناروں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"جیسی تمہاری مرضی" منوہر نے یکایک دل شکستہ ہو کر کہا اور پھر وہ سمندر کی ان اچھلتی کودتی موجوں کو دیکھنے لگا جو پورے زور و شور کے ساتھ ساحل کی طرف بڑھتی تھیں اور پھر اپنا سا منہ لے کر لوٹ جاتی تھیں۔"

صفحہ ۹

(۲) "واقعی کامنی ہم کب تک جھاڑیوں، پارکوں اور سنیماؤں میں چھپ چھپ کر ملتے رہیں گے۔ کب تک یہ دوری، یہ فاصلہ، اب برداشت نہیں ہوتا۔ زندگی کے بہترین ساعتیں یوں ہی نہیں گزر رہی جا رہی ہیں اور ہم کچھ کر نہیں پا رہے۔"

(صفحہ

(۳) "کامنی اب کیا ہوگا؟ میرے تو سارے روپے ٹیکسی والے کی نذر ہو گئے۔ اب جھونپڑا لینے کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔" منوہر نے مایوسی کے لہجے میں کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ آخر یہ جنگل اور پہاڑ کس کام آئیں گے؟" کامنی نے منوہر کو اطمینان دلایا اور وہ اسے گھسیٹتی ہوئی چڑھائی پر چڑھنے لگی۔ منوہر مزاحمت کر رہا تھا، لیکن کامنی کی گرفت مضبوط تھی۔

(صفحہ

پہلے اقتباس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہیروئن کامنی، ہیرو منوہر کے بہلاوے میں نہیں آتی اور اپنے محبوب کو سمجھا کر اپنی عصمت اور عزت محفوظ رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔

لیکن ہیرو کی روز روز کی گذارش، جذباتی رونے روٹھنے کی ادا پر کامنی سپر ڈال دیتی ہے اور اپنے من کے ساتھ ساتھ اپنا تن بھی اپنے محبوب کے حوالے کر دیتی ہے اور جوانی کی راہ میں بھٹکنے لگتی ہے۔ اسی حد تک کہ ہیرو کے انکار پر بھی اس کی گرفت ہیرو پر مضبوط رہتی ہے۔ آہستہ آہستہ کامنی اس راہ پر چلنے لگ

(بقیہ صفحہ

ایک خود فراموش مسافر کا عمل نامہ

عبداللہ کمال

آپ اپنے کو بھلانا کوئی آسان نہیں
بڑی مشکل سے میاں بے خبری آتی ہے

میں ان دنوں دلی میں تھا اور انجمن ترقی اردو کے ہفت روزہ "ہماری زبان" کی ادارت کے فرائض انجام دے رہا تھا۔
۲۲ نومبر ۱۹۷۸ء کی ڈاک میں میرے نام ایک خط تھا جس کا اقتباس یوں ہے۔

"میں آپ کی نگارشات سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ خصوصاً "اردو مستقبل کے آئینہ میں" پڑھ کر جی بہت خوش ہوا۔ جس کے لئے آج دیر سے سہی، مبارکباد قبول کیجئے۔ میں نے بمبئی میں جب کئی لوگوں سے آپ کا ذکر کیا تو کسی نے مجھے بتایا کہ آپ بھی پہلے بمبئی میں رہتے تھے۔ افسوس کہ آپ سے کبھی میری ملاقات نہیں ہو سکی۔
میں ایک بات کا خاص طور پر شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے "ہماری زبان" کے کسی گذشتہ شمارے میں صفحۂ اول پر "فلم اور اردو" کے سلسلے میں ایک مضمون لکھا تھا جس میں مجھے بھی یاد کیا تھا۔ انشاء اللہ کسی موقع پر دلی آؤں گا تو آپ سے ملنے کی کوشش کروں گا۔"

یہ خط "ادبی سنگم" کے خوبصورت لیٹر ہیڈ پر لکھا گیا تھا اور خط لکھنے والے کا نام تھا قیصر عثمانی" جن سے میں ۱۹۷۰ء کے دوران دو مرتبہ ان کے دفتر گوکل سنے کارپوریشن میں مل چکا تھا۔ ایک ملاقات تفصیلی تھی۔ دراصل

ان دنوں میں عورتوں کے ایک ماہنامہ "بنت حوا" کا ایڈیٹر تھا اور قیصر عثمانی "پرچھائیوں کا دیس" جیسی معرکۃ آرا نظم کے شاعر — میں "پرچھائیوں کا دیس" کی تلخیص "بنت حوا" میں شائع کرنا چاہتا تھا اور قیصر عثمانی اس کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ یہاں پر یہ واقعہ نقل کرنے سے میری مراد یہ ہے کہ یہ ملاقاتیں ایسی نہ تھیں کہ بھلا دی جاتیں — میرا مضمون تھا ہی اس نوعیت کا کہ اس پر ہندوستان کے گوشے گوشے سے خط آ رہے تھے لیکن قیصر صاحب کے خط نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ لہٰذا میں نے اس کا جواب انہیں ذاتی طور پر لکھا، ان کی ملاقاتوں کے حوالے کے ساتھ

یہ قیصر عثمانی صاحب کی زندگی کا ایک رخ تھا جسے بظاہر کمزور یادداشت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ لیکن میں اسے "معصوم گمشدگی" کہتا ہوں۔ یہ وہ گمشدگی ہے جو بالعموم تخلیقی فنکاروں کے حصے میں آتی ہے۔ چاہے وہ ادیب ہوں۔ شاعر ہوں یا مصور ہوں — قیصر عثمانی ہوں، جاں نثار اختر ہوں یا خدائے مصوری مائکل اینجلو — مائکل اینجلو نے حضرت موسیٰؑ کا سنگی مجسمہ تراش لیا اور آخری نظر ڈالنے کے لئے تھوڑے فاصلے سے اس کا جائزہ لینا شروع کیا۔ پتہ نہیں اس کے جی میں کیا آیا کہ اچانک اپنے پاؤں سے جوتا اتار کر بے تحاشہ مجسمہ پر برسانے لگا۔ اتفاقاً پوپ بھی اسی وقت وہاں پہنچ گیا اور مائکل اینجلو کے جنون میں اٹھے ہوئے ہاتھ کو پکڑ کر شدید حیرت و استعجاب کے ساتھ پوچھا۔ "یہ کیا کر رہے ہو" مائکل اینجلو نے وحشت میں ڈوبی ہوئی کھوئی کھوئی آواز میں کہا — "میں اسے مار رہا ہوں کہ یہ بول پڑے"

مکاں کی قید تھی اور لامکاں وہ تھا
شریک بزم تھا لیکن کہاں وہ تھا

آئینہ اس کے سامنے محض مظہر یا عکس ہی نہیں عکس ایک ٹرانسپرنٹ میڈیا بن جاتا ہے اور وہ عکس در عکس، تہ در تہ اپنے اندر اترتا چلا جاتا ہے۔ اور خود کو آئینے کے سامنے نہیں اس کے اس پار پاتا۔ یہی ایک تخلیقی فن کار کی "معصوم گمشدگی" ہے جو اسے سطح سے بلند کرتی ہے۔ وہ اپنی ذات کی کائنات رہتا ہے۔

دُور تک کوئی لہکتا ہوا بن ہے مجھ میں
دیکھئے کب مری وحشت مجھے گھر جانے دے

زندگی کے اس منظرنامے میں قیصر عثمانی صاحب کی حیثیت اس دروں بیں مسافر کی سی ہے جو اپنی ذات کے تو کائنات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن جب یہ عام سطح پر ہمارے سامنے آتی ہے تو ہم یہ کہتے ہیں کہ ق کی یادداشت کمزور ہے۔ لیکن اگر ہم اس پر سنجیدگی کریں تو ایک بے حد نازک پیچیدہ مگر دلچسپ نفسیا سامنے آتا ہے۔ دراصل یہ عقلی نفسیات کا کیس ہے۔ ایڈلر کہ شعور اور لاشعور کی آنکھ مچولی سے بھی اکثر قسم کی دانشورانہ گم شدگی جنم لیتی ہے۔ تخلیقی ذہن میں ڈوبتا ابھرتا رہتا ہے اور بعض اوقات تہ میں یاد کوئی در نایاب بھی مل جاتا ہے۔ قیصر صاحب کی یادداشت غالباً اسی نفسیاتی مدوجزر سے دوچار ہے۔

نمونہ مشتے از خروارے کے طور پر قیصر عثمانی صاحب کا ایک واقعہ پیش ہے۔

سنہ ۱۹۶۷ء میں فلمی دنیا کے مایہ ناز ہدایت کار دلیپ ندر گوئل جواب اس دنیا میں نہیں۔ پہلی مرتبہ اپنی فلم "لاکھ" کی آؤٹ ڈور شوٹنگ کے سلسلے میں کشمیر پہنچے تھے اور فلم کی ہیروئن ببیتا اور ہیرو سنجے کے سا

پیلس" ہوٹل میں مقیم تھے۔ ایک دن اسی ہوٹل کے حسین و شاداب میدان میں شوٹنگ ہو رہی تھی کہ گوئل صاحب نے قیصر صاحب سے کہا۔ "یہ سین لیجئے اور ببیتا کو اچھی طرح سمجھا دیجئے۔" قیصر صاحب سین لے کر فوراً چل پڑے اور جب اوپر کی منزل پر ہوٹل کا ایک لمبا چوڑا کاریڈور طے کر کے ببیتا کے کمرے کے سامنے پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ دروازہ کھلا ہے اور اسی کے قریب ببیتا سنگھار دان کے سامنے کرسی پر بیٹھی اپنے بال سنوار رہی ہے۔ صاحب سلامت کے بعد قیصر صاحب نے وقت ضائع کئے بغیر سین سنانا شروع کر دیا اور کہا کہ مکالمہ اچھی طرح یاد کر لیجئے، گوئل صاحب، کچھ ہی دیر بعد آپ کو شاٹ کے لئے لوکیشن پر بلانے والے ہیں —— لیکن ببیتا، قیصر صاحب کی بات پر بالکل دھیان نہیں دے رہی تھی اور مسکراتی ہوئی صرف اپنے بال سنوارے جا رہی تھی۔ قیصر صاحب نے جب دیکھا کہ وہ سین سننے میں قطعی دلچسپی نہیں لے رہی ہے تو انہوں نے قدرے جھلا کر کہا۔

"آخر آپ میری بات پر دھیان کیوں نہیں دے رہی ہیں؟ گوئل صاحب ابھی آپ ہی کا شاٹ لینے والے ہیں۔ آپ کو اس کے لئے پہلے سے تیار ہو جانا چاہئے۔"

اور نئے سرے سے بڑے انہماک کے ساتھ سین سنانا شروع کر دیا۔ اسی اثنا میں کمرے کے ایک دوسرے گوشے سے آواز آئی۔

"قیصر صاحب آپ کا بھی جواب نہیں۔ میں یہاں بیٹھی ہوں اور آپ سین میری بہن کو سنا رہے ہیں۔"

قیصر صاحب کو اس وقت معلوم ہوا کہ وہ اتنی دیر سے غلط نمبر گھمانے میں مصروف تھے۔

میں جب "ہماری زبان" کی ملازمت سے مستعفی ہو کر دوبارہ بمبئی آیا تو اتفاق کہئے یا قیصر صاحب کی کوشش کہ کچھ دنوں بعد ملاڈ ہی میں رہائش کے لئے مجبور ہونا پڑا۔

جی ہاں! ابتدا میں یہ مجبوری ہی معلوم ہوئی تھی کہ میرے احباب زیادہ تر بمبئی میں تھے اور میں ہمیشہ اس موقع کی تاک میں رہتا تھا کہ کب کوئی صورت نکلے اور میں بمبئی بھاگوں۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ مجبوری ایک خوشگوار مسرت میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ اس کے ذمہ دار بڑی حد تک دو حضرات تھے۔ ایک تھے جناب عزیز الدین صدیقی صاحب جن سے مجھے دوستی کا بے پایاں خلوص ملا۔ اور دوسرے تھے قیصر صاحب جن سے یگانگت اور "بزرگانہ" شفقت ملی۔ معاف کیجئے گا۔ یہاں پر لفظ "بزرگانہ" واوین میں ہے۔ اور بہ طور لفظ معترضہ استعمال ہوا ہے۔ ورنہ قیصر صاحب کی ابھی عمر ہی کیا ہے؟ یہ اور بات ہے کہ ان کی تاریخ پیدائش ۲۰ دسمبر ۱۹۱۹ء ہے لیکن یہ بات بھی جھٹلائی نہیں جا سکتی کہ گزشتہ سال بھی انہوں نے اپنی ۷۳ ویں سال گرہ منائی ہے۔

قیصر صاحب کا آبائی وطن ہندوستان کا وہ مردم خیز خطہ ہے جسے بہار کہتے ہیں۔ اور جس نے ہر دور میں اور ہر میدان میں اپنی امتیازی حیثیت تسلیم کروائی ہے۔ دینی معاملات ہوں یا سیاسی، علمی ہو یا ادبی، بہار کی شناخت ہمیشہ روشن اور واضح رہی ہے۔ مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی سے لے کر مولانا سید سلیمان ندوی تک —— سیاسی میدان میں ڈاکٹر راجندر پرشاد سے لے کر جے پرکاش نرائن تک —— شاعری میں بیدل، راسخ، شاد، یاس، یگانہ چنگیزی سے علامہ جمیل مظہری تک —— اور تنقید و تحقیق میں قاضی عبدالودود سید حسن عسکری اور کلیم الدین احمد روشن ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قیصر صاحب کا تعلق اسی بہار کے ایک تاریخی علاقہ کے زمیندار گھرانے سے ہے جہاں علم و ادب اور شعر و شاعری کو دوسرے

کاموں پر فوقیت حاصل تھی۔ شعر بولے جاتے تھے، شعر گائے جاتے تھے، روٹی ابھی مسئلہ نہیں بنی تھی۔ قیصر صاحب کے والد ماجد حضرت سید شاہ عبدالعزیز آزاد پیر بیگھوی اپنے وقت کے قابل ذکر شاعروں میں شمار کئے جاتے تھے۔ پروفیسر اختر قادری نے ان کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

"حضرت آزاد قدیم شرفاء کی تہذیب اور رکھ رکھاؤ کے جیتے جاگتے نمونہ تھے۔ علم و ادب، شعر و سخن ان کا مشغلہ تھا۔ فن اور قواعد کی پامالی انہیں برداشت نہ تھی۔ گہری ناقدانہ نگاہ رکھتے تھے۔ یہ جذبۂ نقد ان کے مزاج میں اس طرح رچ بس گیا تھا کہ بات چیت، وضع قطع نشست و برخاست شعر و ادب کسی معاملے میں بے راہ روی پر وہ چپ نہ رہ سکتے تھے اور "نکتہ چیں" ایک طرح سے ان کا "عرف عام" ہو گیا تھا۔"

قیصر صاحب اس زمانہ میں عبدالحئی ہوا کرتے تھے۔ گیارہ بارہ سال کی عمر میں انہوں نے اپنی ادبی شناخت کرائی اور ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۶ء تک یعنی اسکول کے زمانہ تک، "بچوں کی دنیا" الہ آباد میں لکھتے رہے۔

قیصر صاحب نے ۱۹۳۹ء تک پٹنہ کالج اور پھر بی۔ این کالج میں انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کی۔ اس زمانہ میں ان کی تحریریں متحدہ ہندوستان کے بڑے بڑے رسائل پر کمندیں ڈالنے لگیں۔ ان میں سے "ادب لطیف"، "شاہکار"، "رومان" اور "خیام" کے علاوہ گیا کے "ندیم" اور "سہیل" کے نام اہم ہیں۔ آخرالذکر رسالہ "سہیل" سے قیصر صاحب دو سال ۱۹۴۰-۴۱ء تک بحیثیت ایڈیٹر بھی وابستہ رہے۔ ۱۹۴۲ء سے ان کی قلمی زندگی شروع ہوئی جب فضلی برادران لمیٹیڈ کلکتہ میں ان کا تقرر پبلسٹی آفیسر کی حیثیت سے ہوا۔ اسی سال فضلی برادران کا دفتر کلکتہ سے بمبئی منتقل ہوا۔ قیصر صاحب کو بھی مشرق سے مغرب کی طرف ہجرت کرنی پڑی اور اب بمبئی کو ان کے وطن ثانی کی حیثیت حاصل ہے۔ فلم کے مختلف شعبوں سے اپنی صلاحیتوں کا خراج وصول کیا۔ پبلسٹ بھی رہے، اسسٹنٹ ڈائرکٹر بھی رہے اور کنٹرولر بھی۔ ۱۹۵۹ء سے گوکل سنے کارپوریشن سے بحیثیت پبلسٹ اور سکریٹری وابستہ ہیں۔

قیصر صاحب بنیادی طور پر ایک ادبی آدمی ہیں۔ شاعری اور افسانہ نگاری ان کے ذاتی دلچسپی اور ذوق کی چیزیں ہیں اور اسی میڈیم سے دراصل ان کی داخلی اور انفرادی شخصیت کی شناخت بھی قائم ہوتی ہے جہاں سے ان کی خارجی زندگی شروع ہوتی ہے۔ وہاں سے پیشے کی سطح پر ان کا رشتہ فلم سے ہے، ان کی یہ شخصیت بھی اتنی مکمل، روادار اور دو ٹوک ہے کہ اگر غالب کے زمانے میں بھی ہوتے تو کسی دربار سے وابستہ ہو کر مدح و قصائد لکھنے کی بجائے سچائی کے ساتھ زندگی گزارتے نظر آتے۔ یعنی محنت، ایمانداری اور سچائی گوشہ کی مصاحبت میں اترانے پر ترجیح دیتے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنی اس طویل فلمی زندگی میں بھی قیصر صاحب "فلمی آدمی" نہیں بن سکے۔ "مسکہ بازی" اور "ہنڈل بازی" کے فن سے آگاہ نہ ہوسکے۔ ورنہ اس وقت شہر میں ان کی بھی دو چار بلند بانگ عمارتیں ہوتیں۔ لیکن جہاں خلوص، محنت، ایمانداری، سچائی اور صاف گوئی ہوتی ہے۔ بلڈنگوں اور کاروں کی جگہ "پرچھائیوں کا دیس" جیسی نظم جنم لیتی ہے جہاں دکھاوا نہیں ہوتا صرف سچ ہوتا ہے۔ کڑوا اور کھردرا سچ۔ اندر کا آدمی باہر کے آدمی سے کسی بھی قیمت پر سمجھوتہ

کرتا، اور نظم "پرچھائیوں کا دیس" بمبئی کی فلمی دنیا کا ایک خوب صورت استعارہ بن جاتی ہے۔

اور حد تو یہ ہے کہ سال میں ایک بار "ادبی سنگم" کا جو سالانہ مشاعرہ ہوتا ہے اس لئے انہیں ایک ایک شخص سے دروازے دروازے جاکر اور کبھی سڑکوں پر ہی چندے کے لئے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے۔ پچھلے دنوں اپنی ان پریشانیوں سے خوش ہوکر کہنے لگے۔ "کیا بتاؤں کمال ایسے ہی موقع پر بینک بیلنس بھی نِل ہوتا ہے ورنہ میں تو ایک چیک میں سارا انتظام کر ڈالوں۔" اور مجھے ان جملوں میں بھی ان کی "معصوم گفتگی" کا عکس نظر آیا۔ اسی طرح دلی میں ایک صاحب تھے۔ استاد رسا دہلوی (اب مرحوم ہیں) اپنے استاد بیخود دہلوی کی یاد میں ہر سال بڑے پیمانے پر ایک مشاعرہ بجھوایا کیا کرتے تھے یہ اپنے وضع قطع کے ایک یادگار زمانہ قسم کے بزرگ تھے۔ پرانی دلی کے خوش ذوق امراء و رؤسا انہیں چندہ بھی دیتے تھے اور تبرک میں گالیاں بھی کھاتے تھے۔ قیصر صاحب "نئی وضع" کے "پرانے لوگ" ہیں۔ اردو کی یاد میں مشاعرہ کرتے ہیں۔ یہ بہت بڑی بات ہے کہ لوگ انہیں چندہ تو کم از کم دے ہی دیتے ہیں۔

اردو کا کوئی بھی معاملہ ہو ___ قیصر صاحب ہمیشہ مخالف ہواؤں کے خلاف رہے۔ چاہے اس کی تحریک کسی راہی معصوم رضا کی طرف سے چلائی گئی ہو یا دھرم ویر بھارتی کی طرف سے۔ چاہے اس کا استحصال فلم میں کیا جا رہا ہو یا سیاسی پلیٹ فارم پر۔ قیصر صاحب نے اس پر شدید یا شعلہ بار احتجاج ضرور کیا۔ میں یہاں پر وہ احتجاجی مضامین اور مراسلے (اردو و انگریزی) نہیں پیش کروں گا لیکن اس سلسلے میں قیصر صاحب کا جو ذہنی رویہ ہے اسے سمجھنے کے لئے ان کے ایک اور خط کا اقتباس ضرور پیش کرنا چاہوں گا جسے انہوں نے

میرے اس مضمون کے ردعمل میں "ہماری زبان" کے ۱۵ر اگست ۱۹۷۸ء کے شمارے میں شائع کروایا تھا۔

"موجودہ شمارے میں جناب عبداللہ کمال کے مضمون "اردو مستقبل کے آئینہ میں" کچھ اونچے قد کے ادیبوں اور شاعروں کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ ہے جو اپنے شیش محل میں بیٹھ کر اردو کی زبوں حالی کا تماشہ دیکھ رہے ہیں لیکن ہمیں ان لوگوں کی وجہ سے بد دل اور مایوس ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ہمارا یہ ایمان ہے کہ جب تک ہندوستان میں اس گنگا جمنی زبان پر مر مٹنے والے کرشن چندر پیدا ہوتے رہیں گے اردو کا شباب کبھی ختم نہیں ہوگا۔ اردو کو مٹانے کی ہر کوشش ناکام ہوتی رہے گی۔ اور ایک دن ہماری یہ خوبصورت زبان اپنے جائز مقام کو حاصل کرکے دم لے گی۔"

اردو پر مر مٹنے والے کرشن چندر اپنا فرض انجام دے چکے۔ وہ اب ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اردو کا محاذ خالی یا کمزور ہوگیا ہے ابھی اردو کا ایک جاں باز سپاہی قیصر عثمانی ہمارے درمیان موجود ہے۔

قیصر عثمانی ۔ میری نظر میں

زیڈ۔ اے۔ جوہر

قیصر عثمانی کو میں ذاتی طور پر برسوں سے جانتا ہوں۔ اور یہ بھی کہ وہ گوئل سنے کارپوریشن سے پچھلے ۲۰ برس سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس سے قبل قیصر عثمانی اور خود دیویندر گوئل فضلی برادرز میں معاون ہدایت کار تھے۔ اس کے باوجود قیصر عثمانی کے پروڈیوسر و ہدایت کار نہ بن پانے پر میں ہی نہیں بلکہ ان کا ہر ساتھی حیران و پریشان ہے کیونکہ اس لائن میں بڑے بینرز میں کام کرنے کا موقع ملے تو پھر ہدایت کار بننے میں بڑی آسانی ہو جاتی ہے — کیونکہ فلم بنانے کی بنیادی ضرورت پیسہ نہیں بلکہ وسیع تعلقات ہیں۔ قیصر عثمانی ایک ملنسار اور زندہ دل آدمی ہیں۔ پھر بھی وہ اس دوڑ میں پیچھے ہیں۔ آخر کیوں ؟ اس کیوں کے جواب میں آنجہانی عادل رشید کی بات کچھ وزن دار لگتی ہے۔

"قیصر عثمانی عملی طور پر اس دنیا سے وابستہ ہیں لیکن انہوں نے اس دنیا میں رہ کر اس دنیا کی خصوصیت کو نہیں اپنایا ورنہ یہ فلمی دنیا سے ہزاروں نہیں لاکھوں کما چکے ہوتے۔ وہ بڑے خوددار انسان ہیں ورنہ اس فلمی دنیا میں مسکہ کی کمی تو ہے نہیں۔ یہ بھی جی کھول کر مسکہ لگا سکتے تھے اور جب یہ مسکہ لگا لگا کر اپنے اردگرد نظر ڈالتے تو یہ دیکھتے کہ اب یہی مسکہ انہیں لگ رہا ہے اور یہ اپنے لگائے ہوئے مسکے کا سود در سود تک وصول کر رہے ہیں۔ لیکن قیصر عثمانی نے ایسا نہیں کیا۔ اسی لئے ان کی عزت میری نظروں میں بہت زیادہ ہے۔"

قیصر عثمانی ایک اچھے انسان ہونے کے علاوہ ایک کامیاب ادیب، صحافی اور شاعر بھی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے فضلی برادران اور گوئل سنے کارپوریشن کی فلموں کی پبلسٹی جس ڈھنگ سے کی ہے اس سے

وہ ایک کامیاب پبلیسٹ بھی مانے جاتے ہیں۔ لیکن فلم والے انہیں دلیوندر گوئل کے معاون کے طور پر ہی جانتے ہیں۔ قیصر عثمانی کہتے ہیں

" ان اٹھائیس برسوں میں میں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میرا رجحان ایام طفلی ہی سے ادب کی طرف رہا ہے۔ جن دنوں میں کالج میں پڑھ رہا تھا میری چھوٹی بڑی تخلیقات بہار کے علاوہ لاہور کے معیاری رسالوں میں بھی شائع ہوا کرتی تھیں اور جب میں اپنی تعلیم کو نامکمل چھوڑ کر پٹنہ سے گیا واپس آگیا تو اردو کے قادر الکلام شاعر اور شمسی پریس کے مالک حضرت بسمل سنسہاروی مرحوم نے مجھے اپنے خالص ادبی رسالہ سہیل کا ایڈیٹر بنا دیا تھا۔ جس کے ادارتی فرائض میں نے اپنے ساتھی عارف سنسہاروی کے ساتھ دو سال تک انجام دیئے۔ انہیں دنوں میرے مخلص دوست شیدا کپوروی پر ہیرو بننے کا بھوت سوار ہوگیا اور میں بھی گیا چھوڑ کر اس کے ساتھ کلکتہ چلا گیا۔ سوچا تھا کہ شیدا ہیرو بن جائے گا اور میں بھی کچھ سال بعد ہدایت کار بن جاؤں گا۔ شیدا ہیرو بن گیا اور میں فضلی برادران میں پبلسٹی آفیسر۔ انہیں دنوں کلکتہ پر بمباری کا اندیشہ تھا۔ لوگ کلکتہ چھوڑ کر لاہور یا بمبئی کی طرف بھاگ رہے تھے۔ چنانچہ میں بھی فضلی برادران کے ساتھ اکتوبر ۱۹۴۲ء میں بمبئی پہنچ گیا جہاں پبلسٹی آفیسر کے علاوہ ہدایت کار سبطین فضلی کا معاون بھی بن گیا اور کئی سال ان کے ساتھ کام کرتا رہا۔ پھر اس کے بعد دیش کے بٹوارے کے ہنگامے شروع ہوئے تو مشہور ڈائیلاگ رائٹر احسن رضوی مرحوم نے مجھے اپنے پاس کلکتہ بلا لیا جہاں ان کی کہانی "نصیحت" کا اسکرین پلے میں نے تحریر کیا تھا۔ لیکن ایک برس بعد ہی جب میں کلکتہ سے گیا واپس آگیا تو فلم ساز ایس۔ ایم۔ نواب اپنے ساتھ پھر بمبئی لے آئے جہاں ان کے ادارہ شاہین پکچرز میں پروڈکشن کنٹرولر کی حیثیت سے کام کیا۔ لیکن وہ کمپنی زیادہ دن نہیں چل سکی چنانچہ اس کے بند ہونے کے بعد ۱۹۵۵ء میں میں نے فلمساز ہدایت کار دلیوندر گوئل کو بطور معاون ہدایت کار جوائن کر لیا اور بس تب سے ہی گوئل بینے کارپوریشن میں ہوں۔

گوئل صاحب کی فلم "ایک سال" کی شوٹنگ کے دنوں میں مدھوبالا میرے کام سے بہت متاثر ہوئی اور اس نے کہا کہ آپ خود فلم کیوں نہیں بناتے؟ آپ کوئی پروگرام بنائیے میں آپ کے ساتھ ہوں۔ آنجہانی کریم سیٹھ (اے۔ کے نڈیاڈ والا کے بھائی عثمان نڈیاڈ والا مرحوم کو جب پتہ چلا تو انہوں نے ڈائریکشن اور مدھوبالا کو ہیروئن لے کر فلم بنانے کی اسکیم لیکن انہیں دنوں ان کی فلم "کیا ملد" کے ہیرو رنجن پر پاگل دورہ پڑ گیا اور فلم رک گئی۔ پھر کچھ ہی دنوں بعد مدھوبالا دل اور وقت کے ہاتھوں ایسی پٹی کہ سارا منصوبہ ختم ہو گیا۔ میں ہدایت کار بننے کی دیرینہ آرزو ہونے کے باوجود میں خو پھر جدوجہد کے لئے تیار نہ کر سکا کیونکہ مال و دولت سے زیا مجھے خودداری بہت زیادہ عزیز رہی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ بند بندھائی آدھی روٹی کو چھوڑ کر ساری کے پیچھے بھاگوں۔ پہلے مدھوبالا نے ہمت و حوصلہ دلا کر ہدایت کار بننے پر اکسایا اب بھی اگر کوئی معقول شخص آفر لے کر آیا تو میں ضرور فلم بناؤں گا۔ لیکن اس کے لئے دوسروں کی خوشامد کر کے اپنی خودداری کو قربان نہیں کروں گا۔ میں زندگی سے متعلق ہمیشہ ہی مثبت اور پرامید زاویہ نگاہ رکھتا ہوں۔ میں یاسیت پسندی کا قائل نہیں۔ یہ میرا یقین ہے کہ اگر آپ میں "کچھ ہے" تو ایک نہ ایک دن لوگ اس خوبی کو ڈھونڈ نکالیں گے اور مجھے یہ بھی امید ہے کہ جس طرح مرار جی ڈیسائی کی وزیراعظم بننے کی دلی تمنا پوری ہوئی ہے۔ ایک نہ ایک دن میں بھی ہدایت کار ضرور بنوں گا۔ اوپر والے کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔

میں خوش قسمت ہوں کہ میں ایک طویل مدت گوئل سنے

کارپوریشن میں نکال دی۔ حالانکہ فلمی دنیا میں اکثر معاون ہدایت کاروں کو ایک کے بعد ایک کمپنی بدلنی پڑتی ہے۔ کیونکہ معاون ہدایت کاروں کی مالی حالت ٹھیک نہیں رہتی۔ انہیں وہ سہولتیں بھی حاصل نہیں ہوتیں جو ایک ہندوستانی شہری کا حق ہے۔ اسی لئے بے چاروں کو آئے دن اچھے سے اچھے مستقبل کے لئے ڈیرہ بدلنا پڑتا ہے۔ میں اس کے خلاف ہوں۔ کیونکہ پتھر ایک جگہ پڑا رہے تو بھاری سمجھا جاتا ہے۔ مجھے بھی کئی فلم سازوں نے روشن مستقبل کا لالچ دے کر اپنے یہاں بلانا چاہا لیکن میں نے گوئل صاحب کے آخری وقت تک ان کا ساتھ نہیں چھوڑا اور آج بھی وہیں اسی عزت و آبرو کے ساتھ ان کے لائق فرزند اجے، جیوتی اور سنیل کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔ آئندہ کبھی اللہ نے ہدایت کار بننے کا موقع دیا تو میں یقیناً عام روش سے ہٹ کر ہی فلمیں بناؤں گا۔ دیکھئے وہ دن کب آتا ہے۔

قیصر عثمانی نے اپنے دل کی ایک ایک بات کھول کر سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

بقیہ ــ مضمون حفیظ وارثی

آج ہر گوشۂ صحرا ہے گلستاں بہ کنار
تیز ہے قافلۂ وقت کی ہر سو رفتار
ہم غریبوں کا وہی حال ہے لیکن سرکار
بات کیا ہے جو شمار اپنا ہے معتوبوں میں
ذکر تک اپنا نہیں ہے آپ کے مضمونوں میں

" بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے " اس لئے بہ قول جناب اختر قادری ــــ

" ... کیا عجب کہ قیصر عثمانی کی یہ نظم محض ان کے ذوق سخنوری کی تسکین کے علاوہ "پرچھائیوں کے دیس" میں ایک نئے فکری انقلاب اور تعمیری اقدام کا پیش خیمہ ہو اور اس طرح یہ نظم اپنی فنی، شعوری اور ادبی کامیابیوں کے ساتھ تعمیری اور انقلابی کارنامہ بھی بن جائے۔"

قیصر عثمانی اور اُن کی شخصیت

محمد حسین منشی

یوں تو میرا بمبئی آنا جانا ۱۹۴۲ء سے ہے اور میٹرک کے بعد ۱۹۵۴ء تا ۱۹۶۱ء اعلیٰ تعلیم یہیں حاصل کی ہے۔ مگر یہ ۱۹۷۰ء کی بات ہے کہ پنجاب کی ملازمت کے دوران میرا آنا جانا ملاڈ میں بھی ہو گیا۔ کیونکہ میرے بڑے صاحبزادے جوان دنوں بمبئی ہائی کورٹ کے کامیاب وکیل اور نامور نوٹری ہیں ان کے رشتے کی بات یہاں کے ایک معزز اور مشہور خاندان کے اعلیٰ تعلیم یافتہ سرکاری افسر کی صاحبزادی سے چل رہی تھی (بعد میں یہ دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک بھی ہو گئے) انہیں ایام میں ہر گلی کوچے چوراہوں۔ بازاروں۔ بس اسٹاپ اور ریلوے اسٹیشنوں پر ادبی سنگم کے پوسٹروں پر جنرل سکریٹری جناب قیصر عثمانی کا نام نامی نظر آتا تھا۔ اس طرح ان سے نیاز حاصل کرنے کا اشتیاق بھی بڑھتا گیا۔ کچھ اپنی ملازمت اور کچھ وقت کی کمی کے باعث کبھی ان سے ملاقات کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔

لیکن ۱۹۸۰ء میں چھوٹے صاحب کے شفاخانے میں ایک روز ایک پروقار، خوش پوش اور متاثر کن شخصیت نظر آئی۔ دل میں تھا خیال آیا کہ کہیں یہی ذاتِ گرامی تو قیصر عثمانی نہیں۔ اتنا سوچنا تھا کہ صاحبزادے نے تعارف کروا کے میرے خیال کی تصدیق کر دی۔ ابتدا میں تو مختصر سے قیام کے دوران معاملہ علیک سلیک اور رسمی گفتگو تک ہی محدود رہا لیکن جب ۱۹۸۶ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوا تو ان کی ہمسائگی میں ہی رہائش پذیر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ تب سے تو یہ عالم ہے کہ

تجھ سے اب مل کے تعجب ہے کہ عرصہ اتنا
آج تک تیری جدائی کا یہ کیوں کر گزرا

[illegible]

کو کبھی نہیں بخشتے۔ اور اچھے اچھے بلند قامت ادیبوں اور شاعروں کی کل سیدھی کئے رہتے ہیں۔ اور اپنا مقام و مرتبہ ارباب علم و فن کے درمیان برقرار رکھے ہوئے ہیں آپ کی ذات گرامی خود ایک انجمن ہے۔ بڑے یار باش۔ دوست نواز اور ادب شناس اور خوش مزاج ہیں۔ زندہ دلی اور رنگین طبع آدمی ہیں۔ اردو سے والہانہ محبت رکھتے ہیں۔ اگر اردو نے ان کو نام و مقام عطا کیا ہے تو قیصر صاحب نے بھی اردو کی آبیاری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ بالخصوص طاؤ کے مشاعروں نے تو ان کی عظمت و شہرت کو اور بھی چار چاند لگا دیئے ہیں۔ لیکن اس درجہ نام آوری اور شہرت کے باوجود ان میں تکبر کا مادہ برائے نام بھی نہیں ہے۔ ان کی مثال ایسی ہے کہ

اچھل کر وہ نہیں چلتے جو کامل ہیں کسی فن میں
چھلک جاتا ہے پانی۔ قاعدہ ہے اوچھے برتن کا

ان کا رہائشی علاقہ ٹیپا پارک کوئی نیشنل پارک جیسا پارک نہیں ہے بلکہ یہاں ان کے ملاقاتیوں اور قدر دانوں کی گاڑیاں ضرور پارک رہتی ہیں۔ محبوبی بلڈنگ کے پہلے منزلے پر پہلا فلیٹ آپ کا ہی ہے یعنی یہاں بھی فرسٹ کلاس فرسٹ جیسی حیثیت حاصل ہے۔ کون ہے یہاں جو ان سے واقف نہیں۔ اگر کوئی اجنبی بھی ان کی رہائش گاہ تک پہنچنا چاہے تو کوئی دقت نہیں ہوتی کیونکہ معاملہ کچھ اس قسم کا ہے کہ ؎

میں ترے شہر میں جب بھی کوئی رستہ پوچھوں
جانے کیوں لوگ ترے گھر کا پتہ دیتے ہیں

ان کا گھر کیا ہے ایک اچھا خاصہ کتب خانہ ہے۔ جہاں بیش قیمت اور نایاب کتب و رسائل کو نہایت سلیقے سے آراستہ کیا گیا ہے۔ ٹیلی ویژن، ٹیلیفون اور آرام دہ فرنیچر کے علاوہ مکان بے حد ہوادار اور پرنور ہے۔ بیگم قیصر عثمانی بھی ادبی شغف رکھتی ہیں۔ اور قیصر صاحب کی ہمکنار ہیں اور ان کا ہو زبردست ہاتھ ہے۔ وہ بے حد درد مند خیر خواہ، اخلاق مند اور پرخلوص و شگفتہ مزاج خاتون ہیں۔ قدرت نے اولاد کی دولت سے بھی مالا مال کیا ہے۔ نیک اور سعادت مند چار عدد تعلیم یافتہ لڑکے ہیں۔ نیز دو لڑکیاں بھی ہیں۔ ان میں سے ایک انگریزی اسکول میں معلمہ ہے اور ایک اہل قلم کے علاقۂ زوجیت میں آگئی ہیں۔ اور دو عدد ذہین اور ہونہار لڑکوں کی ماں ہے۔ دوسری لڑکی خانگی ذمہ داری کے ساتھ انگریزی زبان میں درس و تدریس کا سلسلہ گھر میں رکھے ہوئے ہے۔ ایسی نیک بخت اور سعادتمند اولاد پر جتنا ناز کیا جائے کم ہے۔ ان سب میں بھی کم و بیش علمی و ادبی شوق ہے۔ خاندانی عظمت و شرافت نیز تہذیب کا بہترین نمونہ یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔

آئے دن ان کی رہائش گاہ پر ادبی نشستیں اور سخن کی محفلیں گرم رہا کرتی ہیں اور نامور اور عظیم المرتبت اہل علم و سخن کا مجمع لگا رہتا ہے۔ ارباب علم و ادب کے ذوق کی تسکین بھی ہو جاتی ہے اور ساتھ میں چائے ناشتہ سے خاطر مدارات بھی۔ ان کے یہاں جانے پر ایک سے ایک عظیم ہستی سے شرف ملاقات حاصل کر لیجئے۔ تب یوں ماجرا ہے کہ

چلو کوچے میں آج ان کے زمانے بھر سے مل آئیں
سنا ہے دیکھنے سارا زمانہ ان کو آتا ہے

اوروں کی بہ نسبت میری آمد و رفت آپ کے یہاں کچھ زیادہ ہی ہے۔ ایک روز کا قصہ ہے کہ حسب معمول جب قیصر صاحب کے دولت کدہ پر پہنچا تو ان کو نہایت مغموم اور متفکر پایا دریافت کیا۔ وجہ یہ معلوم ہوئی کہ بہار اردو اکیڈمی سے جو پانچ ہزار روپے ان کے نئے شعری مجموعے "حدیث دل" کو ملے [illegible] ... وہ قطعی ناکافی ہے۔ میں نے ا

صلہ یہ بات کہہ کر بڑھایا کہ یہ تو اللہ کا لطف و کرم ہے
یاست بہار نے آپ کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے
نواز بخشا ہے۔ اس میں اداس ہونے کی کیا بات ہے۔ کیوں
ا تجویز پر عمل کیا جائے کہ کتاب کی مقررہ قیمت فلم کی ایڈوانس
کی طرح دوست و احباب اور ادب نواز حضرات کو پیشگی
ر بنا کر وصول کیا جائے۔ یہ سنتے ہی قیصر صاحب کے چہرے
شی کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے بھی اس تجویز کی تائید کی۔ اور
سلسلے میں پہلا خریدار بننے کا شرف مجھے حاصل ہوا۔ اور
گے اللہ کا کرم دیکھئے کہ کوئی دن ایسا نہیں گذرا کہ قیصر
ب کے گھر میں ڈاکیہ منی آرڈر یا چیک لاکر نہ دیتا ہو۔ اس
ان کے واقف کار وکلا، ڈاکٹر، فلمی اداکار، ہدایت کار
ہ نگار اور فلمی دنیا کے دیگر احباب اور رفقا نے بخلوص
تعاون ہی پیش نہیں کیا بلکہ بہتوں نے تو کچھ زیادہ ہی فراخ
کا ثبوت دیا۔ اور اس طرح یہ خوبصورت کتاب شائع ہوگئی
س کی پہلی جلد کے حاصل کرنے کا فخر مجھ ہی کو حاصل ہوا۔

تقریباً نصف صدی تک فلموں میں وابستگی کے
بود قیصر صاحب کی طبیعت میں کوئی نخوت اور رعونت نہیں
۔ اکثر ان کے عزیز و اقارب محض اس وجہ سے ملنے سے گریز
تے ہیں کہ قیصر صاحب اس بلند مقام و مرتبے پر پہنچنے کے باعث
یں شاید ... [illegible] ... شان ... ایک
ہ ایسا [illegible] سے ملنے
لئے آئے [illegible] یہ لوگ
ابھی گو [illegible] نے ان
یرت زدہ [illegible] کے
نو نکل [illegible] گفتگو
ے اور سب کے عجز و انکسار اور کسر نفسی سے متاثر ہوئے
ہار، کہ وہ ... کو دیکھ کر ... اور آخر

میں اپنی رائے بدل کر ہی اُٹھے۔

جیسے میں آدمی سمجھا تھا دیوتا نکلا

انسان کی زندگی کا آغاز عہد طفلیت سے ہوتا ہے۔
لیکن قیصر صاحب کی نئی شعری تخلیق "حدیث دل" ان کی نظم
"پیری" سے شروع ہوتی ہے۔ جو انہوں نے اپنے والد کی
رحلت سے متاثر ہو کر سترہ سال میں کہی تھی اور زیر نظر کتاب میں
وہ نظم اس وقت شائع ہوئی جب وہ ستر سال کے ہو گئے۔ یہ
کیسا عجیب اتفاق ہے کہ عنوان شباب کی اس نظم میں قیصر
صاحب نے بڑھاپے کی کتنی منفرد تصویر پیش کی ہے۔ جیسے

کمر میں خم کچھ ایسا ہے کہ خم لائے کماں اس سے
چلا دے گی کسی دن تیر مرگ ناگہاں اس سے
مراحل زندگی کے طے ہوئے رفتار دھیمی سے
کہ بحر ہستی میں اب یہ ندی گرنے والی ہے
نمود صبح پیری ہے چراغ روشن ساحل
یہی ہے کشتیٔ عمر رواں کی آخری منزل

اس ابتدائی نظم سے بھی قیصر صاحب کی یہ انفرادیت ان کی
شاعری کا طرۂ امتیاز معلوم ہوتی ہے جو حدیث کے
دوسرے منظومات میں بھی جا بجا پائی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ اس کتاب میں "میرا وطن میرا گھر"
ایک ایسی دردناک نظم ہے جو یوسف ناظم کے خیال کے مطابق
ان کی طبع روانی ہی کی نہیں ان کے اشک روانی کی بھی منہ
بولتی تصویر ہے۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ بیس بائیس سال قبل
جب قیصر صاحب دیوبند گوٹل کی فلم "ایک پھول دو مالی" کی
کشمیر کی آؤٹ ڈور شوٹنگ کے دوران مشہور پنجابی ادیب
اور فلمی اداکار بلراج ساہنی کو اپنے مخصوص انداز میں جب
یہ نظم سنا رہے تھے تو بلراج ساہنی دفعتاً اشکبار ہو گئے
تھے۔ غالباً اس وقت ... انہوں ... تھا ... والا اتنا گھر مار آگیا

ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نظم میں تاثر کا سمندر یونہی موجزن نہیں۔ قیصر صاحب نے کچھ کھویا ہے تب جاکے اس کامیاب نظم کا تحفہ پایا ہے۔

حدیثِ دل میں جتنی بھی نظمیں ہیں ان کے دردمندِ دل کی عکاس ہیں۔ انہوں نے غزلیں بھی کہی ہیں جن سے ان کی شدتِ احساس کا پتہ چلتا ہے۔ جیسے ذیل کے چند اشعار ؎

یورش ہوئی ہے دل پر کچھ اتنے حادثوں کی
ہوتا نہیں اثر اب کوئی بھی حادثہ ہو

احباب کا ستم ہی تھا اپنا نصیب مقدر
کیا اس کی پھر شکایت کیوں اس کا پھر گلہ ہو

لیکن میرا خیال ہے کہ حاصلِ غزل کے اعتبار سے فلمی دنیا سے متعلق قیصر صاحب کی "پرچھائیوں کا دیس" حاصلِ کتاب کا درجہ رکھتی ہے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ یہ شاہکار نظم ان کی طویل فلمی زندگی کے تلخ و شیریں تجربات کا ماحصل ہے۔ فلم کے موضوع پر خالص ادبی رنگ میں ایسی جاندار اور حقیقت افروز نظم شاید ہی کسی اور زبان میں موجود ہو۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے ایک مضمون میں بالکل صحیح تحریر کیا ہے کہ یہ نظم ایک موثر اور فنکارانہ مرثیہ ہے۔

قیصر صاحب کی شاعری سے صرف ان کی دردمندی ہی ظاہر نہیں ہوتی بلکہ ان کی طبیعت میں حسن پرستی بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہے جو ان کے ان اشعار سے آشکارا ہے۔

قیصر محرموں کا مذہب ہے وہ عشق
حسن کو کہتا ہے جو پروردگار

تھے اور سب پجاری مندر میں دیوتا کے
ہاں دل جھکا ہوا تھا چرنوں میں مدلقا کے

یا پھر یہ رنگین شعر ملاحظہ ہو

ہونٹوں پہ ہائے رے وہ تبسم کی لہریں
جس طرح بوستاں میں کھلے صبح دم کلی
(پرکیف ساعتیں)

یا پھر یہ اشعار

آیا جو تم ذرا سا لب ہائے خوشنما پر
تاروں کا ہو گیا اک جھرمٹ کا دو سا فضا پر

بدلا مزاجِ حسن تو وہ روبرو نہیں
وہ عشوہ و ادا نہیں وہ گفتگو نہیں

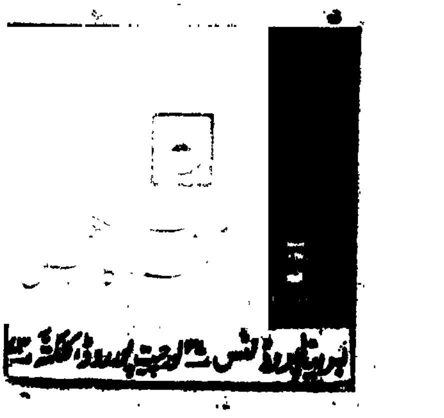
دل سے تجھے نکال کے کچھ مطمئن تو ہوں
پھر بھی کہوں یہ کیسے تری جستجو نہیں

مجھ کو دیکھا نہ بات کی کوئی
یہ بھی آخر ادا ہوئی کوئی

جلتی ہے شمع آگ میں اپنی تو کیا ہوا
رخسارِ دل خاں سے مرا دل جلا کرے

ایک شب اور دو ہوں ماہ تمام
آئے پھر ایسی اک گھڑی کوئی

مختصر یہ کہ قیصر صاحب فلمی آدمی کے بجائے سرتا پا شاعر ہی شاعر نظر آتے ہیں۔ اور یہ ان کے کردار کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ جس سے ان کا ملاقاتی متاثر ہوتا رہتا ہے۔



چلتی پھرتی انجمن، قیصر عثمانی

رفیق جعفر

بمبئی کی بھاگتی دوڑتی زندگی میں کسی انجمن کا تصور بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ صحرا میں پھول کھلے ہوں۔ لیکن بمبئی میں انجمنیں ہیں اور وہ اپنا کام کرتی بھی رہتی ہیں۔ ایک انجمن کو چلانے میں کم سے کم ایک درجن لوگ درکار ہیں۔ ان میں کمی یا زیادتی بھی ہو سکتی ہے ــــ کوئی بھی انجمن ہو وہ تو ہوتی ہے عوام کی بھلائی کے لئے مگر عوام کو اس کی برقراری یا استحکام کی قطعاً فکر نہیں ہوتی۔ عوام کو تو صرف فائدہ سے مطلب ہوتا ہے۔ اور انجمن والوں کو چندے سے غرض ہوتی ہے۔ یہ فائدے سے مطلب اور چندے سے غرض کے ٹکراؤ سے انجمنیں بنتی، بگڑتی اور ٹوٹتی رہتی ہیں۔ بہت ہی کم انجمنیں مستقل طور پر چل پاتی ہیں۔

انجمن سازی دراصل ایک بیماری ہے جو کبھی بھی کسی بھی شخص کو کسی بھی وقت ہو سکتی ہے۔ یہ بیماری متعدی ہوتی ہے۔ اس کے جراثیم ایک دوسرے میں منتقل ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اور انجمن سازی کوئی آسان کام نہیں اس کے لئے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ بڑی ہی صعوبتیں جھیلنے کے بعد کوئی انجمن بنتی ہے۔ پھر اس کے لئے ایک جگہ آفس کے لئے چاہئے۔ آگے کی کاروائی کے لئے سرمایہ بھی چاہئے۔ الغرض ہزاروں جھنجھٹیں ہیں انجمن سازی کے لئے۔ شاید ان تمام باتوں کو محسوس کرتے ہوئے کچھ ہوشیار لوگ انجمن بنانے کے بجائے خود انجمن بن جاتے ہیں ان ہی ہوشیار ترین لوگوں میں ایک قیصر عثمانی بھی ہیں۔

قیصر عثمانی چلتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی انجمن کا دفتر چلا جا رہا ہے۔ بولتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی انجمن کی میٹنگ ہو رہی ہو۔ ان کی لکھی ہوئی چیز ہم پڑھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ سارے جہاں کا درد انھیں کے جگر میں ہے ہنستے ہیں تو لگتا ہے کہ کسی انجمن کے دفتر میں کسی کارنامے پر خوشی کا نعرہ بلند

ہو رہا ہو۔ اور جب روتے ہیں تو ....! نہیں، نہیں انھیں تو روتے ہوئے کسی نے کبھی نہیں دیکھا۔ شاید آئینے نے بھی نہیں! اصل میں روتے وہ ہیں جنہیں ہنسنا نہیں آتا۔ ہنسنے کا سلیقہ اور خوشی کا ہنر جاننے والا کبھی رو ہی نہیں سکتا۔ قیصر عثمانی جینے کی فنکاری سے خوب واقف ہیں۔ سنہ ۱۹۱۹ء سے بدستور جیئے جا رہے ہیں۔ خوش اسلوبی سے جینے کا یہ گر وہ اپنے کسی عزیز ترین شاگرد یا اپنی کسی اولاد کے حوالے نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے حالات، واقعات اور تجربات نے انہیں تحفتاً یہ گر دیئے ہیں اور تحفے محفوظ رکھے جاتے ہیں بانٹے نہیں جاتے۔

اس چلتی پھرتی انجمن جس کا رجسٹریشن نمبر ۸۰ ہے اور ہر سال اس عدد میں "ایک" کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ اس انجمن کو کسی چندے کی ضرورت نہیں۔ یہ اپنے آپ ہی چلتی رہتی ہے۔ تبھی تو یہ خود مختار ہے اور من مانی کرنے کی عادی ہے۔ من مانی میں جو خامی رہ جاتی ہے یا غلطی ہو جاتی ہے اس کا پوچھنے والا، روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ کسی میں بھی اتنی ہمت نہیں ہو سکتی کہ کچھ بولے کیونکہ جو لوگ چندہ نہیں دیتے انھیں بولنے کا کوئی حق نہیں۔ انجمن ہوتی تو ہے مونث لیکن ہماری یہ انجمن مذکر ہے کیونکہ اس کا نام ہے "قیصر عثمانی"۔ تذکیر و تانیث کے جھگڑے میں پڑے بغیر ہم انہیں "انجمن" ہی کہتے ہیں۔ ہاں اس مذکر انجمن کا تعلق مونث سے چولی جیسا ہے۔ ان کی شاعری سے لے کر نجی زندگی تک یہ تعلق رواں دواں ہے۔ صنف نازک سے ان کا یہ رشتہ بڑا ہی نازک ہے اور وہ اس رشتے کو نباہنے میں بڑی احتیاط برتتے ہیں گویا کہ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو والی بات ہے

اس انجمن کا گٹھ جوڑ ایک اور انجمن سے ہو گیا تھا جس کا نام تھا "ادبی سنگم" اور اس ادبی سنگم کے ہمدرد قیصر عثمانی کے ارد گرد خود رو پودوں کی طرح اچانک اُگ آئے تھے

ان پودوں کو دیکھ کر قیصر عثمانی مسرور ہو گئے اس سے کہ وہ مغرور ہو جاتے اچانک ان ہی ہمدردوں کے ہاتھ اس بے چاری "ادبی سنگم" کا ڈرامائی طور پر مرڈر ہو گیا مقتول انجمن کے دکھ میں قیصر عثمانی مغموم رہنے لگے ان کی یاسیت دنیا والوں سے دیکھی نہ گئی۔ سب نے مل کر انجمن کا عقد "ادبی سمسد" سے کروا دیا۔ یہ عقد ثانی ا انجمن کو راس آگیا۔ "ادبی سنگم" کی ہی طرح "ادبی کی ماہانہ نشستیں ہونے لگیں اور سالانہ مشاعرے بھی شان سے ہوتے رہے۔ پھر کیا تھا کہ "ادبی سمسد" قیصر ع سے اور قیصر عثمانی ادبی سمسد سے پہچانے جانے لگے۔ اپنے کی بنیاد پر قیصر عثمانی نے اپنے "ہمدردوں" کو گھسنے نہیں دیا طرح "ادبی سمسد" مقتول ہونے سے بچ گئی۔ مگر وہ کے درپے ہے۔ بہت بیمار ہو گئی ہے بے چاری، کوئی پرسان نہیں اور جو پرسانِ حال ہے وہ ہمیشہ وارانہ رقابت کا ش ہے کیونکہ انجمن "ادبی سمسد" انجمن قیصر عثمانی سے زیاد ہو گئی تھی۔ سنا ہے ان کے ارد گرد "ادبی سمسد" کے ہم اکٹھے ہونے لگے ہیں۔ خدا خیر کرے!

جس انجمن کا نام نامی قیصر عثمانی ہے ان سے جب ملاقات ہوتی ہے موضوع گفتگو خود بخود "اردو" ہو ہے۔ اور یہ موضوع اتنی طوالت اختیار کر جاتا ہے کہ ہول لگتا ہے۔ اور یہ خدشہ بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ اردو کہیں ہمیں بھی لاحق نہ ہو جائے اور اردو کے سلسلے میں تک قیصر عثمانی کا تعلق ہے ایسا لگتا ہے کہ اردو نام ہے کی چہیتی اور لاڈلی جوان اور خوبصورت بیٹی کا جس کی ش کی فکر انہیں دن رات کھائے جا رہی ہو۔ اور یہ اس کو حسن اخلاق کی تعلیم دینے میں لگے ہوئے ہیں میں کچھ ایسے گن بھر دینا چاہتے ہیں کہ جسے دیکھ کر کو

ہز کے بیاہنے کے لئے تیار ہو جائے ـــــ طرح طرح سے وہ اردو شیو کو سنوارتے سجاتے رہتے ہیں۔ اس کے ساتھ کسی بدسلوکی کو وہ قطعاً برداشت نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی نگاہ غلط انداز بھی اس پر ڈالے تو وہ اس کی آنکھیں پھوڑنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ کچھ برس پہلے جب کرشن چندر حیات تھے تو ایک اردو دشمن تحریک نے جنم لیا تھا۔ اس میں اردو کے ہی پالکڑے جنھوں نے اسی کے بل بوتے پر نام کمایا تھا اور کھا کما رہے تھے۔ مخالفت پر اتر آئے تھے۔ گویا جس تھالی میں کھا رہے تھے اسی تھالی میں چھید کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ یہ بات کرشن جی کو بہت بڑی لگی تھی۔ کیونکہ کرشن جی اردو کے سچے عاشق تھے۔ اس کے خلاف ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہیں تھے۔ ادھر تحریک اس قدر جڑ پکڑ رہی تھی کہ اسے اکھاڑ پھینکنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ ادھر ہندوستان ہر پیمانے پر اس کی مخالفت ہو رہی تھی۔ بمبئی سے ہمارے کرشن جی اور ہماری انجمن (قیصر عثمانی) نے تو حد ہی کر دی۔

ہندی اور اردو میں چھپنے والے ہر مضمون کا جواب یہ دونوں حضرات ڈھونڈ نکالتے تھے اور کبھی منہ توڑ جواب دیتے تھے اور کبھی سر پھوڑ ہتھوڑا مارتے تھے۔ اس سلسلے میں دونوں حضرات ایک دوسرے کو داد بھی دے لیا کرتے تھے۔ کرشن جی نے اپنے آخری دنوں میں ایک دن قیصر عثمانی سے فون پر کہا تھا۔ "قیصر عثمانی اردو دشمن تحریک سے چوکس رہنا اور اپنے دوستوں اور ہمدردوں کو بھی اس جنگ میں شامل کرنا، اگر یہ کام تم نے نہیں کیا تو سمجھو کوئی نہیں کرے گا۔" زندگی بھر کرشن جی فراق گورکھپوری کی طرح دیوناگری رسم الخط کے خلاف ہی رہے اور اردو کو جان و دل سے زیادہ عزیز رکھا۔ اچھے خاصے پڑھے لکھے ہونے کے باوجود انہیں کسی اور زبان سے پیار نہ ہو سکا۔ اردو لکھنا اردو بولنا، اردو پڑھنا اور اردو ماحول بنائے رکھنے کو ایک عبادت سمجھتے تھے۔ کچھ ایسی ہی صفات ہماری انجمن (قیصر عثمانی) میں بھی ہیں۔ بہر حال اس زمانے میں ان دونوں حضرات نے ایسی مجاہدانہ جوابی تحریک چلائی کہ اردو دشمنوں کی مات ہو کر رہی اور قیصر عثمانی فخریہ یہ کہنے لگے کہ ؎

یوں تو عیسیٰ بنی رہی بادِ مخالف قیصرؔ
تازہ دم ہند میں غالب کی زباں آج بھی ہے

کوئی مانے یا نہ مانے اس وقت کچھ ایسی ہوا بن گئی تھی کہ یہ انجمن اگر کھل کر میدان میں نہ آتی [illegible] اردو کرشن چندر اپنے دوستوں کے ساتھ قلم کے ہتھیاروں سے لیس اس جنگ میں نہ کود پڑتے تو بے شمار اردو والے کنونٹ ہو چکے ہوتے۔ ہمارے انجمن کی شہرت اردو لڑائی کی وجہ سے بھی ہے۔ اس سے پہلے فلمی دنیا پر لکھی ہوئی طویل ترین نظم (مسدس) سے اور ملاڈ کے سالانہ مشاعروں کی کامیابی سے اس انجمن کو بے حد شہرت اور مناسب مقبولیت مل چکی تھی۔ اردو کی جنگ نے ان کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے۔

اصل میں اردو رسم الخط کو رد کرنے اور اردو زبان کو زبان تسلیم نہ کرنے کی تحریک کا مطلب یہ تھا کہ اردو کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ اب تک پتہ نہیں چلا کہ اس گھناؤنی سازش کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا! یہ مسئلہ کیوں کھڑا کیا گیا؟ اردو کے مستند شعراء و ادباء کی حمایت کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس قسم کے سوالات اگر آپ ہماری انجمن (قیصر عثمانی) سے کریں گے تو ایک دفتر کا دفتر کھل جائے گا۔ ان کے دوست احباب ان کو چھیڑ کر معلومات کے موتی لوٹتے ہیں۔ ان لٹیروں میں ایک میں بھی ہوں۔

قیصر عثمانی کو جو لوگ قریب سے جانتے ہیں وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ ان کی یادداشت اچھی نہیں ہے۔ اور

خود انہیں یہ بھی یاد نہیں کہ ان کی یادداشت کب اور کیسے ختم
میں اچھی تھی۔ سوچنا پڑتا ہے کہ کالج کے زمانے میں بھی ان کی
یادداشت اچھی نہیں تھی تو پھر موصوف اعلیٰ جماعت میں اعلیٰ نمبروں
سے کامیاب کیسے ہوگئے ۔۔۔! اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے
ہمیں یہ بھی سوچنا پڑتا ہے کہ اس یادداشت کی تشہیر کہیں قیصر
عثمانی ہی نے تو نہیں کی ۔ اپنے پی آر او ہونے کا فائدہ تو نہیں
اٹھایا ۔۔۔!؟ مزید سوچیں تو پتہ چلتا ہے کہ نہیں۔ انہوں نے
یہ چکر نہیں چلایا ہوگا کیونکہ وہ فلموں کے پی۔ آر۔ او ہیں۔ ادب
کے نہیں ۔ اپنے شخصیت کے بھی نہیں ۔ مگر یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے
کہ اگر ان کا کوئی ملنے جلنے والا صرف ایک دو مہینے ان کی نظروں
سے دور ہو جائے تو وہ اتفاقاً اس کو بھول جاتے ہیں اور کوشش
کرتے ہیں کہ اس شخص کا نام بھی بھول جائیں۔ مگر بھولتے نہیں ہیں۔
اس کا مطلب ہوا ان کی یادداشت اچھی بھی ہے۔ اچھی یادداشت
کا ثبوت یہ ہے کہ ان کا ملنے جلنے والا بہت دن کے بعد اچانک سامنے
آجائے تو وہ اسے پہچانیں گے نہیں اور نہ ہی اس کا نام انھیں
یاد آئے گا۔ اور اگر سامنے والا اردو بولنے لگے اور اردو کی ہمدردی
میں کچھ کہے تو اچانک انہیں ایک جھٹکا سا لگتا ہے اور ان کی
یادداشت واپس آجاتی ہے ۔ یادداشت کے چلے جانے اور اس
کے چلے آنے کا جو عمل ہے وہ بڑا ہی عجیب و غریب ہے ان
کے اس چکر میں ہم زیادہ پڑیں تو ہمیں اپنی یادداشت پر شک
ہونے لگتا ہے۔ قیصر عثمانی کی یہ نفسیات ہے کہ وہ کھوئی ہوئی
شکلیں، کھوئے ہوئے جسم اور کھوئے ہوئے نام پھر سے پانا
چاہتے ہیں ۔ وہ چاہتے ہیں کہ وہ سب کچھ جو ان کے حصے میں آیا تھا
وہ ہمیشہ ان کے پاس رہے ان کے ساتھ رہے ۔ جوانی کی طرح
کوئی شئے ان سے بے وفائی نہ کرے ۔ ویسے وہ اپنی جوانی کو ہمیشہ
اپنے ساتھ دیکھنا چاہتے ہیں۔ مگر چاہنے سے کیا ہوتا ہے ۔ یہ
بات وہ مانیں گے نہیں ۔ انہیں آئینہ دکھانا ہوگا تب کہیں

جاکر وہ مانیں گے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ انسان
سکتا ہے لیکن آئینہ جھوٹ نہیں بول سکتا۔
کھوئی ہوئی چیزوں کو پا جانے کی کشمکش
ہمیشہ مبتلا رہتے ہیں ۔ کوشش کرتے رہتے ہیں اور
سہی تصور میں ہی سہی وہ اپنی کھوئی ہوئی چیز پا ہی لی
تازہ دم ہو کر زندگی کے سفر پر پھر نکل پڑتے ہیں ۔ یہ عمل
نفسیاتی ہے جس کا تعلق اچھی یادداشت سے ہے ۔
ہماری انجمن (قیصر عثمانی) کی یادداشت اچھ
بری یہ ایک الگ مسئلہ ہے ۔ اس کا فیصلہ تو دنیا
عدالت میں ہو ہی نہیں سکتا۔ چشم دید گواہوں کے بیانا
والے ثبوت کی روشنی میں قیصر عثمانی کی یادداشت کا
اس کا یقین کرنا پڑتا ہے۔ چشم دید گواہوں میں سے
کہ کئی معاملات میں قیصر عثمانی کی یادداشت واقعی
مگر تعجب ہے اس پر کہ ایک مثلث یعنی تکون (فنیا
کا نہیں) انہیں ہمیشہ یاد رہتا ہے ۔ وہ تکون ہے
گھر اور اُردو ۔۔۔ اس تکون کے سلسلے میں ان کی
کا جواب نہیں۔ یقین مانئے انہیں آدھی صدی سے یہ
باتیں بھی آج تک اچھی طرح یاد ہیں۔
سچ پوچھئے تو نوکری، گھر اور اردو کے تکو
ان کی زندگی مفید بھی ہے اور نقصان بھی ۔۔۔ ان کی یہ
اپنی مثال آپ ہے ۔ آدھی صدی اور بیس برس یعنی لگ
پانچ بن باس ۔۔۔! اس عرصے میں کتنے موسم بدلے،
آئے، مگر ان کا اس تکون سے پیار کم نہ ہوا بلکہ ا
ہی چلا گیا ۔ شاید اسی وجہ سے یہ تکون ان کا ساتھ
رہا ہے ۔
یہ چلتی پھرتی انجمن بمبئی والوں کے لئے بڑ
ہے ۔ یہ انجمن سوشیل ورک بھی کرتی ہے ۔ استا

باپ اور نانا کے فرائض بھی ادا کرتی ہے۔ یاری دوستی کے اعلیٰ اقدار کو بھی بڑھاوا دیتی ہے۔ شعر و ادب کو بھی جلا بخشتی ہے۔ مگر اپنے تکون کی حدود میں رہ کر —!

اس انجمن کا واسطہ ادب، مذہب اور سماج والوں سے ہی نہیں فلم والوں سے بھی پڑتا رہتا ہے۔ تقریباً سبھی انہیں جانتے ہیں۔ کیا اداکار، کیا صداکار، کیا قلم کار اور کیا ہدایت کار، سب کے سب اس انجمن کے گرویدہ ہیں اور وقتاً فوقتاً اردو کا لہجہ اور معنی و مفہوم معلوم کرتے رہتے ہیں۔ اور اس انجمن کی سند مستند سمجھی جاتی ہے۔ بغیر کسی اکاڈمی کے مالی تعاون کے اور بغیر کسی سرکاری یا غیر سرکاری مدد کے عرصہ دراز سے یہ اردو کی چلتی پھرتی انجمن کام کر رہی ہے۔ نہ ستائش کی تمنا اور نہ صلہ کی پرواہ —! آئیے ہم اس انجمن کے تصورات اور خیالات کا خیر مقدم کریں اور "حدیثِ دل" کو اپنے سینے کی رحل کی زینت بنا لیں۔

(بقیہ:- ڈاکٹر حفیظ وارثی)

آج ہر گوشۂ صحرا ہے گلستاں بہ کنار
تیز ہے قافلۂ وقت کی ہر سو رفتار
ہم غریبوں کا وہی حال ہے لیکن سرکار

بات کیا ہے جو شمار اپنا ہے معتوبوں میں
ذکر تک اپنا نہیں ہے آپ کے منصوبوں میں

"بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے" اس لئے بقول جناب اختر قادری۔ "... کیا عجب کہ قیصر عثمانی کی یہ نظم محض ان کے ذوق سخنوری کی تسکین کے علاوہ "پرچھائیوں کے دیس" میں ایک نئے فکری انقلاب اور تعمیری اقدام کا پیش خیمہ ہو اور اس طرح یہ نظم اپنی فنی، شعوری اور ادبی کامیابیوں کے ساتھ تعمیری اور انقلابی کارنامہ بھی بن جائے..."

(بقیہ:- احمد قادری)

جو تباہی و بربادی کی جانب جاتا ہے۔ اور اس راہ پر چلتے چلتے کامنی پوری طرح اس دہانے پر پہنچ جاتی ہے۔ جس دہانے پر پہنچنا ممبئی شہر کی ایسی لڑکیوں کا مقدر بن جاتا ہے، اور جیون ساتھی بننے کے وعدہ کرنے والے اور جنم جنم ہاتھ اور ساتھ نہیں چھوڑنے کا وعدہ کرنے والے اس کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں۔

بمبئی کی اس گندی اور بے حس زندگی کو قیصر عثمانی نے جس خوبصورتی اور چابک دستی سے پیش کیا ہے، وہ صرف قیصر عثمانی کا حصہ ہے۔

حالانکہ یہ ناولٹ برسوں قبل تصنیف کیا گیا تھا لیکن آج کے حالات میں اس ناولٹ کی صداقت زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ قیصر عثمانی نے سماج کے اندر اس ماحول کو پیش کر کے بلاشبہ وقت اور حالات کے کینسر کی نشاندہی کی ہے جس کے لئے قیصر عثمانی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

(بقیہ:- شیدا امام)

[illegible]

بڑے بھائی

قیوم اثر

بھائی صاحب پر مضمون لکھنے میں مجھے تامل ہو رہا تھا۔ اس لئے میں نے گریز کے سبھی پہلو اپنائے۔ لیکن فاضل مدیر سہیل کے پیہم اصرار کے سامنے میری ایک نہیں چلی۔ مجھے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہونا پڑا۔ جناب سید عبدالحئی جو ادبی دنیا اور فلمی دنیا میں اپنے تخلص "قیصر عثمانی" کے نام سے معروف شخصیت ہیں۔ میرے اپنے بڑے بھائی ہیں۔ وہ عمر میں مجھ سے قریب تین سال بڑے ہیں۔ عمر کے اس تفاوت کے باوجود ہم دونوں ایک دوسرے کے بے تکلف دوست ہیں۔

گرچہ بھائی صاحب اور میں دو ماؤں کی کوکھ سے پیدا ہوئے ہیں۔ پھر بھی ہم دونوں کے درمیان سوتیلا پن کی کوئی دیوار کھڑی نہیں ہو سکی والد مرحوم نے ہمارے لئے ایک معقول جائیداد چھوڑی تھی۔ البتہ اس کی تقسیم کے سلسلے میں خفیف بدمزگی ہمارے رشتے میں پیدا ہوئی تھی۔ لیکن یہ لمحاتی بدمزگی تھی۔ جلد ہی ختم ہو گئی اور ہمارے آپسی لگاؤ بدستور قائم ہو گیا۔ یہ بھی سچ ہے کہ ہماری ماؤں میں آپسی بناؤ نہیں تھا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ میری والدہ مجھے اپنے ساتھ لے کر گاؤں چلی گئیں۔ اس لئے میری تعلیم کا سلسلہ دینیات کے مکتب سے شروع ہوا اور وہیں مزید تعلیم کے لئے مڈل اسکول میں داخل کیا گیا۔ اس طرح میں اور والد صاحب ایک ہی چھت کے نیچے بہت کم رہے ہیں۔ والد کے انتقال کے بعد بھی ہمارے درمیان بُعد مکانی قائم رہا ہے۔ ۱۹۳۹ء میں میں کلکتے گیا۔ بھائی صاحب اس وقت پٹنے سے گیا آ چکے تھے۔ ۱۹۴۰ء کو میں کلکتے سے پٹنہ آ گیا۔ تقریباً انہیں دنوں بھائی صاحب کلکتہ کو چلے گئے، پھر بمبئی۔ جہاں آج بھی ہیں۔

ہمارے والد بزرگوار سید شاہ عبدالعزیز آزاد اپنے زمانے کے

معروف، ہردل عزیز اور بھاری بھرکم شخصیت کے مالک تھے۔ وہ قدامت پرست تھے۔ ان دنوں قدامت پرستی شریف اور معزز خانوادوں کی علامت تھی اور یہ نظر احسن دیکھی جاتی تھی۔ ہمارے والد ذی علم بزرگ تھے۔ ان کی عربی فارسی، اردو اور انگریزی دانی کا سکہ لوگوں کے دل پر جما ہوا تھا۔ دینی علوم پر بھی ان کی پکڑ مضبوط تھی۔ تفسیر، حدیث، منطق اور فقہ پر اچھی نگاہ تھی۔ انہیں شعروادب کا بہت ستھرا ذوق تھا۔ ان کے علم اور فضیلت کی دور دور تک شہرت تھی۔ فارسی اور اردو ادب سے خصوصی لگاؤ تھا۔ وہ فارسی اور اردو کے شاعر بھی تھے۔ جناب سید عبدالحیٔ قیصر عثمانی نے ایک ایسے ہی محترم و مغتنم خانوادے میں اپنی آنکھ کھولی اور والد بزرگوار نے اپنا تمام تر علم اور خوبیاں اپنے چہیتے بیٹے میں منتقل کرنے پر اپنی پوری توجہ مرکوز کی۔

بھائی صاحب مقامی مدرسہ انوارالعلوم گیا میں ابتدائی تعلیم کے لئے داخل کئے گئے۔ عربی، فارسی اور اردو انہوں نے اسی مدرسہ میں پڑھی۔ پھر انہیں انگریزی تعلیم کے لئے قاسمی مڈل اسکول (گیا) میں داخل کرا دیا گیا۔ اور سال دو سال کے بعد وہ ہری داس سیمنیری (ٹاؤن اسکول گیا) کے درجہ ششم میں داخل ہو گئے اسی اسکول سے بھائی صاحب نے ۱۹۳٦ء میں سکنڈ ڈویژن سے میٹرک کا امتحان پاس کیا پھر مزید کالج کی تعلیم جاری رکھنے کی غرض سے انہیں پٹنہ بھیج دیا گیا۔

اپریل ۱۹۳۹ء میں اچانک مشفق باپ کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا۔ باپ کا سایہ کیا اٹھا کہ ان کی دنیا اندھیری ہو گئی۔ والد مرحوم کے انتقال کو ابھی کم و بیش دو سال ہی گذرے تھے کہ ان کی والدہ محترمہ بھی اس دار فانی سے رخصت ہو گئیں۔ ماں کی رخصت کے بعد بھائی صاحب کے پیروں تلے سے بچی کھچی زمین بھی نکل گئی۔ وہ بالکل ہی بے سہارا ہو گئے۔ کالج کی تعلیم کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر وہ پٹنے سے گیا آ گئے۔ ان کی زندگی کی کشتی بیچ منجدھار میں ہچکولے کھانے لگی۔ اب وہ ایک ایسی کشتی پر سوار تھے جس کا کوئی ناخدا نہیں تھا اور پتوار بھی ٹوٹ گیا تھا۔ ناز و نعم میں پلے سید عبدالحیٔ کا اس بھری پری دنیا میں والی اور مددگار نہیں تھا۔ بچپن سے اپنی جوانی تک وہ جس طور سے لاڈ سے پالے گئے تھے اس نے ان میں حوصلہ اور طوفان بلا سے مقابلے کی صلاحیت پیدا نہیں ہونے دی تھی۔ ان کی آنکھوں تلے اندھیرا چھایا ہوا تھا کہ اچانک بجلی کوندی۔ تھوڑی روشنی ملی اور ایک راستہ نمودار ہوا۔ تب وہ آگے کی طرف بڑھے۔

حضرت بسمل شمشہاروی نے گیا شہر سے ایک ادبی ماہنامہ جاری کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس مجلہ کے لئے انہیں ایک پڑھے لکھے لائق ہونہار معاون کی جستجو ہوئی۔ ملک کے ممتاز اردو جرائد میں آئے دن شائع ہونے والی قیصر عثمانی کی نگارشات بسمل صاحب کی نظروں سے گذر رہی تھیں۔ سید عبدالحیٔ قیصر عثمانی کو وہ سید شاہ عبدالعزیز آزاد کے واسطے سے بھی بخوبی جانتے تھے۔ چنانچہ بسمل صاحب کی نظر انتخاب قیصر صاحب پر گئی جو ان دنوں گیا شہر میں بڑی ابتلا میں پڑے اپنی زندگی کے دن کاٹ رہے تھے۔ ۱۹۴۳ء میں بسمل صاحب کے منجھلے صاحب زادے عارف شمشہاروی اور قیصر عثمانی کی مشترکہ ادارت میں رسالہ سہیل آب و تاب کے ساتھ گیا کے ادبی افق پر طلوع ہوا۔ عارف اور قیصر کی یہ "جگل جوڑی" سہیل کے لئے بڑا نیک فال ثابت ہوئی — بر جستہ شاہد — ملک کے طول و عرض میں اس رسالے کی بڑھ چڑھ کر پذیرائی ہوئی۔ علم دوست حلقوں میں ادبی جریدہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ رسالہ سہیل کی اس بے مثال مقبولیت میں قیصر عثمانی صاحب کی ان تھک محنتوں، لگن اور مدیرانہ صلاحیت کا بڑا عمل دخل تھا۔

چوں کہ اس دنیا میں قیصر صاحب کا کوئی سرپرست نہیں رہ گیا تھا وہ خود کو بہت اکیلا محسوس کرنے لگے تھے۔ اور یہ احساس بڑھتے بڑھتے دوزخ مصیبت بن گیا تھا۔ گیا شہر انہیں راس نہیں آرہا تھا۔ اسے چھوڑ کر وہ دور بہت دور چلا جانا چاہتے تھے۔ وہ اس شہر سے پوری طرح اوب چکے تھے۔ ناخدا کے بغیر ان کی زندگی کی کشتی ساحل کی گویا تھی اور ساحل نظروں سے اوجھل تھا۔ اس عالم میں سنہ ۱۹۴۱ء میں وہ گیا چھوڑ کر کلکتے گئے۔ محض اتفاق تھا کہ فضل برادران سے ان کا تعلق پیدا ہو گیا اور بھائی صاحب فضل برادران کی فلم کمپنی میں بحیثیت پبلسٹی آفیسر کام کرنے لگے۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فلمی دنیا سے منسلک ہو کر رہ گئے۔

وہ بڑی منحوس ساعت تھی جب قیصر صاحب نے پہلے پہل فلمی دنیا میں اپنا قدم رکھا تھا۔ فلمی دنیا نے قیصر صاحب کی آگے کی راہ مسدود کر دی۔ فلم جگت نے انہیں اور ان کے متعلقین کو دو وقت کی روٹی ضرور فراہم کی ہے لیکن اس دو روٹی کے عوض ان سے ان کا ادبی مال و متاع تو ان کا اصل سرمایہ تھا چھین لیا۔ زندگی کے لئے روٹی کی ضرورت سے کون کافر انکار کرے گا۔ لیکن محض روٹی زندگی کا مقصود ہرگز نہیں ہے۔ یہ زندگی کا ماحصل نہیں ہے۔ قیصر صاحب کو فلمی دنیا کی دو روٹیاں بہت مہنگی پڑی ہیں۔ قدرت نے جو انہیں صلاحیت ودیعت کی تھی۔ ان کے ذمہ ملک سماج، ادب، تہذیب کے جو تقاضے عائد کئے تھے وہ سب تشنہ کام رہ گئے۔ ہر چہار جانب سے العطش العطش کی آواز اٹھ رہی ہے۔ خدا جانے یہ آواز کبھی قیصر عثمانی صاحب کو کبھی سنائی دی ہے یا نہیں۔ ان کا احساس کبھی جاگا؟ کبھی اس سے مراجعت کی کوشش بھی انہوں نے کی؟ ان سوالوں کا جواب قیصر صاحب ہی دے سکتے ہیں۔ میری آنکھیں ماضی اور حال کے آئینے میں جس طور دیکھ رہی ہیں ان کا چند لفظوں میں اظہار ضروری ہے۔ "پرچھائیوں کے دیس" کے خالق اور "حدیث دل" کے مصنف و مرتب سے ہم نے اس سے بہت زیادہ کی توقعات وابستہ کی تھی۔ ہمیں اس کے عوض سمندر سے محض ایک بوند ملی ہے۔ اس زاویئے سے دیکھئے تب اندازہ ہوگا کہ قیصر عثمانی صاحب نے فلم کی دنیا میں جا کر ہم سب کو بہت مایوس کیا ہے۔ "پرچھائیوں کا دیس" پڑھ کر آپ اتفاق کریں گے کہ قیصر عثمانی میں ایک کہنہ مشق شاعر کی سبھی خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ زبان اور فن پر ان کو قدرت حاصل ہے۔ اس کے بعد قیصر عثمانی کی ادبی تخلیقات تلاش کیجئے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ فلموں کی کامیاب پبلسٹی، فلمی شخصیتوں پر ادھر ادھر "شمع" "بیسویں صدی" جیسے رسالوں میں چھپے چند مضامین اور بس۔ قیصر عثمانی صاحب کی کل یہی پونجی ہمیں ملتی ہے۔ ایک ایسے شاعر اور ادیب کا جس نے ادبی زندگی کی ابتدا اپنی کم عمری میں کی تھی۔ قیصر عثمانی (تب وہ سید عبد الحئی تھے) کا سب سے پہلا مضمون "کلکتے کی سیر" الہ آباد سے شائع ہونے والے ماہنامہ "بچوں کی دنیا" میں شائع ہوا تھا۔ ایک دن ان کی زبان پر "یہ اردو زبان ہندوانوں کی جان ہے" کا مصرعہ آگیا۔ ذرا دیر بعد انہوں نے اس میں دوسرا مصرعہ جوڑا اور شعر ہو گیا۔ "اسے کون روکے یہ جوئے رواں ہے" انہیں اس کے آگے کی جستجو

ہوئی اور دس گیارہ اشعار کی ایک نظم دوسرے دن تیار ہو گئی جو پورنیہ سے شائع ہونے والے رسالے "طالب" میں نمایاں طور سے چھپی۔ قیصر عثمانی نے اپنے پیر باہر نکالے ان کی تخلیقات مقتدر رسالوں میں جگہ پانے لگی: "ادب لطیف" لاہور میں ان کے افسانے پابندی سے چھپنے لگے۔ تھوڑے ہی عرصے میں انہوں نے ادبی دنیا میں اپنی جگہ بنالی۔ حضرت بسمل نے قیصر عثمانی کی صلاحیتوں کا اندازہ انہیں تخلیقات کو پڑھ کر لگایا تھا۔ اور متاثر ہوئے تھے۔ سہیل جیسے پایہ کے ادبی رسالے کی کامیاب ادارت نے قیصر عثمانی کی صلاحیتوں کا سکہ پوری طرح جما دیا۔ نثر، نظم اور غزل، یہ سبھی صنف ادب قیصر عثمانی کی جولاں گاہ تھی۔ وہ ادب کی ان اصناف میں یکساں رفتار سے آگے کی طرف بڑھ رہے تھے کہ اچانک کسی کی نظر بد ان کو لگ گئی۔ وہ فلم کی دنیا سے جڑ گئے۔ ادب کی دنیا سے انہوں نے تقریباً رخصت لے لی۔ ادب سے برائے نام رشتہ باقی رہ گیا۔ یہ ان کی پرانی کمائی ہے کہ لوگ انہیں یاد رکھے ہوئے ہیں۔ اس وقت ادب کی دنیا میں وہ بطور مردہ بہ دست زندہ باقی ہیں۔

قیصر عثمانی نے فلم جگت میں صرف کھویا ہے۔ وہ وہاں ایک "مس فٹ" (MISFIT) پرزہ ہیں۔ چار دہائی سے اوپر کی بات ہے۔ ۱۹۴۶ء کا اوائل تھا۔ جے پرکاش نرائن کے اوجنٹ بلاوے پر میں پہلی بار بمبئی گیا تھا۔ آل انڈیا ریلوے مینس فیڈریشن کی مجوزہ کل ہند ہڑتال کے سلسلے میں ضروری مشورہ کرنا تھا۔ بمبئی شہر میں واقع "جناح ہال" (بمبئی صوبائی کانگریس کا صدر دفتر) میں میرے قیام کا بندوبست کر دیا گیا تھا۔ میں وہیں جا کر ٹھہرا۔ بھائی صاحب کلکتے سے منتقل ہو کر بمبئی

پہنچ چکے تھے۔ میں اپنی روانگی کی اطلاع انہیں [illegible] سکا تھا۔ میں فرصت پا کر ملاقات کے لئے ان کی قیام [illegible] دادر گیا۔ بھائی صاحب اور احسن رضوی دانا پور [illegible] ہی کمرے میں رہتے تھے۔ بھائی صاحب کے چند فلمی ا[illegible] بھی وہاں موجود تھے۔ ان میں ایک حبیب شاہین [illegible] حبیب شاہین نے فضلی برادران کی مشہور سماجی فلم [illegible] میں اپنی مختصر لیکن کامیاب اداکاری کے لئے اچھا نا[م] [illegible] تھا اور ان کی آواز کا جادو سامعین کے دل پر چل[تا] [illegible] بمبئی میں اس دن کی نشست بھی حبیب شاہین نے [illegible] صاحب کو رنگا رنگ اور بھدی بھدی گالیاں دی[ں] [illegible] ہی سانس میں وہ بھائی صاحب کی سات پشت کو ا[illegible] نشانہ بنا رہے تھے۔ میرے لئے وہ منظر دیدنی تھا۔ ا[یک] طرف حبیب شاہین کی گالیاں اور پھٹکار اور دوسری ط[رف] بھائی صاحب کی سپردگی۔ لگتا تھا بھائی صاحب [illegible] سونگھ گیا ہے۔ سامعین بیچ بیچ میں بھائی صاحب [illegible] ہنسی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ بھائی صاحب [illegible] حبیب شاہین کا فیصلہ تھا کہ فلمی دنیا کو ایسے نیک، بج[illegible] ضرورت نہیں ہے۔ فلمی دنیا میں کامیابی کی کنجی جھ[وٹ] بے ایمانی، ریا اور منہ زور ہونے میں پوشیدہ ہے۔ قیـ[صر] میں یہ صفتیں نہیں ہیں اس لئے انہیں واپس لوٹ جانا چاہئے اور واپس جا کر اپنے باپ دادا کی خانقاہ کو [illegible] کرنا چاہئے۔

طویل عرصہ گذر گیا اس واقعہ کو — حبیب شاہین کی بات کی صداقت دھندلائی نہیں بلکہ زیادہ نکھر کر ہمارے آپ کے سامنے ہے۔ بھائی صاحب جگت کے ریس میں ایک نان اسٹارٹر (Starter [illegible] گھوڑے کے مانند آج بھی کھڑے نظر آتے ہیں۔ حبیب [illegible]

زندہ باد!

سید شاہ عبدالعزیز ہمارے والد بزرگوار پرانے خیال کے راسخ العقیدہ بزرگ تھے اور قدامت پرستی کا جیتا جاگتا عمدہ نمونہ ۔۔ ان کی زندگی میں بھائی صاحب ہرگز فلمی دنیا کا رُخ نہیں کرتے۔ یہ بات مجھ پر بھی صادق آتی ہے۔ ابا مرحوم کی زندگی میں ٹریڈ یونین اور ملکی سیاست میں میری شمولیت ناممکن تھی۔ والد مرحوم کے انتقال کے بعد ہم سانڈ کے بیٹے سانڈ بن گئے۔ اور ہم نے اپنی مرضی کی دنیا آباد کی۔ لیکن ہم مانتے ہیں کہ ہم نے والد مرحوم کی روح کو تکلیف پہنچائی۔

بھائی صاحب ایک بہت اچھے انسان ہیں۔ ریا اور دنیا داری جسے آج کی دنیا کامیابی کی کلید مانتی ہے اس سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں رہا ہے۔ بہت کم لوگ ہیں۔ مزاج میں ضرورت سے زیادہ انکسار ہے۔ لیکن ذود رنج اور کان کے تیلے واقع ہیں۔ ان سے اپنے رشتے کو بچائے رکھنے کے لئے احتیاط لازم ہے۔ یہ "وجہ بتاؤ" نوٹس کے بغیر بھی اگر آپ سے اپنا رشتہ منقطع کرلیں تو اس میں حیرت کی بات نہیں ہے۔ تصنع اور بناوٹ ان میں بالکل نہیں ہے۔ ان کا اندر اور باہر ایک ہے۔ نیک دل اور نیک سیرت ہیں۔ وہ ایک نوزائیدہ بچے کی مانند معصوم ہیں۔ نسیان کے پرانے مریض ہیں۔ نام اور چہرے انہیں یاد نہیں رہتے ہیں۔ کچھ لوگ اس بنا پر انہیں خبطی سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ نادرست ہے۔ بھائی صاحب ہمیشہ ہمیشہ کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں۔ ابرار بھائی مرحوم (ایڈوکیٹ گیا) بھائی صاحب کو "حقیقۃً مسافر" کہتے تھے بھائی صاحب کو عملی سیاست سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ لیکن سُرخ پھریرا اس پر ہنسیا ہتھوڑے کا نشان بنا ہو یا ستارے کا کوئی بھی نشان ہو ان کا محبوب جھنڈا ہے۔ سرخ جھنڈا! ان کی نگاہ میں غریبوں، کسانوں اور مزدوروں کی نمائندگی کرتا ہے۔

ایک دلچسپ بات بھائی صاحب سے متعلق سنئے اور اپنے سر کو دھنئے۔ بھائی صاحب ایک سیدھے سادے سچے مسلمان ہیں اور وہ کسی مسلک سے بندھے ہوئے نہیں ہیں ۱۹۵۰ء یا اس کے آس پاس کی بات ہے۔ رحمت اللہ میاں (مولانا فضل الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ گنج مراد آبادی کے پوتے) اپنے مریدوں کے بلاوے پر گیا آئے ہوئے تھے۔ وہ خواجہ رحمت نور کی کوٹھی 'نورستان' میں مقیم تھے اسی جگہ یہ بتانا ضروری ہے کہ ہمارے والد محترم سید شاہ عبدالعزیز کو مولانا فضل الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھی اور ان کے بیٹے اور خلیفہ احمد میاں علیہ رحمۃ سے خلافت ملی ہوئی تھی۔ قصہ مختصر بھائی صاحب رحمۃ اللہ کا نیاز حاصل کرنے گئے تھے۔ لیکن وہاں سے ان کے مرید ہو کر لوٹے یعنی آگ لانے گئے تھے پیغمبری لے کر واپس آئے۔ مرید ہونے کے بعد کچھ دنوں تک نماز اور وظیفہ چلا پھر اپنی اصلی حالت پر آگئے۔ کہاں کا روزہ نماز۔ کیسی ابھی تو شغل شراب میں ہوں۔

بھائی صاحب نے اب پھر نماز شروع کی ہے۔ اب ان کی نماز کا رنگ دوسرا ہے۔ وہ رات دیر گئے تک جاگتے ہیں۔ اس لئے ان کی صبح دیر سے ہوتی ہے۔ بیدار ہو کر وہ ضروریات سے فارغ ہوتے ہیں اور مصلے پر کھڑے ہو کر فجر کی دو رکعت قضا نماز ادا کرتے ہیں۔ پھر کچھ دیر تسبیح کے دانوں پر ہاتھ پھیرتے ہیں۔ ان سے فارغ ہو کر وہ اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر بندگان دین اور خلقاً کہ مرحومین کے مغفرت کی اللہ میاں سے دعائیں مانگتے ہیں۔ یہ سلسلہ دیر تک چلتا ہے۔ اللہ میاں کے حضور وہ بہتیرے نام گنواتے ہیں۔ ایک لمبی فہرست ہے اس لئے دیر ناگزیر ہے۔ ان کی اس فاتحہ خوانی میں ہیپ کا بند فلم کی مشہور اداکارہ "مینا کماری" کا نام ہے۔ خدا بخشے

قیصر عثمانی — اور — پرچھائیوں کا دیس

ڈاکٹر حفیظ وارثی

قیصر عثمانی سے شاید آپ واقف ہوں۔ اگر آپ واقف ہیں تو یہ آپ کی ہمہ گیر نظر اور آپ کے وسعتِ مطالعہ کا ثبوت ہے کیونکہ قیصر عثمانی آسمانِ شعر و ادب اور فلمی دنیا کا وہ ستارہ ہیں جو کہکشاں کی محفلِ خاص میں تو نظر آجاتے ہیں مگر ستاروں کی محفلِ عام میں نہیں۔

آیئے میں ان کی واضح اور صحیح خد و خال سے آپ کو اور ہر خاص و عام کو روشناس کراؤں تاکہ وہ پھر ستاروں کے جھرمٹ میں نہ گم ہو جائیں اور آپ انہیں ڈھونڈھنے میں تھک نہ جائیں۔

جسے زمانہ قیصر عثمانی کے نام سے پکارتا ہے وہ دراصل ایک قلمی نقاب ہے جس کے پیچھے صحیح شخصیت چھپی ہوئی ہے۔ اور اس شخصیت کا اصل نام ہے عبد الحیٔ — جی ہاں، زندگی کا خادم، جس نے اپنی خدمات کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا — اپنی بے لوث خدمت اور بے ریا محبت کا معاوضہ نہیں وصول کیا۔ بس چپکے چپکے اوائل عمر میں ہی شعر و ادب کو اپنا خون پلاتے رہے۔ اور پھر برسوں خون پسینے کو فلمی دنیا کو بنجر اور بے حس زمین پر بہاتے رہے۔

ان کا بلند و طویل قد و قامت ان کے اعلیٰ حوصلوں کا مظہر ہے۔ ا… کی لمبی اور مخروطی انگلیاں ان کی فنکاری کی غماز ہیں۔ ان کے پتلے ہونٹ ا… کی نفاست طبع کا احساس دلاتے ہیں۔ لمبی اور ستواں ناک عزت و عظمت کا نش… ہے۔ دو شیشوں کے شفاف پردے کے پیچھے بڑی بڑی گہری آنکھیں غور و ف… کا پتہ دیتی ہیں۔ بلند و کشادہ پیشانی ان کی صاف طبعی، زندہ دلی، روشن خی… اور ذہانت کا آئینہ ہے۔ اور سونے پر سہاگہ ان کے گھنگھریلے بال ان کی شخص… میں چار چاند لگاتے ہیں۔ شاید کبھی ان گھنگھروؤں کی بھول بھلیوں میں ر… راہ کھول بیٹھا ہوں —!

تو یہ ہے آپ کے سامنے جناب عبدالحئی کا قلمی خاکہ جن کا قلمی نام ہے قیصر عثمانی ۔۔ اس خاکہ میں قلم سے رنگ بھرنا تو ممکن نہیں۔ یہ کام آپ کی آنکھیں ہی بہتر طور پر انجام دے سکتی ہیں۔ ویسے میں ان کے مزاج و عادات کے چند رنگ ضرور دکھا سکتا ہوں۔

اگر آپ انہیں خط لکھیں تو وہ جواب ضرور دیں گے لیکن اگر آپ شکایت کریں کہ آپ کو جواب سال بھر بعد ملا تو یہ آپ کی زیادتی ہوگی۔ اگر آپ بن بلائے مہمان کی طرح ان کے گھر جا دھمکیں تو وہ آپ سے انتہائی مرعوب ہو کر اپنا گھر بار، کھاٹ بستر اور ہانڈی برتن آپ کے حوالے کر دیں گے۔ اور ایسا معلوم ہوگا کہ آپ صاحب خانہ ہیں اور وہ بن بلائے مہمان۔ ان کے نام پر اگر آپ نے کسی دکان سے کچھ سامان لے لیا ہے تو وہ بعد میں بہ خندہ پیشانی اپنی جیب سے ادا کر دیں گے اور آپ کا شکریہ بجا لائیں گے کہ آپ نے انہیں کسی قابل تو سمجھا۔ اگر ان کے چھوٹے عزیز بھی ہیں تو وہ آپ کو سگریٹ پیش کریں گے اگر آپ ازراہ عجز و خاک انکار کریں گے تو کہیں گے " اماں پیو۔ میں ان سب تکلفات اور رسمیات کا قائل نہیں"۔ آپ چھوٹے عزیز ہوتے ہوئے بھی آپ کو " مائی ڈیر" اور " صاحب" سے یاد کریں گے۔ جب کبھی وہ وطن آئیں گے تو ہر اپنے بیگانے اور چھوٹے بڑے کو ان کے گھر پر پورسش کر کے گرفتار گفتگو کرنے کی سعی کریں گے۔ اور جو دستیاب نہ ہو سکیں گے۔ ان پر طرح طرح حملے جاری رہیں گے۔ اور لگا ہوا میں خواجہ خضر کے ہمعصر نظر آتے تھے۔

ہاں تو آپ ہیں گمنام عبدالحئی اور معروف زمانہ قیصر عثمانی۔ عبدالحئی کو گمنام بنانے میں آپ ہی کا دست کرم کو دخل ہے۔ والد کا عطا کردہ نام پسندِ خاطر نہ آیا اور اپنے لئے خود قیصر عثمانی کا لقب اختیار کر لیا۔ مگر اب ان کی عظمت یاد کر کے الیس۔ اے ۔ایچ۔ قیصر عثمانی لکھنے لگے ہیں۔ تو آپ ہیں پورے طور پر ۔۔ سید عبدالحئی قیصر عثمانی۔

آپ ۲۰ دسمبر ۱۹۱۹ء کو بہار کی واجد حانی پٹنہ کے مشہور و معروف محلہ رمنہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام سید شاہ عبدالعزیز تھا جو ایک قادر الکلام شاعر تھے اور آزاد تخلص کرتے تھے۔ ان کا اصل وطن پیر بیگہ ہے جو شہر گیا سے چھ سات میل اتر پچھم واقع ہے۔ یہاں حضرت عثمان ذی النورین کی اولاد آباد ہے۔ یہ بستی اپنی دینی، روحانی علمی اور ادبی خدمات کی وجہ سے ممتاز رہی ہے۔ حضرت آزاد بہ سلسلۂ ملازمت گیا آئے اور محلہ کریم گنج میں قیام پذیر ہو گئے جناب آزاد پیر بیگھوی، حضرت باقر حسین باقر کے شاگرد تھے اور حضرت باقر غالب کے شاگرد تھے۔ گویا حضرت آزاد کا سلسلہ تلمذ حضرت غالب سے ملتا ہے جن کی آغوش تربیت میں قیصر عثمانی نے شاعرانہ شعور حاصل کیا اور ان کی ہدایت میں اسے پختہ تر کیا۔ گویا شاعرانہ ذوق انہیں ورثہ میں ملا ہے۔ جو ان کی رگ و پے میں سرایت ہے۔

قیصر عثمانی کا ادبی پہلو ہمہ رنگ ہے۔ شاعری ان کا وجدانی جوہر ہے۔ افسانہ نویسی سے خاص شغف ہے، ناولٹ بھی لکھ چکے ہیں۔ اور صحافت کے بھی مرد میدان رہ چکے ہیں۔ ادارت و نقد و تبصرہ بھی ان کی ادبی زندگی کا ایک گوشہ رہ چکا ہے جبکہ ۱۹۳۹ء میں گیا سے مشہور رسالہ "سہیل" کا اجرا ہوا۔ دسمبر ۱۹۴۱ء سے انہوں نے باقاعدہ فلمی زندگی اختیار کر لی اور پہلے پہل کلکتہ میں فضلی برادرس نام کی فلم کمپنی میں بہ حیثیت پبلسٹی آفیسر مقرر ہوئے اور انہیں کے ساتھ بمبئی پہنچ گئے۔ کچھ چند سال بعد فضلی برادرس کے پاکستان چلے جانے کے بعد وہ کوہ نور سنے کارپوریشن میں پبلسٹی آفیسر و سکریٹری اور معاون ہدایت کار کی حیثیت سے

اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ جس نے "آنکھیں" "آنسو" "چراغ کہاں روشنی کہاں" "دور کی آواز" "دس لاکھ" اور "ایک پھول دو مالی" جیسی اچھی اور معیاری فلمیں پیش کی ہیں۔ تب سے اب تک فلمی ماحول اور وہاں کی زندگی کا انہوں نے بغور اور عملی مطالعہ کیا ہے۔ اس چوتھائی صدی سے بھی زیادہ عرصہ کے تجربے نے وہاں کے تمام نشیب و فراز، سارے ظاہر و باطن اور ہر روشن و تاریک گوشے کا انہیں راز داں بنا دیا۔

"پرچھائیوں کا دیس" ان کے اسی چوتھائی صدی کے تجربوں کا نچوڑ ہے۔ اور ان کی پرفکر صلاحیت اور قادر الکلامی کا بین ثبوت بھی۔ "پرچھائیوں کا دیس" ان کی طویل نظم ہے جس میں انہوں نے قریب قریب پوری فلمی دنیا اور وہاں کے فن کاروں کا مرقع کھینچ دیا ہے۔ اس نظم کا ایک چھوٹا سا حصہ "فلم نامہ" کے عنوان سے سب سے پہلے جناب قیوم خضر کی ادارت میں پٹنہ سے نکلنے والا اردو ماہنامہ "اشارہ" اگست ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا تھا جو بے حد مقبول ہوا تھا۔ اس کے بعد مکمل نظم قسط وار "پرچم ہند" (دہلی) میں چھپی اور یہی مقبولیت کتاب کے وجود کا نتیجہ بنی۔

آئیے، ان کی نظروں سے ہم بھی ان کے "پرچھائیوں کے دیس" کی سیر کریں اور دیکھیں کہ یہ خیالی جنت کیسی ہے جہاں سب کچھ ہے۔ ارضی باغ ارم بھی ہے اور جنت کے نظارے بھی۔ خوبصورت اور پری پیکر حوریں بھی ہیں اور زمرّدیں و زرکار قصر بلّوریں بھی۔ نہر بھی ہے اور مرغزار بھی۔ کوہ بیاباں بھی اور جنت کے نظارے بھی۔ ابر ستاں بھی ہے اور طوفان بھی۔ برق و رعد کے جھماکے بھی ہیں اور اس کی گھن گرج بھی۔ خورشید کی ضیا باری بھی ہے اور قمر کی نور پاشی بھی۔ ستاروں کی جھلملاہٹ بھی ہے اور رات کی نشیلی سیاہی بھی۔ اور یہ سب ایک انسان کے اشارے پہ پیدا ہو جاتے ہیں ؎

اک اشارے میں یہاں ہوتے ہیں طوفاں پیدا
بجلیاں، ابر، دھنک، چشمۂ حیواں پیدا
جھیل تالاب ندی کوہ و بیاباں پیدا
اور بھی کتنے ہی ہو جاتے ہیں ساماں پیدا

کالے پردوں پہ ستاروں کا چمکنا دیکھو
فلمی دنیا میں عجب میں نے تماشا دیکھا

اور یہ سب ہی حیرت بس کھنکتے ہوئے سکوں کی کرامات کی بات ہے۔ جہاں ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد

کے مصداق ؎

ہے یہاں شام و سحر بزم خرابات کی بات
آنکھوں آنکھوں میں فقط رمز و کنایات کی بات

اور ؎

حُسنِ یوسف ہے یہاں عشقِ زلیخا ہے یہاں
چاہِ کنعاں ہے یہاں طور کا جلوہ ہے یہاں

اس جنت ارضی کا وہ گوشہ بھی ملاحظہ کیجئے جو قصر ہمہ رنگ کی حیثیت رکھتی ہے اور جسے عرف عام میں اسٹوڈیو کہتے ہیں۔

مسکن حُسن و ادا جلوہ گہہ رقص و سرود
دلربا و طرب افزا یہ گلستان شہود
رشک فردوس ہر اک گوشۂ رومان آلود
رنگ و نکہت میں لفظ بندیٔ صنعت کی نمود

دیکھئے یہ "پرچھائیوں کا دیس" یہ فلمی دنیا کتنی حسین، کتنی پرُ ہے، کتنی دلکش اور کتنی خواب آور ہے۔ مگر کیا حقیقت بھی! ہے۔ اس کا جواب ڈاکٹر ظ۔ انصاری دیتے ہیں ۔

" بڑی دلکش ہے پرچھائیوں کے اس دیس میں۔ اس اندھیرے تار میں بندھے بندھے نہ جانے کتنے نازک اندام اور خوبرو فہم نوجوان پنجاب، یوپی، اور بہار سے کھنچے چلے آتے ہیں۔

اور موٹے تاروں کی اس چھلنی میں پڑ جاتے ہیں جس میں سے دانے دانے چھن کر نیچے آ پڑتے ہیں اور پھر پتہ نہیں کس کس طرح اپنے واپسی کا ٹکٹ کا انتظام کرتے ہیں اور کچھ جو اوپر کے تار میں پھنسے رہ جاتے ہیں ان کو رول کر فلم انڈسٹری (اگر اسے انڈسٹری کہہ سکیں) کے در و دیوار میں فٹ کر دیا جاتا ہے۔ ہر ایک کی قدر و قیمت اس بات سے طے پاتی ہے کہ کون کس سچویشن میں فٹ ہوا۔ آگے اس کی تدبیر اور تقدیر پر منحصر ہے؟

اور دراصل اس حقیقت کو پیش کرنے کے لئے قیصر عثمانی نے اپنی نظم میں پرچھائیوں کے دیس کی تصویر کشی کی ہے۔ اس حقیقت کی تلخی کچھ لوگوں کو ناگوار گذرے گی، کچھ لوگ اس کی کڑواہٹ سے برہم ہو جائیں گے مگر ان کے ڈر سے حقیقت نہیں بدلتی۔ سچائی سچائی ہی رہتی ہے۔ فلمی دنیا بس اصل کی نقل ہے۔ وجود کی پرچھائیں ہے۔ عکس ہے۔ تصویر ہے۔ چھایا ہے۔ یہی چھایا اس کی کائنات ہے، اس کا سرمایہ ہے اس کی دنیا ہے ؎

یہ وہ گلشن ہے جو خوشبو سے سدا خالی ہے
پیرہن کاغذی پہنے ہوئے ہر ڈالی ہے
جس طرف دیکھئے نقالی ہی نقالی ہے
حد تو یہ ہے کہ خزاں میں بھی ہریالی ہے
فصل گل میں بھی کبھی رنگ خزاں کا دیکھا
فلمی دنیا میں عجب میں نے تماشا دیکھا

یہاں بھی انسانی ہاتھوں کا کارنامہ ہے۔ انہیں کی صناعی ہے جو چند دنوں میں سدا بہار گلشن کی تخلیق کر ڈالتا ہے جس کے کاغذی پھول اس وقت تک نہیں مرجھاتے جب تک اس کا کام ختم نہیں ہو جاتا۔ موسم خزاں میں یہاں بہار کا سماں پیدا کیا جاتا ہے اور موسم بہار میں خزاں کا رنگ لایا جا سکتا ہے۔ جاڑے میں جھما جھم برکھا ہو سکتی ہے اور برسات میں خشکی پیدا کی جا سکتی ہے۔ یہ سب انسانی ہاتھوں کا کمال ہے۔ نقلی اور مصنوعی حکمتوں کی پیداوار ہے۔

یہ دنیا پیسے کی ہے۔ پیسہ اگر ہے تو سب کچھ خریدا جا سکتا ہے۔ پیسے کی یہ دنیا بالکل اندھی ہے اور کھوٹے کھرے کی تمیز نہیں۔ یہاں صرف چلنے والی چیزوں کے دام ملتے ہیں، صرف چڑھتے سورج کی پوجا ہوتی ہے ؎

آرٹ بکتا ہے یہاں شعر و ادب بکتا ہے
حسن بکتا ہے ادا بکتی ہے سب بکتا ہے
ناز بکتا ہے ادا بکتی ہے سب بکتا ہے
خوب ہر مال یہاں بکتا ہے جب بکتا ہے
کبھی چڑھتے ہوئے بازار کو گرتا دیکھا
فلمی دنیا میں عجب میں نے تماشا دیکھا

اور ؎

عقل عیار ہے اور عشق کی نادانی ہے
دام صیاد ہے طائر کی پَرافشانی ہے
دُرِ عصمت کی اک امید پہ قربانی ہے
آبرو کچھ بھی نہیں بہتا ہوا پانی ہے
جس کو دیکھا اسی سیلاب میں بہتے دیکھا
فلمی دنیا میں عجب میں نے تماشا دیکھا

فلمی دنیا جوار بھاٹا کا گویا ایک سمندر ہے جس میں ہر وقت اتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے۔ جب وقت کا جوار آتا ہے تو ایک ناچیز ذرہ بھی اُٹھ کر آسمان پر پہنچ جاتا ہے۔ اور جب اس کا اتار پستی کی طرف ہوتا ہے تو آسمان پر چمکتا ہوا ستارہ بھی ذرہ ہو کر زمین بوس ہو جاتا ہے۔ فلمی دنیا میں فلمی ستاروں کا عروج و زوال ایک حسرتناک ترقی و تنزل کی داستان ہے۔ جب وقت اچھا ہوتا ہے تو کسی کی نگاہِ التفات ایک ذرہ کو بھی موتی (مشہور اداکار موتی لال) بنا دیتی ہے اور

جب وقت خراب آتا ہے تو اس دنیا میں لعل وگوہر (جیدو لعل شاہ اور گوہر بانی) بھی اپنی قدر کھو دیتے ہیں کبھی ایک معمولی سی مینا (مشہور اداکارہ مینا کماری) بھی مینائے حسن وشباب بن کر لوگوں کو مدہوش کردیتی ہے۔ اور کبھی نگاہِ کرم کے پھرتے ہی بام ثریا بھی (مشہور اداکارہ ثریا) عرش سے فرش پر پہنچ جاتی ہے۔ اور خوبصورت نرگس لالہ (مشہور اداکارہ نرگس) روتے روتے اپنا جگر داغدار کر لیتی ہے۔ دیکھئے اوج وپستی کی یہ داستان کتنے اختصار اور دو معنی طور پر پیش کی گئی ہے ؎

کبھی ایک ذرہ ناچیز یہاں موتی ہے
قسمت لعل وگہر برسوں کبھی سوتی ہے
قلقلِ مینا ادھر راحتِ جاں ہوتی ہے
آنکھ نرگس کی ادھر شام وسحر روتی ہے

جو زمیں بوس ہے وہ بام ثریا دیکھا
فلمی دنیا میں عجب میں نے تماشا دیکھا

قیصر عثمانی نے جہاں اس فلم نگری کے تمام شعبوں اور فلم کی تمام یونٹ کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے ان کی خدمات کا بھی اعتراف کیا ہے اور ان کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ ان کا یہ انداز ان کی ترقی پسندی اور سرمایہ دارانہ نظام سے بیزاری کی دلیل ہے۔ دیکھئے پہاڑوں سے چشمے نکالنے والے کوہکن کے ہاتھ کس طرح زخمی ہیں اور ان کے لب کس طرح پیاسے ہیں ؎

ہر جگہ ہے وہی سرمایہ پرستی کا نظام
اپنی محنت کے نتیجوں سے ہیں محروم عوام
پیٹ خالی ہیں کہیں اور کہیں لبریز ہیں جام
کوہکن پر ہے مئے عشرت پرویز حرام

یعنی چشمے جو نکالیں انہیں پیاسا دیکھا
فلمی دنیا میں عجب میں نے تماشا دیکھا

غرض کہ قیصر عثمانی نے کسی پہلو کو فراموش نہیں کی نظم "پرچھائیوں کا دیس" کے مطالعہ سے کا آئینہ ہمارے سامنے آجاتا ہے جس میں سبھی چہرے واضح ہوجاتے ہیں۔ طوالت کا خوف تفصیلی طور پر نہیں دیتا اس لئے ارباب نظر خود ہی اس کا بات کا فیصلہ کرلیں۔ امید ہے ارباب ذوق اپنے ادب کو تسکین دینے اور فلمی دنیا کا مشاہدہ کر کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور مصنف کی پرسوز کاوشِ فکر کا خاطر خواہ انعام دیں گے جس کے اس پرچھائیوں کے دیس میں اور کتنے ہی نظا قابل دید ہیں۔ پروفیسر اختر قادری کے لفظوں ہی کہا جاسکتا ہے

"...... ہدایت کار، سنگیت کار، نغمہ اسٹوری رائٹر، کیمرہ مین، آرٹ ڈائریکٹر، فائن بورڈ، ہیرو ہیروئن، حکومت کے اربابِ حل" اس حمام میں ننگے نظر آتے ہیں لیکن یہ تصویر کھینچی گئی ہے ......"

فلمی دنیا میں جہاں کا باوا آدم ہی نرالا ہر بت ایک خدا نظر آتا ہے۔ ایک عجیب اف ایک عجیب من مانی ہے اور ایک عجیب اندھ ہے کہ ہماری آزاد حکومت بھی اس صنعت نہیں دیتی۔ محنت وسرمایہ میں توازن قائم نہ صنعت سے حکومت کو کافی ٹیکس ملتے ہیں۔ لیکن باوجود حکومت اس صنعت کے تحفظ وبقا کے نہیں اٹھاتی، کوئی سہولت نہیں دیتی۔ دیکھئے اور دردانگیز لہجے میں قیصر عثمانی نے ہماری سرکا ملک آزاد ہوا آگئی گلشن میں!

پرچھائیوں کا دیس

مدھوسودن

"پرچھائیوں کے دیس" کی سیر کی۔ یہ سیر عجیب پر لطف تھی۔ کبھی کبھی احساس ہوتا تھا کہ یہ محض پرچھائیوں کا دیس نہیں، آئینوں کا دیس ہے۔ جہاں جگہ جگہ اپنی یا اپنوں کی شکلیں آئینوں میں سے جھانکتی نظر آتی تھیں۔ کبھی ہنستی ہوئی، کبھی فاتحانہ، کبھی نادم اور سر جھکائے ہوئے

پرچھائیوں کے دیس کی خوبی محض یہی نہیں کہ اس میں شعری نفاست ہے، محض یہ بھی نہیں کہ یہ اشعار گوشۂ دل میں ایک ہم آہنگی کا احساس دلاتے ہیں۔ نہ محض یہ کہ یہ اشعار اس تجارتی دور میں فنکار کی توقیر کو برقرار رکھنے کے حق میں احتجاج کرتے ہیں۔

پرچھائیوں کے دیس میں یہ سب کچھ ہے اور بہت کچھ اور بھی، مجھے حیرت ہے کہ آپ نے خود اس دیس میں رہ کر کس طرح اپنے احساس کی شدت کو قائم رکھا ہے۔ یہ کچھ انسان کی فطرت ہے کہ جس ماحول میں رہتا ہے اس سے بہ تدریج بے حس ہوتا جاتا ہے لیکن آپ نے ان اشعار میں جس ادراک و احساس کا ثبوت دیا ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ نے اپنے شعور و حس دونوں کو ماحول کے ہاتھوں کند ہونے سے بچائے رکھا ہے۔ شاید یہی فنکار کی پہچان ہے۔ قیصر عثمانی کے اندر جو فنکار ہے اسے میری طرف سے گلے لگائے گا۔

"قیصر عثمانی کو میں نے بہت نزدیک سے دیکھا ہے اور
پڑھا ہے۔ آج پہلی مرتبہ ان کی طویل نظم "پرچھائیوں کا دیس" پڑھنے کا اتفاق ہوا۔
انہوں نے جس سچائی اور بے باکی کے ساتھ فلمی دنیا کی تصویر کھینچی ہے اس کے لئے میں انہیں
دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اردو کی اس خوبصورت کتاب کا ہندی
ایڈیشن بھی بے حد مقبول ہوگا۔"

اشوک کمار (فلم اسٹار)

"پرچھائیوں کا دیس" — میری نظر میں

قیصر عثمانی صاحب کی یہ شعری تصنیف "پرچھائیوں کا دیس" فلمی دنیا کی پرچھائیں نہیں لگتی، جیتی جاگتی تصویر معلوم ہوتی ہے۔ طرز بیان میں وہ زندگی ہے کہ میں پڑھ رہا ہوں اور یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میں دیکھ رہا ہوں۔ جس سچائی سے قیصر صاحب نے یہاں کے حالات شاعری کی زبان میں بیان کیا ہے اس سے ان کی بے باک طبیعت کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے دامن میں اس چمن کے پھول کم ہیں، کانٹے زیادہ نظر آتے ہیں — مجھے کہنے دیجئے یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہر کریکٹر اپنی صورت دیکھ رہا ہے۔

میں قیصر صاحب کو ان کے اس کارنامے پر مبارکباد دیتا ہوں۔

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

نیازمند —
دھرمیندر

"پرچھائیوں کے دیس" کے بارے میں قیصر عثمانی کی نظم ایک
انوکھی تخلیق ہے۔ ایک خوبصورت کارنامہ ہے۔"

پران (فلم اسٹار)

عبدالحئی ماموں —— سراپا محبت اور پیکر

طیب عثمانی ——————

آج قیصر عثمانی ادبی و شعری دنیا کا معروف نام ہے۔ حضرت بسمل سنسہاروی اور عارف سنسہاروی کے دور کا ادبی ماہنامہ سہیل گیا سے جناب قیصر عثمانی کی ادبی زندگی کی ابتدا ہوتی ہے، جب وہ "سہیل" کی ادارت سے وابستہ ہوئے پھر دو سال بعد فضلی برادران انہیں شعر و ادب کی وادی سے فلم کی دنیا میں کھینچ لائے اور قیصر عثمانی بمبئی کے ہی ہو کر رہ گئے اور گیا کی زندگی ایک بھولی بسری کہانی بن گئی۔

آج میری یادوں کے جھلملاتے سائے میں تقریباً نصف صدی پیچھے کے وہ دن یاد آرہے ہیں، جب میں اپنے اباجان کی انگلیاں پکڑ کر چھوٹے چھوٹے قدموں کے ساتھ کریم گنج میں اس وقت کے "عبدالحئی ماموں" کے مکان پر آیا کرتا تھا۔ تقریباً سات آٹھ برسوں کی عمر ہوگی، اردو رواں پڑھ لیتا تھا، عبدالحئی ماموں بڑی محبت سے ملتے، اباجان سے ہنسی مذاق کی باتیں کرتے اور مجھے بطور تحفہ الہ آباد سے نکلنے والا مشہور بچوں کا رسالہ "بچوں کی دنیا" کا کوئی نہ کوئی شمارہ ضرور دیتے۔ اس وقت وہ "سید عبدالحئی" تھے، ان کا نام رسالہ میں چھپا دیکھ کر اور مضمون پڑھ کر، میرے دل میں پڑھنے لکھنے اور چھپنے کی خواہش چٹکیاں لیتی اور مجھے ایسا احساس ہوتا ہے کہ میرے لاشعور میں بچپن کی وہی دبی ہوئی آرزو برگ و بار لائی اور پھر کتاب و قلم میری زندگی کا مقصد بن گیا۔ اس لحاظ سے عبدالحئی ماموں کا ادبی فیضان بھی مجھ پر رہا ہے۔

بمبئی کی چکا چوند کر دینے والی فلمی دنیا میں رہتے ہوئے، قیصر عثمانی کا شعر و ادب سے جو گہرا تعلق تھا، وہ ٹوٹا نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ قیصر عثمانی کی اصل شناخت وہی ہے جو انہیں اپنے والد جناب سید شاہ عبدالعزیز آزاد پیر بیگھوی رکن ادارہ "ندیم" گیا سے وراثت میں ملی تھی۔ وہی ادبی و اخلاقی روایت ان کے شعر و ادب کی بنیاد ہے۔ جناب قیصر عثمانی کے نئے مجموعہ کلام "حدیث دل" میں ان کی اسی ادبی روایت کا تسلسل نظر آتا ہے، جس میں فنی حسن، فکر کی تازگی، اور صالح روایت کی بالیدگی پائی جاتی ہے۔ تقریباً پانچ دہائیاں فلمی دنیا میں رہ کر، اس کے نشیب و فراز کی عکاسی ان کی شاہکار نظم "پرچھائیوں کا دیس" میں نظر آتی ہے۔ یہ نظم ان کی فکری بصیرت اور فنی مہارت کا آئینہ ہے۔

قیصر عثمانی ترقی پسندی کے اسٹیج میں

بودھ، وشنو اور منصورؔ کی دھرتی گیا دنیا کی تاریخ میں منفرد ا
مقام کی حامل رہی ہے، بودھ کو گیان گیا نے دیا، وشنو کے چرنوں کے ر
گیا نے اپنے سینے سے لگا کر امنٹ کر دیا۔ اور منصورؔ کو اپنے قلب م
دے کر شہر قطب کا روپ دیا جنہیں بلا تفریق مذہب و ملت ہر کس و
اپنی مراد کے بر لانے کا وسیلہ مانتے ہیں۔ مذہبی انفرادیت کا یہ شہر
ثقافتی، تہذیبی اور ادبی دنیا میں بھی لال و جواہر بکھیرتا رہا ہے۔ اور اد
گہوارہ بنا رہا ہے۔ اس کے جواہر پارے زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی فنی م
کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں۔ یوں تو گیا نے بڑی بڑی ادبی شخصیتوں کو
جنہوں نے ادب کے ہر صنف میں نمایاں مقام کیا۔ یہاں میں ایک ترقی
فنکار جناب قیصر عثمانی کی دہری حیثیت پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ جنہ
ادبی و شعری دنیا میں عظمت حاصل تو کی ہی، فلمی دنیا میں بھی وقار حاصل کر
جناب قیصر عثمانی کی پیدائش پیر بیگہ (گیا) کے ایک متمول تعلیم یا
خانوادے میں ہوئی، ادبی مزاج انہیں اپنے والد سید شاہ عبدالعزیز
صاحب سے وراثت میں ملی۔ بچپن سے جوانی تک کی سیڑھیاں انہوں نے
سرزمین پر طے کیا۔ پٹنہ سے کالج کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب گیا آ
جناب بسمل سنسہاروی مرحوم نے انہیں ماہنامہ سہیل کی ادارت سونپ
شہر کا قدیم ادبی ماہنامہ سہیل جس نے بہت ساری شخصیتوں کو عالم ا
شہرت دی، جناب قیصر عثمانی کی شخصیت کو جلا اسی ترقی پسند ا
سہیل سے ملی۔ دو سال ادارت سے وابستہ رہنے کے بعد سفر کلکتہ ت
پہنچنے اور فلمی دنیا میں روز و شب گزارنے لگے۔ لیکن فلمی دنیا کی چکا

فیاض حالی

والی زندگی ان کے ادبی مزاج اور ترقی پسندانہ احساس پر غالب نہ آسکی۔ اور ان کے ادبی شہ پارے منظر عام پر آتے رہے۔

فلمی دنیا جہاں دولت کا ریل پیل ہے۔ چند سرمایہ دار اجارہ دار اپنی دولت اور اجارہ داری کے بل پر محنت کشوں، ذہین لوگوں، ادیبوں، شاعروں اور آرٹسٹوں کی صلاحیتوں کو کوڑی کے مول خریدا کرتے ہیں، قیصر عثمانی کی شاعری کو خرید نہیں سکے کیونکہ انہوں نے ادب کا سودا نہیں کیا۔ اسے فروخت نہیں کیا بلکہ اپنے ادبی تخلیق کے ذریعہ فلمی دنیا میں استحصال کے خلاف آواز بلند کیا۔ ورکروں کو جگایا اور انہیں احساس دلایا۔ فلمی دنیا کے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف انہیں بیدار کیا۔ اور حقوق کے حصول کے لئے ترغیب دی۔

جناب قیوم اثر صاحب کی زبانی میں قیصر عثمانی کو جان سکا ہوں اور مختصر سی ملاقات میں ان کی مکمل تصویر دیکھ سکا ہوں۔ قیصر عثمانی کا مجموعہ کلام "حدیث دل" ان کی شخصیت کا پرتو ہے، اس مجموعہ میں بہت سی نظمیں، غزلیں اور قطعات پیش کئے گئے ہیں جن میں نظم "پرچھائیوں کا د[...] اقبال کے شکوہ کے انداز میں لکھا گیا ہے" نظم "فلمی دنیا" کے فرسودہ نظام، نقالی اور استحصال کو بے نقاب کرتی ہے [...] شاعر کے ترقی پسند نظریہ کا بھرپور نمونہ پیش کرتی ہے۔ یہ نظ[م] ادبی دنیا میں اپنے موضوع کے لحاظ سے ایک کامیاب اضا[فہ] ہے۔ فلمی دنیا کے موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ نثری ا[ور] شعری تخلیق بہتوں نے پیش کی ہے لیکن قیصر عثمانی کی یہ [نظم] معرکتہ الآرا نظم ہے۔ نظم "میرا وطن میرا گھر" میں قیصر عثم[انی] نے اپنے بچپن کی زندگی، وطن اور گھر سے محبت، بزرگوں اور دو[ستوں] کی رفاقت اور وطن وگھر کے چھوٹنے کے درد کو پیش کیا ہے۔ قیصر عثمانی نے وطن اور گھر کی ایسی منظر کشی کی ہے کہ آنکھ کو نم اور دھڑکنوں کو تیز کر دیتی ہے، مجموعی طور پر دو[نوں] نظمیں فن شاعری اور حقیقت نگاری کے بہترین نمونے ہیں جو قیصر عثمانی کے اندرونی کیفیات کی غمازی کرتے ہیں۔

میرا وطن میرا گھر

قیصر عثمانی

برسوں کے بعد آج پھر اپنے وطن میں ہوں
میں جس چمن کا پھول تھا پھر اس چمن میں ہوں
آرام جاں تھی جو کبھی اس انجمن میں ہوں
لیکن یہ کیا کہ آج کہیں دل کشی نہیں
سب کچھ نگاہ میں ہے بس اک زندگی نہیں

حیرت سے تک رہے ہیں مجھے سارے بام و در
پہچانتی نہیں مجھے اب کوئی رہ گذر
بے گانہ وار پڑتی ہے ہر شخص کی نظر
للہ کچھ نہ پوچھئے کتنا دکھی ہوں میں
اپنے ہی شہر میں ہوں مگر اجنبی ہوں میں

راہیں وہی ہیں کوچہ و بازار ہیں وہی
میدان کھیل کے وہی گلزار ہیں وہی
نالے ندی ہیں سب وہی کہسار ہیں وہی
لیکن اب ان میں ہائے وہ جذب و اثر کہاں
اپنے وطن کی پہلی سی شام و سحر کہاں

بازار حسن کے وہ نظارے کہاں گئے؟
"رونق فروز شب" وہ ستارے کہاں گئے؟
وہ دل نوازیاں وہ اشارے کہاں گئے؟
جی چاہتا ہے پھر وہی ایام لوٹ آئیں
سب عالم شباب کے آرام لوٹ آئیں

یاد آ رہی ہیں بکر[۱] کی وہ بذلہ سنجیاں
دل داریاں شفیق[۲] کی عارف کی شوخیاں
اخگر[۳] کی نغمہ سنجیاں شیدا[۴] کی مستیاں
تھا حشر خیز جس کا ہر اک لمحۂ جواں
سونی پڑی ہے آج وہی بزم دوستاں

تھی اک شفق[۵] جو چرخ ادب پر کہاں ہے وہ؟
انجم[۶] کہ جس کا نور تھا گھر گھر کہاں ہے وہ؟
تھا اک یہیں سریر[۷] سخنور کہاں ہے وہ؟
بسمل[۸] تھا ایک بزم سخن کا کدھر گیا
محسوس ہو رہا ہے کہ فن جیسے مر گیا

وہ لوگ کیا ہوئے جو میرے غم گسار تھے
دکھ سکھ میں جو شریک تھے جو وضع دار تھے
مخلص تھے مہربان تھے یاروں کے یار تھے
مہر و وفا کی بستیاں ویران ہو گئیں
جن محفلوں کی دھوم تھی سنسان ہو گئیں

اک موڑ پر ہوں دیرے میں چپ کھڑا ہوا
آنکھیں ہیں ڈبڈبائی ہوئی دل بجھا ہوا
جاؤں کہاں یہ فیصلہ مجھ سے نہ ہو سکا
اب کون ہے جو مجھ کو گلے سے لگائے گا
میرے لئے جو راہ میں آنکھیں بچھائے گا

جب تھک گیا دماغ میرا سوچ سوچ کر
دنیائے بیکسی میں مرا دل تھا راہبر
اب میں تھا گھر کے سامنے اور سامنے تھا گھر
وہ گھر جو تھا کبھی مرا اب میرا گھر نہیں
وا ہوگا میرے واسطے اب جس کا در نہیں

داخل نہ ہو سکوں گا میں اس گھر میں اب مگر
دل کی نظر سے دیکھ رہا ہوں ادھر ادھر
یہ طاق یہ ستون یہ دیوار اور یہ در
سب جیسے مجھ کو دیکھ کے مسرور ہو گئے
شکوے گلے تھے جو انہیں سب دور ہو گئے

★ ۱۔ ابوبکر مرحوم ۲۔ شفیق قادری ۳۔ اخگر سیمابی مرحوم ۴۔ شیدا کیوردی

★ ۵۔ حضرت شفق رضوی حاذپوری گیاوی ۶۔ حضرت انجم مانپوری گیاوی ۷۔ حضرت سریر کابری گیاوی ۸۔ حضرت بسمل سنسہاروی گیاوی

لیکن وفورِ اشک سے اب حال تھا خراب
میں ہو رہا تھا جوشِ ندامت سے آب آب
بچپن جہاں کٹا مرا گزرا جہاں شباب
مجرم سا میں کھڑا ہوں اسی کے حضور میں
برپا ہے ایک حشر دلِ ناصبور میں

آنگن کو دیکھتا ہوں تو آتا ہے یہ خیال
ہے اب بھی محوِ کھیل میں اک طفلِ خردسال
یہ کاٹھ کے کھلونے یہ موٹر یہ فٹ بال
بچپن کا وہ زمانہ بھی تھا ہائے کیا حسیں
تھا دوست آسمان تو لونڈی تھی یہ زمیں

یہ اک طرف ہیں منزلِ بالا کی سیڑھیاں
باقی ہیں جن پہ اب بھی مرے پاؤں کے نشاں
کھلنے لگے صحیفۂ ماضی کے سب ورق
یاد آ گئے مجھے کئی بھولے ہوئے سبق

یہ چھت جہاں برستی تھی تابانیٔ سحر
لڑتی تھی میری آنکھ ستاروں سے رات بھر
تھی نوجوانیٔ سازِ محبت پہ نغمہ گر
شاید مرے بغیر بہت
مایوس ہے ملول ہے اداس ہے

پھر جا رہا ہوں تجھ سے بہت دور کیا کروں
ہوں گردشِ حیات سے مجبور کیا کروں
آلامِ روزگار سے ہوں چور کیا کروں
میں جانتا ہوں تجھ پہ یہ لمحات
تڑپوں گا میں بھی تیری جدائی میں

قیصر عثمانی

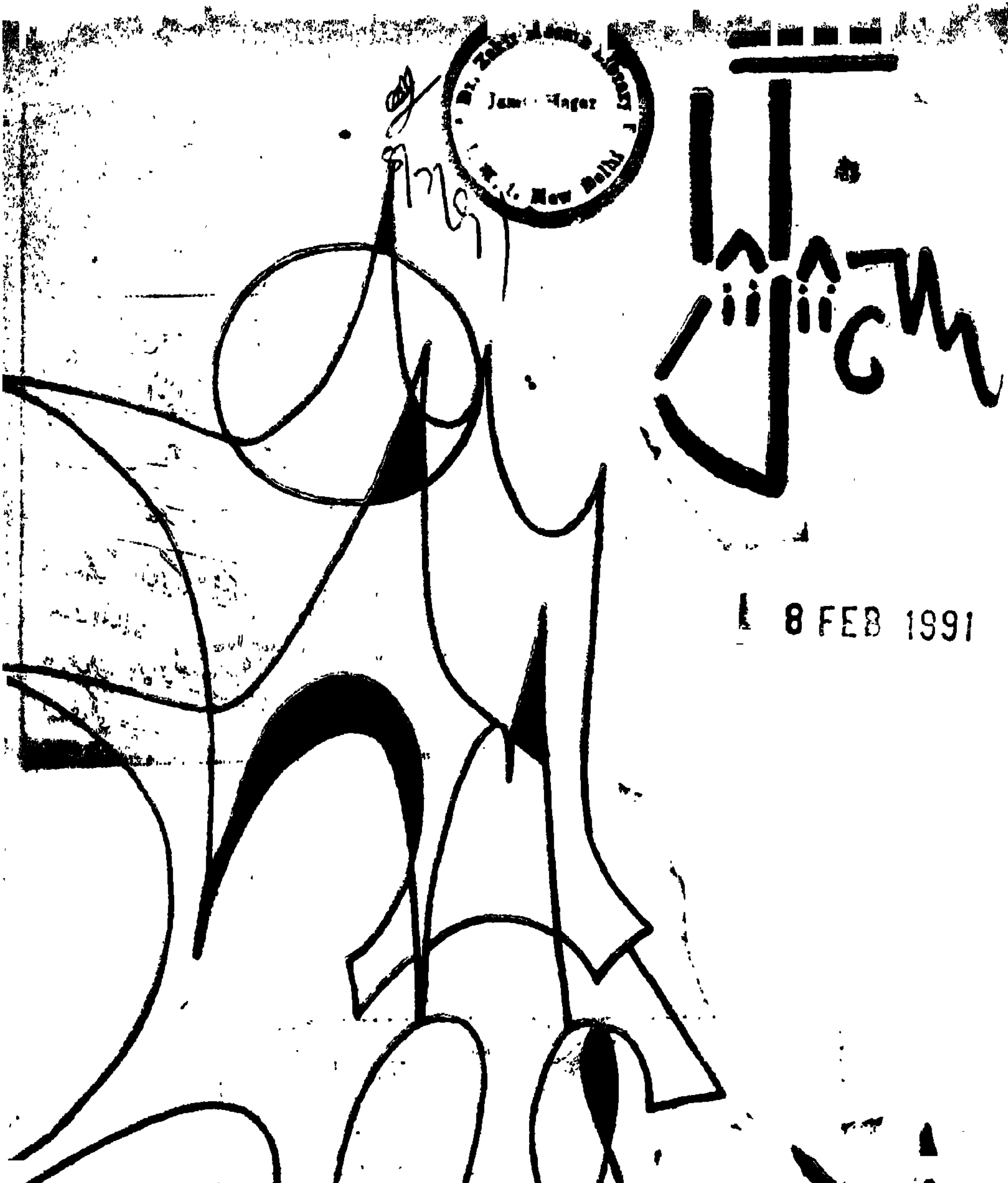
ایک نوجوان بیوہ سے

تیری دنیا ایک خوابِ ناتمام
سوزِ پیہم تیری ہستی کا ہے نام
ہے شکستہ اب وہ مینائے شباب
جس سے ڈھلتی تھی اداؤں کی شراب
ہم ہوں تیری دید سے کیوں کر نہال
حُسن ہے تیرا محترم کا ہلال
اُجلے کپڑوں میں ہے تو کیسی مگن
زیبِ تن ہو جیسے شوہر کا کفن
تو سراپا درد کی تصویر ہے
تیری خاموشی بھی اک تقریر ہے
چال میں ہے اس مسافر کی تھکن
جس پہ شامِ بے کسی ہو خندہ زن
اے معاذ اللہ تیری زندگی
اک عذابِ مستقل سے ہو گی

اف یہ تیری نگاہِ دزدیدہ
جس میں شوخی بھی ہے حجاب بھی ہے
دیکھ کر بھی نہ دیکھنے کی ادا
اس ستم کا کوئی جواب بھی ہے

قطعہ

اک ماہ رخ سے میری ملاقات ہو گئی
جس کا گمان بھی نہ تھا وہ بات ہو گئی
پیرایہ مری حیات کا مضمونِ حسن ہے
وقفِ عروسِ ناز مری ذات ہو گئی




زعفرانی تیل
ایک حیرت انگیز پیشکش
چوٹ، موچ، درد، زخم، کٹنے، جلنے، ورم، ناگہانی حادثات اور بچوں کی مالش میں کام آنے والا تیز اثر اور فائدے بیشمار۔
QADRI MANJAN
(MOVAMI ART, GAYA 86)


TEKKA
ROSE WATER
عطر مجموعہ
TEKKA
KEORA WATER
عطر فردوس
عرق کیوڑہ نمبر ۲۰۰۰
عرق گلاب نمبر ۵۰۰۰
GAZIPUR STAR CHEMICAL WORKS

بانی :- حافظ محمد عبدالرحمٰن سہیل سہسرامی ——— بیادگار :- زین العابدین احمد و ادریس سہسرامی

ماہنامہ سہیل گیا

فہرست

نمود ——— ۵
دوسری زبان ..... تاراچرن رستوگی ۶
نادم بلخی کی شاعری ۔ قیوم خضر ۱۳
غزلیں ——— فضا ابن فیضی، طراج حیرت ۱۷
گجراتی نظمیں ——— سیتا نائک، ترجمہ۔ غلام رازق شیخ ۲۰
نظم ——— شبیر حسن ۲۳
غزلیں ——— قیصر جبالی، کمال جعفری، گوہر جبالی ۲۴
غزلیں ——— ملک زادہ جاوید، شاہد عزیز ۲۵
غزلیں ——— اختر شاہ جہاں پوری ۲۶
غزلیں ——— ضمیر درویش ۲۷
سلگتے خیموں سے دور ۔ نوشاد احمد کریم ۲۹
نثر ۔ ذاکر کمار ۳۳
نئی کتابوں کا تعارف ۔ علیم اللہ حالی ۳۶
شہر خیال ——— ۳۸

مجلس مشاورت

ڈاکٹر تاراچرن رستوگی
ڈاکٹر قمر رئیس
اصغر علی انجینئر
قیصر عثمانی
شاہد احمد شعیب
ڈاکٹر محمد مثنیٰ
ڈاکٹر علیم اللہ حالی

چیف ایڈیٹر :- مسعود منظر
ایڈیٹر :- جمیل منظر
معاونین :- شکیل احمد جبالی، عبدالقیوم ابدالی
• کتابت :- سید عبدالاحد گیاوی •

★

شمارہ ۳ جلد ۵

بدل اشتراک
• فی شمارہ .... ۳/= روپے
• زر سالانہ .... ۳۶/= روپے
• لائف ممبری .... ۵۵۱/= روپے

• خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ •

ماہنامہ سہیل گیا
سیور سائیڈ روڈ، گیا۔ ۸۲۳۰۰۱
فون نمبر 21573

ترقی اردو بیورو کی تازہ مطبوعات

۱	ابوالکلام آزاد شخصیت، سیاست، پیغام		پروفیسر رشید الدین خاں	۳۳۶	۱/۰۰
۲	ابوالکلام آزاد - ایک ہمہ گیر شخصیت	مرتبہ	"	۶۸۸	ر/۰۰
۳	بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء		اختر اورینوی	۳۴۷	/۰۰
۴	دکن میں مرثیہ اور عزاداری		رشید موسوی	۳۱۵	/۰۰
۵	رہبر اخبار نویسی		سید اقبال قادری	۷۵۲	/۰۰
۶	عربی اردو کی تاریخ اول (تیسرا ایڈیشن)		عبدالحلیم ندوی	۳۶۰	/۰۰
۷	" " " " دوم)		" " "	۳۹۰	/۰۰
۸	غزل اور غزل کی تعلیم (دوسرا ایڈیشن		اختر انصاری	۲۳۲	/۰۰
۹	فکر و تحقیق (تحقیقی مجلہ پہلا شمارہ)	مرتبہ	ترقی اردو بیورو	۲۸۸	/۰۰
۱۰	البیرونی کے جغرافیائی نظریات		ڈاکٹر حسن عسکری کاظمی	۱۶۸	/۰۰
۱۱	تاریخ اور سماجیات		عائشہ بیگم	۱۴۰	/۵۰
۱۲	جغرافیہ کی ماہیت اور اس کا مقصد		ایس ڈبلو وولرج / انیس احمد صدیقی	۲۴۰	/۰۰
۱۳	اردو افعال		سونیا چرنیکووا	۳۲۴	/۰۰
۱۴	آہنگ اور عروض		کمال احمد صدیقی	۲۲۴	/۰۰
۱۵	فرہنگ اصطلاحات ریاضیات (انگریزی، اردو)	مرتبہ	ترقی اردو بیورو	۷۶	/۰۰
۱۶	فرہنگ اصطلاحات لسانیات		" " " "	۱۱۲	۰۰
۱۷	لسانیات کیا ہے		ڈاکٹر ڈیوڈ کرسٹل / نصیر احمد خاں	۱۶۰	۰۰
۱۸	مختصر اردو لغت (اردو، اردو)		ترقی اردو بیورو	۹۴۸	/۰۰
۱۹	دکن میں اردو		نصیر الدین ہاشمی	۲۹۶	/۵۰
۲۰	دیوانِ آبرو	مرتبہ	پروفیسر محمد حسن	۳۷۸	/۰۰
۲۱	ہندوستانی سماج ساخت اور تبدیلی		ضیاء الدین احمد	۴۶۰	/۰۰

شعبۂ فروخت و نمائش

ترقی اردو بیورو ویسٹ بلاک 8 آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی 110066

فون :- 09746

نمود

عالمی سطح پر پوری دنیا میں سیاسی، سماجی اور نظریاتی اتھل پتھل نے ایک عجیب کیفیت پیدا کردی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اجتماعی طور پر ہمارے فکر پر بھی اضمحلال کے آثار واضح ہو چلے ہیں۔ بے سمتی کی کیفیت میں دھند نے صحیح سوچنے اور صحیح دیکھنے کی صلاحیت پر بھی قبضہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

ہم ابھی ایران و عرب اور عراق و کویت کی باتیں کیوں کریں۔ ابھی تو خود ہمارا ہندوستان اپنے سینے میں دہکتے ہوئے انگارے محسوس کر رہا ہے۔ ایک سرد جنگ ہے جو شعلے اگلنا چاہتی ہے۔ رجعت پرست طاقتیں بھی یہ ضرور جانتی ہیں کہ ملک کی فلاح و ترقی اور عام خوش حالی کا مسئلہ مسجد و مندر کے تنازعے اور اکثریت و اقلیت کے معقولانہ تصادم سے حل نہیں ہو سکتا مگر پھر بھی یہ بادلاجن ہم پر سوار ہوتا جاتا ہے ـــــ اور اس مسئلہ کو ہوا دے کر لوگ یہ بھول رہے ہیں کہ ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں ہر تھوڑی دیر کے بعد بھڑکنے والی آنچ اس آگ کو پورے ملک میں پھیلا سکتی ہے۔ فسطائی طاقتیں اس ہوشیاری سے کام کر رہی ہیں کہ ہندوستان سے دوستی اور حب الوطنی کے دعویدار بہت سے طبقے اس تخریبی مشن میں آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔ انہیں خود بھی خبر نہیں کہ وہ کن ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں، کون سی طاقت اپنے طور پر انہیں نچا رہی ہے۔ اور ہندوستان کو تباہ و برباد کرنے اور اس کی سالمیت کو نیست و نابود کرنے کے نئے کون کون سی بازیگری رچی جا رہی ہے۔ بابری مسجد، رام جنم بھومی، کشمیر، پنجاب، بوڈو تحریک، فرقہ پرستی، تشدد، نسل پرستی ـــ اور ایسی تمام استعماری آوازیں دراصل ہندوستان کے خلاف ایک زبردست سازش ہے۔ ہم بچارے بھولے بھالے دلیش باسی اس بات سے غافل ہیں کہ اس پردۂ زنگاری کے پیچھے کون سا معشوق ہے ـــــ کوئی بھی ہو مگر ہم اتنا جان لیں کہ ان مسائل پر اصرار کرنے والے بلاشبہ ہندوستان کے دوست نہیں ہیں۔ ہمیں ان سے اب بھی ہوشیار ہو جانا چاہیے

(ادارہ)

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی

دوسری زبان کی اصطلاح دستور ہند میں ہے نہ گجرال کمیشن میں

لسانی مسائل کا تناظر و تجزیہ

لسانی مسائل کو قومی تناظر میں دیکھنا بہت ضروری ہے۔ قومی تناظر کی جانب توجہ مبذول کرانے کے پیشتر ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنا بہت ضروری ہے۔ میرے دائرہ علم سے باہر ہے کہ "دوسری زبان" بہ طور اصطلاح کہاں سے اور کیسے معرض وجود میں آگئی ہے۔ دستور ہند اور گجرال کمیشن رپورٹ دونوں میں یہ اصطلاح چراغ لے کر ڈھونڈنے پر نہیں مل سکتی۔ گجرال کمیشن نے اردو زبان کی بابت جو سفارشات پیش کی ہیں وہ بالعموم جائز ہیں مگر گجرال کمیشن TERMS OF REFERENCE سے باہر بھی چلا گیا ہے۔ مگر اس کا جائزہ لینا برمحل نہیں معلوم ہوتا۔ دستور کے مطابق کسی ریاست میں ریاستی زبان کے علاوہ اور کسی زبان یا زبانیں بولنے والے "معتدبہ تعداد" میں ہوں تو صدر جمہوریہ اس زبان یا زبانوں کو معینہ مدت کے لئے معینہ سطح پر مستعمل کرنے کے لئے اجازت دے سکتا ہے۔ سوال "دوسری زبان" کا ہے۔ جس کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ اگر درجہ بندی

یا نمبر شماری جائز کر دی جاتی تو بے شمار مشکلات حائل ہو جاتیں۔ مثال کے طور پر آسام میں اسمیہ (جس کا تلفظ اکھمینہ بھی کیا جاتا ہے) سرکاری زبان ہے۔ آسام کو مقامی لوگ "اسم" کہتے ہیں۔ اس ریاست کا ایک حصہ جو پہلے کچھار کہلاتا تھا اب تین اضلاع "کچھار، ہیلا کانڈی اور کریم گنج میں منقسم ہو گیا ہے۔ بنگلہ زبان بولنے والوں پر مشتمل ہے لہذا یہاں ضلعی سطح تک بنگلہ زبان کے استعمال کی مراعات دی گئی ہیں۔ اسکولوں میں ذریعہ تعلیم بنگلہ ہے اور کالجوں میں انگریزی۔ آسام یعنی اسم کا ایک ضلع اور ہے جہاں بنگلہ زبان مروج ہے۔ گوال پارا مگر اس ضلع کو وہ مراعات نہیں دی گئی ہیں۔ مزید براں اسم میں ۱۵-۱۶ زبانیں اور بھی ہیں، بوڈو رابھا، دشتو پریہ، منی پوری، میتائی، منی پوری وغیرہ۔ اسم سرکار نے ان زبانوں کو بھی کچھ نہ کچھ مراعات دے رکھی ہیں لیکن درجہ بندی نہیں کی گئی ہے۔ اگر درجہ بندی کا مطالعہ کیا جائے تو دریا کے بر بستر میں پانی بہنا بند ہو جائے گا، خون بہنے لگے

ملحوظ رہے، بنگلہ بولنے والے آسام میں ۴۲۸ فی صد ہیں۔ اگر ۱۷۔۱۲ فی صد ہی دوسری زبان کا درجہ دیا جاتا ہے تو ۸۔۳۸ فی صد آبادی کو کیوں کر محروم رکھا جا سکتا ہے۔ لہٰذا کسی قسم کی نمبر شماری ملک و قوم کو نہ جانے اور کتنے مسائل سے دوچار کر دے گی۔ غالباً اسی لئے دستور ہند میں دوسری زبان کی اصطلاح استعمال نہیں کی گئی۔ اس سوال کو وسیع تناظر میں بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔

میں اپنے ایک مضمون A HUNG PAR- -LIMENT AND A HUNG POLITICAL- -WISDOM (ایک معلق پارلیمان اور معلق سیاسی دانش) جو CACHAR TRIBUNE میں بالاقساط اپریل کے اواخر میں شائع ہوا، کا خلاصہ پیش کرنا بے محل نہیں سمجھتا۔ لب لباب یہ ہے کہ برصغیر ہندوستان کی سیاست پیشہ ورانہ ہو گئی ہے۔ ملکی مفادات و مسائل کو مرتکزات توجہ سمجھنے کو صرف نظر کیا جا چکا ہے۔ ریاستی انتخاب کے امیدوار کو کم از کم ۷۔۸ لاکھ روپئے اور پارلیمان کی رکنیت کے خواب دیکھنے والے کو کم از کم ۱۵۔۲۰ لاکھ روپے کے اخراجات برداشت کرنے کی توانائی کا حامل ہونا چاہئے۔ مزید براں جسمانی طاقت بھی چاہئے۔ انگریزی میں MONEY & MUSCLE (دولت و عضویاتی توانائی) اتنے بڑے اخراجات کے بعد رکنیت ملتی ہے تو ظاہر ہے کہ ریاستی رکن ہو یا پارلیمانی ممبر کس طرح ایماندار رہ سکتا ہے۔ ایک دفعہ رکنیت ملتے ہی بڑی تاحیات پنشنیں، دوران رکنیت بے شمار سہولتیں اور ماہانہ تنخواہ سے کہیں زیادہ ہر ماہ ملنے والے معاوضے وغیرہ ہندوستان جیسے غریب ملک کی مالیات پر بارگراں ہی کہے جا سکتے ہیں۔ مزید براں وزارت و رکنیت وغیرہ موروثی ہو گئی ہیں۔ اگر ذاکر حسین مرحوم کے اولاد نرینہ نہ تھی تو کیا ہوا ان کے داماد پہلے مرکزی وزارت میں وزیر تھے اور آج کل گورنر ہیں۔ لال بہادر شاستری کے صاحبزادے بھی پارلیمان میں آ گئے ہیں۔ خویش پروری، رشوت خوری، بیورو کریسی، تقسیم انعامات وغیرہ میں دھاندلیاں اور نہ جانے کتنی اور بڑی لعنتوں میں ملک محصور ہو چکا ہے۔ یہی حال، بلکہ اس سے بدتر حال پاکستان کا ہے۔ دونوں ممالک میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو اپنی طاقت کو برقرار رکھنے کے لئے جنگ کا سہارا بھی لے سکتے ہیں۔ ان تمام اسباب کے اثرات زندگی کے ہر شعبے پر مرتب ہوتے ہیں۔ تفصیل میں جانے سے کیا فائدہ، مضمون ہذا میں بوجوہ مرکزی و ریاستی سربراہوں کو بالعموم RUNWAY- RUNAWAY- MENTALIT (یا انداز ذہنیت) اور PROPENSITIY (فرار آمادہ تمایلات) کا حامل قرار دیا گیا ہے۔ فرقہ واریت کی لعنت بھی پیشہ ورانہ سیاست سے عبارت ہے۔ شریمتی اندرا گاندھی کے شہید ہو جانے کے پہلے ہی سے حالات خراب ہونے لگے تھے۔ اس جانب نہ جانے کیوں ہمارے دانشوروں نے توجہ مبذول فرمانے کی زحمت نہیں کی ہے۔ ہمارے دانشور بھی ذہنی ملوثات کا شکار ہیں۔ بڑی آسانی سے بھٹک کر کسی فرقہ واریت کا الزام لگا سکتے ہیں۔ حبیب بھائی جان (جناب سہیل عظیم آبادی مرحوم) حیات تھے تو کسی حلقے نے پریم چند کو متعصب بتایا تو مرحوم نے مجھے لکھا کہ اگر منشی پریم چند متعصب تھے تو ہندوستان میں کسی کو بھی بے تعصب نہیں کہا جا سکتا ہے۔ منشی پریم چند کے صاحبزادے امرت رائے کی تصنیف A HOUSE DIVIDED کی تاب نہ لا سکے تو لکھنے والوں نے امرت رائے کو غیر سیکولر ہی کہنا شروع کر دیا۔ غالباً ایسے لوگ یہ نہیں جانتے کہ محمد ظہیر مرحوم امرت اللہ کو بہت پسند کرتے تھے اور جو لوگ اس کا ثبوت طلب کریں تو وہ جناب رام لعل مشہور و معروف

افسانہ و ناول نگار کی تالیف "حرف خیر" سے رجوع فرمائیں اور سجاد ظہیر کے ایک خط میں یہ سب کچھ مل جائے گا اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ چندی گڑھ سے واپس ہوتے ہوئے جناب سہیل عظیم آبادی مرحوم امرت رائے کے گھر پر شرف میزبانی بخش رہے تھے کہ ان پر دل کا دورہ پڑا اور وہ ہسپتال کے INTENSIVE CARE UNIT میں دنیائے فانی کو خیرباد کہہ گئے۔

ایسی ذہنیت ہمیشہ کارفرما رہی ہے۔ حکیمت کوسروی نے، فراق گورکھپوری کو پاکستان میں اور ہمارے ملک کے بعض حلقوں نے، گیان چند صاحب اور مجھے نہ جانے کتنوں نے فرقہ واریت کے الزام سے نوازا، غرض کہ یہ پرانی روایت ہے جو دراصل مرضیاتی ذہنیت (PATHOLOGICAL - MENTALITY) کی آئینہ دار بھی ہوتی ہے اور اس کیفیت کی غماز بھی جس کو علم نفسیات میں TRANSFER - MOTIVE کہتے ہیں یعنی جو اپنے عیب یا عیوب کی پردہ داری کے لئے دوسروں میں وہ عیب یا عیوب کی نشاندہی کرنے پر اتر آتی ہے۔ پروفیسر محمد حسین صاحب غالباً خود ہی سمجھ سکتے ہیں کہ اس کنایہ کی سوئی کا رخ کس جانب ہے دراں حالیکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اردو والے بالعموم اسی جانب توجہ مرتکز رکھتے ہیں جدھر ان کا دل کہتا ہے دماغ پر زور ڈالنا کفر کے مترادف سمجھتے ہیں۔

دراں حالیکہ اک عمر انگریزی درس وتدریس ہی میں گذری ہے اور ابھی تک انگریزی اور تقابلی ادبیات سے متعلق ریسرچ (RESEARCH) سے بحیثیت نگراں وابستہ ہوں اردو اور فارسی ادبیات سے مجھے عشق رہا ہے۔ میں اردو فارسی کا پیشہ ور ادیب نہیں ہوں۔ پیشہ وران اردو کے حرکات وسکنات سے ہر طرح اور ہر سطح پر واقفیت رکھتا ہوں۔ ایک دو واقعات کا ذکر کرنا غالباً بے محل نہ ہوگا۔

(۱) معلم اردو لکھنؤ کے برنی نمبر کی ترتیب مجھے تفویض کی گئی۔ سوچتا تھا کہ اپنے تعلقات کے پیش نظر اور سابق گورنر ہریانہ سید مظفر حسین برنی جو گراں قدر ادبیات ظفر یابیوں کے حامل ہیں اور جنہوں نے علامہ اقبال کو ان کی مسلم لیگ وابستگی کے باوجود بنیاد پرستوں کے ہاتھوں سے چھین کر ہندوستانی گنگ و جمنی میں مقام ومرتبہ کا حامل بنایا ہے مشاہیر سے مضامین حاصل کرنے میں زیادہ جد و جہد نہیں کرنا پڑے گی میں نے "مہمان مدیر" کے فرائض انجام دینا شروع کئے۔ مشاہیر سے استدعا کی گئی کہ وہ اپنی تحریروں سے برنی نمبر کو کامیاب بنانے میں میرا ہاتھ بٹائیں۔ جناب شمس الرحمان فاروقی صاحب کا جواب بلا تاخیر موصول ہو گیا کہ مصروفیات مانع ہیں اور وہ خاصے وقت تک لکھنے کے لئے وقت نہیں نکال سکتے۔ میں فاروقی صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے بروقت مطلع کر دیا۔

ملحوظ رہے برنی صاحب اپنی ذات سے ایک ادارہ دل و دماغ کی خصوصیات سے ایک اکیڈمی اور اپنی ہمدردانہ حاتمانہ فیاضی کا سرچشمہ ہیں بے شمار اردو، انگریزی اور ہندی ادیبوں نے ان سے کسب فیض کیا۔ فیض حاصل کرنے والوں کے اکثر و بیشتر مجھ سے ذکر کیا ہے۔ افسوس کا مقام ہے، کچھ ایسے بھی ہیں جو برنی صاحب کی شرافت کا استحصال کرتے رہے ہیں۔ اپنے محسن کے بارے میں ایک لفظ بھی ان کے منہ سے نہیں نکلتا۔ خیر گردش حالات مواقع سبھی کو فراہم نہیں کرتی۔ مجبوریاں بھی روک سکتی ہیں۔ ایک بہت بڑے عالم فاضل سے جب مضمون کے لئے استدعا کی تو ان کے جواب نے مجھے دم بخود کر دیا۔ جواب

کہ " مبلغ تین سو روپیہ بطور معاوضہ معلم اردو سے
دیجئے۔۔۔" مکتوب ہذا معلم اردو کے دفتر میں محفوظ
ظ ہے۔ نام کی نشاندہی کئے بغیر اظہار احمد، مدیر معلم اردو
" دو باتیں " کے تحت اشارہ بھی کیا ہے۔ یہ راز ابھی تک
ہے۔ وہ صاحب برقی صاحب سے خاصا فیض حاصل
چکے ہیں۔

(۲) سہیل عظیم آبادی مرحوم میرے لئے بڑے بھائی
۔ اور میں عمر بھر ان کو بھائی جان لکھ کر اور کہہ کر خطاب
کرتا تھا۔ بھائی جان نے مجھ سے سہیل گیا کو اپنی تحریریں
ال کرنے کا بھی حکم دیا۔ جناب ادریس سنہاروی
وم مدیر تھے۔ مگر ہم دونوں اپنے لکھنؤ کے تعلقات کو
ول چکے تھے۔ انہوں نے واصل بہ حق ہونے سے دو سال،
ھائی سال پیشتر لکھا کہ بچے آپ کا نام مجلس مشاورت
شامل کرنا چاہتے ہیں۔ میں کبھی بچوں کا حکم نہیں ٹالتا
میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ادریس بھائی کے سانحہ
تحال کے دو چار ماہ گذرے ہوں گے کہ ایک بہت مشہور ادیب
مجھے مکتوب گرامی سے نوازا اور یہ مشورہ دیا کہ آپ کے
م کا استحصال کیا جا رہا ہے لہٰذا مجلس ادارت کی رکنیت
ے علاحدہ ہو جایئے۔ عجیب و غریب مشورہ تھا۔ جواباً میں
عرض کیا کہ ادریس مرحوم کے دوران حیات بھی یہ مشورہ
بل تسلیم نہ ہوتا۔ ان کے بچے میرے بچے ہیں۔ غالباً جن
احب نے مجھے یہ خط لکھا تھا ان کے بطون میں کوئی عجیب
بذبہ کار فرما رہا ہوگا۔ میں ان صاحب کا نام نہیں بتاؤں گا
رنہ ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔

(۳) منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی جو ملازمت سے
سبکدوش ہو کر دہلی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ لکھنؤ کا
بستہ محلہ اردو شاعری کا شعر زار ہے جس کے باعث

یہ کہنا سو فیصد درست ہے کہ ؎

این خانہ تمام آفتاب است

منور صاحب کے پتاجی کھتری دوار کا پرساد جو
افق تخلص کیا کرتے تھے بزرگ شاعر تھے۔ منور صاحب نے
افق صد سالہ جشن کا جوش و خروش سے اہتمام و انصرام کیا
" لمحات افق " کے عنوان سے اپنے پتاجی کے اردو کلام سے
انتخاب منور صاحب نے بہ حسن و خوبی شائع کرایا۔ منور
صاحب نے مجھے بھی مدعو کیا تھا مگر کالج اور یونیورسٹی کی
مصروفیات میں محصور رہا اور جشن میں شرکت نہ کر سکا۔ جشن
کا اجراء کرانے کے لئے اردو کی ایک معروف ہستی کو مدعو
کیا گیا تھا۔ منور صاحب نے بعد کو مجھے مطلع کیا کہ جشن کے اجراء
سے چند منٹ پہلے جب اجراء کی رسم ادا کرنے والے صاحب یہ
پوچھتے سنے گئے کہ " افق " صاحب کون تھے۔ منور صاحب
اس ناواقفی پر دل مسوس کر رہ گئے۔ اجراء ہو گیا مگر جاننے
والوں کے دل داغ داغ ہو گئے۔ نام بتانا غیر ضروری ہے۔ ہم
اردو والے اپنی معلومات پر استفہامیہ لگا رکھنا غالباً پسند
کرتے ہیں۔

برایں عقل و دانش بباید گریست

(۴) شان ہند شمارہ فروری ۱۹۹۰ء کے اداریہ سے پتہ
چلا کہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو پدم شری کا خطاب دیا جانا
مسلمان اردو دانشوروں کو ناگوار گذر رہا ہے۔ ایسے متعصب
اشخاص میں نارنگ صاحب کا نام نامی بھی مشمول ہو گیا جب کہ
اردو، اردو کا ورد کرنے والوں میں نارنگ صاحب ہمیشہ پیش
پیش رہے ہیں۔ جناب محمد حسن صاحب کو میرے مضمون
میں فرقہ وارانہ ذہنیت نظر آئی، یعنی ایسے شخص کو مورد الزام
بنا دیا گیا ہے جس نے ہمیشہ فرد و سماج کی ہم رشتگی ہی کو خدا
سمجھا ہے۔ اس ہم رشتگی کے علاوہ میں نے دبستان نفسیات

کوکبھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا، مجھے اس بہتان طرازی کے "اندازو انداز" سے اذیت ہوئی مگر موصوف کو میں سکولر اقدار ہی کا حامی سمجھتا ہوں۔ مجھے ان کا یہ ارشاد کہ "اسلام کا مستقبل تصوف ہی میں تابناک رہے گا" آج تک یاد ہے۔ غالباً کسی سمینار کے اجلاس کے دوران وہ میرے پاس ہی تشریف فرما تھے۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ محمد حسن صاحب کی ادبیاتی کارکردگی مجھے ہمیشہ بے کشش معلوم ہوتی ہے۔

ان کا انداز بیان انتقادیاتی نہ ہو کر حکایتی رہتا ہے۔ مثلاً "سہیل" شمارہ مارچ ۱۹۹۰ء میں مشمولہ مضمون "افسانہ ـــ جدید افسانہ، جدید تر افسانہ" متعلمانہ ہی ہے کیونکہ "جدید تر" کی وضاحت کی جانب موصوف نے توجہ مبذول ہی نہیں کی ہے اور "کہانی پن" سے ان کی مراد کیا ہے "فی بطن الراقم" ہی ہو کر رہ گئی ہے۔ انگریزی کی معروف شاعر و افسانہ نگار کملا داس کی خودنوشت سوانح حیات MY STORY پر میرا ایک مضمون ۲۰ مئی ۱۹۹۰ کے PATRIOT (New Delhi) میں شائع ہوا ہے۔ مضمون ہذا میں متذکرہ خودنوشت کو ناول نگاری کی توسیع قرار دیا ہے، جس کے وجوہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ درآں حالیکہ میں شاعر و شعر کی جانب زیادہ متوجہ رہا ہوں مگر انگریزی کی درس و تدریس میں یورپی ادبیات سے واسطہ پڑا ہے۔ یہ وہ رموز ہیں جن کو سمجھنے کے لئے صرف اردو دانی ہی کافی نہیں ہے۔ جناب محمد حسن صاحب کا ایک اور مضمون لیجئے جو "انشاء" کلکتہ کے مشاہیر کے معاشقہ نمبر میں شائع ہوا ہے۔ مضمون ہذا مجاز کے عشقیہ زندگی کے بارے میں ہے۔ مضمون میری نظر میں کسی خاص معنویت کا حامل نہیں ہے کیونکہ محض "حکایت گوئی" پر اکتفا کیا گیا ہے۔ اقبال سے متعلق میرا مضمون بھی شامل ہے مگر جو کچھ بھی پیش کیا گیا ہے بر حوالہ ہے یعنی انتقادیاتی ہے۔

سمیناروں میں شرکت ان کے موضوعات سے متعلق علمیت میں اضافہ کا موجب ہوتی ہے ان کے مقاصد و منہج میں بے آہنگی نہیں ہوتی۔ ہر مقالے کے بعد ہونے والی بحث تمحیص سے سکالرشپ کو بھرپور جست (QUANTUM LEAP) حاصل ہوتی ہے۔ دہلی ہی میں منعقدہ سمینار میں پروفیسر محمد حسن صاحب کو اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے میں نے نہیں دیکھا۔ ہاں، ۱۹۷۷ء کی اقبال عالمی سمینار میں ایک اجلاس کی صدارت موصوف نے ضرور کی تھی وہ متعدد اجلاسوں میں شریک تو ہوتے رہے مگر بحث و تمحیص میں کبھی حصہ نہیں لیا۔ سمینار کی بحث و تمحیص میں حصہ لینا سکالرشپ کے لئے دار پر چڑھنے کے مترادف ہوتا ہے اور اس ضمن میں میری کارکردگی سبھی کو معلوم ہے۔ بہر کیف احساس برتری اور احساس کمتری دونوں مذموم ذہنی نفسیاتی کیفیات ہیں۔ بالکل اسی استدلال پر رجائیت قنوطیت کو میزان میں لانا چاہئے۔

یہ سب کچھ پیش کر دینے کے باوجود اردو سے متعلق میرا موقف جو ہالہ اثری (HALO AFFECT) کے تحت غلط فہمی کا شکار ہوا ہے دوبارہ درج ذیل ہے موقف کو دہرانے کی ضرورت اس لئے بھی محسوس ہوئی کہ جناب مجروح سلطانپوری صاحب نے بھی اس موضوع پر مجھے مکتوب گرامی سے نوازا ہے۔ مجروح صاحب دور حاضر کے بڑے شاعر بھی ہیں اور دلنواز مکتوب نگار بھی۔ شاعر، شعر، تموجات فکر و نظر کی توحید کا بہترین پیکر "مجروح حیات" میں ملتا ہے جملہ معترضہ ضرور ہے مگر اس حقیقت کا اقرار بھی ناگزیر میرے موقف کا خاکہ توجہ کا طالب ہے۔

۱۔ مرکزی سطح پر انگریزی کا استعمال قومی مفاد کا ضامن ہے۔ انگریزی بین الاقوامی زبان ہے اور اس زبان نے ہندوستانیت کو فروغ بخشا ہے۔ متعدد علوم و فنون پر اسی زبان نے دریچے وا کئے ہیں، مزید براں، غیر ہندی ریاستیں مثلاً، تامل ناڈو، کیرل، ناگالینڈ، میزورام، میگھالیہ وغیرہ کا بھی اصرار رہا ہے کہ انگریزی کی ترویج کو مجروح نہ کیا جائے۔

انگریزی میڈیم تعلیم کے خلاف جذبات کی نوعیت محض سیاسی ہے اور ہماری سیاست پیشہ ورانہ بھی ہے اور وراثتی بھی ہے۔ ایسی سیاست کیا کیا گل کھلائے گی اور کب تک عوام جذباتی مسکرات کا شکار ہوتے رہیں گے کیا ہم اس سوال پر بھی توجہ صرف کرنا پسند کریں گے۔ ہندوستان کے جملہ مسائل سیاسی غلط روی سے بھی عبارت ہیں اور جذباتیت سے بھی۔

۲۔ اردو زبان و ادب کو فروغ آشنا کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ امکانات کا جائزہ لیا جائے۔ کسی ریاست میں اس کو نمبر شماری کے تحت نہ لایا جائے زبان زبان ہے۔ دستور ہند میں اور گجرال کمیشن کی رپورٹ میں کہیں دوسری زبان کی اصطلاح نہیں ملتی، اگر اس اصطلاح کو استدراجات و تنقیحات (PROCESSING & INVESTIGATION) کی منزلوں سے گذارا جائے تو منتجات لطف کر دا شگاف ہو سکتے ہیں۔ اردو والے حامیانِ ہندی پر اکثریتی جارحانہ رویہ (MAJORITY CHAUVINISM) کا الزام تو لگاتے ہیں مگر اس کے ساتھ در خور صد اعتنا ایک جز بنیادی بھی ہے جس کو دانستہ یا نادانستہ طور پر صرف نظر کیا جاتا رہا ہے۔ اس پہلو کو ہم اقلیتی علاحدگی پسندانہ (MINORITY SEPARATISM) سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اکثریتی شوونزم اور اقلیتی علاحدگی پسندانہ طرز عمل دونوں مذموم ذہنیت سے عبارت ہوتے ہیں اور ہماری گنگا جمنی ثقافت کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ امرت رائے کی عالمانہ بصیرتوں سے بھرپور تصنیف A HOUSE DIVIDED کا ذکر آتے ہی اکثر و بیشتر پیشہ وران اردو ہوش و حواس باختہ ہو کر ہر کسی کو غیر سیکولر کہنے پر اُتر آتے ہیں۔ اس مقام و مرتبہ کی تصنیف جیسا کہ کئی بار پروفیسر گیان چند جین صاحب نے بھی کہا ہے کوئی اردو والا لکھ کر دکھا دے۔ گیان چند صاحب کو بھی فرقہ واریت میں ملوث بتایا جانے لگا۔ امرت رائے نے ہندی (ہندوی) گجراتی، مراٹھی، بنگالی، دکنی، کونکنی، اودھی، برج بھاشا، بھوج پوری، مگدھی، میتھلی، کیتھلی، راجستھانی وغیرہ زبانوں کے مابین ہم رشتگی اور مسلمانوں کے تعاون و اشتراک سے ان پر پڑنے والے اثرات کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ اس مقام پر پہنچنے کے بعد بلا شک و شبہ آشتی کا رجحان محکم ہو کر ابھرتے معلوم ہوتے ہیں۔ امرت رائے نے اردو کو ہندی کا اسلوب بنانا غلط قرار دیا ہے اردو ادبیات کی علاحدہ حیثیت و مقام ہے بہ ایں طور زبان اردو اور ہندی دونوں ایک ہیں مگر اس کے ادبیات دو ہیں، اردو ادبیات اور ہندی ادبیات اپنی کتاب کے آخری باب میں اردو کو دوسری زبان کا درجہ دیا جائے اس کی مصنف نے مخالفت

لی ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خان کا INDIAN
LITERATURE میں کتاب پر ریویو شائع
ہوا تھا جس میں خان صاحب نے امرت رائے کے
کام کو سراہا ہے مگر دوسری زبان کے مطالعہ سے
متعلق ان کی رائے کو سیاسی نوعیت کا بتایا ہے
اس کے بعد نہ جانے کیا ہوا پروفیسر موصوف
نے اردو مضامین میں امرت رائے کو وجوہ کی نشان
دہی کئے بغیر ہی برا بھلا کہنا شروع کیا۔ غالباً وہ
بھی جذبات کی رو میں بہہ گئے۔ دراں حالیکہ
لسانیات میں ان کا دائرہ مطالعہ خاصی وسعت
کا حامل ہے مگر اس میدان میں پروفیسر محمد حسن
صاحب نے ہنوز کسی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں
کیا ہے۔ غرض کے جذبات کی رو ہمارے ہوش و
حواس کو بہائے گئی ہے۔ ہندوستانی دانش و بینش
ایک بہت بڑے چیلنج سے دوچار ہے اور اس
چیلنج کا سامنا کس طرح کرتے ہیں اس پر نہایت
ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

(۳) مرکزی سطح پر ہندی کی ترویج شروع تو ہوگئی
ہے مگر یہ حقیقت واضح ہے کہ انگریزی کے سامنے
ہندی روز بروز سراسیمہ تر ہوتی جا رہی ہے۔ اس
ضمن میں ایک تجویز پیش کرنے کی جرأت رندانہ
کر رہا ہوں دراں حالیکہ میں جانتا ہوں کہ مجھے
حماقت کا مرتکب قرار دیا جا سکتا ہے۔ بہرکیف
تجویز پیش ہے۔ انگریزی کو بے دخل کئے بغیر سرکاری
سطح پر ریاستی زبانوں کا استعمال بین الاقوامی
صوتی رسم الخط (I.P.S) میں کیا جائے یعنی
دوسرے الفاظ میں رومن رسم الخط کی ترویج کی جائے

اگر اس تجویز کو شرف قبولیت حاصل ہو جائے
اتر پردیش، بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان
ہریانہ ریاستوں میں سرکاری کام کاج کے لئے
آسام میں آسامیہ، بنگال میں بنگالی، تامل ناڈو میں
وغیرہ زبانوں کا رسم الخط سرکاری سطح پر ایک
جائے گا۔ اور اس سے ملکی ہم آہنگی کو مزید تقویت
پہنچے گی۔ ترکی اور انڈونیشیا میں رومن رسم الخط
ہے، جہاں خواندگی کی شرح صد فی صد نشانہ تک
پہنچ گئی ہے۔ رومن رسم الخط سے ہندی کو نقصان
پہنچتا ہے نہ اردو کو، بنگالی کو نہ آسامیہ کو، تامل
تلگو کو۔ یعنی کسی زبان پر خراب اثرات مرتب نہ
ہو سکتے۔ یہ تجویز صدق دل سے حامل ہے اور
اس اسکیم میں خرابیوں کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا
اس تجویز کو اگر ہندوستانی جذبات بھی خراب
سمجھیں تو غالباً متعدد لسانی مناقشوں سے
قوم کو نجات مل سکتی ہے۔ جذبات کی منطق غالب
ہوتی ہے یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جذبات کی
میں منطق کبھی سکہ رائج نہیں بن سکتی۔
ملحوظ رہے رومن رسم الخط ذریعہ تعلیم پر اثر
نہیں ہوگا۔ ہندی دیوناگری ہی میں پڑھی جائے
اور اردو کی درس و تدریس اس کے اپنے رسم
میں جاری رہے گی البتہ سرکاری سطحوں پر رومن رسم
کا استعمال رہے گا۔ جس سے ہندی اور اردو
کے جھگڑوں سے عوام بچے رہیں گے۔ عبوری
میں البتہ کچھ مشکلات بھی سر اٹھا سکتی۔ مگر
صحیح اندازہ اسکیم کو عملی جامہ پہنا ہی کر کیا
سکتا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۲)

قیوم خضر

نادم بلخی کی شاعری کا ایک جائزہ

نام محمد ابراہیم، تخلص نادم، اور سنہ ولادت
١٩ ہے۔ خاندان بلخیہ سے تعلق رکھنے کے سبب بلخی
ہیں۔ خاندان بلخیہ کے اکثر افراد نے آٹھویں صدی ہجری سے
ل مسلسل علمی و ادبی خدمتوں کے فرائض انجام دیئے ہیں۔
پہ یہ کہنا مناسب ہے کہ نادم بلخی کی پشت پر ان کے اسلاف
ین کے صدیوں پرانے علمی و ادبی کارناموں کی مہر لگی ہوئی
ماشاء اللہ اب تو ان کی علمی و ادبی خدمات کی عمر بھی عمر
ن کو پہنچ چکی ہے۔ اب تک ان کے سات شعری مجموعے شائع
منظر عام پر آچکے ہیں، اور معلومہ اطلاع کے مطابق ابھی
ت مجموعے اور بھی اشاعت پذیر ہونے والے ہیں۔ یعنی
جودہ کتابوں کی تعداد مکمل ہو جائے گی تب اردو ادب
دہ طبق روشن ہونے کی توقع ہے۔

۱۹۶۱ء میں "آغاز سحر" سے "ذوق سفر" شروع ہوا
۹۵ء میں "دوپہر کے دائرہ" میں پہنچے۔ پھر "دھوپ میں
آوارگی" کے بعد جب ۱۹۸۰ء میں "لفظوں کے حصار" سے
۱۹۸۹ء میں "جیون درشن" کی پذیرائی ہوئی، اس
پذیرائی سے ان کے ذہنی سفر کی نہ صرف ارتقائی منزلوں کا پتہ
چلتا ہے بلکہ بتدریج منزل بہ منزل ان کے بدلتے ہوئے خیالات
کی بھی نشاندہی ہوتی ہے۔ اس ذہنی سفر کو طے کرنے کے سلسلے
میں بلخیہ خاندان کی صالحانہ روایات نے ان کی ایسی پشت
پناہی کی کہ وہ ڈگمگاتے ڈگمگاتے سنبھل گئے۔ وہ نہ صرف
خیالات کی سطح پر سنبھلے، بلکہ ادبی سطح پر بھی "ترقی پسندی"
اور "جدیدیت" کے آسیبی سائے سے اپنے آپ کو محفوظ و
مامون رکھا۔ چنانچہ اس کے تمام مجموعہ کلام کا بغور مطالعہ کر
جائیے، آپ کو کہیں بھی نہ وہ غیر مفہم زبان ملے گی اور نہ وہ
مبہم بیان ملے گا۔ نیز نہ وہ عروضی بے اعتنائی ملے گی، جو "ترقی پسند"
اور "جدیدیت" کے علمبرداروں کا طرہ امتیاز ہے۔ جہاں تک
عروض کا تعلق ہے تو نادم کو یہ علم ورثے میں ملا ہے۔ ان کی
کتاب "تفہیم العروض" سے ان کی ماہرانہ صلاحیت کا اندازہ
ہوتا ہے۔ ان کے والد جناب فصیح الدین بلخی مرحوم ایک
مشہور ادیب و محقق اور مستند و معتبر مؤرخ ہونے کے علاوہ
ماہر علم و عروض بھی تھے، چنانچہ ان کی آغوش میں پرورش و
تربیت پانے کا یہ ثمرہ ہے کہ نادم بلخی کو علوم و فنون کی کافی دولت
میسر آئی۔ اس علمی و ادبی دولت کے استحفاظ کی خاطر انہوں

نے بھی اپنی پوری زندگی ہی وقف کردی ہے۔

نادم بلخی کے تین شعری مجموعے (آغاز سحر، ذوق سفر، دوپہر کا دائرہ) میں ۲۰۸ غزلیں، ۳۱ نظمیں اور ۱۹ سانیٹ شامل ہیں، اس کے علاوہ "لفظوں کا حصار" ۴۰۹ رباعیوں پر مشتمل ہے اور "جیون درشن" میں ۲۸۵ دوہے شامل ہیں۔ ان کی غزلوں کا ایک مجموعہ "دھوپ میں صحرا نوردی" اور بچوں سے متعلق ایک شعری کتاب "تحفہ" کے علاوہ ان کے کل مجموعۂ کلام کے بالاستیعاب مطالعہ کے بعد میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ وہ دراصل نظم کے شاعر ہیں، اور صنف نظم میں وہ خاص طور پر "سانیٹ" کے فارم میں جب کہتے ہیں تو ان کا شاعرانہ جوہر زیادہ نکھر کر سامنے آتا ہے۔ ان کے شعری مجموعے میں جتنے بھی "سانیٹ" شامل ہیں وہ سب بحسب معیاری ہونے کے علاوہ اس قابل ہیں کہ ہر لحاظ سے ان کی پذیرائی کی جائے۔ مگر انہوں نے "سانیٹ" لکھنے پر اتنی توجہ نہیں دی جتنی کے ان کو دینی چاہئے تھی۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر وہ اس صنف کو مخصوص کر کے اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بناتے تو زیادہ کامیاب اور موثر ثابت ہوتے اور یہی صنف ان کی امتیازی انفرادیت و خصوصیت کا سبب بن جاتی۔ "سانیٹ" کے بعد ان کے قلم کی شگفتگی اور تازگی کا لطف نظموں میں بھی ملتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے مختلف مجموعے کلام میں جو نظمیں لکھی ہیں وہ غزلوں کے مقابلے میں زیادہ شگفتہ و تازہ اور جاندار ہیں۔ خاص طور پر ان کے دوسرے مجموعۂ کلام "ذوق سفر" میں "مرگ پدر" اور "غم ہجر" کے عنوان سے شامل شدہ نظمیں اور تیسرے مجموعۂ کلام "دوپہر کا دائرہ" میں اپنی رفیقۂ حیات وجیہہ النسا کے نام جو انتسابی نظم انہوں نے لکھی ہے، وہ اتنی بھرپور، اتنی پرتاثیر اور اتنی

خوبصورت ہے کہ دل کو چھولیتی ہے۔ اور بے ساختہ زبا
تحسین کے کلمات نکلتے ہیں۔

تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کرنے کا
نہیں۔ مگر کوئی خاص صنف اور کوئی خاص طبعی رجح
ضرور ہونا چاہئے، جس سے فنکار کی انفرادی پہچان
مثال کے طور پر جگر مرادآبادی کی پہچان ان کی غز
سبب اور جوش ملیح آبادی کی پہچان ان کی نظموں
سے ہوتی ہے۔ انفرادی پہچان کے بغیر کوئی بھی فنک
کے مقابلے میں منفرد اور ممتاز مقام پانے کا اہل نہیں
بات سمجھنے کی اصل یہ ہے کہ مختلف اصناف سخن میں طب
کرنے کا سب سے بڑا نقصان ہوتا ہے کہ کسی خاص
میں مہارت حاصل نہیں ہو پاتی، اس لئے فنکار کو
صلاحیتوں اور اپنے طبعی رجحان کا محاسبہ کر کے
اصناف ادب کی کسی ایک صنف کو مخصوص کر کے ا
قوتوں کو صرف کرنا چاہئے۔ اسی سلسلے میں مجھے ایک
کہنی ہے کہ کوئی ضروری نہیں کہ تمام بحور و اوزان کے
اشعار کہے جائیں، بلکہ انہی بحور و اوزان کا انتخا
چاہئے۔ جن میں خیالات کا اظہار بحسن و خوبی انجا
مختلف بحور و اوزان میں شعر کہنے سے استادی
کا اظہار تو ہو جاتا ہے مگر شعری کیفیت عنقا ہو
اسی طرح [illegible] رواں ردیف و قافیہ
ٹیڑھی میڑھی زمینوں اور مشکل ردیف و قوافی کی
جکڑ دینے سے غزل کی لطافت و نزاکت بھی مجروح ہو
اور اس کا صوتی حسن بھی غارت ہو کر رہ جاتا ہے۔
یہ چلتے چلتے ایک نکتہ اور بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ
انکار کی گنجائش نہیں لیکن جہاں تک بسیار گوئی کا
ایک ایسا مرض ہے، جو فنکار کو فضول گوئی اور کبھی کبھی

…حد تک پہنچا دیتا ہے۔
نادم بلخی نے نظموں اور غزلوں کے علاوہ رباعیاں …یں، چنانچہ ان کا چھٹا مجموعہ کلام "لفظوں کا حصار" …عیوں ہی پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ کی ایک خصوصیت …س میں شامل شدہ رباعیوں سے نادم کے موجودہ …جھنے میں مدد ملتی ہے ـــــ ۱۹۵۰ء کی بات ہے ان سے پہلی بار پٹنہ میں ملا تھا، تو اس وقت وہ …ادخیال اور بطفیل "تحریک ترقی پسندی" روسی …بیت کے حامی تھے، خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے …پنا محاسبہ کیا اور "لفظوں کے حصار" میں جو رباعیاں …ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنے …سلف کی صالحانہ روش نہ صرف اختیار کر رکھی …ن اسلاف صالحین کی راہ پر عمل پیرا بھی ہیں۔ بہرحال …تو ضمنی طور پر آ گئی ہیں، ان کی رباعیوں کے سلسلے …بات کہنی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے رباعیوں …موضوعات کے تحت لکھ کر پابند و مجبور بنا کر رکھ دیا …وہ ذہن میں خود بخود ابھرنے والے خیالات کے …باعیوں کو لکھتے تو ان میں ایک دوسری ہی کیفیت …جاتی۔ اس طرح کی غلطی انہوں نے اپنے ساتواں …نام "جیبون درشن" میں کی ہے۔ تمام دوہے …ت کے تحت لکھے جانے کے سبب ان میں رکی رکی اور …جی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے، اس کے علاوہ …ں ان کی اپنی کوئی خاص گہری اپج بھی نہیں بلکہ عام …رعام چالو محاوروں کو عروضی طور پر موزوں کر کے …روپ دے دیا گیا ہے، اس لئے اکثر دوہوں میں …بندی کا لطف تو ملتا ہے مگر دل کو چھونے والی جو …ہونی چاہئے وہ بہت کم دوہوں میں پائی جاتی ہے۔ دوہوں میں عام طور پر ہلکی پھلکی زبان میں اخلاقیات کا درس اور زندگی کے حقائق کے بیان کی جو روایت چلی آ رہی ہے اس کو نادم بلخی نے ایک حد تک نباہنے کی کوشش کی ہے دوہوں کی ایک روایتی خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ وہ ضرب المثل کے طور پر عام زبانوں پر جاری ہو کر مقبولیت کی سند حاصل کرتے ہیں، چنانچہ نادم کے بعض دوہے ایسے ہیں جو ضرب المثل کے تحت زبانوں پر چڑھ کر بازاروں میں کھپ سکتے ہیں۔

مذکورہ بالا سطور میں بے تکلفانہ اور مخلصانہ طور پر نادم بلخی کی شاعری کا ایک جائزہ لیا گیا ہے۔ چالیس برسوں سے لگاتار اردو ادب کی خدمت کرنے والے کو خادم تو کہا جا سکتا ہے مگر نادم نہیں! مسلسل اور ان تھک فنی ریاضتوں نے ان کو ایک ایسے مقام پر پہونچا دیا ہے کہ کوئی ان کے علمی و ادبی کارناموں کو یکلخت نظر انداز یا فراموش کرنا چاہے بھی تو نہیں کر سکتا۔

سب سے آخر میں مجموعی طور پر اپنی پسند کے مطابق ان کے کلام کا ایک مختصر سا انتخاب ناظرین کی خدمت میں بطور ضیافت طبع پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

منفرد اشعار ـــ (آغاز سحر، ذوق سفر، اور دوپہر کا دکھ، سے منتخب شدہ)

ہوائے تند سے کچھ بھی نہ ہو سکا نادم
بلند اور بھی مشت غبار ہو کے رہے

ہم کو ملتی ہی نہیں اب تو خبر نادم کی
ان دنوں آپ خدا جانے کہاں رہتے ہیں؟

نادم حیات، جہد مسلسل کا نام ہے
دل میں خیال چارۂ درد جہاں رہے

واعظا چراغ پا ہے فقط ذکر جام پر ۔ میں نے تو کوئی بات بھی ایسی کہی نہیں!

اب تو ہم کو بھول کر بھی یاد وہ کرتے نہیں
نام جن احباب کا بے ساختہ اکثر لیا

دریا کے حوادث میں رہنا کچھ عادت ہے کچھ فطرت ہے
گرداب یہ سمجھا بڑھ نہ سکے طوفان کے ڈر سے آگے ہم

شرحِ غم آسان نہیں، اس کا ہنر بھی چاہیے
اشک میں آمیزشِ خونِ جگر بھی چاہیے

پاگل تری طرف کہیں پتھر چلا نہ دے
شیشے کے گھر میں رہ کے تو اس کو صدا نہ دے

سرسوں کے پھول رائی کا پیدا کریں پہاڑ
بنجر زمین کو حوصلہ ایسا خدا نہ دے

آپ اسی سے لے گئے کتنے سرابوں کے دامن
خود رہا تشنہ، سمندر جس کے زیرِ دام تھا

یاد پرانی جب بھی آئی دل نے یہ محسوس کیا
ماضی کی بے خواب ڈگر پر خوابیدہ دیوار گری

سرد بدن کو چھو کر نادم لوگ یہی کل بولیں گے
مدت سے جو بوسیدہ تھی آج وہی دیوار گری

گھٹ رہے ہیں سنگ میں کتنے بتانِ بے شبیہ
آذری کو ہے ابھی دستِ ہنر کا انتظار

اگر چہرہ نہ ہو چہرہ، فقط ہو خول چہرے کا
تو نادم جو حقیقت میں ہے چہرہ کون دیکھے گا

وقت کا طوفان تو آ کر گذر ہی جائے گا
یاد کا بادل مگر صدیوں لہو برسائے گا

کچھ علم نہیں جس کو ابھی زیر و زبر کا
سب سے بڑا ناقد ہے وہی اہلِ ہنر کا

"دوہے" (جیون درشن سے منتخب شدہ)

بات کوئی کہنے سے پہلے سوچ سمجھ کر بول
کھول نہ دے نادانی تیری، تیرے ڈھول کا پول

ناک وہ اپنی اونچی سمجھے جیب سے جس کی تگڑی
شان دکھائے کل کا مزدور آج پہن کر پگڑی

نگری نگری کالے دھن کی جیب سے ہے بھرمار
ایرو غیرو، نتھو خیرو، سب ہیں ساہوکار

کلجگ کی پہچان یہی ہے پاپوں کی بھرمار
نگری پاپی، پاپ کا سودا، پاپ کا ہر بازار

جانے ہوں یا پہچانے ہوں سب پیسوں کے
پیسوں کی ہے دنیا ساری، پیسوں کا س

رباعیات ("لفظوں کا حصار" سے منتخب شدہ)

جو شخص برے وقت پہ کام آتا ہے
میرا ہے وہی دوست وہی اپنا ہے
کچھ بھی نہیں دنیا میں قرابت مندی
اخلاص کا رشتہ ہی بڑا رشتہ ہے

رکھتے ہیں بظاہر تو بلندی کا مقام
لیکن وہ حقیقت میں ہیں پستی کے غلام
ان کا یہی ظرف کہ پیسوں کے لئے
کتوں کا ادب کرتے ہیں گدھوں کو سلام

مسلک ہی نہیں کچھ بھی تو کیا ہو سالک
رکھے گا اگر ملک تو ہوگا مالک
آنکھوں میں جو رہ جائے تو کاجل کہلائے
رخسار تک آئے تو وہی ہے کالک

جاں سوز دل آزار تکلم سے گریز
فتنوں کے ستم خیز تبسم سے گریز
شوریدہ مزاجی سے بچا کر دامن!
کرتا ہوں عقیدوں کے تصادم سے گریز

آدھا رہی الفاظ کا یہ ٹھہرا ہے ؛ جو تیز ہے کانوں کا وہی بہرا
پایانی دریا نہیں ناپا جس نے ؛ ساحل سے ہے یہ کہتا ہے بہت

(بقیہ صفحہ ۳۷ پر)

غزلیں

فضا ابن فیضی

تعلقات کو دے دی، نئی جہت اس نے
عجیب ڈھنگ سے برتی منافقت اس نے

میں جس کے لمس سے برسوں تلک رہا مانوس
کھرچ کے پھینک دی وہ جسم کی پرت اس نے

اب اس کی سوچ کا انداز مختلف سا ہے
کہاں گنوادی، وہ ذہنی مطابقت اس نے

تمام چہرے، مجھے ایک جیسے لگتے ہیں
بکھیر دی ہے، وہ گرد مشابہت اس نے

یہ کس پڑاؤ پہ، دنیا نے اس کو روک لیا
قدم بڑھائے تھے، بے جادہ بہت اس نے

انا کے شیشے میں بال آئے، کب گوارا تھا
کبھی نہ وقت سے کی، یوں مفاہمت اس نے

نہ رولیوں پہ اصرار تھا زمانے کو
نہ چھوڑی پھر بھی وہ اپنی پرانی لت اس نے

چلو، کہ ختم ہوئی عدل کی توقع بھی
مجھی پہ نصب کی، میزان مصلحت اس نے

جب آؤں گھر میں، رگ و پے میں دھوپ کھلنے لگے
مرے مکان پہ ڈالی ہے کیسی چھت اس نے

تمام دانش و ابلاغ رہ گئے حیراں
کچھ اپنے فکر کی رکھی عجب نیت اس نے

رہا وہ مجمل معانی کی تہمتوں سے بری
نہ لی فضا کبھی الفاظ کی بچت اس نے

★

علیراج حیرت

کوئی ہمسفر نہیں ہے کوئی رہنما نہیں ہے
[illegible] کوئی آشنا نہیں ہے

یہ ہے احتجاج ہستی کہ ہوں عام کیف و مستی
اسے ناقبول مت کر یہ مری دعا نہیں ہے

مرا ظرف چاہتا ہے کوئی اور آزمائش
یہ کشاکش دل و جاں طلب آزما نہیں ہے

یہ جنوں کی داستانیں ہیں عجیب داستانیں
کہیں ابتدا نہیں ہے کہیں انتہا نہیں ہے

اسی سمت سے گئے ہیں ترے خاکسار شاید
یہی رہگزر ہے جس میں کوئی نقش پا نہیں ہے

کوئی ایسی قید مطلق ابھی داؤ پر لگی ہے
کہ شکست فاش سے بھی مرا دل بجھا نہیں ہے

یہ سوال کر رہا ہے مجھے کس لئے پریشاں
مرے حق میں کیا ہے گا رے حق میں کیا نہیں ہے

مرے عزم کی کمی ہے مری تشنگی کا باعث
یہ کرم ہے مجھ پہ اپنا کسی اور کا نہیں ہے

نہ تو موج ہے نہ ساحل مری زندگی کی منزل
میں خود اپنا مقتضا ہوں مرا مقتضا نہیں ہے

مری طرح میرا رب بھی ہے خلاف شرع حیرت
جو اسیر منصفی ہو وہ مرا خدا نہیں ہے

بہار کی ہمہ جہت ترقی ہمارا عہد

منصوبہ کیلئے مختص ۶۰ فیصد دیہی علاقوں میں خرچ

★ بہار کی موجودہ حکومت عوام کی معیار زندگی کو بلند کرنے اور ریاست کی ہمہ جہت ترقی کے لئے پابند ہے۔ دیہی علاقوں میں ترقیاتی پیش رفت کو تیز کرنے کے مقصد سے اب منصوبہ کا مختص ۶۰ فیصد رقم دیہی علاقوں میں خرچ کی جائے گی۔ حکومت کے عوامی فلاحی اقدام اور فیصلوں سے ترقی میں تیزی تو آئی ہی ہے سماجی اقتصادی تعلیمی اور صنعتی میدان میں بھی خوشگوار تبدیلی کا ماحول بنا ہے۔ بدعنوانی کی لعنت سے عوام کو راحت دلانے اور انتظامی جمود کو ختم کرنے میں حکومت کو اطمینان بخش کامیابی ملی ہے۔ اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا نیا ماحول بنا ہے۔

دیہی ترقیات

● ہمہ جہت دیہی ترقیات کے تحت درجہ فہرست اور درجہ قبائل کے لوگوں اور خواتین کے ۵۰ء۴ لاکھوں کنبوں کو ترجیحی بنیاد پر قرض فراہم کرنے کا انتظام

● ٹرائیسم اسکیم کے تحت ۳۵-۱۸ برس کی عمر کے ۲۳،۶۴۰ لوگوں کو تربیت یافتہ بنانے کا پروگرام

● دیہی سڑکوں پر اس برس ۷۵ کروڑ روپے منظور

جرائم کنٹرول

۱۹۸۹ء	واردات	کشیدگی
فرقہ وارانہ	۱	۶۹
مظالم ہریجن	۱۰۹۴	
ادیباسی	۱۵	
انتہا پسندی	۲۱۱	
۱۹۹۰	واردات	کشیدگی
فرقہ وارانہ	×	۲۲
مظالم ہریجن	۲۲۵	
ادیباسی	۱۵	×
انتہا پسندی	۲۱۱	×

پینے کا پانی

● دیہی علاقوں میں پینے کے پانی کے کل ۶۲ ہزار نئے وسائل پر ۵۱ کروڑ اور ۷۲ ہزار چاپاکلوں کی مرمت پر ۵ کروڑ ۶۰ لاکھ روپے اخراجات کا نشانہ

اصلاحی اراضی

● رواں مالی برس کے لئے ۱۱۰۰۰ ایکڑ زمین حد بندی زمین کے علاوہ ۵۰ ہزار ایکڑ زمین بے زمینوں میں تقسیم کرنے کا نشانہ

● اصلاحات اراضی کے تحت شروع سے اب تک بہار میں ۴۴۱۳ لوگوں سے حاصل کردہ ۶۸۰ء۲۵۴ ایکڑ اضافی زمین ۲۹۵۰۹۹ لوگوں کے درمیان تقسیم کی جاچکی ● جن لوگوں کو زمین الاٹ کیا گیا ہے ان میں ہریجن ذات کے ۶۱۷۷۱ افراد اور ادیباسی ذات کے ۵۵۴۴ دیگر طبقوں کے ۸۱۸۸۲ افراد شامل ہیں۔

تعلیم

● خواتین کے لئے مفت تعلیم ● اس برس بنیادی تعلیم میں ۵ لاکھ بچوں اور ۴۵ء۱ لاکھ بچیوں کا اضافی داخلہ۔

● پرائمری اسکولوں میں ۵۰ فیصد نشستیں طالبات کے لئے متعین۔

● ہریجن ذات کے لئے مفت نصابی کتابیں ● ۵۰۰۰ پرائمری گرلس اسکولوں اور ۱۰۰۰ اسکنڈری اسکولوں میں پینے کے اوصاف پانی کا انتظام ● پرائمری گرلس اور غیر رسمی تعلیم کے لئے ۲۴ کروڑ روپے کی بہار کی اسکیمو پر حکومت ہند اور یونیسیف کی رضامندی حاصل۔ ۱۹۹۰-۹۱ء میں ۱۱ کروڑ روپے خرچ کا نشانہ ● مکمل خواندگی کو متعین کرنے کے لئے رانچی ضلع کا چنا کیا گیا ہے ● ڈپلومہ سطح پر تکنیکی تعلیم میں اصلاح اور پالی ٹیکنک کی جدید کاری کے لئے ۸۰ کروڑ روپے کی عالمی بینک کی اسکیم پر عمل درآمد، اس پر ۹۱-۱۹۹۰ء میں ۱۲ کروڑ روپے خرچ نشانہ

۲۰ نکاتی پروگرام ● ۲۰ نکاتی پروگرام کے تحت جواہر روزگار اسکیم، اضافی زمین کی تقسیم، بندھوا مزدوروں کی بازآبادکاری، کمزور طبقے کے لوگوں کے لئے مکان، جدید قسم کے چولہے کی تعمیر میں ۸۰ فیصد سے زیادہ حصولیابی ہوئی ہے۔

روزگار کے لئے مواقع ● بے روزگار لوگوں کے تعاون سے بیروزگاروں کی امداد کے لئے نیو جن کمیشن کا قیام ● حکومت کے ذریعہ ۹۱-۱۹۹۰ء میں چھپرہ ضلع بے روزگاری کے مکمل انسداد کے لئے منتخب ● مزدوروں کو کم از کم مزدوری ۱۶ روپے یومیہ مقرر ● امداد باہمی کمیٹی قائم کر بیڑی مزدوروں کی مزدوری میں ۶ روپے کا اضافہ ● غریب لوگوں کے [illegible] میں رین بسیرا اور سرکاری خرچ پر کھانا ● بے روزگار نوجوانوں کو نوکری کے لئے درخواست فارم کے ساتھ پوسٹل آرڈر ختم ● انٹرویو کے لئے اسٹیٹ روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن کی بسوں میں مفت سفر، بیروزگاری بھتہ ۵۰ روپے سے بڑھاکر ۱۰۰ روپے کرنے کا انتظام ● مجاہد آزادی کے پنشن میں ۵۰ روپے کا اضافہ ● خواتین کے لئے سرکاری ملازمت میں داخلہ کی عمر حد ۳۰ برس سے بڑھاکر ۳۲ برس کرنے کا انتظام۔

سیلاب کنٹرول ● سیلاب کنٹرول اسکیموں کے لئے ۴۰ کروڑ روپے کی منظوری دی گئی ہے۔ محکمہ ریلیف کے ذریعہ بھی ۲ کروڑ روپے دیا گیا۔

فلاح ● ہاسٹلوں میں رہنے والے ہریجن اور آدیباسی طلبا کے اسکالرشپ ۴۰ روپے سے بڑھاکر ۸۰ روپے کرنے کا انتظام ● خواتین کی ترقی کے لئے خواتین فلاحی کارپوریشن کا قیام ● محکمہ دیہی ترقیات کے ذریعہ ریاست کے ۱۴ ضلع کے ۱۳۲ بلاکوں میں خواتین کی ترقی کے لئے پروگرام ● ضعیف العمر بے سہاروں، بیواؤں اور معذوروں کی پنشن رقم ۳۰ روپے سے بڑھاکر ۱۰۰ روپے کردی گئی۔

نظم و نسق ● ضلعی انتظامیہ کو چست اور درست کرنے کے مقصد سے ۱۰ کروڑ روپے کی رقم جاری کی گئی ہے ● پولیس دستہ کو طاقتور اور جدید اسلحے سے لیس کرنے کی کوشش۔ کمپونٹ بٹالین کے لئے مکمل تقرریاں ● پولیس کی جدید کاری کے لئے ۲۰ کروڑ روپے کی لاگت کی اسکیموں پر عمل درآمد ● جرائم پر قابو پانے کے لئے شراب کی دکانیں اب ۸ بجے صبح سے ۷ بجے رات تک کھلی رکھنے کی ہدایت۔

توانائی کا فروغ ● اضافی توانائی پیداوار کے لئے بہار الیکٹریسٹی ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے قیام کا فیصلہ ● حکومت بہار بجلی کی پیداوار کے لئے سنگھ بھوم ضلع میں ایک تھرمل پاور اسٹیشن [illegible] جاری ہے۔ نجی ملکیت میں بجلی پیداوار کو فروغ۔

صنعت ● صنعت کاروں میں کھلی صلاحیت کی بنیاد پر ریاست میں سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی۔

انسداد بدعنوانی ● اچانک معائنہ سے کام کے تئیں رغبت ● محکمہ نگرانی کے ذریعہ بڑے پیمانے پر چھاپہ ماری جاری ● بدعنوان افسروں کے خلاف کارروائی کی مہم ● عوام کی تعریف۔

فرقہ وارانہ واقعات پر قابو ● حکومت کے قوی ارادہ اور مستحکم ارادے سے خیرسگالی کا نیا ماحول بنا ● کل جماعتی کمیٹی کی تشکیل کی گئی ہے ● رام نومی، عید الفطر اور محرم پہلی مرتبہ پرامن طور پر منایا گیا۔

چھوٹی آبپاشی ● چھوٹی آبپاشی کے تحت نجی شعبہ میں ۹۱-۱۹۹۰ء میں کمزور طبقوں کے لئے ایک لاکھ ۱۹ ہزار ۸ ٹیوب ویلوں کے تنصیب کا پروگرام

جاری کردہ: **اطلاعات و تعلقات عامہ، بہار**

P.R-168 D(Ung-127)90-91

گجراتی نظمیں

پنّا نایک

علام رزاق شیخ

گذشتہ دو دہائیوں کی گجراتی شاعری میں جن شاعرات نے اپنی شناخت قائم کی ہے ان میں وِجو گنا ترا، سروپ دھرو، جیا مہتا اور پنّا نایک کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں بھی موخرالذکر شاعرہ کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ پنّا نایک کے اب تک تین شعری مجموعے (پرویش، فلاڈلفیا، اور سنیٹ) شائع ہوکر قبولِ عام کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ حال ہی میں گجرات ساہتیہ اکادمی، (حکومت گجرات) گاندھی نگر نے پنّانایت کا ایک نہایت عمدہ انتخاب گجراتی کے مشہور نقاد شاعر سریش دلال کے وقیع مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ یہ انتخاب گجرات کی کئی یونیورسیٹوں کے نصاب میں بھی شامل ہے۔ زیرِ نظر تراجم اسی انتخاب کی چند نظموں کو اردو کے قالب میں پیش کرنے کی ایک طالب علمانہ سعی ہے ـــ مترجم

سنیپ شاٹ

آج خوش ہوں
کیوں؟ معلوم نہیں
اس خوشی کا
'سنیپ شاٹ' لے کر
اسے فریم کروا کے
خواب گاہ میں سجا سکتے ہیں؟

تنگ گلی / پگڈنڈی

جھٹپٹے کے وقت
دھندلی روشنی میں
خوابوں کے پچھواڑے
کھڑے
اُن
عُریاں درختوں
گونگی چٹانوں
بانجھ صحرا
اور
ریزہ ریزہ آسمان
ان سب کے بیچ
جہدِ مسلسل میں مصروف
ٹیڑھی میڑھی زندگی کی
ایک پگڈنڈی

لمس

آج سخت سردی کے
زرد صحرا میں
چاہتی ہوں
گل مہر کے جھومتے شعلوں کا لمس
پھر
میں خود بسنت بنچی

ہم

ہم
اتنے قریب
پھر بھی زندگی
زندگی بھر
ایک دوسرے کو دیکھا کرتے ہیں!
جیسے
میں اسٹیشن پر
اور
تو
گزرتی ہوئی ٹرین کا مسافر

آسماں ہاتھ آگیا

درختوں کی دو
لچیلی شاخوں کے درمیان
جھکا آکاش
کچھ
اتنا
کہ
تارے توڑنے کو
ہاتھ لمبایا
تو
ہرسنگھار اور مولسری کے
خوشوں کے ساتھ
پورا آسمان
ہاتھ آگیا ●

دیکھتے رہیں

سوکھے درخت کی
بے برگ شاخوں پر
پر بریدہ دو پرندے
بیٹھے بیٹھے دیکھتے ہیں
نیچے
زمین پر
خزاں کے
بکھرے ہوئے پتوں میں
ایک آدمی کو
اپنے دست و بازو تلاش کرتے......

کہاں تک

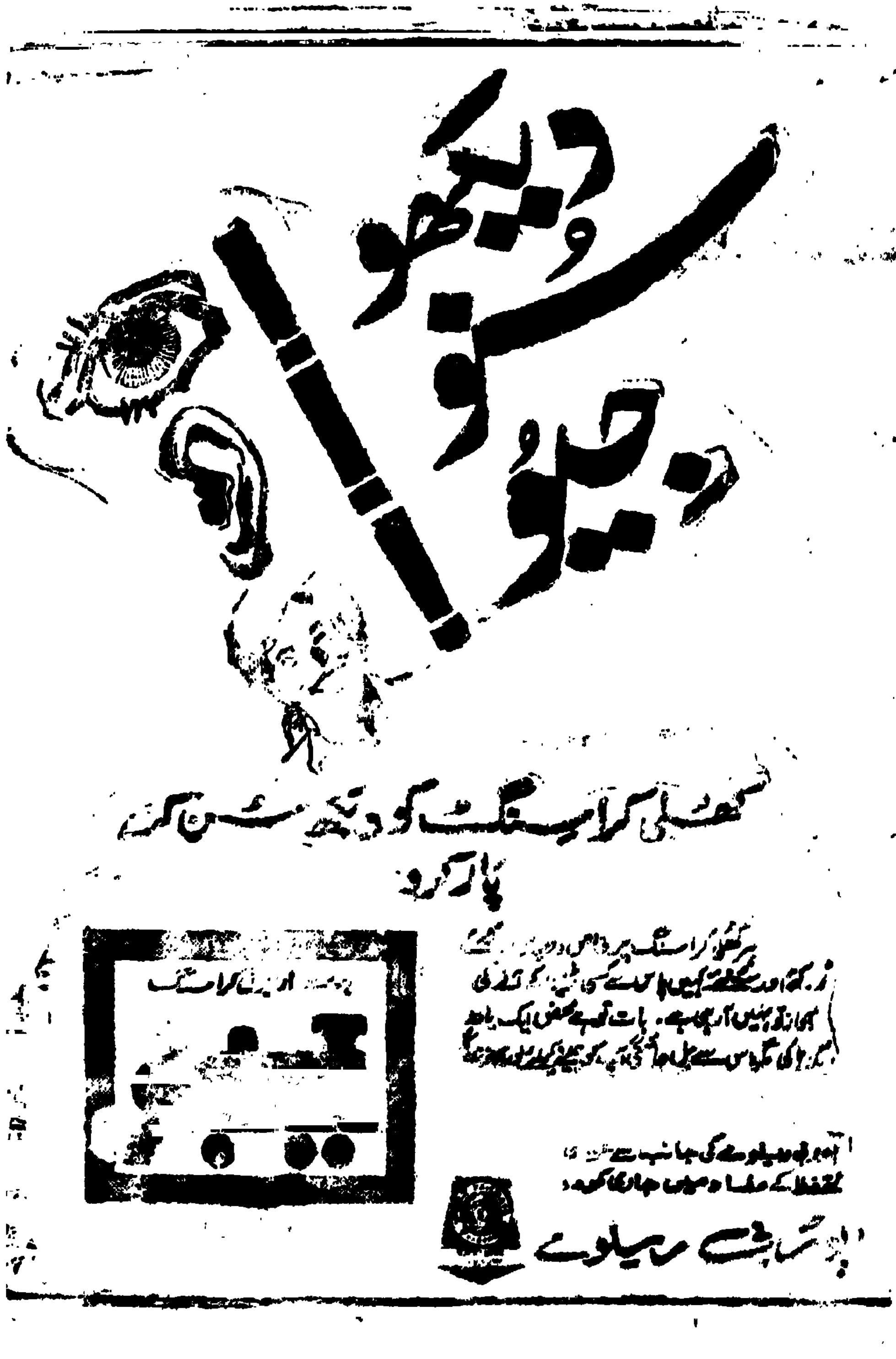
تجھے لکھتے ہوئے
بیت گئے برسوں
لیکن
کچھ ہلکی یادوں کے سہارے
تیرا خاکہ کھینچتی ہوں
تیرے ہاتھ ہیں ؟
پھر کیوں نہیں لیتا آغوش میں اپنی
تیرے پیر ہیں ؟
پھر کیوں نہیں آتا دوڑ کر مرے پاس
بصارت کا حامل ہے اگر تو
ایسا کیوں نہیں لیتا مجھے، تو اپنی آنکھوں میں ؟
لیکن سوچتی ہوں
چکنا ہے تو اس سے کہیں زیادہ
ان سیاہ لکیروں کے پنجرے سے
تو پھسل جاتا ہے، دُو.....ر بہت دُو.....ر
کسی طرح بھی قید نہیں کر سکتی تجھے میں
کہاں تک
لکیریں کھینچتی رہوں گی
اور تو
پھسلتا رہے گا۔
کہاں تک ؟

آخری دیدار کو آئے ہوئے محبوب سے

تیرے بروقت نہ آنے کی
فریاد
اب کیسے کروں ؟
یہاں
بہت سے لوگ موجود ہیں
اور
میرے لب بند ●

لرزش

پانی پر نظم لکھتے ہوئے
لرز گیا ہوا کا ہاتھ..... ●


دیکھو
سنو
جیو
کھلی کراسنگ کو دیکھ سن کر
پار کرو
ریلوے

کہاں چلے جاتے ہیں یہ لڑکے

شبیر حسن

ہندی سے ترجمہ

گاؤں میں ہمارے
کھیل کا ایک میدان ہے
جہاں روز
لڑکے جمع ہوتے ہیں
گیند کھیلتے ہیں
آپس میں ہنسی مذاق کرتے ہیں
دیکھنے والوں کی بھیڑ بھی جمع ہوتی ہے
خوب تالیاں بجتی ہیں
خوب مزہ آتا ہے

میدان میں
کھیلتے ہوئے لڑکے
بہت ہی اچھے لگتے ہیں
بالکل تازہ پھولوں کی طرح
لیکن کہاں چلے جاتے ہیں یہ لڑکے ؟

چند برسوں بعد
پھر کبھی نظر نہیں آتے
نظر آتے بھی ہیں تو
پریشان اداس
بالکل مرجھائے ہوئے سے
میدان میں گل موہر کے پیڑ
اب ہیں جوان
لال۔ لال پھولوں کی فصلیں
آتی رہتی ہیں ان میں
لیکن کہاں چلے جاتے ہیں یہ لڑکے ؟

درد کا رشتہ

بچپن میں
دیکھا تھا
اپنے سفید رنگ کے بیل کی موت پر
اعظم بھائی کو روتے
بڑا تعجب ہوا تھا
کیوں ؟
کوئی روتا ہے، اپنے بیل کی موت پر
اس وقت کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا
رونا اعظم بھائی کا
ایک جانور کی موت پر
لیکن جب وقت گذرا
اور سمجھا
کسان، کھیت اور بیل کا رشتہ
زندگی کے ساتھ کا
سکھ، دکھ کا رشتہ
باڑھ، سکھاڑ اور اکال کا رشتہ
تو پھر ہو گیا ہے
بالکل آسان یہ سمجھنا
کہ
کیوں ایک غریب کسان
روتا ہے اپنے بیل کی موت پر
کیوں روئے تھے اس روز
اعظم بھائی
اپنے سفید رنگ کے بیل کی موت پر

قیصر جمال

ہر طرف بکھرے در و دیوار تھے
گھر کے بربادی کے یہ آثار تھے
لڑکیاں بیٹھی ہیں شوکیس میں
کتنے چھوٹے شہر کے بازار تھے
معرکوں کا سلسلہ در سلسلہ
کیسے کیسے میرے بھی کردار تھے
عمر بھر سوچ تھا میرا سائباں
جسم پہ خوابوں کے پیہم وار تھے
سو گیا آنکھوں میں منزل کا جنون
پاؤں پھر بھی مائل رفتار تھے
بیٹیوں کے سر سفیدی چڑھ گئی
ماں کے آنچل میں چھپے انگار تھے
سوچتا رہتا ہوں میں قیصر جمال
میں بھی کیا تھا، کیا مرے اشعار تھے

کمال جعفری

مال و زر کو زندگی کا مدعا کہتے ہیں آپ
جو ہے رہزن اس کو اپنا رہنما کہتے ہیں آپ
آپ کی حسن نظر کا بھی عجب ہے انتخاب
بے وفا لوگوں کو اکثر باوفا کہتے ہیں آپ
جس پہ چل کر آدمی پائے نہ منزل کا سراغ
کیا ترقی کا اسی کو راستہ کہتے ہیں آپ
اپنی ہستی کی حقیقت سے نہیں خود آشنا
آپ ہی کہئے کہ اس پستی کو کیا کہتے ہیں آپ
کیوں نہ کھائیں آپ کی سادہ دلی کی ہم قسم
اپنی نادانی کو جب اپنی انا کہتے ہیں آپ
جس ہوا کے لب پہ شامل ہو نہ پیغام چمن
اس کو کس بنیاد پر باد صبا کہتے ہیں آپ
قوم کی یکجہتی ہو قائم جس سے بھارت میں کمال
ایسی ہر کوشش پہ ہر دم مرحبا کہتے ہیں آپ

گوہر جمالی

وہ بھی ہیں رام کے آدرش سے غافل یارو
ہم بھی کردار پیمبر کے ہیں قاتل یارو
کوئی مقصد نہ تمنا ہے نہ منزل یارو
پھر بھی ہم قافلے والوں میں ہیں شامل یارو
سارے اخلاق کے رشتے ہوئے درہم برہم
درد کے دشت میں جب سے ہوئے داخل یارو
موج طوفاں سے ڈرانے کی نہ کوشش کرنا
میری تدبیر کی مٹھی میں ہے ساحل یارو
کتنے انسانوں کا سر کاٹ کے بستی بستی
تمغۂ امن لئے پھرتا ہے قاتل یارو
نام سجاد ہے گوہر ہے تخلص میرا
شعر کہنا نہیں میرے لئے مشکل یارو

ملک زادہ جاوید

گرائے گئے جب بزرگوں کے گھر
حوالے ملے خاندانی مجھے

وراثت پہ آنسو بہاتی ہوئی
حویلی ملی اک پرانی مجھے

محبت کا وعدہ نبھائے گا وہ
کہ دی ہے انگوٹھی نشانی مجھے

بہت تیز بارش ہوئی جو کبھی
دیا رنگ موسم نے دھانی مجھے

سدا کھینچ لیتی ہے اپنی طرف
گزرتی ندی کی روانی مجھے

شاہد عزیز

ہستیوں سے دور ہیں کچھ بستیاں
جانے کیوں معذور ہیں کچھ بستیاں

صرف جینے کے لئے مرتی رہیں
کس قدر مجبور ہیں کچھ بستیاں

ہر کسی کے لب پہ کوئی نام ہے
نام سے مشہور ہیں کچھ بستیاں

کیوں لئے پھرتی ہیں سر پہ بوجھ یہ
کیوں تھکن سے چور ہیں کچھ بستیاں

وقت کی آنکھوں میں کتنے سال سے
آج تک ناسور ہیں کچھ بستیاں

زندگی کے جنگل میں

زندگی کے جنگل میں
دور تک سمندر ہو
ہر طرف کناروں پہ
سبز باغ پھیلے ہوں
خوشنما مکانوں کی
چھت پہ چاند اترا ہو
ہر طرف فضاؤں میں
خواہشوں کی خوشبو ہو
راستے مجھے میرے
نام سے بلاتے ہوں
سوچتا ہوں ایسا ہو
آج نیند آئے تو
خواب دیکھوں...
جی بھر کے —

غزلیں

اختر شاہجہاں پوری

○

وہ جسے اک بار بھی میں نے کہیں دیکھا نہ تھا
اس کی فرقت خون رلوائے گی یہ سوچا نہ تھا
پیاس کی شدت نے ہم کو یہ سمجھنے کب دیا
وہ سرابوں کا سفر تھا وہ کوئی دریا نہ تھا
ریزہ ریزہ ہو گیا پھر کس لئے میرا وجود
اس نے جب سنگِ ملامت مجھ پہ بھی پھینکا نہ تھا
وقتِ رخصت آج تو کچھ حال تھا اس کا عجب
اس سے پہلے تو کبھی وہ دور تک آیا نہ تھا
دھوپ کا عفریت حاکم تھا سرِ راہِ طلب
پیڑ سایہ دار تھے لیکن کہیں سایا نہ تھا
کیا ڈراتا ہم کو موجوں کا تموج دوستو
ریت پر ہم نے کسی کا نام تو لکھا نہ تھا
یوں رہا انجان اختر سرد و گرمِ دہر سے
وہ حصارِ ذات سے باہر کبھی آیا نہ تھا

○

یقین نہیں ہے تو پھر کچھ گماں بھی نہ رہ
سروں پہ چھت جو نہیں آسماں بھی نہ ر
جہاں نہ دھوپ نہ تازہ ہوا نہ یکسو
اگر یہی ہے مکاں تو مکاں بھی نہ ر
سجا لیا کرو ایسی خوشی کی تحریر
کہ چہرہ غم کا کبھی ترجماں بھی نہ
اگر پرندہ نہ توڑے زمیں سے ر
تو پھر یہ طے ہے کہ اونچی اڑان بھی نہ
یہ سوچ لو کہ مقابل رہے گی دھوپ
اگر خدا نہ کرے سائباں بھی نہ ر
اسی لئے کہ ہیں کچھ تجربات بھی نہ
جو مہرباں ہے کبھی مہرباں بھی نہ
سفر پہ نکلو تو ہمت نہ ہارنا اختر
شکستہ کشتی ہو یا بادباں بھی

*

غزلیں

منصور درویش

○

پاؤں زخمی سر پہ گٹھری زندگی کی میری طرح
بڑھ رہی ہے سوئے منزل یہ صدی میری طرح

کون ہے پھر مجھ میں میرا ہے نہ جو سقراط ہے
اور کہتا ہے کہ زہر عشق پی میری طرح

میرے لہجے کی سمجھنی ہے اگر بے لہجگی
گونج اپنے آپ میں اور ہونٹ سی میری طرح

ایک قطرے کی حدوں میں ہے میری تشنگی
اور ریگستان کہتا ہے کہ پی میری طرح

آہ کاسہ بھی مرا وہ پھینک دیگا چھین کر
کون اس کے در سے لوٹے گا تہی میری طرح

خود کو ٹھہرایا نہیں محرم جب ... دربار میں
کیا ... ہوگی ... میری طرح

ابر ہوں میرے پیروں کو ... تو حسرت سے دیکھ
خشک دھرتی میں سما جا تو بھی میری طرح

○

راہگیر ہوں مجھ سے ترا رشتہ ...
وہ پیڑ ہے تو جو لیسن دیوار ...

انگریز مورخ کی گواہی یہ مرا ...
ناکردہ گناہوں کی سزا کا ...

ہر چند وہ اک آہنی دیوار ...
جھڑتے ہوئے ریشوں نے اسے ...

آتا نہیں اس کو ابھی ...
لگتا ہے کہ اس شہر ... وہ

جھگی میں کوئی ... ہوئے
یا ... ہر اک شخص کی ...

کھڑکی سے تو بلوالیا اس نے مجھے درویش
میں نے بھی مگر سر کو نہیں جھکنے دیا ہے


شمسی شعاعوں کا استعمال زیادہ
سے زیادہ کیجئے۔ یہ مقدار میں بے حساب
اور مفت دستیاب ہیں۔
توانائی بچائیے
بجلی کی بچت ہی
بجلی کی
پیداوار ہے
جاری کردہ محکمہ بجلی، وزارت توانائی
بھارت سرکار، نئی دہلی 110001

نوشاد احمد کریمی

سلگتے خیموں سے دور

ایسی ہی بستی میں اچانک چلنے والی گرم لہر سے خود کو [illegible] ہوا ایک قافلہ ڈگمگاتے قدموں سے راتوں رات بھاگ [illegible] سورج کی نئی روشنی کو ڈھونڈتا ایک نئی آبادی میں وارد [illegible]۔ لیکن ــــ یہاں کا منظر بھی عجیب تھا۔ سارے قبیلے اپنے خیموں میں دبکے ہوئے تھے۔ ہر طرف خاموشی تھی، ہر سمت [illegible] ماتا تھا۔ نالیوں میں تیرتی ہوئی اگلتے ہوئے سورج کی بےجان، افق بیوہ مانگ کی طرح ویران، راستے آسمان [illegible] سنسان!

تو وارد قافلہ متحیر تھا کہ کیا کرے، کہاں جائے، [illegible] جگہ قیام کرے؟ قافلے کے سربراہ نے کہا۔ چلو۔ باری باری [illegible] خیموں کے دروازوں پر آواز لگائیں۔ ممکن ہے پناہ کی [illegible] کی شکل آئے! قافلہ والوں نے سربراہ کے آگے سر تسلیم [illegible] خم دیا۔ خیموں کی طرف بڑھے۔ پہلے خیمہ کے دروازے پر آواز [illegible] خیمے کا سربراہ باہر آیا۔

"کون ہو تم؟" سربراہ کے لہجے میں تحیر تھا

"ہم انسان ہیں۔ [illegible] پناہ چاہتے ہیں!"

خیمے کے سربراہ نے [illegible] کو غور سے دیکھا۔ [illegible]

[illegible] بولا۔ "ہم وہ نہیں جو تم ہو!" اور ان سے کچھ اور کہے، کچھ اور سنے بغیر خیمے میں چلا گیا۔

اہل قافلہ نے ایک دوسرے کو دیکھا، اور آگے بڑھ گئے۔

دوسرے خیمے کا سربراہ بھی ان کی آواز سن کر باہر آیا۔

"تم کون ہو؟" سربراہ کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی۔

"ہم انسان ہیں، پریشان ہیں، پناہ چاہتے ہیں؟"

خیمے کے سربراہ نے انہیں نوکیلی نظروں سے دیکھا اور کٹیلی آواز میں بولا۔ "تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے، غلط جگہ آ گئے ہو!" اور وہ بھی مزید کچھ سنے خیمے میں واپس لوٹ گیا۔

قافلہ عالم استعجاب میں لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھا۔ تیسرے خیمے کے سربراہ نے بھی یہی سوال کیا۔

"تم سب کون ہو؟" سربراہ کا لہجہ وحشت زدہ تھا۔

قافلہ والوں نے پھر وہی جواب دیا۔ "ہم انسان ہیں، پریشان، مصیبت زدہ، پناہ چاہتے ہیں!"

قافلے والوں کی بات سن کر خیمے کا سربراہ پرسکون دکھائی دینے لگا۔ کچھ سوچ کر چند لمحوں بعد بولا۔

"تم لوگوں کی بات میری سمجھ سے باہر ہے!" اور وہ بھی

خیمے کے اندر چلا گیا

قافلہ اور آگے بڑھا، آواز دی۔

"جو تھے خیمے کے سربراہ ... خارزار تھا۔" اے یہ مسافر خانہ نہیں ہے؟"

قافلہ خود کو گھسیٹتا آگے بڑھتا رہا۔ خیموں کے دروازوں پر آوازیں دیتا رہا۔ اور مایوس و نامراد ہوتا رہا۔ پناہ کی تلاش میں دوپہر ہو گئی، سب تھک گئے، نڈھال ہو گئے، مگر نوالہ ... نہ ملا۔ قافلے کا ایک فرد سربراہ سے مخاطب ہوا۔

"صبح سے دوپہر ہو گئی، ہم آوازیں دیتے رہے اور مایوس ہوتے رہے، مدد طلب کرتے رہے اور ناکام ہوتے رہے۔ کسی کو ہم پر ترس نہیں آیا۔ قبل اس کے کہ شام اور شام کے بعد رات ہو جائے کیوں نہ ہم اپنا سفر جاری رکھتے ہوئے اس گہرے، نیلے اور وسیع سمندر کے اس پار چلیں۔ ممکن ہے اس پار پناہ کی کوئی صورت شکل آئے۔"

"اس پار بستی ہے؟" دوسرے نے سوال کیا

"ممکن ہے ہو۔" قافلے کا تیسرا فرد بولا۔

"لیکن ہم میں سے آج تک کوئی ادھر نہیں گیا۔ کسی کو معلوم نہیں ادھر کیا ہے، محض قیاس آرائی کی بنا پر خود کو سمندر میں ڈال دینا دانشمندی ہے؟" یہ آواز قافلے کے چوتھے فرد کی تھی۔

"کسی کو معلوم نہیں ادھر کیا ہے، تو ادھر بھی ہمارے لئے کیا ہے؟ اور یہ ضروری نہیں کہ ہم وہی کریں جو کرتے رہے ہیں۔ اور — اور پھر یہ کہ ہم عمر خضر لے کر تو نہیں آئے ہیں جو ہوگا دیکھا جائے گا!"

قافلہ کے سربراہ کو آواز کی یہ کھنک نئی معلوم ہوئی اور پھر — تپتی ہوئی ریت پر نقشِ حیات ثبت کرتا قافلہ سمندر کی طرف روانہ ہو گیا۔ آفتاب غروب ہوا تو شب تاریک نے شام کے مٹیالے اندھیرے پر یلغار کر دی۔ ہر سمت سیاہی بکھر گئی۔ خلاف توقع فضا میں طوفان برپا ... دیکھتے ہی دیکھتے طوفان کے سلسلے آسمان سے لے کر فضا ... اور فضائے بسیط کے کرمیں پر اور سطح سمندر پر ... کے ... گہرے سیاہ بادلوں چاند ستاروں ... وجود گم ہو گیا۔ باد و باراں کی گھن ... اس قدر بڑھی ... سمندر بپھرا اٹھا۔ لہریں یوں ابال کھانے لگیں جیسے ایک ... سوار چند انسانوں نے ان کی انا کو پامال کر دیا ہو۔ تنکے ... تھپیڑے کھانے لگی۔ ڈوبنے اور ابھرنے لگی۔ بعض سرکش ... کشتی کو اتنا اوپر لے جا کر چھوڑتیں کہ بچ جانے کے سارے ... کٹ جاتے۔ ناخدا کے ہاتھوں میں کشتی کی لگام بے معنی رہ گئی تھی۔ لیکن کشتی کے سواروں پر خوف مسلط نہ ... ان کے دلوں میں طوفان پر قابو پا لینے اور کنارے لگ ... کے یقین کی مشعل فروزاں تھی۔

اور جب شب تاریک پر دن کا اجالا غالب ... لگا تو طوفان اور موسلا دھار بارش کا زور ٹوٹنے ... پرسکون ہونے لگی۔ سمندر کی سرکش لہریں تھک کر ... لگیں۔ کشتی کنارے لگی۔ قافلہ کے افراد کشتی ... لیکن یہاں کا منظر بھی عجیب تھا۔ کوئی آبادی نہ آدمی ... آگے دور تک ریت کا سلسلہ اور پیچھے چڑھتا اترتا اور وسیع سمندر۔ قافلہ چل پڑا۔ حد نگاہ تک پھیلی ... حیات ثبت کرتا۔ دہکتا ہوا سورج جلتی ہوئی ... نیزے برساتا رہا۔ اور قافلہ بڑھتا رہا۔ اور جب سو... مغرب کی طرف جھکنے لگا تو اس کے جاہ و جلال پر ... اندھیرا مسلط ہونے لگا۔ اور تب اہل قافلہ نے دیکھا سامنے دور تک پھیلا ہوا جنگل تھا، گھنا، سر... کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ کیا ... کیا جائے۔ قافلہ کے سربراہ نے کہا۔





"ہم اپنے انجام سے بے خبر یہاں تک آئے ہیں۔ اب جو [ہو] دیکھا جائے گا۔ چلو جنگل میں چلتے ہیں۔ ممکن ہے پڑاؤ کے [لئے] کوئی معقول جگہ نظر آجائے۔ رات تو بہرحال کسی نہ کسی طرح [بسر] کرنی ہی ہوگی۔

قافلہ جنگل میں داخل ہوکر کچھ ہی دور آگے بڑھا تھا [کہ] ایک ساتھ کتنی ہی ڈری ہوئی، سہمی ہوئی آوازیں بلند [ہوئ]یں۔

"وہ — وہ دیکھو ہمیں گھورتی ہوئی کتنی ہی چمکتی ہوئی [خونخو]اری آنکھیں!"

"کہاں؟" کئی ایک ساتھ چیخے۔ یکلخت ان کے [اوس]ان خطا ہوگئے، ان پر خوف مسلط ہوگیا۔

"وہ — وہاں سامنے والی جھاڑیوں کے پیچھے!" [خوف] زدہ آوازوں کے ساتھ کتنی ہی لرزتی ہوئی انگلیاں سامنے [اٹ]ھ گئیں۔

قافلہ کے سربراہ نے خوف زدہ آنکھوں سے سامنے [دیکھ]ا۔ لمبی سانس لی، اور پرسکون ہوتے ہوئے بولا۔ دُھت! وہ انسانوں کی نہیں جنگلی درندوں کی [آنکھ]یں ہیں۔ تم سب خواہ مخواہ ڈر گئے۔

اور قافلہ بلا خوف، اطمینان سے آگے بڑھنے لگا!!

واجب الادا انکم ٹیکس کا لیکھا جوکھا

ابھی سے کرلیں

راشٹریہ بچت پروگراموں میں سرمایہ کاری
رقم کا 20% (زیادہ سے زیادہ 10,000/روپیہ)
آپ کے واجب الادا ٹیکس سے گھٹا دیا جائے گا

راشٹریہ بچت پروگرام 87 میں سرمایہ
40000 روپیہ تک کی رقم کل ٹیکس سے
گھٹا دی جائے گی ۔

یہ سہولت مندرجہ بالا سہولت
کے علاوہ

اپنے قریبی راشٹریہ بچت آفیسروں سے رابطہ قائم کریں

(جاری کردہ)

ڈائریکٹر، راشٹریہ بچت، بہار، پٹنہ

P.R. No. 159 (Inf/20) 90.91

ذاکر نثار

"ڈر"

شہر میں دھارا ۱۴۴ کا نفاذ تھا
لوگ چار کی تعداد میں ایک جگہ اکٹھا نہیں ہو سکتے تھے۔ سبھی اپنے اپنے مکانوں میں دبکے تھے۔ مکتب کھلا تھا مگر بچے غائب تھے۔ اسپتال کھلا تھا۔ ڈاکٹر ندارد تھے۔ مکانوں کی کھڑکیاں، دروازے بند تھے۔ چوراہوں پر پولیس کھڑی تھیں اور ان کی گاڑیاں گشت کر رہی تھیں۔ گھوڑ سوار گھوڑے دوڑاتے پھر رہے تھے۔ عام لوگ ہی نہیں، پولیس والے بھی اندر ہی اندر ڈرے سہمے سے تھے۔ بات ہی خوف وہراس کی تھی۔ مٹھی بھر درندوں کے خوف سے سارا علاقہ خوف زدہ تھا۔ انہوں نے لوگوں کے دلوں میں اپنا خوف، اپنی دہشت بٹھانے کی خاطر کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ مکتب کے معصوم بچوں سے بھری بس نذرِ آتش کردی گئی تھی۔ اور اب ان کا نشانہ معروف وکیل دھرم داس تھا۔ وہ درندوں کے خوف سے پولیس کی حفاظت میں جی رہا تھا۔ انہوں نے اس دن کے اندر اسے مار ڈالنے کی دھمکی دی تھی۔ اس کا قصور یہی تھا کہ اس نے ایک مشہور درندہ کو سزا دلادی تھی۔ آج وہ اپنے گھر جا رہا تھا۔ اپنی بیوی بچے کو ڈھیر سارا پیار دینے جا رہا تھا۔ [illegible]

پولیس سپرنٹنڈنٹ نذیر خان کی گاڑی رینگ رہی تھی جس میں دھرم داس بیٹھا تھا اور اس کے پیچھے ایک گاڑی اور پولیس چل رہی تھی۔ پولیس کی گاڑیاں شہر کے مختلف مقامات سے ہوتی ہوئی اس کے گھر کی طرف رفتہ رفتہ بڑھ رہی تھی۔ اچانک دھرم داس چیخا ـــ بچاؤ ـــ بچاؤ ـــ"

ایس پی خان نے مڑ کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا وہ خوف زدہ تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں، ماتھے پر بل تھا وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔

"کیا ہوا ؟" خان نے پوچھا

"و......ہ......ل...و...گ...."

"کون لوگ ؟"

"د...ر.....ن...د....ے..."

"آپ کے دل میں ان کا خوف بیٹھ گیا ہے۔"

"نہیں... نہیں... میں نے اپنی آنکھوں سے ان کو موٹر سائیکل پر آتے دیکھا ہے، ان کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔"

اس کی آنکھیں بند تھیں اور زبان چل رہی تھی۔

ایس پی خان کڑک کر بولا۔

" [illegible] "

"مجھے بچا لیجئے .... مجھے بچا لیجئے ..."

وہ بچوں کی مانند پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"رونا دھونا بند کیجئے، آنکھیں کھولئے اور دیکھئے دور دور تک ایک بھی موٹر سائکل کا نام و نشان نہیں ہے۔"

اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ واقعی دور دور تک کسی گاڑی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ صرف ایک وہم تھا، ایک دہشت تھی۔ اور باتوں باتوں میں اس کا گھر آگیا۔ پولس کی گاڑی اس کے دروازے پر ایک دھچکے کے ساتھ رکیں۔

ایس. پی. خان اترا۔ پھر دھرم داس اترا۔ اس کی چھوٹی بچی اس کے قدموں سے لپٹ گئی، اس نے اپنی بچی کو گود میں اٹھالیا۔ جی بھر کر پیار کیا اور پھر چھوٹے چھوٹے قدم بڑھاتے ہوئے بیوی کے قریب گیا، آہستہ سے پوچھا۔

"کب سے انتظار کر رہی ہو؟"

"اسی دن سے۔"

"آپ کا انتظار ختم ہوا، جب بھی پولس کی ضرورت پڑے بے خوف آواز دیجئے گا کیونکہ پولس آپ سب کی حفاظت کے لئے ہے۔"

"شکریہ!"

اور ایس پی خان گاڑی پر بیٹھا اور پولس کی گاڑی چل پڑی اور وہ ان کی گاڑیوں کو دور تک جاتے دیکھتا رہا۔

شہر سے دھارا ۱۴۴ اٹھا لیا گیا۔ رفتہ رفتہ سب کچھ معمول پر آنے لگا۔ لوگ سڑکوں پر آنے جانے لگے۔ مکتب میں بچے آنے لگے۔ اسپتال میں ڈاکٹر آنے لگے۔ بازار کھل گیا۔ دکانیں کھل گئیں۔ چوراہوں سے پولس ہٹ گئی۔ گھوڑ سواروں کی گشت بند ہو گئی۔ دھرم داس تنہا تنہا سڑکوں پر، بازاروں میں اور سنیما گھروں میں دیکھا جانے لگا تھا۔ ایک دن وہ اپنی بچی کے ساتھ بازار میں دیکھا گیا تھا۔

اور آج وہ اپنے خاندان کے ساتھ ایک کھلونے کی دکان پر تھا۔ اچانک ایک شور اٹھا۔

"بھاگو .... بھاگو ....."

اور افراتفری مچ گئی۔ دکانوں کے شٹر گرنے لگے۔ لوگ اپنی اپنی جان لے کر بھاگنے لگے۔ لوگوں کو بھاگتے دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ بھاگے .... یا مقابلہ کرے .... پھر اسے خیال آیا میں تنہا نہیں ہوں میرے ساتھ بیوی ہے۔ بچی ہے۔ یہ سوچ کر اس نے بچی گود میں اٹھالیا اور بیوی کا ہاتھ پکڑ کر بھاگنے لگا۔ کچھ دور ہی چلا تھا کہ گولی چلی اور پھر اس کی بچی کے ہاتھوں سے کھلونے زمین پر بکھر گئے۔

وہ بھاگ رہا تھا۔

کچھ دور اور بھاگا تھا کہ دوسری گولی چلی اور اس کی بیوی کی چیخ فضا میں گونج اٹھی۔

وہ بھاگ رہا تھا۔

اور تیسری گولی چلی .... وہ ناچ کر گر پڑا اور وہ تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ دو غنڈے ریوالور کو اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھتے ہوئے موٹر سائکل کو اور تیز کر کے چلتے بنے۔

بازار کے وسط میں دھرم داس کی بچی تڑپ تڑپ کر مر گئی اور لوگ اپنی اپنی دکانوں کے پھاٹک کے سوراخ سے یہ دیکھتے رہے۔ اس کی بے قصور بیوی تڑپ تڑپ کر مر گئی اور لوگ یہ منظر بھی دیکھتے رہے۔ دھرم داس ایڑی رگڑ رگڑ کر مرا ۔۔۔ لوگ ۔۔۔ کیا ہو گیا ہے ۔۔۔ لوگوں کو ۔۔۔ ہم ایک جگہ اکٹھا ہو کر کووں کی مانند ماتم بھی نہیں کر سکتے۔

اچانک ایس پی خان کی گاڑی آ دھمکی۔ اس گاڑی کے اندر لوگوں کی آہٹ محسوس ہوئی اور سامنے تین تین لاشیں نظر آئیں۔ یہ منظر دیکھ کر وہ جوش میں آگیا۔ اس نے لوگ

اور اپنے ہاتھ کے ہنٹر سے دکانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
لا۔

" لوگوں اپنی اپنی دکانوں سے باہر آؤ اور دیکھو دھرم
اس کے خاندان کی لاشیں۔ کب تک ڈر کر جیتے رہوگے؟ اپنی
تت پہچانو۔۔۔۔ ورنہ آج وہ ۔۔۔ اور ۔۔۔۔ کل ۔۔۔۔
خر یہ کھیل کب تک چلے گا؟ صرف مجھے ایک گواہ چاہئے میں
مرم داس کے خاندان کے قاتلوں کا نام ونشان مٹا دوں
گا۔"

بہت دیر تک فضا پر سکوت طاری تھا۔ نہ کوئی دکان
کھلی نہ کوئی باہر آیا۔ لگتا تھا بازار نہیں شمشان ہو۔ ایک
پان کی دکان کا شٹر اٹھا۔ ایک سانولا سا، لمبا سا، پتلا سا
نوجوان باہر آیا اور شٹر گرگیا۔ اس نوجوان کے بالوں میں چوٹی
گوندھی ہوئی تھی۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں کاجل
لگا ہوا تھا۔ وہ بوسیدہ سی قمیض اور بلو ننگی میں ملبوس تھا۔
عجیب طرح سے آنکھیں مٹکاتا ہوا، کمر لچکاتا ہوا سینہ
تان کر ایس پی خان کے سامنے کھڑا ہوگیا اور سینہ ٹھوک کر
مردانہ اور زنانہ آواز میں بولا۔

" صائب (صاحب) میں گواہی دوں گا۔"

ایس پی خان کو ہنسی آگئی، اس نے ہنسی روک کر
پوچھا؛

" تم گواہی دوگے؟"

پھر اس نے سینہ ٹھوک کر جواب دیا۔

" ہاں میں گواہی دوں گا۔"

" تمہارا نام؟"

" گوکھل۔"

" پیشہ؟"

" گیج بجھ بنانا، جتیا۔"

" کیا تم کو ان سے ڈر نہیں لگتا؟"

" لگتا ہے۔۔ پر کب تک؟"

" شاباش گوکھل شاباش۔"

" اب میں جاؤں صائب؟"

" جاؤ پر بہت جلد پولس کو تمہاری ضرورت پڑے گی۔"

" میں آؤں گا۔"

اور وہ لاشوں کو پلٹ پلٹ کر دیکھتا ہوا، اپنے گھر
کی جانب چل پڑا۔

شہر کی نازک حالت دیکھتے ہوئے دھارا ۱۴۴ نافذ
کردیا گیا۔ لوگ اپنے اپنے مکانوں میں دبک گئے۔ مکتب بچوں
سے خالی ہوگیا۔ اسپتال ڈاکٹروں سے خالی ہوگیا۔ سڑکیں
سنسان ہوگئیں۔ بازار سنسان ہوگیا۔ چوراہوں پر پولس
کھڑی ہوگئی اور ان کی گاڑی گشت لگانے لگی۔ گھوڑ سوار
گھوڑے دوڑانے لگے۔ دو دنوں کے اندر ۱۵۰ لوگوں کی
گرفتاری ہوگئی اور اس کی شناخت کے لئے گوکھل کو خبر
دی گئی پر جب ایس پی خان کو یہ خبر ملی کہ ـــــ وہ ـــــ
تو اس نے ٹوپی اتار دی اور اس کو گوکھل کا وہ جملہ یاد
آنے لگا۔

" صائب میں گواہی دوں گا۔"

نئی کتابوں کا تعارف

(تبصرہ کے لئے دو جلدوں کا آنا لازمی)

• مبصر: علیم اللہ حالی

نام کتاب :- دریچہ سیم سمن
مصنف :- فضا ابن فیضی
نوعیت :- شعری مجموعہ
ضخامت :- ۲۰۰ ، قیمت :- ۵۰ روپے
پتہ :- فیضی پبلی کیشنز، مئو ناتھ بھنجن ۲۷۵۱۰۱ (یوپی)

★ فضا ابن فیضی ہمارے ان شعراء میں ہیں جنہوں نے جب اپنا تخلیقی سفر شروع کیا تو کبھی کسی منزل پر رکے نہیں۔ رجحانات اور تحریکات کے تغیر نے ان کے انہماک کو کبھی متزلزل نہیں کیا۔ ایک سچے فنکار کی طرح تخلیقی کارگزاریوں میں انہوں نے اپنے دل و دماغ کی اسیری قبول کی ہے۔ کبھی کسی خارجی تحریک کے بہاؤ میں خس مضمون کی طرح بہکے نہیں۔ اس سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ انہیں اپنی فنی شخصیت پر اعتماد رہا ہے ـــــ وہ دوسروں کے معیار کو سمجھنے اور ان سے متاثر ہونے کی بجائے اپنی برسوں کی ریاضت پر بھروسا کرتے ہیں۔ اپنی فنکارانہ شخصیت پر یہی اعتماد اور بھروسا فضا ابن فیضی کی انفرادیت کی تشکیل کرتی ہے۔

ایسا نہیں کہ شعر و ادب کے بدلتے تیور جناب فضا سے مخفی رہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ زندگی کی طرح ادب کی قدریں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ بعض حالات میں یہ تبدیلی بڑی واضح اور سریع ہوتی ہیں اور عام حالات میں اس کی رفتار نہایت دھیمی ہوتی ہے۔ اتنی دھیمی کہ ہم بہت دیر تک اس کی آواز پا کو کوشش بھی نہیں سکتے۔ جناب فضا کے کئی شعری مجموعے جو آج تک شائع ہوئے ہیں ان کے اس گہرے شعور کا احساس دلاتے ہیں کہ انہوں نے زندگی اور ادب کی رفتار اور سمت پر نظر رکھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی فنی اظہار میں جمود کی بجائے تحرک ہے۔ موضوعاتی اعتبار سے بھی انہوں نے اپنے ہر شعری مجموعہ میں نئے امکانات کی طرف نشاندہی کی ہے، لب و لہجہ اور بیان و زبان، لغات و الفاظ اور تراکیب و تیور کے اعتبار سے بھی جناب فضا کا یہ تازہ شعری مجموعہ نئی فضاؤں کی طرف لے جاتا ہے۔

دریچہ سیم و سمن بھی جناب فضا کے تخلیقی ارتقا کا آئینہ دار ہے۔ اس میں شاعر کے لسانی اجتہاد کے کئی نمونے بھی ملیں گے۔ جدید موضوع اور احساس کا تازہ کار پیرایۂ اظہار بھی ملے گا۔ غزل جیسے بظاہر گھسے پٹے پیکر میں جناب فضا کی غیر معمولی اختراعی قوت نے جو تازگی و توانائی بخشی ہے اس کی مثال دوسری جگہ ذرا کم ملے گی۔ بلاشبہ اس میدان سخن میں چند ایسے نام بھی مل جاتے ہیں جنہوں نے روایات سے یکسر رخصت و انحراف سے ایک بالکل نئی فضا کا احساس دلایا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ تجربات کی مشقتوں کے طفیل حاصل ہوا ہے۔ غزل کو روایات کی زمین سے نکال کر گملوں اور گلدانوں میں رکھ کر کتنی لمبی زندگی دی جا سکتی ہے۔ اس پر ہمیں سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ جناب فضا ابن فیضی

کے دانش ورانہ تخلیقی رویئے نے غزل کو اپنی اصل سے الگ نہیں کیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی پیدا کردہ بہاروں میں پامیلا ای کے نقوش ملتے ہیں۔

جناب فضا کو یہ احساس ہے کہ اب تک ان کے تخلیقی رویئے کی شناخت نہیں کی جاسکی ہے۔ ممکن ہے تفصیل کے ساتھ صاحبانِ نقد و نظر نے اس سلسلے میں اپنا مطالعہ منوزہ پیش نہیں کیا ہو لیکن ابھی وہ نگاہیں باقی ہیں جو پس پردہ الفاظ حسن و حقیقت کے جلوے دیکھ لیتی ہیں۔ جناب فضا نے ایک جگہ لکھا ہے کہ

کس میں ہمت ہے کہ جھانکے پس اوراق و سطور
پڑھنے والا بھی مرا، مجھ کو پڑھے گا کتنا

مجھے یقین ہے کہ ایسے باہمت افراد سامنے ضرور آئیں گے جو پس اوراق و سطور جھانک کر جناب فضا کے شعری تجربات کا مطالعہ پیش کریں گے اور اس مطالعہ کے لئے شاعر کے کسی ایک مجموعہ کلام کے ساتھ نہیں بلکہ اس کے تمام سرمایۂ سخن کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کی ضرورت ہے۔

"دریچۂ سیم سمن" میں شاعر نے ہمیں متعدد نئے احساسی مشاہدوں کا پتہ دیا ہے۔ بعض بڑے نازک اور نہایت لطیف لمحے شعری پیکروں میں تبدیل ہو گئے ہیں، مندرجہ ذیل اشعار بطور نمونہ از خروارے ملاحظہ فرمائیں۔

اوروں سے مختلف ہے ہمارا معاملہ
شوریدہ سر ہیں، دشت میں گھر چاہئے ہمیں

چلتے پھرتے پاؤں میں لفظوں نے بیڑی ڈال دی
اب کہاں دہلیز معنی چھوڑ کر جاؤں گا میں

جو تجھ کو دیکھنا چاہے اسے دکھا مجھ کو
کہ تیرا عیب برنگ ظہور ہے مجھ میں

آسماں کی کھوج میں ہم سے زمیں بھی کھو گئی
کتنی پستی میں مذاقِ بال و پر لے جائے گا

دریچۂ سیم سمن کی تخلیقات نہ صرف جناب فضا کی نئی منزل کی گواہی دیتی ہیں بلکہ کاروبارِ سخن میں مصروف دوسرے عصر شعراء کے لئے بھی سرمایہ مہیا کرتی ہیں

بقیہ
دوسری زبان کی ....

معروضات صدق دل سے عبارت ہیں اگر کوئی میرا فرقہ واریت کا الزام لگاتا ہے تو لگاتا رہے۔ مجھے اجراَت مندی، اقدار صالح، کشادگی دل و دماغ پر بھر اعتماد ہے اور کوئی طاقت میرے اس اعتماد کو متزلزل کر سکتی۔ عمر، عدم صحت نیز حالات گندیدگی ایسے مواقع جو ارتباط دل و دماغ کو متاثر تو کرتے ہیں مگر میرے خیالا کو منتشر نہیں کر سکے ہیں۔ پیشہ وران اردو اپنے مضمرات اور محفوظات ذہنی میں ملوث رہے ہیں۔ مگر ملوثات سے ذہنیت کو پروان چڑھائے بغیر ہم ہندوستانیت کو ہم آ نہیں کر سکتے۔

(بقیہ۔ نادم بلخی)

توقیر ہی وہ اپنی ہی گھٹا دیتے ہیں
نا اہل کو اُٹھا جو بڑا دیتے ہیں
سائے سے بھی ان لوگوں کے بچ کر رہنا
آئے ہی بُرا وقت دغا دیتے ہیں

اسرار خفی کھول رہے ہیں دیکھو
اقدار بیاں تول رہے ہیں دیکھو
گویائی جو گونگوں کو عطا کی ہم نے

شہرِ خیال

○ نصف صدی سے نکلنے والے اردو جریدے "سہیل" کا ادبیاتی و ثقافتی اردو صحافت میں نمایاں رول رہا ہے۔ "نمود" جس کے تحت حالات گرد و پیش کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس رسالے کے سامنے گراں مایہ اقدار رہے ہیں اور انسانیت کو پروان چڑھانے کے لئے صحت مندانہ کاوشوں پر مشتمل ایک لائحہ عمل سے متعلق ترغیبات پر بھی خاطر خواہ روشنی ڈالی جاتی ہے۔

"شہرِ خیال" اس کا مخصوص فیچر ہے، جس کے تحت بصیرتوں سے بھرپور قارئین کرام کی آرار پیش کی جاتی ہیں۔ جو بالعموم قلم کاروں اور قارئین کے مابین ارتباط استوار کرتا ہے۔ رشدی کو اگر کوئی گردن زدنی سمجھتا ہے، سمجھتا رہے مگر اس کو اپنی سوچ کا جائزہ بھی لینا چاہئے تاکہ میزان دانشوری اپنے متوجات کا صحیح مطالعہ حاصل کر سکے۔ اجتماعی لاشعور سے عبارت خیالات کو عام کرنے کی ہر کاوش سعی رائگاں ہی رہے گی۔ ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں ہم اپنے خیالات کو بگٹٹ چھوڑ دیں۔ مذہبی جذبات کی اپنی منطق ہوتی ہے لہذا ہندوستان کے کسٹم ڈپارٹمنٹ نے رشدی کی ناول SATANIC VERSES پر پابندی لگا دی، جو درست اقدامی کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ دہلی سے علی صدیقی کی ادارت میں شائع ہونے والے بالتصویر ہفتہ میں "آیت ابلیسی" کی اصطلاح دیکھی تھی جو ذہن نشین ہو گئی اور میں نے اپنے مضمون میں اسی کو استعمال کیا۔ اگر "آیات" غلط ہے اور اس کی جگہ "کلام" ہونا چاہئے مجھے کوئی اعتراض نہیں ویسے لفظ "کلام" بھی اسلامی پس منظر رکھتا ہے۔ میں اسلامیات کا عالم فاضل نہیں ہوں ۱۸ سال کی عمر میں بھی اپنی فہم و دانش کو متعلمانہ سطح سے کبھی دور نہیں ہٹاتا ہوں۔ فاضلانہ اور عامیانہ میں کیا فرق ہے کاش یہ بھی بتایا جاتا۔

ایک بات اور ـــــ کوئی اس جانب اپنی توجہ مبذول نہیں کرتا کہ دانتے نے کتنی خراب بات پیش کی ہے اور کیوں عالم اسلام میں اس کی معروف تخلیق پر پابندی نہیں لگائی گئی ہے۔

نوبل پرائز سے متعلقہ کتب سے رجوع کرنے پر سب کچھ پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ میرا مطلب ابو ماضی شاعر سے نہیں تھا، کتابت میں مجھ سے سہو ہو گیا ہوگا۔ ابو ماضی کے ایک لبنانی ناول نگار بھی ہیں جو شکاگو میں رہتے ہیں، ان کی رائے تک میری رسائی نہیں ہو سکی اور بس۔

مجھے عین مسرت ہوئی کہ میرے نگارشات کا رد عمل ہوا۔ ایجابی یا سلبی دونوں مجھے اچھے لگتے ہیں۔

تارا چرن رستوگی، دہلی

مسعود بھائی آداب

آپ کا خط مورخہ ۱۸ جولائی ملا ۔ شکریہ ۔
بھلا میں آپ سے کیوں ناراض ہونے لگا ۔ آپ کا پرچہ پابندی سے ملتا رہتا ہے ۔ اور فرصت کے اوقات میں پڑھ لیتا ہوں
دراصل گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے ادھر کچھ نہیں لکھ سکا ہوں ۔ یہ خط بھی شانتا کروز ائرپورٹ سے لکھ رہا ہوں ۔ میں چار پانچ دن میں واپس آؤں گا ۔ اور انشاء اللہ کچھ تحریر کروں گا ۔ اور جتنی جلد ہو سکے گا آپ کو بھجواؤں گا ۔ آپ تقاضہ کرتے رہیں گے تو کچھ تحریر ہو جائے گا ورنہ مصروفیات کی وجہ سے ذہن ادھر جا ہی نہیں پاتا ۔
آج کل جمیل منظر کہاں ہیں ۔ کیا وہ گیا میں نہیں ہیں؟ ان کا خط آئے ہوئے طویل عرصہ گذرا ۔

اصغر علی انجینئر (بمبئی)

○ عزیز گرامی ! دعائے مسنونہ

ادھر چند مہینوں سے "سہیل" برابر مل رہا ہے ۔ رسالہ آتے ہی میں اس کے مضامین نظم و نثر کو پڑھ لیتا ہوں ماشاء اللہ اب "سہیل" اپنے ماضی کے معیار پر رفتہ رفتہ آرہا ہے ۔ اور تمہارا ادارتی جوہر بھی آہستہ آہستہ کھلنا شروع ہو گیا ہے ۔ اگر تم اسی لگن اور اسی دھن سے لگے رہے تو انشاء اللہ "سہیل" اس مقام پر پہنچ جائے گا کہ لوگ اس کو پڑھنے کے منتظر رہیں گے ۔
پیش نظر شمارہ میں نئی دہلی سے طراج حیرت کا لکھا ہوا خط کافی فکر انگیز ہے ، اور اس قابل ہے کہ اردو کے ٹھیکیدار اس کو بغور پڑھ کر اپنے لسانی رویئے پر نظر ثانی کریں ۔ اردو کے سلسلے میں طراج حیرت نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے میں ان سے لفظاً بہ لفظاً نہ صرف متفق ہوں بلکہ میں نے تو ایک کتاب لکھ کر شائع کر دی ہے ۔ موجودہ دور میں طراج حیرت کی طرح بہت کم لوگ ہیں ، جنہیں نگارش کی ایسی بے باکانہ توفیق عطا ہوئی ہے ۔ اس جرأت مندانہ اظہار خیال پر میں ان کو تہنیت خاص پیش کرتا ہوں ۔
زیر نظر شمارہ نے آج میرے قلم کے جمود کو توڑ کر "سہیل" میں لکھنے پر مجبور کر ڈالا ۔ چنانچہ نادم بلخی پر ایک مضمون بھیج رہا ہوں اس کو بالکل قریبی شمارہ میں شائع کر کے میرے موڈ کو برقرار رکھنے میں مدد کرو ۔

قیوم خضر (پٹنہ)

○ محترم مسعود منظر صاحب ۔ سلام خلوص

محترم اظہر نیر دربھنگوی صاحب کے یہاں میں بیٹھا ہوا تھا ۔ چند رسالے سامنے ٹیبل پر بکھرے پڑے تھے انہیں میں ماہنامہ سہیل بھی تھا ۔ مجھے تعجب ہوا کہ میں خود گیا کا رہنے والا اور مجھے اپنے ہی شہر کے رسالہ کا علم نہیں ۔ جبکہ میں ہر سال دو سال پر گیا آتا رہتا ہوں ۔ فردوس گیاوی اور نذر الاسلام صاحب سے محفلیں بھی ہوتی رہتی ہیں مگر افسوس ہے ان کے توسط سے بھی سہیل سے تعارف نہ ہو سکا ۔ بہت پہلے جناب قسیم الحق گیاوی (مرحوم) صاحب سے بھی گھنٹوں کی ملاقات ہوتی تھی مگر سہیل کا تذکرہ کبھی نہیں آیا ۔ بہر کیف ! میں اظہر نیر صاحب کا شکر گذار ہوں جن کے ذریعہ ماہنامہ سہیل سے تعارف ہوا ۔
آج ہندوستان میں اردو اور اردو ادب ایک یتیم بچے کی طرح ہو گئی ہے ۔ اسے برہمن کی بیوہ بھی کہہ سکتے ہیں جو جینے کا حق تو رکھتی ہے مگر گھٹ گھٹ کر [illegible]

اس کی نزاکت و لطافت کا اعتراف تو سبھی کرتے ہیں پھر بھی
بن سنور کر زینت محفل ہونے سے روک دیتے ہیں۔ ایسے
المناک ماحول میں آپ صرف اس کے گیسو سنوارنے میں ہی لگے
ہوئے ہیں بلکہ آپ اس کی حجروں میں روغن تار ہے ہیں۔ بھئی آپ
لائق مبارکباد ہیں۔ آج نہ جانے کتنے رسالے روز پیدا ہوتے ہیں
اور اپنوں ہی کی بے توجہی کے سبب مر بھی جاتے ہیں۔ سہیل
پابندی کے ساتھ برسوں سے شائع ہو رہا ہے اسے عنائی
چمتکار سمجھوں یا آپ لوگوں کی سچی لگن اور محبت۔

گوہر جمالی (رائے پور)

○ برادرم مسعود منظر صاحب! سلام و رحمت

تازہ سہیل موصول ہوا۔ بے حد پسند آیا۔ مضامین،
نظم و نثر اور خطوط سبھی علم و ادب کے شہ پارے ہیں۔ یہ حقیقت
ہے کہ سہیل لگ بھگ ۵۰ برسوں سے خاموش علم و ادب کی
خدمت کر رہا ہے۔ آپ کے والد بزرگوار مرحوم اور لیبی سنہاری
نے بڑی جانفشانی کرکے اس رسالے کو زندگی دی تھی۔ آپ
لوگ ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ماہنامہ "سہیل" کے ذریعہ
ادب کی خاموش خدمت کر رہے ہیں۔ سہیل میں لکھنے والے
ملک کے نامور قلم کار ہیں۔ یہ ترقی پسند، جدید ادب اور روائتی
ادب تینوں کا ترجمان ہے۔

کمال جعفری (نئی دہلی)

○ محترمی مسعود منظر صاحب! ہدیہ خلوص

"سہیل" پابندی سے مل رہا ہے۔ شکریہ۔

ادھر کتابت و طباعت میں دل پذیر اضافہ ہوا ہے
معنوی اعتبار سے ویسے بھی جاذب توجہ تھا۔ آپ کی پرخلوص
کاوشوں، مجھے یقین ہے، شمارہ بہ شمارہ اسے مزید دلکش
بنائیں گی۔

"سہیل" کے خصوصی نمبر کے متعلق جناب عبدالقوی
دسنوی کی تجویز توجہ طلب ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر ایک
خصوصی شمارہ "بہار کا اردو ادب۔ آزادی کے بعد" کے
تحت نکالا جائے۔ ممکن ہو تو اس تجویز پر غور کیجئے۔ میرا
خیال ہے، اس سلسلے میں آپ کو ہر قسم کا تعاون حاصل ہوگا۔

سید شکیل دسنوی

○ مکرمی و محترمی برادرم مسعود منظر صاحب

سلام مسنون

دسنوی صاحب کا خط دلچسپ ہے اور ان کی
پرخلوص شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے رشدی
کے مسئلے کو دانتے سے مماثلت دی ہے گویا مسلم کے
ارتکاب جرم کو غیر مسلم سے خلط ملط کر دیا ہے جس
کی وضاحت میں نے اپنے جوابی خط میں کر دی ہے۔
امید ہے کہ غلط فہمی کا ازالہ ہو جائے گا۔

ڈاکٹر صاحب کے خط سے فراخدلی عیاں
ہو رہی ہے۔ خط پاکر دلی مسرت ہوئی واقعی
فن کار کا دل خلاقانہ ہوتا ہے وہ سمندر کی طرح
گہرا اور وسیع ہوتا ہے۔ مجھے یہ جان کر
بڑی حیرت ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب کی عمر
۸۱ برس کی ہے۔ وہ موذی مرض سرطان
میں مبتلا ہیں۔ اس پیرانہ سالی و خطرناک مرض
کے باوجود وہ صحیح الدماغ ہیں اور غور و فکر
کی بڑی صلاحیت ہے۔ وہ بودھ مذہب سے تعلق
رکھتے ہیں جو بے حد پرامن مذہب ہے اور اہنسا کو

کی وجہ سے ان کا دوبارہ جنم ہوا ہے
ورنہ ہندوستان سے تو اس کے ماننے والے دکھائی
نہیں دیتے تھے۔ اس کی وجہ محض یہ تھی کہ وہ
اہانت مورتی کے مرتکب ہوئے تھے۔ پنجاب کا
مسئلہ بھی اسی کا شاخسانہ ہے۔ اہانت کسی مذہب
کی ہو کر بانی مذہب کی خطرناک صورتحال پیدا
کرتی ہے۔ اہانت کے برعکس احترام صحت وسلامتی
کا ضامن ہے۔ اہانت کی مذمت نہ کرنا بھی اہانت کی
طرفداری تصور ہوگی۔ اس لئے اسلام نے اس
امر کی تعلیم دی کہ کسی دوسرے مذہب کو برا نہ کہو۔
اسی لئے اسلام احترام مذاہب اور احترام انسانیت پر زور
دیتا ہے۔

محمد عبدالقادر ادیب ، (بنگلور)

○ برادرم مسعود منظر اداب
خوشی کی بات ہے کہ آپ سہیل کی
طباعت بہتر بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس
سے پرچے کی اہمیت میں خاصہ اضافہ ہو جائے
گا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

اصغر علی انجینیئر (بمبئی)

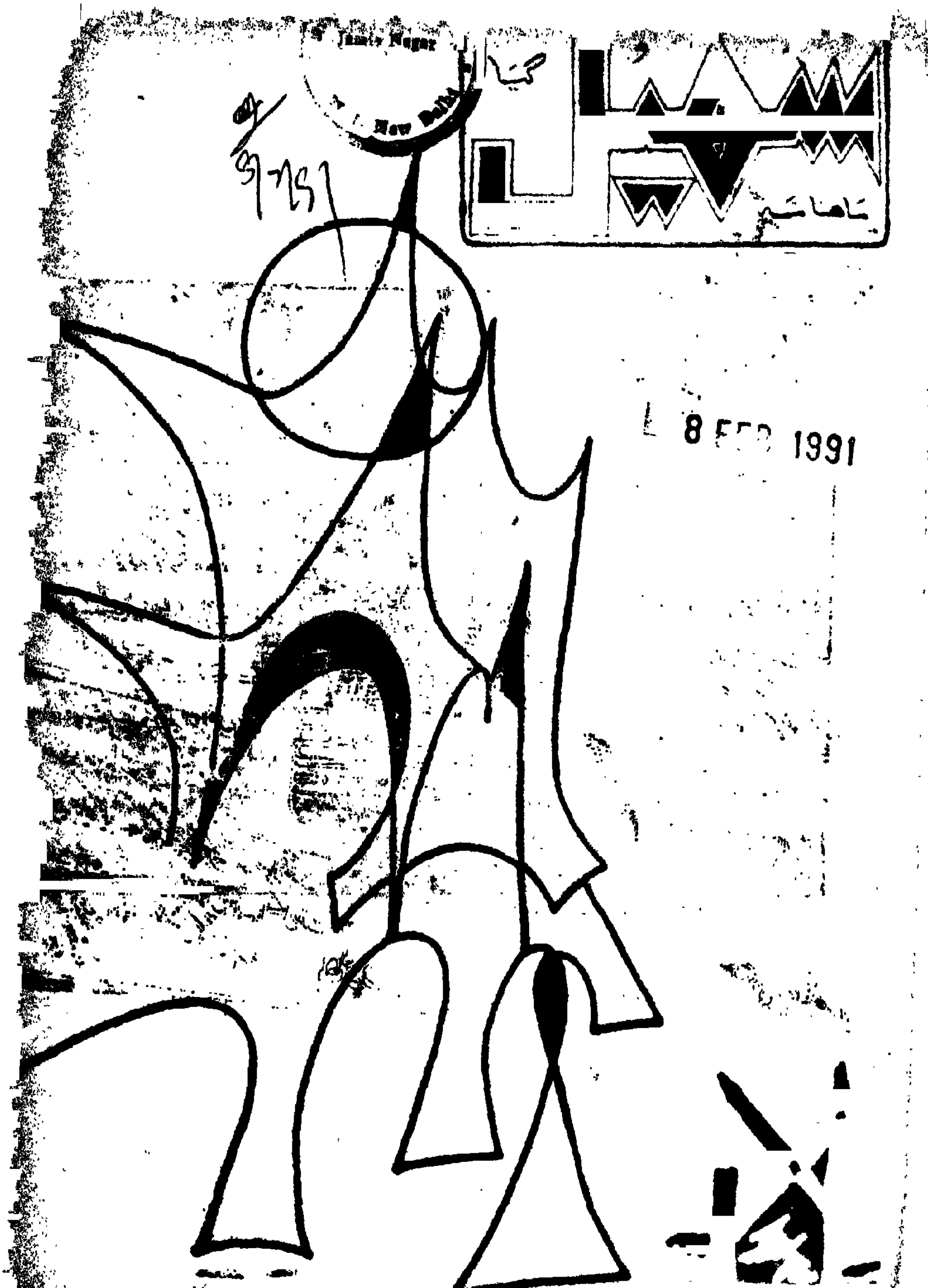
○ محترمی ومکرمی حسین منظر صاحب، تسلیمات
سہیل کا تازہ شمارہ ملا۔ مجھے خوشی ہے کہ "سہیل"
خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ اقبال پر تارا چرن رستوگی
صاحب کا مضمون اچھا ہے۔ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی

ان معدودے چند محققوں میں ہیں جنہوں نے اقبالیات
میں گراں قدر اضافے کئے ہیں۔ اقبال کے سلسلے سے یہ عرض
کردوں کہ شاعر کے اقبال نمبر کی پہلی جلد میں اقبال کے ایسے
اور اتنے خطوط شائع ہوئے ہیں جن سے اقبال کی ذاتی
زندگی اور عقائد وغیرہ سب کھل کر سامنے آگئے ہیں۔
قرآن پاک میں شعراء کی بابت یہ لکھا ہوا ہے کہ "یقولون
مالا یفعلون" (یہ جو کہتے ہیں کرتے نہیں ہیں) اقبال
کی شاعری اور اقبال کی زندگی کے حالات میں بھی معاملہ
کچھ ایسا ہی ہے۔ ویسے بھی قرآن پاک کے مقدس الفاظ
پر تو ایمان ہو۔ ظاہر ہے شعراء کے اتباع کی بات از روئے شریعت
درست نہیں۔ اس لئے کہ ان کا تتبع کر کے ہم وادیوں
میں بھٹکیں گے اور آسمان میں جنونی فضا دیکھنے لگیں
گے۔

اقبال کو ایک بڑا شاعر تسلیم کیجئے۔ مگر بڑے شاعر
پر ہر انداز سے تنقید لکھی جا سکتی ہے۔ میر اور غالب
پر جیسے کہ لکھی گئی ہے۔ اس طرح جیسے دوستوئیفسکی،
ایلیٹ پر لکھی گئی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو تنقید کو قصیدہ
گوئی کہا جا سکتا ہے — اقبال نہ تو پیغمبر تھے اور نہ
ہندوستان کے اولیائے کرام میں سے تھے۔ تذکرۃ الاولیاء
میں اقبال کا ذکر نہ ہونا بے سبب نہیں۔ اس لئے انہیں
بھی کسنے دیجئے۔ کسوٹی پر کسنا گناہ نہیں۔ شاعر کو
شاعر سمجھئے۔ موضوع تفصیل طلب ہے مگر یہ اجمالی
ہے۔

خورشید سمیع (مظفر پور)

مسودہ خوش خط بھیجئے




گھر کے ہر فرد کا محافظ
زعفرانی تیل
ایک حیرت انگیز پیشکش
چوٹ، موچ، درد، زخم، کٹنے، جلنے، ورم، ناگہانی حادثات اور بچوں کی مالش میں کام آنے والا تیز اثر
اور فائدے بیشمار۔

بانی :- حافظ محمد عبدالرحمٰن بسمل سنسہاروی ✿ بیادگار :- زین العابدین احمر و ادریس سنسہاروی

سہیل گیا

ماہنامہ

شمارہ ۹ جلد ۵

بدل اشتراک

فی شمارہ .... ۳/= روپے
زر سالانہ .... ۳۶/= روپے
لائف ممبری .... ۵۵۱/= روپے

فہرست

نمود ۵
مذہب، امن و کائنات ـــــ اصغر علی انجینیر ۶
کونپل ـــ ایک مطالعہ ـــ ڈاکٹر عبدالقیوم ابدالی ۱۲
غزلیں ـــ ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد، فضا ابن فیضی ۱۸
غزلیں ـــ علی عباس امید، محمد عبدالقادر ادیب ۱۹
غزلیں ـــ واجد سحری، شفیع اللہ خان راز اناوی ۲۰
غزلیں ـــ راز اعظمی، عصمت آرا، گوہر جمالی ۲۱
نیوتا ـــــ قیوم خضر ۲۲
مرگ نینی نے کہا ـــ مشرف عالم ذوقی ۲۵
تبصرہ ـــ علیم اللہ حالی ۲۷
شہر خیال ـــ حسن نعیم، خورشید اکبر، درما،
ویر نیدر شہاری، حقانی القاسمی، قیوم خضر
شانتی رنجن بھٹاچاریہ، ظفر صدیقی۔
محمد مجیب احمد، اظہر نیر ۲۹

ـ خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ ـ

ماہنامہ سہیل
دلیو سائیڈ روڈ، گیا۔ (بہار)
فون نمبر :- 21573


خود مختاری سے
آزادی کی طرف
پہلے ہم نے غلامی کی زنجیریں توڑ کر آزادی حاصل کی
اور اس کے ساتھ ہی شروعات ہو گئی اصلی آزادی کی ہماری جدوجہد،
…اری رہے گی جب تک ہم محنت کشوں کی زندگیاں
منور نہیں کر لیتے،
دلت و مظلوم لوگوں کے آنسو نہیں دھو ڈالتے،
عورتوں کے درجے میں بہتری نہیں لاتے،
ہر ایک کو معنی خیز روزگار مہیا نہیں کرا دیتے،
اپنے گاؤوں میں خوشحالی نہیں لے آتے،
ہماری جمہوریت کی جڑیں مضبوط نہیں ہو جاتیں۔
آزادی کی طرف ہمارے قدم بڑھتے ہی رہیں گے۔

نمود

ادھر رجعت پرست اور استعماری طاقتیں پورے زور وشور سے ملک بھر میں نفاق، عصبیت، تصادم اور قتل غارت گری کو ہوا دے کر پورے ہندوستان کو جس طرح کمزور کرنے کی سازش میں مصروف ہیں اس سے ہر صاحب فکر کو تشویش ہو گئی ہے۔ مذہب کی آڑ میں توڑ پھوڑ اور کھلے طور پر فساد پھیلانے والی طاقتوں کو اجازت عام دے دینے سے ہمارے سیاست دانوں اور ارباب اقتدار کو کیا فائدہ حاصل ہو رہا ہے اسے تو وہ خود سمجھیں مگر ہمیں تو ان مہلک نقصانات سے بچنا ہے جو ہمارے ملک کی پرانی روایات اور صلح و آشتی اور محبت و اتحاد کی فضا کو بگاڑ رہے ہیں۔

ہندوستان کے روائتی مزاج اور تہذیبی خمیر میں دوستی تحمل، بھائی چارگی، اخوت، مفاہمت اور ہم آہنگی کے خوشگوار نقوش اسے دنیا بھر کے ممالک سے ممتاز کرتے رہے ہیں۔ ہندوستان کی یہ امتیازی خصوصیت غیر ممالک کی بعض طاقتوں کو ہمیشہ کھٹکتی رہی ہے۔ اور یہ سازش ہوتی رہی ہے کہ اس امتیاز کو ہم سے چھین لیا جائے لیکن اب تک ہمارے ملک کی سیکولر طاقتیں ان سازشوں کو ناکام بناتی رہی ہیں۔ لیکن اب یہ بات کھل کر سامنے آچکی ہے کہ سامراجی ملکوں کی اس سازش میں خود ہمارے دیش کے وطن دشمن عناصر بھی شریک کار ہو چکے ہیں۔

اب صورت حال یہ ہے کہ اگر اس دیوِ استبداد کو قید نہیں کیا گیا۔ اگر مذہبی عصبیت کے مہلک زہر پھیلانے والوں کو قرار واقعی سزا نہیں دی گئی۔ اگر سیاسی اقتدار کے حصول کے لئے مقدس مذہبی جذبہ کا استعمال نہ روکا گیا ــــــــ تو پھر یقین جانئے کہ بہت جلد ہندوستان کی سالمیت کو زبردست خطرے سے دوچار ہونا پڑے گا

لہٰذا ہر وطن دوست اور قوم پرور قوت کو متحد ہو کر اس صورتحال کا مقابلہ کرنا ہے۔ شاعر و ادیب، دانشور، سیاست داں، ارباب اقتدار، طالب علم، استاد، مرد و عورت، امیر اور غریب ــــــ غرض ہر طبقہ اور اس کے ہر فرد پر اپنے وطنِ عزیز کی حفاظت کی اہم ذمہ داری ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے ملک کو ان اژدہوں کے منہ میں نہ جانے دیں اسے ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچائیں ــــــ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم کھل کر سیکولر، روشن خیال اور تعصب سے پاک بالیں بازو اور جمہوری طاقتوں کو مضبوط کریں۔

اصغر علی انجینئر

عدل، امن، کائنات کی سالمیت اور مذہب

جنوبی کوریا میں عالمی کانفرنس

مذہب کی کیا اہمیت ہے؟ کیا آج کے دور میں مذہب کے کوئی معنی نہیں؟ کیا یہ محض خلاف عقل وعقائد کا نام ہے جس کے لئے آج کے سائنسی دور میں کوئی جگہ نہیں؟ چند الحاد پرست اور عقلیت کے قائل لوگوں کا تو یہی خیال ہے۔ وہ مذہب ہی نہیں پر اس عقیدے کی جس کا سائنسی مشاہدوں کے ذریعے ثبوت مہیا نہ ہوسکے نفی کرتے ہیں۔ وہ کسی بھی بات کو قابل مشاہدہ مظاہر کے ذریعے ہی تسلیم کرنے کے قائل ہوتے ہیں۔

دوسری طرف سے کچھ لوگ مذہب کو محض رسموں کا پلندہ سمجھتے ہیں اور ان رسوم کو ادا کرکے یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے مذہبی فرائض کو ادا کر دیا۔ وہ ان رسوم کو قطعاً میکانکی طریقے سے ایک سماجی ضرورت کے تحت ادا کرتے رہتے ہیں۔ نہ وہ ان رسوم کو سماجی اہمیت سے واقف ہوتے ہیں نہ ہی مذہب کے فلسفیانہ اور الٰہیانہ پہلوؤں سے۔ ان کے لئے یہ رسوم محض ایک نفسیاتی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ان کو ادا کرنے سے انہیں ایک طرح کے ذہنی سکون اور تحفظ کا احساس ہوتا ہے۔

لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو مذہب کی سماجی، ثقافتی الٰہیاتی اور فلسفیانہ پہلوؤں سے وا
ہیں۔ ان کے لئے مذہب کی کسوٹی نہ تو محض مجرد عقل ہے نہ ہی وہ نام ہے کچھ جامد اور بے جان رسوم کا۔
متحرک ہوتا ہے ہر اس عمل کا جو حق پرستی، عدل وانص
اور امن وخیر خواہی کا ضامن ہو۔ ایک طرف وہ اپنے
کا حق عبودیت ادا کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے تو دوسر
حقوق عباد کے دلی احترام کا محرک۔ ہر عالمی مذہب میں
عناصر موجود ہیں جو اس کے ماننے والوں کو حق پر
انصاف پرستی اور انسان دوستی کی تحریک دیتے ہیں
وہ مذہب کے عناصر ہیں جو ایک صالح معاشرہ پیدا
باعث ہوتے ہیں۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں نہ ظلم و
ہو، نہ کمزور طبقوں کے ساتھ ناانصافی، نہ انسانی ح
پائمالی کی گنجائش اور نہ دولت کے نشے میں چور افراد
پرستی اور عیش پرستی۔

صالح معاشرے کے لیے ضروری ان سارے

پر قرآن مجید میں پورا زور ہے۔ انسانی مساوات، عدل و سماجی انصاف، اور انسانی حقوق پر بھرپور زور ہے تو دوسری طرف ظلم، کمزور طبقوں کے استحصال، استکبار اور زرپرستی اور عیش پرستی کی بھرپور مذمت لیکن مشکل تو یہ ہے کہ جاگیردارانہ سماج اور اس کے بعد سرمایہ دارانہ سماج نے اسلام کی ان اقدار کو پس پشت ڈال دیا اور مذہب ہمارے لئے محض چند رسوم کا پلندہ بن کر رہ گیا جنہیں ادا کر دینا ہی اعلیٰ ترین کمال تصور کیا جاتا ہے۔

لیکن آج کے جمہوری اور انسانی حقوق کے دور نے ہمیں صالح معاشرہ عطا کیا ہو یا نہ کیا ہو اس کا واضح شعور ضرور بخشتا ہے۔ آج ایسے ہی باشعور لوگ مذہب کو محض جامد عقیدے اور چند رسموں کے پلندے کے طور پر قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ایسے مذہب پرست اسے ایک صالح معاشرہ پیدا کرنے کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں جہاں قرآن مجید کے الفاظ میں مستکبرین، مستضعفین پر حاوی نہ ہوں گے۔ اور نہ صرف انسان انسان کا استحصال نہیں کرے گا۔ بلکہ انسان اللہ تعالیٰ کی دیگر مخلوقات کا بھی احترام کرے گا۔

آج مغربی ممالک میں سرمائے کا جیسا دور دورہ ہے اور کثیر قومی کارپوریشن نے جس طرح تیسری دنیا کے ممالک کا استحصال کیا ہے اس نے انسانی صالح قدروں کو بری طرح مجبور کیا ہے اور استکبار کا استضعاف پر، طاقتوروں کا کمزوروں پر غلبہ بڑھا ہے۔ اتنا ہی نہیں سرمائے نے سائنس اور ٹکنالوجی کی مدد سے نہ صرف دوبارہ پیدا نہ ہونے والے ذرائع کی لوٹ مچا رکھی ہے بلکہ فضا کو بھی آلودہ کیا ہے جس وجہ سے ہمارے دور میں ماحولیات کا زبردست مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔

انہیں مسائل کو لے کر ورلڈ کاؤنسل آف چرچیز (W.C.C) نے جنوبی کوریا کی راجدھانی سیول (Seoul) میں ایک عالمی مذہبی کانفرنس کا انعقاد کیا جس کا عنوان تھا "عدل، امن اور کائنات کی سالمیت (JUSTICE, PEACE AND INTEGRITY OF CREATION) عدل- اور اس کی اہمیت سے تو ہم عام طور پر واقف ہی ہیں لیکن کائنات کی سالمیت یا تصور یقیناً اتنا عام نہیں ہے۔ اس تصور کے مطابق اللہ کی ہر مخلوق کا یکساں احترام کرنا فرض ہے۔ کیونکہ انسان ہی نہیں ہر مخلوق اس کی تخلیق ہے اور اس اعتبار سے یکساں قابل احترام۔ دوسرے معنی میں انسان فطرت پر قابض نہیں بلکہ اس کا ایک حصہ ہے، اس کا مالک نہیں اس کا ہی ایک جزو ہے۔ کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے سیول کے آرک بشپ کارڈینل کِم نے کہا کہ "ہمیں بائبل کے اس فرمان پر کہ کائنات پر قابو پالو، اسے مسخر کر لو، ہمیں دوبارہ غور کرنا پڑے گا۔ ان الفاظ کو انسان نے غلط طور پر استعمال کیا ہے۔ جس کی وجہ سے دنیا تباہی کی طرف جا رہی ہے۔" واقعی آج ماحولیات کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے اور انسان کی حرص و   نے فطرت کی ایسی لوٹ مچائی ہے کہ یہ ہمارے دور کا زبردست مسئلہ بنتا جا رہا ہے۔ اس لئے کائنات کی سالمیت کا تصور نہایت اہم ہے اور جس طرح ظلم و استحصال اور عدل و انصاف اپنے اپنے دور میں مختلف مذاہب کی تھیالوجی کا حصہ بنے کائنات کی سالمیت کا تصور بھی جدید تھیالوجی (الٰہیات) کا مسئلہ   چاہیئے۔

اس کانفرنس کی خوبی یہ تھی کہ اس میں عیسائیوں کے علاوہ دیگر مذاہب کے نمائندوں کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی تاکہ بین مذہب اتحاد کی بنیادوں کو مضبوط کیا

جا [illegible] اور تمام مذاہب کے ماننے والے عدل و امن اور کائنات کی سالمیت کے لئے متحد ہو کر کام کر سکیں۔ دیگر مذاہب کے نمائندوں میں میرے علاوہ فلسطین، الجیریا اور مراقش سے مسلم خواتین یروشلم سے ربی جیرے می چند بدھسٹ اور سکھ کے نمائندے بھی شریک تھے۔ ربی جیرے جی جو اسرائیل سے یہودیوں کی نمائندگی کر رہے تھے اسرائیل اور فلسطین میں باہمی امن اور مفاہمت کے لئے کوشاں ہیں اور مجھے یہ جان کر بڑی خوشگوار حیرت ہوئی کہ اسرائیل میں چند یہودی مذہبی پیشواؤں نے مل کر فلسطین کے کچھ مذہبی افراد کے تعاون سے ایک تنظیم بنا رکھی ہے جس کا نام ہے۔ رجال دین من اجل السلام یعنی امن دوست دینی افراد کی تنظیم۔ یہ تنظیم یہودیوں اور فلسطینیوں میں قیام امن کے لئے فعال رول ادا کر رہی ہے۔

مجھے ربی جیرے می نے بتایا کہ اسرائیل کے عوام امن چاہتے ہیں لیکن چند مفاد پرست حکمراں فلسطین دشمن جارحانہ پالیسی اختیار کئے ہوئے ہیں اور یہودیت کو بدنام کر رہے ہیں۔ ان سیاست دانوں اور مفاد پرستوں نے یہودیت کی اعلیٰ قدروں کو پامال کیا ہے۔ جو ڈیزم امن بھائی چارے اور انصاف پرستی کی قدروں پر زور دیتا ہے۔ لیکن اسرائیلی حکمرانوں اور دیگر سیاست دانوں نے یہودی مذہب کو اس دشمنی اور جارحیت کا حامی مذہب بنا کر رکھ دیا ہے۔ ہم اپنے مذہب کے دامن سے اس داغ کو دھونا چاہتے ہیں اور اسی لئے قیام امن کے لئے ہم نے رجال دین کی یہ تنظیم بنائی ہے۔ اس میں ہمیں اپنے مسلم برادروں کا پورا تعاون حاصل ہے۔

میں نے جیریمی سے کہا کہ اسلام سلام (امن) کا مجسم پیغام ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تو بار بار قرآن مجید نے حنیف کے لفظ سے یاد کیا ہے جس کے معنی استقامت اختیار کرتے کے ہیں۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی عظیم المرتبت پیغمبروں میں تسلیم کرتا ہے اور یہودیوں کو تو اہل کتاب کا درجہ دیا ہے۔ جیریمی نے کہا کہ افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہمارے یہودی جماعتوں کو ان باتوں کا علم نہیں ہے آپسی دشمنی نے شدید تعصبات کو جنم دیا ہے اور ہماری کوشش یہی ہے کہ ہم ان تعصبات کی دیواروں کو ڈھا دیں ہو سکتا ہے ہمیں کبھی آپ کی بھی خدمات حاصل کرنا پڑے۔ امید ہے آپ ہماری ضرور مدد کریں گے۔ ہم سب کو متحد ہو کر نفرت کے زہر کا تریاق تلاش کرنا ہے۔ میں ربی جیریمی کے خلوص سے بے حد متاثر ہوا۔ میں نے کہا کہ ہندوستانی مسلمان بھی فلسطینیوں کے حقوق کے حامی ہیں اور اسرائیلی جارحیت کے خلاف ہیں۔ ہم سب دل سے چاہتے ہیں کہ فلسطینیوں کے حقوق اور خصوصاً ان کے حق خود ارادیت کا احترام کیا جائے اور دریائے اردن کے مغربی ساحل پر انہیں آزاد ریاست قائم کرنے کا حق حاصل ہو اور وہ پر امن طریقے سے اسرائیلی عوام کے پڑوسی بن کر رہ سکیں۔ جیریمی نے کہا کہ رجال دین من اجل السلام کا بھی یہی منشا رہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا فلسطین کی نمائندگی ایک عیسائی خاتون کے علاوہ ایک مسلم خاتون کر رہی تھیں جن کا نام تھا فاطمہ صیام۔ یہ خاتون اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور یروشلم میں انسانی حقوق کی ایک تنظیم سے وابستہ ہیں۔ فاطمہ صیام نے مجھے بتایا کہ فلسطینی خواتین تعلیم کے میدان میں مردوں سے کہیں آگے ہیں اور ان سے بہتر نمبروں سے کامیاب ہوتی ہیں۔ ان میں حقوق نسواں کا پورا شعور موجود ہے اور وہ اپنے شرعی حقوق سے بھی غافل نہیں۔ فلسطینی خواتین وطن عزیز کی آزادی کی تحریک میں بھی مردوں کے شانہ بہ شانہ پورے فعال طریقے سے شامل ہیں۔ ہم فلسطینی اپنے حقوق کے لئے ہر طرح کا

مہ سہیل گیا

نی دینے کے لئے تیار ہیں۔ مراقش سے امینہ بوعیاش آئی
تھیں۔ یہ خاتون بھی اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ تھیں
حقوق نسواں کی تحریک کی حامی۔

عیلنڈ کا کونسل آف چرچز کی منعقدہ کردہ یہ کانفرنس
بی کوریا میں ۵ سے ۱۳ مارچ تک ہوئی اور اس میں دنیا
ہر ملک سے نمائندے آئے تھے۔ کوئی ملک ایسا نہ تھا جس
نمائندگی نہ رہی ہو۔ یہ نمائندے اکثر چرچوں سے متعلق تھے۔
سی نہ کسی عوامی جدوجہد کی تنظیم سے وابستہ تھے۔ عدل امن
ئنات کی سالمیت سب کی توجہ کے مرکز تھے یہاں تک کہ
صبح عبادت کا جو سیشن ہوتا تھا اس میں بھی زور انہی
باتوں پر دیا جاتا تھا۔

کانفرنس میں تیسری دنیا کے ممالک کی جن میں خاص
سے افروایشیائی ممالک شامل ہیں، زبردست نمائندگی تھی۔
نمائندوں نے ان مسائل پر توجہ مبذول کرائی جوان کو درپیش
۔ آج مغرب کے سرمایہ دارانہ ممالک تیسری دنیا کے ملکوں
بردست استحصال کر رہے ہیں۔ اور اپنا کنزیومر کلچر
فی تہذیب) ان پر لاد رہے ہیں۔ سائنس اور تکنالوجی تیسری
کے ممالک کے استحصال کا ذریعہ بن گئی ہیں اور اس لئے یہ
کے لئے راحت سے زیادہ لعنت کا باعث بنی ہوئی ہیں۔ مغربی
ے کی سرمایہ دارانہ جارحیت نے تیسری دنیا کے ان ممالک
ض کا زبردست بوجھ لاد دیا ہے اور سود کے ذریعے ان کا
ن چوس رہے ہیں۔ اس قرض کی ادائیگی کا التوا اس کا
ے حل نہیں ہے بلکہ قرض کی ادائیگی کو ہی ختم کر دینا چاہئے۔

اکثر نمائندوں نے عدل، امن اور کائنات کی سالمیت
لئے بائبل کے حوالوں سے تقریر کی۔ میری باری آئی تو میں نے
ن مجید کے حوالوں سے اپنے خیالات پیش کئے۔ میں نے عرض کیا
عدل اور امن پر قرآن مجید نے بڑا زور دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ

فرماتا ہے کہ اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ۔ یعنی عدل کرو
کہ یہ بات تقویٰ سے قریب تر ہے۔ یعنی عدل کا مسلمانوں کو حکم
دیا گیا ہے اور اتنا ہی نہیں اسے تقویٰ کا جزو قرار دیا ہے۔ عدل
کے بغیر تقویٰ کا تصور نہیں ہو سکتا۔ متقی وہی ہو سکتا ہے
جو عادل ہو۔ اس طرح امن کے سلسلے میں خدا کا ارشاد ہے
کہ وَاللّٰہُ یدعوا إلی دارالسّلام۔ یعنی دین دارالامن کی
طرف بلاتا ہے۔ گویا تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس دنیا
کو امن کا گھر بنانے کے لئے کوشاں رہیں۔ اور جہاں تک ممکن ہو
تشدد سے پرہیز کریں۔

کائنات کی سالمیت کو لے کر میں نے عرض کیا کہ ہر مسلمان
سورہ فاتحہ میں روز یہ الفاظ دہراتا ہے کہ الحمد للّٰہ ربّ
العالمین یعنی تعریف ہے اس اللہ کے لئے جو تمام عالموں کا رب
ہے۔ اور رب کہتے ہیں پالنے والے کو یا اس کو جو کسی شے کو کمال
کے ایک درجے سے دوسرے درجے تک لے جائے۔ یہاں تک کہ
وہ اکمل تک پہنچ جائے۔ یعنی اللہ تعالیٰ پوری کائنات کو
درجہ کمال تک پہنچانا چاہتا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے
جب ہم پوری کائنات کا احترام کریں اور اسے درجہ کمال تک
پہنچانے کے مقصد کو ہمیشہ سامنے رکھیں اور کوئی ایسی بات نہ
کریں جس سے فطری توازن بگڑنے کا اندیشہ ہو۔ اس لئے ہر
مسلمان کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ سائنس اور تکنالوجی کا استعمال
اس طرح سے نہ ہونے دیں جس سے کائنات میں یہ فطری توازن
بگڑنے کا خطرہ پیدا ہو جائے جیسا کہ آج ہو رہا ہے۔ سرمایہ دارانہ
حرص کائنات کے اس توازن کو بگاڑنے پر تلی ہوئی ہے۔ اس
طرح ہم اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے عمل میں حائل ہو رہے ہیں
اس لئے ماحولیات اسلامی تھیالوجی کا بھی اہم مسئلہ ہے۔

میں نے داعیان کانفرنس سے یہ بھی گذارش کی کہ
ہمیں عدل امن اور کائنات سالمیت کے لئے تمام مذاہب کو ساتھ

لے کر چلنے کی ضرورت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ کانفرنس چرچ کی تنظیموں نے بلائی ہے اور ہم دیگر مذاہب کے نمائندوں کو شرکت کی دعوت دی ہے لیکن آپ کے مسودے کی زبان محض بائبل کی زبان ہے اور اس میں عیسائی تھیالوجی پر زور ہے۔ آج کی دنیا کے تمام ممالک کثیر مذہبی (MULTI-RELIGIOUS) ہیں اور آج کے چیلنجوں کا مقابلہ محض ایک مذہب کے لوگ نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے بین مذہبی تعاون اور اشتراک بہت ضروری ہے۔ ہم سب مل کر ہی ان مشکلات کا سامنا کر سکتے ہیں۔ جو عدل اور امن کے قیام کے لئے ضروری ہے اور جو کائنات کی سالمیت کی حفاظت میں درپیش ہیں۔

میں نے یہ بھی عرض کیا کہ دنیا کے کئی حصوں میں بعض مفادات ظلم و جبر کے لئے بھی استعمال کر رہے ہیں۔ ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات ہوتے ہیں جس میں مذہب کے نام پر سینکڑوں لوگ موت کے گھاٹ اتارے جاتے ہیں۔ حال ہی میں بھاگلپور میں ..۹۵ کے قریب افراد مارے جا چکے ہیں۔ اسی طرح بوہرہ مذہبی پیشوا اپنے ہی ہم مذہبوں پر مذہب کے نام پر طرح طرح کے ظلم کرتے ہیں ایسے ظلم کے سن کر رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ اس کی میں نے کچھ مثالیں بھی پیش کیں۔

ایک امریکی ریڈ انڈین نے کہا کہ اس مسودے میں امریکی انڈینز کا ذکر نہیں ہے حالانکہ امریکہ میں آج ان کی تہذیبی شناخت کو ختم کرنے کی پوری کوشش ہو رہی ہے۔ اگر یہ ناانصافی نہیں ہے تو کیا ہے۔ ایک افریقی نمائندے نے کہا کہ اس میں افریقی عوام کی جدوجہد کا خاطر خواہ ذکر نہیں ہے اس لئے ہم اس مسودے کو قابل قبول نہیں سمجھتے۔ اسے دوبارہ اس طرح سے تیار کیا جائے کہ افریقی عوام پر جو گوری نسلیں ظلم کر رہی ہیں اس کا خاطر خواہ ذکر ہو اور ان کے لئے عدل و انصاف کی راہیں متعین کی جائیں۔ اکثر مقررین نے اس بات پر زور دیا کہ عدل اور امن کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ امن اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ عدل نہ ہو دراصل ٹکراؤ اور تصادم کی صورت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب ناانصافی فقدان امن کے لئے ذمے دار ہیں۔ ظالم اور مظلوم میں کبھی امن قائم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے نہایت ضروری ہے کہ آج دنیا کے پورے سماجی اور معاشی نظام کو بنیادی طور پر بدلا جائے آج مغرب کے سرمایہ دارانہ ممالک تیسری دنیا کا استحصال کر رہے ہیں اور تیسری دنیا کے مظلوم عوام انصاف کی خاطر جدوجہد میں مصروف ہیں۔ اسی طرح تیسری دنیا کے ممالک میں بھی حکمران طبقے غریب اور نادار عوام کا استحصال کرتے ہیں جس سے ٹکراؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ اس استحصال نظام کو بدلے بغیر دنیا کے کسی ملک میں امن قائم نہیں ہو سکتا، عالمی امن کے قیام کی بات تو دور ہے۔

بہرحال مسودے پر خاصی بحث ہوئی اور اس میں کئی ترمیمیں کرنی پڑیں۔ لیکن ایک بات واضح تھی کہ ساری دنیا کے چرچ کے یہ نمائندے اپنے چرچ کے اعلیٰ حکام پر یہ دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ عدل، امن اور کائنات کی سالمیت کے مقاصد کو اپنا عیسائی فرض سمجھیں اور اس کے لئے استحصال کی ہر صورت کو ختم کرنے میں کوشاں ہوں۔ اب محض صدقوں اور خیرات سے غربت اور افلاس کا علاج نہیں کیا جا سکتا حالانکہ بعض حالات میں چیریٹی کی حیثیت مسلم ہے۔ غربت اور افلاس نوشتۂ قسمت نہیں ہے اور اس کا ذمے دار خدا کو ہرگز نہیں ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ اس کی ذمے داری استحصال کرنے والوں پر ہے اور غریبی دور کرنے کے لئے ان استحصالی قوتوں کو نابود کرنا چرچ کا فرض ہے۔ اسے سرمایہ داری کا کسی حالت میں ساتھ نہیں دینا چاہئے۔

یہ سب میرے لئے بڑا خوشگوار تجربہ تھا۔ یہی صحیح نہ

ٹ ہے۔ میں بار بار یہ سوچ رہا تھا کہ آج چرچ کے لوگ
ہم مسائل کی طرف، جو مظلوم عوام کے مسائل ہیں اسقدر توجہ
رہے ہیں اور اسپر بحث کرنے کے لئے کوریا میں عالمی کانفرنس
دکی ہے لیکن ہندوستان میں مذہب کو مندر اور مسجد کے
ڑوں کے لئے استحصال کیا جارہا ہے اور سینکڑوں لوگ
تضیئے کی بھینٹ چڑھائے جارہے ہیں۔ ہندو وشو پریشد
جدید ہندوستان میں رام جنم بھومی کو ہی ہندوازم کی
مسئلہ بنالیا ہے اور نہایت جارحانہ پروپیگنڈہ کر رہے
بس کے نتیجے میں سینکڑوں بے گناہ لوگ مارے جاچکے ہیں۔ ابھی
مذہب مندر مسجد کے تنازعوں سے آگے نہیں جاسکا ہے
ہر مذہبی بوہرہ مذہبی پیشوا دولت سمیٹنے کے لئے مذہب
م و جبر کا آلہ بنا رہے ہیں۔ اور عورتوں کو پستی کرنے اور نان و
قے سے محروم کرنے کے لئے مذہب کا استحصال ہو رہا ہے۔
کتنا تضاد ہے ان دو رویوں میں۔ کیا ہندوستان
کبھی اہل مذہب اسپر توجہ دیں گے۔

بقیہ در کونپل

کر شیشے کے دروازوں کو کھولکر باہر آگیا ہے اور ننھی
کونپل کو اپنے لحاف کے دامن میں لے لیا ہے اور اس طرح
کے درخت بننے کا سارا انتظام کرلیا ہے جس کی شاخوں سے
ویتے، مہکتے سرخ سرخ پھولوں کو فانوسوں کی صورت
ہوتا ہے۔ اور اس طرح کہانی کے بطن سے ایک اور حقیقت
بھر کر سامنے آئی ہے اور شاعر، بچہ، کونپل اور پورٹریٹ
ڈوبتی رسی جس کا انگ ہیں۔ دیوار، پورٹریٹ، چھپکلی،
اور تنکا جتنی بڑی حقیقت ہے۔ شاعر، بچہ، کونپل اور پورٹریٹ
کی ڈوبتی رسی، اس سے بڑی حقیقت ہیں۔ دوسری حقیقت
پہلی حقیقت کی موت کا اعلان ہے اور پہلی حقیقت، دوسری
حقیقت کی پیدائش کی وجہ، اس کی بشارت اور اس کا اشارہ
ہے۔ ان معنوں میں انور سجاد کا یہ افسانہ اسی شعور کی
تحریری تصویر ہے جس میں انسان اپنے داخلی اور خارجی تضادات
کے حوالے معروضی صورت حال کے کئی منزلہ بھوت سے نبرد آزما
ہے اور اپنی فتح کا یقین رکھتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالقیوم ابدالی

کونپلے ۔۔۔ ایک مطالعہ

٭ افسانے کے قاری کی حیثیت سے میری مشکل یہ ہے کہ افسانہ پڑھتے وقت میں غیر جانب دار نہیں رہ پایا۔ یا تو کہانی مجھے پسند نہیں آتی یا پھر مجھے اپنا اسیر بنا لیتی ہے اور میں اس میں شریک ہو جاتا ہوں۔ بہت ساری کہانیاں اور ان کے کردار تو ایک زمانہ کے بعد بھی اب تک میرے ذہن و دل میں محفوظ ہیں۔ زندگی کے پرپیچ اور سنگین راہوں پر چلتے ہوئے مجھے بارہا احساس ہوتا ہے کہ کوئی سوگندھی، بابو گوپی ناتھ اور کوچوان ۔ کوئی لاجو، بیلی، بھولا، کالو بھنگی ۔ لحاف اور گیندا کا کوئی کردار مجھے اپنے ساتھ گھسیٹے لئے جا رہے ہیں کاش اردو افسانے کے جغادری ناقدین کبھی اپنی کاروں، اسکوٹروں یا تانگوں سے نیچے اتر کر ان گلیوں کی بھی سیر کو نکلتے ۔ بو، ٹھنڈا گوشت، کھول دو، آخری کوشش، آنندی، گرہن، دادر پل کے بچے، ہتک، ایک سگریٹ کے لئے، اللہ دتہ، گلیاں، دھماکے ۔۔۔ کے خالقین کو لعنت دینے کی مہربانی کرنے کے بجائے ان کے ساتھ اس کرب کو بھی جھیلتے جو ہمارے ان حساس افسانہ نگاروں نے جھیلا تھا۔ اس جہنم زار سے بھی گزرتے جہاں جسم ہی لہولہان نہیں ہوتے، احساسات، جذبات، خواب، انا، ضمیر ہر چیز شیشے کی طرح نازک ہو جاتی ہے۔ بیدی کے 'ونائی'، شوکت کے "خواب گزیدہ نوجوان" اور سلام کے "درمیانی صف کے سورما" کے ساتھ کچھ دور چل کر دیکھیں کہ آج کا نوجوان جس کی پرورش ماں کے رحم میں صحت مند اغذیہ کے بجائے ماں کے آنسوؤں سے ہوتی ہے جیسے پٹرول ٹینکر سے قطرہ قطرہ ٹپک کر برباد ہونے والے تیل کو سگریٹ کے ڈبے میں محفوظ کر لینے کے لئے "ہائی وے رابری" کی سزا دی جائے اور اس جرم کی پاداش میں اس کے محبوب سے ضمانت کی شکل میں وہ چیز حاصل کر لی جائے جو اس کی اکلوتی دولت ہے تو اس کے پاس صرف دو ہی راستے بچ رہتے ہیں۔ حالات سے سمجھوتہ یا حالات کی مخالفت۔ حالات سے سمجھوتے 'درمیانی صف کے سورماؤں' کو جنم دیتے ہیں یا 'بک جانے' والوں کو اور حالات کی مخالفت سے "ونائی" بنتا ہے، خواب گزیدہ نوجوان بنتے ہیں یا ٹیڑھی انگلیوں والی، گردن ناپنے والی نسل پیدا ہوتی ہے۔ وہ نسل جس کو اس کے ذہن میں پلنے والے غصہ نے سراپا احتجاج بنا دیا ہے۔ وہ اپنی آگ سے اندھا ہو گیا ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ اس کا دشمن کون ہے۔ اس لئے اُس کے

حملے بے محابہ ہیں اور ان کا مشترکہ چالاک دشمن ان کو اندھیرے میں ہی مار لیتا ہے۔ اس وقت تک مارتا رہتا ہے جب تک انفرادی ذہنوں میں بنتا ہوا یہ غصہ اجتماعی شکل اختیار نہیں کر لیتا۔ یہ کھیل جاری رہتا ہے۔ اور اس مشترکہ دشمن کی چالوں، گھاتوں اور حملوں کی شکار یہ نسل کبھی اپنی محنت بیچ کر تو کبھی اپنی انا، اپنی ضمیر قربان کر کے اپنی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کی جدوجہد میں مصروف رہتی ہے۔ مشترکہ چالاک دشمن کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ انفرادی ذہنوں میں بنتا یہ غصہ "اجتماع" کی شکل اختیار نہ کر پائے۔ لیکن اس کی یہ کوشش خود اس کے گرد ایک جال سا بنتی جاتی ہے آخرکار جس کا اسے شکار بننا پڑتا ہے "کونپل" اسی نوجوان نسل کے "شاعر" کی کہانی ہے جس نے انفرادی غصوں کو اجتماعی شکل دینے کی کوشش کی تھی۔

انور سجاد کی یہ کہانی 'کونپل' میں نے کوئی آٹھ نو سال قبل پڑھی تھی۔ اس کہانی کا آغاز بھی 'بولو' کی طرح ایک 'سوالات' سے ہوتا ہے۔ لیکن یہ سوالات پیلا "چوکی" کے پولس اسٹیشن سے الگ ہے۔ دراصل پیلا چوکی کی ہیبت ناکی کو بیان کرنے کے لئے بیدی نے لفظوں سے جو تصویر کشی کی تھی انور سجاد نے اسے 'دیوار' چھپکلی، پورٹریٹ اور پتنگا کی تصویر کے ذریعہ زبان دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ دونوں تکنیک ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں۔ ایک لفظوں سے تصویر کشی کرتا ہے دوسرا تصویر کے ذریعہ حقیقت کو زبان دیتا ہے۔ ایک کے ہاتھوں میں آکر سوتر بھی بول اٹھتے ہیں۔ اور دوسرے کے ہاتھوں ظلم اور بربریت کی گواہ ہر چیخ برف کی سل کی طرح ٹھنڈی ہو جاتی ہے جس سے اٹھنے والا دھواں اندر کی تپش کا پتہ تو دیتا ہے لیکن آگ کا نشان کہیں نہیں ہوتا۔

"بھرے بھرے چہرے پر جابرانہ انداز میں کھنچی کھنچی پتلی آنکھیں، بھنچے ہونٹ، سیاہ نکٹائی کی اکڑی گرہ میں، پھنسی دوہری گردن، سیاہ کوٹ کے دائیں طرف سینے کی جیب میں ریشمی رومال جس کا سرخ رنگ وقت کے ساتھ فیڈ ہوتا اب پیازی سا معلوم ہوتا ہے۔ داخلی دروازے کے سامنے دیوار پر کیل سے لٹکی اس پورٹریٹ کے فریم کے دائیں کونے پر چھپکلی کا داہنا پاؤں پڑتا ہے۔ تصویر لمحہ بھر کو لرزتی ہے۔ کوٹ کے کالر کے کاج پر ایک سنہرا پتنگا بیٹھا ہے جو بلب کی روشنی میں بالکل کسی تمغے کی طرح لشکتا ہے۔ چھپکلی اس کے گھات میں وہیں جم جاتی ہے۔"

انور سجاد نے تصویر کی جو تفصیلات بیان کی ہیں اس سے شخص مذکور کے خدوخال ہی واضح نہیں ہوتے بلکہ اس کے تئیں افسانہ نگار کے جذباتی رویے کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ نفرت کی ایک دبی ہوئی تہہ نظر آتی ہے۔ اور چھپکلی و پتنگے کی موجودگی اس تصویر کو مزید 'کراہیت' بخش دیتی ہے۔ اور پھر تصویر، چھپکلی، پتنگے کے ساتھ 'دیوار' اور میز پر جھکے 'سیاہ کپڑوں میں ملبوس' بے ضابطے کی کارروائی میں مصروف علاقے کے انچارج کے ذکر کے ساتھ تو جیسے وہ پس منظر ہی تیار ہو جاتا ہے جس میں افسانے کا قاری کسی بھی دہشت ناک حادثے کے لئے خود کو تیار کرنے لگتا ہے۔ گو کہ افسانہ نگار نے دیوار، چھپکلی، پورٹریٹ اور پتنگا کو ہی ایک حقیقت کا انگ کہا ہے لیکن علاقے کے انچارج کا سیاہ لباس اسے بھی اس حقیقت کا ایک انگ بنا دیتا ہے اور اس طرح اس کمرے میں وقوع پذیر ہونے والا ہر واقعہ کسی نہ کسی طرح اسی حقیقت کا ایک انگ بن جاتا ہے اور علاقے کے انچارج کے ذریعہ سرکاری سیاہی چیوں پر سرکاری سیاہی سے تحریر کردہ ہر کارروائی اس حقیقت کی وجہ ہی نہیں جو لفظ کبھی بڑ کر سامنے آتی ہے۔

کہانی کے تیسرے پیراگراف میں ہماری ملاقات ایک بے نام شخص سے ہوتی ہے جسے وہاں کھڑے جانے کتنا عرصہ ہوگیا ہے ۔ اسے بیٹھنے تک کی اجازت نہیں ہے ۔ اس کے بالکل پیچھے ایک قدم ہٹ کے دو سیاہ پوش دائیں بائیں کھڑے ہیں جب بھی وہ تھک کر اپنا پورا بوجھ دونوں میں سے کسی ایک ٹانگ پر ڈالنا چاہتا ہے ۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں پکڑے بید زنانٹے سے ہوا کو چیرتے ہیں ۔ اس کی مضبوط پنڈلیوں پر پڑکے اچھلتے ہیں ۔" اس شخص کی کوئی خاص تصویر یا تفصیل ہمارے سامنے نہیں ہے سوائے اس کے کہ اس کی ایک سفید بالوں والی ماں ہے ، ایک بیوی ہے اور ایک معصوم بچہ بھی ۔ اس کا قصور نہ تو اس کی ماں کو معلوم ہے ۔ نہ ہی بیوی کو اور نہ خود اسے ۔ جب ظلم سہتے سہتے وہ تھک جاتا ہے ، اوب جاتا ہے اور اپنے جرم کی تفصیل جاننا چاہتا ہے تو اسے بتایا جاتا ہے کہ ــــ

" تمہارا صرف ایک جرم ہے ۔ تم کسان ہو ، مزدور ہو ، کلرک ہو ، شاعر ہو ، خطرناک قسم کے بلڈی پوئٹ ۔"

اور وہ حیران ہوکر کہتا ہے ــ " میں بیک وقت یہ سب کچھ ؟"

جواب ملتا ہے ــ " ایک عرصہ سے تم یہ سب کچھ ہو ۔ تمہاری فائل کہتی ہے ۔ آج دوپہر تم نے یہ ثابت بھی کر دیا ہے ۔"

وہ انکار کرنا چاہتا ہے تو اسے بتایا جاتا ہے ــ " تو پھر تم ہجوم کے درمیان چبوترے پر کھڑے کیا بک رہے تھے ؟"

اس نے جواب دیا ــــ آواز کی آرزو میں ، وہ خواہشیں وہ خیال ، وہ لفظ جنہیں میں لے اپنے سمیت اپنے وجود میں سمیٹ لیا تھا ۔ آج ان کی نجات کا دن تھا ۔ اور میں ہجوم کے ساتھ مل کر اس حقیقت کا اعلان کر رہا تھا کہ ہم انسان ہیں ۔

جانور نہیں ۔ ہم آزاد ہیں ۔ غلام نہیں ۔"

" تم واقعی خطرناک شاعر ہو ۔" افسر کے اندر خوف کا پتا ہے اور وہ جواب دیتا ہے ۔

"ــــ میں یہاں ایک ہوں ۔ اگر خواہشوں اور لفظوں کو آواز سے روشناس کرانا خطرناک ہے ساراہجوم ، سارا شہر ، سارا ملک ، ساری کائنات ہے ۔ انہوں نے اپنے مقدر پر کئی جبر و استبداد کی مہ گرائی ہیں ۔"

وہ افسر سے مخاطب ہوکر کہتا ہے ــــ " آ بدنصیبی ہے کہ آپ نے مہریں لگانے والی مشین کا پرز پسند کیا ۔"

ــــ اس کے بعد ــــ جلتے ہوئے انگا کی زبان پر رکھ دیئے جاتے ہیں ۔ اور وہ سدا کے لئے جاتا ہے ۔

خواہشوں ، خیالوں اور لفظوں کو آواز کرانے کا جرم صرف النور سجاد کے ملک تک ہی محدود اور نہ ہی اس کی پاداش میں ڈھائے جانے والے ظلم کو میں قید کیا جاسکتا ہے ۔ لیکن سزا کی سنگینی کا دا جرم کی سنگینی پر ہی ہوتا ہے ۔ درمیانی صنف کے جلوس کو قابو میں رکھنے کے لئے جابر بیورو کریسی ہ بناتی ہے ۔ صف بندی کرتی ہے لیکن جونہی کسی اندھی گ پتھر آتا ہے جو پولس جیپ کا شیشہ توڑ جاتا ہے ایلرٹ ہو جاتی ہے اور سنگین تن جاتی ہیں ۔ اسکو بیگ میں رکھا کپڑے کا گیند خوف و ہراس میں مبتا لیکن دانشور سورماؤں کے لیے جلوسوں سے زندگی نہیں آتی ۔ ان معنوں میں آخری کمپوزیشن ، کا وا النور سجاد کے بے نام شاعر میں کوئی مماثلت نہیں ہے ۔ سزا

ایک سا ہے اور نہ ہی ان کی سزا ایک سی ہے ۔ انور سجاد کے بے نام شاعر بچے تقریباً وہی الزامات عائد کئے جاتے ہیں جو بیدی کے 'ونائی' پر عائد کئے گئے تھے ۔ اور جس اذیت کا شکار انور سجاد کا بے نام شاعر ہے تقریباً ویسی ہی اذیت 'ونائی' کا بھی مقدر ہے ۔ بلکہ مجھے کہنے دیجئے کہ ہمارا بے نام شاعر اگر پاکستان کا وہ شہری ہے جس کی انگلیاں کاٹ دی گئی تھیں تو 'ونائی' ہندوستان میں اس کا وارث ہے جو ٹیڑھی انگلیوں کے ساتھ پیدا ہوا ہے ۔

"کونپلیں" میں بھی شاعر کا ایک بچہ ہے جو عین اسوقت جب "شاعر" کی گرفتاری عمل میں آ رہی ہوتی ہے سردی سے بے پروا بے حد خوش چوکڑیاں بھرتا صحن سے واپس آتا ہے اور یہ بشارت دیتا ہے کہ "جو بیج اس نے اپنے بیٹے کو بونے کے لئے دیا تھا اس کی کونپل پھوٹ پڑی ہے ۔ اور جیب جیب تیزی سے شاہراہوں پر گہری ہوتی ہوئی شام کی سیاہی پھیلاتی جانے لگتی ہے ۔ آسمان پر پھیلے تاریک بادل ونڈ اسکرین کے فریم میں مہیب صورتوں میں ابھرتے ہیں اسے فوراً خیال آتا ہے کہ وہ اپنے بچے کو بتا کر کیوں نہیں آیا کہ تند ہوا تیز بارش اس کی کونپل کے لئے قاتل ہیں ۔ جب تک یہ کونپل درخت نہیں بن جاتی اور اس پر موہنے مہکتے سرخ سرخ پھول فانوسوں کی صورت میں نہیں جھومتے تب تک ـــ اور پھر جب بیوی اور ماں کو حوالات میں دیکھتا ہے تو جیدوں کے بے بہے وار سہتا ۔ بیچ پر بیٹھی عورتوں سے تشویش بھرے لہجے میں پوچھتا ہے ۔ بچے کو اکیلا ہی چھوڑ آئی ہیں ؟ اور آخر کار جب اذیت رسانوں نے چلاتے اس کے ناخنوں کو کھینچ کھینچ کر اس کو بے دم کر دیا ہے ۔ وہ فرش پر پنجوں اور ہتھیلیوں کے بل چپکے سے چلتا ماں اور بیوی کے قدموں میں جا پہنچتا ہے ۔

"بچہ تو محفوظ ہے نا ؟"

عین اسی وقت آسمان سے بارش کے پہلے قطرے کا فائز ہوتا ہے ۔ بارش مشین گنوں سے چلتی گولیوں کی صورت اختیار کر لیتی ہے ۔ بچہ اپنے لحاف کو ذرا سا اٹھا کر دوسری چارپائی کی اور دیکھتا ہے ۔ بہتر سال کی بوڑھی ماسی لحاف میں دبکی نیند میں غائب غلا ہے ۔ بچہ بہت محتاط، چارپائی کی چر چراہٹ کو دھیرے دھیرے اپنے بس میں کرتا ہے ۔ ... دبے پاؤں چل کر دیوار سے لگا اسٹول اٹھاتا ہے ...... آہستہ آہستہ کنڈی کھولتا ہے ۔ ... اس کی آنکھوں کے سامنے تیز بارش کا پردہ ہے ۔ کارپوریشن کے کھمبے پر جلتے بلب کی روشنی نے بارش کی چادر پر پھیل کر اسے اندھا شیشہ بنا دیا ہے ۔ بچے کے جسم میں سردی کی سنسنی پھیل جاتی ہے ۔ اس کو چھینک آ ہی جاتی ہے ۔ دوسرے بستر پر بنی قبر میں جنبش ہوتی ہے ۔ بچہ رو ہانسا ہو کر فوراً اپنے بستر میں دبک جاتا ہے ۔ لحاف کے اوٹ سے ماسی کو دیکھتا ہے ۔ ماسی پھر اپنی نیند میں قائم ہو چکی ہے ۔

بچے کا دل مسلسل دھڑکے جاتا ہے ، جانے باہر تیز بارش تند ہوا میں اس کے ننھے کونپلے بوٹے کا کیا حال ہے ۔ اس سے رہا نہیں جاتا ۔ وہ بے چینی سے اٹھ کر اپنے تمام حرکات دہراتا ہے ۔

کارپوریشن لیمپ پوسٹ کی روشنی سے بنے اندھے شیشے کے پار دیکھتے ہوئے بچے کو یکدم ترکیب سوجھی ہے ۔ وہ دروازہ سے ہٹ کر جلدی سے مڑتا ہے ۔ پل بھر کے لئے دوسرے بستر پر تنفس سے ابھرتی ڈوبتی رضائی کی قبر کو دیکھتا ہے ۔ اپنی چارپائی کے پاس آ کر جلدی جلدی جوتا پہنتا ہے ۔ اپنی پوری قوت سے اپنے بستر کا لحاف اٹھا کر اوڑھتا ہے ۔ پلٹ کر تیز تیز قدم اٹھاتا کمرے سے باہر نکل جاتا ہے ۔ صحن کے عین وسط میں پہنچ کر بیٹھ جاتا ہے اور اس ننھی منی کونپل کو اپنے لحاف کے دامن

میں لے لیتا ہے۔ جو معصوم مٹی کو اپنی تیز کٹاری جیسی نوک سے چیر کر ابھری ہے اور درخت بننے پر جس کی شاخوں سے موہنے مہکتے سرخ سرخ پھول، فانوسوں کی صورت جھولیں گے۔

"جدلیاتی و تاریخی مادیت" (ترقی پسند تحریک کے رومان پیروں، حقیقت کا سطحی ادراک رکھنے والے بانجھ تحریروں کو گالیاں دینے کے بجائے کاش نئی نسل ان کی پرچھائیوں سے اپنا قد بڑھا لینے کی سعی کرتی) پر نظر رکھنے والے اس حقیقت کا ادراک رکھتے ہیں کہ زندگی ہر پل تبدیل ہونے والی ایک ایسی حقیقت ہے جو ماضی کے کوکھ سے پیدا ہوتی ہے اور آنے والے پل میں وقوع پذیر ہونے والی حقیقت کا جواز بھی ہے اور وجہ بھی۔ جس دن سے ملکیت کا تصور پیدا ہوا ہے یعنی جس دن سے وہ طبقہ پیدا ہوا جو بغیر محنت کئے دوسروں سے اپنی عقل اور طاقت کا خراج لیا جاتا ہے اس دن سے استحصال کرنے والوں اور استحصال کا شکار ہونے والوں کی جنگ بھی شروع ہوئی۔ محنت کش طبقہ وہ چاہے جسمانی محنت کرنے والا ہو یا ذہنی۔ ہمیشہ اپنی کم از کم ضروریات کی تکمیل کے لئے کوئی آواز نہ اٹھائے اس کی بھی نگہداشت کرتے ہیں۔ زباں بندی کی کوشش کی جاتی ہیں۔ خوف و ہراس کا ماحول تیار کیا جاتا ہے اور اظہار پر پابندیاں عائد کر دی جاتی ہیں۔ کیونکہ تاریخ کا پہیہ "عمل اور ردعمل" کے مسلسل نتیجہ میں آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اظہار کی پابندی — اظہار کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنے والوں کو پیدا کرتی رہتی ہے۔ ان جدوجہد کرنے والوں کے خون۔ برسر اقتدار طبقہ سخت کارروائیوں کے احکام صادر کرتا ہے اور مظالم کی انتہا بغاوت اور انقلاب کے لئے راہیں ہموار کرتی رہتی ہیں۔ ایک نسل کے بعد دوسری نسل اس مشعل کو سنبھال لیتی ہے۔ اور کارواں آگے بڑھتا رہتا ہے۔ شاعر نے آزادی، مساوات اور حقوق کی جدوجہد کی جو مشعل روشن کی۔ اس کی گرفتاری یا موت کے ساتھ اس کی جوت بجھ نہیں سکتی کیونکہ شاعر نے "بچہ" کی شکل میں وہ "مشعل" کردی ہے جو اس کی "فکری" اور "نظریاتی" جدوجہد کا محا ہے اور وارث بھی۔ ابھی اس "فکر" کی محض "کونپل" پھو اور "تند ہوا" اور "تیز بارش" اس کے لئے قاتل ہیں! اس کی حفاظت نہ کی گئی تو اس کے فنا ہو جانے کا خطرہ اور اس "کونپل" کی حفاظت کے لئے اس کے پھلنے پھولنے نہ صرف "کونپل" کی حفاظت ضروری ہے بلکہ "بچہ" کے رہنے کی بھی ضرورت ہے۔ اگر "بچہ" محفوظ نہ رہا تو بھی کی حفاظت شاید ممکن نہ ہو سکے۔ کہانی کار کی کہانی کا خوا "رجائیت" کے ساتھ کیا ہے کہ "بچہ" اس ننھی منی کو اپنے لحاف کے دامن میں لے لیتا ہے، جو معصوم مٹی کو اپنی سی نوک سے چیر کر ابھری ہے اور درخت بننے پر جس کی شا سے موہنے مہکتے سرخ سرخ پھول، فانوسوں کی صورت جھو کہانی کا یہ خاتمہ بذات خود ایک "خواب" ہے جو ہمارے ا نگار اور اس کے جیسے لاکھوں، کروڑوں، لوگ دیکھ ہیں۔ یہی جو خواب ہے جو نسل کے بعد نسلوں کو اپنی ز کی ترغیب دیتے رہتے ہیں۔ اور "کل" ایک سنہرے "کل" اور "خود مختار" "کل" پر یقین ہے جو ہنستے ہنستے زہر کا پیالہ لینے کی ترغیب دیتا ہے۔ اور بھگت سنگھ، چی گوارا او منڈیلا باری کے پیروؤں کو زندہ رہنے کے لئے موت کو اپنا ہمت عطا کرتا ہے۔ خواب دیکھنے کے اس عمل کے بغیر "رومان پروری" بھی کہہ سکتے ہیں نئی دنیا، نئے کل کے لئے ہی ممکن نہیں۔

مختصر یہ کہ "کونپل" میں بہ یک وقت تین کہا رواں ہیں۔ تین الگ الگ سچویشن۔ تین الگ الگ اور تین الگ الگ اشارے، پہلی کہانی، پورٹریٹ، اور پینٹنگ کی ہے۔ پہلے مرحلہ میں "فریم" کے دائیں کو

داہنا پاؤں پڑتا ہے۔ تصویر لمحہ بھر کو لرزتی ہے۔ جھینگا ر
ٹنے کالر کے کاج پر بیٹھا ہے۔" دوسری بار سیچوئشن میں بس
نا سی تبدیلی آتی ہے کہ پورٹریٹ کے داہنے کونے پر چھپکلی کا داہنا
ؤاس طرح جما ہے۔ آنکھیں جھینگے پر گڑی ہیں۔ چھپکلی کی دُم
آخری سرا دیوار پر ایک ملی میٹر سرکتا ہے۔ پورٹریٹ میں ہلکا
ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ دیوار کی کیل پر تنی رسی جس سے
پورٹریٹ لٹکی ہے، ذرا سا تنی ہے۔ کیل پر محیط اسی کے نچلے
نگ آلود، بوسیدہ حصے کے چند تاگے ٹوٹتے ہیں۔ تیسرے مرحلہ
جھینگا کوٹ کی کاج پر اس طرح جما بیٹھا ہے لیکن چھپکلی
ے اگلے پیر فریم کو پار کر چکے ہیں اور اس کا بایاں پچھلا پیر فریم کے
نے کے قریب ہے۔ داہنی ٹانگ دُم کے سدھ میں کھنچی ہے اور
رٹریٹ مزید دو سوت نیچے سرک آئی ہے۔

اگلے مرحلے میں چھپکلی پوری کی پوری فریم کے شیشے پر
چلی ہے۔ جھینگا آہستہ آہستہ چلتا ہوا ماتھے پر آ کر رک
ا ہے۔ چھپکلی نے زاویہ بدل کر گھات لگایا ہے اور پورٹریٹ
یا سوت کششِ ثقل کی طرف کھسک آئی ہے۔ اور آخرکار شاعر
زبان جلا دی جاتی ہے تو تصویر کے سچوئشن میں یہ تبدیلی آجاتی ہے۔

عین اسی وقت پورٹریٹ کی رسی کا ایک اور تاگا ٹوٹتا
ہے۔ پورٹریٹ چند سوت اور کششِ ثقل کی جانب سرکتی ہے۔
ب صرف ایک تاگا رہ گیا ہے جس کے سہارے پورٹریٹ کیل
پر ٹنگی ہے۔ چھپکلی اگلا دایاں پاؤں اٹھائے، ماتھے کے
لئے، سنہری جھینگے پر اب جھپٹا ہی چاہتی ہے۔

دیوار، چھپکلی، پورٹریٹ اور جھینگا کے ذریعہ انور سجاد نے
اپنے قارئین کو اس حقیقت سے روشناس کرایا ہے کہ انسانوں
کے استحصال پر مبنی جس نظام نے انسانوں کو جانور بنا دیا
ہے۔ اس کی آزادی چھین کر اسے غلام بنا لیا ہے اگر اسے کسی
جی احتجاج کا سامنا بھی کرنا پڑے تو بھی وہ اپنے "داخلی

تضادات" کا شکار ہوتی رہتی ہے اور آخر کار فنا ہو جاتی ہے
چھپکلی جھینگے کو اپنا شکار بنانے کے لئے گھات لگاتی ہے، چالیں
چلتی ہے، زاویہ بدلتی ہے۔ جھینگے کی طرف سے اس کی گھاتوں،
چالوں اور تیاریوں کا کوئی باضابطہ جواب نہیں دیا جاتا۔ وہ یا
تو اپنی جگہ جما رہتا ہے یا پھر نہایت ہی آہستہ روی سے آگے
بڑھتا ہے۔ کبھی سینے پر تمغہ بنتا ہے تو کبھی ماتھے پر۔ وہ جابر
اہلِ اقتدار کی شان میں اضافہ تو کرتا ہے لیکن کسی بھی طرح نہ تو
چھپکلی کے لئے نہ ہی پورٹریٹ کے لئے کوئی خطرہ بن پاتا ہے لیکن
از جلد اپنا شکار بنا لینے کی ہر کوشش اس رسی کو کمزور کرتی
جا رہی ہے جس کے سہارے وہ پورٹریٹ ٹنگی ہے جس پر چھپکلی
کی بھی زندگی کا انحصار ہے۔ اس طرح چھپکلی غیر شعوری طور پر
اپنی موت کا انتظام بھی خود ہی کر رہی ہے۔

دوسری کہانی اس نوجوان شاعر کی ہے جس نے عوام کے
درمیان جبر و ظلم کے خلاف آواز اٹھائی ہے اور انسان کی
انسانیت اور اس کی آزادی کی حفاظت کا نعرہ بلند کیا ہے۔
اسے قید کر لیا گیا ہے۔ اذیتیں دی گئی ہیں۔ اور اعترافِ جرم
پر زبان پر انگارے رکھ کر اسے گونگا بنا دیا گیا ہے۔ لیکن اس
کی بے زبانی نے گویائی کو مات دیدی ہے۔

تیسری کہانی بچہ اور کونپل کی ہے۔ شاعر نے جو بیج اپنے
بچہ کو دیا تھا، اس کی گرفتاری کے وقت اس میں سے کونپل
پھوٹ آئی تھی۔ یہ کونپل اپنی تیز دھار سے ملتوں مٹی کا سینہ
چیر کر باہر تو آگئی ہے لیکن تند ہوا اور تیز بارش سے اگر اس کی
حفاظت نہ کی جا سکی تو اس کے فنا ہو جانے کا خطرہ ہے۔ شاعر
یہ بات بچے کو بتا نہیں پایا ہے اس لئے پریشان ہے۔ لیکن بچے
کو اب اس سے زیادہ "کونپل" کی فکر ہے۔ وہ کسی بھی طرح اس
کی حفاظت کرنا چاہتا ہے اور تند ہوا، تیز بارش، تاریک رات،
بستر پر تنفس سے ابھرتی ڈوبتی ماسی کی رضائی کی قبر سے بے پروا

ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد

میں کہ دورِ زوالِ شعر میں آج
شاعرِ بے نظیرِ ہند میں ہوں
کھر درا ہو رہا ہے جب کہ سخن
ایک کیفِ لطیفِ ہند میں ہوں
بے سُرے پن کے روبرو آزاد
نغمۂ دل پذیرِ ہند میں ہوں
اہلِ لاہور و اہلِ عیسیٰ خیل
میں تمہارا سفیرِ ہند میں ہوں
جس نے ٹھکرا دیا امیری کو
میں اک ایسا فقیرِ ہند میں ہوں
شاعری کا دیا جلائے ہوئے
ظلمتوں کا اسیرِ ہند میں ہوں
غالب و میر بھی ہوئے ہیں یہاں
میں بھی اک گوشہ گیرِ ہند میں ہوں
ہند کو کیا خبر، پتا ہی نہ ہو
کہ میں روشن ضمیرِ ہند میں ہوں

فضا ابن فیضی

میں یوں نہیں بوجھ برگ و ثمر، ٹوٹ جاؤں گا
اتنی جھکا نہ شاخِ ہنر، ٹوٹ جاؤں گا
کچھ، جارحانہ زندگی کرنے کا ڈھنگ دے
میں بے سنان و تیغ و سپر، ٹوٹ جاؤں گا
ہوگی مری خودی، ترے تیشے سے کب شکستہ
پتھر سے بت بنوں گا، اگر ٹوٹ جاؤں گا
کام آئیں گے یہ چہرے، نہ جلوے نہ آئینے
ٹوٹا جو اعتبارِ نظر، ٹوٹ جاؤں گا
یہ تو ہیں آبگینۂ جاں، نقشِ پا کہاں
ہوگا جہاں یہ ختمِ سفر، ٹوٹ جاؤں گا
جذبے قدح قدح، تو تخیل دھنک دھنک
کب ٹوٹنے کی شے ہوں، مگر ٹوٹ جاؤں گا
میں پچھلی شب کا ہچکیاں لیتا چراغ ہوں
چھو جائے گی جو بادِ سحر، ٹوٹ جاؤں گا
میرا اثاثہ ہیں، یہی کاغذی کشتیاں
لپکی جو کوئی موج ادھر، ٹوٹ جاؤں گا
کیسے بچوں گا میں بھی، کہ یہ زندگی فضاؔ
ہے کاروبارِ شیشہ و سر، ٹوٹ جاؤں گا

علی عباس ازکیؔ

رنگ قصے کا اور ہی کچھ ہے
جب سے ہم میر داستاں بنے
میزبانی میں آگیا ہے خلوص
رنج و غم ایسے مہماں بنے
جو نتیجہ تھے امتحاں کا مرے
پھر وہی مرا امتحان بنے
جب ہم ہی تم قریب آ نہ سکے
بات پھر کس کے درمیان بنے
جس نے دھرتی کو چومنا سیکھا
نقش پا اس کے آسمان بنے
صاف گوئی کی بھی وہی ہے سزا
اس لئے ہم غلط بیان بنے
خول میں خود کو سی لیا سب نے
اک ہم ہی چاک گریباں بنے
میں نے فرزانگی سے کیا پایا
کچھ عقیدے وبال جاں بنے
عشق جہد بقا کا مسئلہ ہے
دل سے کہدو کہ سخت جان بنے

محمد عبد القادر ادیبؔ

غم کے مٹنے پہ بھی کچھ اور ہی غم آئے ہیں
میرے دامن میں فقط رنج و الم آئے ہیں
دم سے ساقی کے نئے ساغر جم آئے ہیں
جام لینے کو سفیران حرم آئے ہیں
تیری باتوں کو بھلانا تو مرے بس میں نہیں
جانے کیوں یاد بہت تیرے کرم آئے ہیں
؎۱ تیرے ایوان کی ہر اینٹ ہوئی ہے بے دم
تیری امداد کو گھر گھر کے صنم آئے ہیں
سحر کا ہو نہ سکا ہم سے مداوا اے دوست!
غیر تو غیر تری باتوں میں ہم آئے ہیں
پھیکے پڑنے بھی نہ پائے تھے نقوش ہستی
بھرنے کچھ رنگ نئے اہل قلم آئے ہیں
تربیت نفس کو دینے کے لئے اے ہمدم!
میری قسمت میں زمانے کے ستم آئے ہیں
جب بھی ظلمت کے مٹانے کو کوئی ہاتھ بڑھا
سنگ راہ بن کے غم دیر و حرم آئے ہیں
غم و شادی میں یہ ساغر بھی چھلکتے ہیں ادیبؔ
جب کبھی ہم آئے ہیں بادیدۂ نم آئے ہیں

؎۱ شاہ فہد سے معذرت کے ساتھ

واجد سحری

پیار کے بندھن، رشتے دیکھو
ہاتھ میں کچے، دھاگے دیکھو
دیکھنا ہے غم مرا، اگر
اُن کو مجھ پر ہنستے دیکھو
انگلیاں، چھوتے ہی جل جائیں
پھول کے اندر شعلے دیکھو
ہوتی ہے کیسے رسوائی
اُن کی گلی میں جا کے دیکھو
چلے گی تیرے جسم کی ناؤ
دریا کو ساحل سے دیکھو
آئینے میں کیا رکھا ہے
رنگ برنگے چہرے دیکھو
اب کیوں غرق ہے اشکوں میں
کس نے کہا تھا سپنے دیکھو
رہنا ہے دنیا میں اگر
واجد میاں تماشے دیکھو

شفیع اللہ خان راز اماوی

آگ ہے ساحلوں کے منظر میں
شعلگی گھل گئی سمندر میں
روشنی کے سفیر آئے ہیں
شور ہے تیرگی کے لشکر میں
زندگی کا عجیب تماشہ ہے
آدمی پڑ گیا ہے چکر میں
چھپ کے بیٹھا ہے پیر میخانہ
تشنگی کا لہو ہے ساغر میں
فائلوں میں سجے ہیں ہنگامے
شور محشر بپا ہے دفتر میں
ضو فگن ہاتھ کی لکیریں ہیں
تیرگی [illegible] ہے مگر مقدر میں
ساحلوں پر ہے جشن آزادی
مچھلیاں قید ہیں سمندر میں
چاندنی محو خواب ہے اے راز
دھوپ مہکی ہوئی ہے بستر میں

جتنے قسمت پہ رونے والے ہیں
قیمتی وقت کھونے والے ہیں
ناخداؤں سے ہوشیار رہو
کشتیوں کو ڈبونے والے ہیں
تنگ ذہنوں سے دور ہی رہیئے
دل میں نشتر چبھونے والے ہیں
آ رہا ہے فساد کا موسم
بے خطا قتل ہونے والے ہیں
لو اگلتی ہوئی زمینوں کو
آنسوؤں سے بھگونے والے ہیں
کتنے چنچل ہیں موم کے پتلے
آگ پانی میں بونے والے ہیں
باغ، خانوں میں بٹنے والا ہے
پھول تقسیم ہونے والے ہیں
راز لہرا رہی ہیں تلواریں
زخم بیدار ہونے والے ہیں

غزلیں

ناز اعظمی

بغ محشر ہے رواں فتنۂ رفتار کے بیچ
انے مسر دیکھے ہیں کٹتے ہوئے بازار کے بیچ

اری دنیا کی نظر میں ہیں جو ظالم قاتل
ے مظلوم کھڑے ہیں تری سرکار کے بیچ

ر بھر باغ تمنا کا کوئی در نہ کھلا
ندگی کاٹ دی ہم نے در و دیوار کے بیچ

ول کھلتے ہیں جہاں کانٹے بھی اگتے ہیں وہاں
صلہ نام کا ہوتا ہے گل و خار کے بیچ

ے چھلکتی رہی پیمانہ بہ پیمانہ مگر
ام پہونچا نہ کوئی بھی لب میخوار کے بیچ

ج ہم زندۂ جاوید انھیں کہتے ہیں
ے گیا شوق شہادت جنھیں تلوار کے بیچ

رپ دیتا ہوں میں اللہ کو ان کی باتیں
ب وہ کر دیتے ہیں رسوا مجھے اغیار کے بیچ

ہ بھی اب صاحب دیوان نظر آتے ہیں
لتی رہی جن لوگوں کی اخبار کے بیچ

ہد و تقوی سے چلا کام نہ کچھ محشر میں
خ صاحب بھی نظر آئے گنہگار کے بیچ

آز اس دور ستم کیش میں بے گور و کفن
ندگی جھول رہی ہے رسن و دار کے بیچ

▲

عصمت آرا

پھرتے یوسف سے جواں، ویسے طرحدار نہیں
بکتی ہر شے ہے یہاں، مصر کا بازار نہیں

ظلم اور جور و جفا سب ہے روا صرف وفا
ہے یہ وہ شے کہ یہاں جس کا خریدار نہیں

ہو کے حیران کہا "جینے کا مقصد ہے کیا؟"
ہم بھی حیران ہیں وہ اتنا سمجھدار نہیں!

کشتئ عمر رواں موجوں کے دھارے پہ ہے
ایسے غافل ہیں کہ جیسے کوئی منجدار نہیں

روز و شب زلف کو اتنا نہ سنوارو ہمدم
اب تو نہ دل ہے جواں، زلف بھی خمدار نہیں

▲

گوہر جمالی

پھر مرے پاؤں میں تقدیر کا چکر تو نہیں
مفلسی گاؤں سے لے جائیگی باہر تو نہیں

شدت درد پہ بھی ہونٹوں کو سی لوں کیسے
آدمی ہوں میں کوئی راہ کا پتھر تو نہیں

ٹوٹ کر آج فلک سے جو گرا دور کہیں
اے خدا میری ہی قسمت کا وہ اختر تو نہیں

پیاس ہر شخص کے ہونٹوں کی بجھی جاتی ہے
پیکے آیا ہوں میں چھاگل میں سمندر تو نہیں

بھوک لگتی ہے نہ اب پیاس ستاتی ہے مجھے
سحر الفت نے ترے کر دیا پتھر تو نہیں

ڈھونڈتے پھرتے ہو اللہ کو مسجد مسجد
اپنے دل میں بھی تو ڈھونڈو کہ وہ اندر تو نہیں

اپنے اخلاق کو اخلاص کو بیچوں کیسے
سونے چاندی کا مرے دوست یہ زیور تو نہیں

چاند بن کر وہ مرے گھر میں بھی آئیں گوہر
اس قدر اوج پہ اب میرا مقدر تو نہیں

قیوم خضر

نیوتا!

[اس کہانی میں عام مگہی بول چال کے کچھ الفاظ مگہی لب و لہجہ کے ساتھ استعمال کئے گئے ہیں، اور ان الفاظ کے اردو معانی آخر میں دیئے گئے ہیں ۔]

پھیکو کنبر کھدوا تھا۔ نجانے گریبی میں کا ہے جاستی لڑکن پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے بھی کھدر بدر، تلے اوپر، اولادیں تھیں۔ اس کی موگی بے چاری، بچہ جنتے جنتے ایسی گھناہی ہوگئی تھی کہ دیکھتے ہی بجے لگتا تھا۔ ایک روز شیلی میں کاتنا گھڑ گیا تو اس کی ٹوپ سے ایسا بخار چڑھا کہ مرتے مرتے بچی۔ دکھیاری کو کمجوری سے چھلی میں ایسی تلیبی رہتی کہ چلنا پھرنا دوبھر ہو جاتا۔ بچوں کا یہ حال تھا کہ کوئی سردی زکام سے ایسا تور جھور کر رہاتہ، دن ناک سے پھیمن چلتی رہتی ۔ سب بال بچوں کے گنہے کپار کے جھونٹے پر مکھیاں بھنبھناتی رہتیں۔ گوڈیا والا سٹ مسوا، بالکل ٹر ٹر، اور لوا لیوا تھا۔ آنکھ میں کیچ، دانت میں پھیسی، لنگٹے، گوہ موت میں لٹ پت پھیچا ہوئی ٹھلیا پر ریں ریں کرتا رہتا۔ سنبھلکا ایسا للکاہا اور بتاہا تھا کہ کتوں کے منہ سے نوالہ چھین کر کھا جاتا۔ سنبھلکا تو ایسا اکبلاہا اور پھیترا ہا تھا کہ اکثر گھر سے ادھیا یا رہتا۔

کبھی کبھی رات کو پڑوسن کے ذرد و جے پر سو رہتا۔ گرمی کی ایک دوپہریا کو پڑوسن نے کسلسائی ہوئی ٹھری اور کئی دن کا بنا ہوا ٹھلکوا کھانے کو دیدیا۔ بے چارہ بھکھا اور چھپا یا ہوا تھا ہی، ہڑبڑا کر گبڑ گبڑ کھا گیا۔ جس کے کارن سخت پیچش ہوگئی۔ اس کے باپ نے حکیم جی سے ادھار دوائی کی ٹکیئی اور ٹیکا تولا کر دیا مگر اک نک ایسی تھی کہ بے چارہ رات بھر چھٹ پٹ چھٹ پٹ کرتا رہا اور بھنسارے پہر مر گیا۔ پھیکو نے پرانے پھٹے ہوئے گلیف میں لپیٹ کر جیسے تیسے گاڑ دیا ۔

پھیکو کے بدھی میں کوئی بات ہی نہیں آتی کہ کا کرے، نہ کرے۔ ایک چٹکبرہ لبوتو لوس رکھا تھا جو جوانی میں تو آس پاس کی ساری بکریوں کی بھرائی کرنے کے لئے اکیلے ہی کافی تھا مگر اب وہ بھی بڈھا گیا تھا، اور بکریاں پال کھانے کے لئے آنا بند ہو گئی تھیں۔ پھیکو کے لونڈے اس کی پیٹھ پر اچھلتے رہتے تب بھی بے چارہ بے سدھ پڑا رہتا۔ پہلے تو اس کا یہ حال تھا

کوئی ذرا سے چھو بھی دے تو ایسی ڈھولنی مارتا کہ اس کی انتڑی پچوٹی نکال کر رکھ دیتا۔ وہ نہ مرتا نہ جیتا۔ پھیکو کے لئے بوجھ بنا ہوا تھا۔ ہونے والی بات کہ اماوس کی ایک رات کو اسے کوئی چرا کر لے بھاگا۔

بغل والے گاؤں میں پھیکو کی برادری میں دلّو سائیں کے گھر اس کی بیٹی کی برات آئی ہوئی تھی۔ پھیکو کو بھی رات کے کھانے کا نیوتا تھا۔ براتی تو سراتی کے یہاں ایک رات کے لئے راجہ بن جاتے ہیں۔ سالوں کے گھر میں کھانے کو چھوڑے یا نہ چھوڑے مگر تیلے تیلے ایسی ایسی فرمائشیں اور ایسی ایسی چھتانی کریں گے کہ بے چارے سراتی گڑھ جاتے ہیں۔ رات کو کھاتے کے بیلا براتیوں کے درمیان چاول میں کنّی رہ جانے اور گوشت کے چیمڑ اور اَسَنّہ ہونے کی عام شکایت ایسی پیدا ہوگئی کہ سبھوں نے کھانے سے ہاتھ روک لیا۔ چند براتیوں کو تو کھاتے ہی کھاتے اُلٹی ہوگئی، اس پر بڑا اُپدرز مچ گیا۔ ہاتھ پاؤں جوڑ کر ان کو منایا گیا۔ اسی ہیر پھیر میں رات زیادہ ہوگئی۔ پھیکو آدھی رات کو نیوتا کھا کر جب گھر واپس لوٹ رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ بھلّو کسائی کاندھے پر لاد کر کوئی چیز لئے آرہا ہے۔ پاس سے گزرا تو پھیکو نے دیکھا کہ اس کے کاندھے پر چتکبری کھال لٹک رہی ہے،

● ان مگہی الفاظ کے اُردو معنی جو مندرجہ بالا کہانی میں استعمال کئے گئے ہیں

۱. نیوتا ۔ دعوت
۲. کبرکھدوا ۔ گورکن
۳. گریب ۔ غریب
۴. کاہے ۔ کیوں
۵. جاستی ۔ زیادہ
۶. لڑکن ۔ بال بچے
۷. کھدربدر ۔ زیادہ تعداد کو ظاہر کرنے
۸. تلے اُوپر ۔ نیچے اوپر ۔ ایکے باد دیگرے
۹. مَوگی ــــ بیوی ۔ عورت
۱۰. گنسا ہی ــــ دبلا پن ، بیماری اور گندگی کی وجہ سے ایسی جسمانی حالت کہ دیکھنے سے نفرت کو جوٹ لگے۔
۱۱. ششپلی ــــ پاؤں کا تلوا
۱۲. ٹوپ ــــ خاص قسم کے درد کی تکلیف جو دوسری بیماری کا سبب بن جائے۔
۱۳. بھئے ــــ ڈر
۱۴. کمجوری ــــ کمزوری
۱۵. پھلی ــــ پاؤں کے ٹخنے اور ایڑی کا درمیانی بدنی حصہ
۱۶. ششنی ــــ ایک خاص قسم کا درد جو پسلیوں میں ہوا کرتا ہے
۱۷. گودیا والا ــــ گود کا بچہ
۱۸. ننگٹے ــــ ننگے
۱۹. کیچی ــــ آنکھ کے کوئے میں جو میل جم جاتا ہے۔ اسی کو کہتے ہیں
۲۰. پھسٹی ــــ دانتوں میں جو میل جم جاتا ہے اسی کو کہتے ہیں
۲۱. ٹر ٹر ــــ بالکل دبلا پتلا
۲۲. لوا لپا ــــ بہت کمزور
۲۳. ٹور جھور ــــ زکامی حالت میں آنکھ ناک سے پانی بہنے کی وجہ سے جو اضطراری کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی کیفیت کو کہتے ہیں۔
۲۴. ست ماسو (ست مسوا) وہ بچہ جو سات ہی مہینے میں پیدا ہو جائے۔
۲۵. بچھنیا ۔ بجوال عورتیں بچوں کے پیشاب پاخانہ سے بستر کو بچانے کی خاطر بچھاتی ہیں جو گدڑیوں سے بنی

ہوتی آسنی کی طرح ہوتی ہے۔ آجکل تو ربڑ یا پلاسٹک
وغیرہ کی ہوتی ہیں۔ اب پرانے قسم کی سپلیا کا رواج
ہی ختم ہوگیا ہے

۲۶۔ ریں ریں کرنا۔ بچوں کے رونے کی آواز
۲۷۔ پھیٹھیں — ناک کی مسلسل ریزش
۲۸۔ کپار — سَر
۲۹۔ جھونٹا — سر کے بال اور الجھے ہوئے بال
۳۰۔ لُلکاہا — لالچی
۳۱۔ مَنجھلکا — منجھلا لڑکا
۳۲۔ سَنجھلکا — سنجھلا لڑکا
۳۳۔ بتاہا — وہ آدمی، جو پاگل تو نہیں لیکن پاگلوں
کی طرح اکثر غیر معمولی حرکتیں کرتا ہو
۳۴۔ کُھنترا — کند
۳۵۔ اُنبلاہا۔ اوٹ پٹانگ بولنے والا
۳۶۔ اُدھیانا۔ گھر سے باہر ہوکر آوارہ اور بیکار گھومتے
پھرنا
۳۷۔ تہری — ایک خاص قسم کا کھانا جو چاول میں گرم
مسالہ، آلو، مٹر اور گھی وغیرہ دے کر بنایا جاتا ہے
اور جو خاص طور پر ہلدی دینے کی وجہ سے پیلے رنگ
کا ہوتا ہے
۳۸۔ ٹھیکوا — آٹے میں گھی اور شکر وغیرہ ملاکر تیل یا
گھی میں چھان کر بنایا جاتا ہے۔ جو کچوری کے سائز
کا ہوتا ہے مگر کچوری کی طرح ملائم نہیں بلکہ ذرا کڑا ہوتا ہے
۳۹۔ کِدُوجا — دروازہ
۴۰۔ چھچھناہا — کھانے کے بغیر ترسا ہوا آدمی
۴۱۔ سُجھکتا — جھوکا
۴۲۔ جھرجھر — جلدی مارنا

۴۳۔ گُبر گُبر — تیز تیز کھانا
۴۴۔ ٹگٹنی — نہایت باریک پسی ہوئی چیز
۴۵۔ بھکی — سفوف
۴۶۔ اُک ٹک — بدہضمی کے بعد طبیعت کی جو کیفیت
ہوجاتی ہے، اسی کیفیت کو کہتے ہیں
۴۷۔ بھنسارے پہر — صبح صادق کے وقت
۴۸۔ گلیف — لحاف یا توشک کے اوپر کا غلاف
۴۹۔ گاڑ دینا۔ دفن کر دینا
۵۰۔ کاکرے — کیا کرے
۵۱۔ بولتو — ناآختہ خصی
۵۲۔ بھرائی کرانا — گائے کو سانڈ سے جفت کرو
پٹنہ کے علاقے میں بولا جاتا ہے۔
۵۳۔ پال کھلوانا — گائے کو سانڈ سے جفت کروانا۔ یہ
کے علاقے میں بولا جاتا ہے
۵۴۔ پال دینا — کچے آموں کو بھوسا کے اندر رکھنا تاکہ
پک کر تیار ہوجائے۔
۵۶۔ بے سُدھ — بالکل سست
۵۷۔ بُڑھا جانا — بوڑھا جانا
۵۸۔ ڈھوسن مارنا — جانوروں کا سینگ سے مار
۵۹۔ اَنتڑی — آنت
۶۰۔ پچونی — آنت ہی کے ایک حصہ کو کہتے ہیں۔
۶۱۔ ٹھیشانی کرنا۔ دکھلاوے اور نمائش کے لئے اپنی
سے زیادہ اپنے آپ کو دکھانا۔
۶۲۔ کُڑھ جانا — دل کا دکھ جانا
۶۳۔ اُسٹھ — بالکل بدمزہ
۶۴۔ چمڑ — سخت چمڑا
۶۵۔ جُوڑنا — میسر ہونا

مرگ نینی نے کہا

مشرف عالم ذوقی

[مشرف عالم ذوقی کی کہانی "مرگ نینی نے کہا" آج کے ہندوستان میں ابھرتی ہوئی فسطائی اور طاغوتی قوتوں پر ایک کاری ضرب ہے ، نئے زہر اگلتے ہوئے حالات میں ادبی فنکاروں کا کیا فریضہ ہونا چاہیئے اور دلوں کو جوڑنے والے انسانیت بدوش جذبوں کے تحفظ کے لئے انہیں کس ایقان و اعتماد کے ساتھ میدان میں اترنا چاہئے۔ یہ کہانی اس کا خوبصورت جواب ہے ۔

آج ہندوستان میں احیاپرستی، بنیادپسندی اور مذہبی بیداری کے نام پر دوستی، محبت، شانتی، یک جہتی، اتحاد اور پریم کے تابوتوں کے ارد گرد تانڈو ناچ میں منہمک دانشوروں کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ وہ مرگ نینی کو بہت دنوں تک قید کرکے نہیں رکھ سکتے، ایک نہ ایک دن کوئی اوینا‌ش آئے گا اور اسے یاد دلائے گا کہ مرگ نینی کہاں ہے — اسے کہاں ہونا چاہئے اسے بتائے گا کہ اس کا وجود ہی سچا ہندوستان ہے — کیا اب تک اوینا‌شں زندہ ہے — کہیں کسی کرنل وکیل یا کسی رنجن نے اسے موت کے گھاٹ تو نہیں اتار دیا، نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان پر اتنا برا وقت کبھی نہیں آسکتا — کبھی نہیں آنا چاہئے۔ ہم اوینا‌ش کے لئے دعا کریں۔ ہم مشرف عالم ذوقی کے لئے دعا کریں۔ ان کی فتح کے لئے ان کی درازیٔ عمر کے لئے ۔

"مرگ نینی نے کہا" جدید اردو کہانیوں کے لئے ایک کفایہ بھی ہے اور ایک سند امتیاز بھی۔

(علیم اللہ حالی)]

★ کون ؟

مرگ نینی کی اٹھنے کی خواہش تو ہوئی لیکن پھر لیٹ گئی۔ رات کے اندھیرے میں کتنی ہی بار خالی خالی چوپایوں کی صدا ذہن کے سناٹے میں ابھرتی رہتی ہے۔ تب کوئی نہیں ہوتا صرف ایک جھوٹ بھرا ہوا وہم۔ پھر بھی کون ہے ...؟ مرگ نینی پوچھنا نہیں بھولتی — اندھیرے میں یہ لفظ پورے کمرے میں بج اٹھتے ہیں۔ اٹھ کر بتی جلانا چاہتی ہے تو مجھے کمبخت لیٹے سے ہاتھ دیر تک کھو جاتے ہیں۔ نا بابا..... اوینا‌ش گھر پہ نہ ہوں تو آدھی رات کے وقت بتی جلاتے ہوئے بھی خوف کا احساس ہوتا ہے۔ بتی جلتے ہی بستر کے سامنے آدم قد تصویریں نگاہوں میں سما جاتی ہیں ... عجیب سے شوق ہیں اوینا‌ش کے .... کھلنڈری طبیعت ... موج و مستی والی عادت .... اور یہی کمرہ اگر بابوجی کا ہوتا تو.....؟ چاروں [illegible] دشمنوں، ہمیشہ برہما کے کلنڈر جھول رہے ہوتے۔ یہاں ایک دم سے بند اس ماحول ۔ کسی طرح کی کوئی پابندی نہیں۔

چاہو تو بڑے کا مانس بھی کھالو... جتنی چاہو شراب پی لو۔ ... وہ نہیں کھاتی ، لیکن ادیباش تو بچپن سے ہی بگڑا ہوا شیر ہے... دھرم ورم بالکل مانتا ہی نہیں۔ ہاں کبھی کبھی اس کے باورچی کی جھڑکی سننے سے بھی نہیں چوکتا.. کبھی جب مستی میں ہوگا تو خوب کھلکھلا کر ہنسے گا... ’یار باس تیرے ڈیڈی بھی کم عجوبہ چیز نہیں ہیں -- اب اس عمر میں خدا کی ہاٹ پیٹنٹ ـــ، وہ ٹھہر کر دیکھتا کہ مرگ نینی اس کی بات کا برا تو نہیں مان رہی۔ پھر سنبھل کر، ہنستا ہوا، ایک شرارتی مکا اس کی پیٹھ پر جما تا... یار بولس.... فکر کی کوئی بات نہیں۔ ریٹائر ہونے کے بعد ہر آدمی اپنی مصروفیت کی راہ تو نکالتا ہی ہے۔ پھر مذہب کو سیاست سے جوڑنا تو، یوں بھی آج کل فیشن ہوگیا ہے‘

وہ چڑھ کر جواب دیتی۔ سیاسی سمجھ بوجھ کا مادہ تو ہر آدمی میں ہونا ہی چاہئے۔ اس کو اگنور (ignore) کرکے نہ تم ایک صحیح شہری بن کے دکھا سکتے ہو۔ نہ ہی خیالات کی سطح پر اپنے آپ کو مکمل محسوس کرسکتے ہو۔

پھر تو ادیباش دیر تک ہنستا رہتا۔ دراصل تیرے ڈیڈی کی آنکھ بی۔جے۔پی کے ٹکٹ کی طرف لگی ہوئی ہے۔ آج نہ کل ٹکٹ تو ملے گا ہی۔ اور سچ پوچھو تو وہ Deserve بھی کرتے ہیں۔

کمرہ اندھیرا ہو تو کتنے ہی چہرے ذہن میں بنتے رہتے ہیں۔ الگ الگ شیپ لیتے رہتے ہیں.... اور بیتے وقتوں کے پرندے کے شور نیند کی حالت میں سوئے ہوئے جسم کو چونکاتے رہتے ہیں۔ پتہ نہیں، کب کیسے ذہن کے کسی چور دروازے سے نکل کر اسد سامنے آگیا تھا۔ اور وہ دہاڑ رہی تھی۔

ہائی ڈیر اسد تم جا سکتے ہو۔ میری تم سے کوئی دوستی نہیں۔ اس لئے کہ تم گائے کا مانس کھاتے ہو۔ اس لئے کہ تم مسلمان ہو۔ تم سے تو یہ شودر (اچھوت) اچھے ہیں۔ تم سمجھتے کیا ہو، ہندوؤں کے مندروں کو ڈھا کر... زور زبردستی تلوار کے زور پر مسلمان بنا کر، جزیہ کے نام پر بھی تمہارے مسلمان بادشاہوں کی نظر ہندوؤں کو توڑنے اور کمزور کرنے پر لگی رہی ہے۔ جبراً اسلام ٹھونپنے کی کارروائی کے سوا انہوں نے کیا ہی کیا ہے۔ پاپا ٹھیک کہتے ہیں۔ تم لوگ کینسر ہو.... تم لوگوں کو یہاں سے جانا ہی ہوگا۔

پھر دھماکے کی کتنی ہی ضرب زور زور سے اس کے سر پر ہوتی رہی۔ اسد کا کھلا کھلا حیرت زدہ چہرہ اس کی آنکھوں میں پھر گیا.....

” تم... مرگ نینی ہوش میں تو ہو.... جانتی ہو کیا کہہ رہی ہو.....؟

تب کے قصے کو بہت عرصہ نہیں ہوا..... زیادہ دنوں کی بات نہیں رہی.... دروازے کے دوسرے چھور پر سنگھ کھڑے تھے... اس کے پاپا.... پرسکون چہرہ لئے..... انہوں نے بھاری آواز میں اسد سے کہا تھا۔

” معاملہ تو کچھ بھی نہیں۔ تم ہندو بن جاؤ... سو تو کر سکو گے یہ بغاوت.... آخر تم شادی کرکے اسے مسلمان ہی تو بناؤ گے ہی دھرم بھرشٹ کرواؤ گے اس کا..... تمہارے دھرم کی بساط ہی کیا ہے... سب سے پرانا تو ہندو دھرم ہے.... آجاؤ اس کی شرن میں....“

مرگ نینی کو یاد ہے... لال لال آنکھیں ہو رہی تھیں پاپا کی.. اور اسد بت بنا اپنی جگہ پر کھڑا تھا۔ پھر ہی اس نے اپنے قدم تیزی سے باہر کی طرف کھینچے۔

اسد کے جانے کے بعد وہ دیر تک اپنے کمرے میں رہی اور سوچتی رہی۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے اسد سے

بولا۔ کیا وہ اس کے اپنے لفظ تھے۔ اسکول اور کالج کی تعلیم سے پیدا لفظ — ملک کی جمہوریت سے اپجے لفظ .... اور فرقہ پرستی کیا ہوتی ہے؟ دل کو ہی فرقہ پرست بناتے ہوئے باہر کے آدمی میں دشمن دیکھنے کا نظریہ کیا خود کے ساتھ ایک دھوکہ نہیں ہے۔ اسے لگا وہ خود کو دھوکہ دے رہی ہے اسکول اور کالج کے دنوں میں اپنی جن جن بڑی بڑی باتوں کے لئے وہ مشہور تھی۔ اب وہی باتیں ایکدم سے اس کے لئے انجان بن گئی ہیں ..... ان دنوں جب سنہتی خوابوں کی پہلی پہلی بارش سے وہ شرابور ہوئی تو اس نے اپنے پورے وجود کا جائزہ لیا اور جیسے بکھرتی چلی گئی .....!

نہ یہ تو وہ مرگ نینی تھی ہی نہیں۔

اسکول کے دنوں میں جھوم جھوم کر "سارے جہاں سے اچھا ....." گانے والی ....!

یہاں تو پاپا تھے ... بوا تھی ... مایا دیدی تھیں اور رنجن تھا۔ دادی کا تو کھانا پینے کا سارا برتن ہی الگ تھا۔ پوجا کا الگ کمرہ .. اس کمرے میں تو کوئی جا ہی نہیں سکتا تھا۔ جانے پر دس صلواۃ ... بوا بھی ویسی ہی مذہبی خیالوں والی۔ مجال کہ کوئی ان کے بستر پہ بیٹھ جائے ... فوراً چادر بدلی جائے گی اور ان سب کا اثر ماں نے لیا تھا۔ ماں کہتی تھی یہاں آنے سے پہلے وہ ایسی نہیں تھی اب ہو گئی ہے۔ یعنی ماحول کا رنگ دیکھ کر... رنجن بھی ابھی سے مندر جاتا ہے۔ ماتھا ٹیکنا، جل چڑھانا اور ان سب سے بھی دو دو آگے نکل گئی ہیں مایا دیدی۔ پاپا تو کبھی ایسے نہیں رہے۔ ساری زندگی وہ کرمنل وکیل رہے۔ مایا دیدی کی شادی کے بعد جب انہوں نے صحت اچھی نہیں پائی تو وکالت سے ناطہ توڑ لیا۔ انہی دنوں ان کے پاس ننکا پاسی کا ایک کیس آیا تھا۔ قتل کا معاملہ تھا۔ وجہ تھی ایک معمولی تاڑی کا پیڑ۔ جس کا ٹھیکا ایک سال کے لئے مقتول مختار پہلے سے ہی لے چکا تھا۔ تاڑ کے پیڑ کو ہی لے کر مختار اور ننکا میں کہا سنی ہو گئی۔ بدلے میں ننکا نے تاڑ چھیلنے والا ہنسیا مختار کے پیٹ میں اتار دیا۔ ننکا کا بدحواس چہرہ دیکھ کر ہی نرسنگھ نے یہ کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ لیکن مختار کے جوان بیٹے کو ان کی یہ پیروی بھی نہ بھائی۔ صبح کے وقت ایک دن جب وہ اپنی بیٹھک میں بیٹھے "موکلوں" کی فریاد سن رہے تھے، مختار کے لڑکے نسیم اللہ نے انہیں جان سے مارنے کی کوشش کی تھی۔ نسیم اللہ کو پکڑا گیا لیکن تب سے نرسنگھ کا مزاج مسلمانوں کی طرف سے اور بھی خراب ہو گیا۔

مایا دیدی کی شادی کے بعد پاپا نے اتنے پیسے تو جوڑ ہی لئے تھے کہ ساری زندگی عیش کر سکتے۔ یوں بھی کرمنل لائر رہے تھے۔ ایک ایک "موکلوں" کی پیروی میں ہی کتنا کما لیتے تھے۔ انہی دنوں راشٹریہ سویم سیوک سنگھ میں ان کی دلچسپی بڑھی تھی۔ اور اس کی سبھاؤں میں وہ پابندی سے جانے لگے تھے۔ یوں بھی سماج میں صرف عہدہ، رتبہ، اور پیسہ تو چلتا نہیں۔ کچھ نہ کچھ سیاسی کیریکٹر بھی آج کے زمانے میں ضرور ہونا چاہئے جو جب تب کسی بھی برے وقت میں کام آ سکے۔ نرسنگھ کی دلچسپی اب سبھاؤں میں بڑھنے لگی تھی۔ اور یہ دلچسپی کا ہی کمال تھا کہ روزانہ اب سبھاؤں کے دفتر اب ان کے اپنے گھر میں بھی لگنے لگے تھے۔ اور ان سبھاؤں کے معرفت ان کی اپنی مذہبی معلومات میں اضافہ ہو چکا تھا۔ جیسے انہوں نے جانا کہ مسلمان تو شودر سے بھی بدتر ہیں۔ اس قوم نے ہندو قوم کے ساتھ اتنی زیادتی کی ہے کہ ان کے کئے پر بھی کوئی رحم نہیں کھانا چاہئے۔ اور یہ کہ سب سے پرانا اور صحیح مذہب تو ہندو مذہب ہے۔ جس کا کوئی وجود ہے۔ پرانی روایت رہی ہے۔ اسلام تو بہت بعد میں آیا اور اسکی تعلیم پر بھی دوسرے مذہبوں کا ہی اثر رہا۔ زبردستی محمد صاحب نے اسے تلوار کے زور پر اور عرب

کے بھولے بھالے ہوئے لوگوں کو اپنی جادوئی باتوں کے موہ جال میں پھنسا کر پھیلایا اور یہ بھی کہ مسلم بادشاہوں نے تو ہمیشہ ہی بے چارے ہندوؤں پر قہر کا پہاڑ توڑا ہے۔ اب جبکہ ان کی اپنی حکومت ہے تو انہیں اس ناسور کو ہندوستان کی زمین سے بھگا کر ہندو راشٹر قائم کرنے کے خواب کو تو پورا کرنا ہی ہے۔

پاپا کی زندگی میں آئے ان ساری تبدیلیوں کو مرگ نینی نے براہ راست دیکھا تھا۔ ان کی زندگی بدل گئی تھی۔ پہناوا بدلا تھا۔ اب انہوں نے درجن بھر کیسریا ٹوپی بھی بنا رکھی تھی۔ کئی خاکی ہاف پینٹ بھی تھے جو ان کے موٹے بھدے پیروں پر بالکل نہیں پھبتے تھے۔ لیکن پاپا ہر سبھا میں باقاعدہ اپنے یونیفورم میں ہی جاتے۔ پھر تو گھر کی دیواروں پر بھی مذہبی کلینڈروں نے اپنی جگہ بنانی شروع کر دی تھی۔ "فخر سے کہو ہم ہندو ہیں" والی چھوٹی چھوٹی کترنیں ڈرائنگ روم اور پاپا کے کمرے میں جا بجا لگنے لگی تھیں۔ اسے لگتا، گھر میں ایک خطرناک زہریلی تبدیلی آ گئی ہے۔ گھر کے سارے فرد ایک محدود دائرے میں پناہ لینے لگے ہیں۔ ذہن کی سینسیٹو (SENSITIVE) سطح پر مذہب پکڑ والا یہ ایک خاص طرح کی بندش لگا رہا ہے — تب وہ کالج میں تھی اور کہنا چاہئے اسد اسے ہر طور پر اچھا لگنے لگا تھا۔ اسد اس کا کلاس فیلو بھی تھا۔ وہ بھی تواریخ سے ہی آنرس کر رہا تھا۔ تواریخ یعنی پرانی یادوں کی دستاویز۔ اسے اسد کی باتیں اچھی لگتیں۔ اسے لگتا اسد کافی پڑھتا ہے، سوچتا ہے اور کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتا ہے۔ یہ بھی کہ مذہب کی کٹر روایتوں کو اسد ایک بیکار سی چیز مانتا ہے۔ انہی دنوں ملک میں کئی جگہوں پر فرقہ وارانہ فساد چھڑے ہوئے تھے۔ دل دہلا دینے والی سرخیوں کو دیکھ اسد کافی غصہ ہوا تھا۔

"مرگ نینی! سچ پوچھو تو سب سے غلط کاروبار یہ اخبار والے کرتے ہیں۔ یہ ایسا کیوں لکھتے ہیں کہ اتنے مسلمان مارے گئے یا ہندو مارے گئے؟ کیا صرف "آدمی مارے گئے" سے کام نہیں چل سکتا۔ ہندو مارے گئے یعنی مسلمانوں سے نفرت پیدا کرنا — مجھے لگتا ہے پریس میڈیا نے اب تک صحیح استعمال نہیں سمجھا ہے۔"

ایک دن فرصت کے لمحے مرگ نینی نے اسد کو گھر آئی تبدیلیوں کی کہانی سنائی تو اسد کسی خاص سوچ میں ڈوب گیا۔ مرگ نینی نے بھولے پن سے پوچھا کہ تواریخ میں بھی پڑھتی ہوں۔ لیکن کیا واقعی مسلمان ایسے تھے؟ اسد نے محمد غوری اور اورنگ زیب جیسے بادشاہوں کا نام لیا جو اپنی ہندو دشمنی کے لئے مشہور رہے تھے۔ اسد نے غصے میں بتایا کہ یہ تواریخ کے مصنفوں کا جھوٹ ہے جو نئی نسل کو برین واشنگ کرنے کے سوا اور کچھ جانتے ہی نہیں۔ تاریخ کے اوراق پر مسلمان بادشاہوں کی جو اچھی مثالیں موجود ہیں، وہاں ان تاریخ لکھنے والوں کی نظر ہی نہیں گئی۔

کیا مسلمان بادشاہ ہندوستان میں "نظامِ مصطفیٰ" چاہتے تھے؟ مرگ نینی نے اپنا سوال پھر دہرایا۔ "نظامِ مصطفیٰ" پاکستان کے حوالے سے اس کا ذکر کتنی بار گھر میں آیا تھا۔

اسد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "نظامِ مصطفیٰ تو اچھی چیز ہے تم اس کا مقابلہ "رام راجیہ" یا ترقی پسند نظریہ کی بنیاد پر بھی کر سکتی ہو۔ لیکن اگر تم اس میں تلوار کی زبردستی کی تفصیل لاتی ہو۔ تو یہ صرف فرضی کہانیاں ہیں۔"

کالج کے چہکتے ماحول سے ہوتی ہوئی ایک بار وہ کورٹ آف ہاؤس کے کٹہرے میں کھڑی تھی۔ جہاں اس کے پاپا اور ممی کی لال لال آنکھوں والی عدالت لگی تھی۔ ایک نا رسی جرح مرگ نینی کے ذہن میں ہلچل مچا رہی تھی۔ نرسنگھ پوچھ رہے تھے۔

"تم کالج میں کسی مسلم لڑکے سے ملتی ہو؟"

"جی ——"

"تم کسی مسلمان لڑکے سے ملتی ہو، اتنا ہی جاننا ہمارے لئے کافی دکھ بھرا ہے؟ اس لئے کہ بہتر ہے کہ تم آگے اس سے نہیں ملو ——"

"لیکن ——؟ ——"

اور اس "لیکن" کو پاپا نے ایک چنوتی کے طور پر لیا۔

"تم، جیسے کالج کی چھوٹی موٹی دوستی کہہ کر بات ٹالنے کے موڈ میں ہو، یہی دوستی دو چار ملاقاتوں کے بعد محبت کہلانے لگتی ہے۔ اور محبت بھی ایک واہیات مسلمان سے۔ تم کسی ہریجن کو بھی چاہتی تو مجھے کوئی دکھ نہیں ہوتا، جتنا یہ سن کر ہو رہا ہے کہ تم ایک مسلمان سے میل جول بڑھا رہی ہو۔"

پھر ممی نے آڑے ہاتھوں اسے لیا تھا۔ میں کی چھایا سے بھی دھرم بھرشٹ ہوتا ہے پگلی۔ گائے کا مانس کھانے والے۔ یہ میں تو اپنے کے بھی نہیں ہوتے۔"

پھر لوانے سنے سنائے اتہاس کے بیتے کل پنے کھول کھول کر آگ میں جھونکنے شروع کر دیئے کہ میں تو نہاتے ہی نہیں، اور ایک سے ایک کہانیاں جو پوری قوم کو غدار قرار دے رہی تھی۔

اب باری تھی مایا دیدی کی، جو اندلوں پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کر رہی تھیں۔ مایا دیدی نے اسے مذہبی سیاست کا ملا جلا خلاصہ پلایا۔

"آخر اب کس لئے مسلمان اس ملک میں ہیں؟ آزادی کے ہنگامے نے تو جناح کے مسلم لیگی ذہن میں یہ بات بٹھا دی کہ گاندھی جی انگریزوں کے سامنے بھلے ہی توپ ہوں۔ لیکن سچائی میں ہیں سب سے دلّو آدمی —— یہی وقت ہے ہندوستان کی کوکھ سے ایک اسلامی ملک کو اچک لینا۔ ایک بڑا حصہ نگلنے کے بعد بھی تو ہندوستان نے پاکستان کی طرح اسلامی ملکوں جیسا مذہبی لیبل اپنی پیشانی پر نہیں رکھا۔ دنیا بھر میں آخر اتنے سارے اسلامی ملک ہیں۔ "ہندو راشٹر" تو مٹھی بھر بھی نہیں۔ پھر آخر یہ مسلمان ہندوستان کو ایک ہندو ملک کے طور پر دیکھنا کیوں نہیں گوارا کرتے؟"

مرگ نینی چپ چاپ سنتی رہی۔ کیا بولتی کے اس لمبے چوڑے بھاشن کا اسد سے کیا تعلق ہے۔ مذہب کی سیاست کے اس بھنور میں اس کی اور اسد کی دوستی کہاں آتی ہے؟"

ایک باری تھی رکھن کی —— اس کا چھوٹا بھائی۔ دراصل اسد سے ملنے جلنے کی معلومات رکھن نے ہی پہنچائی تھی۔ وہ ایک ہی جملہ اچھال کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

" اس میں کے چھوکرے کو تو ایک ہی بار میں ...

اس نے سرخ آنکھوں سے مرگ نینی کو دیکھا تھا۔ اور مرگ نینی تڑپ کر تیزی سے بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ اور زور زور سے رونے لگی۔ لیکن اچانک اسے لگا۔ رونا کہیں سے کسی مسئلے کا حل نہیں۔ بلکہ ایک طرح کی بزدلی ہے کہ وہ اسد سے نہیں ملے۔ اس لئے کہ بغاوت وہ کر نہیں سکتی۔ نہ ہی یہ اس کے بس کا روگ ہے۔"

پھر ایسا کتنی بار ہوا جب اس طرح کی سبھاؤں میں پاپا گھر کے لوگوں کو بھی شامل کرنے لگے۔ پھر کتنی ہی بات اس کی دھیرے دھیرے سمجھ میں آنے لگیں۔ مسلمان بادشاہوں کے قصے اس کے سامنے کھلنے لگے۔ اندھیرے کی کیسی کیسی تہیں تھیں۔ ان سبھاؤں میں ہندو مذہب کو دور دور تک پھیلانے کی بات ہوتی۔ معصوم ذہن میں ہندو دھرم کے بیج لگائے جانے کا ذکر ہوتا۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ ہندوستان کو وہ ایک مکمل ہندو راشٹر کی شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

اب پاپا کے ساتھ ساتھ ان سبھاؤں میں وہ ماں کے تیور بھی پڑھنے لگی تھی ... اس دن گھر پر ہی کچھ لوگوں کے آجانے

سے ایک جھجک ہو گئی تھی۔

ماں بولی تھی۔

ایک چیز ہوتی ہے قوت برداشت، مسلمان بادشاہوں نے ایک ہی بات جانی۔ حملے کی بھاشا اور تلوار کی زبان۔ اور ہم نے محبت کی بھاشا سے کام لیا۔ یا برداشت سے۔ نتیجہ، وہ ہمارے سر پر چڑھ گئے اب باری ہے، انہیں سیدھے سیدھے بتانے کی کہ ہندوستان پوری طرح ایک ہندو راشٹر ہے۔ یہاں رہنا ہے تو ہندو بن کر رہنا ہوگا۔"

پتہ بھی نہیں چلا۔ کب کیسے دوسرے بہت سارے لوگوں کے ساتھ ہنسی قہقہوں کے بیچ مرگ نینی کے ہاتھ بھی اچانک تیزی سے اٹھ گئے۔

"مسلمان کا ناش ہو! ...."

پاپا نے پیار سے اس کی طرف دیکھا پھر لہجہ سخت ہوا۔ - فخر سے کہو ہم ہندو ہیں۔" پھر سب نے یہ جملے دہرائے۔ فخر سے کہو.... اور مرگ نینی کو لگا، اسد اچانک کسی غار میں چھپنے لگا ہے۔ اس کا سایہ گم ہوا جا رہا ہے۔ اُسے یاد آیا اسد نے ایکبار کہا تھا

"دراصل آر۔ ایس۔ ایس کمیونل جماعت نہیں ہے۔ ڈاکٹر ہیڈگیوار نے تو اسے بطور ڈسپلن لیا تھا کہ ہندو مذہب ایک خاص طرح کی ڈسپلن کی پیروی کر کے زندگی کے مقصد کو سمجھیں مرگ نینی کو لگا اسد اس غار میں ڈوبتا جا رہا ہے اور جب اس اندھیرے تنگ غار سے اس کا سر تھوڑا سا اونچا ہوا تو وہ بیٹھ گیا۔

"تمہارا ناش ہو — تم سب کینسر ہو کینسر......"

پاپا نے مشورہ دیا — اسد تم اپنا مذہب چھوڑ کر آجاؤ ور اسد پھر سے غار میں گم ہو گیا... باہر نہیں نکلا— تب سے کتنا وقت گذر گیا۔ پھر اس کی شادی اویناش

سے کر دی گئی۔ اویناش دہلی میں دوا کی ایک بڑی میڈیکل ریپرزنٹیٹیو تھا فطرتاً سے چنچل اور آزاد خیز نہیں ماننے والا۔ اویناش کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ خاص کر عبدل بھائی۔ جو بلا ناغہ آتے۔ پھر مچھلی کی بہار آجاتی۔ عبدل بھائی کی پرانی دہلی میں ا کی دکان تھی۔ اب تو وہاں ان کے بچے بیٹھتے تھے۔ ایک شادی بھی ہو گئی تھی۔ لیکن وہ پتہ نہیں کیا تھا کہ اتنے کے بعد بھی ان کا دل اویناش سے ہی لگتا تھا۔ وہ" نہ کچھ بنوا کر گھر سے لایا کرتے۔ شروع شروع میں تو م کو گوشت مچھلی چھوتے ہوئے بھی ڈر سا لگتا تھا۔ گو کا گھر جہاں ان سب کے بارے میں سوچنا بھی گنا اویناش کے لئے تو سب گوشت برابر تھے۔ کیا بڑے کا— شروع شروع میں تو اس کا سارا جسم ہی سہ پھر دھیرے دھیرے وہ عادی ہونے لگی۔

(۲)

اندھیری رات — مرگ نینی کی اٹھنے کی خو لیکن پھر وہ لیٹ گئی۔ رات کی تاریکیوں میں تو کتنی ہی با سناٹے میں خالی خالی قدموں کی صدا اُبھرتی رہتی ہے تب کوئی نہیں ہوتا، صرف ایک جھوٹ بھرا یقین۔ نینی یہ سب کیوں یاد کر رہی ہے۔ تب سب کچھ ایک خواب کی طرح اس کے ذہن پر نقش ہو گیا... جیسی حالت.... جیسی کہ اب اس ملک کی ہوئی پرستی کے بڑھتے شعلے اور ملک میں ہونے والے فر ...... رام جنم بھومی اور بابری مسجد سے اپجے مسئلے۔ کا مسئلہ ان کی دل دہلا دینے والی سرخیوں سے اندر۔ خون کو محسوس کرنا— اور کہیں اپنی ہی آنکھوں۔ کہ یہ کیا ہو رہا ہے...: یہ جماعتیں کیا کر رہی ہیں..

لیا اس میں پورے ملک کو ہی نیست و نابود کرنے میں جٹ
رہیں۔ تب ایک ایسے ہی خوفزدہ خوابوں کی آندھی اور بھی
لگی... جب اس کا پہلا بچہ بلبیرا سے ڈیڑھ سال کی
میں اسے روتا چھوڑ گیا تھا۔ اور وہ کسی بھیانک خواب
طرح چیخ مار مار کر اٹھتی اور رو رو کر دروازے کی طرف بھاگتی
.. اور یہی اویناش تھے اور عبدل بھائی جو اسے بار بار پکڑ
اندر لاتے.... پھر ہفتے مہینوں گزر گئے۔ عبدل بھائی
سمجھایا تھا... صبر کرو اویناش.... بہو کو دورے نہیں
تے.... اسے محبت کہتے ہیں... جب تک اس کی گود دوبارہ
ہیں بھر جاتی.... ہم تم اس کا علاج نہیں کر سکتے...."

بلبیر کی موت کا سن کر پاپا بھی آئے تھے۔ عبدل بھائی
دیکھ کر پاپا کی آنکھوں میں کنکری چبھی تھی۔

"یہ بوڑھے میاں یہاں کیوں آتے ہیں؟"

اویناش نے بتایا ہمارے ہمدرد ہیں۔ مرگ نینی کو
بت مانتے ہیں۔ بچے کام پر لگ گئے خالی ہیں تو زیادہ وقت
ہیں گذارتے ہیں۔

پاپا نے اپنے طور پر سمجھایا — "زمانہ خراب ہے۔
ہ بوڑھے میاں کا یہاں آنا اچھا نہیں سمجھتے۔"

اویناش نے بات بڑھانا مناسب نہیں سمجھا۔ تاؤ کھاتا
ہوا وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں لوٹ آیا تھا۔ لیکن شاید پاپا
ی بات وہ اپنے دل سے نکال نہیں پایا۔ شام کے وقت دروازے
پر دستک پڑی..... بہو... او بہو......

آواز عبدل بھائی کی تھی۔ اویناش نے دروازہ کھولا...
چہرے پر پاپا والی بات کی بھاپ موجود تھی۔ "آئیے!" کہتے
ہوئے اس کے لہجے میں بھاری پن موجود تھا۔ عبدل بھائی نے
کو بھی محسوس نہیں کیا۔ اس کے برعکس بہو..... بہو کہتے ہوئے
اندر آ گئے۔ ہاتھ میں ایک پیالہ پکڑے ہوئے تھے۔ مرگ نینی
قریب ہی تھی۔ تیزی سے لپکی —

"کیا ہے.....؟"

عبدل بھائی خوش ہو گئے.. کچھ سوئیاں بنی تھی بہو،
سوچا تمہیں اور اویناش کو بھی چکھاتا چلوں....

اویناش نے آگے بڑھ کر پیالہ لپک لیا تھا... اور
بہت غور سے گمبھیرتا سے عبدل بھائی کی آنکھوں میں آنکھیں
ڈال دی۔

"کیوں کرتے ہیں یہ سب... کیوں لاتے ہیں اتنا کچھ۔
آپ جانتے ہیں آپ ہمارے لئے صرف ایک مسلمان ہیں..
جو ہم سے محبت رکھ ہی نہیں سکتے۔

"کون کہتا ہے۔" عبدل بھائی کانپ کر رہ گئے۔

اویناش نے نظرانداز کرتے ہوئے دوبارہ پوچھا...
سکھ دکھ کے موقع پر آپ نے ہمارے ساتھ جو کچھ بھی کیا
ہے، وہ کیا کسی غرض سے کیا ہے؟

کیا کہتے ہو اویناش — عبدل بھائی بگڑ گئے تھے۔
سارا قصور تو دل کا ہے... جسے چاہے پسند کرے۔ جس کا چاہے
ہو جائے... تم اور بہو اپنے لگتے ہو تو....."

لیکن اچانک ہی عبدل بھائی نے نرسنگھ کی جلتی آنکھوں
کو دیکھ کر سارا معاملہ سمجھ لیا۔ وہ اٹھ کر چل دیئے اور نرسنگھ
غصے میں سامان باندھنے لگے۔

مرگ نینی غصے میں تھی — پاپا کی انسلٹ کیوں کی.."

"انسلٹ کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا..... میں
صرف بات کی باریکی سمجھانا چاہ رہا تھا... کہ دراصل ویسا کچھ نہیں
ہے جیسا وہ سمجھتے ہیں۔"

عبدل بھائی نے بھی جاتے جاتے کہا تھا: "قصور صرف
ایک طرف سوچ کا ہے، پرانی دلی کی جب ہوا خراب ہوتی ہے تو
ہمارے بچے بھی ہندو مسلمان کا فرق نکالنے لگتے ہیں.... اللہ

بچائے اس ہوا سے ــــ "

اور اویناش نے کہا تھا ۔ سارا قصور تو ان سیناؤں کا ہے مرگ نینی ۔ ۔ ۔ بجرنگ سینا ۔ ۔ ۔ ۔ شیو سینا ۔ ۔ ۔ ۔ آدم سینا ۔ ۔ ۔ ۔ باندر سینا ۔ ۔ ۔ ۔ ان سیناؤں نے ملک کی سالمیت نوچ ڈالی ۔ ۔ ۔ ۔ جمہوریت ختم کر ڈالی ۔ اب صرف الگ الگ مذہب کے نام پر یہ نامرد سینائیں بچی ہیں ۔ جو ہمارے یہاں کی تاریخی یکتا سے کھیلتی رہتی ہیں ۔ ۔ ۔ "

مرگ نینی صرف اتنا بولی ۔ ۔ ۔ " لیکن یہ کوئی وقت تھا بولنے کا ، پاپا ہمارے غم میں آئے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ اب غصے میں جا رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ روکو نا ۔ ۔ ۔ ۔ "

اویناش نے یہاں بھی سختی دکھائی ـــــ نرمی کا مطلب ہے ایک بیمار سوچ کو قبول کرنا ۔ ۔ ۔ اور اس کو ٹھہراؤ دینا ۔ ۔ اس سے یہ ممکن نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ "

مرگ نینی کو لگتا ہے پاپا اور ان کے تعلقات کے بیچ کہیں دراڑ پڑ گئی ہے ۔

ایک گمبھیر فکر میں ڈوب گئی ہے مرگ نینی ۔ رات جیسے جیسے سرکتی رہی ۔ مرگ نینی گہری اداسی میں ڈوبتی چلی گئی ۔ اندر صدیوں سے چھپ بیٹھے ناگ نے جیسے اُسے ڈسنا شروع کر دیا ۔ ۔ ۔ تم کہاں ہو مرگ نینی ۔ ۔ ۔ اس پورے تناظر میں ؟ تم کہاں ہو؟ شاید کہیں نہیں ۔ ۔ ۔ کیا اوقات ہے تمہاری ۔ ۔ ۔ ؟ کیا حیثیت ہے؟ تمہاری اپنی شخصیت کیا ہے ؟ ۔ ۔ ۔ یا بالکل ہی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ تم صرف دوسروں پر منحصر رہی ۔ ۔ ۔ یا جیتی رہی ۔ ۔ ۔ شادی سے پہلے پاپا کے مذہبی خیالوں والے کٹہرے میں ۔ ۔ ۔ اور شادی کے بعد شوہر کی آزاد خیالی کے آسمان میں ۔ ۔ ۔ لیکن یہ تو دونوں کے وجود کا حصہ تھا ۔ ۔ ۔ تم خود کہاں رہی مرگ نینی ؟ اگر نہیں رہی تو کیوں نہیں رہی ۔ ۔ ۔ ؟

اور مرگ نینی کو لگا ۔ ۔ ۔ وہ خلا میں بکھرتی جا رہی ہے ۔

لیکن یہ احساس بھی تھا کہ اس بکھراؤ سے ہی ایک مضبوط کا جنم ہوتا ہے ۔

اس دن عبدل بھائی گھبرائے ہوئے آئے تھے ۔ چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا ، پھر بھی ہاتھوں میں لفن موجود تھا جس میں اویناش کے لئے گھر سے بنا ہوا " اشٹو گوشت " لائے تھے ۔ عبدل بھائی کا لہجہ اس دن سہما ہوا تھا بولے ۔

" پتہ نہیں کیوں آزادی کے اتنے سالوں بعد لگتا ہے یہ ملک اب ان کا اپنا نہیں رہا ۔ ہوا بدلتی جا رہی ہے ۔ ذہن میں فرق کے جراثیم آ گئے ہیں ۔ خدا بچائے ۔ حکومت بنانے والی پارٹیاں بھی اب کھلے عام مسلم دشمنی کا اعلان کرنے لگی ہیں ! اگر پاگل ہوا کا بہاؤ یہی رہا تو ۔ ۔ ۔ "

اویناش نے ٹوکا تھا ـــ " آپ غلط سوچ رہے ہیں عبدل بھائی ، چند ناسمجھ لوگ اگر ۔ ۔ ۔ ۔ "

" ناسمجھ نہیں " عبدل بھائی کے صبر کا پیمانہ چھلک آیا ۔ " ان چند سالوں میں مذہب کے پاؤں ہندوستان کی زمین پر جس طرح مضبوطی سے جمے ہیں ، پہلے کبھی دیکھا تھا ، سچ بتاؤ " عبدل بھائی نے ٹھنڈی سانس بھری ۔ نزہت کا فون آیا تھا اس کے یہاں اسٹڈی (S.T.D) ہے نا ۔ ۔ ۔ جب تک فون رہتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ فون پر کیسی لرزتی ہوئی آواز تھی اس کی ۔ ۔ کہہ رہی تھی " ابا ، فضا بہت خراب ہے ۔ ۔ ۔ ڈر لگ رہا ہے ۔ ۔ ۔ کبھی بھی کچھ بھی ہو سکتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔

" آپ انہیں بلا کیوں نہیں لیتے ۔ " مرگ نینی نے پوچھا

" کیسے بلاؤں ۔ ۔ ۔ بیٹی داماد کی بات ہے ۔ ۔ ۔ فیروز کے کام میں خلل پڑتا ہے ۔

اس دن پہلی بار عبدل بھائی بوڑھے لگے تھے ۔ کمر تھوڑا جھکے ہوئے ۔ ۔ بال تو پورے پک گئے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ہاتھ کی جھریوں میں بھی کپکپاہٹ آ گئی ہے ۔ ۔ ۔ لرزتی ہو

ہا مہ سیل گیا۔

ز بیمار ماحول کا ایک حصہ بن گئی۔

"خیر! جو ہو رہا ہے اچھا نہیں ہو رہا ہے۔ فرقہ پرست
ٹیوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور یہ پارٹیاں
بیت کر اپنے حلقے میں فرقہ واریت بڑھاتی جا رہی ہیں۔ روز
ز طاقت ور بنتی جا رہی ہے۔ تم اسے کیا نام دوگے اوینا ش؟
ں کا مطلب تھک ہار کر عام ذہنوں نے بھی مذہب کے
ریں کو قبول کر لیا ہے۔ یا جو بھی وجہ رہی ہے.... اور ایک
ں یہ فرقہ پرست پارٹیاں ہی۔ یہاں حکومت کریں گی۔ تب؟
وچ سکتے ہو ہم کتنے نازک دور میں آکر ٹھہر گئے ہیں...؟

عبدل بھائی کی سانس تیز ہو گئی.... اسے کچھ اور
ت سمجھا۔ لیکن یہ سچ ہے کہ یہ دنگے زیادہ وہیں ہوئے ہیں
اں مسلمان کی مالی حالت اچھی رہی ہے اور آر ایس۔ ایس
یسی جماعتوں کی نظر میں وہاں لگی رہی ہیں.... مسلمانوں
توڑنے کے لئے...!

عبدل بھائی چلے تو گئے.... مگر مرگ نینی کو گہری فکر میں چھوڑ
۔ اپنے سونے پن کے گھنے دائرے میں گم ہوتے ہوئے اسے اپنے
کی وہ سبھا یاد آگئی، جہاں اس نے بھی مذاق میں ہی ہاتھ ملا کر
پاکے دوستوں سے اتفاق کیا تھا۔ "مسلمانوں کا ناش ہو۔"

اچانک خلا میں ڈوبتے ہوئے اسے لگا۔ چہرے بدلنے
لگے ہیں پاپا کے.... ممی کے.... اور سبھوں کے جن کے تعلق ایسی
رشتوں سے تھے، اسے لگا ان کے چہرے سخت ہونے لگے ہیں۔
.. پھر وہ ایکدم سے دیو نظر آنے لگے.... بے ہنگم.... وحشی سروں کا
لاپ کرتے.... اور اسے لگا کمرے میں دور تک خون پسر گیا ہو۔

اس کی دھیرے سے چیخ نکل گئی۔

تسلسل تو اس وقت ٹوٹا.... جب اس نے دیکھا۔
ہی ایک بوڑھا لڑکھڑاتا وجود اوینا ش کے ہاتھوں کے سہارے
انے ڈرائنگ روم میں چپ چاپ آکر بیٹھ گیا ہے.... وہ

ایک ٹک عبدل بھائی کے سوکھے آنسوؤں کے پیچھے چھپی درد
ناک کہانی کو پڑھنے کی ہمت کرنے لگی۔

اوینا ش کا چہرہ پتھر جیسا سخت دکھ رہا تھا۔

دوپہر، دو بجے کا وقت — دھوپ کی تپش نے پورے
شہر کو جھلسا کر رکھ دیا تھا، آگے بڑھ کر مرگ نینی نے کولر آن
کر دیا۔ عبدل بھائی اچانک سسک سسک کر رونے لگے تھے۔

اوینا ش نے جھنجھوڑا — "عبدل بھائی ہمت رکھئے۔"

مرگ نینی نے کانپتی آنکھوں سے اوینا ش کی آنکھوں میں
جھانکا۔ اوینا ش نے اسے کچھ اشارہ کیا۔ وہ لرزتے قدموں
سے دوسرے کمرے میں بھاگی اور فریج کھول کر ٹھنڈا شربت
بنا کر لے آئی۔ عبدل بھائی نے دھیرے دھیرے شربت گلے سے
نیچے اتارا۔ اور پھپھک پڑے۔

"سب کچھ لٹ گیا بھائی — سب کچھ —"

وہ تھوڑی دیر تک بیٹھے — اوینا ش نے روکنے کی
بہت کوشش کی لیکن رکے نہیں۔ اوینا ش نے انہیں گھر
تک چھوڑنا چاہا — لیکن وہ ٹال گئے.... بچے بہت غصے میں
ہیں.... تمہارا جانا ٹھیک نہیں....

عبدل بھائی کو چھوڑ کر اوینا ش دوبارہ واپس آئے تو
مہینوں کے بیمار دکھ رہے تھے۔ آتے ہی مسہری پر لیٹ گئے۔
گہری اداسی میں — مرگ نینی دھیرے سے بڑھی — ماتھے پر کانپتا
ہوا ہاتھ رکھا — پوچھا کیا ہوا۔؟

"عبدل بھائی کے بیٹی داماد۔" اوینا ش کا لہجہ کانپ
رہا تھا۔ بارہ بجے فون آیا تھا نورینہ کا — فون عبدل بھائی نے
ہی ریسیو کیا — فون پر ڈری سہمی آواز تھی —

"ابا سارے محلے میں آگ لگ رہی ہے — پھر آواز آئی۔
ابا وہ پڑوس کا مکان جلا رہے ہیں — فون پر تھوڑی دیر
پر آیا تھا — پھر فون آیا — ابا ایک بلوائی ہمارے گھر میں

گھس رہے ہیں... ابا! اب وہ پھاٹک توڑ رہے ہیں... ابا
اب پھاٹک ٹوٹ گیا ہے... ابا! اب وہ گھر میں داخل ہو گئے
ہیں... اور ابا... صرف ایک تیز چیخ تھی زرینہ کی — اور اس
کے علاوہ عبدل بھائی کچھ نہیں جانتے کہ کیا ہوا؟

اوناش نے دانتوں کو بھینچتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔
یہ کیا ہے — کیا ہو رہا ہے... ؟ .... کیا یہ پوچھنے کا حق ہم
کو نہیں ہے کہ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ آخر ہم بھی اس ملک
کے رہنے والے ہیں.... اس کی آواز لڑکھڑا گئی تھی۔ یار باس!
تمہارے پاپا بھی انہیں میں سے ایک ہیں۔ قاتل.... درندے...

مرگ نینی اچانک اٹھ کھڑی ہوئی — "میں جا رہی ہوں"

اوناش نے پلٹ کر دیکھا — کہاں؟

"عبدل بھائی کے یہاں" اس کے لہجے میں سختی تھی۔

اوناش پلنگ سے اٹھ کر بیٹھ گیا — پاگل ہوئی ہو۔
عبدل بھائی کے بچے خونخوار ہو رہے ہیں اس وقت۔ جانا مناسب
نہیں ہے۔"

"لیکن میں جاؤں گی۔"

مرگ نینی کے لہجے میں پہلے سے زیادہ سختی تھی "میں اکیلے
جا رہی ہوں۔"

اوناش دھم سے لیٹ گیا۔

عبدل بھائی کے یہاں ماتم پرسی کرنے کتنے ہی لوگ آ گئے
تھے۔ رہ رہ کر سسکیوں کی آوازیں تیز ہو جاتیں — مرگ نینی
ایک طرف کھڑی تھی، اسے غصے میں دیکھتے ہوئے عبدل بھائی کے بچے
اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ان کی چھوٹی بیٹی ریحانہ بھی ہمیشہ کی طرح
آج مرگ نینی سے کھیلنے نہیں آئی۔ مرگ نینی دھیرے سے آگے
بڑھی اور عبدل بھائی کی بیوی سے سٹ کر بیٹھ گئی اور اچانک
جانے کیا ہوا کہ وہ سسکیوں سے رونے لگی۔ عبدل بھائی پلٹے پاؤں
لوٹے اور اسے لپٹا لیا۔ عبدل بھائی کے بچے بھی نکل کر باہر آ گئے
تھے۔ چہرہ سوجا ہوا تھا لیکن اب وہاں نفرت نہیں تھی
سکون جھلک رہا تھا۔

وہاں سے وہ لوٹی ضرور، لیکن لگا، وہ کسی قبر
سے نکلی ہے۔ ایک بھیانک سناٹے نے پورے ماحول کو
لیا ہو — رات میں عبدل بھائی، اور عبدل بھائی کے گھر کے
لوگوں کے چہرے ذہن میں چھائے رہے۔ کیا سچ مچ فضا یہ
یا اتنی اشانت کے کبھی شانت نہ ہو سکے گی۔ اب تو ہر تہوار
کے موقع پر بھی پولس سیکیورٹی بڑھا دی جاتی ہے۔ کیوں؟
لئے؟ کیا ہر تہوار سانپ کا رقص کے لئے روز بروز ایک
بنتے جا رہے ہیں۔ آنکھوں میں ہندوستان کا ایک نقشہ بنتا
وہ دیکھتی ہے۔ اس پورے نقشے کو دنگائی گھیرتے جا رہے
ان میں ہر شکل اس کی جانی پہچانی ہے۔ پاپا سمیت سارے
کو وہ پہچانتی ہے... اور پاپا کہہ رہے ہیں... اتنی
اگر اب ہمیں یہ احساس ہوا ہے کہ اس ملک میں ہندو
آ سکتا ہے تو ہمیں اس کے لئے کوشش کیوں نہیں کرنی
مرگ نینی کا ... نفرت سے بھر اٹھتا ہے
لگتا ہے... وہ ریلیکس نہیں ہو پا رہی ہے... اس
انتشار بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

گھر آئی تو پتا جی کا خط رکھا ہوا تھا — "تم آ
ہو تو آ جاؤ — یہاں کا ماحول بھی خراب ہو رہا ہے۔ تمہ
ماں تم کو لے کر کافی پریشان ہیں۔ ایسے موقع پر تمہیں
تو نہیں لیکن مجھے لگتا ہے تمہیں دیکھ کر شاید تمہاری ما
جائیں —"

"ماں باپو جی کو یہاں بلا لوں؟" اس نے آہستہ
"بلا سکتی ہو۔ لیکن کیا وہ لوگ آئیں گے۔"

اوناش نے اس کی طرف دیکھا — لیکن اس
بڑا ایک سوال ہے۔ تمہارے باپو جی یا ہم تم کہاں کہا

دنگوں اور فسادوں کے خوف سے بھاگتے رہیں گے ... کس جگہ کو تم محفوظ کہہ سکتی ہو۔ اگر آگ آج یہاں لگی ہے تو کل کسی دوسرے مقام پر بھی لگ سکتی ہے۔

"پھر ؟"

"ہم دونوں ہی چلیں گے —"

شہر میں جتنا ہنگامہ تھا، گھر کے ماحول میں اتنی ہی اداسی چھائی تھی۔ پاپا ممی نے خوفزدہ آنکھوں سے ان دونوں کا خیر مقدم تو کیا، لیکن مرگ نینی کو محسوس ہوا، شہر کی ناسازگار فضا سے الگ ایک عجیب طرح کا خوف ان کے دلوں میں بھی پل رہا ہے دو چار روز میں یہ بھی احساس ہوا کہ پاپا اوینا ش کے ڈر سے کوئی بھی ایسی بات کہنے سے ہچک رہے ہیں جس پر وہ بھڑ کے چھتے کی طرح نہ ٹوٹ پڑے۔ ہاں، اس بار رنجن کچھ زیادہ ہی مخالفت پر اتر آیا — اس کی آنکھوں میں پتہ نہیں وہ کیسی دہکتی آگ تھی کہ مرگ نینی اس کا سامنا کرنے سے ڈر رہی تھی۔

اس دن ڈائننگ ٹیبل پر اس خاموشی کا خاتمہ اوینا ش نے ہی کیا —

"شہر کا ماحول اچھا نہیں ہے؟"

"ہاں" پاپا سہم کر بولے۔

"آپ بھی پریشان ہیں" اوینا ش نے چٹکی لی۔

"آپ وِلیسلی (obviously) —"

"آپ کو تو پریشان نہیں ہونا چاہئے۔ آخر آپ ہی کی جماعتیں تو ....."

اچانک اس نے رنجن کے چہرے پر ایک خونخوار تناؤ کو محسوس کیا۔

"مطلب ؟" رنجن نے پلٹ کر اوینا ش کو دیکھا۔

اوینا ش نے پھر زندہ دلی کا مظاہرہ کیا — خوف کے جنم داتا بھی آپ ہیں .... گھبراتے بھی آپ ہیں۔ کیا صرف اس لئے کہ آپ کا گھر بھی جلنے والوں میں ایک ہو سکتا ہے۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

مرگ نینی نے دیکھا۔ پاپا نے کھانے سے ہاتھ روک لیا ہے۔ اور وہ پرانا کرمنل لائر ان کے اندر پھر زندہ ہو گیا ہے۔ ویسی ہی گمبھیر اور نپی تلی آواز —

"تمہیں اپنے آپ کو سیکولر کہلوانے کا شوق ہو گیا ہے۔ کتنے سیکولر ہو تم۔ دنگوں کے دوران اگر تمہاری بیوی مسلمانوں کے بیچ پھنسی ہو تو کیا اس وقت بھی تم اتنے ہی سیکولر رہو گے؟"

مرگ نینی نے دیکھا۔ اوینا ش پاپا کی بات سے کمزور پڑا ہے۔ یا سوال کے جواب میں اتنی دور نکل گیا ہے کہ جلد واپسی ممکن نہیں۔

پھر اس نے دیکھا کہ اب مورچہ رنجن نے سنبھال لیا ہے۔

"بھارتیہ سنسکرتی میں دھرم کی نیو اتنی گہری ہے کہ سیکولرزم صرف دکھاوے جیسا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ آپ دھرم کو شکل بندھن سمجھ کر اس سے کٹنے کی سوچ رہے ہیں۔

اور پاپا نے پھر کہا — "آخر بھارت کو ایک ہندو راشٹر کیوں نہیں ہونا چاہئے۔ یہ مانگ کہاں سے ناجائز ہے؟"

اور پھر اس نے دیکھا، ممی کچھ کہتے کہتے ٹھہر گئی ہیں۔ مرگ نینی کو احساس ہوا۔ پاپا کا جنم ایک نئے انداز میں رنجن کے اندر ہوا ہے۔ وہ ایک ٹک ڈائننگ ٹیبل پر پسری اس بھیانک سناٹگی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جو اچانک اوینا ش کے مذاق سے پیدا ہوئی تھی۔

اوینا ش نے جیسے ہار مان لی۔ بس اتنا کہا — لیکن سیدھے سیدھے کسی دھرم کی مخالفت سے بھی تو کوئی راہ نہیں نکلتی —

مرگ نینی کو احساس ہوا، اوینا ش کا لہجہ پوری طرح ابھر نہیں سکا ہے۔ اور دن کو رات کہنے والی بے معنی جرح

سے کوئی نتیجہ [illegible] الا۔

اسے لگا، وہ ڈائننگ ٹیبل کٹمس میں بندھی نہیں رہ سکتی۔ رشتے صرف خون کے تو نہیں ہوتے۔ آخر عبدل بھائی بھی تو ہیں۔ کیا لگتے ہیں وہ ان کے۔ کیوں اتنی محبت سے جاتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ اویناش کا سر، ماحول کے بوجھ تلے دب جاتا، بچپن سے اندر تھوڑا تھوڑا کر کے جمع ہو رہے زہر کو، ایکدم سے سمیٹ کر مرگ نینی چیخ پڑی۔

"آخر میں کہیں ہوں کہ نہیں پاپا — اگر ہوں تو مجھے اپنی بات کہنے کا پورا حق ہونا چاہیے۔ کل میں نہیں تھی۔ کل کیا، کبھی آج سے پہلے نہیں تھی — اس لئے کہ پیدا ہوئی تو آپ تھے اور آپ کے خیال تھے — ہمارے تو صرف پاؤں تھے۔ آپ جیسے چاہتے— ہمیں چلایا کرتے، ہمیں آپ کی کسی بات کو کاٹنے کا حق نہیں تھا۔ یہ بھی نہیں کہ یہ محدود سوچ آپ اٹھائے کیوں رہے ہیں۔

اس نے ایک نظر سب ہی کی طرف ڈالی پھر تیز تیز بولتی چلی گئی۔

غلط اگر غلط ہے تو اس کے لئے کسی منطق کی ضرورت نہیں۔ اتنا مان لینا کافی ہے کہ یہ غلط ہے۔ اگر ایک مکان جل رہا ہے تو یہ پوچھنا بے معنی ہے کہ یہ کیوں جل رہا ہے، سب سے پہلا کام آگ بجھانا ہے۔ اس لئے آپ کی ساری منطق بے بنیاد ہے — کہ ایسا ہونا چاہیے یا ہندو راشٹریہ ....."

اس نے اویناش کی طرف دیکھا۔ پھر سہمی ہوئی ممی کی طرف، حیرت سے دیکھتے رنجن کی طرف، بگڑا آنکھوں سے جھانکتی پاپا کی طرف — اور پھر بولی۔

"جب دو خیالوں میں زمین و آسمان کا فرق ہو اور یہ احساس بھی ہو کہ انہیں ملانے کی کارروائی بیکار ہے تو...؟

ایسے رشتے ٹھہریں گے تو نہیں نا.... پھر ان رشتوں کو ڈھویا جانا کیا ضروری ہے۔ اس لئے میں ابھی سے یہ رشتہ توڑ رہی ہوں۔

مرگ نینی نے ایک ٹھنڈی سانس اچھالی — گڈ بائے پاپا اینڈ گڈ بائے ایوری باڈی۔

پھر اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر اویناش کی طرف دیکھا اور کہا —

کل آفس نہیں جاؤ گے کیا ؟

اور جواب کا انتظار کئے بغیر آگے بڑھ گئی۔

بقیہ — نیوتا

۶۶ تیلے تیلے ۔ فوراً فوراً

۶۷ بیلا — وقت

۶۸ کنی رہ جانا — چاول کا اس طرح پکا ہوا ہونا کہ اس کا زیادہ حصہ تو گلا ہوا ہو مگر تھوڑا حصہ ایسا ہو جو گلنے سے رہ گیا ہو

۶۹ اُلٹی — قے

۷۰ اُپدّر — ہنگامہ، افراتفری

۷۱ ہیر پھیر — ادھر سے اُدھر

۷۲ کسائی — قصائی۔

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا لازمی)

نئی کتابوں کا تعارف

نام کتاب :- صبائے سنگ
مصنف :- محمد سالم
نوعیت :- شعری مجموعہ
ضخامت :- ۱۴۴ صفحات ، قیمت :- ۳۰ روپے
پتہ :- بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴

"صبائے سنگ" ایک تازہ کار اور خوش گوار شعری مجموعہ ہے۔ جناب محمد سالم ادھر کچھ عرصے علم و ادب اور شعر و سخن کے ممتاز حلقوں میں وزن و وقار کے ساتھ جانے پہچانے جاتے ہیں۔ جن حضرات نے ان کی نگارشات کا مطالعہ کیا ہے وہ یہ جانتے ہیں کہ جناب سالم تخلیقی سطح پر منفرد اور جدت نواز ہیں۔ تنقید میں ان کے شعور کی بالیدگی، مطالعہ کی وسعت اور ذہن کی کشادگی نے انہیں بہتوں سے ممتاز بنا دیا ہے۔

صبائے سنگ کا نام خود بھی جناب سالم کے جدید تخلیقی ذہن کی غماز ہے۔ اس میں شریک تخلیقی عمل یا اس کلیہ کے بارے میں بہت سی دلیلیں اور مثالیں میسر ہوتی ہیں۔

جناب سالم نے شروع میں شاعری کے [illegible] صفحات میں شاعر نے بطور تمہید لکھا ہے ان کی نظریہ سخن پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر تخلیقی آزادہ روی میں بھی ایک سماجی وابستگی کی جھلک دیکھتا ہے۔ ان کا یہ جائزہ حقیقت پر مبنی ہے لیکن اس کے باوجود سماجی فریضہ کی ادائیگی اور وابستگی فنکار کے تخلیقی سفر میں حائل نہیں ہوتی فنکار بحیثیت ایک فرد سماج سے جڑا رہتا ہے لیکن سچا فنکار تخلیقی لمحوں میں کسی روایتی NORM کا تابع نہیں ہوتا، یہ NORMS تحت الشعور کی سطح پر فنکار کے ذہن کی تربیت کرتا ہے۔ جناب سالم کی شاعری اس حقیقت کی آئینہ دار ہے۔ ان کی شاعری میں ایک کھلی کھلی ذہنی فضا کا احساس ہوتا ہے۔ زبان و بیان پر انہیں قدرت حاصل ہے۔ یہ قدرت کسی عالم زبان یا ماہر لسانیات والی قدرت نہیں ہے بلکہ انہوں نے الفاظ کو تخلیقی سطح پر استعمال کیا ہے انہیں لغت کے مفہوم سے ہٹا کر ان میں نئی معنوی جہتیں پیدا کی ہیں۔ لفظوں کے اس غیر رسمی استعمال نے جناب سالم کی شاعری میں ایک خاص انداز کی شگفتگی اور دلنوازی پیدا کر دی ہے۔ لہجہ کی یہ تازگی ان اشعار میں ملاحظہ کیجئے

پھر ہوا شب غم کے در پہ سر پٹکتی ہے
پھول پھول بستر کی نیند اجاڑ رہنے دے

اک جھیل تھی کہ اپنی جگہ سوکھتی رہی
اک طائر طلب تھا کہ پر تولتا رہا

جو ٹوٹی شاخ تمنا تو برگ دل بکھرے
شکستہ اور ہوائیں اداس منظر میں

جناب صام نے نظمیں بھی لکھی ہیں، ان میں بھی وہی دروں بینی، جدت طرازی لہجہ کی لطافت اور احساسات کی شدت و توانائی ہے جو عام طور پر ان کی غزلوں کے مزاج میں شامل ہے۔ ان کی شاعری قاری کو نئی احساسی کیفیات سے ہم کنار کرتی ہے اور ایک ایسی معنویت کا احساس ہوتا ہے جہاں حقائق CONCRETE طور پر نہیں بلکہ ABSTRACT انداز میں اثر انداز ہوتے ہیں "سباے سنگ" جدید شعری سرمائے میں ایک اضافہ ہے



شہرِ خیال

○ عزیزم مسعود منظر ، دعائیں لو

سہیل کا تازہ شمارہ چند روز قبل ملا تھا، شکریہ۔

نمود میں جو سوالات آپ نے اٹھائے ہیں وہ قابل احترام ہیں لیکن سیاسی اور سماجی مسائل کے صحیح جوابات جن لوگوں کے پاس ہوتے ہیں ان کی شنوائی کسی دور میں بروقت نہیں ہوتی ہے۔ تاریخ کی اپنی ایک الگ رو ہوتی ہے جو کبھی آگے کی طرف لے جاتی ہے اور کبھی پیچھے کی طرف اور کبھی برسوں ایک مزاج کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ ہم اسی دور سے گزر رہے ہیں۔ اس وقت مہدی موعود بھی رونما ہو جائیں تو شاید گرفتار کر لئے جائیں گے اور ان کی ضمانت پر رہائی بھی ممکن نہ ہو سکے گی۔

ہاں یہ بات درست ہے کہ ہم اپنی آواز سنتے اور سناتے رہیں۔ مولانا آزاد پر سیمینار کرنا تو ممکن ہے لیکن ان کی باتوں پر عمل کروانا سردست ممکن نہیں، کبھی کبھی تو حالات اتنے مایوس کن ہو جاتے ہیں کہ مجھ جیسے لوگ جو بنیادی طور پر شاعر ہیں اپنی لکھی ہوئی باتیں بھول جاتے ہیں۔ مثلاً چند برس پہلے کا تاثر میں نے کہا تھا کہ جھوٹ ہارے گا۔

مگر یہ دیکھئے اپنا مشاہدہ کیا ہے!

حالانکہ میرا یہ شعر ہے اور محسوس کر کے میں نے لکھا تھا۔ کوئی جو وہ بچ سکا پایا

اپنے صفحوں میں علم ہے، جرأت ہے، وقت ہے
انسانیت کہ، سچ کا مقدر شکست ہے

اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ 'نمود' میں جو باتیں آپ نے لکھی ہیں اسے پڑھ کر تقویت تو ضرور ملتی ہے لیکن کیا ہندو دماغ اور مسلم دماغ فی الحال مستقبل اور ماضی کو اس نگاہ سے دیکھنے پر تیار ہے جس کی طرف آزاد نے واضح الفاظ میں اشارہ کیا تھا۔

'پیام اقبال کا جائزہ' نہایت عالمانہ مضمون ہے۔ ڈاکٹر رستوگی اور بلراج حیرت کے خطوط بھی نہایت اہم سوالات اٹھاتے ہیں۔ باقی مشمولات بھی توجہ کی طالب ہیں۔ نئی کتابوں پر قیصر زماں کا تبصرہ پسند آیا۔

حسن نعیم (بمبئی)

○ محترم جمیل صاحب۔ سلام

سہیل کا تازہ شمارہ ملا۔ شکریہ!

معروفیات کی بنا پر اطمینان سے پڑھ نہیں سکا۔ اور چند دنوں میں بہت دیر تک فارغ ہو جاؤں گا۔

آپ محسوس کر رہے ہوں گے، دیکھ رہے ہوں گے کہ اپنے ذاتی مفاد اور انا کی تسکین کے لئے موجودہ حکمراں ملک اور قوم کو کس طرف لے جا رہے ہیں ان لوگوں نے مکمل سیاسی، اقتصادی اور عالمی بحران (CHAOS) پیدا کر دیا ہے کہ اگر یہ لوگ کرسی پر نہ رہیں تو آنے والے ایسی مصیبتوں میں گھرے رہیں کہ کچھ بن نہ پائے۔ رام جنم بھومی، ریزرویشن، دہشت گردی، مہنگائی، کرپشن (حد سے بڑھتی ہوئی) یہ تمام مسائل اب ہمیں چین سے نہیں رہنے دیں گے۔ یہ ہمارے نئے محافظ تو پرانوں کو بھی مات کر گئے۔ آپ نے وہ کفن چرانے والے کی کہانی تو سنی ہو گی۔ پہلے تو کفن چراتے تھے۔ نئے تو مردے کو غائب کر رہے ہیں۔

اس سلسلے میں نے بھیجی ایک نظم دی ہے [illegible]
جو میں آپ کو بھیج رہا ہوں۔
مسعود منظر کو سلام کہئے گا۔

شردن کمار ورما (امرتسر)

○ برادرم ! اولیب
ایک طویل عرصے کے بعد سہیل کا شمارہ ملا۔ شکریہ۔
کشمیر کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ ذہنی طور پر سخت پریشان ہوں۔
جن لوگوں کے ساتھ جذباتی و خیالاتی رشتے تھے۔ بلکہ خون کے بھی رشتے تھے ان کے ساتھ اب ٹیلی فون سے جڑا ہوا ناطہ ہے۔ تین منٹ کی کال کے دوران دونوں طرف خاموشی کو توڑنے کے لئے بار بار ایک دوسرے سے یہی پوچھنا پڑ رہا ہے۔ اور سب ٹھیک ہے نا۔ باقی وقت خاموشی کے ساتھ نکل جاتا ہے۔ سوال خاموشی۔ جواب خاموشی۔ خیر۔ کیا کریں۔ نہ کچھ لکھ سکتا ہوں۔ نہ پڑھ سکتا ہوں۔ پھر بھی بے چین قلم کو روکنا مشکل ہے۔
RESERVETION پر ایک کہانی "جنم" لکھ چکا ہوں اور وہ آپ کے رسالے میں شائع بھی ہو چکی ہے میں سمجھتا ہوں کوئی بھی چاہے وہ برہمن ہو یا ہریجن۔ ہندو ہو یا مسلم جنم کے آدھار پر کیوں SELFER کرے۔ میرے نقطۂ نگاہ سے یہ سب ڈھکوسلہ ہے۔ دراصل یہ RESERVETION
PROVILEGED CLASS کے لئے ایک چابی ہے۔ جس سے وہ اپنا مفاد حاصل کرتے ہیں۔ غریب ہندو مسلمان، برہمن یا ہریجن سب SUFFER کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ کاش غریبوں کا کوئی سنتا۔ اور یہ محسوس کرتا کہ ملک میں دو ہی CLASS ہیں ایک غریب اور ایک امیر۔ باقی خیریت۔

دیرمیندر پٹواری (جموں)

○ مکرمی، تسلیم
سہیل کا تازہ شمارہ ملا۔ شکریہ
ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کا مضمون "پیغام کا ایک جائزہ" بہت ہی دلچسپی سے پڑھا۔ نہ جانے کیوں پیغام اقبال کی آفاقیت اور عالمگیریت سے انکار کیا جب کہ مشہور مستشرق نکلسن اور عرب مفکر و ادیب عزام اور ماوی علی شعلان وغیرہ اقبال کو عالمگیریت کے اور ان کے حد درجہ مداح و قدردان بھی۔ بہرحال رستوگی کا یہ اپنا ذاتی خیال ہے جس سے ہم لوگوں کا اتفاق کرنا ضروری نہیں۔ کیا رستوگی صاحب نے کبھی یہ سوچا کہ جنہوں نے نیا شوالہ اور ترانۂ ہندوستان جیسی چیزیں لکھیں وہ کیوں اسلام اور مسلمان کی بات کرنے لگے؟ انہیں اقبال کا پیغام صرف ایک مسلم طبقے تک محدود رہ گیا۔ کیا آخر کیا وجہ ہے؟ شاید وجہ یہ ہو کہ گول میز کانفرنس میں جب مہاتما گاندھی اور دیگر ہندوؤں نے اقلیت سے بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا اور شدید کوشش کی کہ یہ کانفرنس کامیاب نہ ہو سکی تو اقبال کے ذہنی و جذبے میں فرق آنا ناگزیر تھا۔ پھر بھی اقبال ایک آفاقی شاعر کی عظمت اس طور پر مسلم ہے۔ رستوگی صاحب کو اقبال لکھنے ہی میں مزا آتا ہے تو ہم کیوں کر خلل انداز ہوں۔
شمارے میں شامل ظفر صدیقی کی غزل نے کاسیا صورت حال کی مکمل طور پر عکاسی کر رہی ہے۔ عصری حسیت آئینہ دار شاعری ظفر صدیقی صاحب کر رہے ہیں۔ خدا کرے اس طرح لکھتے رہیں۔ کوئی تو ہو جو غزلوں میں بہاری بھی جائے۔
دیپندر پٹواری کی افسانوی شخصیت پر منظور کا مضمون بہت پسند آیا۔ میں نے خود بھی پٹواری کو پڑھا ہے

افسانوں نے متاثر کیا ہے۔ مکتوبات کے گوشے میں رستوگی صاحب بھی معلوم ہوئے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں لوگ انہیں فرقہ پرست سمجھ جاتے ہمارے یہاں ہندو اور مسلم ادیب کی کوئی تفریق نہیں برتی جاتی ہے صرف ان کی حوصلہ افزائی کی غرض سے کبھی کبھی یا اس خیال سے کہ ہمارے ہندو بھائیوں کی گراں قدر خدمات کا اعتراف کیا جائے انہیں ہندو ادیب کہہ کر ضرورتاً پکارتے ہیں۔ ورنہ ہمارے طبقے کے ذہن میں کوئی ایسی تشویشناک بات نہیں ہے اور نہ ہی ہم تاریک خیالات کو اپنے ذہن و دماغ میں جگہ دیتے ہیں۔ رام بابو سکسینہ، لالہ سری رام، فراق گورکھپوری، جوش ملسیانی، مالک رام، کالیداس گپتا رضا، گوپی چند نارنگ، گیان چند جین اور ان جیسے دیگر اردو ادبا کی ادبی خدمات کے باوجود کیسے ہم انہیں اپنے سے الگ سمجھ سکتے ہیں؟

مجھے خوشی ہے کہ سہیل تمام تر نزاعی امور میں انصاف پسند واقع ہوا ہے۔ مسئلے کے تمام تر پہلوؤں کی وضاحت کے لئے وہ اپنے صفحات کھلا رکھتا ہے۔ اس مسئلے پر بھی سہیل نئی روشنی ہم لوگوں تک پہنچانے میں کامیاب ہوگا۔ خدا کرے سہیل اب مزید ترقی کرے۔

حقانی القاسمی (علیگڑھ)

○ عزیز گرامی! ہدیہ سلام مسنون!

امید ہے تم اچھے ہوگے۔

میں نے بڑی محنتوں کے بعد ان مگہی لفظوں کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے جو خاص طور پر گیا اور اس کے اطراف و جوانب میں علاقائی طور پر، خاص لب و لہجہ کے ساتھ بولے جاتے ہیں۔ قریب قریب تین چار ہزار الفاظ جمع ہو گئے ہیں۔ ذرا دوسرے کاموں سے فرصت ملے تو ان کو حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دے کر ایک مگہی لغت کی شکل دینے کی کوشش کروں گا۔ یہ کام تو تنہا کرنے کا تھا نہیں، اسے تو مگہی اکادمی کو کرنا چاہئے تھا، لیکن خدائے قادر مطلق جس سے جو بھی کام کروانا چاہتا ہے کروا لیتا ہے، بہرحال، یہ ایک بڑا کام ہے جو ترتیب و تدوین کی منزلوں سے گزر رہا ہے۔ لیکن اس سے بھی بڑا کام ان الفاظ کو استعمال کرکے ادبی روپ میں ڈھالنے کا ہے، صرف الفاظ جمع کرنے سے کیا فائدہ؟ زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ کل وہ صرف علاقائی یا گھریلو طور پر لوگوں کی زبان پر تھے، اور آج وہ کاغذ پر لکھ دیئے گئے، لیکن اگر وہ الفاظ مکتوبی زبان کا روپ اختیار نہیں کرتے تو دیر یا سویر ان کو فنا تو ہونا ہی ہے۔ یوں تو دنیا کی ہر چیز فانی ہے، پھر بھی انسان اپنی محنتوں کا لہو دے دے کر ان کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتا ہی رہتا ہے، اور جہاں تک لفظ و معنی کا تعلق ہے تو انسانوں نے جتنی اس کی خدمت کی ہے، شاید دنیا کی کسی دوسری شئے کو یہ افتخار میسر نہیں! میں نے بھی کچھ مگہی لفظوں کو زندہ رکھنے کی خاطر ان کو ادبی روپ میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے، اسی کوشش کی پہلی کڑی (بشکل افسانہ) تم کو بھیج رہا ہوں۔ جس طرح مسودہ ہے، اسی طرح ہو بہو، صحیح صحیح چھپ جائے تو تمہارے قارئین کو ایک خاص چیز، خاص زبان میں، ایک خاص لب و لہجہ کے ساتھ پڑھنے کو ملے گی۔ شائع ہونے کے بعد، دیکھو، کیا ردعمل ہوتا ہے، ایک ردعمل یہ ہو سکتا ہے کہ میں اردو جیسی مہذب زبان میں مخصوص علاقائی الفاظ ٹھونس کر اس کو گنوار بنانے کا جرم کر رہا ہوں، لیکن یہ اعتراض وہی حضرات کریں گے جو لسانیاتی ارتقائی عمل کا شعور نہیں رکھتے۔ اردو تو شروع ہی سے بلوان بھاشا رہی ہے۔ اس میں محلوں اور شہروں کے ساتھ ساتھ جھونپڑیوں اور دیہاتوں کی بولی کا بھی رنگ نمایاں طور پر شامل ہے۔ اردو ہمیشہ کھلی فضا میں سانس لیتی رہی ہے۔ مختلف قسم کے لسانی دریچوں

سے آنے والی روشنی اور تازہ ہواؤں سے اس کا چہرہ روشن اور شگفتہ ہوتا رہتا ہے۔ خیر چھوڑو، اس لمبی بحث کو، میرا تو خیال ہے کہ اردو کو مالا مال کرنے کے سلسلے میں آج بھی مختلف سطح سے کوشش کرنے کی ضرورت ہے اگر کچھ ایسے ممکنہ الفاظ جو اردو زبان میں بآسانی کھپ سکیں اور اردو زبان میں بگاڑ آنے کے بجائے مزید سنوار اور سجاؤ میں اضافہ ہو تو ان الفاظ کو پہلے کی طرح قبول کر لینا چاہئے۔ اگر میرے مرتب کئے ہوئے لغت کے چند الفاظ بھی اردو نے قبول کر لئے اور ان کا چلن مکتوبی طور پر عام ہو گیا تو سمجھ لوں گا کہ میری محنت، اکارت ہونے سے بچ گئی

قیوم خضر ــــ (پٹنہ)

○ منظر برادران! محبت

"سہیل" برابر ملا کرتا ہے۔ شرمندہ ہوں اب تک میں "سہیل" کے لئے کچھ بھی نہیں لکھ سکا۔ اور آپ لوگ ہیں کہ "سہیل" برابر بھیجا کرتے ہیں۔ یہ محبت نہیں تو اور کیا ہے؟ تازہ شمارے میں ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کا مضمون "پیغام اقبال ایک جائزہ" پڑھا۔ فکر انگیز مضمون ہے کوئی شک نہیں۔ رستوگی صاحب اس عمر میں اور وہ بھی کینسر جیسے مرض کے وہ شکار ہیں اور زندگی کی کوئی امید نہیں ہے، برابر لکھتے پڑھتے ہیں۔ یہ اتنی بڑی بات ہے جس کا اندازہ لگانا ہی دشوار ہے ـــ یہ ہمت، یہ زندہ دلی، یوں تو موت برحق ہے لیکن کتنے ایسے لوگ ہوں گے جو موت سے اس طرح مقابلہ کرنے کی ہمت رکھتے ہیں۔

یوں بھی ان کی علمی ادبی خدمات بھلائی نہیں جا سکتی۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ (کلکتہ)

○ مکرمی جمیل منظر صاحب! تسلیمات

سہیل پابندی سے موصول ہو رہا ہے اس بار بھی نثری

حصہ خوب سے خوب تر ہے۔ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی "پیغام اقبال ایک جائزہ" بھرپور جائزہ ہے ـــ میں کو آپ نے شریک اشاعت کیا جس کے لئے متشکر ہوں۔

میری غزل میں مطلع کے مصرعۂ ثانی میں "بدلے" ہوا "تحریر ہو گیا ہے۔ اصل مطلع یوں ہے۔

اس وقت چراغوں کو لہو ہم نے دیا ہے
جب حد سے سوا زور اندھیروں کا بڑھا ہے

اور مقطع کے مصرعۂ اول میں "تو" چھوٹ جانے کی وجہ خارج از بحر ہو گیا ہے۔

اوپر سے تو لگتا ہے ظفر اب بھی سلامت
اندر سے جو دیکھو تو بہت ٹوٹ چکا ہے

اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔

ظفر صدیقی (کٹک)

○ محترم مسعود منظر صاحب! سلام خلوص!!

مزاج اقدس!!!

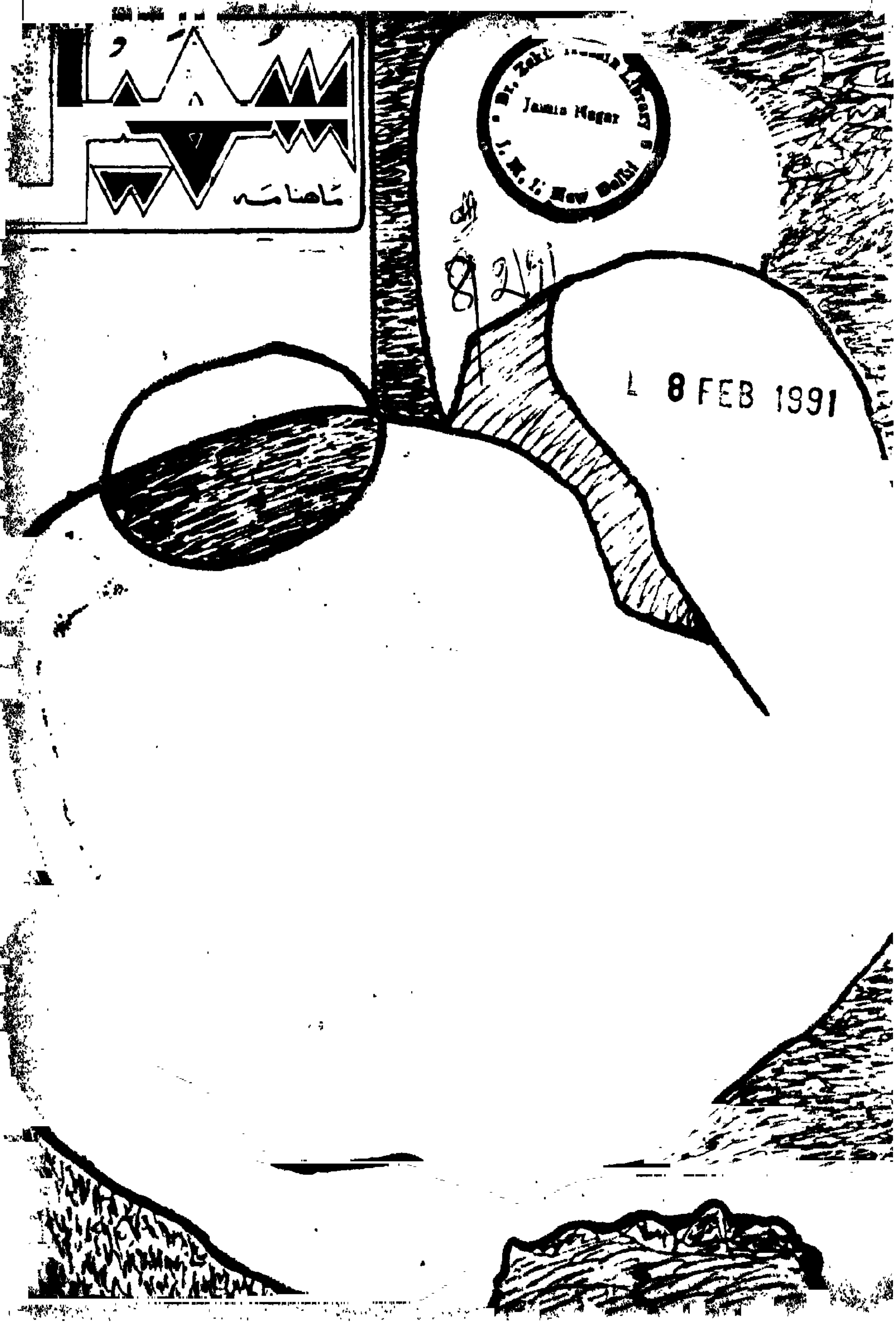
یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ ماہنامہ "سہیل" عرصے سے ادب کی خاموش خدمت انجام دے رہا ہے۔ یقیناً اردو زبان کو آپ جیسی بے لوث شخصیتوں کی اشد ضرورت ہے جو اس بار زمانہ میں بغیر کسی غرض اور صلہ کے یہ کام انجام دے رہے امروز نہیں تو آنے والے کل میں آپ کا کارنامہ تاریخ ضرور دہرائے

محمد مجیب احمد (حیدر آباد)

○ محب گرامی! ہدیہ خلوص و احترام

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے! سہیل کا تازہ شمارہ پیوست ہوا۔ یہ حقیقت ہے ماہنامہ سہیل نصف صدی سے ایک کارنامہ انجام دے رہا ہے۔ واقعی یہ جریدہ تمام جریدوں سے ایک امتیازی حیثیت کا مصداق ہے۔

اظہر نیّر (بھاگلپور)


ماهنامہ

بانی :۔ حافظ محمد عبدالرحمٰن بسمل سنہاروی — بیادگار :۔ زین العابدین احمر و ادریس سنہاروی

سہیل گیا

ماہنامہ

فہرست

نمود ۵
کرشن مراری ایک تعارف ۔ ۷
کرشن مراری بحیثیت شاعر ۔ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی ۸
کرشن مراری ایک منفرد تخلیقی آواز ۔ ڈاکٹر علیم اللہ حالی ۹
غزلیں ۔ کرشن مراری ۱۲
کرشن چند یادوں ...... قیصر عثمانی ۱۳
محافظ ۔ خدا حافظ ۔ شرون کمار ورما ۱۹
پہلا قدم، قادر مطلق کی شناخت ۔ ڈاکٹر محمد علی اثر ۱۹
جاپانی نظمیں ۔ مترجم :۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی ۲۰
غزلیں :۔ حسن نعیم، فضا ابن فیضی ۲۱
غزلیں :۔ حسن نجمی سکندرپوری، عبدالمتین نیاز ۲۲
غزلیں :۔ وسیم مینائی، یعقوب یاور، گوہر جمالی ۲۳
غزلیں :۔ اختر جہاں پوری، مدہوش بلگرامی ۲۴
غزلیں :۔ عبدالمتین جامی، اعجاز طالب، اظہر نیر ۲۵
خوشی کا ساون ۔ محمد مجیب احمد ۲۶
مفاد پرست ۔ نسیم احمد نسیم ۲۹
وعدہ ۔ سہیل جامعی ۳۲
نئی کتابوں کا تعارف ۔ ڈاکٹر علیم اللہ حالی، تاج پیامی ۳۴
شہر خیال ۳۷

مجلس مشاورت

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
ڈاکٹر قمر رئیس
اصغر علی انجینیئر
قیصر عثمانی
شاہد احمد شعیب
ڈاکٹر محمد مثنیٰ
ڈاکٹر علیم اللہ حالی

نائب ایڈیٹر :۔ مسعود منظر
ایڈیٹر :۔ جمیل منظر
معاونین :۔ شکیل احمد جمالی
عبدالقیوم ابدالی

• کتابت :۔ سید عبدالاحد گیاوی •

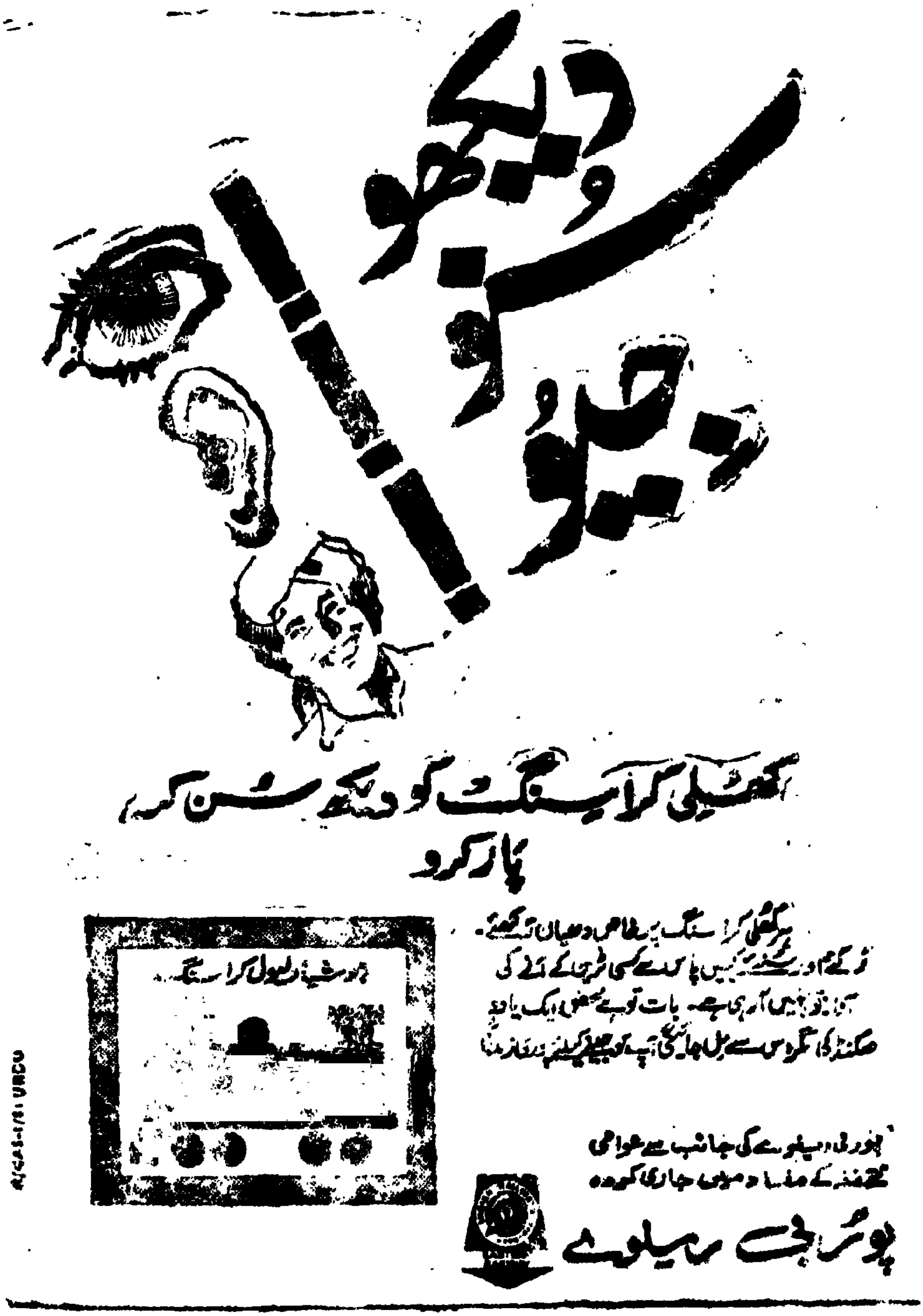
شمارہ ۱۰ جلد ۵

بدل اشتراک

• فی شمارہ ۳/- روپے
• زر سالانہ ۳۶/- روپے
• لائف ممبری ۵۰۱/- روپے

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ سہیل
ڈیوڈ سائیڈ روڈ، گیا ۔ ۸۲۳۰۰۱
فون :۔ 21573


دیکھو
سنو
جیو
کھلی کراسنگ کو دیکھ سن کر
پار کرو
پوربی ریلوے

نمود

نیا سیاسی منظر نامہ اور ہندوستانی عوام

ہندوستان کے سیاسی افق پر جو تغیرات ادھر چند ماہ میں ہوئے ہیں اور جو اب بھی ہو رہے ہیں وہ بڑے مضحکہ خیز نظر آتے ہیں، سرکار بنتی ہے، لوگ ٹوٹتے ہیں۔ مندر، مسجد اور منڈل بہانے بنائے جاتے ہیں، نئی قیادت بیساکھی کے سہارے لنگڑا رہی ہے ــــ اور کون جانے کب یہ بیساکھی بھی ٹوٹ جائے۔ پھر نیا انتخاب پھر اسی طرح قیادت کے پرانے مہرے عوام کی بساط پر ادھر سے ادھر ناچتے ہوئے دکھائی دیں گے۔

اتنی بات طے ہے کہ ہندوستان ادھر چند برسوں سے زبردست سیاسی عدم استحکام کے دور سے گذر رہا ہے۔ یہ سب محض اس لئے ہو رہا ہے کہ کئی سیاسی جماعتیں اپنے عوامی اور سماجی نصب العین کے بغیر محض اقتدار کی خاطر انتخابی دنگل میں اتر آتی ہیں اور بعض نہایت غیر اہم اور چھوٹے چھوٹے نکتوں کو سامنے رکھ کر عوام کو گمراہ کرتی ہیں اور ان کے قیمتی ووٹوں کو بے اثر کر دیتی ہیں۔ لیکن شاید اب یہ کھیل زیادہ دنوں تک نہیں چل سکتا، اب عوام یہ سمجھ چکے ہیں کہ مضبوط اقتصادی ڈھانچے اور منصفانہ سماجی نظام کے خاکے ہی ان کے مسائل حل کر سکتے ہیں، جذباتی امور پانی کے بلبلے ہوتے ہیں۔ اب یہ بلبلے ٹوٹ رہے ہیں۔ اور آئندہ انتخاب بلاشبہ نظریاتی، اقتصادی اور سماجی نظام اور خیالات کو مرکز مان کر لڑا جا سکتا ہے ــــــ اور وہ جماعتیں جو ان امور میں کھوکھلی ہیں عوام کے ذریعہ رد کر دی جائیں گی۔

(ادا—۴۷)

اردو شاعری میں
ایک منفرد تخلیقی آواز



جناب کرشن مُراری

• ایک مختصر تعارف •

تعارف

نثار احمد رشتوگی

کرشن مراری بہ حیثیت شاعر

"آزاد کے بعد دلّی میں اردو غزل" مولفہ ڈاکٹر عنوان چشتی، جس کو اردو اکادمی دہلی نے شائع کیا ہے میں متعدد ایسے شعراء جن کا کلام شامل کیا جا سکتا تھا نظرانداز کئے گئے ہیں۔ مزید براں، ڈاکٹر موصوف کا سپرد قلم کیا ہوا مقدمہ بھی ادبیاتی ژرف نگاہی کا ثبوت فراہم نہیں کرتا۔ نہ جانے کیوں؟ یہ پیش نظر نہیں رکھا گیا کہ جس بنگال میں نشاۃ الثانیہ کا آغاز ہوا اس میں بہار اڑیسہ اور آسام بھی شامل تھے۔ بہار کی اردو شاعری پر بھی اس کے واضح اثرات مرتب ہوئے جن کا جائزہ کسی اور مضمون ہی میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ بنگال یعنی اس وقت کے بنگال نے نشاۃ الثانیہ کے اثرات مغربی ہندوستان یعنی پنجاب پر بھی مرتب ہوئے۔ غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ وغیرہ کے بعد اردو کا مرکز لاہور ہو گیا۔ حالیؔ، آزادؔ وغیرہ نے وہیں رہ کر وہ کام انجام دیا جس کی اہمیت و افادیت آج تک تسلیم کی جاتی ہے۔

تقسیم ہند نے پنجاب، صوبہ سرحد، بلوچستان وغیرہ کے ہندوؤں کو ہندوستان میں پھینک دیا۔ مگر اس المیہ کا اثر اردو شاعری پر انجابیت صالح و صحت مند ثابت ہوا۔ پنجابی اصحاب قلم و بیان نے لکھنؤ اور دہلی کے دبستان ہائے اردو کے احتلاو اطراف زدہ کر دیا اور ایک نیا دبستان معرض وجود میں آگیا۔ پنجابی حضرات کی اردو شاعری نے CATALYST (تیز کر دینے والا کیمیائی مرکب) فراہم کیا۔ آج کی اردو شاعری ہندوستانی شاعری ہے جس کا طلوع دہلی ہی سے ہوا۔ کیونکہ آزادی کے بعد دہلی میں ہر اطراف و جوانب سے آئے فنکاروں کی تعداد روز بروز بڑھتی ہی چلی جاتی ہے اور ان فنکاروں میں باہمی ارتباط و تعلقات نے جملہ پر واضح اثرات مرتب کئے جن کا جائزہ ہندی، بنگالی، آسامی، گجراتی کے ناقدوں نے لیا مگر اردو میں روایت دانشوری کمزور اور دانشوری انجابیت نا غیر ہونے کی وجہ سے نئے گرد و پیش نیز نئے ابھرتے آفاق کا افقی و عمودی جائزہ لیا ہی نہیں گیا۔

جناب کرشن مراری جو انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ میں ڈپٹی کمشنر کے عہدہ پر پہنچ کر ۱۰ برس قبل ریٹائر ہوئے فنون لطیفہ سے دلچسپی رکھتے ہیں اور خاصے اہم ہندوستانی کے اردو شاعر ہیں۔ ابھی تک ان کی تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "ساز رگ جاں"، "شعلہ احساس" اور "رنگ ترنگ"۔ ان کی شاعری کے اوصاف میں ساز رگ جاں، شعلہ احساس، اور رنگ ترنگ کی صاف نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ لفظیات اردو اور ہندی کا سنگم نظر آتا ہے میں یکجا سنگم بہترین ترنم اور دل موہ لینے والے سنگیت میں سمویا ہوا ہے۔

پروفیسر علیم اللہ حالی

کرشن مراری — ایک منفرد تخلیقی آواز

اُردو شاعری کی اتنی جہتیں، قسمیں، اور تہیں ہیں کہ ان تمام گوشوں تک نظر پہنچانا اور ان کا جائزہ لینا ممکن نہیں۔ بہت سے دلکش گوشے ہماری نظروں سے اس لئے اوجھل رہ جاتے ہیں کہ ہماری نگاہیں اردو کی بیسیوں عظیم [illegible] گوشوں کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔ کرشن مراری کی شعری خدمات کا جائزہ بھی میں نہیں لے سکتا تھا۔ اگر جناب مسعود منظر ایڈوکیٹ مدیر ماہنامہ "سہیل" گیا مجھے اس کی طرف متوجہ نہ کرتے۔ میں ان کا ممنون ہوں کہ ان کی وجہ سے مجھے اس خوشگوار فریضے کی انجام دہی کا موقع ملا۔ میں نے ان کی پیشکش کو قبول کرتے ہوئے کرشن مراری کی تخلیقات کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور یہ اندازہ ہوا کہ ؎

ہر بیشہ گمان مبر کہ خالیست
شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

مجھے یہ محسوس ہوا کہ کرشن مراری نے اپنی شاعری کے ذریعہ اردو کی شعری اقدار و روایات میں موسیقی اور شاعری کو کچھ اور بلکہ بہت قریب کرنے کی کوشش کی ہے۔ کرشن مراری کی شاعری کے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجے تک پہونچا ہوں کہ انہوں نے روایت اب و لہجہ سے بالکل ہٹ کر اپنے مخصوص تخلیقی اسلوب کے ساتھ اردو شاعری کو نئے تیور، نئے آہنگ اور نئی فضا سے متعارف کیا ہے۔

کرشن مراری کے دو مجموعہ ہائے کلام "ساز رگ جاں" اور "رنگ ترنگ" میرے زیر مطالعہ رہے ہیں۔ ان مجموعوں میں یوسف حسین خاں، نیر آسی، رام کرشن مضطر، گوپال متل، کرشن موہن اور پریم گوپال متل نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے کرشن مراری کی شاعری کے خدوخال واضح ہوتے ہیں۔ یوسف حسین خاں نے ان کے کلام میں ان مخصوص اخلاقی اقدار کی نشاندہی کی ہے جن کے طفیل کرشن مراری کو جذبہ و تخیل کے متوازن اظہار و انجذاب کا موقع ہاتھ آیا ہے۔ انہوں نے شاعری کی اس قدرت و صلاحیت کا تفصیلی اظہار کیا ہے۔ جہاں ہندی الفاظ کے مناسب استعمال سے کرشن مراری کی شاعری میں زبان و بیان اور ہیئت کا نیا تجربہ سامنے آتا ہے۔

رام کرشن مضطر نے کرشن مراری کی شاعری میں موسیقیت کو مرکزی نقطہ مان کر ان کی تخلیقی مزاج کی امتیازی خصوصیات بیان

کی ہیں۔ انہوں نے کرشن مراری کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ

" ان کے یہاں گھن گرج، شور و غوغا، تندی و ترشی اور زلزلہ خیزی نہیں ہے۔ ایک رچا ہوا، سنورا ہوا، متوازن سوچ میں ڈوبا ہوا گمبھیر انداز ہے۔ جو ادھ کھلی کلیوں، پھولوں کی کچلی شاخوں اور ندی کی دھیمی لہروں کے مانند دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اور ایک اور مستقل تاثر پیدا کرتا ہے۔"

نیز آتمی ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ " اردو کے مقبول عام محاوروں اور ہندی کے مدھر تالوں کے سنگم نے ان کے کلام کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔"

گوپال متل نے ہمیں اس نتیجے تک پہونچایا ہے کہ

" ان کی شاعری کی معنوی فضا جن عناصر سے وجود میں آئی ہے انہیں ہم جذبے کی سادگی، احساس کی صداقت اور فکر کے البیلے پن کا نام دے سکتے ہیں۔"

کرشن موہن نے کرشن مراری کے کلام میں لسیاتی خصوصیت کی نشاندہی کی ہے اور پھر اس کے ذریعہ شاعر کی شخصیت تک پہونچنے کی کوشش کی ہے وہ ایک جگہ یہ لکھتے ہیں کہ اپنے لسیاتی اشعار میں شاعر نے ان کیفیات کی بھی عکاسی کی ہے جنہیں شاید اس کا شرمیلا پن اور رکھ رکھاؤ روزمرہ کی بات چیت میں بیان نہ کرنے دیتا۔"

ان تمام آرا سے کرشن مراری کی شاعری کے متعدد پہلو روشن ہو جاتے ہیں لیکن جس طرح حسن کی ہزاروں ادائیں ہر صاحب دل اور صاحب نظر کو اپنے اپنے طور پر متاثر کرتی ہیں اسی طرح اچھی شاعری کا تاثر چند خصوصیات تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا مطالعہ کرنے والے سارے لوگ، کچھ نئی خصوصیات سے متاثر ہوتے ہیں اور اس ہر اپنے جائزے میں ہر بار شاعری کی تفہیم کے لئے نئے اشارہ نما بناتے جاتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کرشن مراری نے الفاظ سے بانسری کا کام لیا ہے اور اس خوبی کے ساتھ کہ وہ ایک طرف ہنسنے

نے پر گذرنے والی واردات بھی بیان کرتے ہیں، اور دوسری طرف لب نے نوازی کی جلوہ فرمائیوں اور اس کی ہنرمندیوں کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ یعنی جہاں کرشن مراری الفاظ کو بانسری بنا کر خشک اور بظاہر بے جان الفاظ کی چھپی ہوئی غنائیت کو ظاہر کرتے ہیں وہیں الفاظ کی معنویت سے نئے موضوعات مضامین کی جلوہ گری بھی کرتے ہیں۔ یہ بات بہت حد تک درست ہے کہ شاعری کا کمال یہ ہے کہ وہ موسیقی ہو جائے لیکن اس سے بڑھ کر اس کا کمال یہ ہے کہ موسیقیت کی اس -NESS کے باوجود یہاں مافی الضمیر کی ادائیگی یا موضوع اور تخیل کی SUBSTANTIAL پیشکش بھی ہونی چاہئے یہ بات ہمیں کرشن مراری کی شاعری میں ان کے امتیازی تخلیقی طور پر صاف دکھائی دیتی ہے۔ غنائیت کے مخصوص فنکارانہ اور شاعرانہ استعمال نے کرشن مراری کے کلام میں معنوی امکانات بھی پیدا کر دیئے ہیں۔ دراصل شعری معنویت الفاظ و بیان کے مخصوص نظام سے متعین ہوتی ہے۔ کرشن مراری نے عام الفاظ کو جامد اور متعین، معنوی حدود سے آگے نکال کر ان میں نئی تخلیقی توانائی داخل کرنے کی کوشش کی ہے اور وجہ ہے کہ ان کے یہاں موضوعات کا نیاپن بھی دکھائی دیتا۔

کرشن مراری نے اپنی شاعری کے ذریعہ اکثر و بیشتر غیر متوقع طور پر نئی معنوی فضا پیدا کر دی ہے الفاظ کو لطیف تر منزلوں میں لے جا کر اور لفظ و رنگ کا ایک نیا جادو جگا کر انہوں نے ان الفاظ میں طباعی اور تخلیقیت کا ایک خودکار نظام پیدا کر دیا ہے۔ اچھی شاعری میں وہ خوبی ہونی چاہئے جسے FNCE ... IN NON SENCE کہا گیا ہے۔ اور یہ بات کرشن مراری کی شاعری پر بہت حد تک منطبق ہوتی ہے۔ وہ اکثر و بیشتر الفاظ کے غیر رسمی اظہار سے خیالات کی ترسیل کرتے ہیں۔ ان موقعوں پر اکثر و بیشتر کرشن مراری کا رویہ غیر روایتی اور جدت

ـش ہوجاتا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار اس دعوے کی دلیل

کھوئے کھوئے منظر کی
صورت تھی پہچانی سی
موڑ کو کاٹ کر جب میں آگے بڑھا
حادثہ اک مجھے دیکھتا رہ گیا
پھر وہی منظر بہ منظر ایک اندھی روشنی
دل میں پھر اٹھتا ہوا سا ایک طوفان تھی
اک روانی سی روانی منجمد ہوتی گئی
جستجو بھی اب طبیعت پر ہوئی بار گراں
سرد رتوں کے سائے بھی
ایک لاج سے ڈرتے ہیں
آشنا دیر و حرم سے جو نہیں مطلق کبھی
راستہ اک راستوں میں سے نکلتا جائیے

ـا اشعار سے یہ بات ظاہر و ثابت ہوتی ہے کہ کرشن مراری ـلنے اظہار کے لئے جہاں روائتی الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔ ـا ان سے ایک نئی تخلیقی فضا تیار کرلی ہے۔ خیال عام طور ـاردو کے یہاں الفاظ کے کرشمہ ساز استعمال سے عام روز ـہ آتا ہے، اور یہ ایک ایسی (امتیازی) خصوصیت ہے جس میں کرشن ـرادی کی حصہ داری کرنے والے بہت کم لوگ ملیں گے

کرشن مراری کی شاعری چونکہ اردو کے عام شعری [illegible] ـہ شناس [illegible] ہے اس لئے شروع شروع میں قاری کو اس کے [illegible] ـت ایک اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے [illegible] ـرنیہ اور نئی شعری [illegible] آشنا ہوتا ہے [illegible] منزل ـاری اس لہجے سے مانوس ہوجاتا ہے۔

کرشن مراری نے کسی مشہور [illegible] شاعر کے لب و لہجہ [illegible] [illegible]

سے بالکل الگ ایک نئی دنیائے سخن کی آفرینش کے لئے ا تخلیقی عمل میں نہایت سنجیدگی سے منہمک رہے ہیں اور اسی کا فیض ہے کہ اردو کے نئے شعری افق پر وہ سب سے الگ لیکن خاصے روشن اور تابناک ستارے کے مانند درخشاں ہیں۔

غزل ۔۔ کرشن مراری

اک فضا شوخ سی گنگنانے لگی
من کی بے کل سی کلیاں کھلانے لگی
ایک عالم جنوں خیز مہکا گیا
اک گھٹا سوچ کی آج چھانے لگی
بھاگتی منزلیں سوچتے راستے
ایک ان تھک تھکن راس آنے لگی
لاکھ رنگوں کی اک دلربا سی مہک
شوخ مدہوش نغمے سنانے لگی
راستے زندگی کے مہکنے لگے
آنچلوں کی پون بھی ہمانے لگی
شوق [illegible] کی بہتی ہوئی راگنی
دودھیا چاندنی میں نہانے لگی
اک ترے نور سے ہے منور فضا
اک تری موہنی دل لبھانے لگی
ساعتوں کی حسیں چھپی روشنی
نت نیا شوخ جادو جگانے لگی
پھر کبھی یاد کی حد بھری کالی گھٹا
آہٹوں ہی سے دل کو لگانے لگی
شوخ پلکوں پہ رکتی ہوئی اک نمی
کچھ انوکھے تعلق نبھانے لگی
رخ بدلتی ہوئی بے رخی آخرش
سامنے بیٹھ کر مسکرانے لگی

اک چھبن دل لبھاتی رہی رات بھر
گنگناتی رہی تشنگی رات بھر
ساغرِ آرزو سے چھلکتی رہی
آتشیں موتیوں کی نمی رات بھر
آگہی آگہی سے الجھتی رہی
گنگناتی رہی گمرہی رات بھر
دل دھڑکتا رہا نیم خوابی رہی
ایک لذت ترستی رہی رات بھر
قربتوں کا نشیلا سا موسم رہا
رس بہاتی رہی دلبری رات بھر
آس کا دلربا شوخ عالم رہا
چاہتوں کی رہی نغمگی رات بھر
آشنا سا تکلف رہا درمیاں
اک عجب سی رہی دل لگی رات بھر
سوچ کی آنچ ہی میں پگھلتی رہی
ذہن کی شوخ آوارگی رات بھر
دوریاں قربتوں کی رہی ناچتی
ایک بے چین بے چارگی رات بھر
جھلملاتی رہی موتیوں کی نمی
بات کچھ روشنی کی رہی رات بھر
گنگناتی رہی اک تغزل بنا
حسن کی شبنمی تازگی رات بھر
شبنمی شبنمی نیم خوابی لئے
جھلملاتی رہی چاندنی رات بھر

اک جواں سا رنگ ہے تشنہ لبی کا
شوخ نقطے پر سمٹتی آگہی کا
جائزہ ہے قربتوں کی تشنگی کا
مخملی مخملی شوخ پلکوں کی نمی کا
نکھرا نکھرا بانکپن ہے دلکشی کا
لہلہاتی سی چمن کی تازگی کا
مطمئن ہے بھولی بھالی ساعتوں سے
ایک لمحہ خوبصورت آگہی کا
موم کر دیتا تھا پتھر کے جگر کو
تھا عجب انداز سرد مہری کا
آ گئی ہے منزلوں تک اب تھکن بھی
ایک جلوہ ہے فریب آگہی کا
اک نیا گلزار کھلتا جا رہا ہے
ساعتوں کی چمپئی سی روشنی کا
غنچے غنچے کو تبسم بانٹتا ہے
دل نشیں انداز اس کی دلبری کا
لمحہ لمحہ اک عجب بے گانگی ہے
رُخ بدلتا جا رہا ہے بے رخی کا
سہمی سہمی روشنی ہے ارتقا کی
ذائقہ ہے پھر کسی حرف نہی کا

قیصر عثمانی

کرشن چندر ۔ یادوں کے آئینہ میں

تقسیم ہند سے پہلے اردو کے رسائل و جرائد کا نہایت دار دور تھا۔ اس زمانے میں معارف، جامعہ، اردو، سائنس مگی، زمانہ، ندیم، سہیل، سب رس اور نگار کے علاوہ دہلی اقی اور لاہور کے ہمایوں، ادبی دنیا، شاہکار، رومان، رنیرنگ خیال اور ادب لطیف کی اشاعت سے دنیائے اردو طرف بہار ہی بہار تھی۔ ادب لطیف مرزا ادیب کی ادارت ری باقاعدگی کے ساتھ نکل رہا تھا اور اس خوبصورت میں ملک کے چوٹی کے شعرا و ادیب کی نگارشات چھپا کرتی ۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ ادب لطیف میں کبھی کبھار میرے زی منظومات کے تراجم بھی شائع ہوا کرتے تھے۔ ایک س رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ "بچپن" کے عنوان یک افسانہ نظر آیا جس کے مصنف تھے کرشن چندر ایم اے ے کے لئے لیا تھا لیکن جب میں نے افسانہ شروع سے آخر ڑھ لیا تو ایسا محسوس ہوا جیسے آسمان ادب پر ایک ایسا ستارہ طلوع ہوا ہے جس کی چمک دمک میں ایک خاص تی۔ "بچپن" کے بعد اپنے کالج کے دنوں میں کرشن چندر ے کی جتنی بھی کہانیاں پڑھیں ان میں کشمیر کے حسن و جمال کی ایسی تصویر کشی ہوتی تھی کہ میں اس میں کھو کر رہ جاتا تھا۔ شاید قارئین کی اس کیفیت کو ظاہر کرنے کے لئے ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے اپنے ایک گراں قدر مضمون میں تحریر کیا ہے۔

"کرشن چندر کے تازہ ناولٹ "میری یادوں کے چنار" نے پہلی مرتبہ مجھے ان کے باطن کی سیر کرنے کا اور ان کے قلم اور علم کے "نیستاں" کا سراغ دیا ہے۔ یہ ان کا بے فکرا خوش باش اور حسین فطرت کی گود کا پالا بچپن اور لڑکپن ہے جو سینے میں [illegible] رکھتا ہے۔ وہ بار بار ان کہانیوں میں کشمیر کا رخ کرتے ہیں۔ چناروں اور لالہ زاروں [illegible] ہیں۔ گل مہر کی ڈالیاں ہلاتے ہیں اور آبشاروں کے گیتوں میں کھو جاتے ہیں۔ حقیقت پسندوں نے لٹر گروہ نے ہر بار کرشن چندر کی اس رومانیت پر لے دے کی ہے۔ اور انہیں ملزم گردانا ہے کہ پڑھنے والوں کو سبز باغ دکھا کر اغوا کر لیتے ہیں۔"

ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے جس اغوا کی طرف اشارہ کیا ہے اس کا شکار میں بھی ہوتا رہا ہوں۔ یہ واقعہ ہے کہ ان

کہانیوں کو پڑھتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں خود کشمیر کی دلفریب وادیوں میں گھوم رہا ہوں۔ انہیں دنوں میرے دل میں یہ تمنا گھر کر چکی تھی کہ جنت نظیر کشمیر کو ایک دن میں خود اپنی آنکھوں سے بھی دیکھنے کی مسرت حاصل کر سکوں اور میری یہ دیرینہ تمنا اس وقت پوری ہوگئی جب فلم ساز دیوندر گوئل کی فلم "دس لاکھ" کی آوٹ ڈور شوٹنگ کے سلسلے میں مجھے ۱۹۶۶ء میں بطور معاون ہدایت کار کشمیر جانا پڑا اور وہاں کے موسم رہا نظاروں نے ایسا متاثر کیا کہ کشمیر پر بے ساختہ ایک نظم ہوگئی پھر "دس لاکھ" کے بعد "ایک پھول دو مالی" کی شوٹنگ کے دوران مجھے بار ہا سرینگر گلمرگ، پہلگام، کنگن کھلین مرگ، بارہ مولہ، یس مرگ، سون مرگ اور کئی دوسرے حسین مقامات کے قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا لیکن یہ واقعہ وہاں کسی نسوانی حسن نے مجھے کچھ زیادہ متاثر نہیں کیا۔ میرے خیال میں شاید اس کی وجہ کشمیری دوشیزہ کے گل رنگ چہرے پر رکھی ہوئی پہاڑ جیسی ناک ہو۔ ایک دن میں نے اپنے دوست وید راہی سے کشمیریوں کی اس مخصوص ناک کا ذکر کیا تو ایک بڑی دلچسپ بات کا انکشاف ہوا۔ انہوں نے بتایا کہ ایک کشمیری شاعر نے اپنی محبوبہ کی ناک کو ایک لمبی چھری سے تشبیہ دی ہے جو دل سے جگر تک کاٹتی چلی گئی اور اس طرح بے شاعر کا کام تمام ہوگیا۔

بہر کیف میں شروع سے کرشن چندر کی دلفریب افسانہ نگاری کا قائل رہا ہوں چنانچہ ۱۹۶۲ء میں جب میں گیا سے شائع ہونے والے ادبی ماہنامہ "سہیل" کا ایڈیٹر تھا تو میں نے اس کے "افسانہ نمبر" کے لئے اپنے محبوب افسانہ نگار کرشن چندر کو بھی دعوت نگارش دی تھی لیکن انہوں نے افسانہ بھیجنا تو درکنار میرے خط کا جواب تک نہیں دیا۔ اس کے باوجود میں انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا متمنی تھا۔ لیکن کہاں گیا اور کہاں لاہور۔ اس کا موقع ہی کہاں تھا۔

۱۹۴۲ء میں گیا کو خیر باد کہہ کر میں کلکتہ جا پہنچا تھا اور فضلی برادرز لمیٹیڈ کے پبلسٹی آفیسر کے فرائض انجام دینے لگا تھا۔ پھر جب یہ باوقار فلمی ادارہ کلکتہ سے بمبئی منتقل ہوا تو میں بھی اس کے ساتھ بمبئی میں تھا جبکہ کرشن چندر فلم ساز ڈبلو۔ زیڈ۔ احمد کی دعوت پر آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت چھوڑ کر پونا کے شالیمار پکچرز سے وابستہ ہو چکے تھے۔ جہاں جوش ملیح آبادی، اختر الایمان، راما نند ساگر، بھرت ویاس اور شہزادہ آیاز بھی موجود تھے۔ راما نند ساگر پبلسٹی کے کام پر مامور تھے اور شہزادہ آیاز شالیمار پکچرز کے بمبئی دفتر کے جنرل منیجر تھے۔ کرشن چندر فلم "من کی جیت" کے مکالمہ نگار تھے اور جوش ملیح آبادی اس کے نغمہ نگار "مورے جوبنا دیکھو ابھار پاپی" اور "دنیا یہ دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی" انہیں دنوں کی پیداوار ہیں۔ "من کی جیت" میں نینا ہیروئن تھی اور شیام ہیرو۔

کرشن چندر پھر بمبئی آگئے اور اپنی پہلی فلم "سرائے کے باہر" کے ہدایت کار بن گئے۔ اس کے بعد ان کی دوسری فلم "راکھ" لیکن کرشن چندر اس میدان کے کھلاڑی ثابت نہیں ہو سکے۔

میں چاہتا تو اس زمانہ میں کرشن چندر سے مل کر بڑی آسانی سے اپنی دیرینہ آرزو پوری کر سکتا تھا لیکن میں ان سے نہ مل سکا۔ شاید یہ کوتاہی میری فطری کم آمیزی کا نتیجہ ہو البتہ انہیں دنوں "مہالکشمی کا پل" اور "ان داتا" پڑھنے کے بعد میرے دل میں ان کی عزت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ "مہالکشمی کا پل" کرشن چندر کے سیاسی افسانوں کے زمرے میں آتا ہے۔ اس افسانے میں کرشن چندر نے پل سے لٹکی ہوئی ایک ایک ساری کے ذریعہ ان کچلے ہوئے انسانوں کے حالات زندگی کو اپنے

...پذیر اسٹائل میں پیش کیا ہے جو دنیا والوں کی ہمدردیوں ...مستحق ہیں۔ افسانے کے آخر میں افسانہ نگار پوچھتا ہے۔

"آپ اس پل کے دائیں بائیں دونوں طرف
دیکھئے اور پھر اپنے آپ سے پوچھئے کہ آپ
کس طرف جانا چاہتے ہیں۔ دائیں طرف
یا بائیں طرف ؟"

...ن داتا" جسے ان کی حقیقت پسندانہ افسانوں میں بڑی ...ملیت حاصل ہے انسان دوستی کی بہترین مثال پیش ہے۔

"میں سیاست داں نہیں ہوں۔ ستار بجانے
والا ہوں۔ حاکم نہیں ہوں۔ حکم بجانے والا ہوں
لیکن شاید نادار مغنی کو بھی یہ پوچھنے کا حق
ہے کہ اس نئی دنیا کی تعمیر میں ان لاکھوں
کروڑوں ننگے بھوکے آدمیوں کا بھی ہاتھ ہوگا
جو اس دنیا میں بستے ہیں۔ یہ سوال اس
لئے کرتا ہوں کہ میں بھی ان عظیم بڑے رہ
نماؤں کی دنیا میں رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے
بھی فسطائیت۔ جنگ اور ظلم سے نفرت ہے
اور گو میں سیاست داں نہیں ہوں لیکن
مغنی ہو کر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اداس
نغمے سے اداسی ہی پیدا ہوتی ہے۔ جو نغمہ
خود اداس ہے۔ دوسروں کو بھی غلام
بنا دیتا ہے۔ دنیا کا ہر چھٹا آدمی ہندوستانی
ہے۔ یہ غیر ممکن ہے کہ باقی پانچ آدمی کرب
کی اس زنجیر کو محسوس نہ کرتے ہوں جو ان
کی روحوں کو چیر کر نکل رہا ہے"۔

...فانے شاید اسی قسم کے افسانوں سے متاثر ہوں خیال ظاہر کیا ہے

"کرشن چندر نے افسانے کی صنف کو محض قصہ گوئی کے لئے اختیار نہیں کیا بلکہ اس کا سہارا لے کر اپنی گہری سوچ کے نتائج کو بھی ہم تک پہنچایا ہے اور اس بغاوت کی نمائندگی بھی کی ہے جو اس نے اپنے زمانے کی خارجی سطح کے نیچے ہوتے ہوئے محسوس کی تھی"۔

اس حقیقت کے باوجود کہ کرشن چندر نے اپنے دوسرے دور میں بڑی حد تک رومانیت سے چھٹکارا پا لیا تھا میرا یہ خیال ہے کہ وہ بنیادی طور پر حسن و عشق کے ہی تخلیق کار تھے اور سچ تو یہ ہے کہ وہ بھی زندگی میں بھی حسن و عشق کے جذبے سے ہمیشہ سرشار رہتے تھے۔ صنف نازک شاید ان کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔

سنہ ۱۹۴۳ء کا زمانہ تھا جب دادر میں واقع فضلی برادرز لمیٹیڈ کے وسیع و عریض دفتر میں بڑی چہل پہل رہا کرتی تھی۔ ان دنوں اس کمپنی میں کچھ مرد و زن اداکاری کے شعبے میں ماہوار تنخواہوں پر ملازم تھے۔ انہیں میں ایک حسین و جمیل دوشیزہ بھی تھی جو اپنے خوبصورت انداز گفتگو سے لوگوں کا دل موہ لیتی تھی۔ ایک دن جب اسی دوشیزہ نے اپنی دل کش گفتگو کے دوران کچھ شکایت کے لہجے میں کرشن چندر کی چھیڑ چھاڑ کا ذکر کیا تو مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ کرشن چندر ایک عام آدمی کی طرح دل پھینک بھی واقع ہوئے تھے۔

"یار سے چھیڑ چلی جائے اسد
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی"

آپ نے غالب کا یہ شعر تو سنا ہی ہوگا۔ میں نے کہا "کرشن چندر شاید اسی جذبے کے تحت آپ سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوں۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہئے"۔ لیکن اس وقت مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ دنیائے اردو کے سب سے بڑے رومان پرست ادیب کرشن چندر

ایک دن اُسی دو قمیص کو "سرائے کے باہر" کی ہیروئن بنا کر اپنی دیرینہ حسرت کو وصل میں بدل دیں گے۔

میرے ایک دوست تھے عرش حیدری۔ شاعر تو تھے ہی خوش نویس بھی تھے۔ ان دنوں وہ کرشن چندر کے سکریٹری کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ جو ان کے بے شمار پرستاروں کے خطوط کا بڑی پابندی سے جواب دیا کرتے تھے۔ تخلیقات کی نقل کرنے کا کام بھی انہیں کے ذمہ تھا۔ کرشن چندر کے سینے میں ایک نہایت دردمند دل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بہ وقت ضرورت وہ اپنے احباب کی مدد کرنے سے کبھی باز نہیں آتے تھے۔ عرش حیدری دن رات شراب پینے کے عادی تھے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ وہ شراب نہیں پیتے تھے۔ شراب نے انہیں پینا شروع کر دیا تھا۔ ایک دن وہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے "یار میرے پاس راشن کا ایک دانہ نہیں ہے۔ مجھے کچھ روپئے دے دو۔" میں نے روپئے دے تو دیئے لیکن بعد میں کسی نے بتایا کہ ملاڈ اسٹیشن پہنچنے سے پہلے ہی عرش حیدری نے وہ سارے روپئے دارو کے اڈے کی نذر کر دیئے تھے۔

عرش کے لئے کوئی کام ہو یا نہ ہو کرشن چندر ہر جائز و ناجائز موقع پر ان کی ضرورتیں پوری کیا کرتے تھے۔ جب ان کے گھر والوں نے انہیں ٹوکنا شروع کیا تو وہ چھپ چھپا کر عرش حیدری کو دیا کرتے تھے۔ عرش کا پھر اچانک بند ہو گیا اور جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ مر گیا تو کرشن چندر نے مرحوم کی انتہائی غیر ذمہ دارانہ زندگی کو سامنے رکھ کر ایک کہانی لکھی تھی ——— "نئی قمیص" ——— آج بھی اس افسانے کے کلائمکس کو یاد آتی ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ——— افسانے کے اختتامی حصے میں کرشن چندر نے کچھ اس طرح لکھا تھا کہ جب عید کے موقع پر بچے کے ہاتھ میں نئی قمیص آئی اور اس نے ماں سے پوچھا کہ یہ کیوں؟ تو ماں نے جواب میں کہا تھا کہ "تمہارے ابا ہم سب کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلے گئے ہیں اس لئے تمہارے انکل نے تمہارے لئے یہ نئی قمیص لائے ہیں۔ اس بچے کا یہ کہنا کہ "ابا پہلے ہی کیوں نہ مر گئے" پڑھنے والے کا دل ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ اللہ اللہ اس چھوٹے سے فقرے کے ذریعہ کرشن چندر نے درد و غم کے ایک پورے سمندر کو کس طرح کوزے میں بند کر دیا۔"

۲۱ دسمبر ۱۹۶۹ء کا وہ تاریخی دن تھا جب عروس البلاد بمبئی کے برلا ماتشری سبھا گرہ میں جناب سید محمد زیدی صاحب کی کوششوں سے آل انڈیا اردو کنونشن کا بہت بڑے پیمانے پر انعقاد ہوا تھا جہاں ملک کے مختلف صوبوں سے آئے ہوئے بے شمار محبان اردو اور مندوبین جمع ہوئے تھے۔ اور اس وقت کی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے اس کا افتتاح کیا تھا۔ اسی جلسے میں اردو کے عظیم افسانہ نگار کرشن چندر نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا تھا کہ اردو رسم الخط سے متعلق شریمتی اندرا گاندھی نے ایک اجتماع میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اردو رسم الخط کو ایک بین الاقوامی حیثیت حاصل ہے اور اسے ہر ممکن طریقے سے تحفظ دینے کی ضرورت ہے۔ کرشن چندر نے اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا تھا کہ کچھ بددیانت لوگ اردو کو ایک بیرونی زبان سمجھتے ہوئے صرف مسلمانوں سے منسوب کرتے ہیں جبکہ اس حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ اردو ہندوستان ہی میں پیدا ہوئی۔ یہیں پیدا ہوئی۔ یہیں بڑھی اور یہیں جوان ہوئی ہے۔ چنانچہ محسنین اردو میں جہاں میر، غالب، اقبال، جوش، جگر، اصغر، فانی، آرزو وغیرہ کے نام ہیں وہیں دیا شنکر نسیم، برج نارائن چکبست، برج موہن دتاتریہ کیفی، پریم چند، آنند نرائن ملا اور رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری وغیرہ کے اسمائے گرامی بھی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے اور بھی بڑے زوردار طریقے

کہا تھا کہ اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ مان بھی لیا جائے کہ اردو ...ن کی زبان ہے تو کیا کسی قوم کو اپنی زبان یا کلچر کی حفاظت ...کا کوئی حق نہیں؟ مجھے یاد ہے اس پر سارا ہال تالیوں کی ...سے گونج اٹھا تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ اس دن کرشن چندر اردو ...ن کے ایک جری فائٹر کا رول اختیار کر کے اپنے الفاظ کی گولہ ...سے ان سارے مورچوں کو اڑاتے چلے جا رہے تھے جہاں محض ...سی اغراض و مقاصد کی خاطر ملک کی ہر دلعزیز زبان اردو ...سلسلے میں حد درجہ گمراہ کن، نازیبا اور ہلاکت آفریں کاروائیوں ...ں رہتی ہیں۔ مختصر یہ کہ اس جلسے میں کرشن چندر کا جوش و ...ش دیکھنے کے قابل تھا۔

اسی یادگار کنونشن کے کچھ دن بعد میں نے جنوری ۱۹۷۰ء ...میلاڈ میں "ادبی سنگم" کے نام سے ایک ادبی اور ثقافتی ...سن کی داغ بیل ڈالی تھی اور میں ہی کا جنرل سکریٹری

"ادبی سنگم" کے تحت ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ ...ں نشست ہوتی تھی اور سال میں ایک بار بڑی دھوم دھام ...ڈ ہی میں ہوا کرتا تھا۔ جس میں بمبئی کی ادبی اور فلمی ...تیوں کی شرکت محفل مشاعرہ کو چار چاند لگاتی تھی۔ خواجہ ...عباس، کیفی اعظمی، ڈاکٹر ظ۔ انصاری، ساحر لدھیانوی، ...نثار اختر، کمال امروہوی، نیاز حیدر، قمر جلال آبادی، مجروح ...نپوری، حسن نعیم، خمار بارہ بنکوی، کنور مہندر سنگھ ...سحر، عزیز قیسی، ندا فاضلی، تبسم، حسن کمال، واجدہ تبسم، ...رفیعہ، شمیم عابدی، یوسف ناظم، فضل جعفری، خواجہ ...غفور، شام کرشن نگم، انجم رومانی، حسرت جے پوری اور ...سوامی وغیرہ کے علاوہ دلیپ کمار، دیوندر گوئل، روپی، نوشاد، ...اور سہراب مودی بھی ان مشاعروں میں شریک ہو چکے تھے۔ ...سال مشاعرے کے افتتاح کے سلسلے میں جب مجھے کرشن چندر

کا خیال آیا تو میں نے انہیں فون کیا اور وقت لے کر ایک دن ان کے دولت کدے پر جا پہنچا۔ میں ان کے فلیٹ کے سجے سجائے دیوان خانے میں بیٹھا تھا کہ ایک دوسرے کمرے سے کرشن چندر جی مسکراتے ہوئے داخل ہوئے۔ میں جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کچھ ایسے بیتابانہ انداز میں ان سے بغلگیر ہو گیا جیسے کوئی برسوں کے بعد اچانک اپنے بچھڑے ہوئے دوست سے مل رہا ہوں۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ میں نے پہلی مرتبہ کرشن چندر کا افسانہ "بچپن" ۱۹۳۷ء میں پڑھا تھا۔ اور اب ان سے میری پہلی ملاقات ۱۹۵۷ء میں یعنی ٹھیک ۲۰ سال کے بعد ہوئی تھی میں نے جب اپنے مشاعرے افتتاح کے لئے کرشن جی سے درخواست کی تو انہوں نے بڑی خوشی سے اپنی آمادگی کا اظہار کیا تھا۔ اس کے بعد مشاعرے کی مقررہ تاریخ سے صرف ایک دن قبل محض یاد دہانی غرض سے دوبارہ ان کے گھر گیا تو کرشن جی نے کہا۔ "قیصر صاحب سا سی رات کو، سر سنگار سمسد کے جلسے میں بھی مدعو ہوں لیکن آپ سے میں نے پہلے وعدہ کیا تھا اس لئے میں آپ کے مشاعرے میں ضرور شریک ہو رہا ہوں۔ آپ فکر نہ کیجئے۔" یہ سن کر میں سوچنے لگا کہ کرشن جی اپنے وعدے کا کتنا پاس رکھتے تھے۔ وہ کتنے سادہ، کتنے مخلص اور کتنے بامروت انسان تھے۔

.بھاتی نگر گارڈن کا وسیع و عریض میدان بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ جہاں مشاعرے کا لطف اٹھانے کے لئے دور دور سے آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ اسٹیج پر شعرائے کرام نے بھی بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ اسی اثنا میں کرشن جی میری طرف آتے ہوئے دکھائی دیئے تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ میں ان کا ہاتھ پکڑ کر جب انہیں اسٹیج کی طرف لے جانے لگا تو انہوں نے مجھے روکتے ہوئے کہا۔ "قیصر صاحب۔ پہلے آپ

مجھے کسی اچھے سے ہوٹل میں کھانا کھلائیے پھر میں اسٹیج پر بیٹھوں گا۔ اس وقت مجھے کرشن چندر کی یہ بے تکلفانہ ادا بے حد پسند آئی تھی۔

کرشن چندر ان دنوں علیل رہا کرتے تھے اور ڈاکٹروں کے مشورے کے مطابق کھانے پینے میں بڑی احتیاط برتنی پڑتی تھی۔ شاید اس سے ان کی طبیعت اوب چلی تھی اور اتفاق سے اس رات اس سے نجات پانے کی صورت نکل آئی تھی۔ سلمیٰ صدیقی بھی ان کے ساتھ نہیں تھیں جو انہیں روک سکیتیں۔ بغرض کہ قریب کے ایک خوبصورت ہوٹل میں انہوں نے پہلے تو کئی جام کے پیسے لئے پھر ڈٹ کر کھانے میں مشغول ہو گئے۔ میرے ساتھ انجمن کے صدر جناب حسین پوری بھی تھے۔ کھا پی کر جب ہم تینوں مشاعرہ گاہ کی طرف واپس آر ہے تھے تو کرشن جی نے کہا۔ "مبارک ہو۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے یہاں اردو کا ایک بہت بڑا میلہ لگا ہوا ہے۔"

ناظم مشاعرہ نے مشاعرے کے افتتاح کا اعلان کیا تو اردو کے عظیم افسانہ نگار کرشن چندر مائک پر تشریف لائے اور کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی زبان کے ذریعہ اردو اور مشاعرے سے متعلق تقریر کر کے انہوں نے ہزاروں سامعین کا دل جیت لیا۔

اسی سال بمبئی میں ایک بہت بڑا ادبی حادثہ بھی پیش آیا۔ اردو کے ایک مصلحت پسند شاعر۔ ادیب اور سابق پروفیسر نے اردو کو جب یہ کہہ کر گالی دی کہ اردو کوئی زبان نہیں۔ اردو ایک رسم الخط ہے۔ باقی جو کچھ ہے وہ ہندی ہے تو دنیائے اردو میں ہر طرف غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ عصمت چغتائی۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری، نیاز حیدر، یوسف ناظم، اور کلام حیدری وغیرہ نے اپنے اپنے مضمون کے ذریعہ اس افترا پردازی کا ڈٹ کر جواب دیا تھا۔ بالخصوص کرشن چندر نے اس سلسلے میں جو رول ادا کیا تھا وہ اردو کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اس بیان کے جواب میں بڑی سختی کے ساتھ اس وقت تک لکھا جب تک کہ اردو ہی والے کی اردو کشی کی آگ سرد نہ ہو۔ کرشن جی ان دنوں میرے وہ مضامین پڑھا کرتے تھے۔ مجھ سے شاید بے حد متاثر تھے۔ جبھی تو ایک دن انہوں نے فون پر مجھ سے کہا تھا۔

"قیصر صاحب۔ اب میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ آپ ہمیشہ چوکنا رہا کیجئے اور جب بھی اردو کے خلاف کوئی آواز اُٹھے آپ اسے دبانے کی کوشش کیجئے گا۔ یہ میری تاکید ہے۔"

کرشن چندر کی مادری زبان پنجابی تھی۔ اس کے باوجود اردو سے ایسی والہانہ محبت تھی کہ ایک بار سلمیٰ صدیقی سے باتوں باتوں میں کہا تھا۔ "قیصر صاحب۔ وہ کہا یہاں تک کہا کرتے تھے کہ اردو کے لئے اگر میری جان جائے تو بڑی خوش نصیبی کی بات ہوگی۔"

لیکن یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ کچھ دن بعد جب پیر مرنے والے کرشن چندر کی ارتھی شمشان کی طرف جا رہی تھی تو اس کے پیچھے گنتی کے چالیس پچاس آدمی چل رہے تھے۔ یہ تھا انجام۔ انجام اس ہندوستانی ادیب کا جس کی ایک ایک کتاب روس کی مختلف زبانوں میں چھپ کر لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوتی رہی۔

(بقیہ :- مفاد پرست)

"لیکن وکیل کچھ نہیں۔ ہمارے لئے ہماری ذات سے بڑھ کر کوئی چیز اہم نہیں ہے۔"

انکار کرنے والے کو اتنی جرأت نہ ہوئی کہ وہ کوئی ۔۔۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور مطلوبہ شئے اٹھا لایا۔

محافظ — خدا حافظ

ڈاکٹر محمد علی اثر

رات گھر لوٹا تو دیکھا
چاروں جانب سانپ تھے
پھن اٹھائے
اور اپنی گول گول آنکھوں میں اک خونخوار سی وحشت لئے
زندگی کو موت کے ظلمت کدے میں پھینک دینے کے لئے بے تاب تھے
میں نے دیکھا —
کھونٹیوں پر سانپ تھے لٹکے ہوئے
میز، کرسی، ریڈیو، ٹی وی، در و دیوار پر بھی
کنڈلیاں مارے ہوئے بیٹھے تھے سانپ،
پھن اٹھائے،
جیت کے نشے میں چور
…متے، پھنکارتے
…پھنیئر
…ت کے پیغامبر
…نا چاہا تو دیکھا
…ں پتھر ہو چکے ہیں
…ؤں میں خون ٹھنڈا ہو گیا ہے
…م بھی نیلاہٹوں کی دلدلوں میں دھنس چکا ہے
…ری آواز کالے پانیوں کی بےلگک کر مر چکی ہے
…منے، پھنکے، لاکھ سانپ تھے، چاروں طرف
…کرسی، ریڈیو، ٹی وی، در و دیوار پر
…نپ تھے جو لپلپاتی، زہر میں ڈوبی زبانوں سے
…دہرا رہے تھے
…م محافظ ہیں تمہارے"
…ب ہیں سجدہ کرو —

پہلا قدم

نیا رستہ —
اکیلا پن !
سفر سے ہی مفر کب ہے ؟
اسی کا نام لیں
پہلا قدم رکھیں

oo

قادرِ مطلق ہیتا ؟

زندگی بھر الجھنیں ہی الجھنیں —
اور
بعدِ مرگ نازل ہو عذاب
ایک مشتِ خاک کی خاطر یہ کیا کیا اہتمام

شناخت

اکیلے چل پڑو
نقشِ قدم چھوڑو
وہ خود اک رہ گزر بن جائیں گے آخر

میلہ

ٹومیکو کیتا گاوا
جاپانی

اجڑتا ہوا میلہ
جنم دیتے ہوئے
ایک تجسس کو!
مجھے اچھا لگتا ہے

میلہ میں!
آدمیوں کی بھیڑ میں
بہت ہی کم
خود کو بھول پاتا ہوں

دیکھتا ہوں
اور صرف دیکھتا ہوں

جب میلہ اجڑ جاتا ہے
ہر کوئی چلا جاتا ہے
میں خود کو پاتا ہوں
گھومتا ہوا
اس جگہ سے قریب
جہاں مسرت اور خوشی تھی
اور ہمیشہ تعجب کرتا ہوں
خود پر ......!
لیکن
پھر میں
ہو جاتا ہوں آمادہ
بڑے اشتیاق سے
نئے میلے کی تیاری میں
تعاون کے لئے!

••

توسابرو اولو
جاپانی

برف

انگیٹھی کی آگ بجھ چکی ہے
ہم بات چیت پہلے ہی ختم کر چکے ہیں
ان سب موضوعات پر
جن پر بات کی جا سکتی ہے
کہنے کے لئے کچھ بھی نہیں ہوا ہے
کوئی بھی سوال ادھورا نہیں چھوڑا ہے
پھر بھی —
ہم کتنے غیر مطمئن ہیں
دوست
کوٹ کے کالر پر جھکا ہوا سر
کیا تم جانتے ہو
وہ سچ کمزور ہے
جو صرف الفاظ کے ذریعے ہی ثابت کیا جا سکتا ہے

••

چالاک لومڑی

چالاک چھوٹی لومڑی
وہاں اس باغ میں
جب کوئی نہیں ہوتا
رات کو چراتی ہے
انگور کے شبنم آلود خوشے
اور پکی ہوئی بیلوں کے سایہ میں
چپکے سے کھاتی ہے!
محبت —
لومڑی نہیں ہے
اور نہ تم انگور کا خوشہ ہو
کہیں انجانے میں میرے دل نے
تم کو چرایا ہے
اور چپکے سے کھینچ لیا ہے
جب نہیں کوئی کہیں تھا !!

••

مناظر عاشق ہرگانوی

فضا ابن فیضی

ہر آئینے میں عکسِ حسنِ مطلق چھوڑ جاؤں گا
ہوں افسردہ تو کیا، چہروں پہ رونق چھوڑ جاؤنگا

تم اپنی منجمد تاریکیاں، اس میں ڈبو رکھنا
میں اپنے درد کا سیال ابرق چھوڑ جاؤں گا

مرے بعد آنے والی تازہ نسلو! مطمئن رہنا
تمہیں محفوظ اپنا گم شدہ حق چھوڑ جاؤں گا

تمہاری چابکی کا امتحاں مقصود ہے مجھ کو
میں سارے فلسفوں کو، یونہیں علق چھوڑ جاؤنگا

کوئی لمحہ نہیں ایسا، بنے جو ہم سفر میرا
خلا میں سارے لمحوں کو معلق چھوڑ جاؤں گا

ملے گا تم کو، ہر ذرہ جہاں، فانوسِ معنی سا
وہی لفظوں کا صحرائے لق و دق چھوڑ جاؤں گا

سمجھنا اے فضاؔ تم مثلِ تعویذِ شفا اس کو
سرِ لوح و قلم اک حرفِ برحق چھوڑ جاؤں گا

حسن نعیم

سُن اس طرح کہ شور بھی نغمہ سُنائی دے
اتنی نہ آنکھ کھول کہ دنیا دکھائی دے

انصاف کے اصول میں کوئی لچک نہ رکھ
جھک جابروں کے بیچ، نہ اپنی صفائی دے

بکھرے میں آفتاب کہ مایوسیوں میں آس
جینے کی ہو سبیل تو سب کچھ سجھائی دے

دیکھا نہیں ہو جس نے ترے دل کا آئینہ
کیا قیمتِ نگاہ شب رونمائی دے

لپٹی ہے سب کے پاؤں سے زنجیرِ غم نعیمؔ
کس میں ہے اتنا زور کہ غم سے رہائی دے

حسن نجمی سکندرپوری

کیسے دن میں آدمی کو آدمی سے ڈر لگے
لوگ چلتے ہیں چھپا کر ہاتھ میں خنجر لگے

پیار کے ٹکڑے نہ کر دے یہ لسانی کشمکش
پھر نہ اپنے دیش کو تقسیم کی ٹھوکر لگے

سربراہی میں ہوس کی، آج کی تعمیر بھی
اک ہلاکت آفریں تخریب کا پیکر لگے

راستہ چلتے ہوئے اب چوکس رہیں جناب!
کب کوئی آجائے پھر کب کوئی خنجر لگے

نفرتیں نغمہ سرا ہیں، گاؤں کے چوپال میں
اب یہاں بھی پیار کا فقدان چہروں پر لگے

جلتے گھر، لٹتی جوانی خوں میں ڈوبی مامتا
بعد میرے ایسے میلے شہر میں اکثر لگے

زندہ دارِ شب، نہ میخانے، نہ پازیبوں کا شور
ایسے ویرانے میں نجمیؔ دل بھلا کیوں کر لگے

عبدالمتین نیاز

اس رات میں یقینِ سحر کس کے پاس ہے
مجھ سا بھی اعتبارِ نظر کس کے پاس ہے

مشکل سے کر رہے ہیں بسر آسماں تلے
گھر کی جو پوچھتے ہو تو گھر کس کے پاس ہے

آنکھوں میں خواب، پاؤں میں چھالے، دلوں میں زخم
کہیے تو ہم سا رختِ سفر کس کے پاس ہے

غربت ہمیں تو عیش کی مسند انھیں ملی
کس نے لہو دیا ہے ثمر کس کے پاس ہے

ملتے ہیں سر جھکے ہوئے جس سمت جائیے
نیزہ پہ ہو بلند وہ سر کس کے پاس ہے

ٹکراؤ سے لرزنے لگا ہے مرا وجود
باطل کو جیتنے کا ہنر کس کے پاس ہے

ہاتھوں سے اپنے ہر خطِ تقدیر مٹ چکا
آئندہ موسموں کی خبر کس کے پاس ہے

وسیم مینائی شاہجہاں پوری

ڈر موت کا نہ خوف کسی دیوتا کا تھا
وہ فتح یاب یوں تھا کہ بندہ خدا کا تھا
پہلے بھی حادثات ہوئے زندگی کے ساتھ
لیکن جو آج دیکھا وہ منظر بلا کا تھا
لو وہ بھی گر گیا مرے آنگن کا پیڑ آج
ہر وقت جس سے آسرا تازہ ہوا کا تھا
سن کر جسے پہاڑوں کے سینے دہل گئے
یہ بھی کرشمہ دوستو اپنی صدا کا تھا
طوفان سے بچ نکلنے کی صورت نہ تھی کوئی
یہ فیض میری ماں کے ہی دستِ دعا کا تھا
تم بھی بھلا دو ترکِ تعلق کا واقعہ
ہم بھی یہ سوچ لیں گے کہ جھونکا ہوا کا تھا
ساحل پہ لا کے آپ سفینے جلا دیئے
یہ کام بھی وسیم ہماری انا کا تھا

یعقوب یاور

دو بچے، اک بیوی، اک گھر والا میں
گھر میرا اور گھر میں باہر والا میں
کالی دنیا چاند لپیٹے سوئی ہے
اجلی شب کی میلی چادر والا میں
بے سر کی مخلوق ہے میری بستی کی
عقل سے عاری اکلوتا سر والا میں
تیرے پیٹ میں سونا ہاتھ میں پتھر ہے
ہاتھ مقدر پیٹ پہ پتھر والا میں
دریا پا کر اترتا ہوں قسمت پہ
بک جاتا ہوں تیرے پر سر والا میں
جنگ انا کی تھی یعقوب تھے یاور کی
جیت گیا یعقوب سے یاور والا میں

گوہر جمالی

اس زمانے میں کوئی ایسا نہیں
جس کا غم سے درد سے رشتہ نہیں
ہم اسی کی جستجو میں مست ہیں
آج تک جس کو کبھی دیکھا نہیں
ساتھ میرے چل رہا ہے کون پھر
جسم کا میرے اگر سایا نہیں
آدمی سے آدمی بیزار ہے
دل سے کوئی شہر میں ملتا نہیں
ایک دنیا آپ کے پیچھے بھی تھی
آپ نے مڑ کر کبھی دیکھا نہیں
دل اگر جھکتا نہ ہو تو دوستو
سر جھکانے سے خدا ملتا نہیں
آج کی دنیا میں گوہر آدمی
آدمیت کا سبق دیتا نہیں

اختر شاہجہاں پوری

سوچا ہے ادا اک یہی سنت نہ کریں گے
اب کوئی بھی عالم ہو تو ہجرت نہ کریں گے
دل مکر و ریا سے کبھی خالی نہیں رہتا
جب تک ہے یہ عالم تو عبادت نہ کریں گے
انعام کے لالچ میں لکھے سب نے قصیدے
ہم بادشہِ وقت پہ بدعت نہ کریں گے
بے جا زر و مال، یہ تمغے، یہ مراتب
اعلیٰ کی کسی طور قیادت نہ کریں گے
بس ہاتھ میں کاسہ ہے کبھی کیسۂ زر ہو
اب ایسی کبھی امیدِ کرامت نہ کریں گے
وہ خوش ہیں اگر اس میں تو ہم پھر کبھی اختر
بربادیٔ دل کی بھی شکایت نہ کریں گے

●

بارود کی بارش کہیں رکھ دے نہ جلا کر
اس باغ کی شادابی کی دن رات دعا کر
آتا ہے امیروں کی حویلی سے تہی دست
ہم جیسے فقیروں کی بھی تو در پہ صدا کر
یارانِ طریقت کی ہیں جان کتنی پیاری
اک قطرۂ خوں بھی تو نہ رکھ پائے بچا کر
سرخی کہیں بڑھ کر نہ سیاہی میں بدل جائے
جامِ مئے گلگوں نہ ہٹے ہونٹوں سے لگا کر
اک تیرے نہ ہونے سے اداسی کا ہے عالم
ویرانۂ ہستی کو بہت دیکھا سجا کر
تقدیر میں جو کچھ ہے ملے گا وہ یقیناً
تو دیکھ لے ہاتھوں کی لکیروں کو مٹا کر
اس دور میں اختر وہ ذہانت ہے کہ دولت
بہتر ہے کہ رکھو اسے دنیا سے بچا کر

●

مدہوش بلگرامی

میں حریصِ دید ہوں منظور ہے
تو ابھی تک کس لئے مستور ہے
پاؤں کے چھالے بتائیں گے مجھے
میری منزل اور کتنی دور ہے
ہم خلوص بے نہایت تک گئے
وہ انا کے خول میں محصور ہے
خواہشِ دیدار ہم کیسے کریں
سامنے انجامِ کوہِ طور ہے
کون کس کے غم بٹا پائے گا اب
ہر بشر حالات سے مجبور ہے
روئے انساں پر بھی ہے گرد سی
اور بدن زخموں سے چکنا چور ہے
ہے کہاں مدہوش دنیا میں وفا
ہاں کتابوں میں بہت مذکور ہے

●

عبدالمتین جامی

پیاسوں کو سراب دے رہا تھا
میں خود کو عذاب دے رہا تھا
لمحوں کی حسین تتلیوں کو
حیرت کا گلاب دے رہا تھا
لفظوں کے شفیق راہبر کو
معنی کی کتاب دے رہا تھا
چہرے پہ خوشی کا رنگ بھر کے
جذبوں کو نقاب دے رہا تھا
ہستی کا عظیم آئینہ گر
چہروں کو حجاب دے رہا تھا
نغموں کا رئیس شاہزادہ
جامی کو خطاب دے رہا تھا

●

اعجاز طالب

خود کو جب لگ گئی نظر اپنی
زندگی بن گئی کھنڈر اپنی
جب بھی سورج غروب ہوتا ہے
یاد آتی ہے دوپہر اپنی
اس کا قصہ بھی اب طویل نہیں
ہے کہانی بھی مختصر اپنی
ساتھ ہوتا ہے جب بھی غم اسکا
مجھ کو ہوتی نہیں خبر اپنی
کوئی مبہم سا نقش پا بھی نہیں
سونی سونی ہے رہگذر اپنی
ہوں تو اپنوں کی بھیڑ میں طالب
کوئی لیتا نہیں خبر اپنی

●

اظہر نیئر

جب بھی تو نے کسی آئینہ میں دیکھا ہوگا
عکس تیرا ہی تجھے دیکھ کے چیخا ہوگا
کوئی آواز سرِ شام بھٹکتی ہے یہاں
اس کھنڈر میں کسی آسیب کا ڈیرا ہوگا
سرد چولھے سے لگا بچہ اسی فکر میں ہے
بھوک کی آگ سے کب گرم یہ چولھا ہوگا
اک رسالہ کسی ردی کی دکاں سے لاکر
ہم نے بک شلف میں کچھ سوچ کے رکھا ہوگا
جال پھیلائے نہ ڈالا کبھی دانہ جس نے
چھت پہ کب اس کی پرندہ کوئی اترا ہوگا
خون سے اپنے چراغوں کو جلاؤ نیئر
اس اندھیرے میں ہر اک سمت اجالا ہوگا

●

محمد مجیب احمد

خوشی کا ساون

آج آدم پور جاتے ہوئے پھر اس کی اکھیاں بھیگی ہوئی تھیں۔ لیکن دل کا یہ غبار خوشی کے باعث تھا!

آٹھ مہینے جب آدم پور سے اس کا تبادلہ ہوا تھا تو اس وقت بھی اس کی انکھڑیاں گیلی تھیں۔ مگر تب جھیل جیسی آنکھوں میں گویا ساون امنڈ آیا تھا —— غم کا ساون —— قصبہ کے چودھری کی بیوی جو اسے ماں کی طرح پیار کرتی تھی۔ اس سے بغلگیر ہو کر آہ و زاری کرتے ہوئے دلاسے دیئے جا رہی تھی: "بیٹی! مت رونا یہ ہجرت تھوڑے ہی دنوں کی ہے۔ ہم جلد ہی ایسا کوئی بندوبست کریں گے کہ تم سدا کے لئے یہیں رہو گی۔"

اس وقت چودھرائن کے یہ الفاظ وہ ٹھیک طور پر سمجھ نہیں سکی تھی۔ آدم پور میں چار برس قیام کے دوران دیہات کا دیہات اس کے لئے جیسا اپنا ہی خاندان بن گیا تھا۔ ہر کوئی اُسے اپنا سمجھتا تھا۔ حالانکہ اس کا دل وہاں جانے سے قبل یہ سوچ کر ہی پریشان تھا کہ کیا پتہ گاؤں کے لوگ کیسے ہوں گے ــ؟ اجڈ، ان پڑھ، گنوار ــ معلوم نہیں بچے کیسے ہوں گے۔؟ بدتمیز، پھوہڑ اور دیہاتی۔ نہ جانے وہ ایک شہری لڑکی سے کس ڈھنگ سے برتاؤ کریں گے۔ وہ وہاں اسکول کی استانی کی حیثیت سے جا رہی تھی ——

گاؤں پہنچنے کے بعد سب سے اول جس امر کا علم ہوا تھا وہ اس کی رہائش کا انتظام تھا۔ چودھری کی "چاندنی محل" میں اسے رہنے کے لئے جو آراستہ و پیراستہ کمرہ مختص کیا گیا تھا۔ وہ ایک شاہی خواب گاہ کی مانند جس میں ہلکی ہلکی دلنواز خوشبوئیں مہک رہی تھیں۔ جس میں انوکھی اپنائیت کی بو محسوس ہو رہی تھی اور ضروریات تمام چیزیں اس میں موجود تھیں اسے ایسا لگا کہ جیسے وہ کسی کنج میں آگئی ہو۔ چودھرائن تو بس اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ سنگ مرمر سے تراشا ہوا حسین پیکر اپنی معصومیت سے پگھل کر ان کی نگاہوں کے راستے سے قلب میں اتر رہا تھا اس کی فردوسی ہستی کی نکہت پوری حویلی میں پھیل رہی تھی۔ اس کا وجیہہ چہرہ الوہی نقاشی کا شاہکار تھا جس سے جھلکتی ہوئی شفق گوں سرخی ایسی لگتی تھی جیسے صبح کاذب صبح صادق سے بوس و کنار ہو رہی ہو۔ قد ایسی کہ جس سے سرو خجل ہو جائے۔ گیسوؤں کے اماوس

چاند پڑ جائیں۔ چشم کشادہ جھیلیں رشک کریں چال کہ
نسیم ارض سے لگ کر چھوئے ہوئے چل رہی ہو۔ سمٹی ہوئی
...ست کی یہ بہت صورت اور خوب سیرت گڑیا انہیں اس
...ہ بھا گئی کہ پھر انہوں نے اسے اپنے نور نظر کی شال سفر
...نے کا قصد کر لیا۔ اور وہ قدرت کی اس صناعی پر عش عش
...نے لگیں۔ اللہ تعالیٰ واقعی مصور ہے ——— سب سے عظیم مصور!

اگلے روز وہ مدرسہ کی حالت دیکھ کر قدرے اداس
...لی۔ دو وسیع کمروں پر ایک مشتمل ایک چھوٹا سا مکان سے
...ں قصبہ کی نئی پود کو پروان چڑھنا تھا۔ اس نے اپنے فرائض
...سنبھال لئے تھے وہ بچوں سے مطمئن ہو گئی سب کے سب
...ش طبع تھے اور اس کی فرماں بردار بھی۔ چند ہی دنوں میں
...س نے تعلیم گاہ کی رنگت یکسر بدل دی۔ اس کے در و دیوار
...تر کار کردگی کا نمونہ پیش کر رہے تھے۔ صحن پھولوں کے پودوں
...ور گملوں سے لہلہانے لگے تھے۔ لڑکے جو ابتدا میں گندے
...ر میلے کچیلے کپڑوں میں رہتے تھے انہیں صفائی کی خوبیاں ذہن
...شین کروائیں۔ اچھی باتوں اور نفیس چیزوں سے دلچسپی
...یدا ہو کر ان میں قبول کرنے کی صلاحیت اجاگر ہوئی اور وہ
...سنورتے چلے گئے۔ پڑھائی میں آغاز سے زیادہ چالاک ہو گئے
...تھے ——— !

طلبا کی بڑھتی تعداد کو مدنظر رکھتے ہوئے اسکول
...دوسری عریض اور شاندار عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔
...یہاں اسے تحتانوی سے ترقی دے کر فوقانی مرتبہ دیا گیا اور
...اس کو صدر مدرسہ کے عہدہ پر فائز کرتے ہوئے کچھ
اساتذہ کا بھی تقرر عمل میں آیا۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا
تھا کہ وہ دیہات کے گھر گھر میں علم کے چراغ روشن کر دے گی
جب اسے اپنی محنت بار آور ثابت ہونے لگی تو اس نے گاؤں
کی پنچایت کے آگے لڑکیوں کی تعلیم کے لئے تجویز رکھی۔ جسے

فوراً منظور کرتے ہوئے "مدرسہ نسواں" کا علیحدہ انتظام
کیا گیا اور ساتھ ہی اس کی کاوشوں کی بدولت غیر تعلیم یافتہ
خواتین کے لئے بھی شام میں خواندگی کا اہتمام ہو گیا تھا۔
جنہیں وہ شخصی طور پر خصوصی توجہ سے علم کے علاوہ کار
آمد گرہستی اور خانہ داری کے دلنشیں انداز میں بتاتی۔ وطن
کی خبریں اور عالمی مسائل کے متعلق معلومات بہم پہنچاتی نیز
بچوں کی عمدہ پرورش پر زور دیتی۔ اس کے سبق آمیز پیام
اور تعلیمی مہم کے سبب یہ قصبہ جدید معاشرہ کی طرف گامزن
تھا۔ اس کے حسنِ خدمات کو ملحوظ رکھتے ہوئے حکومت نے
اسے "قابل معلمہ" کے اعزاز سے سرفراز کیا اور ماہرین تعلیم
نے اس کی کافی حوصلہ افزائی کی ———!

اس کی نمایاں صفات سے متاثر ہو کر چودھری اور
چودھرائن اس پر بے حد مہربان ہو گئے تھے۔ ان کے پاس
کوئی بچی نہ تھی۔ فقط ایک لڑکا تھا جو شہر میں تعلیم حاصل
کر رہا تھا۔ اس لئے وہ اولاد کی کل چاہ اس پر نثار کرنے
لگے۔ چنانچہ وہ بھی اس کی عنایات خسروانہ کے حصول کی خواہش
مند رہنے لگی تھی۔ سب اسے احترام و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے
تھے۔ اور یہاں کے پٹیل کا کہنا تھا کہ اس کے آنے کی وجہ سے
وہ لوگ نہ صرف جدید طرز زندگی سے روشناس ہوئے ہیں
بلکہ اس سرزمین پر نئی تہذیب بھی کروٹ لینے لگی ہے۔ وہ بھی
اس سے بڑی شفقت سے سلوک کرتا تھا۔ اب اسے دیہات
میں رہتے ہوئے یوں احساس ہو رہا تھا کہ گویا یہی اس کا
مسکن ہے۔ پھر جب اسے آدم پور سے تبادلہ کے احکام صادر
ہوئے تو وہ انتہائی رنجیدہ ہو گئی۔ یہاں سے رخصتی کا الم آمد
سے کہیں زیادہ تھا۔ چپہ چپہ سوگوار دکھائی دے رہا تھا۔
اس کی حالت دیکھتے ہوئے چودھرائن اسے گلے سے لپٹا کر تسلی
دینے لگی کہ بیٹی! نہیں رونا، ہم تمہیں جلد ہی واپس بلا لیں گے

ہمیشہ ... !

اور آج وہ پھر آدم پور جا رہی تھی۔ سارا گاؤں مسرور ہو کر اس کا والہانہ استقبال کر رہا تھا جیسے شادمانیوں کی بارش ہو رہی ہو۔ باراتی خراماں خراماں چل رہے تھے۔ قریب کی مسجد سے اذان سحر گہی کی صدا اَشہدُ اَلّا اِلٰہ اِلّا اللہ۔ اشہد انّ محمد الرسول اللہ۔ ساکت فضا میں ایک وجدانی کیفیت طاری کر رہی تھی۔ آذانِ سحر خیزی سے واقف پرندے صبح کے گیت اور اڑانیں شروع کر دی تھیں۔ کار کولتار کی اجلی اور چوڑی چکنی سڑک پر رینگ رہی تھی۔ جو دو رویہ گھنے درختوں کے سائے سائے ہوتی ہوئی حرا پبلک اسکول کی عمارت کے سامنے سے گذرتی اور رفیق اسپتال کا دامن چھوتی ہوئی چودھری صاحب کے عالیشان بنگلہ کی سمت بڑھ رہی تھی۔ دور گنبد کی اوٹ سے مشرق کی چٹان چیر کر آفتاب کا ابھرنا پھوٹ رہا تھا۔ اس کی پہلی نرم نرم کرنیں ہر سو بکھر رہی تھیں۔ اور ادھر ایک ماہتاب "چاندنی محل" میں طلوع ہونے جا رہا تھا۔ چودھرائن نے اسے واپس بلا لیا تھا۔ صدر معلمہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ اپنی بہو بنا کر۔ ان کا بیٹا جو شہر میں معلم تھا اس کی شریک حیات کے روپ میں۔ پھر اس کی منتقلی کا [illegible] منسوخ ہو گیا تھا۔ مگر اس کے باوجود بھی اس کے نین نم تھے۔ شاید دل کا یہ گداز خوشی و مسرت کے کارن تھا۔۔۔!!!

بقیہ: وعدہ

ہے سامنے مجھے پھٹکارا، بس یہی بات مجھے کھائے جا رہی ہے۔"

پارو گہری سوچ میں ڈوب گئی اس کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے جس سے اس کی یہ اداسی ختم ہو جائے۔۔۔ اچانک اسے ایک خیال آ جاتا ہے اور وہ اپنے پلو میں سے — پانچ روپئے کا نوٹ ہاتھ میں لے کر بڑے پیار بھری نظروں سے رام پال کی جانب دیکھتی ہے اور پوری ہمدردی اور پیار بھری آواز میں کہتی ہے "تو دکھی نہ ہو رام پال یہ لے پانچ روپئے اور سامنے بھٹی میں جا کر دارو پی لے تیرا سارا موڈ ٹھیک ہو جائے گا۔"

اور رام پال پانچ کا نوٹ ہاتھ میں لئے ہوئے۔ پارو کی جانب دیکھ کر صرف سوچ رہا تھا۔ بول کچھ بھی نہ رہا تھا، شاید وہ اس کی لگائی ہوئی شرط یاد کر رہا تھا۔

"دارو نہیں پئے گا، گالی نہیں بکے گا، ہاتھ کبھی نہ چھوڑے گا۔"

تبصرہ: بقیہ

فضا میں زخمی پرندہ جدھر گیا ہوگا
لہولہان ہواؤں کو کر گیا ہوگا
بچھی ہوئی ہے درختوں تلے صفِ ماتم
کوئی ہرا بھرا موسم گزر گیا ہوگا

دن رات بگولوں کا سفر دیکھ رہا ہوں
ہر سو لہو سے ہر رنگ سحر دیکھ رہا ہوں

ہونٹوں پہ تہ بہ تہ ہیں مسرت کی پپڑیاں
لیکن کوئی منظر کے اندر اداس ہے

حقیقت یہ ہے کہ آج ہر شخص بظاہر خوش نظر آتا ہے لیکن اندر سے اداس ہوتا ہے کیونکہ:

مرے ہر طرف زرد رو خوف ہے
کہ بنتا ہوں خود ہی ہدف چار سو

"اجنبی صدا" کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے۔

(تاج پیامی)

نسیم احمد نسیم

مفاد پرست

فئیٹ ایک فیاٹ کار تھی جس میں وہ پانچوں بیٹھے ہوئے تھے اور ایک دوسرے کو غصیلی نظروں سے دیکھے جا رہے تھے۔ ساتھ ہی ڈرائیور کو چیخ چیخ کر گالیاں بھی دیتے جا رہے تھے لیکن وہ اپنی دھن میں ان کی گالیوں کی پروا کئے بغیر کار کو بڑی سنعدی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ کار کی غیر معمولی اسپیڈ اور ڈرائیور کی پراسرار خاموشی، دونوں نے مل کر انہیں بوکھلا سا دیا تھا۔

گاڑی اب شہر چھوڑ کر ایک سنسان سڑک پر دوڑی چلی جا رہی تھی۔ یہ سفر لگ بھگ دو گھنٹے کے بعد ختم ہوا۔ کار ایک موڑ پر جا کر رک گئی۔ سب سے پہلے ڈرائیور باہر آیا۔ اور بڑے مودبانہ لہجے میں ان سے باہر آنے کو کہا۔ وہ پانچوں اس طرح گاڑی سے اترے جیسے اترتے ہی اسے قتل کرنے کا ارادہ کر چکے ہوں۔ لیکن ڈرائیور نے کسی تاثر کا اظہار کئے بغیر اپنی جیب سے ایک پیکٹ نکالی اور ان کی طرف اچھال دی۔ اور برق رفتاری سے گاڑی میں بیٹھا اور دیکھتے دیکھتے یہ جا وہ جا۔

وہ پیکٹ جس کے ہاتھ لگی تھی اس نے بنا سوچے سمجھے ایک طرف سرپٹ دوڑنا شروع کر دیا۔ لیکن باقی ساتھیوں نے اسے کچھ ہی دور پر جا لیا۔ اب وہ ایک دوسرے سے پیکٹ چھیننے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ دیر تک یہ کھیل چلتا رہا۔ بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ اسے کھول کر آپس میں برابر تقسیم کر لیا جائے۔ اس بات پر سب راضی ہو گئے اور اپنے اپنے حصے کی رقم لے کر مطمئن ہو گئے۔ لیکن یہ اطمینان زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ انہوں نے اس جگہ کا معائنہ کرنا شروع کیا، جہاں وہ کھڑے تھے۔ تارکول کی پتلی سڑک دور تک جا کر معدوم ہو چکی تھی۔ سڑک کے دونوں جانب شیشم کے لمبے لمبے درخت خاموش و بے حرکت کھڑے تھے۔ درختوں کے عقبی حصوں میں دور دور تک بنجر زمین دکھائی دے رہی تھیں۔ حد نظر تک کسی مکان یا مکین کا نام و نشان نہ تھا۔ شام کے چھ بجنے والے تھے۔ دیکھتے دیکھتے بنجر اور سوکھی زمین کہاسوں سے نہا گئی۔ اور درختوں پر دھند کا قبضہ ہو گیا۔ ادھر ان پانچوں کو یہ بھی پتہ نہ تھا کہ وہ شہر سے کتنی دور اور کس جگہ پر ہیں۔

تھک ہار کر وہ سڑک سے اتر کر پگڈنڈیوں سے ہوتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ یہ جگہ ان کے لئے اجنبی تھی۔ پھر بھی انہوں نے یہاں رات گذارنے کا مصمم ارادہ کر لیا کیونکہ اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ سردی سے سب کے دانت بج رہے تھے۔ اور گھڑی دو ہی ٹوٹی جا رہی ہیں۔

چلتے چلتے ابھی وہ تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ انہیں
ایک مکان کا ہیولہ نظر آیا۔ سب کے چہرے یکایک کھل اٹھے
تقریباً ۵ منٹ بعد وہ اس مکان کے سامنے کھڑے آپس
میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ یہ مکان کھیتوں کے بیچوں بیچ
واقع تھا۔ شاید یہ اسے ان کے لئے بنوایا گیا تھا جو کہ اناج
پکنے کے وقت راتوں میں رکھوالی کرتے ہیں۔ یا کبھی کبھی کھیت
کے مالکان آکر ٹھہرتے ہیں۔ لیکن فصل کی غیر موجودگی میں اسے
خالی ہونا چاہئے تھا۔ یہ سوچ کر وہ برآمدے میں پہنچ چکے
تھے۔ لیکن برآمدے میں بالکل غیر متوقع طور پر ایک کتے
کو دیکھ کر چونک اٹھے اس کی نظریں ان پانچوں کو گھورے
جا رہی تھی۔ اور جھبرے ہوئے ہوئے اوپر نیچے ہو رہے تھے۔
انہوں نے [illegible] سن گن لی اور پھر سے مطمئن ہوگئے
کہ واقعی ان کے علاوہ یہاں کوئی نہیں ہے۔ چونکہ مکان کے
دروازے پر بھاری تالا پڑا ہوا تھا اس لئے وہ برآمدے میں
ہی ایک دوسرے سے سٹ کر بیٹھ گئے۔

"یار ہم یہاں سردی سے کانپتے ہوئے جا رہے ہیں۔
اور وہ سالے موج کر رہے ہوں گے۔" ان میں سے ایک بولا۔
"لیکن چارہ بھی کیا تھا۔ ہمارا وہاں سے ہٹ جانا ہی
بہتر تھا۔" اس کے ساتھی نے جواب دیا۔
"لیکن بات سمجھ میں نہیں آئی۔ آخر وہ کہاں چھپے تھے
کہ اچانک باہر نکل آئے۔ اور ہمیں پکڑ کر یہاں بھجوا دیا۔
"کیا فرق پڑتا ہے۔ وعدے کے مطابق تو پیسے دیدیئے
انہوں نے۔"
"خاک دیدیئے... جنگل میں لا کر پھنسا دیا حرامزادوں
نے۔" اس نے برا سا منہ بنا کر کہا اور خاموش ہوگیا۔
وہ تھوڑی دیر تک خاموشی ایک دوسرے کو تکتے رہے
[illegible] رہا تھا۔ باہر کی ساری [illegible]

رفتہ رفتہ دھواں ہوگئیں۔ اور کانچ گھڑ
توڑ گئے۔ اب وہ رہ رہ کر ایک دوسرے
مخاطب تھا: "سردی سے بچاؤ کیسے ہو؟" ۔ اا
نے جو کہ سردی سے اب بری طرح کانپ رہا تھا
کو مخاطب کیا۔
"اس طرح تو ہم صبح تک بالکل اکڑ
"پھر ہم کیا کریں۔ چلے جاؤ شہر، ہ
ملے گی؟" اس کے ایک ساتھی نے طنزاً کہا
"تم ہی کیوں نہیں چلے جاتے۔ تم بھی تو
ہو۔ اور تمہیں بھی تو سردی لگ رہی ہے۔"
"میں پانی میں رہ کر گھڑیال کے خلاف
اٹھا سکتا۔ ابھی میرے بہت سے سپنے ہیں۔
"وہ سپنے کبھی پورے نہیں ہوں گے۔"
سے پہلے ہی دنیا چھوڑنی پڑے۔"
"بکواس بند کرو۔ تم کو ان کی طاقت
نہیں۔ وہ ہمیں کئی دفعہ مصیبت سے نکال چکا
بچے دوست اور مددگار ہیں۔ ان کے رہتے ہما
بگاڑ سکتا۔"
اس کی باتوں کا کسی نے جواب نہیں
لگا کر سردی سے مقابلہ کرنے لگے۔ رات کے گیا
میں کھڑی گلے نجانے کہاں سے بھول بھٹک کر
اس کی حالت کا اندازہ بھلا وہ کیسے کر سکتے
ہی فکر میں ہلکان ہو رہے تھے۔ ایک تو کڑا
اور اس پر سے مچھروں کی یورش۔ خود ک
ان کے لئے دوبھر ہو رہا تھا۔ کتے نے کھڑ
کو گوبروں سے بالکل لت پت کر دیا تھا
[illegible]

"سنو بلدیو اسے برآمدے سے باہر نکال دو"۔ ایک اپنے ساتھی سے کہا۔

"لیکن......"

"لیکن ویکن کچھ نہیں، جلدی بھگاؤ اسے مار مار کر آدھ ا کر دوں گا۔ کم بخت نے مچھروں کی فوج بلالی ہے" اس نے ا پنڈلی زور دار ہاتھ مارتے ہوئے جھلا کر کہا ـــــ اس کا ساتھی ، سمجھ چکا تھا۔ اس نے گائے کو کریدنا شروع کیا۔ لیکن وہ ر نکلنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ الٹا اس کی طرف سینگ اٹھائے لہ۔ وہ غصے میں آ کر گائے کی پشت پہ زور زور سے ڈنڈے لانے لگا۔ آخر وہ ڈکارتی ہوئی برآمدے سے کودی اور بھاگ ی ہوئی۔ اب وہ سارے اپنے کو ہشاش بشاش محسوس نے لگے۔ لیکن اب کی دفعہ سارے کے سارے مچھر ان پہ پل ے۔ ان کا بس چلتا تو وہ مکان کا تالا توڑ دیتے اور اندر کر کچھ اپائے کرتے۔ لیکن تالے کی جسامت دیکھ کر وہ سرد پڑ اتے۔ ان میں جس کا نام بلدیو تھا اس نے اپنے ایک ساتھی کو کر دھیمی آواز میں نہ جانے کیسے گالیاں دیئے جا رہا تھا۔ مخاطب یا

"اکرم کیا اس مکان میں ہم کسی طرح گھس نہیں سکتے شاید اندر بہت کچھ مل جائے۔ کم سے کم آگ ہی کا انتظام ہو جائے۔"

"لیکن تالا کیسے توڑیں گے؟"

"ایسا کرتے ہیں کہ پیچھے کی کھڑکی کو کسی طرح باہر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں ـــ کیوں؟"

"ٹھیک کہتے ہو" اور یہ کہہ کر وہ سب ایک ساتھ اٹھے اور مکان کے عقبی حصہ کی طرف بڑھے۔ تھوڑی سی محنت کے بعد وہ کھڑکی نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور باری باری کھڑکی پھلانگ کر اندر کمرے میں پہنچ گئے۔ اندر زمین پر پیال بچھی ہوئی تھی۔ پاس ہی کچھ ٹوٹی پھوٹی میز اور کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ انہوں نے کمرے کا تفصیلی جائزہ لیا۔ ایک طاق میں لکڑی کے دو بڑے بڑے رحل رکھے ہوئے تھے۔ جن پر گرد سے اٹی ہوئی دو کتابیں موجود تھیں۔ اس کے علاوہ دروازہ کے قریب ایک خالی گھڑا اوندھا پڑا تھا۔ یہ تھیں کل چیزیں۔ وہ سارے پیال پر آرام سے بیٹھ گئے اور دھیرے دھیرے اپنے نیچے سے پیال نکال کر سلگانے لگے۔ اب انہیں بڑی راحت محسوس ہو رہی تھی۔ ان کے چہرے کی رنگت واپس آنے لگی۔ اندر وہ قدرے خوش تھے۔ لیکن پیال کتنی دیر تک ساتھ دیتی۔ وہ جلد ہی ختم ہو گئی۔ اب وہ ٹوٹی کرسیوں اور میز کی طرف متوجہ ہوئے اور انہیں توڑ توڑ کر جلانے لگے۔

"یار اب جا کر جان میں جان آئی ہے"۔ ایک نے لمبی سانس لے کر کہا۔

"لیکن یہ بھی تو اب جلد ہی ختم ہو جائے گی۔ اور ابھی آدھی رات پڑی ہے۔ پھر کیا ہوگا؟"

"ہاں یہ تو ہے، لیکن گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ کسی نہ کسی طرح رات گذر ہی جائے گی۔"

اور وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ ساری لکڑیاں دھو دھو کر کے راکھ ہو گئیں۔ وہ راکھ کے ڈھیر کو بے صبری سے کرید رہے تھے کہ شاید کچھ چنگاری نکل آئے۔ لیکن ناکام ہوئے۔ اب تو ان کی بیتابی اور بھی بڑھ گئی۔ رات کے آخری پہر کی سردی جان لیوا ثابت ہو رہی تھی اور سارے اسباب ختم ہو چکے تھے۔ وہ پھر سے ہراساں نظر آنے لگے۔ لیکن اچانک ان میں سے ایک کی نظر طاق کی طرف گئی اس نے مسکراتے ہوئے اپنے ساتھی کو طاق کی طرف اشارہ کیا اور کہا ـــ

"اکرم! جاؤ اٹھا لاؤ۔"

"لیکن...... وہ تو......!؟"

(بقیہ صفحہ ۱۵۱ پر)

سہیل جامعی

وعدہ

جھاڑو دیتے دیتے اس نکڑ پر بھی تو اپنے بہت ہی قریب جوتے کی چاپ سن کر اچانک میرے ہاتھ جھاڑو پر رک گئے۔ اور میری نگاہ اس نوجوان کی طرف اٹھ گئی جو بت بنا مستقل مجھے گھورے جا رہا تھا اور میں مستقل اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی کہ اچانک یاد آجاتا ہے —
"ارے! یہ تو وہی چھوکرا ہے جو نیا نیا اپنے وبھاگ میں آیا ہے۔" اور پھر میں کچھ سوچنے لگتی ہوں۔

اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ پوچھوں وہ بغیر کچھ کہے خاموشی سے ایک اچٹتی نگاہ مجھ پر ڈالتے ہوئے آگے بڑھ جاتا ہے اور میں دوبارہ جھاڑو لگانے میں مشغول ہو گئی۔

پھر اس کا روزانہ کا معمول بن جاتا ہے — وہ آتا ہے، خاموش نگاہوں سے مجھے جھاڑو لگاتے ہوئے سڑکوں پر دیکھتا، میرے دل میں صدائیں دیتا، پیار بھری نظریں میرے جسم کے ارد گرد گھماتا اور خاموش آگے بڑھ جاتا ہے — اتنا تھا کہ اس نے کبھی مجھ سے کچھ کہا نہیں البتہ آہستہ آہستہ اس کے قدموں کی چاپ میرے دروازے پر محسوس ہونے لگی، جس کی کسک پگھلانے لگی۔ پھر میرے دل میں بھی اس کی چاہت اور میں خاموش نگاہوں سے اس کی پرستش کرنے مدعا دونوں میں سے کسی کی زبان پر نہ آیا۔

البتہ ایک دن اس کی موسی شادی کا پیغا گھر آدھمکی۔ ماں کے پوچھنے پر میں نے موسی سے کہ "موسی! شادی تو میں رام پال سے کر لوں گی لیکن شرط ہے۔"

"کیا شرط ہے بیٹی!؟"

ہم سب چونکہ سبھی ایک ساتھ کام اور ہمارا ماحول ہی کچھ اس طرح کا ہے کہ آپس میں میں کوئی جھجک نہیں محسوس ہوتی۔ اسی لئے تو میں کی موسی سے بلا جھجک اپنی شرط بتادی۔

"موسی! میری چھوٹی سی شرط یہ ہے کہ وہ کی طرح دارو نہیں پیے گا، مجھے گالی نہیں دے گا اور ہاتھ اٹھائے گا۔"

"بیٹی! یہ کیسی شرط تم لگا رہی ہو۔ بھلا بھئی

ان عیبوں سے پاک ہوگا پھر تو ہماری تہذیب ہی بدل جائے گی، ہماری زندگی ہی بدل جائے گی۔ یہ تو بیٹی میں پوری عمر دیکھتی آئی ہوں کہ شام ہوتے ہی سارے بھنگی دارو کے نشے میں ڈوبنے لگتے ہیں اور آدھی رات کو گالیاں بکتے ہوئے اپنے گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ تھوڑی اونچ نیچ ہوئی کہ وہ ہمیں پیٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ دیکھو یہ میرے پیٹھ پر زخموں کے نشان یہ صرف میری پیٹھ پر نہیں ہر بھنگی کے پیٹھ پر تجھے مل جائیں گے — یہ تو ہمارا مقدر ہے تو اس کے بارے میں اتنا کیوں سوچتی ہے ایسا تو تو اپنے گھر بچپن سے دیکھتی آئی ہے اور ہماری بچیاں تو اس کی عادی ہو گئی ہیں۔"

"نہیں موسی! میں بغیر اپنی شرط منوائے شادی نہیں کر سکتی۔"

"تو کہتی ہے تو میں رام پال سے پوچھ کر دیکھتی ہوں — ویسے میری سمجھ سے کوئی بھی بھنگی اس شرط کو مانے گا نہیں کیونکہ یہی تو اس کی زندگی ہے؟ پھر موسی پوچھ کر آنے کو کہہ کر چلی گئی۔

ایک دن موسی آتے ہی بول پڑتی ہے۔ "پارو! وہ تو تیرا دیوانہ ہے اس نے تیری ساری شرط مان لی — اب تو ہاں کر دے۔"

پھر ہماری شادی ہو گئی — زندگی ہنسی خوشی گزرنے لگی اور رام پال وعدے کا پکا نکلا۔ اس نے شادی کے بعد کبھی دارو کو ہاتھ نہیں لگایا، نہ مجھے گالی دی، نہ ہی ہاتھ اٹھایا۔

آج پارو کے سیٹھ جے پال سنگھ کے یہاں دعوت تھی اور سیٹھ نے پارو اور رام پال کو بلا کر اس ڈیوٹی پر تعینات کر رکھا تھا کہ میزبانی میں بن بلائے مہمان نہ گھس آئیں۔

دونوں دھاما، جیوی اجعام تنا بلند کہ خوشی ہو از مذہر

بیٹھے ہر آنے جانے والوں کو دیکھ رہے تھے کہ اسی درمیان رام پال کی نگاہ پارو کے ریشمی لباس سے پھسل کر اس کی بڑی بڑی آنکھیں، اس کے سانولے چہرے اور بھرے جسم کو دیکھنے میں محو ہو گئیں۔ اور جسم کے ہر حصہ میں گدگداہٹ سی محسوس ہونے لگی — نئی بیوی کے حسن اور بھرپور جوانی کا نشہ اس پر ایسا غالب ہوا کہ وہ اپنی ذمہ داری بھول گیا۔

جب پارو اس کی نظروں کی تاب محسوس کر کے اس کے پاس سے ہٹنے لگی تو وہ فوراً بول پڑا۔

"تجھے میری قسم جو تو یہاں سے ہٹی۔"

"پاگل نہ بن۔ کہتے ہوئے پارو اس جگہ سے ہٹ گئی۔"

"پارو۔ تیری قسم تو آج بہت پیاری لگ رہی ہے۔"

"دیکھ پھر وہی باتیں۔ ذرا دھیان کر یہاں کتنے لوگ موجود ہیں۔ کچھ خیال کر۔"

"وہ سب کے سب کھانے میں مگن ہیں کون دیکھتا ہے ہمیں۔ ذرا پاس آ پارو۔"

ابھی یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ ایک شور اٹھا۔ ایک کتا اندر گھس گیا۔ اور اس نے تھال میں منہ لگا دیا۔

سیٹھ جتنی گالیاں دے سکتا تھا۔ اس نے دیدی۔ صرف ہاتھ نہیں چھوڑا یہ اس کی مہربانی تھی۔ ہم دونوں کو کافی برا لگا۔ ساری خوشی غائب ہو گئی۔ سارا موڈ کرکرا ہو گیا اور ہم دونوں وہاں سے اٹھ کر چلتے بنے۔

لیکن رام پال کا موڈ بہت زیادہ خراب ہو گیا تھا اس لئے میں گھر جانے کے بجائے اسے شہر کی طرف لے کر چل پڑی تاکہ اس کا دھیان ہٹ جائے اور اس کی اداسی دور ہو جائے لیکن اس کا موڈ اور بھی زیادہ خراب ہوتا جا رہا تھا۔ میں جوں جوں اسے تسلی دیتی تھی توں توں اسے سیٹھ پر غصہ آتا۔ وہ کہنے لگا.... "پارو! اور سب تو ٹھیک تھا لیکن اس نے

تبصرہ کے لئے کتابوں کی دو جلدیں آنا ...

نئی کتابوں کا تعارف

نام کتاب :۔ تنہا تنہا
مصنف :۔ سید شکیل دسنوی
نوعیت :۔ شعری مجموعہ
ضخامت :۔ ۱۵۲ قیمت : چالیس روپے
پتہ :۔ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، پرنسس بلڈنگ، ابراہیم رحمت اللہ روڈ — بمبئی ۴۰۰۰۰۳

سید شکیل دسنوی اردو غزل کی مملکت میں ایک جانی پہچانی شخصیت ہے۔ غزل کی یہ مملکت اتنی وسیع و عریض ہے اور اس میں وہ جم غفیر ہے کہ بالعموم چہروں کی شناخت آسان نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی کوئی چہرہ حلقۂ آشنائی میں آتا ہے اور پھر اس بھیڑ میں گم ہو جاتا ہے۔ مگر سید شکیل دسنوی اپنے پہلے مجموعے "زندگی اے زندگی" کے بعد سے ہی جانے پہچانے جاتے ہیں اور اس طرح کہ انہیں بھولنا مشکل ہے۔ اس کی خاص وجہ وہ عوامل ہیں جن سے ان کی شاعری مرکب ہوتی ہے۔

سید شکیل دسنوی کی شاعری رومان، سکوت اور کرب کے عناصر ثلاثہ سے متشکل ہوتی ہے۔ یہ تینوں عناصر موضوعاتی اعتبار سے بھی ان کی شاعری میں اختصاص پیدا کرتے ہیں اور لہجہ میں بھی امتیازی خطوط بناتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جب یہ دونوں شی[ئیں] کسی شاعر کے کلام میں جلوہ گر ہو جائیں تو اس [کی] شناخت آسان ہو جاتی ہے اور اسے بھولنا مشکل ہے۔

میں نے ابھی جن عناصر کی بات کہی ہے و[ہ] ذیل اشعار سے واضح ہوتے ہیں۔ نمونے کے طور پر ملاحظہ کیجئے۔

اتنے چہروں میں کہیں اپنا کوئی چہرہ نہ[یں]
زندگی تجھ کو ابھی تک ٹھیک سے دیکھا نہ[یں]

یا شکستہ ہیں ارادے، آرزوئیں جاں بہ [لب]
اور نشانِ راہ منزل دور تک ملتا نہیں

سناٹے کا سینہ چیرے جب کوئل کی ...
دل میں کیسی کیسی ٹیسیں اٹھائے ...

دل والوں رہا نشانہ بے بہری حیات
پھر بھی میں غمگسار کوئی ڈھونڈتا نہیں
جو ایک شخص مرے گھر کے پاس رہتا
نہ جانے کیوں وہ ہمیشہ اداس ...

کسی طرح مارا سموم وقت نے شب خوں شکیلؔ
اُجڑا اجڑا آرزوؤں کا چمن ہے ان دنوں

یہ اداسی شام کی پرچھائیاں
یہ سکوت غم، مری تنہائیاں

سید شکیل دسنوی نے ہندی کے کومل شبدوں سے اپنے اشعار میں نرمی، حلاوت اور تاثیر پیدا کرنے کی کامیاب کوشش بھی کی ہے، ان کے شعروں میں لہجہ کا دھیما پن اور جذبے کے غیر رسمی اظہار نے خوبصورتی پیدا کر دی ہے۔

ان شعری خصوصیات کو ان مواقع پر ضرب پہنچتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ شکیل دسنوی کے کلام میں بعض فنی معائب بھی موجود ہیں۔ پیش نظر مجموعہ کلام میں کہیں بعض مصرعے بحر و وزن سے خارج نظر آتے ہیں۔ ایک آدھ جگہ تذکیر و تانیث کا جھمیلا ہے۔ کہیں حشو و زواید کی خامی ہے اور ان سے شاعر کا عجز بیان جھلک اٹھتا ہے۔ ممکن ہے بعض نقائص کتابت کے نقص سے پیدا ہو گئے ہوں، وجہ کچھ بھی ذمہ داری تو فنکار کو ہی قبول کرنی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل شعروں میں شاعر کا عجز بیان شعر میں گھلاوٹ پیدا نہیں ہونے دیتا۔ ملاحظہ ہو ؎

شکیل بڑھ کے بکھیرو ۔ سارا شیرازہ
یہ مجھ میں کون ہے اکثر ابھارتا ہے مجھے

دشوار ہے، پُر خار ہے یہ راہ محبت
رکھئے گا سنبھل کر کے قدم دیکھ کے چلئے

پہلے شعر میں 'بڑھ کے' اور دوسرے میں 'کر کے' نے اچھے شعروں کو غارت کر دیا۔

فنکار کو چاہئے کہ صفحہ ۱۱۳ کے شعر ۱۰ بھی دیکھ لے اور تذکیر و تانیث کا فیصلہ کر لے۔ اس کے علاوہ بحر و وزن کے تسامح کے سلسلے میں مندرجہ ذیل اشعار پر بھی نظر ثانی ڈال لینی چاہئے۔

صفحہ ۱۱۱، شعر ۲ مصرع اول / صفحہ ۹۹، مطلع، مصرع اول / صفحہ ۱۱۲، مطلع، مصرع ثانی / صفحہ ۱۲۲، شعر ۳ مصرع اول / صفحہ ۱۲۵، شعر ۲، مصرع ثانی / صفحہ ۱۳۳، شعر ۵، مصرع اول / صفحہ ۱۴۱، شعر ۳، مصرع ثانی / صفحہ ۱۴۸، مطلع، مصرع ثانی / صفحہ ۱۵۱، شعر ۱ مصرع ثانی۔

اس کے باوجود سید شکیل دسنوی کی شعری تخلیقی صلاحیت قابل اعتبار ہی نہیں، قابل تحسین ہے۔ انہوں نے غزل کے نازک و لطیف لہجہ تک رسائی حاصل کر لی ہے اور یہاں اپنی انفرادیت کی چھاپ بھی بنائی ہے۔ بیان و الفاظ کے معائب تو اس خس و خاشاک کی طرح ہیں جو تخلیقی بہاؤ میں بہتے بہتے خود بخود دور ہو جاتے ہیں۔

(علیم اللہ حالی)

کتاب :- اجنبی صدا
مصنف :- منیر سیفی
سال اشاعت :- ۱۹۸۵ ـــــ قیمت ۲۰/- روپے
ملنے کا پتہ :- بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ

"اجنبی صدا" جناب منیر سیفی کا شعری مجموعہ ہے جس میں نظمیں اور غزلیں ہیں۔ شاعر کا کلام پڑھنے سے پتا چلتا ہے کہ اس نے شاعری کا سفر ۱۹۶۵ء کے بعد شروع کیا ہے کیونکہ اس میں ترقی پسندوں کی عصری آگہی نہیں، جدیدیت پسندوں کی عصری حسیت ہے۔ میں عصری آگہی اور عصری حسیت کو دو مختلف شعور سے تعبیر کرتا ہوں۔ آگہی کا تعلق معلومات سے ہے اور حسیت کا تعلق محسوسات

یاں آج ہر دور کے شاعر کو عصری آگہی ہوتی ہے اور بغیر
ے اس کا کلام بے سود ثابت ہوگا لیکن ترقی پسندوں
ں طور پر عصری آگہی پر زور دیا۔ انہوں نے اپنے کلام میں
فرق، مزدور اور سرمایہ دار کے تنازعے، غریبی، بھوک اور
ے دیگر مسائل کو پیش کیا۔ ان کے کلام میں خارجی اور
خیالات کا اظہار ملتا ہے۔ یہ سلسلہ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۶۰ء
تک رہا۔ ۱۹۶۰ء کے آتے آتے شعراء اور ادباء نے محسوس
ری عوامل کے علاوہ داخلی کیفیت کا اظہار بھی ہونا
۔ اجتماعی حالات کے علاوہ انفرادی کیفیت کا اظہار
ناچاہئے۔ اس لئے ۱۹۶۰ء اور اس کے بعد کے شعراء
لی کیفیت، انفرادیت، وجودیت اور عصری حسیت
پر زور دیا اور ساتھ ہی انہوں نے شاعری کی ہیئت
تبدیلی کی۔ پابند نظموں کے علاوہ نظم معرا، آزاد
نثری نظموں کا تجربہ کیا۔ بعض تجربے بہت کامیاب
نہیں لوگوں میں منیر سیفی بھی ہیں۔ انہوں نے زیادہ
نظمیں کہی ہیں اور ان میں وہ بہت کامیاب ہیں۔
ہور نظموں میں "تخلیق کا کرب"، "نئے رشتے کا
بھوک کی صلیب"، "ہنسا" بہت عمدہ ہیں۔ "ہنسا" ایک
ہے جو شاعر کی شخصیت کی شناخت ہے۔ شاعر کن خیالات
رکھتا ہے وہ کن اصولوں کو مانتا ہے اور کیا چاہتا ہے اس
سے وہ ہنسا چاہتا ہے۔ وہ نفرت کی بجائے محبت
جنگ کے بدلے امن چاہتا ہے۔ مگر آج کی دنیا
میں ممکن نظر آتا ہے؟ آئیے شاعر کا کرب ہم بھی محسوس

"ہنسا"
جل گئی
جسم کی ہر شاخ ہری

پھول چہروں کے جلے
درد کی شاخ بھی
ٹوٹ کے چاروں طرف
بیج نفرت کے گرے
اور پھر بجنے لگے جنگ کے ساز
کھا گئی کتنے جیالوں کو یہ بھوکی دھرتی
اور جو بچ گئے
جیتے ہیں اپاہج بن کے
خواب باپو کا نہ شرمندۂ تعبیر ہوا۔

اور یہی بنیادی نکتہ ہے جسے شاعر اپنے کلام میں خواہ نظم ہو یا غزل پیش کرتا ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستان کی فضا ایسی زہر آلود ہوئی کہ بیان سے باہر۔ آزادی تو ملی لیکن باپو کے خواب کی تعبیر ثابت نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر کو کہنا پڑا۔

کس نے لہو نچوڑ لیے صبح و شام کے
پیڑوں سے مسکراتی ہوئی کون لے گیا

شاعر جانتا ہے کہ یہ کون لوگ ہیں یہ وہی لوگ ہیں جن کے ہاتھ باپو کو خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ غزل کے ایمائیت اور حسن تعلیل کا تقاضا ہے کہ بات براہ راست نہ کہی جائے لیکن سمجھنے والے تو سمجھ ہی لیں گے۔ اور پھر یہ شعر بھی ملاحظہ ہو۔

ٹوٹ کر آنکھوں میں پھر خوابوں کا نشتر رہ گیا
اک پرندہ دشتِ شب میں پھڑپھڑا کر رہ گیا

اور پھر یہ شعر بھی۔

شہر کو اجڑے تو برسوں ہو گئے لیکن منیر
آج تک آنکھوں میں وہ غبارِ منظر رہ گیا

آزادی کے بعد کتنے شہر اجڑے کچھ ٹھکانہ نہیں۔ کچھ اور بیت ملاحظہ ہو۔

کوئی چنگاری بھڑک جائے گی، پاگل خوابوں کی مت کریدا کرو

شہرِ خیال

○ عزیز گرامی مسعود منظر ! سلام محبت

سہیل کا شمارہ نمبر ۹، جلد نمبر ۵ موصول ہوا۔ اس شمارے میں "پیغام اقبال۔ ایک جائزہ" کے عنوان سے محترم ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کا مضمون نظر سے گذرا۔ اقبال ہوں یا پریم چند، جگر ہوں یا فراق یا متقدمین میں قابل ذکر شعراء ہوں ان پر تحقیق و تنقید کا عمل جاری رہنا چاہیے۔ ڈاکٹر موصوف نے اپنے وقیع مضمون میں اقبال کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، اس کی موافقت بھی ہوگی اور مخالفت بھی۔ یہ سلسلہ تحقیق و تنقید کے میدان میں چلتا رہے گا۔ محترم ڈاکٹر صاحب اس طرح کے مضامین قلم بند کریں، کسی کو ان پر بندش لگانے کا کوئی حق نہیں ہے۔

مجھے تو موصوف سے اتنا عرض کرنا ہے کہ ملک اس وقت انتہائی دشوار گذار منزل سے گذر رہا ہے۔ اندرونی اور بیرونی طاقتیں بھارت کی ساکھ بگاڑنے پر تلی ہوئی ہیں۔ مندر و مسجد کے تنازعہ کو لے کر تنفر، انسان کشی لاقانونیت کو ہوا دی جا رہی ہے۔ جس نے بھارت کے سوشلزم اور سیکولرزم کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ لسانی کشمکش بھی یہی فریضہ انجام دے رہی ہے۔

اس صورت حال کے پیش نظر، ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو قلم اٹھاتے وقت بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ اور ایسے مضامین سے احتراز کرنا چاہیے جن سے فرقہ پرستی کو تقویت ملے۔ آپ کو بھی مضامین، نثر و نظم کا انتخاب کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیے تاکہ فرقہ پرستوں کو اختلافی مضامین کی آڑ میں گل کھلانے کا موقع نہ ملے۔

موجودہ پرچہ پسند آیا۔ تخلیقات معیاری اور دل کو چھونے والی ہیں۔ میری صحت ابھی قابل اطمینان نہیں۔

خیر طلب ـــــ حسن نجمی سکندر پوری۔ دہلی

○ مسعود میاں۔ سدا خوش و خرم رہو

آج دیوالی ہے۔ اندھیرے سے آدمی کی جنگ کی علامت۔ یہ جنگ غالباً روز ازل سے ہر لمحہ جاری ہے لیکن اندھیرا دور نہیں ہوتا اور اس کی وجہ آدمی کے دل میں مستقل بسا ہوا اندھیرا ہے۔ جسے کوئی ولی پیغمبر یا اوتار نہیں مٹا سکا۔ مہاتما گاندھی نے ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد کی ایک چھوٹی سی شمع روشن کی تھی لیکن ہمارے اس وقت کے رہنماؤں نے اسے بجھا دیا اور پرانے زخم جنھیں لوگ بھول چکے تھے پھر تازہ ہو گئے اور تقسیم ملک کے ساتھ ہونے والے وحشیانہ فسادات نے تو قیامت ڈھا دی۔ لیکن اس سے بھی ہمارا دل نہ بھرا اور ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ پاکستان میں بھی تب سے فسادات کا سلسلہ مسلسل جاری ہے اس لئے یہ کہنا درست نہیں لگتا کہ ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات کی وجہ مذہبی اختلاف ہے۔ اب ہمارے ملک کے سامنے یہ مسئلہ ہے کہ ایودھیا میں بابری مسجد قائم رہے یا رام جنم بھومی کے احترام کے لئے مندر بنے۔ یہ مسئلہ آزادی کے کچھ دن بعد ہی کھڑا ہو گیا تھا اگر تب طے ہو جاتا تو ملک کے لئے اچھا ہوتا۔ لیکن نہ الہ آباد ہائی کورٹ کو فیصلہ جلد کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، نہ ہمارے سیاست دانوں کو اور نہ ہمارے مذہبی رہنماؤں

کو اب پنجاب میں سکھ جوان انتہا پسندوں کی غارتگری نیز شاہ بانو مقدمے میں سپریم کورٹ کے فیصلے سے پیدا ہونے والے ایجیٹیشن کے دباؤ میں نئے قانون نے حالات کو بالکل بدل دیا ہے اب ہمارے مسلمان رہنماؤں کا یہ دعویٰ کہ بابری مسجد کے متعلق انہیں عدالت کا فیصلہ منظور ہوگا بہت کمزور لگتا ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو وہ شروع سے عدالتی فیصلے کی جلدی کا تقاضا کرتے اور شاہ بانو کیس میں بھی عدالتی فیصلے کو مان لیتے مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس طرح اگر رام جنم بھومی مندر کے سلسلے میں ہندؤں کو عدالتی فیصلہ ماننا منظور نہیں تو چالیس سال پہلے ہی وہاں مندر بنانے کی تیاری کر لیتے اور مندر بنا ڈالتے۔ اب گذشتہ ایک سال سے اس مسئلے پر فرقہ وارانہ فسادات عام ہو گئے ہیں اور نہ جانے کتنے معصوم لوگ مارے جا چکے ہیں یا برباد ہو گئے ہیں۔ یہ ایک خوفناک طوفان کی آمد کی طرف صرف ایک اشارہ ہے جس سے نہ رام بھگتوں کو فائدہ پہنچا ہے نہ اسلام کو۔ اس لئے اب اس طوفان کو آتے دیکھئے اور اس کی نذر ہو جائیے۔ اس کے سوا کے اور سب راستے بند نظر آتے ہیں۔ شاید طوفان کے بعد بچنے والوں کو ماحول پرسکون نظر آئے۔ اگر ہم لوگ خودکشی پر آمادہ ہیں تو ہمیں کون روکے گا اور کیوں۔

سہیل کے لئے ایک تازہ غزل بھیج رہا ہوں جو نہایت شدید ذہنی بحران کے دوران کہی گئی۔

ڈاکٹر رستوگی صاحب کا مضمون "لسانی مسائل کا تناظر و تجزیہ" بہت خوب ہے لیکن وہ اس سوال کو نظر انداز کر گئے کہ کسی زبان کو دوسری سرکاری زبان قرار دینے سے اس زبان کو فائدہ کیا ہوگا۔ اور کیسے ہوگا۔ میرے خیال میں کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ ہاں اگر کسی ریاست کی دوسری سرکاری زبانیں ہو جائیں تو کچھ بات بنتی ہے۔ لیکن ایسا کرنا عملی سطح پر ممکن نہ ہو سکے گا۔

بلراج حیرت (دہلی)

برادرم !

ملک کی موجودہ صورت حال پر بہت کچھ لکھ سکتا ہوں۔ مگر بات وہی ہے۔ کچھ کہا بھی نہ جائے۔ چپ رہا بھی نہ جائے۔ ذہنی وطنی کشتی میں حالات دن بدن خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ پہلے گولیاں برستی رہتی تھیں اب آگ برس رہی ہے۔ سوال ہندو یا مسلمان کا نہیں۔ انسان کو زندہ جلا دیا جائے تو اسے کیا کہا جائے۔ بربریت یا قدرت کے عکس۔

ذہنی طور پر بہت پریشان ہوں۔ اس پہ یہ طرہ کہ سیاسی لوگ حالات کو دیکھ کر کہہ رہے ہوں ـــ کیا آگ سنہری ہے، کیا آنچ سہانی ہے۔

اپنے اندر ہی اندر اُبلتے ہوئے مادے کی آنچ محسوس کی۔ قلم پر قابو رکھنا لازمی سمجھا پھر بھی جو کچھ لکھ سکا ارسال خدمت ہے۔ شاید ادھوری کہانی ادھورے خیال کی طرح اوٹ پٹانگ نظر آئے۔ پھر بھی یہ سمجھ کر کہ دل کا حال سنے دل والا ـــ چند جملے لکھے ہیں۔ آج کل سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کیا کہہ رہا ہوں۔ کیا لکھ رہا ہوں۔ اور کیا کرنے جا رہا ہوں۔ ادیبوں کی فہرست میں شامل نہ ہوتا تو دانشور لوگ بھی مجھے دیوانہ سمجھتے۔ میں بھی کیا کروں ـــ میرا گھر جو جل رہا ہے ـــ باقی ـــ

دیریندر پٹواری (دہلی)

○ برادرم ! سلام علیکم

تارا چرن رستوگی صاحب آج کل خوب لکھ رہے ہیں۔ پچھلے شمارے میں "اقبال" کے بارے میں کئی انکشافات تھے۔ اس بار "دوسری زبان" کے عنوان سے بھی انہوں نے کئی باتیں کہی ہیں مگر اندازہ کہیں کہیں [illegible]

Compliments جیسا ہے۔

معلوم ہوا کہ نادم بلخی بڑی ہمہ جہت شخصیت کا نام ہے۔ ڈاکٹر علیم اللہ حالی صاحب نے فضا ابن فیضی کا مکمل تعارف کرا دیا۔ دریچہ سیم سمن قوان کی گفتگو کے لئے بس اک بہانہ کا کام کرتا ہے۔

پرچہ خوب ہے۔ نوازش کے لئے ممنون ہوں۔

رؤف خیر، حیدرآباد

○ برادرم

کل سہیل کا شمارہ ۸ ملا۔ اس سے پہلے شمارہ ۵ ملا تھا۔ مگر چھٹا اور ساتواں شمارہ کہاں ہے؟ اگر آپ نے بھیجے تو مجھے ملے نہیں۔ یا پھر آپ چھلانگ لگا گئے؟ شمارہ ۸ ابھی پڑھا نہیں ہے۔ صرف آپ کا اداریہ دیکھا۔ سب کے دل کی آواز آپ کے منہ سے سُنی مگر عیسیٰ آج صلیب پر چڑھتے تو یہی کہتے کہ اے خدا انہیں کبھی معاف نہ کرنا کیونکہ یہ جانتے ہیں کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔

ازل (بمبئی)

○ مسعود منظر صاحب : سلام و نیاز

"سہیل" پابندی کے ساتھ مل رہا ہے۔ ڈاک کے ڈاکو بھی کرم فرما ہیں۔ نصف صدی سے نکلنے والے جرائد میں "شانِ ہند"، "شاعر" کی طرح "سہیل" بھی ہے۔ نہایت سادہ مگر ادبیاتی و ثقافتی اردو صحافت میں نمایاں رول رہا ہے۔ آپ کی ہمت اور لگن کو داد دیتا ہوں جو اتنے اچھے معیاری رسالے کو اس دورِ انحطاط میں مسلسل جاری کئے ہوئے ہیں۔ یہ بڑے دل گردہ کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خیر و عافیت رکھے اور عمر دراز عطا فرمائے تاکہ اردو ادب کی ترقی میں ہاتھ بٹاتے رہیں۔ آمین

تمام اراکین "سہیل" کو سلام عرض ہے۔ فی امان اللہ۔

آپکا چھوٹا بھائی

ارمان (بیلاری)

○ مکرمی مسعود منظر صاحب، تسلیم

"سہیل" کے تازہ شمارے (۸ جلد ۵۰) میں محترم ڈاکٹر رستوگی صاحب کا مضمون "دوسری زبان کی اصطلاح" دستورِ ہند میں ہے نہ گجرال کمیشن میں" خاصا اہم اور متنازعہ ہے۔ فرقہ واریت اور متعصبانہ ذہنیت کے تعلق سے انہوں نے جو باتیں لکھی ہیں وہ بہت حد تک صحیح ہیں۔ ممتاز ساختیاتی ناقد و ادیب گوپی چند نارنگ کو اوارڈ ملنے پر مسلمان دانشوروں کو تکلیف پہونچنے کی بات کوئی حیرت انگیز نہیں ہے۔ اردو معاشرے پر تنگ نظری اور گروپ بندی اس درجہ غالب ہے کہ بہتوں کو قرۃ العین حیدر کے گیان پیٹھ ایوارڈ ملنے پر بھی تکلیف پہونچی جب کہ وہ اُس اعلیٰ ادبی اعزاز کی مستحق ہیں۔

پروفیسر محمد حسن جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی کے بارے میں رستوگی صاحب کے جو بھی ارشادات ہیں وہ بیجا ہیں یا بجا اس کا صحیح فیصلہ تو ادبار اور عمائدین علم و فن ہی کر سکتے ہیں۔ یہ ان بزرگوں کے ذاتی معاملات ہیں اس لئے ہمیں اس نوک جھونک میں پڑنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ پھر بھی رستوگی صاحب کے چند جملے مثلاً: "محمد حسن صاحب کی ادبیاتی کار کردگی مجھے ہمیشہ بے کشش معلوم ہوئی ہے" اور "ان کا اندازِ بیان استفادیاتی دھوکر دھکا بچی رہتا ہے" دل و دماغ میں کھٹکتے ہیں۔ محمد حسن کو ہم نے بھی پڑھا ہے ان کے تنقیدی مضامین بھی اور ڈراموں کی نوعیت کا بھی مضمون نظر سے گزرے ہیں

دونوں طرح کی چیزیں انہوں نے لکھی ہیں۔ اس لئے کلی طور پر "حکایتی" ہونے کا فیصلہ کر دینا تنقیدی اصول اور ادبی دیانت داری کے خلاف ہے جس کا ارتکاب کم از کم رستوگی صاحب جیسے وسیع النظر عالم فاضل کو نہیں کرنا چاہئے۔ امرت رائے صاحب یقیناً قابل احترام ہستی ہیں اور A HOUSE DIVIDED ان کی ایک عالمانہ تصنیف ہے مگر گیان چند کا یہ دعوی کہ "کوئی اردو والا لکھ کر دکھا دے" بے معنی سا ہے۔

سہیل کا شعری گوشہ بھی بہت بہتر ہے۔ رضا ابن فیضی کا یہ شعر

انا کے شیشے میں بال آجائے کب گوارا تھا
کبھی نہ وقت سے کی، یوں مفاہمت اس نے

پڑھ کر ماضی کے وہ لمحے یاد آگئے جب میں بھی انا کے حصار میں مقید تھا اور اسے بچانے کی خاطر بہت سی صعوبتیں برداشت کر گیا تھا مگر اب وقت اور مجبوری حالات کے سامنے میں نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ لفظ "انا" نے اب معنی و مفہوم بہن لئے ہیں اس لئے "انا" کی ردا اوڑھے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ سہیل کی ترقی کے لئے کوشاں ہوں۔ خدا کرے یہ رسالہ اوج ثریا تک پہونچے۔

مخلص حقانی القاسمی (علی گڑھ)

○ آج کل گجراتی ادب میں مختصر ترین افسانے کا رواج عام ہے۔ گجراتی کا یہ مختصر ترین افسانہ عموماً ڈیمائی سائز کے ایک صفحہ پر محیط ہوتا ہے۔ اور اس میں لطیفہ یا عام خبر کے انداز میں کوئی چھوٹی سی بات کہی جاتی ہے۔ لیکن یہ چھوٹی سی بات نقطۂ ارتکاز پر قاری کے ذہن پر ایک چوٹ دے جاتی ہے۔ دراصل ان افسانوں میں نقطۂ ارتکاز پر کہا جانے والا جملہ ہی عام طور سے افسانے کا حاصل یا خلاصہ ہوتا ہے۔ آپ نے دو تین کہانیاں طلب فرمائی تھیں۔ حسب حکم دو + تین = پانچ کہانیوں کا ترجمہ کیا تھا۔ جن میں سے دو بھیج چکا ہوں۔ بقیہ تین کہانیاں Fair کرنا باقی ہیں۔ ان میں کسی ایک کہانی میں ایک لفظ [redacted] "ویولا" (جو کہانی میں Key word کی حیثیت رکھتا ہے) پریشان کئے ہوئے ہے۔ اردو میں اس لفظ کے قریبی مفہوم کے تو کئی لفظ مل جاتے ہیں۔ لیکن اس کا صحیح مترادف مجھے ابھی تک نہیں مل رہا۔ اس کے انگریزی معنی ذیل کے مطابق ہیں۔

(1) OVER WISE.

(2) FOOLISH LAQUECIANS.

(3) SENTIMENTAL FOOLISH.

اگر آپ کے ذہن میں اس معنی میں کوئی اردو لفظ آئے تو لکھ بھیجئے تاکہ وہ کہانی بھی بھیج سکوں۔

غلام رازق (احمد آباد)

○ مکرمی!

موجودہ شمارے میں گجراتی اور ہندی نظموں کے تراجم پڑھنے کو ملے۔ میں ترجمے کی روایت کو بڑی اہمیت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ اور ان اخباروں کو فوقیت دیتا ہوں جو ترجمے شائع کرتے رہتے ہیں یا کرتے ہیں۔ مگر اس ترجمے کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے ذہن میں اس بات کو صاف کر لینی چاہئے کہ ترجمے کا مطلب صرف ایک زبان کے فنکار کو دوسری زبان میں متعارف کرانا۔ یا ایک زبان کے فن پارے کو دوسری زبان میں منتقل ہی کرنا نہیں ہوتا۔ ترجمہ جب تک ہمیں کوئی نیا، انوکھی اور Original چیز نہیں دیتی اس کی منطق ہی بے معنی اور بے کار ہے۔

خالد عبادی (دربھنگہ)

○ جمیل منظر صاحب ! سلام وعلیکم

تازہ سہیل موصول ہوا۔ میری دو غزلیات شامل ہیں۔ وصلہ افزائی کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ سہیل پابندی سے صول ہو رہا ہے جس کے لئے مکرر شکریہ۔

مبالغہ نہیں یقین جانئے اس دور خود غرضی اور ناموافق الات میں سہیل ہر ماہ بہ ماہ نکھار آتا جا رہا ہے۔ گروہ بندی رمحدود ذرائع کے باوجود سہیل کا ہر شمارہ ایک ادبی دستاویز حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اہلیہ کی علالت کے باوجود تازہ ہیل کا مطالعہ کیا۔ معیاری تخلیقات سبحان اللہ، دل باغ غ ہو گیا روح سرشار ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کے حوصلے ہمیشہ ان رکھے۔ اور سہیل کو شہرت دوام عطا فرمائے۔

شفیع اللہ خاں راز اثاری

○ مکرمی مدیر سہیل۔ سلام واحترام

سہیل کا تازہ شمارہ شروع تا آخر پڑھ چکا ہوں حد پسند آیا۔ مضامین، نظم ونثر، اور شہر خیال سبھی اپنی اپنی دیت کا بھرپور احساس دلاتے ہیں۔ بالخصوص نوشاد احمد یم کا افسانہ "سلگتے خیمود اسے دور" اور رستوگی صاحب ضمون کافی فکر انگیز اور دلکش ہے

قیوم خضر کا مضمون "ناوک حمزہ پوری کی شاعری" کو مضمون اور تبصرہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔ مجموعی طور پر "سہیل" کا مارہ اچھا تاثر چھوڑتا ہے۔ خدا کرے یہ یونہی ترقی کی پر گامزن رہے۔

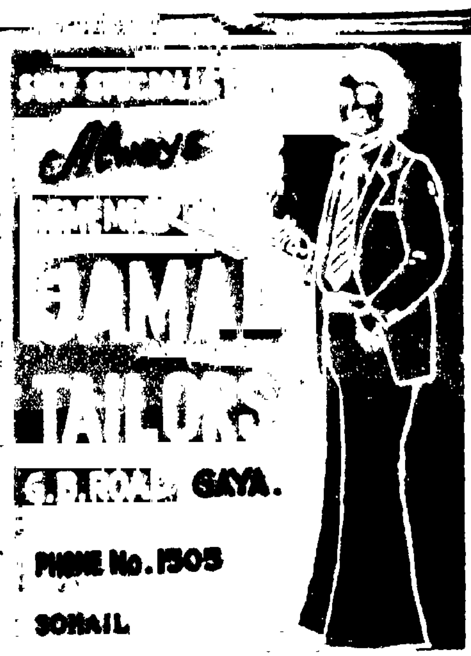
آفاق عالم صدیقی اردبھنگہ

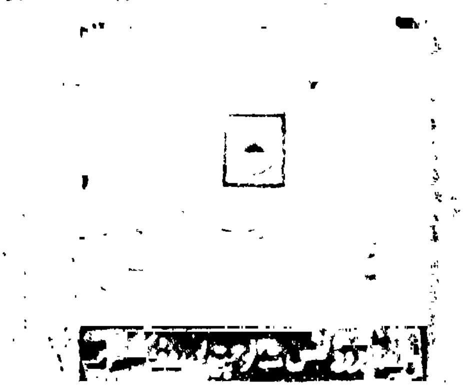
○ جناب جمیل منظر صاحب سلام مسنون

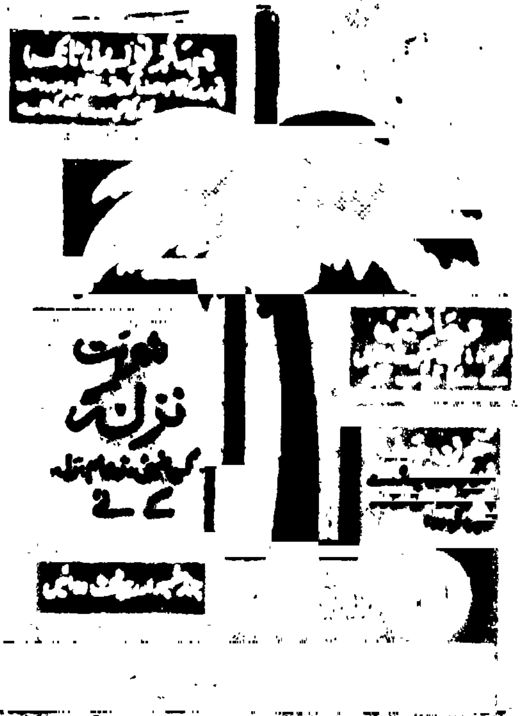
سہیل کا شمارہ ۸ پڑھا۔

آپ کا سوز بڑا فکر انگیز اور متاثر کن ہے اور اس میں آپ نے جن جن باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے وہ سو فیصد صحیح ہیں لیکن اگر ہم سب بھی نہ جاگیں تو انجام برا ہوگا۔
نوشاد احمد کریمی اور ذاکر کار کے افسانے اچھے ہیں مگر ذاکر کار کی فنی صلاحیت ان کی توجہ کی طالب ہے۔

محمد حامد (دربھنگہ)

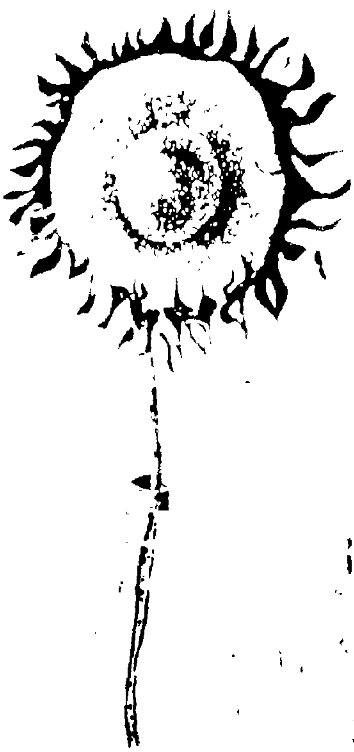






سُہَیل گیا

ماہنامہ



بانی :- حافظ محمد عبدالرحمٰن بسمل سنہاروی ـــــــــــ بیادگار :- زین العابدین احمد و ادریس سنہاروی

ماہنامہ سہیل گیا

نئے ایڈیٹر :- مسعود منظر
ایڈیٹر :- جمیل منظر
معاونین :- شکیل احمد جمالی، عبدالقیوم ابدالی
• کتابت :- سید عبدالاحد گیاوی •

فہرست

نمود ۵
شہنشاہ غزل مجروح سلطانپوری - ڈاکٹر تارا چرن رستوگی ۶
مرثیہ ـــــ ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد ۱۳
انتخاب ـــــ عنوان چشتی ۱۴
لکھنا } رؤف خیر ۱۵
غزل }
مفلسی ـــــ ملک زادہ جاوید ۱۶
وہ بھی کیا دن تھے ـــــ ویریندر پشواری ۱۶
غزلیں ـــــ ڈاکٹر سعید عارفی، اشہر ہاشمی ۱۷
غزلیں ـــــ اعجاز طالب، عبدالمتین جامی ۱۸
پرندوں کا جھنڈ ـــــ جوگندر پال ۱۹
کچی مٹی ـــــ شرون کمار ورما ۲۴
انٹرویو ـــــ محمد خالد عابدی ۲۸
جینے کی ادا کا شاعر ـــــ سید احمد شمیم ۳۱
نئی کتابوں کا تعارف ـــــ ڈاکٹر علیم اللہ حالی ۳۶
شہر خیال (خطوط) ۳۸

شمارہ ۱۱ جلد ۵

اشتراک :-

فی شمارہ .... ۳/= روپے
زر سالانہ .... ۳۶/= روپے
لائف ممبری .... ۵۰۱/= روپے

★ خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ ★

ماہنامہ سہیل گیا

نیو ریسائیٹی روڈ، گیا - ۸۲۳۰۰۱
• فون :- 2/573 •

آہ! حسن نجمی سکندرپوری

اردو کے منفرد شاعر، مستند ادیب، معتبر صحافی اور ہمارے دیرینہ کرم فرما جناب حسن نجمی سکندرپوری نے ۲۸ نومبر ۱۹۹۰ء کی شب دہلی میں واقع اپنی رہائش گاہ پر داعی اجل کو لبیک کہا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

جناب حسن نجمی سکندرپوری کا اصل نام محمد حسن خاں تھا۔ نجمی ان کا تخلص تھا۔ موصوف کی پیدائش اترپردیش کے بلیا ضلع کے سکندرپور نامی قصبہ میں یکم نومبر ۱۹۱۳ء میں ہوئی تھی۔ انہوں نے انگریزی کی تعلیم ہائی اسکول تک ہی پائی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۹۳۵ء سے ہی درس و تدریس کے کام میں لگ گئے۔ لکھنے کا آغاز انہوں نے ۱۹۳۸ء میں نثر نگاری سے کیا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں آپ نے نظم نگاری شروع کی اور ۱۹۴۵ء میں آپ صحافت سے وابستہ ہوگئے۔

جناب حسن نجمی سکندرپوری نہ صرف ماہنامہ سہیل گیا سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے بلکہ ماہنامہ سہیل گیا کے چیف ایڈیٹر جناب مسعود منظر سے بھی مرحوم کے ذاتی مراسم تھے۔

ادارۂ سہیل اپنے ایک مخلص اور سرپرست سے محروم ہوگیا ہے۔ ادارہ سہیل جناب حسن نجمی سکندرپوری کی بے وقت وفات پر گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے پسماندگان سے ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

مرحوم پچھلے کئی مہینوں سے علیل تھے۔ مگر وہ ایسے بھی نہیں تھے کہ وہ ہم سے جدائی لیتے۔ لیکن مشیت ایزدی میں کسی کا کیا دخل۔ ہر انسان کو عالم فانی سے عالم حقیقی کی طرف جانا ہے۔ ابھی ایک ماہ پہلے ہی ایک شفقت بھرا خط اور اپنی ایک تازہ غزل انہوں اشاعت کی غرض سے بھیجی تھی۔ افسوس اس بات کا ہے کہ وہ غزل اور خط ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔

مرحوم کا پہلا افسانوی مجموعہ ۱۹۶۹ء میں "موم کی عورت" کے نام سے ہندی میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ۱۹۷۲ء میں "موم کی عورت" کا ہی اردو ترجمہ "پھول کھلے ویرانے میں" کے نام سے شائع ہوا۔ ان کے دو شعری مجموعے "شب چراغ" اور "کسک" کے نام سے بھی شائع ہو چکے ہیں۔

جناب حسن نجمی سکندرپوری کی بے وقت موت سے جہاں دنیائے اردو ایک منفرد شاعر، مستند ادیب اور معتبر صحافی سے محروم ہو گئی ہے وہیں ادارہ سہیل نے اپنے ایک مخلص اور سرپرست کو کھو دیا ہے۔

ادارہ

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی

شہنشاہ غزل
مجروح سلطانپوری

جناب مجروح سلطانپوری کا نام نامی اور م گرامی ہندوستان، پاکستان، افغانستان اور عرب لک میں مشہور و معروف ہیں۔ غالباً ایسی شہرت اردو کے کسی عر کو نہیں ملی۔ یہ حقیقت ہے کہ مجروح کی شہرت، عظمت ل کی وساطت سے ہے، وہ صنف شاعری جس کو کلیم الدین مرحوم نے "نیم وحشی" قرار دیا اور غزل پر نہ جانے کب ے "ریزہ خیالی" کا الزام عائد کیا جاتا رہا ہے۔ کلیم الدین صاحب نے اردو تنقید پر بھی یہ اظہار خیال کیا تھا کہ اردو تنقید کا وجود معشوق کی موہوم کمر ہے یا "اقلیدس ی کا نقطہ" انہوں نے بالکل صحیح بھی فرمایا تھا اور غلط بھی چونکہ اردو میں تنقید ہنوز گھٹنوں ہی چل رہی ہے ۔ اردو حلقوں میں کلیم الدین احمد کے نام ہی سے نفرت نے لگی، یہاں تک کہ اردو ادب (انجمن ترقی اردو، لی کا سہ ماہی) اور زبان و ادب (سہ ماہی بہار اردو می) دونوں ابھی تک کلیم الدین احمد خصوصی نمبر شائع ر سکے چونکہ مجروح صاحب بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لہٰذا پہلے اس نکتے پر توجہ صرف کرنا بہت ضروری ہے کہ غزل کیا ہے؟

غزل چند اشعار جو کسی مخصوص بحر میں نیز مخصوص قوافی اور ردیفوں میں کہے جائیں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اور چونکہ ہر شعر علاحدہ موضوع سے مخاطب ہوتا ہے لہٰذا سمجھنے والوں نے اسے انتشار اور ریزہ خیالی سے تعبیر کر دیا۔ دراصل غزل ہمارے دل و دماغ کا استعارہ ہے۔ متنوع خیالات و تصورات کا تموج زندگی بھر قائم رہتا ہے مگر ان متنوع خیالات و تصورات کے پیکر تو ریزہ ریزہ نہیں ہوتا، وجود و تنوع خیالات لازم و ملزوم ہیں۔ بالکل اسی طرح غزل کا ایک مخصوص پیکر ہوتا ہے۔ دراں حالیکہ اشعار متعدد موضوعات پر محیط ہوتے ہوئے بھی ہم رشتہ ہی رہتے ہیں۔ یک آہنگی و ترنم غزل کے پیکر کو حامل روح ہی رکھتے ہیں۔ بنظر غائر دیکھنے پر جملہ موضوعات جن پر اشعار کہے جائیں شاعر کے دل و دماغ ہی کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ لہٰذا غزل میں ریزہ خیالی کا وہم و گمان ہی غلط

…نامہ سہیل گیا

…بت ہو جاتا ہے ۔

غزل کو 'نیم وحشی' کہنا کیا درست ہے ؟ اس سوال …بھی دو چار ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ وحشی کے معنی …لو رہی نہیں ہیں ۔ استعارۃً اس سے مراد حامل حواس …لیئے جا سکتے ہیں ۔ یعنی حواس خمسہ سے عبارت نیز ان …اثرات مرتب کرنے والی شاعری ، یعنی وہ سب کچھ اردو …جمالیات اور فارسی میں زیبائی کے تحت سمجھا جاتا ہے ۔ …اصل انگریزی لغت AESTHETICS کا ترجمہ …لیات مروج تو ہو گیا ہے مگر یہ قدرے نادرست کیونکہ …انی AESTHOS کے معنی حواس ہی ہوتے ہیں اور …س لئے جمالیات کے بجائے حواسیات ترجمہ AEST- …ETI- کے پورے معنوں کا احاطہ کرتا ہے ۔ تفصیلاً …ری انگریزی تفسیر A HANDBOOK OF - LITERARY TERMS & AESTHETIC- سے رجوع …نے پر دیکھی جا سکتی ہیں ۔ ملٹن (MILTON) نے اچھی …ریزی شاعری کے تین اوصاف بتائے ہیں ۔

۱ SIMPLICITY سادگی

۲ SINCERITY سنجیدگی

۳ SENSOUSNESS جذبات آگینی

…معروف شاعر ، افسانہ و ناول نگار اور ناقد D.H.- LAWRENC- نے درج ذیل خوبیوں کی نشاندہی …ہے ۔

۱ SENSUALLYALIYE زندہ جذبات آگینی

۲ INTELLECTUALLY ACCEPTABLE تعقلی پذیرائی

۳ MORALLY HONEST اخلاقی ایمانداری

…بار تے MORAL سے مراد کار کردگی (MORES) سمجھے ۔

اور یہ تمام تر خصوصیات کلام مجروح میں یکجائی کرتی نظر آتی ہیں ۔ ریزہ خیالی کی زد میں مجروح کی کوئی غزل نہیں آتی ۔ کیوں کہ شاعر کی حیثیت سے مجروح کے یہاں وحدت تاثرات کی فراوانی ہے ۔ مثال کے لئے یہ غزل

۱ جب ہوا عرفاں تو غم آرام جاں بنتا گیا
سوز جاں دل میں سوز دیگراں بنتا گیا

۲ رفتہ رفتہ منقلب ہوتی گئی رسم چمن
دھیرے دھیرے نغمۂ دل بھی فغاں بنتا گیا

۳ میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

۴ میں تو جب جانوں کہ بھر دے ساغر ہر خاص و عام
یوں تو جو آیا وہی پیر مغاں بنتا گیا

۵ جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایان شوق
خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا

۶ شرح غم تو مختصر ہوتی گئی اس کے حضور
لفظ جو منہ سے نہ نکلا داستاں بنتا گیا

۷ دہر میں مجروح کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

سات اشعار پر مشتمل درج فوق غزل وحدت تاثر کی آئینہ دار ہے اور خوبی یہ ہے کہ مطلع ہی اپنی معنویت سے نمودار ہوا ہے کہ اس کی ضیائیں مقطع تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں ۔ شاعر نے اپنا غم غم جہاں میں تبدیل کر کے جو عرفان و عزم حاصل کئے ہیں وہ پوری غزل کو معنویت سے ہم آغوش رکھتے ہیں ۔ شاعر اکیلا چلا تو کارواں بنتا گیا ۔ جو لفظ منہ سے نکلا داستاں ہو گیا ۔ جس مضمون کو چھوا اس کو داستان ہی بنا کر دم لیا ۔ مجروح کا … اولے پناہ عزم ہے ۔ ایسا عزم غیر معمولی بات نہیں ہے ۔

ملاحظہ ہو ایک بعد کو کہی ہوئی غزل جو مجموعہ "غزل" میں شامل نہیں ہے:-

مجھ سے کہا تخلیقِ جنوں نے یہ بھی وحیِ الٰہی ہے
مذہب تو بس مذہبِ دل ہے باقی سب گمراہی ہے

وہ جو ہوئے فردوس بدر تقصیر تھی وہ آدم کی مگر
میرا عذاب دربدری میری ناکردہ گناہی ہے

سنگ تو کوئی بڑھ کے اٹھا شاخِ ثمر کچھ دور نہیں
جس کو بلندی سمجھے ہو ان ہاتھوں کی کوتاہی ہے

پھر کوئی منظر، پھر کوئی گردش کیا کیجئے اے کوئے نگار
میرے لئے زنجیرِ گلو میری آوارہ نگاہی ہے

بہرِ خدا خاموش رہو بس دیکھتے جاؤ اہلِ نظر
کیا لغزیدہ قدم ہیں اس کے کیا دزدیدہ نگاہی ہے

دور سے اس کو چاک ملا جان کے ناصح خوش ہیں یہ
لیکن میرے گریباں پر تو اس کاجل کی سیاہی ہے

دید کے قابل ہے تو سہی مجروح تری مستانہ روی
گرد ہوا ہے رختِ سفر رستے کا شجر ہم راہی ہے

مذہبِ دل، تقصیرِ ناکردہ گناہی، ہاتھوں کی کوتاہی، آوارہ نگاہی، کاجل کی سیاہی، شجر ہم راہی اور رختِ سفر گرد ہوا وغیرہ موضوعات سب کے سب مذہبِ دل سے عبارت ہیں۔ مذہبِ دل پر منور لکھنوی کا ایک شعر حافظے میں آوازِ بازگشت کرتا معلوم ہوا ہے۔ جو پیش ہے ۔۔۔

کاش، تم اس کا فیصلہ میرے ہی دل پہ چھوڑتے
میں کسی کی بندگی کروں کون مرا خدا بنے

غرض مجروح کی ہر غزل وحدتِ تاثر کی حامل ہوتی ہے اور وحدتِ تاثر کسی طلسماتی منصوبہ بندی (PARALLEL [illegible]) سے عبارت نہیں ہوتا۔ کیٹس (KEATS)

اس نوعیت کی شاعری سے نفرت کرتا تھا۔ اقبالؔ اس میزان پر کھرے نہیں اترتے۔ ان کی شاعری صرف دورِ وسطیٰ کے تاریخی کردار، فرماں روایان جو بالاتفاق مسلمان تھے سے متعلق ہوتی ہے اور چوں کہ مسلم لاشعور پر ان کی گرفت خاصی مضبوط ہے لہٰذا اقبال کی شاعری معیاری معلوم ہوتی ہے۔ اقبال کے کلام کا کچھ حصہ ہی معیاری ہے اور یہ وہ تلخ حقیقت ہے جو بہت کم لوگ سمجھتے ہیں۔ تاریخی اسلام اور وہ بھی عہدِ وسطیٰ کے بادشاہوں اور امیروں کا اسلام اقبال کے دل و دماغ پر کابوسانہ طور پر قابض رہا۔ مجروح انسانیت کے شاعر ہیں۔ دل و دماغ کو عیر گرفتہ کرنے والے شاعر ہیں۔ ہمارے محسوسات، ذہنی کیفیات، تموجات، جذبات و خیالات و تاثرات وغیرہ کلامِ مجروح میں منعکس ہوتے ہیں۔

شاعری کو نغمگیٔ دل سے بھرپور کر دینا ہی شعری معراج ہے اور اس شعری معراج کا تشخص ہی نام غزل ہی ہو سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں، شاعری کا روح القدس غزل کا شعر ہی ہوتا ہے۔ طویل نظموں کے معدودے چند اشعار ہی ازبر ہو جاتے ہیں۔ اس حقیقت کی واضح نشاندہی کولرج (COLERIDGE) نے کی ہے۔ مثال کے طور پر اقبال کی نظم "تصویرِ درد" کو لیجئے۔ اس نظم کے کچھ اشعار ہی غزلیہ معراج تک پہنچ سکے ہیں۔ (یہ) ارغوانی اشعار ہیں۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

ایسی ہی قسم کے دوسرے اشعار بھی ہیں

نظم ہذا کا رنگِ تغزل قائم ہے۔ ایک شعر اور عوامی پسند میں شامل ہے ؎

یہ دستورِ زبان بندی ہے کیا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زبان میری

…ب سے، اردو دانشوروں نے ہنوز "زبان بندی"
…ر نہیں کیا ہے۔ "زبان بندی" بیان شہادت کو کہتے ہیں
…ں کہ یہ فارسی ترکیب با اضافت استعمال ہوئی ہے
…اردو معنی ومطلب مسلوب ہو جاتے ہیں۔ ابھی تک
…شعرا ایسے استعمال کو معیوب سمجھتے آئے ہیں۔
…ں کا دفاع کرنے کے لئے ایسی فارسی تراکیب جن کے
…میں مروجہ مضمون … کے خلاف ہیں یا اضافت صحیح تسلیم
…ے کے لئے کلیہ وضع کرنا پڑے گا۔ مگر یہ نکتہ اہم ہونے
…وجود موضوع سے انحراف ہی کے تحت لیا جائے گا
…ضمن میں اتنا اور کہتا چلوں کہ اقبال کی وہ غزلیں جو
…ی نظموں سے بہتر ہیں بالعموم بال جبریل اور زبور عجم
…تی ہیں۔ غزل کو کسی انٹرویو میں مجروح نے PORTABLE
…سفری صنفِ سخن بتایا تھا۔ بڑے نکتے کی بات ہے
…موص اس لئے بھی کہ غزل کے اشعار ہی زبان زد خواص و
…ہو جاتے ہیں۔ غزل سفری ضرور ہے مگر شعر کہنا آسان
…ہے۔ شعر کو معیاری شعری جسارت اور اعلیٰ جذباتی ارتعاشوں
…ہمکنار کرنے کے لئے ذہن ودماغ کو فکری وجذباتی و مستغیر سے
…پڑتا ہے اور وہ شاعر جو فکری تاریکیوں اور جذباتی
…طوفانوں سے دو چار ہونے کی توانیاں نہ رکھتا ہو اچھا شعر
…کہہ سکتا۔

شب تاریک و بیم موج وگردابی چنیں حائل
کجا دانند حال ما سبکساران ساحل‌ها (حافظ)

ز عشق تا به صبوری هزار فرسنگ است
(زعشق تواں دید روئے شاہد ما
کہ نور چہرۂ خوباں زقاف تا قاف است)

ز زلفِ رُخ دلدار آئینے برخواں
کہ آں بیانِ مقامات کشف وکشاف است
(حافظ)

سبکساران ساحل تاریکیٔ شب اور طوفانوں میں گھرے ہوئے کی حالت سمجھ ہی نہیں سکتے۔ عشق ہی قاف سے قاف تک دنیا پار یاں کرسکتا ہے۔ کسی زیبائی تک رسائی حاصل کرنے کے لئے کشف وکشاف کے مقامات سے گذرنا پڑتا ہے۔ آتش طور اور وعدۂ دیدار تلاش کرنے والے کو رات کے اندھیروں اور وادیٔ ایمن ایسے لق ودق سے واسطہ پڑتا ہے۔

شب تار است رہ وادیٔ ایمن در پیش
شعلۂ طور کجا وعدۂ دیدار کجا ست (حافظ)

ملحوظ رہے حافظ کے محولہ فوق اشعار کو بادجوہ پیش کیا گیا ہے اور منجملہ وجوہ میں ایک خاص وجہ یہ ہے کہ غزل کے ہر شعر کا شاذ المیہ کوئی مقصد ومقصود ہو سکتا ہے۔ شعلہ طور کو مثال کے طور پر شعری الہام ووجدان اور وعدۂ دیدار کو بہ معنی لطیفوں شاعر لیا جاسکتا ہے۔

اچھا شعر فکر وجذبہ کی آویزشوں اور آمیزشوں کے ہیجان و بحران سے گذرتے ہوئے معرض وجود میں آتا ہے فکر جب تک جذباتی چاشنی نہیں بنتا شعریت سے دور رہتا ہے۔ پیغام آفریں نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اقبال کا یہ بند

دگرگوں عالم شام وسحر کر
جہانِ خشک وتر زیر وزبر کر
رہے تیری خدائی داغ سے پاک
مرے بے ذوق سجدوں سے حذر کر (ارمغانِ حجاز)

یا اقبال کا یہ قطعہ
سرورِ رفتہ باز آید کہ ناید

نسیمی از حجاز آید کہ نیاید
سرآمد روزگار این فقیری
دگر دانائی راز آید کہ نیاید

دونوں شعریت سے مبرا قطعے ہیں۔ ان میں شعری نظر فقدان ہے۔ دونوں میں جذبات کا شمشان یعنی قبرستان ہے۔ ین یگانہ چنگیزی کا یہ شعر ؎

کتنے سارے خدا بنا ڈالے
کام بندوں کا ہے خدا کا نہیں

یہ صنم کاری انسانی فکر و نظر کا آئینہ ہے۔ یہ کام انسان کر سکتے ہیں، خدا نہیں کر سکتا۔ یہ شعر اس مزاج کا آئینہ رہے جو جذبات و فکریات کے تعمل و انقطع بلکہ ان مراقبہ و مجاہدہ سے شاعر کے دل و دماغ کو حاصل ہوتی ہے۔ ایسی شعری معراج کلام مجروح میں ہر غزل میں فروغ معنوی کرتی نظر آتی ہے۔ مجروح کی شاعری واعظانہ ...ں ہے۔ اس میں انسان کے دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ مجروح شاعری میں ہم عصری (CONTEM-PORAR) عناصر پائے جاتے ہیں، ملحوظ رہے، بڑی شاعری ہمیشہ ہم عصر رہتی ہے۔ مثال کے طور پر کیا آج کے ہندوستان میں جو کچھ ہو رہا ہے اس بازگشت اس کے ...انات، عوام کے تصورات وغیرہ درج ذیل اشعار ...ں کہکشانی کرتے نظر نہیں آتے۔ ؎

...میں تو جب جانوں کہ بھر دے ساغر ہر خاص و عام
یوں تو جو آیا وہی پیر مغاں بنتا گیا

... دو ... یہ منزل یہ اجالا، یہ سکوں
... کو اسکو ... یہ، خواب کی تعبیر نہ دیکھ

فریبِ ساقیِ محفل، نہ پوچھئے مجروح
شراب ایک ہے بدلے ہوئے ہیں پیمانے

اے رُخِ زیبا بتا دے اور ابھی ہم کب تلک
تیرگی کو شمع، تنہائی کو پروانہ کہیں

اور بھی اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں۔ محولۂ فوق چار اشعار ہی میں ہندوستان ہی نہیں پاکستان کی بھی صورت حالات رقبہ ہائے معنویات میں شامل نظر آتی ہے۔ کبھی کبھی پس منظر بدل جانے سے کسی شعر کی معنویت بھی متاثر ہو جاتی ہے مثلاً — میری نگاہ میں ہے ارضِ ماسکو مجروح
وہ سرزمیں کہ ستارے جسے سلام کریں

یہ جس غزل کا ایک شعر ہے وہ ۱۹۴۷ء میں کہی گئی تھی۔ یعنی وہ زریں عہد جب سوویت روس قابل لحاظ WORLD-POWER (دنیا کا عظیم قوت آگیں ملک) تھا۔ امریکہ ایسی بڑی طاقت بھی اس کے خوف و دبدبے سے بری نہ تھی۔ آج کا روس PERESTROIKA اور GLASSNOT یعنی کشادگی اور تشکیل نو کے چکر میں پھنس کر حالات کے ایسے بھنور میں پھنس چکا ہے کہ اس کے وجود ہی پر استفہامیہ لگایا جا سکتا ہے۔ کبھی کبھی یہ خیال بھی گذرنے لگتا ہے کہ کہیں یہ سب کچھ سی۔ آئی۔ اے (C.I.A) کی کارستانی تو نہیں ہے۔ مو خر الذکر پس منظر میں شعر مجروح روس کی صورت حالات پر طنز بن کر بھی ابھرتا ہے۔ اشتراکیت کے مجھ جیسے واقف کار بڑی الجھنوں کے شکار بنے ہوئے ہیں۔ کیا اصرافیت (CONSUMERISM) کو اشتراکیت میں کوئی جگہ دی جا سکتی ہے یہ سوال دل میں ... نہیں ابھرتا ہے۔ یہاں یہ بھی قابل توجہ نکتہ ہے کہ غزل زمانی اعتبار سے بھی PORTABLE ...

زری) ہے۔
مجروح کی روشن خیالی اور حقیقت پسندی کا دائرہ بھی ہے اور وسیع بھی۔ غزل کے مخصوص لہجے اور غزلیہ ترنم کو مجروح قائم رکھتا ہے۔ غزلیہ لہجہ و ترنم کے رنگ لپسنت ہوا اشعار ہی حائل دلکشی اور موجب جاذبیت ہوتے ہیں۔

بہانے اور بھی ہوتے جو زندگی کے لئے
ہم ایک بار تری آرزو بھی کرد یتے

بن گئی ہے مستی میں دل کی بات ہنگامہ
وطیرہ تھی جو ساغر میں لب تک آکے طوفاں ہے

یہ رکے رکے سے آنسو، یہ دبی دبی سی آہیں
یوں ہی کب تلک خدایا، غم زندگی نباہیں

کبھی جادہ طالب سے جو پھرا ہوں دل شکستہ
تری آرزو نے ہنس کر وہیں ڈالدی ہیں باہیں

ان کی تعداد بڑھائی جاسکتی ہے۔ غزلیہ لفظیات کلاسیکی ہیں مگر طرز و انداز میں کلاسیکیت ہے مجروح نے نئی معنویت میں پیدا کیا ہے یعنی سماجیاتی پس منظر کو نفسیاتی استعجابات و استعارات (PROCESSING) سے گذارتے ہوئے نئے نئے معنی آفرینی نیز شعری آتش فکری (TARGETS MEANINGFULNESS & POETIC EFFECENC) کے آفاق پر پہنچا دیا ہے۔ کیسا دلکش انداز ہے

ہٹ کے روئے یار سے تزئین عالم کرگئیں
وہ نگاہیں جن کو اب تک رائیگاں سمجھا تھا میں

اسے ملتا جلتا خیال فراق گورکھپوری نے پیش کیا ہے ؎

[illegible] عشق مانوس جہاں ہوتا گیا
[illegible] تنہا سمجھ بیٹھے تھے ہم

اور ملاحظہ ہو ؎

سوال ان کا، جواب ان کا، سکوت ان کا، خطاب ان کا
ہم ان کی انجمن میں سر نہ کرتے خم تو کیا کرتے

(مجروح)

محبوب کی جانب اشارہ سمجھ لیجئے یا کسی سرمایہ دار کے حضور میں اپنی بے کسی کا تصور کر لیجئے۔ اس نوعیت کا ایک شعر بشیشور پرساد منور لکھنوی کا یاد آنے لگا ہے۔

کیا جانے کس سوال کا پایا ہے کیا جواب
آنسو بھرے ہیں دیدۂ امیدوار میں

(منور لکھنوی)

غرض کہ شعر مجروح میں حساسیت بھی ہے، سادگی و خلوص بھی ہے۔ ہم عصریت بھی ہے اور تعقل پذیری بھی ہے بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ بہ حیثیت شاعر ان کی مخصوص شناخت و شخصیت تو ہے ہی، مجروح صاحب ژرف بین ناقدانہ نظر کے حامل بھی ہیں۔ کسی انٹرویو میں غالب کے درج ذیل مطلع کی بابت کہا تھا کہ بات پہلے مصرعے میں ختم ہو جاتی ہے مگر شعر معتبر ہوتا ہے دوسرے مصرعے سے۔

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوش قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

نظر اپنی اپنی خیال اپنا اپنا مجروح نے غالب سے متعلق کچھ کہا تو اور جو کچھ کہا اس میں وزن ہے۔ ماہرین غالبیات کچھ بھی کہتے رہیں، غالب کے اس مطلع کو یاس یگانہ چنگیزی دولخت سمجھتے تھے اور [illegible] سے اتفاق ہے مجروح دور حاضر [illegible] ایسا غزل گو ہے جس کی غزل ہر دور میں ہم عصری (CONTEMPORARY) رہے گی۔
مجروح کی فلمی شاعری بھی خاصی منفرد انہ ہے اور نفسیاتی

کیفیات سے شرابور سے

کہیں بے خیال ہو کر مجھے چھو لیا کسی نے
کئی خواب دیکھ ڈالے یہاں میری بے خودی نے

آنکھیں تھیں اور آئے تھے وہ بھی نظر مجھے
پھر کیا ہوا نہیں ہے کچھ اس کی خبر مجھے

ہم بے خودی میں خود کو پکارے چلے گئے
ساغر میں زندگی کو اتارے چلے گئے

چلی گوری پی سے ملن کو چلی
چھپنے والے سامنے آ

اور نہ جانے کتنے نغمات عوامی پسند میں شامل ہو چکے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ "لوک گیت" میں شامل ہو جائیں۔ محفوظ رہے لوک گیت کا شاعر نامعلوم رہتا ہے۔

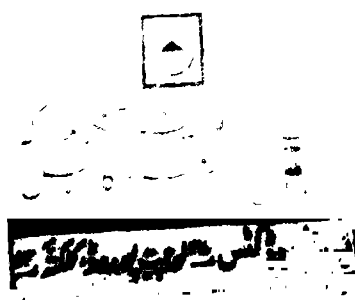
اردو تنقید کو مجروح کی شعری صفات، کیفیات سے مخاطب ہونا چاہئے۔

❀

(بقیہ: تبصرہ)

منظر شہاب کے شعری مجموعہ کا انتظار اہل ذوق کو بہت دنوں سے تھا۔ اب یہ آگیا ہے تو یقین ہے کہ اس سے شاعر کی فن کارانہ شخصیت زیادہ واضح ہو سکے گی۔

سہیل سے متعلق
اپنی رائے سے
ضرور نوازیئے



ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد

مُرسیہ

[شیخ محی الدین ابنِ عربی کے زاد بوم مرسیہ (اسپین) میں کہی گئی]

کیوں نہ ممتاز جہاں ہو تری عالی نسبی
تو ہے وہ شہر کہ ہے مولد ابنِ عربی

مرسیہ! ان سے فرومایہ نہیں رتبہ ترا
قرطبہ ہے کہ ہے غرناطہ کہ اشبیلیہ

تو بھی ہے خاتمِ اندلس میں نگینے کی طرح
تو بھی طوفانِ جہاں میں ہے سفینے کی طرح

تری مٹی کا فسوں موجِ گلستاں میں نہیں
ترے ذروں کی چمک لعلِ بدخشاں میں نہیں

کل تھا جس طرح علیگڑھ مرا مقصودِ سفر
آج تو عین اسی طرح ہے مسجودِ نظر!

کچھ حقیقت کی خبر ہو مجھے واللہ نہیں
اور میں شیخ کے رتبے سے بھی آگاہ نہیں

ایک زائر ہوں ترا، علم سے بیگانہ سہی
تو بلا شبہ حقیقت ہے میں افسانہ سہی

مجھ کو لیکن دلِ بیتاب لئے پھرتا ہے
دن ہو یا رات ہو بے خواب لئے پھرتا ہے

مُرسیہ! لعل و ادب کا تجھے معدن کہئے
یا تجھے لطفِ گہربار کا مخزن کہئے

کشتیٔ روح میں طوفاں کا سہارا تو ہے
یہ جہاں ایک سمندر ہے کنارا تو ہے

اور چمکیں گے تری خاک کے ذرات ابھی
تجھ کو معلوم نہیں تیرے مقامات ابھی

وقت آئے گا جب اسپین تجھے جانے گا
جو ترا رتبۂ عالی ہے وہ پہچانے گا

آج ناقدریِ ایّام سے تاراج ہے تو
ورنہ ایّام کے ماتھے کا حسین تاج ہے تو

عنوان چشتی

انتخاب

ماں کی مراد، باپ کی شفقت لہو کی ہے
دو بھائیوں کی جنگ میں شامت لہو کی ہے
دنیائے رنگ و بو میں محبت ہے جس کا نام
وہ بھی تو ایک شوخ روایت لہو کی ہے

❀

جمال و جسم کا پھر سحر چلنے والا ہے
سُنا ہے رات کو سورج نکلنے والا ہے
زمانہ اک نئی کروٹ بدلنے والا ہے
چراغ اُس کا، لہو اپنا جلنے والا ہے

❀

ہوا ہے تیز سمندر بپھرنے والا ہے
بلائے جاں ہے جو لمحہ گزرنے والا ہے
چلو سجی ہے عدالت پھر آج مدت میں
وہ اپنی بات سے یعنی مکرنے والا ہے
فلک کی سمت نہ دیکھو افق کی بات کرو
سُنا ہے چاند زمیں پر اترنے والا ہے

❀

❀

دلوں کے بیچ جو دیوار اٹھانے لگتا ہے
وہ بھائی، بھائی پہ تلوار اٹھانے لگتا ہے

❀

ہوائیں تیز بہت ہیں چراغ جاں کے لئے
کہاں سے لاؤں لہو، شعلہ بیاں کے لئے

❀

دشمنوں کے ہاتھ اٹھے ہیں دعا کے واسطے
رحم مجھ پر اب تو کر ظالم خدا کے واسطے

❀

میدانِ جنگ ایک ہے نیت کے فرق سے
کوئی ہوا جو حر، تو کوئی شمر سا ہوا

لکھنا

یوں تو دشوار نہیں کوئی غزل کا لکھنا
میں نے چاہا تھا ترے نام قصیدہ لکھنا

میں نے سیکھا ہی نہیں ذرے کو صحرا لکھنا
مجھ کو آتا ہی نہیں قطرے کو دریا لکھنا

میری آنکھیں ترے شہداب بدن سے سیراب
مدحتِ طرح و قلم تیرا سراپا لکھنا

اعتبارِ نظر و حرف و صدا ہے ہم سے
کھیل ہے اپنے لئے رنگ تماشہ لکھنا

میرے سے بھی زیادہ ہے قلم کا درجہ
حسن یوسف دمِ عیسیٰ یدِ بیضا لکھنا

لکھ لیا کرنا کبھی زرد صحافت کے خلاف
اور کبھی منظرِ خونیں سے گزرنا لکھنا

منصبِ عشق ہے نوکِ قلم تیشہ سے
ڈوب کر حسنِ ایلورا و اجنتا لکھنا

کتنے چھالے ہیں خبر بھی ہے قلم کے منہ میں
کتنا مشکل ہے کوئی واقعہ سچا لکھنا

ڈوب جانا مرا مفہوم کی گہرائی میں
وہ عملاً ترا الفاظ کا پھیکا لکھنا

بھیگ جاتی ہیں بہر حال قلم کی آنکھیں
خون آشام نوشتہ کوئی پڑھنا لکھنا

لوگ حیران تھے دلدار کا لکھا پڑھ کر
پنہاں سادہ پہ ترا نام نہ چھوٹا لکھنا

چوڑیاں ٹوٹ گئیں کتنے دلوں کی مانند
آنکھ سے کس کی گرا ٹوٹ کے تارا لکھنا

میں کہ مزدور قلم کا ہوں لکھا کرتا ہوں
صبح تا شام مرا کام ہی ٹھیرا لکھنا

اور یہ نظم بھی مزدور کے بیگار سی ہے
میں نے لکھی کہ یہی حکم ہوا تھا ـ لکھنا

غزل

بہت دنوں سے کچھ اپنا پتہ نہیں ملتا
کبھی تو چہرہ کبھی آئینہ نہیں ملتا

یہ سچ تو ہے ترے کوچے میں کیا نہیں ملتا
سوال یہ ہے کہ کوچہ ترا نہیں ملتا

وہ آب جو ہوں کہ جس میں ہزار جھرنے ہیں
تو تشنہ لب ہے تو کیوں مجھ سے آ نہیں ملتا

کئی دریچے کئی در ہیں اس کی آنکھوں میں
بھٹک گیا ہوں کہاں راستہ نہیں ملتا

کبھی بدلتا ہے منظر کبھی تو پس منظر
کہیں کبھی سلسلۂ نقشِ پا نہیں ملتا

ملے خطوط و رسائل تو کونے کونے سے
بس ایک خط ترا لکھا ہوا نہیں ملتا

وہ شخص غیر کوئی غیر ہی نہیں لگتا
ہزار اس سے کوئی سلسلہ نہیں ملتا

ملک زادہ جاوید

"مفلسی"

دعا کے ہاتھ میں پھولوں کی ایک ٹہنی ہے
بہت سے پھول کھلے ہیں اداسیاں لے کر
شدید دھوپ میں جھلسی جوانیاں لے کر
ذرا سی عمر میں کتنی کہانیاں لے کر
یہ ختم ہوں گے بہاروں کا مرثیہ پڑھ کے
یہ لوٹ جائیں گے دنیا پہ فاتحہ پڑھ کے
دعا کے ہاتھ میں پھولوں کی ایک ٹہنی ہے

ویریندر پٹواری

وہ بھی کیا دن تھے ـــ !

وہ بھی کیا دن تھے
جب شبنم کے قطروں سے
گلوں کے جسم دھلتے تھے
تتلیوں کے چومنے سے
پنکھڑیوں کا سنگار ہوتا تھا
چمکتی سورج کی کرنوں سے
درختوں کا روپ نکھرتا تھا

تب ہم دور سے
دوڑے چلے آ کر
مہک کو سونگھ لیتے تھے
اور اپنا سر جھکا کر
زمینِ وطن کو پرنام کرتے تھے
پھر چلی ایسی ہوا کہ
شبنم کے قطرے اُڑ گئے
پھر چلی شعلوں کی آندھی
اور گل مرجھا گئے
پھر دھول سے لپٹے ہوئے
دھوپ کی چادر اوڑھ کر
اُدھ جلے چند پھول سے بچے
جھاڑیوں سے جھانک کر
اجڑے چمن کو یاد کرتے تھے۔
یہ بھی کیا دن ہیں ـــ اُف

ڈاکٹر سعید عارفی

مرکز کو اپنے چھوڑ کے آیا نہ ہو کہیں
وہ شخص بھیڑ میں بھی اکیلا نہ ہو کہیں
سوچو تو شکستِ دل کی لہو رنگ ساعتو
حُسنِ غزل میں خونِ تمنا نہ ہو کہیں
گھر میں سمٹ کے بیٹھے ہیں کیوں آج سارے لوگ
تنہائیوں کا شہر میں پہرا نہ ہو کہیں
مثلِ غبار ٹوٹ کے بکھرو فضا فضا
یہ بھی حیاتِ نو کا تقاضا نہ ہو کہیں
چہروں کی تازگی پہ نہیں جائیے جناب
کھلتے ہیں جس کو پھول وہ شعلہ نہ ہو کہیں
کیوں میرے ساتھ ہیں ترے قدموں کی آہٹیں
یہ بھی مرے شعور کا دھوکا نہ ہو کہیں
دھندلی سی ایک شکل ہے کیوں لاشعور میں
سوچا کبھی اسے، کبھی لکھا نہ ہو کہیں
منڈلا رہا ہے سب کے سروں پر جو شہر شہر
آشوبِ روزگار کا سایا نہ ہو کہیں
شیشہ گرانِ وقت ذرا یہ بھی سوچ لیں
جو آئینہ بدست ہے اندھا نہ ہو کہیں

اشہر ہاشمی

اشعار

(۱)

اب بھی آہٹ پہ مری رات ڈھلے اک کھڑکی
شہرِ مانوس کی ویرانی میں کھل جاتی ہے
لاکھ سنجیدہ بنے شوخ طبیعت میری
اک ملاقات کی جولانی میں کھل جاتی ہے
لغزشِ شوق کو مطلوب ہے اظہار اپنا
اک نہ اک حرکتِ لایعنی میں کھل جاتی ہے
جبرِ دانائی سے اظہارِ جنوں ہو نہ جہاں
بات دل کی وہاں نادانی میں کھل جاتی ہے
چند جملوں میں بھرم رہتا ہے قائم اشہرؔ
شخصیت قصۂ طولانی میں کھل جاتی ہے

(۲)

جہاں بساط پہ گھر جائے شاہ نرغے میں
کبھی کبھی وہاں پیادہ خطا نہیں ہوتا
وہ دشمنوں میں اگر ہو تو بچ بھی جاؤں میں
اسی کا وار مبادا خطا نہیں ہوتا
جو سر بچے بھی تو دستار بچ نہیں سکتی
نشانہ اس کا زیادہ خطا نہیں ہوتا
کسی کی گردِ سفر شیشے بھی دیکھیں گے
ہماری نظروں سے جادہ خطا نہیں ہوتا

عبدالمتین جامی

شہر سے وہ شخص اک اک حرفِ الفت لے گیا
منجمد لفظوں کی تحریری عمارت لے گیا

سبز جامن کی مہکتی چھاؤں سے اٹھا غبار
آدمی کے ذہن سے خوابوں کی جنت لے گیا

لکھ کے انجام سفر کی داستاں تفصیل سے
راہبر لوگوں کی بستی سے مسرت لے گیا

حوصلوں کے ٹوٹتے مینار سے نکلا وہ شخص
منتشر افکار سے مہر و مروت لے گیا

اپنی تہذیبی وراثت سے ہوئے محروم جب
نقل کرنے کا ہنر تفسیرِ فطرت لے گیا

فلسفہ انسانیت کا پڑھ رہا تھا وہ مگر
آگہی کی وادیوں سے آدمیت لے گیا

راکھ ہو کر جب خلا میں گم ہوا اپنا وجود
وقت کی دیوار پر سے رنگ عظمت لے گیا

قافلے نغموں کے پتھریلے محل میں قید تھے
یاس و حسرت کا قبیلہ نقش وحدت لے گیا

اعجاز طالب

آدمی بدحواس چاروں طرف
پھر بھی جینے کی آس چاروں طرف

تشنگی آسماں کو چھوتی ہے
خشک صحرا کی پیاس چاروں طرف

چشم در چشم قائم و دائم
ایک منظر اداس چاروں طرف

آگ کی زد میں خیمۂ ہستی
جلتے جسموں کی باس چاروں طرف

بھوک کے پانو میں بندھے گھنگھرو
رقص کرتے گلاس چاروں طرف

ہیں تلاشوں کہاں یقیں کہ ستھر
تیکا جھوٹا قیاس چاروں طرف

بھوکوں ننگوں کے شہر میں طالب
عاجزی التماس چاروں طرف

ہے بہت خوب اہتمام مرا
حادثوں کی جگہ قیام مرا

اس سے کہدو ہو مٹا دے گی
ریت پر لکھ رہا ہے نام مرا

آسماں قہقہے لگاتا ہے
جب بھی ہوتا ہے قتل عام مرا

خود مرے شہر میں شناسا بھی
مجھ سے اب پوچھتے ہیں نام مرا

وہ بھی دن تھے کہ تیری محفل میں
ذکر ہوتا تھا صبح و شام مرا

جب حویلی ہماری اونچی تھی
لوگ کرتے تھے احترام مرا

پیار آتا ہے دشمنِ جاں پر
کیسے پورا ہوا انتقام مرا

گرچہ طالب زمیں کی گردشوں میں
آسمانوں پہ ہے مقام مرا

جوگندر پال

پرندوں کا جھنڈ

برادرِ عزیز مسعود منظر،
ایک نہیں 'سہیل' کے لئے پوری چھو کہانیاں لایا ہوں۔ پڑھ کر دیکھئے یہ افسانچے اپنے اختصار کے باوصف (یا شاید، کے باعث) کتنے پُرگو ہیں۔ پہلے دور کے افسانچے میں نے 'کتھا نگر' کے نام سے چھپوائے تھے، ادھر جو بھی نئی چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہو رہی ہیں انہیں اسی نام (پرندوں کا جھنڈ) سے شائع کروا رہا ہوں۔
جوگندر پال

گم شدہ

اس کی ابھی آنکھ بھی نہ کھلی تھی کہ اس نے ایک دم چیخ مار کر اپنی بیوی کو بلایا۔ وہ بےچاری سراسیمگی میں دوڑی دوڑی آئی۔ "کیا ہوا؟"
"اب کیا ہوگا؟" اس کا پاگل پتی اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔
"اپنا آپ تو میں اپنے خواب میں ہی چھوڑ آیا ہوں۔"

فراق

میاں بیوی ہوتے ہوتے کچھ اس طرح یکجان ہو گئے کہ ایک کو دوسرے کی الگ ذات کا احساس ہی نہ رہا۔ وہ گھنٹوں ایک دوسرے کی موجودگی سے بےخبر ایک ساتھ تنہا بیٹھے رہتے اور تنہائی سے گھٹ

گئے کہ ہر دو ماتو اپنے اپنے محبوب کا انتظار کر رہے ہوتے۔

مقام مسرت

سجاتا کے پتی کی موت کے دن لوگ اس کی ڈھارس بندھاتے رہے۔
پہلے تو اس کا رونا تھمنے ہی نہ آتا تھا، پھر آخر جب ہمدردوں کی روانگی کے بعد وہ منہ ہاتھ دھو کر اپنے کمرے میں آرام سے آ بیٹھی تو اپنے آپ کو سمجھانے لگی، تم بھی کتنی مورکھ ہو سجاتا! جب تک وہ زندہ رہا، تمہارے گمان میں بھی نہ ہوتا تھا کہ وہ دن کہاں گزارتا ہے اور رات کہاں، مگر اب تو وہ رو رو کر تم سے جدا ہوا ہے اور کسی گمان بھر مقام پر گیا ہے۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیئے۔

واہمہ

میں کتاب پڑھنے کے لئے اپنے سامنے میز پر عینک ڈھونڈنے لگا اور اسے یہاں کہیں نہ پاکر پہلو کے بستر پر تلاش کرنا شروع کر دیا۔ وہاں بھی ناکام رہا تو ڈرائنگ روم میں گیا کہ شاید وہیں چھوڑ آیا ہوں گا۔ اس کے بعد چار سو سر پٹخنے پر بھی نہ ملی تو تھک ہار کر واپس اپنی کرسی پر آ بیٹھا اور عینک کے بغیر کتاب کو سامنے رکھ لیا، مگر پڑھنے میں اتنی دقت محسوس ہوئی کہ آخر کتاب کو ایک طرف ڈال دیا اور بیزار سا ہو کر ماتھے پر ہاتھ جو مارا تو خوشی سے اچھل پڑا۔ عینک تو عین میری آنکھوں پر ہی لگی ہوئی تھی۔
میں نے ہنستے ہوئے کتاب کو پھر ہاتھ میں لے لیا اور اب کے فر فر پڑھتا چلا گیا۔ کتاب کا مصنف سمجھا رہا تھا کہ پیدائش سے موت تک ہر واقعہ خیالی ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ ہمارا پیدا ہونا اور مرنا بھی۔

وہ بھی

"نہیں" میرا یہ دوست اپنے دوستوں کے رویوں کی نہایت مایوس کن گرداننا تھا۔ "عین موقع پر سبھی نظریں بچا کر نکل جاتے ہیں۔"
میں اپنے ایک خلا باز واقفکار کی باتیں یاد کر کے خاموش نہ رہ سکا۔ "ذرا غور کرو بھائی۔ کروڑوں اربوں سیارے ہمہ وقت خلا میں گھومتے رہتے ہیں اور بعض اوقات ایک دوسرے کے اتنے قریب آجاتے ہیں کہ اس خیال سے سانس پھنسنے لگتی ہے کہیں ایک دوسرے کو چھو نہ جائیں؛ میں نے

ہنس کر اپنے اس دوست سے پوچھا۔ "بڑے طوطا چشم ہیں، پرندے ہوں تو غور کرو، پہلے آجائے : مجھے خود اپنی منطق عجیب معلوم ہونے لگی۔ "انہیں تو صرف اپنے بچاؤ کی فکر لاحق ہوتی ہے، مگر اس کا ملکہ ہمارے بچاؤ کی تدبیر ہو جاتی ہے۔"

جنّت

"اچھا!" خدا مسکرانے لگا تو انگنت ستارے درخشندہ ہو اٹھے۔ "انسان جیتے جی یہاں ساتویں آسمان میں آن بسا ہے؟" کچھ اور کہنے سے پہلے وہ لحظہ بھر رکا۔ "اس کی آل اولاد اب اس لئے ساری کی ساری عمر عبادت میں صرف کیا کرے گی کہ موت کے بعد اُسے" اس نے کرۂ ارض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنا جملہ پورا کیا: "وہاں بسنا نصیب ہو۔"

اپنا اپنا

ایک دفعہ سائبیریا کا ایک باشندہ ہمیں بتا رہا تھا ۔۔ "پھر کیا ہوا کہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایک عجیب و غریب اڑن کھٹولا زمین پر اتر آیا۔ اس اڑن کھٹولے سے دو شکلیں باہر نکلیں۔ بڑی مختلف النوع مخلوق تھی۔ الٹا سیدھا لباس پہن رکھا تھا اور چہروں پر کوئی آلے چڑھا رکھے تھے۔"

"کیا انہوں نے بھی آپ کو دیکھا؟"

"نہیں، میں پاس ہی جھاڑی میں چھپ گیا تھا ۔۔ تھوڑی دیر میں دو میں سے ایک کا آلہ اس کے منہ سے سینے پر گر کر لٹکنے لگا۔ اتنا عجیب چہرہ تھا کہ میرے بیان سے باہر ہے۔ کچھ دیر وہ آپس میں باتیں کرتے رہے۔

"کیا باتیں کرتے رہے؟"

مجھے ان کی زبان تو نہیں آتی مگر جب ایک نے دوسرے کی طرف دیکھ کر چونکی چونکی آواز میں ایک جملہ بولا تو مجھے لگا۔ اُس نے کہا ہے۔ بے وقوف! اپنا آلہ جلدی سے منہ پر چڑھا لو، ورنہ آکسیجن کے زہر سے دَم توڑ دو گے۔

ضمیر

"سمجھ میں نہیں آتا امریکی لوگ اتنے مناظرہ باز کیوں ہیں؟"

"ڈیری سمپل! —— کیونکہ وہ صدقِ دل سے سمجھتے ہیں کہ وہ سچے ہیں —— اور کیونکہ انہیں ڈر سا لگا رہتا ہے کہ ان کا جھوٹ پکڑا جائے گا"

ایبسرڈ

میں اس لئے خودکشی کر رہا ہوں کہ کب تک اپنی غلامی کرتا رہوں۔ میری پیدائش سے آج تک سارا عرصہ یونہی بیتا ہے۔ میں جہاں بھی ہوتا ہوں مجھے اپنی مصاحبت میں موجود رہنا پڑتا ہے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے —— کیا میں محض اس لئے ہوں کہ میر اپل پل اسی چاکری میں صرف ہو، خوابیدہ ہوں یا بیدار، گھڑی بھر بھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ رہوں؟ —— بس یہی میری زندگی ہے؟ میری اپنی کوئی زندگی نہیں؟ —— میں اب صرف اور صرف اپنی زندگی جینا چاہتا ہوں، اس لئے خودکشی کر رہا ہوں ——

نہیں، رحمن بابو

نہیں، رحمٰن بابو، عجز و اختیار کی اپنی اپنی نسبت ہوتی ہے —— نہیں، رو رُو دھو دُو نہیں، چپ ہو جاؤ۔ جوانی کا اختیار چھن گیا تو کیا ہوا؟ —— نہیں بابو، بڑھاپے میں بےچارگی کے احساس سے ہی اختیار عطا ہوتا ہے۔ اب اس عمر میں اپنے عجز کے وسائل کو دل و جان سے لگائے رکھو —— نہیں، یہ وسائل بھی چھن گئے تو مرنے کا حوصلہ کہاں سے لاؤ گے۔

(۲)

نہیں، رحمٰن بابو، اپنے جوان بیٹے کو اپنے ساتھ کشتی سے اتر آنے کو مت کہو —— نہیں بابا۔ اس ٹاپو پر ایک تمہیں ہی اترنا ہے۔ سفر صرف تمہارا ختم ہوا ہے، تمہارے بیٹے کا نہیں۔ اسے تو ابھی سمندر کی متلاطم موجوں پر بہتے چلے جانا ہے —— کہاں؟ —— کہاں؟ —— کیا پتہ، کہاں؟ —— مگر اس کا سفر بھی جہاں ختم ہوگا کشتی وہاں آپ ہی جا لگے گی، سو اُسے اللہ کے بھروسے چھوڑ دو اور اکیلے اتر آؤ۔ —— نہیں، جیسے ہر لحظہ ایک نئی منزل کا سامنا ہو وہ بےچارہ مڑ مڑ کر تمہیں کہاں تک دیکھتا رہے گا! اسے بھی اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ آگے ہی آگے نظر جمائے رکھے —— تو بابو —— اتر آؤ۔

(۳)

نہیں، رحمٰن بابو، معجزوں کا سلسلہ پٹتے وقتوں سنگ مانند اب بھی جوں کا توں جاری ہے۔ معجزے اگر رونما ہو جاتے تو زندگی کب سے اجیرن ہو چکی ہوتی۔ کیا کبھی تمہارے دیکھنے میں آیا ہے کہ مردے جی اٹھیں؟ ــــ ہاں، بھئی، سچ مچ کے مردے ــــ ہاں ہاں، میں نے اپنی ان دو آنکھوں سے دیکھا ــ حکمرانوں نے جب بے گناہوں کو پھانسی پر لٹکانے کے بعد لاشیں حکومت کے ایوان کے باہر پھینکوا دیں تو شہر مرگ میں حرکت کے آثار پیدا ہونے لگے۔ سارے مردے آپ ہی آپ اٹھ کر صف آرا ہو گئے۔ اور حکومت کے ایوان پر ٹوٹ پڑے ــــ نہیں، بابو، میں نے اپنی ان آنکھوں سے دیکھا۔

(۴)

نہیں، رحمٰن بابو، پرانے زمانے کے دکھوں کی وجہ سے ہی تمہارا ماضی ابھی تک تمہارے دل و دماغ میں لہلہا رہا ہے۔ یہی دکھ تمہاری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔ انہیں ہمیشہ اپنے ذہن میں محفوظ رکھو ــــ نہیں بابو، اپنے ماضی کے دکھ بھول کر تم اپنی یادداشت کھو بیٹھو گے۔

برج پریمی میموریل کمیٹی کا قیام

(ن) ۱۵ر نومبر سنہ ۱۹۹۰ء

آج یہاں سرکردہ ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور دانشوروں کی ایک میٹنگ منعقد ہوئی جس میں ریاست کے معروف ادیب، افسانہ نگار اور محقق جناب ڈاکٹر برج پریمی کو خراج عقیدت ادا کیا گیا۔ میٹنگ کی صدارت مقبول شاعر جناب عرش صہبائی نے کی۔ بعد میں فیصلہ کیا گیا کہ "ڈاکٹر برج پریمی میموریل کمیٹی" کے نام سے ایک ادبی تنظیم تشکیل دی جائے۔ جو موصوف کے غیر مطبوعہ مسودات اور مخطوطات کا جائزہ لے گی اور ان کی تفہیم و اشاعت کے لئے کام کرے گی۔

میٹنگ میں نومبر کے آخری ہفتہ میں برج پریمی کی یاد میں ایک تقریب کا انعقاد کیا جائے گا جس میں موصوف کے فن اور شخصیت پر مقالے پڑھے جائیں گے اور بعد میں ایک مشاعرہ بھی ہوگا۔

شروَن کمار ورما

کچی مٹی

(منظر صاحب ! آداب

کہانی حاضر ہے۔ عجیب سے موضوع کا احاطہ کرتی ہے یہ کہانی۔ بچہ ناجائز نہیں ہوتا۔ اور ممتا کا جذبہ تو کبھی ناجائز ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کہانی میں تین عورتیں ہیں۔ خدا نے عورت ہی کو ماں بننے کی توفیق عطا کی ہے لیکن سماج میں با عزت طور پر رہنے کے لئے فطرت کے خلاف چلنے پر بھی آدمی مجبور ہو جاتا ہے۔ ایک ماں، دوسری ماں کی ممتا کا گلا گھونٹ دیتی ہے کیونکہ دوسری ماں، سماج کی نظروں میں ماں، نہیں ہو سکتی۔ میں نے اس کہانی میں یہی سوال پوچھنے کی جرات کی ہے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ سوال بہت خطرناک ہے۔ خاص طور پر ہمارے مشرقی معاشرے میں۔ ایسا معاشرہ جو مرد کی برتری پر کھڑا ہے۔ اس کہانی میں وہ مرد، جو شادی کر کے اس لڑکی سے اپنے بچے کا باپ بھی ہو سکتا تھا۔ غیر حاضر ہے اور کسی کی نظروں میں قصوروار بھی نہیں کہ اسے سزا دینے کا خیال کسی کو نہیں آتا۔ سارا غصہ اور ظلم ایک ایسی ماں کی تقدیر بنتا ہے جو شادی کے بندھن میں نہیں بندھی اور ایک مرد کی ہوس کا شکار ہو گئی۔ مرد نے بڑی چالاکی سے عورت کو عورت کا دشمن بنا دیا ہے۔ ماں کو بیٹی کا۔

امید ہے آپ یہ سوال، سہیل کے قارئین تک پہنچا دیں گے۔) ——————

شروَن کمار ورما

روتا آئی اور پھر بستر پہ ڈھیر ہو گئی

وہ بہت سوچتی کہ اسے کیا ہوا ہے۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ بس اندر جیسے کچھ سرکتا اور ٹھہر جاتا، رگوں میں خون کی رفتار اور حرارت بڑھ جاتی۔ بدن تھکا تھکا سا محسوس ہونے لگتا۔ ابکائیاں آتیں۔ جی متلاتا اور قے سی آنے کو ہوتی۔ کھٹی چیزیں کھانے کو من مچلتا۔ ماں کی نظر بچا کر وہ املی اور چولہے کی مٹی کھا لیتی۔ یوں تو وہ کئی مرتبہ بیمار ہوئی تھی — سردرد، پیٹ کی خرابی۔ بخار۔ لیکن یہ کیفیت عجیب تھی۔

اب اس کا [illegible] بستر پر تو ... میں نہیں لگتا تھا۔ عجیب سی سوچیں اسے گھیر لیتیں۔ سامنے خالی دیوار پر کئی منظر اُبھرنے لگتے۔ ایک تنہا راستہ، دو طرفہ سایہ دار درخت،

— پھر یہ سب کچھ ایک عجیب جنگل کا روپ لے
بستانے میں کسی کے آہستہ آہستہ رونے کی آواز
- پھر کچھ خوش نوا پرند چہچہانے لگتے۔ پھر دیوار
ا۔

آج صبح اس کی طبیعت کچھ زیادہ ہی بگڑی بگڑی
۔ اس کا جی متلایا اور وہ نالی پر جا بیٹھی۔ ذرا سا
نکلا۔ لیکن پیٹ میں جیسے گھڑا بھرا رکھا تھا جو چلتی
ں رکھے پانی کے مٹکے کی طرح چھلک چھلک جانے کو
تھا۔

ماں غسل خانے سے نکلی اور اسے دیکھ کر ٹھٹھک

"اری، کیا ہوا تجھے —؟ پھر اس کے زرد چہرے،
آنکھیں اور پسینے سے تربتر جسم کو دیکھ کر جیسے ڈر گئی
آنکھوں میں شک کی ہلکی سی پرچھائیں ابھری، در ڈوب
سے دل و دماغ نے اسے گوارا نہیں کیا۔ ماں نے روتا
نی چھوکر خوف سے پوچھا: "کیا کھایا تھا جو یہ الٹیاں
رہی ہے؟"
"کچھ نہیں —" رتنا خود خوفزدہ تھی۔ "دل گھبرائے جا
۔ گبیرے پڑ رہے ہیں۔"

ماں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا، ہونٹ دیکھے اور
رے میں لے گئی، گم صم سی اسے دیکھتی رہی۔ پھر سر تھام
سا بیٹھ گئی۔ رتنا ڈر گئی۔
"یہ کیا کر آئی ہے مرن جوگی؟" آخر ماں نے روہانسی
میں کہا۔ "تو نے تو ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔"
رتنا جیسے کسی اندھے کنوئیں میں گر گئی۔ دل تھا کہ مری
چڑیا کی طرح سینے کے گھونسلے میں پڑا تھا۔ وہ رونے

"اری رانڈ، رو پھر لیجو۔" ماں نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔
"رونے کو ساری عمر پڑی ہے منہ سے تو کچھ بول۔"
ماں نے پہلی بار اسے گالی دی تھی۔ رتنا اور بھی تیزی
سے رونے لگی۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ ماں کیا پوچھ رہی تھی
کیا کیا تھا۔ اس نے ماں کے بار بار پوچھنے اور دو ہتڑ مارنے
پر اس نے بتا دیا۔
"کل اسکول میں کڑھی کھائی تھی۔"
"کڑھی کی بچی۔ کون تھا وہ — کس کے ساتھ۔"
کون تھا — اور اسے اپنی سہیلی کرن کے بھائی
اوتار کا خیال آیا۔ لیکن اوتار کا اس کی الٹیوں اور گھبراہٹ
سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ جب بخار ہوا تھا تو قے بھی ہوئی
تھی تب تو ماں نے یہ سب نہیں پوچھا تھا۔
وہ تو کرن کے گھر کتاب لینے گئی تھی۔ دروازہ
اوتار نے کھولا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ کرن اوپر کمرے میں ہے۔
وہ اوتار کے ساتھ کمرے میں گئی تھی اور — اوتار نے کہا
تھا رو نہیں، کچھ نہیں ہوگا — اوتار نے اس بارے میں کسی سے
بھی بات کرنے کو منع کیا تھا۔
"بولتی ہے کہ نہیں —" ماں نے لوہے کی سلاخ اٹھا لی
تھی۔ "کیا نام ہے اس کا، کہاں گئی تھی تو، کس کے ساتھ گئی
تھی —؟"
"اوتار —" رتنا ایک دم زرد پڑ گئی تھی۔ "میں کتاب
لینے گئی تھی کرن سے، اوتار نے زبردستی —" پھر رونے لگی۔
ماں جیسے تھک گئی تھی۔ اب وہ اپنی آنکھیں پونچھ
رہی تھی، وہ رتنا کی طرف دیکھتی اور نظریں جھکا لیتی۔ اس
کے لب ہلتے اور بے حرکت ہو جاتے آخر اس نے دھیرے
سے پوچھا۔
"کتنے دن ہو گئے —؟"

"اوتار نے کہا تھا کسی سے نہ کہنا، ورنہ پتا جی ماریں گے۔"
"میں پوچھتی ہوں دن کتنے ہو گئے؟"
[illegible] رما کچھ نہیں سکی تھی، بس پریشان سی ماں کو [illegible] رہی۔ پھر بولی۔
"یاد نہیں۔"

"تیرا ستیاناس ہو۔" ماں نے پھر سر اٹھایا۔ "جانتی ہے کہ نہیں۔ ۔۔۔ بھگوان، کہاں ڈوب مری جا کر۔ تیرا باپ سنے گا تو زہر کھا لے گا یا اس اوتار کا خون کر دے گا۔ اری بولتی کیوں نہیں؟"

رما کو وہیں چھوڑ کر ماں کچن میں گئی اور کوئی سفوف لے آئی۔ ماں کے کہنے پر رما نے وہ کسیلا سفوف نگل لیا۔
"کچھ ہو تو بتا دیجیو۔"

رات کو ماں پتا جی سے دھیرے دھیرے باتیں کرتی تھی۔ وہ بار بار غصہ میں آجاتے۔ کبھی گالیاں دیتے۔ کبھی جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دیتے، ماں انہیں بار بار پکڑ کر بٹھا لیتی۔ رما کو کچھ نہیں معلوم۔ ابھی جو وہ کی تو ہے ساری۔ لیکن۔

وہ ساری رات جاگتی رہی۔ شاید ماں اور پتا جی بھی۔

اب گھر میں عجیب سا سناٹا طاری رہتا۔ ماں اور پتا جی عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتے۔ پتا جی نے تو اس سے بات کرنا تقریباً بند کر دیا تھا۔ ماں عجیب عجیب سے سوال کرتی۔ اسے اسکول سے ہٹا لیا گیا تھا۔ باہر بھی نہیں جانے دیا جاتا تھا۔ ماں اسے کئی قسم کے سفوف اور دوائیاں کھلا چکی۔ بس ایک سوال، 'ہوا کچھ؟' اس کی 'نہیں' سن کر وہ جیسے ایک دم تھک ٹوٹ کر بیٹھ جاتی۔ اور پھر وہی [illegible]

رما کو لگتا اس کے اندر کچھ مسلسل بڑھ رہا ہے۔ جیسے پھول کھل رہے ہوں، جنگل اگ رہا ہو۔ وہ اپنی کسی ہم لڑکی کو دیکھتی تو عجیب سا احساس ہوتا۔ جیسے وہ لڑکی خالی ہو اور وہ خود بھری بھری سی۔
بچے پر کوئی دوا اثر ہی نہیں کرتی۔ کئی دن بعد ماں نے کہا: "اپنا کیا بھگت رہی ہے، یہ موا پیٹ کا بچہ کیسے ضائع ہوگا؟"

اور اس رات رما دیر تک جاگتی رہی۔ بار بار اس کا ہاتھ پیٹ پر چلا جاتا۔ اس کے پیٹ میں بچہ کہاں سے آگیا۔ وہ حیرت سے سوچتی۔ پھر اسے ہلکی سی خوشی کا احساس ہوتا۔ وہ باقی سب لڑکیوں سے الگ اور بڑی ہے۔ اس نے پڑھا تھا کہ شہزادی کنتی نے سورج دیوتا کی آرادھنا کی تھی اور اس کے کرن پیدا ہوا تھا۔ جسے اس نے ٹوکری میں رکھ کر ندی میں بہا دیا تھا۔ اس نے چاند کی طرف دیکھا تھا، جو اس کی کھڑکی کے سامنے آکر جیسے ٹھہر گیا تھا۔ بچہ پیٹ میں کیسے رہتا ہے! کئی سال ہوئے، تب وہ بچی تھی ـــ ایک صبح اس نے ماں کے پہلو میں خوبصورت سا بچہ دیکھا تھا۔ پوچھنے پر ماں نے اس کا گال تھپتھپا کر بتایا تھا کہ پچھلی رات چندا ماموں اسے یہ بھائی دے گئے تھے۔ لیکن اس کے پیٹ میں کیوں رکھ گئے چندا ماموں یہ بچہ! رانی کے گھر لڑکا ہوا تھا تو اس کی ماں نے محلے میں لڈو بانٹے تھے ـــ اسے خواہش ہوئی کہ جلدی سے اپنے پیٹ کا بچہ دیکھ لے۔ پھر چاند میں ایک بہت ہی پیارے، گورے، صحت مند بچے کی شبیہ ابھری۔ اس نے بازو ادھر پھیلائے اور رونے لگی۔

ماں نے نرم، ملائم، گلابی اون کا ننھا سا سوئٹر اور جھبلا [illegible] اس کے بھائی کے آنے سے پہلے اس کی ماں

نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ اس نے الماری سے اون نکالکر
جب ماں نے دیکھا تو جیسے بھوکی شیرنی کی طرح جھپٹ کر
سب کچھ چھین لیا۔
"کمبخت، بے شرم، یہ کیا کر رہی ہے — خبردار جو"
وہ روتی رہی اور رات کو کھڑکی سے چاند کو دیکھتی
رہی، اب وہ روز ایسا کرنے لگی تھی۔ لیکن چاند گھٹنے لگا
تھا اور ایک رات بالکل نظر ہی نہیں آیا۔ اس رات رما
بے حد ڈر لگا۔ اس نے بھگوان کرشن کے کلنڈر کی
طرف دیکھ کر دعا کی کہ اس کا بچہ خوب گورا چٹا خوبصورت
اور صحت مند ہو تاکہ سب اسے پیار کریں۔ لئے لئے پھریں۔
لیکن جب وہ ماں کے منہ سے بچے کے بارے میں بری بری
باتیں اور گالیاں سنتی تو ڈر جاتی اور تنہائی میں رو لیتی۔
پھر ماں اور پتا جی اسے شہر سے باہر لے گئے۔ ان کے
رہنے کا انتظام کر کے باپ واپس چلا گیا۔ ایک موٹی باتونی،
تجربہ کار عورت اسے روز دیکھنے آتی۔ رما کو اپنے بڑھتے پیٹ
کے ساتھ ایک عجیب سے نرم، محبت بھرے جذبے کا احساس
ہوتا۔ لگتا اس کے اندر دو باہیں اسے تلاش کر رہی ہیں۔
اب ان دو باہوں نے اسے تکلیف دینا شروع
کر دیا تھا۔ وہ درد سے نڈھال ہو جاتی۔ وہ موٹی عورت
ہنس ہنس کر اس کی ماں سے باتیں کرتی اور اپنے انعام کی یاد
دلاتی، ماں وعدہ نبھانے کی بات کرتی۔
"بے بے فکر مت کر، یہ بلا ٹل جائے۔ میں تیرا گھر بھر دونگی۔"
اور وہ اوتار کی ماں بہنوں کو گالیاں دیتی۔ کپڑے، پڑیا، آگ
اور جانے کیا کیا۔
نہ جانے کیوں رما چاہتی کہ ماں یہ سب نہ کہے
ماں، وہ عورت اور خود رما جس گھڑی کا انتظار
کر رہی تھی، آخر آ پہنچی۔۔۔ رما تکلیف سے بلبلا اٹھی، جیسے

بے ہوش ہو گئی۔ پھر اس کے کانوں نے ہلکی سی چیخ سنی اور
پھر سناٹا۔ آنکھیں کھولیں تو ماں مسکرا رہی تھی۔
"بڑا خوبصورت، بالکل چاند سا تھا۔" وہ عورت بتا
رہی تھی۔
"لے جاؤ، ندی میں پھینک آؤ۔" ماں نے منہ پھیر کر کہا۔
"نہیں ماں" رما کے لبوں سے آپ سے آپ نکل گیا
اور اس کی باہیں بوری میں لپٹے مردہ جسم کی طرف اٹھ گئیں،
جو اس تجربہ کار عورت کے باہوں میں تھا۔



محمد خالد عابدی

وجاہت مرزا صاحب چنگیزی

سے ایک انٹرویو

محمد خالد عابدی :- آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے ؟

وجاہت مرزا :- سیتاپور ۲۰ اپریل دوشنبہ ۱۹۰۸ء زیادہ عرصہ لکھنؤ رہا اور تعلیم وہیں پائی۔

عابدی :- آپ نام کے ساتھ "چنگیزی" کس رعایت سے لکھتے ہیں ؟

مرزا :- میرے پاس شجرہ موجود ہے۔ میں چنگیز خاں کے سب سے چھوٹے بیٹے ہلاکو خاں کی اولاد سے ہوں۔

عابدی :- آپ ادب سے فلم میں کس طرح آئے ؟

مرزا :- مجھے ادب سے کبھی بھی کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی نہ میں نے کبھی کوئی ناول لکھا نہ مضمون۔

عابدی :- کیا آپ کو فلموں میں آنے سے پہلے ڈراموں سے [illegible]

مرزا :- مجھے تھیٹر کی کمپنیوں سے کافی دلچسپی رہی ہے مگر [illegible] صرف کامیڈی پورشن سے ٹریجک سینوں میں umm ational - سمجھتا تھا مجھے ہنسی آتی تھی جب بلند آواز سے ڈرامائی سین ادا کئے جاتے تھے۔

عابدی :- بہ حیثیت مکالمہ نویس، آپ کی پہلی فلم ؟

مرزا :- کلکتہ ایسٹ انڈیا فلم کمپنی میں ۱۹۳۲ء میں میں نے "آب حیات" فلم کے مکالمے لکھے تھے۔ وہ اس قدر پسند کئے گئے کہ اس کے بعد میں مستقل مکالمہ نویس ہو گیا۔

عابدی :- "گفتگو" اور "مکالمہ" میں کیا بنیادی فرق ہوتا ہے ؟

مرزا :- گفتگو، فارسی ہے، مکالمہ عربی ہے۔ دونوں کے معنی بات چیت کے ہیں۔ مکالمے کے لغوی معنی دو یا دو سے زیادہ لوگوں میں بات چیت کے ہیں۔ فلمی مکالمہ چند مختلف سینوں کے مخصوص موضوع پر گفتگو کے ہیں۔

عابدی :- مکالمہ کی جامع اور مستند تعریف کیا ہو سکتی ہے؟

مرزا :- صرف بات چیت، میرے خیال میں۔

عابدی :- فلموں میں Additional Dialogue writer کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے ؟

مرزا :- پر ڈائیلاگ رائٹر شوٹنگ کے وقت "سیٹ" پر حاضر نہیں رہ سکتا۔ اس لئے کوئی معمولی شخص رکھ لیا جاتا ہے جو ضرورت کے وقت ایک دو ڈائیلاگ لکھ دیتا ہے۔

عابدی :- کیا آپ مکالمے لکھتے وقت فلم ایکٹر یا ایکٹریس وغیرہ کی شخصیت اور اس کی نفسیات وغیرہ پر غائر نظر رکھتے ہیں؟

مرزا :- یقیناً، یہ ضروری ہے۔

عابدی :- کیا آپ نے اپنے مکالموں میں کسی ہیرو یا ہیروئن کے کہنے پر کبھی رد و بدل وغیرہ بھی کی ہے؟

مرزا :- یہ بھی ضروری ہے۔ بعض آرٹسٹوں کو کچھ ڈائیلاگ بولنے میں تکلف ہوتا ہے تو ایسی صورت میں معمولی تبدیلی کرنی پڑتی ہے۔

عابدی :- بحیثیت مکالمہ نگار کے آپ کے ذاتی تجربات کیا ہیں؟

مرزا :- جواب تفصیل طلب ہیں۔ مختصر یہ کہ مکالمے کردار کی حیثیت کے اعتبار سے ہونا چاہئے۔ مثلاً مالک اور نوکر، کاروباری لوگ، مہاجن، مزدور وغیرہ۔ اصل گر یہ ہے کہ مکالمے مختصر ہونا چاہئے اور کم عبارت میں زیادہ مفہوم نکلنا چاہئے۔

عابدی :- اور بحیثیت کہانی نویس آپ کی پہلی فلم کونسی تھی؟

مرزا :- میں نے ایک فلم "جوانی" نیشنل میں ڈائرکٹ کی تھی۔ وہ میری ہی کہانی تھی۔ میں نے جتنی کہانیوں کے ڈائیلاگ لکھے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں بھی میرا کافی حصہ ہے۔

عابدی :- مجھے خیال ہے کہ آپ بحیثیت ہدایت کار کے بھی فلموں میں رہے اور غالباً فلم "پربھو کا گھر" اور "جنت" وغیرہ فلمیں آپ کی ہدایت میں تیار ہوئی تھیں، تو میں یہ جاننا چاہوں گا کہ ہدایت کار کی حیثیت سے آپ کی پہلی فلم کونسی تھی؟

مرزا :- صرف "پربھو کا گھر" میری کہانی تھی، "رنجیت" میں، میں ہی ڈائریکٹ کر رہا تھا مگر بیچ سے چھوڑ کر نکل گیا تھا۔ "جنت" سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ میرا پہلا ڈائرکشن "جوانی" فلم میں تھا۔

عابدی :- آپ نے فلموں کے لئے منظر نامے بھی لکھے ہیں، کچھ فلموں کے نام بتا سکیں گے؟

مرزا :- میں نے جتنے فلموں کے ڈائیلاگ لکھے ہیں ان کے "اسکرین پلے" میں نے ڈائرکٹر کے ساتھ مل کر لکھے ہیں مثلاً "عورت"، "مدر انڈیا"، "کوہ نور"، "گنگا جمنا" اور "مغل اعظم" وغیرہ۔

عابدی :- منظر نامہ (اسکرین پلے) کی تعریف کیا ہے اور یہ کس طرح تیار کیا جاتا ہے؟

مرزا :- اسکرین پلے اس مسودے کو کہتے ہیں جس میں کہانی کو چار سینوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ہر سین کا بزنس تفصیل سے کہا جاتا ہے۔ سین میں جن خاص چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی لکھ دی جاتی ہیں۔ کرداروں کے خاص ایکشن بھی ہوتے ہیں۔ بمبئی میں اب بھی ڈائریکٹر اور مکالمہ نویس مل کر اسکرین پلے لکھ لیتے ہیں۔

عابدی :- کیا "مکالمہ" منظر نامہ سے الگ ایک آزاد فن ہے یا منظر نامے کا ایک حصہ اور متبادل؟

مرزا :- امریکہ وغیرہ میں اسکرین پلے میں عموماً ڈائیلاگ بھی ہوتے ہیں مگر ہندوستان میں شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے۔ اسکرین پلے ڈائیلاگ رائٹر کو دے دیا جاتا ہے وہ ڈائیلاگ لکھتا ہے۔

عابدی :- کہانی و منظر نامے میں مکالمے کا کیا اہم رول ہوتا ہے ؟

مرزا :- بغیر منظر نامے کے ڈائیلاگ نہیں لکھے جا سکتے۔ اسکرین پلے رائٹر دو ایک ڈائیلاگ اشارتاً لکھ دیتا ہے۔ مکالمہ نویس انہیں اپنے رنگ میں لکھتا ہے۔

عابدی :- فلم اسکرین پر منظر نامہ کس شکل میں دیکھا جا سکتا ہے یا یہ فن قلم بندی کے وقت صرف صفحۂ قرطاس پر ہی رہتا ہے ؟

مرزا :- ڈائیلاگ لکھنے کے بعد اسکرین پلے کا کام بہت کم رہ جاتا ہے۔ اسکرین پلے کی خوبی سینوں کی چستی اور کہانی کے تسلسل میں دیکھی جا سکتی ہے۔

عابدی :- فرض کیجئے کہ ایک فلم بنگالی یا ملیالم وغیرہ زبان میں مقبول ہوتی ہے۔ وہی فلم جب ہندی/اردو میں بنائی جاتی ہے تو اس وقت اس کے مکالموں کا ترجمہ کیا جاتا ہے یا از سر نو لکھے جائیں گے ؟

مرزا :- میں نے کبھی کوئی ایسا فلم نہیں لکھا۔ میرے خیال میں زیادہ تر لوگ ترجمہ ہی کرتے ہیں۔

عابدی :- کیا آپ منشی شمس لکھنوی سے واقف ہیں ان کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کر دیجئے۔

مرزا :- شمس صاحب میرے دوستوں میں تھے۔ اسٹیج کے آدمی تھے۔ اسٹیجی ڈائیلاگ بھی لکھتے تھے۔ کہانیاں بھی لکھتے تھے۔ سناتے تھے۔ خوب تھے۔ "شہنشاہ بابر" انہیں کی جو ہم دونوں نے مل کر بنائی تھی اور میں نے ہی ڈائریکٹ کی تھی رنجیت میں میران کا ساتھ "شہنشاہ بابر" کی شوٹنگ کے دوران کوئی تین چار مہینے رہا۔ موصوف لکھنؤ کے شہزادہ نواب ممتاز الدولہ کے خاندان سے تھے۔ اپنا کیریر Career اسٹیج سے شروع کیا تھا۔ جب تھیٹر ختم ہو گئے تو فلمی کہانیاں اور ڈائیلاگ لکھنے لگے۔ مجھ سے کافی Senior تھے۔ ان کی بہترین خصوصیت اسٹوری سنانا اور بیچنا تھی۔ بڑے زور و شور سے ایکٹنگ کر کے سناتے تھے۔ یہاں تک کہ اگر ٹریجڈی سین سناتے تھے تو رو بھی دیتے تھے۔ جہاں تک اسٹوری بیچنے کا تعلق ہے انہوں نے کافی اسٹوریاں بیچی تھی مگر بنی بہت کم تھیں۔ مجھے ان کی بنی ہوئی کہانیوں میں سے سوائے "جہیز" کے اور کوئی یاد نہیں ہے۔ بہرحال آدمی نہایت دلچسپ تھے۔

عابدی :- کیا وجہ ہے کہ اب فلم اسکرین پر اور اخبار و رسائل میں آپ کے نام کے ساتھ "چنگیزی" استعمال نہیں ہو رہا ہے ؟

مرزا :- میں نے اس امر پر کوئی توجہ نہیں کی۔ اخبار والے تو بعض اوقات "وجاہت" کو "وزاہت" بھی لکھ دیتے ہیں۔

عابدی :- اردو زبان کے بغیر فلم کی مقبولیت اور کامیابی مشکوک ہے۔ کیا یہ دعویٰ درست ہے ؟

مرزا :- بالکل صحیح ہے۔

سید احمد شمیم

جینے کی ادا کا شاعر منظر شہاب

منظر شہاب کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ ان
وجود کا کوئی لازمی حصہ ان کی ذات سے ٹوٹ کر جدا ہوگیا ہے
جو اب بھی یادوں کے مدار میں گردش کرتا رہتا ہے۔ کبھی
قریب آتا ہے کبھی دور چلا جاتا ہے۔ پانے اور کھونے کی لذت
اذیت سے منظر شہاب کی شاعری کا منظر نامہ ابھرتا ہے
اس ٹوٹے ہوئے حصے کو گرفت میں لینا اس لئے دشوار ہے

" ساتھ یوں بھی گذرتا ہے سر کوچۂ عشق
ایک چاہت کئی محبوب میں بٹ جاتی ہے "

یوں بھی منظر شہاب
" زندگی اور ادب کو معلوم سے نامعلوم کے دو طرفہ
اتی اور منفی سفر کرنے " کا عمل سمجھتے ہیں اور زندگی کی
طرح ادب کو بھی کسی مخصوص رنگ میں مقید نہیں مانتے۔
وجہ ہے کہ ان کے یہاں ایک دھنک رنگ کیفیت ابھرتی

جنہاں خاطر پر ان کی شعری کردار کی تعمیر رومانی عنصر

سے ہوئی ہے۔ مگر انہیں وہ ذہن بھی نصیب ہے جو عمل
کو ردعمل سے جدا کر کے دیکھنے کا عادی نہیں ہے۔ انہوں نے
زندگی کو " اختلاف معانی " کے حوالے سے سمجھا ہے اور فنکار کو
حرف کی جادوگری اور آہنگ کے عشوہ طرازی کا رمز شناس ہونا"
لازمی مانا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کا یہ بھی یقین ہے کہ ایسے
موضوعات جو سماجی ارتقا میں خارج ہوں تخلیقی ادب
کی سطح کو پست کر دیتے ہیں: شاید یہی وجہ ہے کہ منظر
شہاب نے کبھی " ذات کے حبس " اور " انانیت کی قبر " کو
جائے عافیت میں زرد پتوں کی طرح بکھر کر بھی اپنے
میں تلسی کا ایک ننھا سا پودا اگانے کی تمنا کرتے ہیں۔ اور
تیغ ستم سے جنا جنا ہو کر بھی درد کا لمحہ زرنگار کرتے ہیں۔
ان کی آنکھیں درد کی خانقاہوں میں بھی پھولوں کے جیسا
دیکھتی ہیں۔ شاید اسی لئے منظر شہاب اس وقت بھی ذات
اور کائنات سے وابستہ رہے جبکہ ان کے اکثر ناموں ہم
عصروں نے جدیدیت کی چکاچوند میں اپنے جیسے بدل لئے
یہ حقیقت اپنے آپ میں کچھ کم دلنواز نہیں ہے کہ زندگی کی قدر

بنانے کے خواب ان کی آنکھیں کبھی نہیں بھولیں۔ اور یہ خواب کبھی معشوق ستم شعار اور کبھی حسن بہار کی صورت ان کے دل میں پرورش پاتے رہے۔

جب مقصد خواب اور خواب محبوب بن جائے تو نظر خبر بن جاتی ہے۔ اور اظہار انکشاف کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ پھر آواز اپنی اصل میں انقلابی ہو کر بھی عرفانی محسوس ہونے لگتی ہے۔ منظر شہاب نے بھی وابستگی کے باوجود خود کو وفاداری بشرطِ استواری سے محفوظ اور تبلیغ سے بچا کر رکھا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ کسی شاعر کے مزاج کی پہچان میں سب سے زیادہ مدد اس کی نظموں سے ہوتی ہے۔ غزل میں شاعر لمحہ بھر کے لئے اپنی جھلک دکھاتا ہے اور غائب ہو جاتا ہے مگر نظموں میں نقاب اور ہٹ کر بھی کھل کھل جاتا ہے۔

"پیراہنِ جاں" منظر شہاب کے بیالیس سالہ ذہنی سفر اور شعری تجربات کا حاصل ہے۔ جس میں کل ۴۲ نظمیں بیالیس غزلیں، دو گیت، تین آزاد قطعات اور کچھ رباعیات ہیں ظاہر ہے اتنی طویل مدت کے پیشِ نظر یہ سرمایہ کوئی زیادہ نہیں۔ اتنے عرصے میں تو ان کے بعض ہمعصروں نے کوئی نصف درجن مجموعے شائع کرائے ہیں۔ گویا منظر شہاب کو کارِ زمانہ نے بیانِ شوق کا موقع بہت ہی کم دیا۔

"پیراہنِ جاں" کی پہلی نظم "سنہرے لمحے" ہے۔ جس میں وقت کے خرامِ رواں دواں کے ساتھ ساتھ کائنات کے رُخ جمال کے سنور جانے کی خوشخبری سنائی گئی ہے۔ یہ آزاد ہیئت میں ایک مختصر مگر جاذب توجہ نظم ہے۔ جو حقیقتاً منظر شہاب کے پورے شعری مزاج کا اشاریہ بھی ہے۔

"پیراہنِ جاں" کی خوبصورت نظموں میں "ایک رات" "چاندنی رات" اور "چاندنی رات" لفظ اور معنی، اسلوب اور ہیئت کے اعتبار سے سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔

"ایک رات" کا موضوع امن ہے اور اس موضوع پر ایک زمانے میں تقریباً ہر شاعر نے طبع آزمائی کی ہے مگر لفظوں کی تراشیدگی، پیکروں کی دلنوازی، تشبیہوں کی تازگی اور استعاروں کی تازہ کاری کے اعتبار سے "ایک رات" ایک شاہکار نظم ہے جس کی طلسماتی فضا میں پڑھنے والا خود گم ہو جاتا ہے۔

سیاہ شب ہے، خاموشی نے ہر سمت پنکھ پھیلائے ہیں۔ جمال شہر کو اندھیروں کی چوٹ نے گھائل کر دیا ہے۔ سجی سجائی دکانیں، قمقموں کے ہجوم، گل رخوں کے گلستاں، گیسوؤں کی بہار، صندلیں رخسار، شاخ بازوئے تاباں سب کے سب سو گئے ہیں۔ شاعر اپنے افکار کی مدھم لطیف لہروں پر دلِ حزیں میں سینکڑوں غم لئے پلکوں پر لرزتے ہوئے دیپ جلائے جاگ رہا ہے۔ اسے دکھ ہے اس کا یہ خوبصورت شہر اور شہر کی فضائیں اور فضا میں پھیلتا ہوا گنگا کی بانسری کا راگ، آسمانوں پر دبے پاؤں کہکشاؤں کا سفر، اسپتالوں کتب خانوں، کالجوں کی قطاریں، پرسکون ہوسٹل اور ہوسٹل میں رہنے والے شوخ و شنگ لڑکے جو اپنی اپنی آنکھوں میں آنے والی سنہری زندگیوں کے خواب بسائے ہوئے ہیں۔ اور دور بہت دور کسی کی نرگسی آنکھوں کی مشتعل تنویر مخملیں زلفوں کا رینگتا ہوا لمس، رس گھولتی ہوئی ہونٹوں کی کلیاں ——
اگر جنگ چھڑ گئی تو ان ساری خوبصورت چیزوں کا انجام کیا ہوگا۔ اس سوال کے ساتھ نظم ختم ہو جاتی ہے اور دلوں میں ہزاروں جاں گسل سوالات جنم دے جاتی ہے

منظر شہاب کو پیکر تراشی اور فضا آفرینی سے ایک فطری لگاؤ سا معلوم ہوتا ہے۔ ان کی نظم "چاندنی رات" بھی اس کی ایک خوبصورت مثال ہے اس میں بھی ایک دلکش طلسماتی رات کی تصویر کشی کی گئی ہے رات کا عالم ہے،

ہ سہیل گیا

ن سیں تو دیجارسوکائنات جیسے کنول میں سلا ہوا
رہے ۔ دورنیل گگن میں چاندنی کی کشتی بہشت کا مانجھی
لہا ہے ۔ کہیں کہیں روئی کے گالوں کی طرح شفاف ابر کے
ہ ٹکڑے تیر رہے ہیں ۔ جیوتی کا قی زمزمے سناتی دھرتی
د میں کھٹولے پر ایک معصوم چاند کا ٹکڑا سو رہا ہے ۔
ہی ماں اپنا سمٹا سمٹا وجود لئے لیٹی ہے جس کا آنچل
ں میں بھیگا ہے اور نینوں میں کاجل پھیلا پھیلا ہے ماں
س تقدس حسن اور بچے کی معصومیت نے حسن کائنات
یفت اور ربودگی پیدا کر دی ہے ایسے میں کوئی شخص اگر
آرزو کر سکتا ہے تو یہی کہ

گردش وقت کاش تھم جاتی
صبح آتی نہ کوئی شام آتی

عشقیہ جذبات کی حامل نظموں میں "مشورہ" لہجے
خی، برجستگی اور تیکھے پن کی عمدہ مثال ہے ۔ زیریں لہروں
ایک گہری اذیت بھی محسوس ہوتی ہے شاعر نے اپنی محرومی
چھپانے کے لئے شاید شوخ لہجہ اختیار کر لیا ہے ۔

تم بھی گستاخ اداؤں کو سکھاؤ تہذیب
شوخ جذبات کو سنجیدہ بناؤں میں بھی
معتدل تم بھی بناؤ بت کافر کا مزاج
عقل کی راہ محبت کو دکھاؤں میں بھی

مورہ" کے برخلاف "لہو ترنگ" میں کسک اور درد کی
تیز ہوتی ہے اور نظم "میں کیا لکھوں" خطا کے پیرائے میں
گئی ہے ۔ وقت کی بے رحمی، کبھی ہوئی شبوں اور اُجاڑ
ن کا ماتم کیا گیا ہے اور درد کے اس شعر پر نظم ختم ہوتی ہے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

تازی لیلی اور گذرے ایام کو صدا دیں" بھی عشقیہ نظمیں

ہیں ۔ مگر ان میں کوئی ارفع اور گہرا تجربہ نہیں ہے ۔ احساس
جمال کی تازگی کی وجہ سے دلکشی سی پیدا ہو گئی ہے ۔ اس کے
سوا ان میں کوئی خاص بات نہیں ہے ۔

"جشن کی رات" "ساقی نامہ" "حکم امتناعی" اور
"نگار زیست تجھے کچھ خبر بھی ہو کہ نہ ہو" ترقی پسندانہ خیالات
بلکہ اشتراکی نظریات کی نظمیں ہیں ۔ جشن کی رات میں اُجالے
کے اندر پوشیدہ تاریکی کا چہرہ دکھایا گیا ہے ۔ فیض نے اسی کو
داغ داغ اجالا کہا تھا اور منظر شہاب نے یوں بیان کیا
ہے ۔

لیکن اے دوست، شب تار کا منظر ہے وہی
دشت افلاک وہی وقت کا خنجر ہے وہی
اب بھی مفلوج ہیں محفل کے رباب و طاؤس
مضمحل شوق کی شہ رگ میں لہو ہے اب تک
جشن کی رات ابھی خواب کی منزل میں ہے

"نگار زیست تجھے کچھ خبر بھی ہو کہ نہ ہو" میں جذبات کی
شعلگی نے شخصیت کا رجحان اختیار کر لیا ہے غم کا زہریلا
اور حالات کی ستم ظریفی کا احساس دلوں کو اسی درجہ دھیمی آنچ
سے پگھلاتا ہے ۔ یہ خوبصورت اور جادو اثر تکنیک ہے منظر
منظر شہاب کی سیاسی نظموں میں سب سے زیادہ اہم
"ساقی نامہ" ہے ۔ یہ زور بیان اور تخلیقی حسن کا خوبصورت
مرقع ہے ۔ روانی ہے کہ اقبال کے "ساقی نامہ" سے کسی طرح
پیچھے نہیں رہتی ۔ اقبال نے جو کام عشق سے لیا ہے منظر شہاب وہی
کام مسرت سے لیا ہے ۔ لیکن عشق میں جو ماورائیت
ہے وہ مسرت میں نہیں ہے ۔ دراصل یہ اقبال کی
مادی روحانیت اور منظر شہاب کی روحانی مادیت کا فرق
ہے ۔ اقبال کے "ساقی نامہ" کی کائنات وسیع تر ہے جب کہ
منظر شہاب کے ساقی نامہ کی دنیا محدود ہے ۔

منظر شہاب نے اپنے سیاسی نظریات کی سزا میں زنداں کی سیاہ راتیں اور الم ناک دن بھی گذارے مگر پھر بھی وہ اپنے نظریے کے معاملے میں سخت گیر نہیں ہیں۔ ذہن کا دریچہ کھلا رکھا ہے۔ چنانچہ نظم "دو ملک، دو کہانی" جو ہندوستان پر چینی حملہ کے خلاف کہی گئی ہے، شبہات کا نشان بن کر ابھرتی ہے ان کے وجدان نے ایک جو تھائی صدی قبل وہ محسوس کر لیا تھا جس سے آج کی اشتراکی دنیا دوچار ہے۔

دم بخود ہے اشتراکی فکر گاہ
منتشر مسلک کی جمعیت ہوئی
جس کی اک اک بوند کو امرت کہیں
مشتبہ اس جام کی صحت ہوئی

پیراہن جاں کی نظموں میں "ایک تہنیتی نظم"، "بوئے خلوص" اور "دیو ہیم چند" واقعاتی اور شخصی نظمیں ہیں۔ ظاہر ہے ان کا دائرہ محدود ہے۔ تہنیتی نظم، مشہور شاعر مظہر امام کی شادی کے موقع پر کہی گئی۔ مسدس کی ہیئت میں یہ نظم انتہائی خوبصورت ہے۔ الفاظ کی شوکت اور بیان کی قدرت قابل داد ہے۔ "بوئے خلوص" اشتراکی دانشور محمد عالم کے نام ہے اس میں جذبے کی آنچ دھیمی ہے مگر گہرائی تک اترتی ہے۔ ان نظموں کے برخلاف "ماتم زندگی الوزکا" اور "شجر کے چوتھے جگنو کا سفر" حادثاتی نظمیں ہیں جن سے شاعر کی دردمندی جھلکتی ہے مگر وسعت اور آفاقیت کم ہے۔

"پیراہن جاں" کا پہلا حصہ نظموں کا ہے۔ پھر رباعیات آزاد قطعات اور دو گیت ہیں۔ سب سے آخر میں غزلیں ہیں اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شاعر نے اپنی غزلوں کو بعد کا لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ منظر شہاب کے بارے میں ہر اچھے شاعر کی طرح یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ نظم کے شاعر ہیں یا غزل کے۔ فیض کو عموماً نظم کا اور فراق کو غزل کا شاعر کہا گیا ہے۔ مگر فیض کی غزلوں اور فراق کی "آدھی رات"، "جگنو" اور "ہنڈولا" جیسی نظموں کے حسن کا انکار کون کر سکتا ہے؟ اسی طرح منظر شہاب اگر نظم کے بانکے شاعر ہیں تو غزلوں کے بھی البیلے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں جو ۱۹۳۹ء سے ۱۹۸۶ء تک کے عرصے پر محیط ہیں دانشوری کا رنگ لئے ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں اقبال کی آواز بھی چہک اٹھی ہے۔

وہ سفید خواجگی تھی یہ سیاہ خواجگی ہے
وہ طریق گمرہی تھا یہ طریق رہزنی ہے
نہ محبتوں کا حاصل نہ صلہ ہے محنتوں کا
کہ متاع کو کہیں پیرہن جبر خسروی ہے

ضمیر عشق میں میری نوا سے گرمی شوق
بلاکشان محبت کی آبرو ہوں میں
مرے جنوں نے سکھائی ہے بے خودی کو
بلا سے رند نہیں غیرت سبو ہوں میں

یہ اقبالیت فکر کی کم اسلوب کی زیادہ ہے۔ لیکن جب کبھی منظر شہاب دانشوری کے آسمان سے اتر کر وادیٔ دل میں آئے ہیں۔ تو ان کی غزلوں میں کہیں جذبات کی شوخی اور شدت۔ اور کہیں دردمندی کی کسک پیدا ہو جاتی ہے۔

جانے کیوں آج بھی ویرانۂ دل تک آکر
اکثر آواز ترا دیدۂ تر دیتا ہے
لذت زخم مجھے موت سے برگشتہ نہ کر
پھر کوئی دعوت پیکان نظر دیتا ہے

دردمندی بھی ہو گئی رسوا
صبر کا کیا گلہ کرے کوئی

خود ہی رونا ہے خود ہی چپ ہونا
درد کب ساتھیوں نے بانٹا ہے

ہ یہ ہے کہ کوئی کسی کا درد نہیں بانٹتا۔ ہم لاکھ جماعتی رہیں ذات کی تنہائی ہمارا مقدر ہے۔ صنعتی اور تکنیکی بی بے سکونی اقتدار کا ہر لمحہ اٹھتا ہوا جنازہ فرقہ وارانہ ت کا زہر ہر باشعور ذہن کو آشوب آگہی میں مبتلا کئے ے ہے۔ منظر شہاب بھی اس آشوب سے محفوظ نہیں سکے ہیں۔

ـہ رات پیڑوں کی آگ سے شہر میں یوں چراغاں ہوا
کانپ کر بجھ گئیں دل کے روشن جھروکوں کی سب بتیاں
بے اماں خلق کرفیو زدہ روز و شب کے اندھیرے میں گم
اپنی گردن میں ڈالے ہوئے اپنے کتبات کی تختیاں
دونوں ہی لکھ رہی تھیں لہو سے مرے سانحہ قتل کا
اک طرف حملہ آور آستیں اک طرف پاسباں وردیاں

اکثر آنکھوں میں دبے پاؤں اترتی ہوئی نیند
اپنے قدموں کی ہی آہٹ سے اچٹ جاتی ہے

بندے کے طلب گار صنم گر بھی صنم بھی
ر آدمی لگتا ہے خدا شہر ہوس میں

ساگر کی بوند بوند ترستی ہے ابر کو
اے آفتاب تیری تمازت کو کیا ہوا

منظر شہاب لفظ کو پیکر اور پیکر کو زندگی عطا کرنا جانتے ہیں۔ کہیں کہیں تیز دھار ریشمی طنز سے بھی کام لیتے ہیں بھی کبھی ڈرامائی صورت حال پیدا کر کے چونکا دیتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے منظر، ماحول اور چہرے جاگ اٹھتے ہیں

ـہ اٹھی نگاہ تو جلووں نے کی قدم بوسی
بڑھے جو ہاتھ تو گیسو سنوارنے کو طے

شیشہ تھا دل وہ ٹوٹ گیا پھر بھی بار بار
تم کیوں یہ کہہ رہے ہو تمہاری خطا نہ تھی

تمام بس کے مسافر میں اضطراب سا تھا
کہ اک نظر بھی اُسے دیکھنا ثواب سا تھا

وقت نے کتنا بنا ڈالا ہے انجانا اُسے
اس کی آواز کی تصویر سے پہچانا اُسے

منظر شہاب لفظوں کے رمز شناس ہیں۔ ان کے ہاں خنجر، لہو، رہگذار، رات، راگنی، شجر، جنگل، آواز کی تصویر، دھوپ، خواب، پہاڑ، آگ، بگولا وغیرہ کبھی زندہ پیکر کبھی بامعنی نشانات بن کر ابھرتے ہیں۔

ـہ پہاڑ سے اتر آئے نہ آگ شہروں میں
سنا ہے سبز بگولہ اٹھا اٹھا سا ہے

ـہ ہوا کی سانس ہے بوجھل فضا بھی ہے گم صم
کہیں قریب ہی طوفان رکا رکا سا ہے

ضرور صبح تلک بارشیں ہوئی ہوں گی
اداس آنکھ کا آنگن دھلا دھلا سا ہے

قاتل نے پھر لکھا ہے خنجر پہ نام میرا
ہو دوستی تو ربط باہم نہیں بدلتا

سراغ قتل، شہادت، ثبوت سب گم تھے
لہو خموش تھا خنجر بھی بے زباں نکلا

اب تک یہ سنتا اور مانا جا رہا تھا کہ "جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا" مگر تو دو لیتوں کے اس عہد نے وہ قانون منسوخ کر دیا ہے کہ زبان خنجر کی طرح لہو بھی گنگ ہو کر رہ گیا ہے مگر منظر شہاب اس پر یقین رکھتے ہیں کہ زمین بھلے ہی آسمان کی طرح طرز ستم ظریفی اختیار کر لے، غم گسار بلائے جاں بن جائے اور حالات کی آندھیاں تیز تر ہو جائیں۔ لیکن جینے کی ادا سلامت رہنی چاہئے۔

پیراہن جان چاک، ہے تیز ہوائیں ، طوفان میں جینے کی ادا چاہئے یارو

نئی کتابوں کا تعارف

(تبصرہ کے لئے کتابوں کی دو جلدیں آنا لازمی)

۱
نام کتاب :- پیراہن جاں
تخلیق کار :- منظر شہاب
ضخامت :- ۱۴۴ صفحے
قیمت :- ۵۰/ روپے
پتہ :- حسینی اشاعت گھر، روڈ ۱، عمارت ۸
آزاد نگر، جمشید پور۔ ۸۳۲۱۱۰

جب ہم میدان شعر و ادب میں داخل ہو رہے تھے تو اس وقت آس پاس جو چند معتبر نام سنے جاتے تھے ان میں منظر شہاب بھی ایک ایسا نام تھا جس سے ہم سب مرعوب کی حد تک متاثر تھے۔ ایسا تاثر عام طور پر نئی نسل کے ذہن میں کھنچاؤ، تناؤ، تصادم اور مسابقت کے جذبات پیدا کرتا ہے ــــ سو ہم نے بھی منظر شہاب کے سلسلہ میں ایسا ہی محسوس کیا تھا، یہ اعتراف اب اس لئے کر رہا ہوں کہ اب ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

منظر شہاب اس وقت بھی بزرگ نہیں تھے اور آج بھی وہ بزرگ کر لکھتے ہیں، اتنا کم لکھ کر اپنے معاصرین میں اس حد تک ممتاز و معتبر ہو جانے میں ان کی تخلیقی انفرادیت کا بھی دخل ہے اور اس میں کچھ غائبانہ خوبی تقدیر کی بھی ہے۔

منظر شہاب اپنے تمام تر تخلیقی تحرک اور انفرادیت کے ساتھ کبھی شہرت اور مقبولیت کے پیچھے نہیں دوڑے۔ شہرت اور مقبولیت کے پیچھے دوڑتے دوڑتے اکثر آدمی منہ کے بل گرتا ہے اور اس طرح گرتا ہے کہ وہ خود اٹھے یا نہ اٹھے مگر شہرت معکوس ضرور ہو جاتی ہے ــــ اور تب وہ گمنامی کے گوشے سے نکل کر بدنامی کی کھائی میں جا گرتا ہے۔ منظر شہاب نے کبھی نہ یہ کرتب بازی کی ہے اور نہ قلابازی کھائی ہے، یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ انہیں شروع سے اپنی شخصیت پر اعتماد رہا ہے، وہ اپنی نگاہ میں بھی اسی طرح باوقار اور پرتمکنت رہے جس طرح دوسروں کی نگاہ میں۔ شعری و ادبی فضا کے شور و شرابے سے دور رہ کر درویشانہ استغنا اور قلب مطمئنہ کے ساتھ ــ Tempta-tion ــ کے فریب میں آئے بغیر تخلیقی انہماک منظر شہاب کو اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ بلند و بالا کرتا ہے ــ بعد والی نسل کے لئے تو خیر ان کی شخصیت ایک Ideal کی سی ہے۔ اس پس منظر میں یہ بات ایک خوشگوار تاثر پیدا کرتی ہے کہ منظر شہاب نے عمر کی چھٹی دہائی میں اپنا پہلا مجموعہ کلام پیش کیا ہے۔ اس میں نہ استعجاب کی ضرورت ہے نہ انفعال کی بلکہ سچ یہ ہے کہ منظر شہاب نے اپنے طویل تخلیقی سفر میں راہوں کے تمام نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ ادبی تحریکات کے فوری اور دیرپا اثرات کا مطالعہ کیا ہے، زبان و بیان کے ٹوٹتے

...تے نقوش دیکھے ہیں، تجربات کی نیرنگی اور لبا اوقات
...مجی پر نظر ڈالی ہے بظاہر ہے کہ اس توقف اور dalda
berati... نے ان کے سرمایۂ سخن میں پختہ کاری پیدا کر دی۔
... یہاں کئی موسموں کی سرد و گرم ہواؤں کا احساس ہوتا ہے
...یت، ترقی پسندی، جدیدیت، رد جدیدیت ــ نام چاہے
... رکھ لیجئے مگر یہ سارے Shedas ... ایک مسلسل عمل کا نتیجہ
... منظر شہاب نے انہیں بانٹ بانٹ کر دیکھنے اور سمجھنے کی
...ی نہیں کی اور ان کی یہی تخلیقی دانش مندی انہیں بہتوں
الگ بھی کرتی ہے اور ممتاز بھی بناتی ہے چنانچہ جب وہ یہ
...ہیں کہ ؎

شاداب نئی رُت سے ہے گلزار ادب بھی
پھولوں کو تر و تازہ ہوا چاہیئے یارو

...ن کے صحیح ترقی پسندانہ ذہن کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں
...ردو شاعری کی مستحکم اور بالیدہ روایات سے بھی فائدہ
...یا ہے خاص طور پر ان کی غزلوں میں روایت کے نقوش
...ہموار تخلیقی اختراع کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری
...خوبصورت تراکیب اہل نظر کو اپنی طرف کھینچتی ہیں،
... جہت میں انہوں نے غالب اور دوسرے شعرائے اردو
...ی سے استفادہ بھی کیا ہے۔ اور بہت سی حسین تراکیب
...باد بھی کی ہیں۔ ان کی ترکیبیں حسین بھی ہیں اور Suggas...
... بھی۔ نفسِ شوق (ص ۳۹)، خوگرِ خجالت (ص ۷۷)
...شئی حرفِ وفا (ص ۸۱) صیدگاہِ دل (ص ۸۱) بازیچۂ ناکام
(ص ۶۵) وغیرہ متعدد نئی ترکیبیں ان کے کلام میں تخلیق کا جزو
...بنی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ کہیں طویل تر کیبیں بھی منظر شہاب کی
...دلاتا ہے۔ مثلاً انہوں نے خزاں سامان بد خواہی
...پہیں (ص ...) الفاظ ہائے اہل اختیاراں (ص ۷۶) قتیل

تلخی مینائے جستجو (ص ...) اور رہینِ منت پیکانِ آرزو
(ص ...) جیسی ترکیبوں کو کامیابی کے ساتھ استعمال کر کے
اپنی اسی تخلیقی رویہ کا ثبوت دیا ہے جہاں اردو شاعری
کی روائتی جمالیات سے ان کے اٹوٹ تعلق کا اندازہ ہوتا ہے
منظر شہاب کی غزلوں میں اگر روایت کی پاس داری
اور اس سے روحانی رشتہ کا پتہ ملتا ہے تو منظومات میں نیا
اسلوب اظہار نمایاں ہے۔ وہ بیک وقت ان دونوں
مملکتوں پر دسترس رکھتے ہیں۔ ان دونوں شاعری میں
جو شئے مشترک نظر آتی ہے وہ ان کے کلام کی تاثیر ہے۔ الفاظ
خواہ کثیر الاستعمال ہوں یا اور تراکیب پرانی ہوں یا نئی،
موضوع آج کا ہو یا کل کا ــ اصل بات یہ ہے کہ اظہار
میں تاثر پیدا ہو ــ اور اس جہت میں منظر شہاب کا کلام
خود ان کی داخلی شخصیت کے گداز، اثر انگیزی، نیم
حزنیہ اور نیم رجائی تیور کی پہچان دیتا ہے، ان دو
اشعار میں جو اعترافات ہیں ان سے منظر شہاب اور ان
کی شاعری کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے ؎

فسانہ تلخ ہے اور ضد کہ لطف سے کہیے
مگر شہاب بہ ایں درجہ خوش کلام نہیں

تیرے اشعار میں اعجازِ تاثر ہے شہاب
رگ افکار کو تو خونِ جگر دیتا ہے

اگرچہ منظر شہاب نے مشاہداتی اور خارجی حقائق کو بھی کامیابی
کے ساتھ موضوعِ سخن بنایا ہے مگر ان کی شاعری بنیادی طور
پر دھیمے لہجے اور رکے تھمے ہوئے حزنیہ عبارات سے متشکل ہوتی
ہے۔ چنانچہ منظر شہاب کا یہ شعر تو گویا ان کی شاعری کا ... ہے

؎ نرم لہجہ بھی عجب آگ لگاتا ہے شہاب
آگ دھیمی ہی سہی دل سے لپٹ جاتی ہے

(بقیہ صفحہ ۲ پر)

شہرِ خیال

○ مسعود میاں۔ ہمیشہ خوش رہو

سہیل کے شمارہ نمبر ۹ کے نمونے سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمہیں ہندوستان کے روایتی مزاج اور تہذیبی خمیر کے متعلق خطرناک خوش فہمی ہے۔ میاں اگر مستثنیات کو نظر انداز کر دیں تو یہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہر سطح پر ہمیشہ ایک خلیج قائم رہی ہے جس کی ذمہ داری ہندوؤں کے دھرم رکشکوں اور اسلام کے علمبرداروں پر ہے۔ آزادی کے بعد انتخابات کی ضرورتوں نے اس خلیج کو اور گہرا کر دیا۔ سبھی بڑی سیاسی جماعتیں انتخابی حلقوں کے ووٹروں کے مذہبی عقائد اور ذات پات کو دھیان میں رکھتے ہوئے اپنے امیدواروں کو چنتی ہیں یعنی وہ سیاسی جماعتیں بھی جو سیکولر ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں حقیقتاً سیکولر نہیں ہیں۔ جناب اصغر علی انجینیر صاحب نے جنوبی کوریا عیسائی مذہبی رہنماؤں کا جو انداز فکر دیکھا وہ قابلِ ستائش ہے لیکن کیا ہندوستان کے دھرم رکشک اور اسلامی رہنما اپنے عقائد میں کسی طرح کی ترمیم یا توسیع قبول کرنے کی توفیق رکھتے ہیں؟ یہ غریب تو اپنے عقائد کے مطابق عمل کرنے کی توفیق بھی نہیں رکھتے۔ ہاں ان کا استعمال کرنا ضرور جانتے ہیں۔ اور وہ بھی ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے لئے نہیں۔ بلکہ اپنے ہم مذہبوں کو بھی نقصان پہنچانے کے لئے سنسکرت لفظ دھرم کا مطلب کم و بیش کائناتی اصولوں کے مطابق کام کرنے کو سمجھا جاتا ہے لیکن اسی دھرم کے علمبردار ہر غیر ہندو کو ملیچھ قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں نے رب العالمین کو صرف رب المسلمین بنا دیا ہے۔ انجینیر کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مصلحت کی حد تک سچ کے قائل ہیں۔ مثلاً وہ یہ تو لکھتے ہیں کہ بھاگلپور کے فسادات میں ۹۰۰ افراد مارے گئے لیکن فسادات کے سبب کے متعلق خاموش ہیں۔ اس کے بعد حال ہی میں ضلع گونڈہ میں فسادات ہوئے میں نہ جانے کتنے مسلمان مارے گئے لیکن فسادات شروع ہونے کا سبب ہندوؤں کے درگا پوجا سے متعلق ایک جلوس پر مسلمانوں کا حملہ تھا جس کا سبب ہندوؤں کی اشتعال انگیز نعرہ بازی تھی۔ اشتعال انگیز نعرہ بازی غلط ہے لیکن اسے قتل کا بہانہ بنانا اور بھی زیادہ بڑی غلطی ہے۔ اب میرے وطن بجنور میں فسادات ہو رہے ہیں جہاں پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ وشو ہندو پریشد کی رام جنم بھومی کو ہندو ازم کی بقا کا مسئلہ بنانے کی کوشش کامیاب نہ ہوگی کیونکہ مذہبی سطح پر ہندو بے شمار فرقوں کا مجموعہ ہیں جن میں ایک فرقہ وہ بھی ہے جو خدا کے وجود سے ہی سراسر منکر ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ہندوستان میں اسلام کی بقا بابری مسجد پر منحصر نہیں ہے بہ الفاظ دیگر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خلیج ہونے کی وجوہات کچھ اور ہیں جنہیں نہ ہمارے مذہبی رہنما دور کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں نہ سیاست داں۔ ہاں اگر ہمارے نوجوان بزرگوں کی روش کو خیرباد کہہ دیں۔ مذہب اور دھرم کے بنیادی اصولوں پر توجہ دیں اور سماجی سطح پر اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کریں تو یہ فسادات کا بھوت قابو میں کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کے سابق چیف جسٹس ایم۔ ایم بیگ نے اقلیتی کمیشن کا چیرمین

ہونے کے بعد کہا تھا کہ ان کے تجربے کے پیش نظر اس ملک میں
یت صرف ہندوستانیوں کی ہے۔ ہمارے نوجوان اس
یت کو اکثریت میں بدل سکتے ہیں اور اکثریت ہی اس
کی سالمیت قائم رکھ سکتی ہے۔ اگر ہم اس ملک کو سیکولر
بنانا چاہتے ہیں تو مذہب اور دھرم کو ذاتی سطح تک محدود
نا پڑے گا اور سب شہریوں کو صرف ایک سول لا قبول کرنا
ے گا۔ ابھی تک تو ہم شہریت کی سطح پر بھی ایک نہیں ہیں۔
باقی سطح پر ایک کیسے ہو سکتے ہیں؟ مثلاً سید شہاب الدین
حب ہندوستان کے مسلمانوں کو مسلم ہندوستانی کہنے پر
مصر رہتے ہیں۔ عزیزی مشرف عالم ذوقی کی کہانی "مرگ نینی سے
ہمارے ہر زبان کے ادیبوں کو للکار رہی ہے کہ اپنے
شیش محلوں سے نکل کر وقت کا تقاضا پورا کریں ورنہ
نا ہو جائیں گے۔ پس انہوں نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا
ہندو کسی غیر ہندو کو ہندومت اختیار کرنے کے بعد بھی ابھی تک
ہندو تسلیم نہیں کرتے۔ کہانی لکھتے وقت جزئیات کو بھی
نظر رکھنا پڑتا ہے۔ قیوم خضر صاحب نے بھی مگھی الفاظ
بہت خوبصورت استعمال کیا ہے۔ کاش اردو ادب پہلے
سے علاقائی بولیوں کے الفاظ کا سلسلہ جاری رہتا

سہیل کے اسی شمارے میں علی گڑھ سے حقانی القاسمی
صاحب کا ایک خط بھی شائع ہوا۔ موصوف کے مطابق مہاتما
گاندھی نے گول میز کانفرنس میں اقلیتوں کے تئیں بے اعتنائی
کا مظاہرہ کیا۔ یہ میرے لئے ایک انکشاف ہے ورنہ میں تو ابھی
تک یہی جانتا تھا کہ گاندھی جی نے ملک کی سالمیت کے لئے جناح
صاحب کو انگریزوں سے ہندوستان کی عنان حکومت
سنبھالنے کی بھی پیشکش کی تھی (جسے کانگریس کے رہنماؤں
نے رد کر دیا) اور سب ہمارے ... کی طرفداری کا الزام
پر ہندوؤں کے ہاتھ قتل ہو گئے۔ آگے موصوف فرماتے ہیں
"ہمارے یہاں ہندو اور مسلم ادیب میں تفریق نہیں برتی
جاتی ہے۔" لیکن اس کے بعد یہ بھی کہتے ہیں کہ "صرف ان
کی حوصلہ افزائی سے کبھی کبھی یا اس خیال سے کہ ہمارے
ہندو بھائیوں کی گراں قدر خدمات کا اعتراف کیا جائے
انھیں ہندو ادیب کہہ کر ضرورتاً پکارتے ہیں" یہ الفاظ دیگر
بغیر اس طرح کی حوصلہ افزائی کے ہندو اردو کی طرف متوجہ
نہ ہوتے اور ان کے تخلیق کردہ ادب کی گراں قدری کا اعتراف
انہیں ہندو بتائے بغیر ممکن نہیں ہے یعنی ادب کی گراں قدری
ادب پر نہیں بلکہ ادیب کے مذہبی عقیدے پر منحصر ہے۔ اس
طرح کے غیر ذمہ دارانہ خطوط اگر سہیل میں شائع نہ ہوں تو
بہتر رہے گا۔ ہاں حقانی القاسمی صاحب سے اقبال کے
کلام میں آفاقیت اور عالمگیریت پر روشنی ڈالنے کے لئے
کہو ــــ

تمہارا طراج حیرت

○ برادرم دعائیں

سہیل کے دونوں شمارے یعنی ۸ اور ۹ مل گئے۔ امید
ہے کہ آپ مشترکہ شمارہ ویسا ہی شائع کر پائیں گے جیسا آپ
چاہتے ہیں۔

میں نے یہ دیکھا ہے کہ عموماً اردو اور دیگر زبانوں
کے الفاظ کے بارے میں جو مضامین شائع ہوتے ہیں ان
میں افسوسناک حد تک غلط معلومات دی جاتی ہے۔ مثلاً
"اردو پر دوسری زبانوں کے اثرات" (زبان و ادب) "اردو
میں سنسکرت الفاظ" (سہیل) وغیرہ۔ قیوم خضر صاحب نے
اپنی ایک کہانی نیوتا (سہیل ...) کے آخر میں ان "مگھی الفاظ"

کی ایک فہرست دی ہے جو انہوں نے کہانی میں استعمال کئے ہیں اور ان کے اردو معنی بھی بتائے ہیں ان الفاظ میں تقریباً سبھی ایسے ہیں جن سے اردو / ہندی والے بخوبی واقف ہیں کیونکہ یہ مگہی بولی کے الفاظ نہیں ہیں اس میں داخل ہوگئے ہیں اور بہار یوپی کی دوسری بولیوں کے علاوہ اردو / ہندی میں بھی مستعمل ہیں۔ ان میں کچھ عربی کے ہیں جیسے کبر (قبر) گریبی (غریبی) کسائی (قصائی) جاستی (زیادتی) تکلیف (غلاف) بعض فارسی کے ہیں جیسے دروجا (دروازہ) مجبوری (کمزوری) وغیرہ اور سنسکرت کے کھدوا، ست ماسو، گود، نیوتا وغیرہ وغیرہ ہیں۔

اردو والوں کو کہانیوں کے ذریعہ دوسری زبانوں کے الفاظ سے واقف کرانا اچھا تعلیمی طریقہ ہے لیکن موصوف اگر ہمیں خالص مگہی بولی کے الفاظ سے متعارف کراتے تو ہماری معلومات میں بے شک اضافہ ہوتا۔ کہانی سے تو بس اتنا ہی معلوم ہوسکا کہ مگہی میں بھی عربی، فارسی، سنسکرت اور دیسی بولیوں کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ موصوف جب مگہی کی لغت تیار کریں گے (خدا کرے وہ یہ کام جلد اور کامیابی کے ساتھ پورا کرسکیں) تو ان الفاظ کے ماخذ یا مصدر کیا بتائیں گے؟

اردو کو خود اس کے الفاظ واپس دکھانے میں اردو کا کتنا فائدہ ہے؟ اور الفاظ کی بگڑی ہوئی صورتوں کو اردو ادب میں رائج کرنا مثلاً غلب کے ساتھ ساتھ ... کو بھی ادبی قرار دینے سے اردو کتنی مالامال ہوجائے گی اس کا اندازہ لگانا ہم جیسے لسانیات سے ناواقف لوگوں کے لئے مشکل ہے۔

امید ہے آپ سب بخیر ہوں گے

علی عباس ازل

○ مکرمی! سلام مسنون

سہیل شمارہ ۹، ۶ دسمبر کو ملا۔ اس عرصے میں تو احمد آباد پر ایک قیامت گذر گئی۔ میں بھی دیوالی کی چھٹیوں کے بعد آج ہی دفتر آیا ہوں۔ سہیل، چونکہ آج ہی ملا ابھی صرف مشمولات پر ایک سرسری نظر ڈالی ہے۔

قیوم خضر صاحب کا نیوتا پڑھا۔ میرے خیال میں اس قسم کی کوشش بھی ہونی چاہئے۔ اس کے ذریعہ اردو اور ہندی کے درمیان کی گہری کھائی کو پاٹا جاسکتا ہے اور اردو کو ہندی اور ہندوستانی سے قریب بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس کہانی کے آخر میں جو لغت ہے اس سے ہمیں کئی لفظ نئے جاننے کو ملے۔ گنتا ہی، سوگی، رشیلی، ربھلی، تھپنی، لوا پوا، للکارا، بھترا، چھپچھانا، اُک بک، اور اُستھ وغیرہ۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ علاقائی بولیوں کا ایک بہت بڑا سرمایہ قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے مثلاً جاستی، گریبی، کاہے، لڑکن، بجھے، لنگٹے، کیار، سنبھلکا، سنبھلکا، دروجا، گاڑ دینا، تکلیف، بے سدھ، اتری، چیز وغیرہ مگدھ کے علاوہ بھی دیگر علاقوں میں انہیں معنوں میں بولے اور سمجھے جاتے ہیں۔ انہیں میں سے کئی تو گجرات میں بھی اسی تلفظ اور معنی میں عام طور پر مستعمل ہیں، مثلاً جاستی، گریبی، لنگٹے (لنگوٹ) درواجا، تکلیف، بے سدھ وغیرہ اور کچھ لفظ معمولی سے تلفظ کے فرق کے ساتھ بولے جاتے ہیں، مثلاً کیار کو کیال یا کیاڑ بولا جاتا ہے۔ امید ہے قیوم خضر صاحب آئندہ بھی اسی طرح کی تخلیقات سے نوازتے رہیں گے۔ جہاں تک گجرات کی علاقائی بولی کا تعلق ہے ہم بھی کوشش کریں گے کہ نیوتا قسم کی کچھ تخلیقات منظر عام پر آئیں۔ ہاں اس سلسلے کو جاری رکھنے میں ایک احتیاط یہ

ضروری ہے کہ ہماری معیاری اردو کے so called
علمبردار کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ اردو زبان کو بگاڑنے کی ایک
سازش ہے۔

امید ہے مع الخیر ہوں گے

غلام رازق

برادرم!

"سہیل" کا تازہ شمارہ ملا۔ مضمون کی مقبولیت کے
شکریہ۔ کرفیو کی بھیانک، مخدوش اور خونی راتوں کے
نک سائے ابتک شہر پر منڈلا رہے ہیں۔ کسی اژدہے کی
پھنکارنے کی صدائیں کانوں میں اب تک گونج رہی ہیں۔
وہ مالی نقصانات تو اس قدر نہیں ہوئے لیکن یقین و اعتماد
کا سرمایہ تباہ و برباد ہو گیا۔ دونوں ہی فرقوں کے ترقی
پسند و سیکولر حضرات گھروں میں بند رہے اور شہر غنڈے
غنڈے کہلانے والے یا فرقہ پرست مذہبی رہنماؤں کی
تحویل میں بدنام لوگوں کے رحم و کرم پر رہا۔ لیکن اگر کوئی بڑا
جانی واقعہ نہیں ہوا تو یہ بھی انہیں لوگوں کی "ذمہ داری"
دو دن کے بعد پولس اور انتظامیہ کو جب ہوش آیا تو وہ
عمل ہوئی۔ خیر اب خیریت ہے۔ زندگی آہستہ آہستہ
معمول پر آرہی ہے۔ تمام احباب بخیر ہیں۔

عبدالقیوم ابدالی

برادرم مسعود منظر صاحب۔ سلام مسنون

امید کہ آپ بخیر ہوں گے۔ سہیل کا ایک شمارہ ملا تھا
جس میں ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کا مقالہ بڑا دلچسپ اور بعض
مقامات پر لمحہ فکریہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مشمولات کے اعتبار
سے رسالہ کسی بھی رسالے کے پہلو میں رکھا جاسکتا
ہے۔ البتہ اگر اس کی پروف ریڈنگ پر خاص توجہ دی
جائے تو کتابت و طباعت کی بعض غلطیاں پاک کی جا
سکتی ہیں۔

قوی امید ہے کہ آپ سبھی حضرات بخیر و عافیت ہوں گے

سید حسن عباس

مکرمی۔ سلام مسنون

آپ کا اداریہ "نمود" پڑھا۔ آپ نے جو کچھ لکھا
ہے وہ وقت کا تقاضہ ہے اور ہمارے آدرش بھارت کے
مستقبل کے لئے مشعل راہ ہے۔

اصغر علی انجینئر صاحب کے مضامین بے حد اہمیت
کے حامل ہوتے ہیں انہوں نے جنوبی کوریا میں منعقدہ عدل،
امن، کائناتی سالمیت اور مذہب پر عالمی کانفرنس کی رپورتاژ
اور اپنا قیمتی تاثر پیش کرکے ہم قارئین پر احسان کیا ہے۔

قیوم خضر صاحب کا نیوتا پڑھا ان کی کہانی میں بیشتر
الفاظ بھوجپوری کے ہیں۔ چند الفاظ مگہی کے ہیں۔ ان کی
کہانی میں برتے گئے الفاظ سے اردو ادب کو کوئی فائدہ پہنچے گا
یہ کہنا مشکل ہے۔ اردو کی روانی، سلاست ان الفاظ کی
متحمل نہیں ہو سکتی۔ بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو اردو، ہندی
یا بھوجپوری میں سہل ہیں وہی مگہی میں جاکر ثقیل ہو جاتے
ہیں تو پھر اس سے کیا حاصل ہے؟

عبدالقیوم ابدالی صاحب کا مطالعہ "کوہنیل" قابل
تعریف ہے۔ وہ قارئین اور قلم کار دونوں کے لئے معلومات افزا
ہے۔

واجد سحری صاحب کے دو اشعار کافی پسند آئے

ہوتی ہے کیسے رسوائی : انکی گلی میں جاکر دیکھو
آئینے میں کیا رکھا ہے : رنگ برنگے چہرے دیکھو

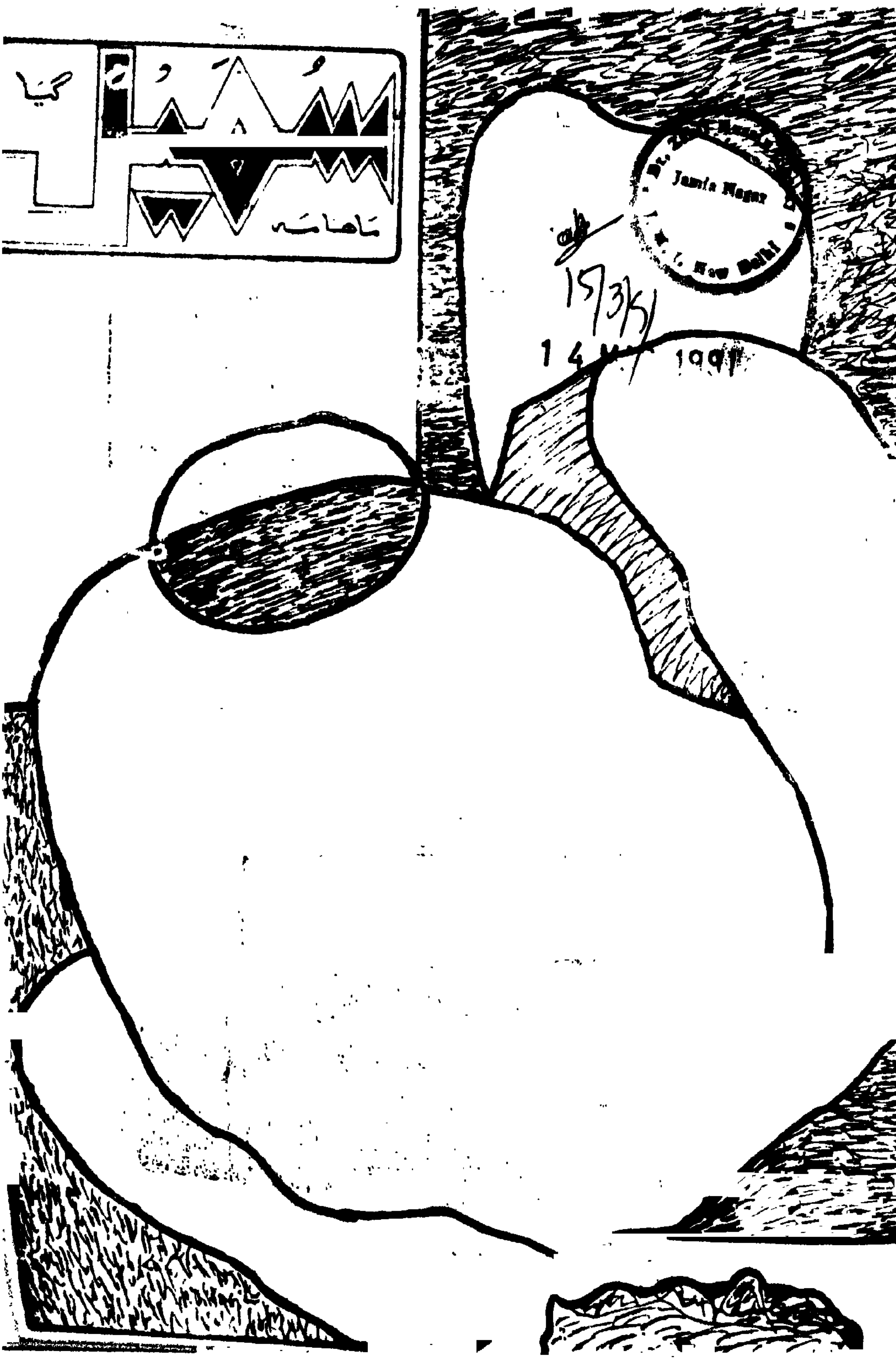
علی عباس ازل صاحب کا یہ شعر بھی کافی پسند آیا۔

میں نے فرزانگی سے کیا پایا
کچھ عقیدے وبال جان بنے

مشرف عالم ذوقی صاحب کا مشاہدہ وسیع ہے۔ وہ افسانے کی تکنیک پر قدرت رکھتے ہیں مگر الفاظ کے موقع محل کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ انہوں نے اپنے افسانے مرگ فینی میں ایک جگہ لکھا ہے "غلط اگر غلط ہے تو اس کے لئے کسی منطق کی ضرورت نہیں۔ آپ کی ساری منطق بے بنیاد ہے کہ ایسا ہونا چاہئے ہندو راشٹر —" یہاں افسانہ نگار بولتا ہوا نظر آتا ہے۔ کوئی ہندو گھرانے کی لڑکی مرگ فینی نہیں بولتی دکھائی دیتی۔ منطق لفظ سے ثقالت اور اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ سہیل پڑھنے والے قارئین عموماً سیکولر ہیں وہ مرگ فینی پڑھ کر کوئی خاص اثر نہیں لیں گے۔ ظالم کے دل کو بدلنے کے لئے مظلوم کے دل کا علاج کرنا بیکار ہے مظلوم کو ظالم کے سامنے لا کھڑا کرنا اور مقابلے کی صلاحیت پیدا کرنا بھی قلم کار کے فرائض میں سے ایک ہے۔ صرف تفنن طبع کے لئے یا آنسو بہانے کے لئے افسانہ لکھا جائے تو وہ بہت جلد اپنا اثر کھو دیتا ہے۔ علیم اللہ حالی صاحب کی سند اعزاز تسلیم مگر موجودہ صورت حال میں سہیل کے قارئین کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ ہم ادیب و شاعر دلوں کو جوڑنے والے انسانیت بردوش جذبوں کے تحفظ کے لئے ایقان و اعتماد کے ساتھ میدان میں اتر چکے ہیں مگر ہماری آواز اردو کے چند رسائل تک محدود ہے۔ افسانہ نگار افسانہ لکھتے ہیں مگر وہ ذکی انور کی طرح سوچتے ہیں جو بہتے مارے گئے۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ وقت کا تقاضا کیا ہے۔ ادیب و شاعر کا دائرہ کار نہایت وسیع ہے۔ اندھیرے کی نشاندہی ضروری ہے مگر اجالا لانے کے لئے تدبیر کرنا بھی انہیں کے فرائض میں داخل ہے۔

امید کہ آپ بخیر ہوں گے

صابر رومانی



بانی :- حافظ محمد عبدالرحمٰن لبسمل شنسہاروی ● بیادگار :- زین العابدین احمد وادریس شنسہاروی

سُہیل گیا

ماہنامہ

چیف ایڈیٹر :- مسعود منظر
ایڈیٹر :- جمیل منظر
معاونین :- شکیل احمد جبالی، عبدالقیوم ابدالی
● کتابت :- سید عبدالاحد گیاوی ●

(فہرست)

نمود ———— ۴
حیات اللہ انصاری کا افسانہ —— اصغر علی انجینئر ۶
محمد علی تاج اور ترقی پسند تحریک —— ڈاکٹر یعقوب یاور ۱۰
جدید اردو غزل —— ناز اعظمی ۱۵
سُر دھا نجلی —— مشتاق احمد نوری ۱۷
غزلیں —— طلوع حیرت، علی عباس اُزل ۱۸
غزلیں —— علیم صبا نویدی ۱۹
غزلیں —— عبدالمتین نیاز، ڈاکٹر محمد علی اثر ۲۰
غزلیں —— نشتر اکبرآبادی ۲۱
غزلیں —— شفیع اللہ طالب نازاں اوری، بیاباسین ریاض ۲۲
غزلیں —— ڈاکٹر ساقی جیل شہپی، اعجاز طالب، اعجاز ماہوری ۲۳
غزلیں —— راشد انور راشد، صابر رومانی ۲۵
گجراتی کہانی —— ترجمہ :- غلام رازق بشیر ۲۶
ہجرت کی تاثیر —— ڈاکٹر اود سے سہا ارمان ۲۸
کالی بلی —— ایوب جوہر ۳۲
شہر خیال —— ۳۴

شمارہ ۱۲ جلد ۵

بدلِ اشتراک
فی شمارہ .... ۳/- روپے
زرِ سالانہ .... ۳۶/- روپے
لائف ممبری .... ۵۰۱/- روپے

● خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ ●
ماہنامہ سُہیل
ریلوے اسٹیڈ روڈ، گیا - ۸۲۳۰۰۱
فون نمبر 21573

شمو

خلیج میں آخر جنگ ہو ہی گئی
اس وقت امریکہ اور عراق کے بیچ گھمسان لڑائی جاری ہے
اس جنگ سے عالمی امن کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا ہے
عام لوگ اس بات کو محسوس کر رہے ہیں کہ یہ جنگ تیل کے لئے لڑی جا رہی ہے
سامراجی استحصال کا یہ پرانا طریقہ ہے۔ سامراجی امریکہ عرب میں اپنا سکہ برقرار رکھنا چاہتا ہے
عراقی صدر صدام حسین نے کویت پر قبضہ کر کے امریکہ کو ایک بہانہ دیدیا ہے۔ اور اسی وجہ سے
غیر جانبدار ملکوں کو اس جنگ میں عراق کی مدد کرنے میں دشواری ہو رہی ہے۔
لیکن غیر جانبدار رہنے والوں کو ایسی صورت حال میں کسی بھی طرح امریکہ کی مدد کرنا غیر اصولی ہوگا
ہندوستانی عوام بھی اس جنگ کے خلاف
ہیں
امن قائم کرنے کے لئے امریکی راجدھانی واشنگٹن سمیت تمام بڑے شہروں
میں زبردست مظاہرے کر رہے ہیں۔
افسوس کا مقام ہے کہ
ہماری مرکزی سرکار نے امریکی جنگی جہازوں کو ایندھن کی سپلائی
کا فیصلہ کر کے ہمارے غیر جانبدار اصولوں اور
[illegible] کیا ہے
اور ہمارے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کا کام کیا ہے
مرکزی سرکار کے وزیر پٹرولیم جناب ستیہ پرکاش مالویہ کے اس بیان نے
ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ کیا ؟

جاننا ضروری ہے کہ سرکار کی خارجہ پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی [illegible]
[illegible] امن پسندوں کے ذریعے امریکی جہازوں کو تیل کی سپلائی
فوراً بند کئے جانے کی مانگ کے جواب میں جناب [illegible]
امریکی جنگی جہازوں کو تب تک تیل کی سپلائی جاری رہے گی جب تک [illegible]
اسلحہ نہیں ڈھوئے جاتے ہیں۔ اور جناب [illegible]
جہازوں کو تیل دیا جا رہا ہے جو جنگ میں حصہ نہیں لے رہے ہیں
مرکزی وزیر [illegible] سے ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ
اسلحہ چاہے جیسا بھی ہو وہ خطرناک ہی ہوتا ہے
اور جنگ کے اس ماحول میں امریکی ہوائی جنگی جہاز تو
ہوا خوری کے لئے نہیں چلتے ہوں گے۔

آیئے! مرکزی سرکار کی اس پالیسی کے خلاف مل جل کر آواز اٹھائیں اور وزیر اعظم ہند جناب چندر شیکھر سے یہ مانگ کریں کہ وہ امریکی جنگی جہازوں کو تیل کی سپلائی فوراً بند کریں اور ساتھ ہی ہندوستانی سرزمین سے [illegible] کی اجازت بند کریں۔

(اداریہ)

۲۲، ۲۳، ۲۴ فروری ۱۹۹۱ء کو

بمبئی میں منعقد ہونے والی

عالمی داؤدی بوہرہ کانفرنس

کا ہم استقبال کرتے ہیں

اصغر علی انجینئر

حیات اللہ انصاری کا افسانہ
"آخری کوشش" ۔۔۔ ایک تجزیاتی مطالعہ

حیات اللہ انصاری ہمارے منجھے ہوئے ترقی پسند افسانہ نگاروں میں ایک ہیں۔ ان کے افسانوں میں سماجی اور سیاسی شعور بھرپور طریقے سے پایا جاتا ہے اور سب سے بڑی خوبی یہ کہ یہ شعور کہیں بھی افسانوں میں چھلک کر نہیں ابھرتا بلکہ بڑی فنکاری سے رچا بسا ہے۔ دوسری اہم بات ان کے سلسلے میں یہ کہنا ضروری ہے کہ ان کے افسانوں میں مغرب زدگی نہیں ہے۔ ان کے کردار ہندوستانی کلچر کی بو باس رکھتے ہیں۔ اس لحاظ سے انصاری صاحب اوروں کے مقابلے میں پریم چند سے بہت زیادہ قریب ہیں۔

ہندوستان میں انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل سے ہمارے جدید ادب کا سفر شروع ہوا جس میں مغربی ادب کے نظریات اور اقدار کا بڑا دخل رہا۔ بعض ادیبوں پر یہ اثر اتنا غالب ہوا کہ ان کے [illegible] ادب کی [illegible] ہندوستانی تہذیب [illegible] بڑے نام ہی کے کردار ہندوستانی ہوتے تھے لیکن اپنی سوچ اور اقدار میں بالکل مغرب زدہ — میکالے کی تعلیمی پالیسی کی طرح۔

بعض اوقات تو مارکسی مفکروں اور ادیبوں نے بھی مارکسی نظریات کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیبی اقدار کو آنکھ موند کر قبول کر لیا۔ اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جدیدیت نے تو مغربی زوال پرستی کی اپنے ادب میں بڑی بھونڈی نقالی کی۔ لیکن خوشی کی بات ہے کہ جدیدیت اس زوال پرستانہ نقالی میں نہیں اٹکی رہی بلکہ اس سے ماورا نکل گئی۔ اگر نہیں اٹکی رہتی تو شاید اسی زوال پرستی کی گھٹن میں دم توڑ دیتی اور ہماری تہذیبی فضا میں کبھی سانس نہ لے پاتی۔

صحت مند ادب ہمیشہ ماضی سے جڑا رہنے کے باوجود اس کی زوال پرستانہ قدروں سے آشنائی نہ رکھے۔ ہماری تہذیبی جڑیں ماضی میں ہیں لیکن ہمیں سانس اپنے دور میں لینا ہے۔ ہماری سانس کا ایک لمحہ ماضی میں ہوتا ہے اور ایک حال میں لیکن ہمارے ماضی کی طرح ہمارا حال بھی ہمارا اپنا ہونا چاہئے۔ مغرب کی تہذیبی قدروں میں رچا بسا نہیں۔

آج بھی ہمارے تخلیقی ادب میں۔ اور خاص طور سے درمیانے طبقے کے تخلیقی ادب میں ہماری تہذیب کی صحت مند اقدار کے مقابلے میں مغربی ٹکنالوجی کی صارفی اقدار (Consumer values) زیادہ جھلکتی ہیں۔ لیکن پریم چند کا ادب اس سے پاک ہے۔ آج ہمارے بورژوا سماج میں پیدا ہونے والی بیگانگی (alienation) جس کی جھلک ہمارے ادب میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ کی اور وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے۔ ترقی پسند مفکروں اور ادیبوں کو اس بات کا پوری سنجیدگی سے جائزہ لینا چاہئے۔

تمہید کے طور پر یہ چند سطور میں نے اس لئے رقم کی ہیں کہ حیات اللہ انصاری کی "آخری کوشش" کے تجزیے سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ حیات اللہ انصاری کا ادب جیسا کہ میں نے عرض کیا پریم چند کے ادب سے زیادہ قریب ہے۔ اس میں شہر کے اوپری طبقوں کی صارفیت نہیں بلکہ چھوٹے شہروں کی غربت اور فلاکت جھلکتی ہے۔ ان کی یہ کہانی ہماری اپنی تہذیبی فضا میں سانس لیتی ہے۔ اس میں اوپر طبقے کی جھوٹی، نمائشی اور کھوکھلی قدریں نہیں ہیں بلکہ زندگی اور زندہ رہنے کی وہ بے رحمانہ کشمکش ہے جو ہماری روح کو ٹھٹھک لگا دیتی ہے۔ اس کا مقابلہ ہم پریم چند کی کہانی "کفن" سے کرسکتے ہیں۔ میں یہ تو نہیں کہنا چاہتا کہ یہ کہانی کفن سے آگے کی چیز ہے لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ یہ پریم چند کی "کفن" اور کملیشور کی کہانی "کتنے اچھے دن" کی طرح ہمارے وجود کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ غربت انسان کو کس سطح پر لے آتی ہے اس کا اندازہ ہمیں اچھی طرح ان تینوں کہانیوں سے ہوجاتا ہے۔

پریم چند کی کہانی آزادی سے قبل لکھی گئی اور حیات اللہ انصاری کی بھی لیکن کملیشور کی آزادی کے کچھ [illegible]

لگتا ہے اس ملک میں جو غربت انگریزوں کی سامراجیت کے عہد میں تھی وہی غربت آج "ترقی یافتہ" سرمایہ دارانہ دور میں بھی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ سامراجیت بیرونی استحصال پر ٹکی ہے اور سرمایہ داری اندرونی استحصال پر۔ سامراج ملک کی رگوں سے لہو کشید کرکے لیجاتی ہے تو سرمایہ داری [illegible] کو چند رگوں تک محدود کر دیتی ہے۔ نتیجتاً کچھ حصے صحت مند نظر آتے ہیں اور کچھ حصے بے حس و حرکت اور مفلوج۔ "آخری کوشش" ملک کے ایسے ہی مفلوج طبقے کے ایک نمائندے خاندان کی کہانی ہے۔

گھسیٹا کئی گمنام کرداروں کی طرح ایک گم کردار ہے جو خوشحالی کا سپنا دیکھ کر [illegible] گیا۔ لیکن شہر کی زندگی ایک معنی میں گاؤں کی زندگی سے کہیں زیادہ بے رحمانہ ہے۔ گاؤں کی زندگی میں استحصال کے ساتھ ساتھ آٹے میں نمک کی طرح قلیل پرانی تہذیبی قدروں کی بھی شامل ہوتی ہیں۔ جس سے زندگی کسی حد تک گوارا ہو جاتی ہے۔ لیکن شہروں میں ہونے والے استحصال میں [illegible] مقابلے کی سختیاں استحصال میں شامل ہو کر زندگی کو [illegible] اور کھردری بنا دیتی ہے۔ گھسیٹا [illegible] کی کچھ غرضیاں محسوس کرنے چند دنوں کے لئے لوٹ [illegible] ہے۔ "اپنے گھر اپنے لوگ، وہ نعمتیں [illegible] سے مزا نہیں چکھا۔ کلکتہ میں گھر کے تختے یا پھر شہر سے میلوں دور [illegible] جنگل زمین پر [illegible] آدمی ہونے [illegible] نہیں ملتی ... رہے اپنے لوگ سو وہاں [illegible] غرض کے بندے۔"

حیات اللہ انصاری [illegible]
کے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] سب کچھ [illegible] تیار ہو گئے

[illegible] یہاں سے گنگا بہتے تک کے یہ

[illegible] شہر [illegible] انسان بے [illegible] مستعمل

[illegible] ہے شاید [illegible]۔ گھسیٹے کی ان گاؤں کی واپسی

[illegible] بات کی علامت ہے کہ ہمارے جدید شہر کارخانوں

[illegible] میں [illegible] سے [illegible] انسانی تہذیب اور انسانی

[illegible] کے [illegible] ہو بھی [illegible] یہاں

[illegible] ایسے [illegible] شاید اور دولت بن جائے [illegible] کے نیچے انسان

[illegible] کے [illegible] ان کی [illegible] جہاں میں پناہ لے

سکتا ہے۔ ان شہروں میں انسانوں کو [illegible] دینے والی

[illegible] ہوا زہریلی [illegible] گندی بستیاں

[illegible] بھوک۔

یہ شہر جدید ہندوستان میں وبا کی طرح پھیل رہے ہیں

[illegible] کہ ان کے گاؤں کا آس پاس

[illegible] ہے کہ [illegible] کی پگڈنڈیاں [illegible]

[illegible] سڑکوں کی [illegible] سب کچھ کتنا

[illegible] ہے [illegible]

[illegible] درخت، کھیت اور امرود کے باغ [illegible]

[illegible] راحت بخش [illegible] بالکل [illegible]

[illegible] میں [illegible] غبار کی طرح

[illegible] ایسے [illegible] کے [illegible]

[illegible] اور [illegible] ہیں۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

اپنا [illegible] ہیں۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ایک سہانی خواب کا [illegible] ہے اور

تلخ حقیقت بھی ہے۔ ایسی حقیقت جس کی تلخی انسان

ہی [illegible] اپنے گلے اتار سکتا ہے۔ انسان [illegible] کر بیٹھیں۔

اشتیاق گاؤں کی زندگی کی [illegible] اپنے قلم کا

[illegible] اور گھسیٹا کے [illegible]

وہاں [illegible]۔

اماں ــــ یہ سب کیا

ہاں ۔۔

جھونپڑے کے کونے میں چیتھڑوں کا ڈھیر لگا تھا۔ اس

کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔ "وہ پڑی ہے۔"

گھسیٹے محبت اور اشتیاق کے جوش میں ادھر

جہاں چیتھڑوں کے انبار میں [illegible] ایک انسانی پنجر پڑا

۔۔۔ جس پر جھائی ہوئی [illegible] گندی کھال ڈھیلے

کی طرح جھول رہی تھی۔

بھوک کا عالم یوں بیان کرتے ہیں۔

"فقیر اچانک [illegible] آیا [illegible] دیکھنے [illegible]

کچھ بکنے لگی اور اپنے ہاتھ سے جھوٹ موٹ کا نوالا بنا

اپنے منہ کی طرف بار بار لے جا رہی تھی۔ جیسے گونگا

[illegible] ۔۔۔ بڑھیا نا معلوم کیا کہہ رہی تھی ۔۔۔۔۔ مگر سننے

میں یہ آتا تھا ۔۔۔۔۔ اب ۔۔۔۔۔ اب ۔۔۔۔۔ اب"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] اپنی [illegible]
بھیک مانگ کر گزارا [illegible] سے [illegible] جا
سکتا ہے لیکن [illegible] بھیک [illegible]
[illegible] سمجھتے [illegible] اور [illegible]
[illegible] ان کے [illegible] اب
تک بھیک کے لئے ہاتھ نہیں پھیلایا تھا۔
لیکن آخر کب تک؟ کشمکش پرانی اور نئی قدروں
میں ہی نہیں ہوتی۔ غربت اور ان قدروں میں بھی ہوتی ہے۔
قدریں نئی ہوں یا پرانی۔ ہم متوسط گھرانے کے لوگ اکثر
پرانی اور نئی قدروں کی کشمکش میں ہی مبتلا رہتے ہیں۔ غربت
اور افلاس میں جو گہرائی ہے۔ اس کی طرف ہماری توجہ جاتی
ہی نہیں۔ دراصل یہ گہرائی اندر ہی اندر بڑی بے رحمی
سے لڑی جاتی ہے اور اس سے پیدا ہونے والا
تشدد نئی پرانی اقدار کی جنگ سے پیدا ہونے والے تشدد سے
زیادہ کربناک ہوتا ہے۔ موخرالذکر تشدد کو
حیات اللہ نے پوری شدت
کے ساتھ افسانے کے مختلف حصوں میں پیش کیا ہے۔ یہ کشمکش
بھی [illegible] کے افسانے کفن میں بھی پوری شدت کے ساتھ
نظر آتی ہے۔ کفن کا باپ بیٹا بھوک سے مجبور ہو کر اپنی
تمام قدروں کو بالائے طاق رکھ کر پوری اور حلوہ خریدنے
پر خرچ کر دیتے ہیں۔ اور مزے لے لے کر کھاتے ہوئے مرنے
والی [illegible] جانے کی دعائیں دے دیتے ہیں۔ اس کے
پیچھے جو ذہنی کشمکش پوشیدہ ہے اس کے تناؤ کو صحیح معنوں میں
وہی سمجھ سکتا ہے جو اسے محسوس کرتا ہو۔ آخری کی کشمکش
[illegible] اس کشمکش اور تناؤ سے [illegible] کر اس بات پہ ختم
ہوتی ہے [illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible] محسوس ہوتا ہے۔
[illegible] کشمکش [illegible]
[illegible] سے [illegible]
[illegible] کے [illegible] اور [illegible]
کے [illegible] ہے [illegible]
[illegible] کے بعد [illegible]
ہے۔ دونوں بھائی اپنے اپنے طور پر [illegible]
[illegible] اور [illegible]
[illegible] میں [illegible]
کر [illegible] دے گا۔
ایک دن [illegible]
ہیں [illegible] دونوں بھائی [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] دیا۔ [illegible]
[illegible]
[illegible] اور [illegible]
[illegible] دونوں بھائیوں سے [illegible]
اور [illegible]
[illegible] ناکام ہو گئی۔ [illegible]
[illegible] کر لے کے [illegible]
[illegible]
آج کے ہندوستان کی حقیقت [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

ڈاکٹر یعقوب یاور

محمد علی تاج اور ترقی پسند تحریک

"میں چاہتا ہوں نظامِ کہن بدل ڈالوں
مگر یہ بات فقط میرے بس کی بات نہیں
اٹھو بڑھو مری دنیا کے عام انسانو
یہ سب کی بات ہے دو چار دس کی بات نہیں"

افسوس کہ اس زمانہ ساز فکر کے حامل فنکار کو [ترقی] پسند تحریک نے یاد نہیں رکھا۔ غریبوں کا دکھ درد سمجھنے والے، [لوگوں] میں امید، بیداری اور حوصلہ پیدا کرنے والے شاعر [illegible] محمد علی تاج کو تحریک نے فراموش کر دیا۔ محمد علی تاج [illegible] کا مقبول ترین اور ہر دل عزیز شاعر [illegible]

ایسے اور بھی کئی شاعر ہیں جو ترقی پسند تحریک کے [illegible] کے سوا اور [illegible] رہے۔ شعوری طور پر بھی [اور غیر] شعوری طور پر بھی [illegible] سبب اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا کہ یہ [تحریک] [illegible] منظم ادبی تحریک کے طور پر یاد کیا [illegible] اعتقاد [illegible] جب اس کے اراکین [illegible] انتشار کا شکار [illegible] تحریک ایک طوفان

عرصے تک صرف اس وجہ سے چل سکی کہ اس وقت ہندوستان کا ماحول اس کے لئے سازگار تھا۔ اس عہد کا ماحول پہلے ہی کسی ایسی تحریک کا متقاضی تھا۔ ورنہ ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے باقاعدہ وجود میں آنے سے پہلے اردو ادب میں اقبال، پریم چند اور جوش ملیح آبادی نہ پیدا ہوتے۔ اس تحریک نے تاریخ کے بہتے دھارے میں اپنی کشتی اتار کر پار ہونے کی کوشش کی لیکن جب یہ کشتی پار لگی تو معلوم ہوا کہ یہ کامیابی ناخداؤں کی کاوشوں کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ دریا کے تیز و تند طوفان اور بلا خیز تھپیڑوں نے اسے پار لگایا تھا۔

تحریک کا مرکز نہایت کمزور تھا لیکن یہ اختیار اس نے اپنے پاس محفوظ رکھا تھا کہ وہ اپنے پسندیدہ فنکاروں کو بلند مرتبے پر فائز کرے۔ اتفاق یہ ہوا کہ مرکز پر کچھ نرم [illegible] فکر [illegible] کا تسلط تھا اور یہ سب حیرت انگیز روسی انقلاب پر دنیا کے بیشتر لوگوں کی طرح انگشت بدنداں تھے [illegible] نوع انسان کا نجات دہندہ سمجھتے [illegible] تحریک کے بیشتر [illegible] ترقی

سند کو کمیونزم کا ہم معنی اور مترادف سمجھتے تھے ان کی نظر میں
ترقی پسند وہی تھا جو کمیونسٹ مینی فسٹو کی پیروی کرے۔ جو
فنکار ان کے طرز فکر سے اتفاق نہ رکھتے تھے انہیں ترقی پسند
نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس طرز فکر سے ایک غلط اور گمراہ کن
نظریہ ترقی پسندی کی تعریف سے جڑ گیا اور ترقی پسندی اپنے
وسیع تر مفہوم کو فراموش کر کے ایک محدود دائرے میں سمٹ گئی۔
چند ایسے لوگ بھی اس تحریک سے وابستہ تھے جو کمیونسٹ نہ تھے۔
لیکن ان کی تعداد برائے نام تھی اور ان کی آواز نقار خانے میں طوطی
کی آواز سے زیادہ اہم ثابت نہ ہو سکی۔

بدقسمتی یہ بھی رہی کہ وہ فنکار جو اپنے مادی وسائل
کی بنا پر ابھر کر اوپر آنے کی صلاحیت سے محروم تھے انھیں ان
کی تمام تر فنکارانہ صلاحیتوں کے باوجود پس پشت ڈال دیا
گیا۔ اور محض ماحول اور کمیونزم کا عقیدہ بے صلاحیت اور
ناپختہ ذہنوں کی حوصلہ افزائی کا سبب بنا۔ بھوپال کے
شاعر محمد علی تاج کو نظر انداز کر دینے کا سبب بھی یہی رہا کہ
وہ اپنی کسمپرسی اور تنگدستی کے وجہ سے قالین پوش محلوں
میں رہنے والے سربراہوں کو متاثر نہیں
کر سکا۔

اس میں قصور کچھ بھوپال کے ادبی ماحول کا بھی رہا
ہے جو اپنی عظیم شخصیتوں کو بجز یہ دنیائے ادب میں متعارف
کرانے کے بجائے باہمی ریشہ دوانیوں کا شکار رہا۔ یہاں
ہر شخص اپنے کو باوا آدم سمجھتا ہے اور اس کوشش میں
اپنی ساری عمر گذار دیتا ہے کہ لوگ بھی اسے یہی سمجھیں۔ آج
بھی بھوپال کی گلیوں میں ایسے کئی خود ساختہ استاد مل
جائیں گے جنہیں تاج کے ادبی رہبر ہونے کا دعویٰ ہے کچھ
تو یہ بھی کہتے نہیں جھجکتے کہ تاج ان کے بخشے ہوئے شعر
[illegible]

محمد علی تاج کے ان لاتعداد استادوں کے یہاں ایسے شعر
نہیں ملتے جو معیار اور تاثر میں تاج کی خاک تخئیل کو بھی چھو
سکیں۔

ترقی پسندی کو اگر اس کی تشہیری مہم سے الگ رکھ
کر دیکھا جائے تو یہ کمیونزم سے بالکل علحدہ ایک رجحان ہے
اور اس کو الگ رکھ کر دیکھنا ہی صالح طرز فکر ہے۔ یہ یاد رکھنا
ضروری ہے کہ اس رجحان کی ابتدا ہندوستان میں اس وقت
ہوئی تھی جب کمیونزم کے چرچے یہاں نہیں پہنچے تھے۔ رومانیت
کے عروج کا عہد ادب کو زمین سے اٹھا کر آسمان سے جوڑ دیا
تھا۔ چند باشعور فنکار اس منفی طرز فکر سے متفق نہ تھے اور اسے
دوبارہ زمین پر لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کا یہی عمل
حقیقی ترقی پسندی تھی اور اس رجحان کو آگے چل کر جب باقاعدہ
تحریک کی شکل دی گئی تو بزرگ فنکاروں نے اسی بنیاد پر تحریک
کی حمایت اور معاونت کی تھی۔ ترقی پسندی کا مفہوم اس
وقت بدلنا شروع ہوا جب نوجوانوں نے
تحریک کی باگ ڈور سنبھالی۔

اس معاملے میں اس بین الاقوامی حکمت عملی کو بھی
نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جس کے تحت بڑی طاقتیں ایک
دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے اس کی ہر اہم بات پر چیخ پکار
کرنا اپنا فرض اولین سمجھتی ہے۔ ہندوستان میں تحریک
کو سازش قرار دینا بھی اسی حکمت عملی کا حصہ تھا
اور ان مباحث کی تشہیر نے عوام الناس میں ترقی پسندی کے مفہوم
کو یکسر بدل دیا۔

محمد علی تاج حقیقی ترقی پسند شاعر تھے۔ وہ
عملی سیاست سے کوسوں دور تھے لیکن ان کی شاعری
دبے کچلے اور پس ماندہ عوام کی [illegible] مستقبل کی بشارت
[illegible]

[illegible] سے ہوگا۔ نہیں ایک [illegible] تک کرکے
[illegible] نظریات کی بنیاد پر [illegible]
[illegible] شروع ہوا اور اس کے [illegible]
[illegible] تو اس بات کا [illegible]
[illegible] کی جاتی۔ اس بے راہ
[illegible] اور ان جیسے دوسرے شاعروں کی [illegible] ہے
[illegible]۔

تاج کے مزاج میں سادگی، معصومیت، بے ریائی، [illegible] صفات کوٹ کوٹ کر بھری تھیں۔ اس نے شاعری کو [illegible] کی حیثیت سے کبھی نہیں دیکھا اور شہرت [illegible] وہ بہت دور تھا۔ شاعری اس کے لئے ایک مشغلہ تھی [illegible] ستائش کی تمنا کی [illegible] یہ [illegible] اا اپریل [illegible] کو [illegible] اس نے اپنے [illegible] رکھنے کے لئے کوئی بیاض نہیں تیار کی اور اغلب [illegible] اس کے بہت سے اشعار [illegible] ثابت ہوا جو نہ اسے خود یاد رہ گئے تھے اور نہ جنہیں [illegible] طور پر [illegible] لیکن اس کے باوجود تاج کا دستیاب [illegible] کی شاعرانہ عظمت۔ اس کے حسن تخیل۔ اس کے شعری [illegible] اس کے نظریات و معتقدات اور اس کے ادبی مرتبے کے [illegible] کے لئے کافی ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اس [illegible] سنجیدگی سے توجہ دی جائے اور ایمانداری اور بے لاگ [illegible] سے الگ ہو کر اس کی شاعری کا تجزیہ ہو تاکہ وہ [illegible] اور صلاحیتوں کی بنا پر مستحق ہونے کے [illegible] نہیں مل سکا بعد از مرگ ہی سہی اسے ملے۔

[illegible] کے دو مجموعے [illegible] اور [illegible] نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی لیکن نظموں کے [illegible] زیادہ [illegible]

[illegible] شاعری کو ان [illegible] سے [illegible] کی کوشش کی تھی اور [illegible]۔

نکھار [illegible] غالب، [illegible]
کوئی رنگ بیاں اپنا کوئی طرز فغاں اپنی
[illegible] پیدا کرنے سے جہاں تک آرزو ہے
غالب کا فن ہمارے لئے آسمان ہے

لیکن تاج کا [illegible] میر کے خاندان سے زیادہ قریب رہا ہے جس کی زبان قلم سے نکلا ہوا ہر ہر لفظ دلوں کی گہرائیوں [illegible] سکتا ہے۔

[illegible] سفر
[illegible] نکال لئے

تو تاج [illegible] میر کے ہم پلہ نظر آنے لگتے ہیں۔ تاج کے یہاں [illegible] کمی نہیں ہے اس کی غزل اردو کی ادبی روایات کی پاسدار ہے کہ تاریخی تسلسل کے ساتھ شعری رجحان کے ارتقا کا [illegible] بھی ہے۔ اس نے ترقی پسندی سے اپنا دامن بچائے رکھا جس کی زد میں آ کر کئی اچھے فنکار یا تو تحریک سے علیحدگی کا اعلان کرنے لگے یا شاعری سے کنارہ کشی کرتے ہوئے قلم رکھ دینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اپنی غزل کا خام مواد اس نے دور کی [illegible] حقیقتوں سے حاصل کیا ہے جہاں چھوٹے چھوٹے مسائل، سماجی، معاشی نابرابری اور پسماندہ طبقے کے استحصال کے خلاف آواز اٹھانے کا [illegible] نظر آتا ہے۔ حالانکہ اس کی فکر میں وسعت [illegible] سیلن الفاظ [illegible]
[illegible]

[illegible] دل کو اس [illegible] لکھتا ہے ہیں
نہ اس کا ہر تجربہ، اس کا ہر مشاہدہ اس کے اشعار میں
جذبات دل کا ترجمان بن جاتا ہے۔ اس کا سماجی شعور [illegible]
پختگی اور صلاحیت کے ساتھ غزل کے سانچے میں ڈھلا ہے
یہ دعویٰ درست معلوم ہوتا ہے ؎

مری غزل میں زمانے کے مسئلے آ کر
حسین ہو گئے رخِ جاناں کی طرح

بیسویں صدی کی تیز رفتار تبدیلیوں کا عکس بھی اس کی [illegible] میں جا بجا نظر آتا ہے۔ روایات کا احترام اور اپنے عہد سے وابستگی کا عمل تاج کے یہاں ایک عجیب حسن اور ایک مسرت بخش لطافت پیدا کرتا ہے۔ اس نے اپنی شاعری میں سادہ مگر پرکار اشاروں، کنایوں، تشبیہات، استعاروں، علامات و امیجری کا استعمال کیا ہے جو قاری اور سامع کو شاعری کی نئی دنیا سے متعارف کراتے ہیں۔

رومان کی روایت کا سلسلہ بھی تاج کی شاعری سے آ کر جڑا ہے اور یہ رجحان غزلوں میں ابھر کر آیا ہے۔ لیکن تاج نے رومان کے فوق الفطرت عناصر سے اپنے کو الگ کر کے اسے ترقی پسندانہ موڑ دیا ہے۔ وہ حسن و عشق کی باتیں کرتا ہے لیکن بیسویں صدی کی زبان میں۔ دراصل ترقی پسندی سے محمد علی تاج کی وابستگی بیشتر دوسرے شعراء کی طرح تقلیداً نہیں تھی بلکہ ترقی پسندی اس کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ یہ اشعار دلیل ہیں ؎

ہم سے خراب حال دوانوں کا غم نہ کر
[illegible] بن گئے تو بڑا کام کر گئے
شعلوں سے اپنے [illegible] ڈھال کر
[illegible] کام کر گئے

اس [illegible] کی [illegible] جرم ہے
یہ بھی کیا زندگی، زندگی جرم ہے
تشنگی [illegible] اتنی قاتل نہیں
[illegible] جرم ہے

حکایاتِ غم و درد کا پتہ بھی جتا
[illegible] داستاں کی طرح
[illegible] قد یار لئے پھرتے ہیں
ہم کہ زندہ ہوں رسن و دار لئے پھرتے ہیں
تری نگاہوں کی جادوگری کو دیکھ لیا
تری نگاہوں کی جادوگری سے کچھ نہ بچا

حالانکہ تاج نے نظمیں کم ہی کہی ہیں لیکن اس صنف میں اس نے ترقی پسندوں کے سطحی مباحث کو رد کیا ہے۔ اس نے تحریک کی ابتدا کے وقت تمام نئے تجربوں سے بھی احتراز کیا ہے اس کی نظموں کا مزاج غزلوں سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہے پھر بھی اس کی فطری ترقی پسندی کا عکس نظموں میں نظر آتا ہے [illegible] ایک خواب [illegible] گیتا بجلی کا شمار شاہکار نظموں میں کیا جا سکتا ہے۔

تاریخ ساز لمحہ [illegible]۔ زمانہ کبھی ایک جیسا نہیں رہتا۔ وقت خود بہت بڑا نقاد ہے۔ نہ جانے اس کی کون سی جنبش کب کیا رنگ دکھلائے۔ تاج کا بھی ایک دن آئے گا [illegible] جب [illegible] اس کے کمال کے اعترافات میں بخل سے کام نہیں لیں گے۔

سہیل سے ملتی
[illegible]

کیا آپ زندگی کے قدرتی حسن میں یقین رکھتے ہیں

اگر ـــــ ہاں ـــــ تو



شاندار ماضی اور ترقی پذیر حال کے ساتھ قدرتی حسن سے بھرپور صوبہ بہار آپ کو سیاحت کا دل پذیر مسرت دیگا۔

اگر آپ مذہبی شخص ہیں تو سبھی مذاہب کا مرکز ہے بہار ـــــ اگر آپ قدرتی حسن کے پجاری ہیں تو پھر چھوٹا ناگپور آئیے اور بہار کے شاندار جنگلوں، خوبصورت پہاڑیوں، حسین آبشاروں جیسے ہنڈرو، نیتر ہاٹ، راج رپا وغیرہ کی سیر کا مکمل لطف لیجئے اور ـــــ اگر رومان پسند کریں تو ہزاری باغ اور بیتلا کے گھنے اور بڑے نیشنل پارکوں میں جنگلی مخلوقات کے بیچ گزاریئے۔

ـــــ بہار کی سیاحت یعنی گاگر میں ساگر ـــــ

یہاں کے سیدھے سادے لوگ، یہاں کی تہذیب، یہاں کا فن، یہاں کا روایتی تیوہار، آپ کو دامن میں سمیٹ لے گا ـــــ آپ یہاں ایک بار آئیے ـــــ آپ یہاں بار بار آنا چاہیں گے۔

صوبائی حکومت نے بہار سیاحت کو صنعت اعلان کیا ہے اور سیاحت سے متعلق بہتر سہولیات آپ کو مہیا کرانے کے لئے پرعزم ہے۔

ـــــ رابطہ قائم کریں ـــــ

سیاحت اطلاع مرکز ـ مظہر الحق پتھ پٹنہ ـــــ سیاحت اطلاع مرکز ـ کچہری کیمپس، رانچی

فون نمبر ـ ۲۲۶۹۰ ـ ۲۰ ـــــ رجسٹرڈ فون نمبر ۲۲۲۸۲

● جاری کردہ ـ محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ، بہار

I.R.K.B. NO 261 (INF-195) 90-91

"جدید اردو غزل"

راز اعظمی

جدید اردو غزل بعض نفسی و شعوری رویوں میں تبدیلی سے عبارت ہے۔ کسی بھی صنف میں تبدیلی اس کے پوشیدہ امکانات کی مظہر ہے۔ یہ تبدیلی فی الواقع حسرت سے شروع ہوتی ہے جنھوں نے صحیح معنوں میں غزل کو زبان اور بیان کی سطح پر ایک نئے رنگ و آہنگ سے آشنا کیا، بعد ازاں اصغر، جگر، فراق وغیرہ نے اس لَے کو اور تیز کیا اور بعض معنوی امکانات روشن کئے۔

جدید تر غزل کے سلسلے میں جب بھی گفتگو ہوگی تو بلا شبہ ہمیں مندرجہ بالا شعراء کی طرف رجوع کرنا پڑے گا اس لئے کہ کوئی بھی صنف سخن قائم بالذات یا خود مکتفی وجود نہیں رکھتی اس کے پس منظر میں اسباب و علل اور عمل رد عمل کا ایک طویل سلسلہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر عہد میں سماجی تبدیلیوں اور پیچیدگیوں کا اثر شعراء کی تخلیقات میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جدید تر غزل دوسری جنگ عظیم کے بعد سماج میں یک لخت تبدیلی اور انتشار کے وجوہ کے سبب شکست و ریخت سے دوچار ہوئی۔ سائنسی ترقی نے انسانی زندگی پر کاری ضرب لگائی

لگا، مزید یہ کہ نئے علوم اور سائنسی ترقی نے مذہبی اور اخلاقی اقدار کو بھی متزلزل کر دیا۔ ایسے میں انسان اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگا، نئے ہتھیاروں کی ایجاد کی وجہ سے سروں پر خوف کا سایہ منڈلانے لگا۔ اس ظاہری تبدیلی نے بطون میں بھی ایک زبردست انتشار کو جنم دیا۔ انھیں عوامل کا اثر موجودہ شعری و نثری تخلیقات پر دیکھا جا سکتا ہے بالخصوص غزل میں اس کا اظہار شدید تر ہوا ہے۔

حسرت سے فراق تک غزل کا ارتقاء عمودی تھا۔ لیکن مابعد کے شعراء نے غزل کہہ کر مختلف جہات کی طرف آگے بڑھایا اس لئے فراق کے بعد کسی بھی شاعر کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ نئی غزل کی پہچان اس سے وابستہ ہے بلکہ مختلف شعراء مل کر اس کی شناخت بنتے ہیں ان کا شاعری میں مختلف رویوں اور معنوی ابعاد کو دیکھا جا سکتا ہے۔ جدید تر غزل کا یہ سفر ناصر کاظمی سے شروع ہو کر آج تک تا حال جاری رہا ہے اس ضمن میں ظفر اقبال، سلیم احمد، شکیب جلالی، احمد مشتاق، شہزاد احمد، باقی، ظفر اقبال وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے جنھوں نے صوتیت کو اپنی غزل میں جگہ

[illegible] مسائل [illegible]

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے
(ناصر کاظمی)

یہ لوگ ٹوٹی ہوئی کشتیوں میں سوتے ہیں
مرے مکان سے دریا دکھائی دیتا ہے
(احمد مشتاق)

کیا جانئے منزل ہے کہاں جاتے ہیں کس سمت
بھٹکی ہوئی اس بھیڑ میں سب سوچ رہے ہیں
(شکیب جلالی)

اے صفِ ابرِ رواں تیرے بعد
اک گھنا سایہ شجر سے بچھڑا
(باقی)

[illegible] دیوار [illegible] کی طرف
[illegible] مسلسل ہے کیا رہ گیا
(شہریار)

اک فضا [illegible] جاتی ہے [illegible]
[illegible]
(ظفر اقبال)

پہلے آنکھوں کے لئے خواب سے منتظر ہونا
[illegible] ہونا
(سلیم احمد)

[illegible] ہوئے
[illegible] ہوتے ہوئے
([illegible])

([illegible])

پاتی ہے۔ زندگی کی یہ صورت گری، [illegible] کو مشکل حقیقتوں کو [illegible] چہروں کے سامنے [illegible] "آخری کشتی" [illegible] حیات اللہ انصاری کی ایک طاقت ور کہانی ہے اور اس کی طاقت اس میں ہے کہ وہ پوری ایمانداری اور سچائی کے ساتھ زندگی کی تلخ ترین حقیقتوں کو [illegible] ہیں۔ شاید علامت [illegible] حیات اللہ کی بیانیہ زبان کا [illegible] ہمارے دیہاتوں اور چھوٹے شہروں میں پائی جانے والی غربت کو اس سے زیادہ طاقتور زبان میں بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔

یہ کہانی کسی سطح پر [illegible] حقیقت کا احساس کراتی ہے بلکہ ایک سیاسی اور سماجی شعور بھی بخشتی ہے۔ ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ [illegible] میں [illegible] اس غربت سے ہم کیسے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ کیسی [illegible] ہے کہ بھیک ملنے کی آس میں دو بھائی ماں کی چتا [illegible] ہیں اور ایک ڈاکٹر کے خوف سے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ کیا اس بے رحمانہ [illegible] کا کوئی حل ہے

کہانی یہ سوال نہیں اٹھاتی [illegible] یہ سوال خود بخود ہمارے ذہن میں ابھرتا ہے۔ یہی اس کہانی کی خوبی بھی ہے کفن میں اور اس کہانی میں یہ بات مشترک ہے۔ کفن کے [illegible] نے کفن کا [illegible] ذمہ داری کسی پر [illegible] اور [illegible] اس نظام پر جس نے ان [illegible] پیدا کئے اور انہیں غربت کی اس سطح پر [illegible] جواب [illegible]

ہر سو اندھیرے قہقہے لگا رہے تھے
ہر دل میں تاریکی کا ہیجان تھا
ہر آنکھ روشنی کی طالب تھی
سب آس لگائے بیٹھے تھے
کہ کوئی تو ہوگا
جو روشنی بن کر آئے گا
کیونکہ سب یہ جانتے تھے
اندھیرے کی کوکھ سے ہی
روشنی جنم لیتی ہے
تبھی سب نے دیکھا

اسی اندھیرے راستے پر
ایک کمزور سا دکھنے والا ویکتی
ایک معمولی سی لاٹھی تھامے
ننگے بدن اور ننگے پاؤں
پوری جوانمردی کے ساتھ
آگے بڑھ رہا ہے
اور اس کے پیچھے پیچھے
روشنی کا ایک لمبا کارواں
تاریکی میں شگاف پیدا کر رہا ہے
سب نے اس کمزور ویکتی کو
اپنے سروں پر بٹھا لیا
اچانک وہ کمزور دکھنے والا ویکتی
پورے دیش کے لئے
طاقت کا سمبل بن گیا
اور دیکھتے ہی دیکھتے
پاس کی تاریکی مٹ گئی
ہر طرف روشنی کا اجالا پھیل گیا

مشتاق احمد نوری

شردھانجلی

ہم اسی ویکتی کے جنم دن پر
اس کے آدرشوں کو بھول کر
اس کی تصویر پر دو چار مالے ڈال کر
یہ سمجھ لیتے ہیں
کہ ہم نے اس کے آدرشوں کا پالن کر لیا ہے
اس کے اصولوں کو اپنے دل میں اتار لیا ہے
اور اسے ایک سچی
شردھانجلی ارپت کر دی ہے

مگر جب تنہائی میں ہم
اپنے دل کے اندر جھانک کر دیکھتے ہیں
تو پتہ چلتا ہے
وہ بوڑھا ویکتی ہم سے روٹھ گیا ہے
اور اپنے ہی آدرشوں کی زنجیروں میں جکڑا
ہمارے دلوں کے اندھیرے میں قید ہے

کون جانے ——
بھارت ماتا کو آزاد کرانے والے اس مہاپرش کو
اس قید سے
آزادی کب ملے گی۔؟

غزلیں

سراج حیدر

کیوں نہیں سمجھا آج تک انساں
[illegible] دل ہے [illegible] ویراں
اکثر اٹھے ہیں ایسے بھی طوفاں
روح سکوں ہو جس پہ قرباں
اہل گلستاں، دشت سواراں
ہم بھی رہے ہیں زلزلہ ساماں
میرے توسط سے غم جاناں
کون ہے رقصاں، کون غزلخواں
دیکھ لیا اعجاز بہاراں
پھول بھی نکلے چاک گریباں
خیر مزاج ساقی دوراں
ہم بھی کہیں ہیں یا غم و حرماں
تیرا مقدر مجھ سے جڑا ہے
میرا زیاں ہے تیرا بھی نقصاں
مسلک ہستی خود ہستی ہے
مسلک ہستی کفر نہ ایماں
اپنے رگ و پے میں بھی لیلو
گلشن بلبل، دشت غزالاں
درد کے رشتے کا یہ کرم ہے
تم بھی پشیماں ہم بھی پشیماں
جینے میں منظور ہے صاحب
کرب مسلسل تا حد امکاں
ہر کس و ناکس پریشاں ہے
ہم بھی بس اب تک خود سے پنہاں
[illegible] بھی ہیں سلامت
[illegible] ہے کار نمایاں

علی عباس ازل

جذب جنوں سے باقی رسوم جنوں بھی تھیں
صحرا میں نقش پا اب اسے ڈھونڈتا نہیں
ممکن نہ تھا کچھ اور رویہ ہی اس کے ساتھ
کرتا بھی کیا میں اس کا اگر پوچھتا نہیں
فرش زمیں پہ رینگنے کی سرسراہٹ ہے
گنبد میں آج حرف ندا گونجتا نہیں
آنکھوں میں اشک لب پہ تبسم ملے کبھی تو
اب ان پہیلیوں کو کوئی بوجھتا نہیں
ہم میں سے کوئی ان کو مناتا نہیں تو کیوں
پہلے کی طرح ہم سے وہ کیوں روٹھتا نہیں
چہرے اداس ہیں کہ دلے ہیں کہ مضطرب
یہ کیسی روشنی ہے کہ کچھ سوجھتا نہیں
ہر عہد ہر سماج کے ہر دور میں ازل
بکھرے ہیں میرے خواب کوئی پوچھتا نہیں

غزلیں

علیم صبا نویدی

بڑی عجیب سی لذت تھی در بدر پھیلی
ہماری پیاس کی وسعت کو دیکھ کر پھیلی
تمام جسم کا نظارہ ہو گیا گھائل
لہو کی جھیل میں جب ظلمتِ بھنور پھیلی
ادھر ہی لوگ بنانے لگے ہیں کیوں مسکن
ہمارے ضبط کی تابندگی جدھر پھیلی
میں ایک موڑ پہ ٹھہرا تھا کائنات لیے
مہکتی سمتوں کی جانب مگر نظر پھیلی
ہمارے لب کی زمیں سمت کیا جھکا سورج
کہ رستہ رستہ نئی خواہش سفر پھیلی
بنا ہے صحرا ابھی سرسبز منظروں کا نصیب
ہماری چاہ کی ہریالی جس قدر پھیلی
نئی دشاؤں کی سانسوں کی جگمگاہٹ میں
صبا نویدی مری عمر مختصر پھیلی

مرنے سے پہلے جیتے جی مر کر بھی دیکھنا
مقتل سجا کے قتل کا منظر بھی دیکھنا
ہر موڑ پر ہے مجلسی چہروں کا انبساط
ظاہر کو چھوڑ کر کبھی اندر بھی دیکھنا
کشتی کو بادباں کے سہارے تو چھوڑ کر
بدلی ہوئی ہواؤں کے تیور بھی دیکھنا
شاید کہیں سے بھیک ہی مل جائے نور کی
ہم جیسے کچھ فقیروں سے مل کر بھی دیکھنا
مقتول کے سفر میں ہے قاتل بھی ہم سفر
الزام کس پہ آئے گا وہ سر بھی دیکھنا
میں آئینہ ہوں ٹوٹ نہ پاؤں گا اے صبا
میرے بدن پہ مار کے پتھر بھی دیکھنا

میں چپ رہوں تو کوئی بھی بولنے لگتا
رموز گہری خموشی کے کھولنے لگتا
سنہرے فن کا پرندہ زمیں پہ آتے ہی
اڑان کے لیے پر اپنے تولنے لگتا
عجیب تھا اس گھٹا کا کرشمہ، عجب اس کا وجود
نشہ لٹا کے فضاؤں میں ڈولنے لگتا
نگاہ خنجر قاتل کو رکھ کے آگے وہ
مٹھاس زہر کے پیالوں میں گھولنے لگتا
صبا نویدی سا مدہوش، ہوش میں وہ کر
نہ جانے کس کو وہ ہر سو ٹٹولنے لگتا

نوٹ: بھنور کے ساتھ اضافت ٹھیک نہیں ہے
مگر ضرورتاً میں نے اسے بحال رکھا ہے

غزلیں

عبدالمتین نیاز

پھر ہواؤں سے برسنے لگا یادوں کا نمک
زخمِ دل اور مہک، اور مہک، اور مہک

لوگ واقف ہی نہیں اس کے ستم سے ابتک
اے مرے صبر کے پیمانے چھلک اور چھلک

آنسوؤں کے سوا مہمان بنائیں کس کو
خیمۂ چشم میں آتے نہیں اب خواب تلک

لو بڑھاتے نظر آتے ہیں ترے گھر کے چراغ
بجھتی جاتی ہے ادھر شہر میں چہروں کی چمک

میرے احساس کو بھی تو نے بنایا دشمن!!
کم نہ تھے میرے لئے یوں ہی ترے ستاں فلک

یہ سمجھ لیجا ہے ترے حسن کا اظہار ہے سب
تو ہی شاخوں کی لچک، تو ہی گلابوں کی مہک

جینے دیتا نہیں کمبخت یہ احساس نیاز
زخم بھر جاتے ہیں رہ جاتی ہے یادوں کی کسک

ڈاکٹر محمد علی اثر

آوازوں کے جنگل میں سنائی نہیں دیتا
وہ بھیڑ ہے چہرا بھی سجھائی نہیں دیتا

بے چین ہیں یوں آفاق کی وسعت میں بکھرنے
کیوں جسم کے زنداں سے رہائی نہیں دیتا

وہ حق جو رفاقت کی روایت کا امیں ہے
وہ حق بھی تو اک بھائی کو بھائی نہیں دیتا

پڑ جائے اگر وقت تو اس دور میں کوئی
پربت تو بڑی بات ہے رائی نہیں دیتا

بارش میں بھی وہ بھیگتا رہتا ہے خوشی سے
آندھی میں بھی وہ پیڑ دہائی نہیں دیتا

بے مانگے بھی دیدیتا ہے شاہی جسے چاہے
اور مانگنے والے کو گدائی نہیں دیتا

وہ شخص جو رہتا ہے اثر آنکھ میں ہر دم
حیرت ہے کہ خود مجھ کو دکھائی نہیں دیتا

نشتر اکبرآبادی

تمام شہر ہوس کی گلی کی جان ہوا
متاعِ عشق سے خالی ہر اک مکان ہوا

نظر میں اپنی میں اب آسمان ہوا
ہزار شکر کہ بیٹا مرا جوان ہوا

اسی کے دم سے وفا کا چراغ روشن ہے
صداقتوں کے لئے جو لہو لہان ہوا

انہیں میں کوئی مرے خون کا پیاسا ہے
خود اپنے حلقہ پہ اکثر مجھے گمان ہوا

سبھی زمیں پہ اسی دھوپ چھاؤں کے سائے
قدم قدم پہ یہاں سب کا امتحان ہوا

یہ جانتے ہوئے نازک مزاج ہے نشتر
سلگتے شہر میں منظور امتحان ہوا

★

شروع عشق میں آسانیاں ہیں
مگر آگے بہت دشواریاں ہیں

کسی کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے
کسی کے پاس گھر کی چابیاں ہیں

چلو آسانیاں پیدا کریں ہم
گھروں میں ہم سبھی کی بیٹیاں ہیں

نصیب اس کا جو اپنی فصل کاٹے
گھروں میں یوں تو سب کے کھیتیاں ہیں

خفا کیوں اس قدر ہو دوستوں سے
ہر اک کے سامنے مجبوریاں ہیں

تم اپنے دل سے یا نشتر سے پوچھو
غزل کہنے میں کیا دشواریاں ہیں

★

بیساکھیوں پہ نظریں جمائے
ساری نسلیں سسکنے لگی ہیں

جتنی بھی جنگیں ہم نے لڑی ہیں
سب آبِ زر سے لکھی گئی ہیں

شق ہو رہا ہے دھرتی کا سینہ
راتوں کی نیندیں اڑنے لگی ہیں

جسموں کی چاندی سورج کو دیکھ
ہر بوالہوس کی آنکھیں لگی ہیں

ہر چیز تیرے دم سے تھی قائم
گھر میں کتابیں بکھری پڑی ہیں

کیا پوچھتے ہو ماضی کی باتیں
سڑکوں پہ اپنی راتیں کٹی ہیں

★

آپسی میل۔ ایکتا اور ہم آہنگی

قوم کی اصل طاقت ہے

زبان، ذات پات اور مذہب سے اوپر اٹھ کر

ہم سب ایک ہیں

ہمارا ملک نہ کسی خاص فرقہ کا ملک ہے نہ کسی خاص مذہب کا۔ یہ سبھی فرقوں، زبانوں، مذہبوں اور تہذیب و تمدن کا ملک ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی وغیرہ سبھی کے ملنے سے یہ ملک بنا ہے۔ گوبندہ، رابندر اور قاضی نذرالاسلام یا دنکر اور اقبال سبھی نے اس کے گیت گائے ہیں۔ تلسی اور کبیر کے گیت آج بھی اس ملک کے گاؤں گھر گھر میں گائے جاتے ہیں۔ کثرت میں وحدت ہماری خصوصیت ہے۔ یہ آج کی نہیں صدیوں کی روایت ہے۔

آیئے ہم سب مل کر اس قابل فخر روایت کو اور مضبوط بنائیں

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

جاری کردہ

محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ بہار

شفیع اللہ خاں رازؔ اناوی

کوئی بستی جو لٹیروں نے جہاں بھی لوٹی
آئینے توڑ کے، پتھر کی دکاں بھی لوٹی
خوف سے موت کا سورج بھی جہاں ڈوب گیا
زندگی، موم کے پتلوں نے وہاں بھی لوٹی
کس قدر شیخ و برہمن پہ جنوں طاری تھا
مسجدیں پھونک کے جاگیرِ بتاں بھی لوٹی
لوٹنے والوں کی روداد الٰہی توبہ
محفلِ چرخِ کہن، بزمِ جہاں بھی لوٹی
تم نے بدلے ہوئے حالات کے ہنگاموں میں
شورِ ناقوس بھی، آوازِ اذاں بھی لوٹی
روشنی چھین لی دنیا نے مری آنکھوں سے
طاقتِ آرزوئے طرزِ بیاں بھی لوٹی
رازؔ پہلے تو ہوئی قصرِ سخن پہ یورش
اس نے پھر آبروئے اہلِ زباں بھی لوٹی

روشنی کا پیمبر بھی مجبور ہے
تیرگی کے جزیرے میں محصور ہے
مسکراتے رہو، قتل ہوتے رہو
یہ نئی قتل گاہوں کا دستور ہے
جسم میں موجزن ہے سمندر مگر
روحِ انساں سرابوں میں محصور ہے
روشنی اہلِ دنیا کو کیسے ملے
عصرِ حاضر کی قندیل بے نور ہے
زندگی کا ذرا بھی بھروسہ نہیں
آدمی کس قدر پھر بھی مغرور ہے
ان کے پیروں کی کچھ دھول لا دیجیے
میرے حق میں وہی سرمۂ طور ہے
آدمی، رازؔ خود زہر پینے لگا
اپنے حالات سے کتنا مجبور ہے

بہاء الدین ریاضؔ

آؤ دیکھیں کہ اجالوں کے نگر کتنے ہیں
آپ کے شہر میں جلتے ہوئے گھر کتنے ہیں
اس سے پہلے کہ ہوا گرم ہو مقتل کی ذرا
گن تو لو ان میں ابھرتے ہوئے سر کتنے ہیں
آپ کے جیسا یہاں لگتا ہے سب کا چہرا
آپ ہی اور یہاں رشکِ قمر کتنے ہیں
ہم سنا کرتے تھے سچ بولنے والے ہیں بہت
مان بھی لیں کہ بہت سے ہیں مگر کتنے ہیں
آپ کی بانکی اداؤں کا نہیں کوئی حساب
تیر کھانے کو مرے پاس جگر کتنے ہیں
اے مرے شہر کو گلزار بنانے والو
تم نے دیکھا ہے یہاں خاک بسر کتنے ہیں
کون پہچانے کہ وہ فن کا پجاری ہے ریاضؔ
روح میں جھانکیں یہاں اہلِ نظر کتنے ہیں

غزلیں

غزلیں

ڈاکٹر ساقی مچھلی شہری

قافلے خوابوں کے میلوں دور ہم سے ہو گئے
چھوڑ کے صحرا میں اگر ہم اکیلے ہو گئے
تھے زمیں پر بھی ہمارا وزن لیکن کم نہ تھا
تم نے کاندھوں پر اٹھایا جب تو ہلکے ہو گئے
سامنے رکھا گیا جب آئینہ کردار کا
کتنے خوش پوشاک اس محفل میں ننگے ہو گئے
سادہ دل لوگوں سے ملنے کی تمنا تھی مگر
گاؤں میں پہنچے تو سب ارمان ٹھنڈے ہو گئے
جب صدائے حق اٹھانے کی ضرورت آپڑی
دفعتاً اس شہر کے سب لوگ گونگے ہو گئے
جنگلوں کے راستے میں تو کوئی سورج بھی نہ تھا
جانے کیوں گلشن میں آکر لوگ اندھے ہو گئے
دھوپ کی شدت تو ساقی تھی بہت ہی ناگوار
چہرے میرے مگر تپ کر سنہرے ہو گئے

اعجاز طالب

نامرادی پہ مری اس کو خوشی سی کیوں ہے
زندگی میرے شب و روز پہ ہنستی کیوں ہے
جب بھی طوفانوں کی زد میں کوئی آتا ہے کہیں
میرے احساس کی بنیاد لرزتی کیوں ہے
بارہا ذہن میں آتا ہے یہی ایک سوال
میری ہر صبح کسی شام سے الجھی کیوں ہ
ہمیشہ کیوں اسے رہتی ہے دوسروں کی تلا
وہ اپنے آپ سے اس درجہ اجنبی کیوں
ابھی تو ہجر کے موسم میں دیر ہے طال
ابھی سے پھولوں کی رنگت اڑی اڑی کی

اعجاز مانپوری

ادائے عشوہ طرازی پہ جان مت دینا
ملیں گے راہ میں عاشق دھیان مت دینا
فنا بدوش نظر آتی ہے زمیں اپنی
تم اس کے زیر اثر آسمان مت دینا
بلا سے بخش دے تو دائمی فراق مگر
بغیر سوچے کسی کو زبان مت دینا
لگا سکے نہ کنارے جو کشتیٔ دل کو
تم اس کے ذمہ کبھی بادبان مت دینا
زمیں پہ جس نے بسر کی ہو زندگی ساری
اسے خدا کی قسم آسمان مت دینا
جہاں نہ دے کوئی دادِ سخن وہی اعجاز
وہاں تم اپنا یہ حسنِ بیان مت دینا

راشد انور راشد

لوگ مجھے یوں دیکھ رہے ہیں حیرت سے
خوابوں کی دوکان سجانے والا میں
لمحہ لمحہ پھول کھلیں گے سینے میں
موسم کا انداز پرکھنے والا میں
چھاؤں کی گنبد میری نگرانی میں خوش
دھوپ کا غصہ ٹھنڈا کرنے والا میں
مایوسی کے رقص کا منظر چاروں اور
امیدوں کی بین بجانے والا میں
خواہش ہے یہ دل میں خوب لیکن
کچھ سانسوں کے بوجھ کو ڈھونے والا میں
دریا میری باہوں میں لے انگڑائی
چندا اپنے اندر رکھنے والا میں
مجھ سے یوں کتراتے ہیں چالاک پرند
میٹھے پھلوں کا جال بچھانے والا میں
پریاں مسکانوں کی ڈھونڈ کے لے آؤں
رستے رستے پھول بچھانے والا میں
دل کے سونے سونے آنگن میں راشد
خوشیوں کے باغ لگانے والا میں

رسوائی کا چرچا عام
تو بھی لگا دے اک الزام
برسوں بعد کھلا یہ راز
اس کی چاہ خیال خام
منزل تیری کھوج میں ہے
پھر کیوں لوٹا ہے ناکام
ڈھونڈوں خود میں اس کو میں
کام یہی اب صبح و شام
عشق سے پہلے سوچ ذرا
ہوگا اس کا کیا انجام
بھٹکوں غم کے صحرا میں
میری وفا کا یہ انعام؟
سوچ سمجھ کے کر ڈالا
اپنا جیون اس کے نام
وقت کی راتشر مانگ یہی
دے شعروں میں کچھ پیغام

صابر رومانی

اس دور کا ہر آدمی ناکام لگے ہے
انسان کے ناموس پہ دشنام لگے ہے
دنیا کی نظر میں تو ہے [illegible] بے ہنر
حق بات جو بولے ہے وہ بدنام لگے ہے
ہم کیا کریں اس شہر میں راحت کی تمنا
یوں لوگ کہیں صبح تو کہرام لگے ہے
کیا ہم نے بگاڑا ہے کہ دشمن ہیں سبھی لوگ
اس پردے کے پیچھے کوئی انعام لگے ہے
سنتا ہے بڑے غور سے اشعار زمانہ
ہر شعر ہمارا کوئی پیغام لگے ہے
تقدیس فنا کرتی ہے سیتا کی خفیف روز
بن باس کے عالم میں ابھی رام لگے ہے
اب اور نہ ساقی مجھے انعام دے ہم کو
کچھ تلخ بہت دُردِ تہہ جام لگے ہے
تاریکیٔ اذہانِ بشر پوچھ نہ صابر
ناموس بھی پابستۂ اوہام لگے ہے

غزلیے

بلاٹنگ پیپر

گجراتی ۔ بہادر بھائی جے. وانک

ترجمہ ۔ غلام رازق شیخ

فرصت کے اوقات میں دفتر کے ملازمین کے خاکے بنا کر اپنے اسکیچنگ پاور کو فروغ دینے کے لئے میں ہمیشہ کوشاں رہا ہوں ۔

ایک روز وقفہ کے وقت دفتر کی ایک رفیق کار نیلا ویاس نے مجھ سے اپنے اسکیچ کی فرمائش کی ، دوسروں کی طرح کبھی میرا بھی اسکیچ بنا دیجئے نا" اور وہ مخصوص انداز میں مسکرادی۔

جی ہاں ! جی ہاں ..... اس میں حرج ہی کیا ہے ؟ آئیے سامنے بیٹھ جائیے اور جھٹا پھٹ آپ کا بھی اسکیچ تیار ہے" جواباً میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا ۔

اور ٹھیک میرے سامنے بیٹھ گئی ۔

کاغذ قلم لے کر اس کا اسکیچ بنانا شروع کیا ۔ وہ یکایک کھل اٹھی ۔ اس کا مسکراتا چہرہ ، بادام سی بڑی بڑی نرگسی آنکھیں ..... کاغذ پر کھینچے ہوئے خطوط میں اس کے نقوش تیزی سے واضح ہونے لگے ۔ اس دوران کبھی ہنستے ہوئے وہ مذاق بھی کر لیتی ۔ کہیں مجھے کھوکھلی اور گھوسٹ نہ بنا دینا ۔

اسکیچ تقریباً پورا ہونے کو تھا ۔ اسی اثنا میں اس نے قدرے اونچی اٹھ کر اسکیچ دیکھنے کی کوشش کی اور خوش ہوتے ہوئے بولی ۔" آپ مجھ سے کی مشابہت لا سکے ہیں ۔

اسکیچ میں چہرے کو فنشنگ ٹچ دینے کے لئے میں اس کی طرف مخصوص زاویے سے بغور دیکھ رہا تھا کہ قلم سے سیاہی کا ایک قطرہ اسکیچ میں ٹھیک اس کی آنکھ پر گر پڑا ۔ میں نے جلدی میں میز سے بلاٹنگ پیپر اٹھا کر سیاہی کے اس قطرے پر چپکا دیا ۔ کچھ دیر توقف کرنے کے بعد جب بلاٹنگ پیپر اٹھا کر دیکھتا ہوں تو ، اسکیچ کی ساری مشابہت بلاٹنگ پیپر میں جذب ہو چکی تھی ۔

پردہ

گجراتی ــــ سمنت راول
ترجمہ :- غلام رازق شیخ

تیز دھوپ میں بیٹھے بیٹھے چھوٹے بھائی کے لئے اونی سوئیٹر بنتے ہوئے پلوی بار بار دیوار پر آویزاں آئینے کو دیکھتی رہتی۔ دراصل پرسے بھی آئینے میں سامنے کے مکان میں، جھومتی نیم کی شاخوں کی سرسبزی و شادابی دکھائی پڑتی جسے دیکھ کر وہ خود بھی سرسبز شاداب ہوا ٹھتی اور اسے محسوس ہوتا گویا اسی کے آنگن میں نیم اُگ نکلا ہو۔

اس کے اپنے گھر میں آنگن کہاں تھا؛ ورنہ وہ خود ضرور نیم اُگاتی۔

اس کی اس حرکت کو باورچی خانے سے چھپ کر اکثر اس کی ماں بھی دیکھ لیتی اور پوچھتی: "ارے پلوی! وہاں بار بار آئینے میں کیا دیکھا کرتی ہے؟ پاگل ہوگئی ہے کیا؟ وہ کوئی جواب نہ دیتی۔ صبح آئینے دیکھ کر برش کرتے ہوئے اپنے پیچھے لہراتی نیم کی شاخوں کو دیکھ لیتی۔ تو دوپہر میں لنگھی کرتے ہوئے بھی نیم کی پرسکوت شاخوں کو دیکھا کرتی۔ کس قدر سبز! ایک بعد، مجھ ہاں ایک روز اسے نیم نظر نہ آیا۔ اپنی پشت کی طرف محض وہائٹ واش کی سفیدی نیم کی جگہ اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ ماں سے پوچھا تو پتا چلا کہ درختوں پر چڑھ کر چور گھروں میں گھس جاتے ہیں اس قسم کی وارداتوں کی خبریں سُن کر خود مکنوبا نے نیم کو جڑ سے کٹوا ڈالا اور اب دیواریں بھی اونچی کروانے والے ہیں۔

دوسرے روز پلوی نے کپڑے کا چوکور ٹکڑا ڈھونڈ کر آئینہ ڈھک دیا۔ ماں نے پوچھا تو کہہ دیا کہ سارا دن چڑیاں آ آکر چونچیں مارتی ہیں نا۔ اس لئے آئینہ خراب ہو جاتا ہے"

"لیکن چڑیا تو میں نے کبھی دیکھی ہی نہیں، تیرا دماغ تو نہیں چکرا گیا" ماں نے متعجب ہو کر پوچھا

"ایسا ہی سمجھ لو ماں ....." کہہ کر وہ مسکرائی اور اپنے کرب پر بھی پردہ ڈال لیا۔

مسّی

رمیش ترویدی
ترجمہ ــــ غلام رازق شیخ

پپا!
اس نے چونک کر گل دان کی طرف دیکھا۔
گل دان پر نقش تتلی گویا اڑنے کو پَر تول رہی تھی۔

پپا جی!!
موگرے کی کلی نے کھڑکی سے جھانک کر تبسم کیا۔

کھڑکی کے پاس سے کوئی چڑیا اُڑی۔ پیروں کی پھڑپھڑاہٹ گم ہوگئی۔
ہوا میں دائرے بناتا ہوا ایک پَر زمین پر آرہا۔
کیا کلتے (کرتے) ہو؟
شوکیس کی گڑیا اسے مسلسل تک رہی تھی۔

ڈاکٹر اُدے سرن ارمان بخاری

برت کی تاثیر

"خوبصورتی دار لوٹے کو گھما پھرا کر دیکھتے ہوئے گنگو کہہ رہا تھا۔" اس لوٹے کا استعمال بھی عقلمندی کا ثبوت ہے۔ اس سے پانی کا صحیح استعمال ہوتا ہے لوگ باگ اس کو مسلمانی لوٹا بھی کہتے ہیں لیکن یہ تو ہر انسان کے لئے کام کا برتن ہے۔ اس میں ایک خرابی ضرور ہے۔" اتنا کہہ کر وہ لمحہ بھر کو ٹھہرا پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔" اس کی چونچ تنگ سارس جیسی گردن کبھی صاف نہیں رہتی" اتنا کہہ کر اس نے لوٹے پر سے نظر اٹھا کر بیوی کی طرف دیکھا کہ وہ اس کی تائید میں کیا کہتی ہے مگر وہ تو دونوں کانوں میں انگلی لگائے بیٹھی تھی۔ جو کچھ سن ہی نہ رہا ہو وہ رائے بھی کیا دیگا۔ حیرت سے گنگو نے پوچھا "کیوں بھئی ایسا کیوں؟"

"کیونکہ آج میرا بھیا بھاؤ کا برت ہے اس لئے میں نے بھلائی تو سُن لی جب تم لوٹے کی برائی کرنے لگے تو میں نے دونوں کان بند کر لیے۔"

"تم بھی کمال کی عورت ہو۔ بھئی برت میں اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"مجبور کر پیٹ رہنے ہی سے برت کا ادھیش پورا نہیں ہوتا ہے۔ برت میں پانچوں اندریوں کا بھی بہت رکھنا پڑتا ہے کسی کی برائی سننا کسی کو برا کہنا برا سوچنا برا کرنا اور برا دیکھنا بھی برت کے خلاف ہے جو لوگ اندریوں پر قابو نہیں رکھتے وہ برت (روزہ) نہیں اُپواس (فاقہ کرتے ہیں)۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو" گنگو نے حقیقت کو منظور کرتے ہوئے گمبھیرتا سے آگے کہا۔" میں نے آج تک تم سے یہ سوال نہیں کیا لیکن چلی بات پر آج یہ سوال کر رہا ہوں۔ تم دس سال سے برابر برت رکھتی چلی آ رہی ہو کس لئے اتنا کشٹ اٹھاتی ہو اور کب تک یونہی جاری رکھو گی۔ ایک بات بتاؤ تمہارے پاس یہ مسلمان لوٹا کہاں سے آیا؟"

"کل رات ایک مسلمان کے گھر سے چوری کی تھی۔ کچھ سامان کے علاوہ میرے حصے میں یہ لوٹا بھی آیا ہے اس کو پیتل میں بیچ کر روپئے بنا لوں گا۔"

یہ سُن کر متفکر انداز میں کرشنا نے کہا "ہندو کے ہاتھ میں مسلمان لوٹا دیکھ کر کوئی کچھ پوچھ بیٹھا یا پولس نے پکڑ لیا تو کیا ہو گا؟"

"پوری بستی میں یہ سوال کرنے کی تمہارے علاوہ کسی میں جرأت نہیں ہے۔ رہی پولس کی بات وہ دیکھ کر بھی ان دیکھی کر جائے گی۔ پیٹ کھاتا نظر شرماتی ہے۔" گنگو نے اتنا ہی کہا تھا کہ کسی نے دروازہ پر دستک دی۔ "گنگو بھیا ہے" ... "یہ تو قمرو ..."

رشنا بھی چپکے چپکے پیچھے پیچھے چلی گئی کیونکہ وہ ان
ٹ ورڈ "نہیں" کا مطلب سمجھتی تھی کھڑکی پر کان لگائے
سارے سننے لگی اور بدحواس رہی " دیکھو آج کیا گل کھلاتے
قمرو نے باہر ہی کھڑے کھڑے کہنا شروع کیا آج شاید وہ
میں تھا ۔

" ایک ایم ایل اے کا پچیس ہزار کا آفر ہے وہ اپنے
مخالف کا خاتمہ کرانا چاہتا ہے جس نے دوران الیکشن
کچا چٹھا سماج کے سامنے کھول کر رکھ دیا تھا اگر یہ
رہا تو آئندہ الیکشن میں یہ ان کو ہرا سکتا ہے ۔" اتنا
گنگو کا ردعمل جاننے کے لئے قمرو چپ ہو گیا اسی وقت
شنا نے دل ہی دل میں کہا "کسی کا نقصان کرنے کے لئے یہ کتنا
خرچ کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں ۔ اگر کوئی غریب ضرورتمند
کے پاس پہنچ جائے تو خالی جیب بتا دیں گے کیسا زمانہ
ہے ۔ شرافت کا ساتھ دینے والے کو دبایا جاتا ہے ۔" کرشنا
رکا نہ گیا اور وہ شدت جذبات میں دروازہ کھول کر ان
ن کے پاس پہنچ گئی اور کڑک کر بولی : " رات دن مار
مار لوٹ کھسوٹ ، قتل و غارت ہی میں لگے رہتے ہو کبھی
ندگی میں کوئی ایسا کام کرنے کے بارے میں بھی سوچتے ہو جس
مرنے کے بعد کوئی تمہیں یاد بھی کرے ۔ ہر آدمی میں کوئی نہ کوئی
خوبی ضرور ہوتی ہے مگر تم میں تو کوئی بھی خوبی نہیں ہے دولت
تے وقت یہ بھی سوچ لیا کرو اس دولت کے ساتھ کسی بے
معصوم کی بددعا تو نہیں ہے ہم نے کوئی کام اچھا کیا ہی نہیں
س کی میت میں شریک ہو رہے ہیں اتنے لوگ تو گاؤں کے
میندار کے مرنے پر بھی اکٹھا نہیں ہوئے تھے بھگوان جھوٹ نہ
ے اس میں کوئی برائی ہی نہیں تھی ہر شخص اس کی تعریف ہی
رہا ہے ۔

[illegible]

کہہ رہی ہیں مگر ہم میں کوئی خوبی ہی نہیں ہے ہم نے کوئی کام اچھا
کیا ہی نہیں ہے یہ بھی غلط ہے ۔ اگر جیپ والی جوان لڑکی کو میلے
میں ہم نے کچھ غنڈوں کے ہاتھ نہ چھڑایا ہوتا تو اس کی جان
اور عزت دونوں ہی خطرے میں تھے ۔"

" تو کیا ہوا تھوڑے ہی دنوں بعد تم نے اس احسان کو
بیچ دیا ۔ یاد نہیں ہے کیا اپنی لڑکی کی شادی میں اس کے باپ سے
پانچ ہزار روپے بطور قرض لے آئے تھے اور آج تک ایک کانی
کوڑی بھی واپس نہیں کی ہے ایسی خوبیاں ہیں تم لوگوں میں ۔"

" بھابی ، میری نیت خراب نہیں ہے میں کسی مجبوری سے
ادا نہیں کر سکا ہوں ۔" سکپکاتے ہوئے قمرو نے بات بنائی ۔

" قمرو تم اس وقت چلے جاؤ میں کرشنا کے حکم کے مطابق
گوکل گھوسی کے داہ سنسکار میں شریک ہونے جا رہا ہوں جو کچھ
کہنا سننا ہے کل کہنا ۔ گنگو نے مضبوطی سے کہا ۔ قمرو کان دبائے چپ
چاپ کھسک گیا ۔ گھاس کے گھر تک گنگو کے دل میں کرشنا کا ایک
ہی جملہ بار بار گونجتا رہا : " زندگی میں کوئی کام ایسا بھی کر لو جو لوگ
واگ مرنے کے بعد یاد کریں ۔" جب گنگو کے دل کے کسی کونے سے اسی
دوران ایک سوال نے سر اٹھایا " کیا تو نے کبھی کوئی نیک کام کیا
ہے ؟" تو جواب میں روح اور دل دونوں جگہ سے ایک ہی آواز
آتی " نہیں " ۔

اسے اس " نہیں " سے ایک جھٹکا سا لگا اور وہ محسوس
کرنے لگا کہ واقعی اس کے اندر ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو مرنے
کے بعد لوگ اسے یاد رکھیں جو کچھ لوگ اس کو سلام کرتے ہیں وہ
عزت یا بڑپن کے سبب نہیں خوف و دہشت کی وجہ سے کرتے
ہیں ۔" کرشنا غلط نہیں کہتی ہے میں جو کچھ کما کر لاتا ہوں
کرشنا اس کو رکھ تو لیتی ہے لیکن اس کے چہرے پر خوشی
نہیں دیکھی اور اسی کا اندازہ ہوتا ہے ۔ وہ بھی دوسرے
[illegible] مجھ سے کچھ کہتی تو نہیں ہے مگر

واقف نہیں ہوتی ہے۔ حالانکہ میں نے کبھی اس کو ذرا سا بھی مارا بھی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ایسا کوئی کام ہی نہیں کرتی۔ ویسے بھی وہ بھی نیکی میں بڑا ہوں اس نے سبھی کو مجھ سے بھلائی ہی کی امید رہتی ہے۔ قدرت کا انصاف تو دیکھئے اتنی اچھی عورت اور ایک ذکیت لٹیرے اور قاتل کے ساتھ بیاہی گئی۔ وہ دس بارہ سال سے برت رکھتی آرہی ہے میں نے کبھی یہ بھی نہیں پوچھا کہ کیوں لگاتار بھوک پیاس کی تکلیف سہتی ہے۔ ویسے ہر عورت کا ایک ہی منشا ہوتا ہے اولاد ہو گھر میں خوشحالی رہے شوہر خیریت سے رہے۔ اس کے علاوہ اور چاہئے بھی کیا۔" اسی طرح سوچتا بچارتا وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا گھوسی کے گھر پہنچ گیا۔

وہاں کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ تمام بستی کے لوگ پورے صحن میں ایک دوسرے سے سٹے سٹے زمین پر بیٹھے تھے۔ گاؤں کے زمیندار کا لڑکا بھی اس بھیڑ میں ایک طرف بیٹھا تھا کبھی اس کے باپ نے گوکل کی بھینس کو صرف اتنی سی بات پر زہر دلوا دیا تھا کہ زیادہ دودھ دینے کی وجہ سے وہ اس کو خریدنا چاہتا تھا اور گوکل نے بیچنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اور کہا تھا کہ "مجھے اچھی بھینس پالنے کا شوق ہے اور یہی میری روزی روٹی کا سادھن ہے شوق اور روزی روٹی کے سادھن کو بیچا نہیں جاتا۔ اور نا ہی کسی بھلے آدمی کو کسی کے شوق کی چیز کو خریدنا چاہئے" گنگو کے دل میں سوال ابھرا "اتنا مغرور اور خود دار ہوتے ہوئے بھی اس کا لڑکا داہ سنسکار میں کیسے شریک ہو گیا؟" اسی وقت دل نے جواب دیا "جیسے تو دکھاوے کے لئے شریک ہوا ہے جس طرح تو اس کی شرکت پر تعجب کر رہا ہے تمام لوگ بھی تیری شرکت پر تعجب کر رہے ہوں گے۔ بہت سے کام سماج میں دکھاوے کے لئے بھی کئے جاتے ہیں یہاں ہر ایک کے ظاہر و باطن میں فرق ہے" گنگو اسی طرح سوچتا ہوا جا...

[illegible]

اس کے آنے سے پیشتر لوگ نہ جانے گوکل کی تعریف میں کیا کیا کہہ چکے تھے۔ لیکن جب وہ پہنچا تو اس نے سنا غلام رسول کہہ رہے تھے۔ "گوکل مرحوم کا بھی جواب نہیں ہے۔ ایک بار یہ گھر سے باہر گیا تھا بیوی کو بچہ ہونے کو تھا۔ لیکن یہ پتہ نہیں تھا کہ نیا مہمان اتنی جلدی وارد ہو جائے گا۔ جب بیوی کو تکلیف شروع ہوئی تو مددگار کوئی تھا ہی نہیں پڑوسی ہونے کے ناطے گوکل کی بیوی نے دائی کو بلا کر لایا۔ اس نے کیس بے قابو دیکھ کر اسپتال لے جانے کی رائے دی۔ بیوی نے گوکل کو حقیقت سے آگاہ کیا تو مرد خدا نے پل بھر کی دیر نہیں کی اور فوراً اسپتال میں بھرتی کرا دیا۔ جب تک میں وہاں نہیں پہنچا انھوں نے گھر میں قدم نہیں رکھا سارا کام کاج ملازم پر چھوڑ دیا۔ کتنے ہیں آج کل ایسے آدمی۔؟" غلام رسول نے اتنا کہہ کر تائید کے لئے لوگوں کی طرف دیکھا فوراً ایک آدمی نے لقمہ دیا——

"آج کل تو زیادہ تر ایسے لوگ ہیں حاجی جی کہ پڑوسی کے عدم موجودگی میں اس کا گھر ہی صاف کر دیں؟" یہ سنتے ہی سب نے گنگو کی طرف دیکھا۔ کسی نے منہ سے تو کچھ نہیں کہا لیکن گنگو کو ایسا لگا کہ گنگو کو ایسے ہی لوگوں میں شمار کیا جا رہا ہے۔ اسے بڑی گھٹن ہو رہی تھی لیکن سادھو کے غصہ کی طرح سب کچھ برداشت کئے بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس حاضری سے تو غیر حاضری اچھی تھی۔

اسی وقت ایک اور پڑوسی نے کہا "حقیقت میں وہ ایک حاتم صفت ہمدرد انسان تھا ایک بار شہر میں فساد ہو گیا تھا چوبیس گھنٹے کا کرفیو لگا ہوا تھا ان دنوں اس نے اپنی کئی بھینسوں کو کھلایا جانے والا دلیا اور دودھ چھوٹوں بڑوں بلا تفریق مذہب و ملت پاس پڑوس کے لوگوں تک پہنچایا تھا۔ انسان دوستی کی اس سے بہتر مثال کیا ہو سکتی

• معلوم: گنگو نے طعنہ زنی کے انداز میں سوال داغا۔

• معلوم نہیں مناسب قیمت مل سکتی ایسے وقت میں روپیہ دے کر بھی ضرورت کی چیزیں مہیا کرانا ایک طرح کا احسان ہوتا ہے۔ اس بے وفا اور خود غرض دور میں اپنی جان جوکھم میں ڈال کر ضرورتمندوں کی مدد کرنا کیا معمولی دل گردہ کا کام ہے؟ سب نے پھر اس حق کی تائید کر دی اور پہلے کی طرح ایکبار پھر گنگو کو دیکھا۔ گنگو نے پھر ندامت سے سر جھکا لیا وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس بار بھی اسی پر تیر چلا ہے۔ انسان کے دل سے بڑھ کر دوسرا لعنت ملامت دینے والا ہے بھی کون۔ اسی وقت ولا نام کے ایک پڑوسی نے کہا: "گوکل کو جنت ملے گی۔ جنت۔ ہر سال محرم میں اس کے دروازے سے ہو کر گزرتے تھے تو وہ دودھ کی لسی کی سبیل لگایا کرتا تھا۔

• کام تو اچھا کرتا تھا لیکن کیا جنت میں جانے کے لئے اتنا ہی کافی ہے؟ گنگو نے طنزیہ کہا۔

• ایسے ایسے لوگ بھی گذرے ہیں جنہوں نے زندگی بھر گناہ کئے خدا کا نام تک نہیں لیا لیکن آخری وقت اس کے حضور گناہوں سے توبہ کی اور رب العزت کا نام ورد زبان کیا اور جنت نصیب ہوئی۔ کچھ بھی ہو اتنا تو کہنا پڑے گا کہ وہ ان خون بہانے والوں سے تو لاکھ درجہ اچھا تھا جو تھوڑے سے روپیوں کے لالچ میں بیش قیمتی جان لے لیتے ہیں" ایک پڑوسی کی بات سنتے ہی سب نے اپنی اپنی نظریں نیچی جھکا لیں۔ اس بار کسی نے بھی گنگو کی طرف نہیں دیکھا لیکن اس بار بھی گنگو محسوس کر رہا تھا کہ وار اسی پر کیا گیا ہے۔ اس کو اپنی زندگی میں کئے گئے گیارہ بے گناہوں کے قتل یاد آنے لگے۔ وہ کیا کیا سوچ رہا تھا یہ تو خدا بہتر جانتا ہے لیکن اس کے چہرے سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنے خطرناک اعمال پر نادم ہو رہا تھا۔ جب کوئی

[illegible]

کے منصر پیدا ہونے لگتے ہیں۔ اسی وقت اس کے کانوں میں ایک کراری آواز ٹکرائی۔ اور وہ چونک پڑا۔ ایک دوسرا پڑوسی کہہ رہا تھا: "گوکل سچ مچ کتنا کا آدمی تھا ایک دن وحیدا تیلی سے کھیت کی مینڈ کے پیچھے تو تو میں میں ہو گئی اس بنا پر سالوں تک بول چال بند رہی لیکن ایک دن نہر کے اس پار گوکل اپنی بھینسوں کو نہلا رہا تھا دوسری پار وحیدا تیلی کا لڑکا اپنی بھینسوں کو نہلا رہا تھا اور بھینس کی دم پکڑ کر تیر رہا تھا۔ یکایک بھینس نے دم کو جھٹکا دیا اور وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ لگا غوطے کھانے لڑکے کے منہ سے غوطے کھاتے وقت زور سے نکلا بچاؤ۔ بچاؤ۔ گوکل نے ادھر دیکھا: ارے یہ تو وحیدا کا لڑکا ہے" وہ بجلی کی طرح فوراً پانی میں چھلانگ لگا دی۔ لڑکے کو ڈوبنے سے بچا لیا۔ لے کر جب وہ وحیدا کے پاس پہنچا [illegible] وحیدا کی حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اور اس نے شبنمی آنکھوں سے گوکل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "گوکل بھیا تم نے برسوں چلتی آ رہی ناراضگی کے باوجود ہمارے لڑکے کی جان بچا کر دشمنی ہی ختم نہیں کر دی بلکہ بیش قیمتی احسان سے ہمارا سر جھکا دیا۔" یہ سن کر گوکل نے کہا: "برسوں سے ہماری تمہاری بول چال بیشک بند تھی لیکن اس بات کا [illegible] کیا مطلب۔ اور یہ تو لڑکا تھا اگر تم بھی ڈوب رہے ہوتے تو میں تم کو بھی اسی طرح بچا لیتا۔ ختم تو دشمنی کو کرنا چاہئے نہ کہ دشمن کو۔ لڑائی تو چند اصولوں کی ہوتی ہے نہ کہ جان جان کی۔ اس کے بعد وہ دونوں گلے مل گئے۔" دیکھئے یہ عالم تھا اس فرشتہ سیرت انسان کا کیا ایسے آدمی کبھی مرتے ہیں لیکن اس نے دشمن کو بھی نقصان نہیں پہنچایا جبکہ آج کل "دوست دوست کا دشمن ہے" ایک اور پڑوسی نے لقمہ دیا۔

• [illegible]

"ٹھیک کہتے ہو" گنگو کے علاوہ سب نے ایک آواز ہو کر کہا اور اس حقیقت کی تائید میں شریک کرنے کے لئے سب نے اپنی اپنی نظریں گنگو پر مرکوز کر دیں لیکن وہ کچھ نہ بولا۔ خاموشی بھی تائید کا دوسرا روپ ہے اس بار گنگو کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔ اور خود کردہ گناہوں کی بھیتری پھٹکار سے رنگ فق پڑ گیا تھا۔ اگر یہی لوگ کہیں دوسری جگہ اس کو ملے ہوتے تو شاید وہ ان کی آنتیں نکال لیتا مگر یہاں وہ سب کچھ برداشت کر رہا تھا اور اس برداشت کے پیچھے ایک راز تھا۔ وہ خود بھی اپنے آپ کو برائی کا مرتکب سمجھ رہا تھا ایسی حالت میں آدمی کا جذبۂ ردعمل سرد ہو جاتا ہے۔

اتنی ہی دیر میں ایک پڑوسی نے ہمک کر کہا "گوکل میں ایسی بہت ساری خوبیاں تھیں جن کی سبھی لوگ تعریف کرتے ہیں مگر اس میں ایک کمی بھی تھی وہ منہ پھٹ تھا گولی لگے دھڑاکے سے کام۔ اس دور میں صاف گوئی مصیبت ہے۔ ایک بار ایک پٹواری ترقی کرتے کرتے نائب تحصیلدار ہو گیا جب وہ ریٹائر ہوا تو ملنے والوں نے فیئر ویل پارٹی دی۔ سب نے اس کی طرح طرح سے تعریفیں کیں۔ نس بندی کرانے میں وہ اپنے علاقہ میں ہر کرمچاری سے شفقت لئے ہوئے تھا یہ بھی اس کی ترقی کا خاص کارن تھا۔ گوکل نے ایک آدمی کے مائک سے ہٹتے ہی بڑھ کے مائک سنبھال لیا اور تڑاک پڑاک بولنا شروع کر دیا۔ "بھائیو جس انسان کی اتنی تعریفیں کی جا رہی ہیں میں اس مہا پرش کی تعریف میں ایک خوبی اور جوڑ دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ جب سرکار نے سیلاب زدہ لوگوں کے لئے امریکہ سرکار سے دان میں ملے دودھ کے ڈبوں کو سائٹ پر جا کر تقسیم کرنے کے لئے دیا تو ان صاحب نے موقع پر جا کر آدھے ڈبے بھی ضرورت مندوں کو نہیں دیئے اور بچائے ہوئے ہزاروں ڈبے کچھ دوستوں میں بانٹ دیئے، کچھ افسروں کے گھر پہنچا کر خیر خواہی حاصل کی اور کچھ گھر میں رکھ لئے۔ کچھ اونے پونے میڈیکل ہالوں پر بیچ ڈالے۔" اتنا کہہ کر پیچھا مائک سے ہٹ گیا۔ اس وقت تحصیلدار صاحب کا چہرہ دیکھنے ہی لائق تھا۔ سب لوگ انگشت بدنداں ہو گئے۔ بولا تو وہ سچ حقیقت پر روشنی ڈالتا،

سچ ویسے ہوتا بھی کڑوا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو اس زمانہ میں سچ بولنا اور ٹھیک تولنا خارج از رواج ہو چکا ہے کھرے آدمی سب کے برے بن جاتے ہیں لیکن جو کچھ وہ دل میں کچھ نہیں رکھتا تھا اس نے کبھی کسی سے چھل کپٹ نہیں کی۔"

یہ سن کر گنگو کی بھویں تن گئیں۔ حالانکہ کوئی خاص بات نہیں کہی گئی تھی مگر چھل کپٹ دو لفظوں نے اس کے دل میں بڑے پاپ کو کرید دیا اور اس نے سوچا کہ پڑوسی اس کی کئی سال پہلی اس حرکت کی طرف انگشت نمائی کر رہا ہے۔ جب گنگو نے ایک پڑوسی کی لڑکی کو میٹھی میٹھی کہہ کے گھر سے باہر بلا کر اغوا کروا دیا تھا اور اچھی خاصی رقم کھا گیا تھا۔ لڑکی کا آج تک پتہ نہیں چلا پولس نے خوف کے مارے اس کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا گواہی دینے کی کسی کی ہمت نہیں تھی ظالم کو ظالم کہنا کیا معمولی بات ہے گنگو کے چہرے کے نقش و نگار سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ برا مان رہا تھا لیکن تھوڑی دیر بعد اترے ہوئے دریا کی طرح وہ نارمل ہو گیا۔ جیسے کہ اس کے اس کے دل نے سمجھا دیا ہو کہ تجھ میں یہ سب عیب نہ ہوتے تو لوگ چھینٹا کشی کیوں کرتے۔

باتوں باتوں میں سارے کام پورے ہو گئے ارتھی سج گئی اور گوکل کو شمشان کی طرف لے چلے۔ تاجی جی نے سب کے ساتھ چلتے ہوئے گنگو سے دھیرے سے کہا۔ "بیٹے

گنگو زندگی میں تم بھی کوئی کام ایسا کرو جس سے مرنے کے بعد لوگ تمہیں بھی گو کل کی طرح اچھے الفاظ سے یاد کریں۔"

اب کی بار اس نے برا نہیں مانا بلکہ وہ مسکرا دیا۔ تھوڑی دیر پہلے اس کی دھرم پتنی اور سماج سیوی نے بھی یہی الفاظ کہے تھے۔ اس کے دل و دماغ میں ایک ایک لفظ رہ رہ کر گونجتا رہا۔ جب وہ شمشان سے گھر واپس آیا تو اس میں دھلے ہوئے کپڑے کی طرح تبدیلی آ چکی تھی پیغام اجل کے آتے ہی کھلی رہ گئی تھیں گوکل کی آنکھیں۔ انسان جنازے کے پیچھے کچھ ہوش کی باتیں کرتا ہے

اگلے دن بوس کے حکم کے مطابق قمرو آ مسکرا، گنگو باہر گیا۔ اس کے پیچھے ہی پیچھے کرشنا بھی چلی گئی۔ "کل کی بات پر کیا سوچا؟" قمرو نے دھیرے سے کہا۔

"آج سے آگے پھر کبھی میرے دروازے ذلیل اور اخلاق سے گرے ہوئے کاموں کے لئے مت آنا یہ سوچا ہے۔"

"گنگو تم مذاق کر رہے ہو یا واقعی سچ بول رہے ہو۔ اگر سچ بول رہے ہو تو ایک رات میں تبدیلی کیسے آ گئی۔ کیا ولیک بننے کا ارادہ ہے؟"

"ایک رات کیا آدمی تو ایک پل میں بدل جاتا ہے۔ اب میں محنت مزدوری اور کسانی کروں گا مگر برا کام نہیں کروں گا۔ میرے گھر میں میری بیوی ہے کہ بالکل دھرماتما ہے اور میں ہوں جس میں کوئی خوبی ہی نہیں ہے نہایت گنہگار اور پاپی ہوں۔ اب میں ایسی زندگی جینا چاہتا ہوں جس سے لوگ مجھے مرنے کے بعد یاد کریں۔ برے لوگوں کی تعریف صرف ان کے سامنے ہوتی ہے اور بھلوں کی ہمیشہ۔" یہ سن کر قمرو چلا گیا ابھی اس کو گنگو کی باتوں پر اطمینان نہیں ہوا تھا۔

جب گنگو گھر میں آیا تو بیوی کرشنا شو کی مورتی کے سامنے خوش خوش ناچ رہی تھی۔ "بڑی خوش ہو کیا مل گیا؟" گنگو نے سوال داغا۔

"مجھے وہ مل گیا جس کو دس سال سے برت رکھ رہی تھی۔ شادی کے بعد مجھے پتہ چلا کہ تم بری سنگت میں اٹھتے بیٹھتے ہو۔ دھیرے دھیرے تمہارے سارے کالے کرتوت مجھے معلوم ہو گئے میں نے بھگوان سے پرارتھنا کی کہ وہ تمہارے دل کو شریف آدمی کا دل بنا دے اور تم بھلے لوگوں کی زندگی جینے لگو۔ آج تم نے برے کاموں سے توبہ کر لی یہی میری حسرت تھی۔"

گنگو بیوی کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا جیسے وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔ "اتنی تاثیر ہوتی ہے برت رکھنے میں؟" گنگو نے دھیرے سے کہا اور وہ سنجیدہ ہو گیا۔



ایوب جوہر

کالی بلی

میں نے اپنی مخصوص عادت کے مطابق سادہ کاغذ کی پیشانی پر سب سے پہلے ۷۸۶ لکھا، پھر چند سطریں چھوڑ کر دائیں جانب ایک چھوٹا سا چوکور بنایا اور اس چوکور کو اوٹ الٹ میں گھیر کر اپنی کہانی کا پہلا جملہ تراشنے لگا۔

اور جب وہ سب اونگھنے لگے اور......

اور میرا جملہ ابھی نامکمل ہی تھا کہ مجھے محسوس ہوا کہ میرا قلم کاغذ کی سطح پر بڑی تیزی سے پھسل رہا ہے اور میں خود میز پر گرنے لگا ہوں۔ میں نے بال پن کے پچھلے سرے سے اپنی شفاف عینک کو ٹھوکے لگائے اور اپنے ذہن کو کریدنے کی کوشش کی کہ پچھلی رات نیند کے اکاؤنٹ میں میرا کوئی حصہ تھا یا نہیں اور یہ جان کر مجھے حیرت ہوئی کہ پچھلی رات نیند کی دیوی نہ صرف میرے قریب آئی تھی بلکہ اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا تھا اور اس وقت تک وہ مجھے کراتی رہی تھی جب تک کہ صبح کا رنگ آسمانوں کی پیشانی سے سپید نہ ہو گیا۔

تو پھر اب بھر پور، مطمئن اور بے حد قربت نیند ہونے کے باوجود میں اب بھی نیند میں ہچکولے لے رہا تھا تو یقیناً اچنبھے کی بات تھی۔ اور ویسے بھی میں دن کو سونے کا عادی نہیں رہا ہوں۔ اور نہ ہی میں اسے اچھا سمجھتا ہوں، مجھے وہ لوگ بڑے ہی عجیب دکھائی دیتے ہیں جو دن کو سوتے ہیں۔ اور رات بھر الّو بن کر اپنے ہی اندھیروں کی بات کھوری پر جھولتے رہتے ہیں۔

لیکن یہ عجیب سی بات، عجیب سا حادثہ آخر میرے ساتھ کیوں چپک گیا ہے؟ اور میں اپنی کہانی کا پہلا جملہ بھول کر اس عجیب سی بات کے عجائبات میں کیوں گم کردہ ہو گیا ہوں، شاید.... شاید.... مگر نہیں.... یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے صبح میں بہت ہلکا پھلکا ناشتہ کیا ہے اور اب تک بھی چار پیالیاں چائے اپنے حلق سے نیچے اتار چکا ہوں پھر بھی غنودگی اب تک کیوں دخیل ہے۔ کہیں اس کی وجہ میری صحت کی اتھل پتھل تو نہیں ہے، مگر نہیں، میری صحت تو ماشاء اللہ بہت اچھی ہے اور ایک تندرست آدمی کی جو علامتیں ہونی چاہئیں وہ سب مجھ میں موجود ہیں تو کیا.... تو کیا....

نہیں، یہ میرا واہمہ بھی تو ہو سکتا ہے، فضا میں ایسی کوئی بو بھی تو نہیں ہے جس سے اندازہ ہو کہ فضا ہی غنودگی کا شکار ہے۔ اور اسی خیال کے آتے ہی میں اپنے ذہن سے تمام غنودگی کو نکال پھینکتا ہوں اور اپنی کہانی کے پہلے جملے کی طرف رجوع ہوتا ہوں۔

اور تب وہ سب اونگھنے لگے اور اپنی عاقبت سے متعلق سوچنے لگے کہ......

اور اس کے بعد ایک لمبی سی لکیر نظر آتی ہے جو کاغذ کے آخری سرے پر جاکر گم ہوجاتی ہے، ایک لمحے کے بعد میں پھر چونک اٹھتا ہوں اور اپنی غنودگی کو اپنے ذہن میں ڈال کر لمبے خراٹے لینے لگتا ہوں۔

لیکن چند ثانئے بعد مجھ پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ میں شاید تنہا خراٹے نہیں لے رہا ہوں بلکہ اور بھی کچھ لوگ ہیں جو مجھ سے زیادہ طویل خراٹے لے رہے ہیں۔ اور تب میں اپنی آنکھیں کھولتا ہوں اور اپنے اردگرد تحیر زدہ نظروں سے دیکھنے لگتا ہوں اور یہ دیکھ کر مزید حیرت زدہ ہوجاتا ہوں کہ میرے چہار جانب بہت سارے لوگ موجود ہیں جو سب کے سب اسی طرح خراٹے لے رہے ہیں جیسے اس کے علاوہ انہیں کوئی کام نہ ہو۔ اور ان خراٹوں کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ان کا تعلق صرف بستر یا آرام دہ گدوں سے نہیں ہے بلکہ یہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اور دوڑتے بھاگتے ہوئے بھی دکھائی دے رہے ہیں۔

اور تب مجھے اپنی کہانی کا نامکمل جملہ یاد پڑتا ہے

اور تب وہ سب اونگھنے لگے اور......... تو کیا میں خود اس افسانوی پس منظر کا ایک پس منظر بن چکا ہوں، وہ منظر جو ابھی تخلیق نہیں ہوا اور جو ابھی تک اپنے پیش منظر کی دھند میں دھندلا کر رہ گیا ہے، ممکن ہے...... ممکن ہے......

اور تب میں فرط شوق سے آگے بڑھتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ ہر قدم پر نت نئے انکشافات کی دہلیز کھلتی ہے اور میری آنکھیں استعجاب اور حیرت کی کنکریوں سے بھر جاتی ہیں، وہ کنکریاں جو ابابیل کی چونچ میں بیٹھ کر کرشمے جنم دیتی ہیں لیکن میری آنکھوں میں داخل ہوکر چمکیلے ستاروں کا روپ دھار لیتی ہیں۔ میں اپنی دکھتی ہوئی آنکھوں سے ایک بار پھر اپنے اردگرد کا تفصیلی جائزہ لیتا ہوں اور یہ دیکھ کر چونک اٹھتا ہوں کہ یہ علاقہ میرا اپنا علاقہ نہیں ہے، میرے چہار جانب پھیلے ہوئے لوگ بھی میرے لئے اجنبی ہیں اور فضا میں ایک عجیب سی بوجھیلی ہوئی ہے جسے میں کوئی نام نہیں دے پا رہا ہوں۔ لیکن یہ لوگ جو زبان بول رہے ہیں اسے میں سمجھ رہا ہوں بلکہ سمجھ ہی نہیں رہا ہوں اس کے کھرے پن کو بھی محسوس کررہا ہوں اور سب سے بڑی بات یہ کہ سائن بورڈ اور دیوار پر جو پوسٹر لگے ہوئے ہیں ان کی زبان بھی وہی ہے جو لوگ بول رہے ہیں اور اچانک مجھے خیال آتا ہے کہ یہ تو وہی زبان ہے جسے سننے، دیکھنے اور پورے طور پر محسوس کرنے کے لئے میں تیرہ سال سے ترس گیا ہوں۔ اور فرط خوشی سے میں ایک زوردار نعرہ لگانے ہی جارہا تھا کہ ایک مانوس آواز میرے کانوں میں اترتی ہے۔

"السلام علیکم ورحمتہ اللہ" سلام کرنے والے کی جانب میں پلٹ کر دیکھتا ہوں اور ایک لمحے کو منجمد سا ہوجاتا ہوں، پورے تیرہ سال بعد میں اپنے پیارے دوست اختر کو دیکھ کر ایک عجیب سی کیفیت میں مبتلا ہوجاتا ہوں اور سلام کا جواب دیئے بغیر میں اس سے اسی طرح جیسے کسی طرح لپٹ جاتا ہوں جیسے اسے میں پورا کا پورا چاٹ کر ہی چھوڑوں گا کچھ یہی کیفیت اختر کی بھی ہے، لیکن اچانک مجھے احساس ہوتا ہے کہ گلے ملتے وقت ہم ایک دوسرے کو اپنے سینوں سے نہیں بھینچ رہے بلکہ ہماری پیٹھ ایک دوسرے سے رگڑ کھا رہی ہے۔ احساس کی اس بیہودگی پر میں جھینپ جاتا ہوں اور ندامت بھری نظروں سے اپنے دوست کی جانب دیکھتا ہوں لیکن اس کی آنکھوں میں کوئی پہچان نہیں ملتی اور میں پھر حیرت کی الگنی پر لٹک جاتا ہوں۔

میرا دوست مجھے اس طرح معلق دیکھ کر مجھ پر طنز کی چوٹ کر کھینچتا ہوا کہتا ہے۔

"ارے تو کھڑا کیوں ہو گیا، یہ تیرا شہر نہیں ہے جہاں کچھوے کی رفتار سے آگے نہیں بڑھتی، یہ اپنا شہر ہے جہاں ایک پل رکے تو دوسرے پل کی خبر نہیں ملتی۔"

اپنے دوست کے مخاطب کرنے پر میں چونک پڑتا ہوں محسوس کرتا ہوں کہ میرا دوست جو بول رہا ہے وہ سچ بول رہا ہے کہ یہاں کے لوگ نہ صرف اپنے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتے نظر آتے ہیں بلکہ یہاں کی گاڑیاں بھی ہاتھی جیسی اور لنگ کرتی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں۔ وہ ایک قدر مشترک ہے ان میں موجود ہے وہ یہ کہ سب کے سب اونگھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ گھبرا کر اپنے دوست کا بازو تھام لیتا ہوں لیکن وہ بھی رہا ہوتا ہے۔ میں اس سے اسی سلسلے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں لیکن وہ میری ان سنی کر کے مجھے لیتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔

راستے میں کوئی چھوٹے بڑے ہوٹل دکھائی دیئے۔ …تے ہوئے ریسٹورنٹ دکھائی دیئے۔ مگر میرا دوست رکتا ہوا نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ مسلسل بھاگا جا رہا تھا …رفتار سے مجھے بھی گھسیٹ رہا تھا۔ بالآخر میں نے اسے …آؤ کسی ریسٹوران میں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔ پھر چلیں گے۔ لیکن وہ صاف انکار کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"…یہاں یہ چائے پینے کا وقت نہیں ہے۔ چائے ہم صبح اور شام میں پیتے ہیں یا پھر چھٹیوں کے دنوں میں۔" مگر مجھے چائے کی طلب ہو رہی تھی، میں نے اس کی بات …کرتے ہوئے کہا: "تو اس کے معنی یہ کہاں کہ تمہاری …لوں میں تو چائے پیوں گا۔" مجھے چائے …دیکھ کر وہ ڈھیلا پڑ گیا۔ اور پھر ہم ایک صاف ستھرے ریسٹوران میں داخل ہو گئے۔ لیکن ابھی ہم نے چائے کی پیالیاں خالی بھی نہ کی تھیں کہ اچانک ریسٹوران کے اندر ایک ہڑبونگ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ہر شخص اپنی اپنی سیٹ سے اونگھتا ہوا اٹھا اور باہر کی جانب لپکتا ہوا دکھائی دیا۔ خود میرا دوست بھی آدھی پیالی چائے چھوڑ کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے حیرت اور خوف ملی جلی نگاہوں سے اپنے دوست کی جانب دیکھا اور پوچھنے لگا۔

"خیریت تو ہے کہیں کوئی ہنگامہ تو نہیں ہو گیا؟" میرا دوست میری بوکھلاہٹ پر محظوظ ہوتا ہوا کہنے لگا۔

"سن نہیں رہے ہو ظہر کی اذان ہو رہی ہے۔"

"ظہر کی اذان!" اچانک میرے دل کو بڑی طمانیت محسوس ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ صوم صلوٰۃ کے بڑے پابند ہیں۔ میں نے لوگوں کو اور اپنے دوست کو بڑی عقیدت بھری نظروں سے دیکھا اور اپنی آنکھوں میں ندامت سمیٹتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

میں اپنے دوست کے ساتھ مسجد کی جانب بڑھ رہا تھا اور بے تحاشہ مسجد کی جانب لوگوں کو بھاگتے ہوئے دیکھ کر یہ سوچ رہا تھا کہ اور جب صور پھونکا جائے گا تو شاید یہی کیفیت ہوگی۔ مردے اپنی اپنی قبروں سے نکلیں گے اور بے تحاشہ سائے کے مانند بھاگتے ہوئے نظر آئیں گے۔ مگر اپنے اس خیال پر میں خجل سا ہوا اور سوچنے لگا کہ ایک ہمارے شہر کے لوگ ہیں جنہیں تبلیغی جماعت کی انتھک کوشش بھی پورے طور پر نمازی نہ بنا سکیں اور یہ لوگ ہیں جن میں چھوٹے بڑے، مرد عورتیں، بچے اور بوڑھے سبھی نمازی ہیں اور ان میں شاید کوئی غیر نمازی نہیں ہے۔ میرا سر عقیدت سے جھکا جا رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ ذات باری سے دل ہی دل میں انتہائی عجز و انکسار سے دعائیں مانگ رہا تھا کہ

اے معبود تو میرے شہر کے لوگوں کو بھی نمازی بنا دے اور صوم صلوٰۃ کا پابند کر دے جس طرح تو نے اس شہر کے لوگوں پر بے پناہ نعمتیں نازل فرمائیں اور انہیں دیندار بنا کر دولت لازوال سے سرفراز کیا۔ اور نہ جانے میں کیا کیا دعائیں مانگتا کہ میرے دوست نے مجھے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔

" جلدی وضو کرو ورنہ پھسڈی ہو جاؤ گے "

میں اپنے دوست کی خالی کی ہوئی وضو کی جگہ پر بیٹھ کر وضو بنایا اور نماز کی ادائیگی کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ پورے ڈیڑھ گھنٹے بعد جب میں نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے باہر نکلنے لگا تو یہ میں نے ضرور سوچا کہ یہ لوگ نماز میں بھی اونگھتے ہیں اور یہ سوچتے ہوئے جب میں نے اپنے دوست سے پوچھا کہ تم لوگ آخر مسجد میں کیوں اونگھتے ہو تو اس نے جھٹ ایک چھوٹا سا لفظ کہا "کالی بلی" اور خاموش ہو گیا میں اس چھوٹے سے لفظ کی تشریح میں اترنا چاہتا تھا کہ مسجد کے صدر دروازے پر میری نگاہیں چپک گئیں۔ وہاں چند پولس والے خراٹے لے رہے تھے۔ میں نے اپنے دوست کی طرف پھر سوالیہ نگاہیں اچھالیں اور اس نے پھر دھیرے سے کہا "کالی بلی" ۔ میں جھنجلا گیا۔ میں نے کہا مجھے نہ بجھاؤ صاف صاف کہو۔ اس نے مجھے پل بھر کے لئے چبھتی نگاہوں سے دیکھا پھر کہا۔

" پیارے یہ لوگ نماز پڑھوانے پر متعین ہیں "

" نماز پڑھوانے کے لئے !! ـــــ اور میں پھر تشریح کے کنویں میں جھانکتا ہوں، مگر اچانک خیال ہوتا ہے کہ میں شاید پھر تنہا ہو گیا ہوں۔ اپنے چاروں اور نظریں دوڑاتا ہوں لیکن میرا دوست کہیں نہیں تھا۔ شاید وہ پھر ایکبار تیز رفتار [illegible] نکل چکا تھا اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ کیسی [illegible]

بھی میرا دوست میرا ساتھ چھوڑ گیا۔ آخر یہ کیوں کر ممکن ہے مگر ممکنات سے کوئی شئے باہر بھی تو نہیں ہے۔

میں ایک ایسے موڑ پر کھڑا ہوں جہاں تحیر کی پرچھائیاں ایک بار پھر رینگتی ہیں اور میری دھنستی ہوئی آنکھوں کی پتلیوں پر دو شخص کی کہانی ابھرتی ہے۔ ایک شخص جو ابلیس بنا ہوا ہے اور دوسرا جو آدمی کی شکل میں کھڑا ہے اور اپنے ہاتھ میں کوڑا لہرا رہا ہے اور لہراتا ہوا کوڑا ابلیس بنے ہوئے شخص کی پیٹھ کے نچلے حصے پر پڑتا ہے۔ ابلیس بنے ہوئے شخص کے ہونٹوں سے ایک لمبی چیخ نکلتی ہے اور آدمی بنا ہوا شخص تمسخر سے اس کی جانب دیکھتا ہے اور کوڑا ایک بار پھر پوری شدت کے ساتھ فضا میں لہراتا ہے۔ اور پھر ابلیس بنے ہوئے شخص کی پیٹھ کے نچلے حصے پر گرتا ہے اور وہاں سے ایک گوشت کا لوتھڑا لیتے ہوئے اور زمین کو سرخ کرتا ہوا آدمی کے ہاتھوں میں آ کر فتح و نصرت کا علم بن جاتا ہے۔

علم برداری کے اس منظر کو دیکھ کر میں اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں اور دور بہت دور پیچھے کی جانب بھاگنے لگتا ہوں۔ جہاں زندگی روئی کے گالوں کی طرح اڑتی ہوئی نہیں دکھائی دیتی جہاں ایک مکمل، بھرپور اور قابل رشک نظام ہستی ہر شعبۂ حیات میں گل و خوشبو کی آبیاری میں لگا ہوا ہے۔ ایسے میں فراخی خیال کے کام میں حسن بھی نظر آتا ہے اور سلیقہ بھی اور پھر میں اپنی آنکھیں کھولتا ہوں اور دیکھتا ہوں۔ زندگی کا ہر شعبہ روئی کے گالوں میں منتقل ہو چکا ہے۔ طوفانی جھکڑوں کا سلسلہ جاری و ساری ہے اور میں اندر ہی اندر چیخ اٹھتا ہوں کہ اے آدمی بنے ہوئے لوگو، اپنی ہی ذات کو ابلیس بنانے سے پہلے یہ ضرور سوچو کہ غار حرا سے روشنی اس وقت طلوع ہوئی تھی جب خود مکے کی اندھیری گلیاں اس روشنی کے حصول کے لئے دور دور [illegible] تک پھیل آئی تھیں۔

سکون میں کوئی کمی نہیں تھا ہیں کہ صرف ایک تماشائی
تھا۔ تماشہ دیکھتا رہا اور اس تماشے میں خود کو گم کرنے اور خود
کو پانے کے احساس سے الجھتا رہا اور اس الجھنے اور سلجھنے
کے دوران میں ایک بار پھر میں اپنے آپ کو وہیں پاتا ہوں جہاں
میں نے اپنی کہانی کا پہلا نامکمل جملہ چھوڑا تھا اور جو دست
سوال پھیلائے ٹکر ٹکر میری جانب دیکھ رہا تھا۔ شاید یہ
کہنا چاہتا ہو کہ اے گلستان کے غازی تم سے تو یہ بھی نہیں ہو سکتا
کہ چند الفاظ کی بھیک دے کر مجھے مکمل کر سکو اور تم چلے ہو دنیا
کی جہانگیری کرنے۔

لاحول ولا قوۃ —— میرے قریب سے ایک مولانا جب
لاحول پڑھتے گزرے تو میں نے چونک کر اپنے آپ کو دیکھا کہ کہیں
[illegible] تو نہیں بنا ہوا ہوں۔ لیکن دوسرے لمحے میرے کان
[illegible] کی پیالیوں سے ابھرنے والی جلترنگ سے
بج اٹھے تو میری بیباک نگاہیں ان چہروں میں کھب گئیں جو
چاندنی جیسے اجلے، پھول جیسے کومل اور اشعار جیسے رنگا
رنگ تھے اور تب مجھے اچانک خیال ہوا کہ مولانا نے شاید غلط
لاحول پڑھی تھی۔ لیکن مولانا، مولانا تھے، غالب تو تھے نہیں
کہ [illegible] خرابات کی تمنا کرتے۔ مگر —— میری
نظر ایک پوسٹر سے الجھ جاتی ہے۔ پوسٹر میں ایک مونچھ والی تصویر
چھپی ہے اور پوسٹر کی عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تصویر
اس شہر کی سب سے معتبر تصویر ہے اور اس کی خصوصیت یہ ہے
کہ اگر غور سے اس پر نظر پڑے تو یہ کالی بلی دکھائی دیتی
ہے جس کی سفید مونچھیں بڑی خطرناک ہیں۔ مونچھیں جن کی معاشرے
میں بڑی اہمیت رہی ہے۔ مونچھوں کی لڑائی ہر دور میں لڑی جاتی
رہی ہے لیکن ذرا سوچئے جس کی سرے سے مونچھیں ہی نہ ہوں
[illegible] کی لڑائی [illegible] ہوگا۔ مگر دلچسپ پہلو یہ ہے کہ
[illegible]

سمجھ میں کہتا ہے —— لڑائی، لڑائی، لڑائی
کو رستے باچھتے جائی۔
جینے اور بچنے کی لڑائی ہر جگہ جاری ہے
کیسے لوگ ہیں، کیسا شہر ہے اور کیسا ملک ہے
سب اونگھ رہے ہیں اور صرف ایک کالی بلی
جس کی مونچھیں بڑی لمبی اور خطرناک ہیں اور [illegible]
میں نیلی رنگ کا بلب روشن ہے —— نیلی رنگ
کی علامت ہے۔ تو کیا —— تو کیا —— مگر میں [illegible]
نہیں سوچ پاتا ہوں اس لئے کہ میرے کندھے
ہاتھ رکھ دیا ہے۔

" ارے تم! اختر کو سامنے دیکھ کر میں
ہوں —— تم کہاں غائب ہو گئے تھے اور ابھی تو تیر
پورے نہیں ہوئے۔ ایک جگ ایک سال ——
بات پر وہ مسکراتا ہے اور پھر بڑی مضبوطی سے
پکڑتا ہے اور ایک جانب دوڑ پڑتا ہے۔
اور دوڑتے دوڑتے جب ہم تھک گئے
ایک تنگ سی گلی میں داخل ہوتا ہے اور پھر اس
گلی کے ایک تنگ سے کمرے میں جب ہم پہنچے تو میں نے
یہ کمرہ اونگھتے اور کھانستے ہوئے لوگوں سے بھرا
پورے کمرے میں ایک کثیف سی بو اور دھواں [illegible]
میں نے اپنے چہرے پر ناگواری کی لکیریں ڈالیں اور
میں سوال انڈیلتا ہوا اپنے دوست کی جانب دیکھ
نے مسکراتے ہوئے کہا۔

" ہر ماحول پہلے اجنبی ہوتا ہے مگر رہتے رہتے
اجنبیت ختم ہو جاتی ہے اور تم بھی اجنبی نہیں رہو گے
" کیا مطلب ؟"
" مطلب صاف [illegible]

گی۔ یہاں شراب کے علاوہ سب چیز ملتی ہے۔ ہیروئن، ایل۔ ایس۔ ڈی، مارفیا، چرس، افیون اور ... گانجا ....

سوٹا لگا کر میرے دوست نے کچھ اس طرح کھینچا کہ ایک اونگھتا ہوا شخص ہڑبڑا کر اٹھا اور چیخ چیخ کر گانے لگا۔

دم مارو دم ... مٹ گئے ہم ....

میں حیرت سے اس شخص کی جانب دیکھ رہا ہوں جس نے گانے کے بول اٹھائے تھے۔ لیکن بس وہ ایک بول تھا، پھر وہ اس طرح خاموش ہو گیا جیسے اچانک غبارہ بے ہوا ہو جائے۔ اب گانجے کی چلم میرے دوست کے ہاتھ میں تھی اور وہ دم لگا رہا تھا — دم — نہ جانے اس دم میں کون سا دم اٹکا ہوا ہے جسے یہ لوگ نہیں سوچ پا رہے ہیں۔

میرا دوست اب نڈھال پڑا ہوا ہے۔ وہ اونگھ بھی نہیں رہا ہے بلکہ سو رہا ہے۔ گہری اور شاید ابدی نیند، اور میں اس کی سپاٹ کھلی ہوئی پتھرائی آنکھوں میں جھانک رہا ہوں جہاں میرے دوست کی کوئی پرچھائیں نہیں ہے البتہ ایک کالی بلی اپنی بڑی بڑی آنکھیں نکالے غرا رہی ہے۔

بقیہ — منی

اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے میٹھی میٹھی ہنسی پھیلا رہی تھی۔

ادھل (ادھر) تو دیکھئے پپا!

اس نے دیوار کے سامنے دیکھا

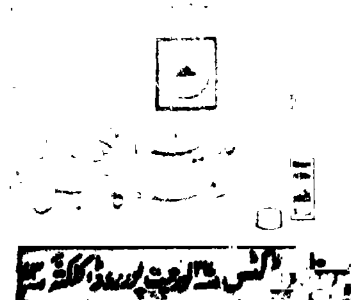
پیارے دونوں ہاتھ پھیلا کر منی کھڑی تھی

وہ چپکے سے منی کے پاس گئے۔ اس کے نازک سے اور خوبصورت گالوں پر بوسہ دیا اور انہیں محسوس ہوا کہ گویا کمرے کی ساری دیواریں ایک ساتھ گا رہی ہوں۔

ہیپی برتھ ڈے ٹو یو!

فریم کی تصویر میں کھڑی پھول میری سی سی منی نے ضد سے پکڑا ہوا ہاتھ چھوٹنے کے انتظار میں وہ پتا نہیں کب تک گم سم کھڑا رہا۔





شہرِ خیال

○ عزیزی مسعود جی. آداب

سہیل باقاعدہ مل رہا ہے۔ بہتر سے بہتر ہو رہا ہے۔ اس کے لئے مبارک ہو۔ اس سلسلے میں آپ کی کوشش جاری رہنی چاہئے۔ کچھ نئی تحریر جلد ہی ارسال کروں گا۔ آپ سب کو واجبات اور دعائیں۔

رام پرکاش راہی، دہلی

○ برادر عزیز! دعائیں

خط ملا۔ آپ جس فنی دکاوش سے قابل قبول معیار کے ساتھ سہیل شائع کر رہے ہیں، تحسین کے قابل ہے۔

ڈاکٹر علیم اللہ حالی صاحب قریب ہوں تو ان سے میرا سلام کہئے گا۔ امید ہے آپ حضرات اس آشوب میں بخیر اور مطمئن ہوں گے ——— خیراندیش —

عطا ابن فیضی، مئو ناتھ بھنجن

○ برادرم دعائیں

خیریت معلوم ہوئی۔ یقیناً حالات نہایت تشویشناک ہیں۔ گذشتہ چالیس سال سے جو بویا جا رہا تھا وہ فصل [illegible] ہوئی۔ [illegible] باور کرایا تھا کہ فصل کٹ رہی ہے۔ [illegible] دانت بوئے تھے جو [illegible] آئے ہیں۔

[illegible] ناسازگار حالات میں آپ جس طرح سہیل نکال

رہے ہیں وہ اپنی جگہ ایک مشن کا کام ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ پرچہ پہلے سے بہتر صورت میں ہو گیا ہے۔

ستمبر کا شمارہ بھی اس کی گواہی دے رہا ہے۔ خدا آپ کے ارادوں اور ہمت کو بلند تر بنائے اور اپنی عافیت میں آپ سب کو رکھے — آمین

نیا سال بہت بہت مبارک ہو۔

ازل (بمبئی)

○ محترم جناب ایڈیٹر صاحب۔ سلام مسنون

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے

"سہیل" کا تازہ شمارہ نظر سے گذرا۔

تمام تخلیقات کا مطالعہ کیا سبھی اپنی اپنی جگہ پر قابل تعریف ہیں۔ آپ جس خلوص اور لگن کے ساتھ "سہیل" شائع فرما رہے ہیں وہ یقیناً قابل ستائش اور ناقابل انکار ہے جس کے لئے میں آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

ادارہ سے وابستہ سبھی حضرات سے میرا سلام عرض کریں

وسیم مینائی (شاہجہانپور)

○ محترم مسعود بھائی! سلام مسنون

نیا سال مبارک ہو

سہیل کا تازہ شمارہ مل گیا۔ شکریہ

آپ جس خلوص و محبت سے اس ناچیز کو یاد کرتے ہیں اس کے لئے شکریہ ادا کرنے کے لئے میرے پاس کوئی مناسب الفاظ نہیں ہیں

میں واقعی شرمندہ ہوں کہ ایک عرصہ سے کچھ لکھ نہیں سکا۔ حالانکہ عملی طور پر کوتاہی نہیں ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی کوئی مضمون سہیل کے لئے ارسال کروں گا۔

جن حالات میں اس وقت ہم لوگ سانس لے رہے ہیں ان کو قلم زد کرنا ضروری ہے۔ اور آپ جس طرح سے اپنے اداریہ میں روشنی ڈالتے رہے ہیں قابل مبارکباد ہے۔

کیا ہم اس حقیقت سے انکار کرسکتے ہیں کہ جو لوگ مسائل سلجھانے کی بات کررہے ہیں وہ لوگ تعاون دیں گے۔ سیاست کا ایسا گندہ جال پھیلا دیا گیا ہے کہ اس میں سبھی پھنستے جارہے ہیں۔ ہٹ دھرمی اور ضد سے کوئی مسئلہ نہ طے ہوا ہے اور نہ ہوگا اس کی آڑ میں لوگوں کو بیوقوف بنایا جارہا ہے۔ فرقہ پرستی کا زہر گھولا جارہا ہے۔ اور انسانیت کا قتل عام ہورہا ہے جبکہ وہاں پوجا ہورہی ہے درشن کرنے والوں پر کوئی پابندی ہے نہیں پھر ڈھانچہ تبدیل کرنے کے لئے اتنا تاولاپن کیوں ؟

نسیم اختر، سہپور

○ محترمی جمیل منظر صاحب : سلام مسنون

نیا سال مبارک ہو۔

آپ کے موقر ماہنامہ سہیل کا دسواں شمارہ دستیاب ہوا۔ میری غزل کی اشاعت کا شکریہ۔ کرشن مراری صاحب پر راجندر رستوگی اور پروفیسر علیم اللہ حالی کے مضامین پسند آئے۔ علاوہ ازیں فضا ابن فیضی، عبدالمتین نیاز، یعقوب یاور کی غزلیں اور مناظر عاشق ہرگانوی صاحب کی مختصر نظمیں اچھی لگیں۔ نئی کتابوں کے تعارف کے باب میں سید شکیل دسنوی کے مجموعہ کلام "تنہا تنہا" اور منیر سیفی کے "اجنبی صدا" پر علیم اللہ حالی صاحب اور تاج پیامی کے مختصر تبصرے حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں۔ دونوں شعراء کے فن پر مکمل روشنی پڑتی ہے۔ دونوں تبصرہ نگار حضرات کو مبارکباد دے دیجئے۔

عبدالمتین جامی (کٹک

○ مکرمی تسلیمات !

اسکول کی چھٹی پر ماہنامہ سہیل پہنچ ملا ہے شکریہ۔ نمبر ۹ کے تعلق سے اتنا تو ضرور کہوں گا کہ اسے بے دلی سے پڑھنا تقریباً ناممکن ہی ہے۔

اپنی دو غزلوں کی اشاعت کے لئے ممنون ہوں۔

بصد انکسار عرض کروں گا کہ میرا ایک شعر سہو کتابت کی زد میں آکر لایعنیت کا شکار ہوگیا ہے۔ اصل شعر اس طرح ہے۔

اب فرشتہ کہنے والا کون ہے
قرض لے کر بنے انسان ہم

احباب کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہوں۔

شمیم احمد قرار، بمبئی

○ مسعود بھائی ! سلام مسنون

سہیل کی کمپلیمنٹری کاپی مل چکی تھی جس کے لئے ممنون ہوں۔ تبصرہ کی اشاعت کے لئے شکریہ !

کرشن چندر پر قیصر عثمانی کا مضمون دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ سہیل جامی نے اچھی کہانی دی ہے۔

شعری حصے میں مخروں کمار دریا، فضا ابن فیضی، حسن نعیم، عبدالمتین نیاز، جامی اور اظہر نیر پسند آئے

کتابت طباعت بھی صاف ستھری ہے۔

ملنے والوں سے سلام کہئے۔

منیر سیفی

جواب طلب امور کے لئے

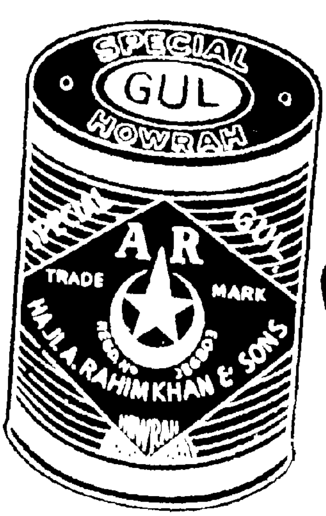
ڈاک ٹکٹ ضرور ارسال کریں

12,274
11.2.92

معذرت

سہیل کے شمارہ ۔ ۱ صفحہ ۔ پر جناب کرشن مراری کی تصویر کی جگہ جناب ڈاکٹر برج پریمی مرحوم کی تصویر چھپ گئی ہے

ادارہ اس کے لئے معذرت خواہ ہے


SPECIAL
GUL
HOWRAH
A R
TRADE
MARK
HAJI A. RAHIM KHAN & SONS
HOWRAH

